مسلم تاریخ



عہد صحابہ اور جدید ذہن کے شبہات

محمد مبشر نذیر

www.mubashirnazir.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

یہ کتاب اسلامک اسٹڈیز پروگرام کی "مسلم تاریخ سیریز" کا ایک حصہ ہے جسے عام قارئین کی سہولت کے لیے الگ سے بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ اس پوری سیریز میں دلچسپی رکھتے ہوں تو www.islamic-studies.info پر وزٹ کیجیے۔ اس پروگرام کے آٹھ ماڈیولز ہیں:

- ماڈیول HH01: اس ماڈیول میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے۔ علوم سیرت کا بھی پہلا ماڈیول ہو گا لیکن اس کے ایڈوانسڈ کورسز علوم تاریخ کی بجائے علوم سیرت کی اسٹریم کا حصہ ہوں گے۔
- ماڈیول HH02: اس ماڈیول میں ہم عہد صحابہ اور تابعین کی تاریخ (11-132/632-750) کا مطالعہ کریں گے جو کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر بنو امیہ کے دور کے اختتام تک کے زمانے پر محیط ہو گا۔
- ماڈیول HH03: یہ ماڈیول، ایک طرح سے دوسرے ماڈیول ہی کی توسیع ہے۔ عہد صحابہ کے بارے میں تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا جواب ہم اس ماڈیول میں تاریخی تنقید (Historical Criticism) کے اصولوں کی روشنی میں پیش کریں گے۔ [یہ کتاب اسی ماڈیول کی ٹیکسٹ بک ہے جسے عام لوگوں کے فائدے کے لیے الگ سے شائع کیا جا رہا ہے۔]
- ماڈیول HH04: اس ماڈیول میں ہم بنو عباس کے دور (132-656/750-1258) کا مطالعہ کریں گے۔
- ماڈیول HH05: یہ ماڈیول اسپین کی مسلم تاریخ (138-895/756-1490) پر مشتمل ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم مسلمانوں کے مین لینڈز میں (656-922/1258-1517) کی تاریخ کا مطالعہ بھی اسی ماڈیول میں کریں گے۔
- ماڈیول HH06: پچھلے پانچ سو برس کی تاریخ (905/1500 تا حال) کا مطالعہ اس ماڈیول کا موضوع ہو گا۔ اس میں ہم گن پاؤڈر ایمپائرز یعنی سلطنت عثمانیہ، صفویہ اور مغلیہ کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ اس کے بعد کالونیل دور (1163-1370/1750-1950) اور آزادی کے بعد کے دور (1370/1950 تا حال) کا مطالعہ بھی اسی ماڈیول کا حصہ ہو گا۔ دنیا کے مختلف خطوں میں مسلم اقلیتوں کی تاریخ کا مطالعہ بھی اسی ضمن میں کیا جائے گا۔
- ماڈیول HH07: اس ماڈیول میں امت مسلمہ کی پوری تاریخ کا مذہبی، علمی، فکری، دعوتی اور تمدنی پہلو زیر بحث آئے گا۔ اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہو گی۔
- ماڈیول HH08: یہ مطالعہ تاریخ کا آخری ماڈیول ہو گا جس میں ہم نہایت تفصیل کے ساتھ ساتھ فلسفہ تاریخ کا مطالعہ کریں گے اور اس ضمن میں قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ابن خلدون، ٹائن بی اور دیگر ممتاز مفکرین تاریخ کے افکار کا مطالعہ کریں گے۔

عہد صحابہ اور جدید ذہن کے شبہات۔۔۔

تعارف

دین اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ کا مطالعہ نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی کی بدولت ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برپا کردہ پیغمبرانہ تحریک نے انسانیت پر کیا اثرات مرتب کیے۔ دنیا کس درجے میں گمراہی کا شکار تھی اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے اپنی جدوجہد کی بدولت ایک عظیم الشان اخلاقی انقلاب برپا کر کے دنیا کے سامنے ایک آئیڈیل نمونہ پیش فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ پاکباز شخصیتیں تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور اس کے بعد انہوں نے اپنی پوری زندگیوں کو آپ کے مشن کی تکمیل میں لگا دیا۔ اس لحاظ سے دور صحابہ کو عہد رسالت کی توسیع (Extension) قرار دیا جا سکتا ہے۔

جب دین کا ایک طالب علم اولین مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے، تو اسے یہ نظر آتا ہے کہ یہ صحابہ اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھے اور اپنے وقت کی متمدن دنیا پر چھا گئے۔ دنیا بھر میں اس وقت مذہبی جبر (Persecution) کا دور تھا اور لوگ اپنے بادشاہوں کا دین اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ صحابہ کرام نے دنیا کے ایک بڑے حصے سے مذہبی جبر کا خاتمہ کر کے انسان کو یہ حق عطا کیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکے۔ وہ لوگ جو قیصر و کسری کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے، انہیں رہائی عطا کی۔ صحابہ کرام کا یہ کارنامہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری نسل انسانی کے لیے ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایک طرف تو خلافت راشدہ کی یہ تصویر دین کے ہر طالب علم کو نظر آتی ہے لیکن دوسری جانب وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اسی خلافت راشدہ کے آئیڈیل دور کے پانچ چھ سال فتنہ و فساد کی نظر ہو گئے اور انہی صحابہ کے مابین ایسے اختلافات پیدا ہوئے کہ باہمی جنگ و جدال کی نوبت آ پہنچی۔ ایسا کیوں ہوا اور اس کے پیچھے کیا تاریخی عوامل کار فرما تھے؟ دینی تاریخ کے ہر طالب علم کے ذہن میں یہ سوال اور اس سے ملتے جلتے کچھ اور سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا حل اگر اسے نہ ملے تو وہ ذہنی پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو دین اسلام کو مانتا ہے، اس کا تعلق خواہ کسی بھی مسلک سے کیوں نہ ہو، یہ تاریخی سوالات اسے بہر حال پریشان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کیوں اور کیسے پیدا ہوئے، ان کے اسباب کیا تھے اور ان کے کیا نتائج امت کی تاریخ پر مرتب ہوئے؟ اس کتاب کا مقصد انہی سوالات کا جواب تلاش کرنا ہے۔

واضح رہنا چاہیے کہ ہم یہ کتاب فرقہ وارانہ اختلافات کو اجاگر کرنے کے لیے نہیں لکھ رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ صحابہ کرام سے متعلق مسلمانوں کے ہاں دو بڑے گروہ موجود ہیں جن کا زاویہ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہے اور ان مسائل پر ان کے ہاں بحثیں ہوتی رہتی ہیں لیکن ہم ان بحثوں سے بالاتر ہو کر محض تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان سوالات کا جواب تلاش کرنا چاہیں

گے اور یہ کوشش کریں گے کہ اس معاملے میں کوئی تعصب اور جانبداری ہماری راہ میں حائل نہ ہو سکے۔ ہمارے نزدیک تمام صحابہ کرام ہی معتبر ہیں اور ہمارے سر کا تاج ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی جانب جھکاؤ یا کسی کے خلاف تعصب کے بغیر ان سب کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم قرآن مجید، احادیث اور تاریخی روایات کی روشنی میں ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِنْ اللَّهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمْ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً.

محمد اللہ کے رسول ہیں اور اس کے ساتھی کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔ آپ انہیں دیکھیں گے کہ وہ رکوع و سجدہ کرتے ہوئے اللہ کا فضل اور رضا تلاش کرنے میں مشغول ہیں۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں، یہ ہے ان کی صفت۔ تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک فصل ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو مضبوط بنایا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نیک عمل کیے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ (الفتح 48:29)

وَالسَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنْ الْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَداً ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ.

مہاجرین اور انصار میں سب سے پہلے آگے بڑھ کر [ایمان لانے والے] اور وہ جنہوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور اس سے۔ اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (التوبہ 9:100)

قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک بالکل صحیح طور پر پورے تواتر سے منتقل ہوا ہے۔ جو لوگ قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں بھی مانتے، وہ بھی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کتاب ہم تک بعینہ ویسے ہی پہنچی ہے، جیسا کہ محمد رسول اللہ نے اسے اپنی امت کو دیا۔ کم از کم تاریخی اعتبار سے قرآن مجید کی محفوظ ہونے پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کیا جائے تو صحابہ کرام کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آپس میں نرم دل اور رحم دل ہیں، ایک دوسرے کے لیے ان کے دلوں میں محبت اور احترام کے جذبات موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس گروہ کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہوئی ہو، اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہ صحابہ کرام کی ایک تصویر ہے۔

دوسری جانب جب ہم تاریخ کے مآخذ کا جائزہ لیں تو ہمیں دو قسم کی معلومات ملتی ہیں۔ معلوماتی رپورٹس کا ایک گروپ تو وہ ہے جو قرآن مجید کی اوپر بیان کردہ آیات کے عین مطابق ہے جبکہ دوسرا گروپ ایسا ہے جو ان آیات سے بالکل متضاد اور مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کی سب رپورٹس درست نہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ان میں سے وہ روایات درست ہیں جو قرآن مجید سے مطابقت

رکھتی ہیں اور یا پھر وہ درست ہیں جو قرآن مجید کے بیان سے ایک مختلف اور متضاد تصویر پیش کرتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی رپورٹس درست اور مستند ہیں؟ آیا قرآن سے مطابقت رکھنے والی یا اس سے متضاد تصویر پیش کرنے والی؟ اس کتاب میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ ان میں کون سی رپورٹس درست ہیں اور فن تاریخ کی رو سے ان کا درجہ کیا ہے؟

دور صحابہ کی تاریخ مختلف افراد کی بیان کردہ کہانیوں اور رپورٹس پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر ایک کہانی کو فن حدیث و تاریخ کی اصطلاح میں "روایت" کہا جاتا ہے۔ یہ مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ ان روایات کا پہلا گروپ وہ ہے جس کے مطابق صحابہ کرام انسانی اخلاق کے اعلی ترین منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔ دنیا ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی، ان کے مخالفین انہیں رات کے راہب اور دن کے مجاہد کا خطاب دیتے ہیں۔ ان کے باہمی تعلقات خلوص اور محبت پر مبنی نظر آتے ہیں اور وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار (بنیان مرصوص) بن کر انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس روایات کا دوسرا گروپ وہ ہے جو ان صحابہ کی کردار کشی پر مبنی ہے اور اس کے مطابق ان کی ایک بالکل مختلف تصویر دکھائی دیتی ہے۔ تعداد کے اعتبار سے پہلی قسم کی روایات کہیں زیادہ ہیں۔ یہاں ہم ان دونوں قسم کی روایات کی چند مثالیں پیش کر رہے ہیں جو اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کی کتب میں آئی ہیں۔

مثبت روایات کا گروپ

روایات کے اکثریتی گروپ کی چند مثالیں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

1۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ (حضرت علی کے بیٹے) بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر کون ہے؟" انہوں نے فرمایا: "ابو بکر۔" میں نے عرض کیا: "ان کے بعد؟" فرمایا: "عمر۔" مجھے خدشہ گزرا کہ اب میں نے یہی سوال کیا تو آپ عثمان کا نام لیں گے۔ میں نے عرض کیا: "ان کے بعد آپ ہوں گے؟" فرمایا: "میں تو مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہوں۔" رضی اللہ عنہم۔[1]

2۔ حبیب بن ابی ثابت کی روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں تھے کہ کسی نے آکر کہا: "ابو بکر بیعت کے لیے مسجد میں بیٹھے ہیں۔" آپ نے صرف قمیص پہن رکھی تھی اور ازار اور چادر نہ تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں دیر نہ ہو جائے، آپ مسجد کی طرف گئے اور بیعت کی۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ گئے اور گھر سے چادر اور ازار منگوا کر پہنا۔[2]

3۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جنازے میں شریک تھا کہ ایک شخص نے میرا شانہ پکڑ

[1] بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 3468۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ www.almeshkat.net (ac. 11 Nov 2011)

[2] ابن جریر طبری (224-310/838-922)۔ (اردو ترجمہ: سید محمد ابراہیم)۔ تاریخ الامم والملوک۔ 11ھ کا باب۔ جلد 2، ص 410 (11H, 2/1-410 کراچی: نفیس اکیڈمی۔ (410

لیا۔ دیکھا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ پھر انہوں نے حضرت عمر کے لیے دعائے مغفرت کی اور کہا: "اے عمر! آپ نے اپنے بعد کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو عمل کے اعتبار سے مجھے آپ کی طرح پسند ہو۔ بخدا! میرا خیال ہے کہ اللہ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ) کے ساتھ رکھے گا۔" [3]

4۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "کیا آپ اس بات سے راضی نہیں ہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون کو حضرت موسی علیہما الصلوۃ والسلام سے تھی؟ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" [4]

5۔ جب عمر بن خطاب نے ایران کی جنگ میں بذات خود جانے کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یاد رکھیے کہ اسلام کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار قلت و کثرت پر نہیں ہے بلکہ یہ دین، دین خدا ہے جسے اسی نے غالب بنایا ہے اور یہ اسی کا لشکر ہے جسے اسی نے تیار کیا ہے اور اسی نے اس کی امداد کی ہے۔ یہاں تک کہ اس منزل تک پہنچ گیا ہے اور اس قدر پھیلاؤ حاصل کر لیا ہے۔ ہم پروردگار کی طرف سے ایک وعدہ پر ہیں اور وہ اپنے وعدہ کو بہر حال پورا کرنے والا ہے اور اپنے لشکر کی بہر حال مدد کرے گا۔

ملک میں حکمران کی منزل مہروں کے اجتماع [تسبیح] میں دھاگے کی ہوتی ہے کہ وہی سب کو جمع کیے رہتا ہے اور وہ اگر ٹوٹ جائے تو سارا سلسلہ بکھر جاتا ہے اور پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتا ہے۔ آج عرب اگرچہ قلیل ہیں لیکن اسلام کی بنا پر کثیر ہیں اور اپنے اتحاد و اتفاق کی بنا پر غالب آنے والے ہیں۔ لہٰذا آپ مرکز میں رہیں اور اس چکی کو انہی کے ذریعہ گردش دیں اور جنگ کی آگ کا مقابلہ انہی کو کرنے دیں۔ آپ زحمت نہ کریں کہ اگر آپ نے اس سرزمین کو چھوڑ دیا تو عرب چاروں طرف سے ٹوٹ پڑیں گے اور سب اس طرح شریک جنگ ہو جائیں گے کہ جن محفوظ مقامات کو آپ چھوڑ کر گئے ہیں، ان کا مسئلہ جنگ سے زیادہ اہم ہو جائے گا۔

ان عجمیوں نے اگر آپ کو میدان جنگ میں دیکھ لیا تو کہیں گے کہ عربیت کی جان یہی ہے۔ اس جڑ کو کاٹ دیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راحت مل جائے گی اور اس طرح ان کے حملے شدید تر ہو جائیں گے اور وہ آپ میں زیادہ ہی طمع کریں گے۔ اور یہ جو آپ نے ذکر کیا ہے کہ لوگ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے آ رہے ہیں تو یہ بات خدا کو آپ سے زیادہ ناگوار ہے اور وہ جس چیز کو ناگوار سمجھتا ہے، اس کے بدل دینے پر قادر بھی ہے۔ اور یہ جو آپ نے دشمن کی تعداد کا ذکر کیا ہے تو یاد رکھیے کہ ہم لوگ ماضی میں بھی کثرت کی بنا پر جنگ نہیں کرتے تھے بلکہ پروردگار کی نصرت اور اعانت کی بنیاد پر جنگ کرتے تھے۔ [5]

---

[3] بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 3482، مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 2389

[4] مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 2404۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ (ac. 11 Nov 2011) http://www.almeshkat.net/

[5] سید شریف رضی (359-406/970-1015)۔ نہج البلاغۃ (عربی)۔ منتديات مقهى الأصدقاء۔ www.PalsCoffee.com ac. 19 Apr 2007 خطبہ 145

6۔ حضرت امیر معاویہ کے نام سیدنا علی رضی اللہ عنہما اپنے خط میں لکھتے ہیں: "میری بیعت اسی قوم نے کی ہے جس نے ابو بکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی اور اسی طرح کی ہے جس طرح ان کی بیعت تھی کہ نہ کسی حاضر کو نظر ثانی کا حق تھا اور نہ کسی غائب کو رد کر دینے کا اختیار تھا۔ شوری کا اختیار بھی صرف مہاجرین و انصار کو ہوتا ہے لہذا وہ کسی شخص پر اتفاق کر لیں اور اسے امام نامزد کر دیں تو گویا کہ اسی میں رضائے الہی ہے اور اگر کوئی شخص تنقید کر کے یا بدعت کی بنیاد پر اس امر سے باہر نکل جائے تو لوگوں کا فرض ہے کہ اسے واپس لائیں اور اگر انکار کر دے تو اس سے جنگ کریں کہ اس نے مومنین کے راستہ سے ہٹ کر راہ نکالی ہے اور اللہ بھی اسے ادھر پھیر دے گا جدھر وہ پھر گیا ہے۔[6]

7۔ جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں مدینہ کا محاصرہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو نصیحت کرنے گئے تو آپ سے فرمایا: "آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آپ کو ان کی صحبت نصیب ہوئی۔ آپ نے حضور کی احادیث کو سنا ہے اور آپ کو ان کا داماد بننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ابن ابی قحافہ (ابو بکر) حق پر عمل کرنے میں آپ سے بہتر نہ تھے اور نہ ہی ابن خطاب (عمر) نیکی آپ سے بہتر تھے۔ آپ قرابت کے رشتے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب ہیں، آپ کو جو (دامادی کا رشتہ) نصیب ہوا ہے، وہ ان دونوں کا حاصل نہیں ہوا۔ اس وجہ سے ان دونوں کو آپ پر سبقت حاصل نہیں ہے۔"[7]

8۔ ابو بکر عبسی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عمر اور علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ زکوۃ کے جانوروں کے باڑے میں گیا۔ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سایہ میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت گرمی کی دھوپ میں کھڑے ہوئے انہیں کچھ لکھوا رہے تھے۔ ان کے بدن پر دو سیاہ چادریں تھے، ایک کو انہوں نے تہبند کی طرح لپیٹ رکھا تھا دوسری کو سر پر لپیٹا ہوا تھا۔ آپ زکوۃ کے اونٹ گن رہے تھے اور ان کے رنگ اور دانت کے بارے میں لکھوا رہے تھے۔ حضرت علی نے (جب خلیفہ وقت کی یہ مشقت دیکھی تو) حضرت عثمان سے فرمایا: "حضرت شعیب علیہ الصلوۃ والسلام کی بیٹی کا یہ قول اللہ کی کتاب میں (حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام) کے بارے میں نقل ہوا ہے۔'ابا جان! انہیں ملازمت پر رکھ لیجیے کیونکہ جس سے آپ اجرت پر کام لیں، ان میں وہ بہتر ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔'" پھر حضرت علی نے حضرت عمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "ایسے قوی اور امین آپ ہیں۔"[8]

8۔ باغیوں کے محاصرے کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ بار بار باغیوں کے پاس جاتے تھے اور خلیفہ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب صفائیاں پیش کر کے انہیں قائل کرتے تھے کہ وہ بغاوت سے باز آ جائیں۔ آپ کی ان کاوشوں سے متعدد باغی واپس بھی

---

[6] ایضا۔ مکتوب 6

[7] طبری۔ 34H, 3/1-382

[8] ایضا۔ 22H, 3/1-222

چلے گئے۔ اہل مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ آپ احجار الزیت کے پاس ایک لشکر میں تھے اور آپ کے گلے میں تلوار لٹک رہی تھی اور آپ سرخ یمنی عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ آپ نے حضرت حسن کو حضرت عثمان کی حفاظت کے لیے بھیجا ہوا تھا۔ مصریوں نے جا کر آپ کو سلام کیا اور اپنی عرض داشت پیش کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر چلائے اور انہیں نکال دیا۔ آپ نے فرمایا: "نیک لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ذوالمروہ اور ذوخشب کے لشکر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ تم واپس جاؤ۔ اللہ تمہاری صحبت سے بچائے۔"[9]

9۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نے اپنے بیٹوں حسن و حسین بن علی، عبد اللہ بن زبیر اور محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہم کو مقرر کیا۔[10]

10۔ جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر پانی بند کیا تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے جو اپنی جان پر کھیل کر انہیں پانی اور ضرورت کی دیگر اشیاء پہنچا کر آتے تھے۔[11]

11۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ نے یہ آیت پڑھی: **كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلإِنسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ.** [یہ لوگ شیطان کی طرح ہیں کہ وہ انسان سے کہتا ہے، "کفر اختیار کرو۔" پھر وہ کافر بن جاتا ہے تو وہ شیطان یہ کہتا ہے: "میں تم سے بری الذمہ ہوں، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"][12]

12۔ باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے آپ کو دفن نہ ہونے دیا اور آپ کے جنازے پر پتھر برسائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر انہیں روکا۔[13]

13۔ احنف بن قیس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس گیا اور ان سے پوچھا: "مجھے لگتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے جائیں گے۔ آپ یہ فرمائیے کہ میں ان کے بعد کس کی بیعت کروں؟" انہوں نے جواب دیا: "علی کی۔" جب انہوں نے یہی سوال سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا تو آپ نے بھی انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا حکم دیا۔[14]

---

[9] ایضاً۔ 35H, 3/1-441 to 443

[10] ایضاً۔ 35H, 3/444

[11] ایضاً۔ 35H, 3/448

[12] ایضاً۔ 3/449

[13] ایضاً۔ 3/472

[14] ایضاً۔ 36H, 3/2-113

14۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لوگو! معاویہ کی گورنری کو ناپسند مت کرو۔ اگر تم نے انہیں کھو دیا تو تم دیکھو گے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گریں گے جیسے حنظل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا ہے۔ [15]

15۔ خوارج نے ایک ہی رات حضرت حضرت علی، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ برک بن عبداللہ خارجی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا۔ وار اوچھا پڑا اور آپ کے کولہوں پر زخم آیا۔ آپ نے اسے گرفتار کر لیا۔ قاتل نے کہا: "میرے پاس ایسی خبر ہے جس کے سننے سے آپ خوش ہو جائیں گے اور اگر میں آپ سے وہ خبر بیان کروں گا تو آپ کو بہت فائدہ پہنچے گا۔" آپ نے فرمایا: "بیان کرو۔" وہ بولا: "آج میرے بھائی نے علی کو قتل کر دیا ہو گا۔" آپ نے فرمایا: "کاش! تمہارے بھائی کو ان پر قدرت نہ نصیب ہو۔" [16]

16۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مسائل پیش ہوتے تھے، وہ ان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر ان کی رائے مانگا کرتے تھے۔ جب ان کے پاس ان کی شہادت کی اطلاع پہنچی تو فرمایا: "فقہ اور علم، ابن ابی طالب کی شہادت کے ساتھ چلا گیا۔" [17]

17۔ حضرت معاویہ کو جب حضرت علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کی خبر ملی تو رونے لگے۔ ان کی اہلیہ نے ان سے کہا: "آپ اب ان کے متعلق رو رہے ہیں جبکہ زندگی میں ان سے جنگ کر چکے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "افسوس! تمہیں علم نہیں کہ آج کتنے لوگ علم و فضل اور دین کی سمجھ سے محروم ہو گئے ہیں۔" [18]

18۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا: "میرے سامنے علی کے اوصاف بیان کرو۔" انہوں نے نہایت بلیغ الفاظ میں حضرت علی کی غیر معمولی تعریفیں کیں۔ حضرت معاویہ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے۔ پھر فرمایا: "اللہ ابوالحسن (علی) پر رحم فرمائے، واللہ وہ ایسے ہی تھے۔" [19]

19۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے افسوس کا اظہار کیا اور مرثیہ کہا۔ [20]

20۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں ہر سال حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو ہر قسم کے تحفوں کے علاوہ دس

---

[15] ابن ابی شیبہ۔ المصنف۔ 14/38850۔ ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغۃ۔ 12/40

[16] طبری۔ 3/2-357, 40H

[17] ابن عبد البر (368-463/979-1071)۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ باب علی۔ 2/53۔ بیروت: دار الفکر۔ www.waqfeya.com (ac. 11 Aug 2012)

[18] ابن کثیر (701-774/1302-1373)۔ البدایہ والنہایہ۔ 11/129۔ (تحقیق: الدکتور عبداللہ بن محسن الترکی) قاہرہ: دار ہجر۔

[19] ابن عبد البر (d. 463/1071)۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ 2/52۔

[20] طبری۔ 3/2-358

لاکھ دینار بھیجا کرتے تھے۔[21]

21۔ واقعہ کربلا کے بعد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کو جب شام لے جایا گیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خاندان کی خواتین بہت روئیں اور یزید نے بھی سخت افسوس کا اظہار کیا۔[22]

22۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تین بیٹوں کا نام ابو بکر، عمر اور عثمان تھا۔ ان میں ابو بکر اور عثمان سانحہ کربلا میں شہید ہوئے۔[23]

ان تمام روایات کو مد نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یک جان اور کئی قالب تھے۔ ان کے درمیان محبت، ہمدردی اور احترام کے تعلقات تھے۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کیا کرتے تھے اور ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی کینہ اور بغض نہ تھا۔

منفی روایات کا گروپ

تاریخی روایات کا ایک اور گروپ بھی ہے جو عام روایات سے ہٹ کر بالکل ہی متضاد تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ خود کو خلافت کا حق دار سمجھتے تھے۔ جب صحابہ کرام کی اکثریت نے آپ کی بجائے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا لیا تو آپ کو سخت رنج پہنچا۔ نعوذ باللہ آپ نے دل ہی دل میں کینہ رکھا اور مجبوراً ان کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کی خلافت کو بھی مجبوراً برداشت کر لیا۔ خلافت عثمانی کے آخری ایام میں آپ نے بغاوت برپا کر کے خلیفہ کو شہید کروا دیا اور خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔ حضرات طلحہ، زبیر، عائشہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم نے آپ کو خلیفہ تسلیم نہ کیا اور آپ سے جنگیں کیں۔ آپ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو مجبور کر کے صلح کی اور پھر بیس برس حکومت کی اور اپنی وفات کے بعد اپنے بیٹے یزید کو نامزد کر گئے۔ اس کی وجہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے علم بغاوت بلند کیا جس کی پاداش میں یزید نے انہیں کربلا کے میدان میں شہید کروا دیا۔

چونکہ اس کتاب کا مقصد ہی ان منفی روایات کا جائزہ لینا ہے، اس وجہ سے ہم نے کوشش کی ہے کہ کم و بیش ان تمام منفی روایات کو اس کتاب میں درج کیا جائے۔ یہ سب روایتیں اپنے اپنے مقام پر آئیں گی۔

کون سی تصویر درست ہے؟

ایک غیر جانبدار قاری جب ان دونوں قسم کی روایات پڑھتا ہے تو اس کا ذہن کنفیوز ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ عہد صحابہ کی ان متضاد تصاویر میں سے کون سی تصاویر درست ہیں؟ اگر پہلی قسم کی روایات کو درست مان لیا جائے تو پھر دوسری قسم کی روایات کا کیا کیا

---

[21] ابو مخنف، مقتل الحسین، ص14، قم: منشورات الرضی، http://www.al-mostafa.info/data/arabic/depot2/gap.php?file=016992.pdf (ac. 16 Feb 2012)

[22] طبری، 61H, 4/1-236,237

[23] ایضاً 61H/4/1-227, 242

جائے اور اگر دوسری قسم کی روایات ٹھیک ہیں تو پہلی قسم کی روایات کی کیا حیثیت ہے؟ اگر پہلی قسم کی روایات درست تھیں تو پھر صحابہ کرام کے درمیان جنگیں کیوں ہوئیں؟ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے محض پچیس برس بعد ہی ایک دوسرے سے کیوں برسرپیکار ہو گئے؟

اگر ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو اس سے ہمیں جس رویے کی تلقین کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ہمارے سامنے کوئی ایسی ویسی بات آئے جس میں ان ہستیوں پر الزام عائد کیا گیا ہو، تو اسے بلا تامل مسترد کر دینا چاہیے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَوْلا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ.

ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب آپ لوگوں نے اس (بہتان) کو سنا تو تھا تو آپ کہتے، ہم تو اس بارے میں اپنی زبان سے کچھ نہیں نکال سکتے۔ اے اللہ! تو پاک ہے۔ یہ تو بڑا ہی بہتان ہے۔ (النور 24:16)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنْ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلا تَجَسَّسُوا وَلا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ.

اے اہل ایمان! آپ لوگوں کو چاہیے کہ بہت زیادہ گمان کرنے سے بچا کریں۔ یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ (کسی کی ذات سے متعلق) تجسس نہ کیا کریں اور نہ ہی آپ میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا آپ میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ آپ لوگ یقیناً اس سے کراہت محسوس کریں گے۔ اللہ سے ڈرتے رہیے کہ یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات 49:12)

اہل ایمان کا یہی رویہ ہونا چاہیے۔ تاہم کتب تاریخ میں چونکہ ایسی متعصبانہ روایتیں بڑی تعداد میں داخل کر دی گئی ہیں، اس وجہ سے بسا اوقات غیر جانبدار قارئین کو بھی یہ کنفیوژن محسوس ہوتی ہے کہ اتنی ساری روایات کو بلا تامل مسترد کیسے کیا جائے۔ اس کتاب میں ہم اسی کنفیوژن کو دور کرنے کی کوشش کریں گے اور تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے خالص علمی انداز میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ ان دونوں قسم کی روایات میں سے کون سی درست ہیں اور عہد صحابہ کی خانہ جنگیوں کے اسباب کیا تھے؟

صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار سے ہمیں جو عقیدت و محبت ہے، اس کی ایک اپنی جذباتی اور دینی اہمیت ہے مگر مناسب ہو گا کہ یہ تجزیہ کرتے وقت اس عقیدت کو کچھ دیر کے لیے ایک طرف رکھ دیں اور بالکل خالی الذہن ہو کر خالص فن تاریخ کی روشنی میں ان روایات کا جائزہ لیں تاکہ ہم پوری غیر جانبداری کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں کیونکہ غیر جانبدارانہ تجزیہ ہی ہمیں دل کا اطمینان فراہم کر سکتا ہے۔ اگر انسان جانبدارانہ تجزیہ کرے تو اس کے دل کو کبھی اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے دل میں کسی مخصوص صحابی سے متعلق بغض موجود ہے، تو ان سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنے دل سے یہ بغض وقتی طور پر نکال دیں اور بالکل غیر جانبدار ہو کر اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

اس موضوع پر بلا مبالغہ ہزاروں کتب لکھی جا چکی ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ یہ کتب فرقہ وارانہ بحثوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن میں ایک دوسرے پر طعن و تشنیع پایا جاتا ہے۔ بعض کتب میں صحابہ کرام کے ایک گروہ کی جانب جھکاؤ موجود ہوتا ہے اور دوسرے گروہ پر

تنقید ہوتی ہے۔ اکثر کتب تکنیکی زبان میں لکھی جاتی ہیں جن کی وجہ سے عام قارئین کے لیے ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ ان میں تاریخی تنقید کے فن کی تفصیلات دیے بغیر اس فن کو استعمال کیا گیا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ایک عام قاری کو مشکل لگتا ہے کہ وہ ان کے مندرجات کی تصدیق (Verification) کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ایک ایسی کتاب لکھنے کی کوشش کی ہے جو فرقہ واریت سے پاک ہو، اس میں کسی فرقے پر طعن و تشنیع نہ ہو، سبھی صحابہ و اہل بیت کا ادب ملحوظ خاطر رکھا گیا ہو، اور کتاب کو ایسے اسلوب میں پیش کیا جائے جسے ایک عام قاری بآسانی نہ صرف سمجھ سکے بلکہ اس کی تصدیق بھی کر سکے۔

روایات کا الگ الگ تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ فن تاریخ کے بارے میں ابتدائی معلومات آپ کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ صحابہ کرام سے متعلق کون کون سی روایات وہ ہیں جو قرآن مجید سے مطابقت رکھتی ہیں اور کون سی وہ ہیں جو قرآن مجید سے متضاد تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہم ایک ایک روایت کا جائزہ لے کر اس کے مستند (Authentic) ہونے کو چیک کر سکتے ہیں۔ یہ معلومات پہلے دو ابواب پر محیط ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ ان دو ابواب کو پڑھے بغیر ہرگز اگلے ابواب کا مطالعہ نہ کیجیے۔

اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

محمد مبشر نذیر

اکتوبر 2012 / ذوالحجہ 1433

باب 1: تاریخ پر تحقیق کا طریق کار

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ جان سکیں کہ:

- تاریخی معلومات کیسے مرتب کی جاتی ہیں؟
- تاریخی معلومات کیسے مسخ ہو جاتی ہیں یا کر دی جاتی ہیں؟
- تاریخی معلومات کو اگلی نسلوں تک کیسے منتقل کیا جاتا ہے؟
- تاریخی معلومات کی جانچ پڑتال کا طریقہ کیا ہے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ تاریخی معلومات کو جانچنے اور پرکھنے کے عمومی طریق کار سے واقف ہوں۔

اس باب میں ہم فن تاریخ کے بنیادی مباحث کا مطالعہ کریں گے تا کہ اس فن کے بارے میں یہ جان سکیں کہ تاریخی معلومات کیسے حاصل کی جاتی ہیں؟ انہیں مرتب کیسے کیا جاتا ہے؟ عہد صحابہ سے متعلق تاریخی معلومات کس شکل میں دستیاب ہیں؟ کیا یہ معلومات ہم تک درست شکل میں پہنچی ہیں؟ فن تاریخ میں ایسے کون سے طریق ہائے کار (Procedures) موجود ہیں جن کی مدد سے ان معلومات کی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے اور اس کی صحت (Authenticity) کا جائزہ لیا جا سکتا ہے؟

تاریخی معلومات کیسے مرتب کی جاتی ہیں؟

تاریخی معلومات، خواہ ان کا تعلق کسی بھی زمانے سے ہو، کو مرتب کرنے کا ایک پراسیس ہوتا ہے جس میں متعدد مرحلوں سے گزر کر یہ معلومات بعد کی نسلوں تک پہنچتی ہیں۔ وہ مرحلے یہ ہیں:

پہلا مرحلہ: واقعہ رونما ہونا اور عینی شہادت

جب کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے، تو اس کے کچھ عینی شاہدین ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس واقعے کی تفصیلات کو نوٹ کرتے ہیں اور پھر اسے آگے بیان کر دیتے ہیں۔ اگر کسی واقعے کو عینی شاہدین میسر نہ آ سکیں تو اس کی تفصیلات بالعموم مخفی رہتی ہیں۔ عینی شاہدین اگر موجود ہوں تو وہ اپنے اپنے رجحان، دلچسپی اور افتاد طبع کے لحاظ سے معلومات کو مرتب کرتے ہیں۔ انسان کی یہ نفسیات ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی واقعے کے ہر پہلو کو جزوی تفصیلات کی حد تک یاد نہیں رکھتا بلکہ اس کی یہ فطرت ہے کہ وہ کسی بھی واقعے کو اپنے خیالات، نظریات، دلچسپیوں اور تعصبات کی عینک سے دیکھتا ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ کوئی قتل کا واقعہ ہو جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گواہ تو پوری تفصیل سے قاتل کا حلیہ بتا دیتا ہے لیکن اس کے قتل کرنے کے انداز کو زیادہ تفصیل سے بیان نہیں کر پاتا کیونکہ اس طریقے میں اس کی دلچسپی نہیں ہوتی اور وہ اسے مناسب حد تک نوٹ نہیں کر پا سکا ہوتا۔ اس کے برعکس دوسرا گواہ قاتل کے حلیے کو تو زیادہ تفصیل سے نوٹ نہیں کرتا لیکن قتل کرنے کے انداز کو بڑے واضح انداز میں بیان کر دیتا ہے کیونکہ اس کی دلچسپی اسی میں ہوتی ہے۔

اسی طریقے سے اگر اس واقعے کو کوئی ایسا شخص بھی دیکھ رہا ہو جو اسلحے میں بڑی دلچسپی رکھتا ہو تو وہ باقی چیزوں کی نسبت آلہ قتل کی جزئیات کو بڑی تفصیل سے بیان کر دیتا ہے۔ ایسا بھی ممکن ہوتا ہے کہ کسی شخص نے قاتل کو پہچان لیا ہو لیکن وہ کسی ذاتی مفاد یا خوف کی وجہ سے اس کے بارے میں غلط معلومات فراہم کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی واقعے کو بیان کرنے والوں میں تفصیلات کے بارے میں کچھ نہ کچھ اختلاف رونما ہو ہی جاتا ہے۔ اس طرح سے تاریخی معلومات کو مرتب کرنے کا پہلا مرحلہ طے پاتا ہے۔ یہ مرحلہ بالعموم واقعے کے فوراً بعد مکمل ہو جاتا ہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ چند دن ہی لگتے ہیں۔

چنانچہ ہم اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہوتے ہی مقامی صحافی اور پولیس موقع پر پہنچ جاتے ہیں اور اس کا ریکارڈ مرتب کر لیا جاتا ہے۔ عینی شاہدین کے بیانات قلم بند کر لیے جاتے ہیں۔ سرکاری ریکارڈ کے علاوہ اخبارات میں اس کی رپورٹس شائع ہو

جاتی ہیں۔

دوسرا مرحلہ: معلومات کو یکجا کرنا

دوسرے مرحلے میں عینی شاہدین سے معلومات کو اکٹھا کر کے ایک جگہ درج کیا جاتا ہے۔ مختلف عینی شاہدین کے بیانات قلم بند کیے جاتے ہیں اور ان تمام معلومات کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اگر معلومات کو درست طور پر مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو ایسا کرنے والا یہ کوشش کرے گا کہ جتنے زیادہ عینی شاہدین مل سکیں، ان سے معلومات اکٹھی کر لی جائیں۔ اگر کسی واقعے کو بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے، تو اس میں قدرتی طور پر عینی شاہدین بہت زیادہ ہونے چاہییں۔ اگر کوئی واقعہ کسی بند جگہ پر پیش آیا ہے اور موقع پر عینی شاہدین موجود نہیں ہیں، تو اس کے بارے میں بالعموم التباس پیدا ہو جاتا ہے۔ عام واقعات کو تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی جرم ہوا ہو یا تاریخی نوعیت کا اہم واقعہ ہو تو اس کی باقاعدہ تفتیش کی جاتی ہے اور مختلف طرز کے ثبوت اکٹھے کیے جاتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ: تصویر کا مکمل کرنا

جب ممکنہ حد تک معلومات کو اکٹھا کر لیا جاتا ہے تو پھر ان کی مدد سے واقعے کی تصویر کو مکمل کیا جاتا ہے، کڑیوں سے کڑیاں جوڑی جاتی ہیں اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ واقعے کی حقیقی صورت سامنے آ جائے۔ یہ عمل بالکل جگ سا پزل (Jigsaw Puzzle) سے مشابہت رکھتا ہے۔ جیسے جگ سا پزل میں تصویر کے مختلف کٹے ہوئے حصے ہوتے ہیں اور انہیں جوڑ کر ایک تصویر بنانا ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی عینی شاہدین کے بیانات کو سن کر تصویر بنائی جاتی ہے۔ البتہ اس معاملے میں مختلف پہلو یہ ہے کہ یہاں ایک سے زائد تصاویر بننے کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اگر عینی شاہدین کے بیانات میں تضاد پایا جائے یا پھر دیگر شواہد (Evidence) کچھ مختلف بات پیش کرے تو یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ واقعے کی ایک سے زائد تصاویر سامنے آئیں۔ یہ بالکل بصری التباس (Optical Illusion) کی طرح ہوتا ہے، جس میں ایک ہی تصویر میں مختلف زاویہ نظر سے ایک سے زائد تصاویر نظر آتی ہیں۔ ایسا ہی ایک التباس نیچے کی تصویر میں دیا گیا ہے۔



اس تصویر کو دیکھ کر کوئی پان کھانے والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اگال دان کی تصویر ہے۔ جبکہ دوسرا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دو آدمیوں کی تصویر ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اسے شراب کا جام قرار دے دے۔ اس کا انحصار ہر شخص کے طرز فکر، سماجی بیک گراؤنڈ اور ذہنی ساخت پر ہے۔ بالکل اسی طرح تاریخی راویات کی بنیاد پر حاصل ہونے والی معلومات سے ایک شخص اپنے طرز فکر، سماجی بیک گراؤنڈ اور ذہنی ساخت کے لحاظ سے ایک تصویر بنائے گا اور دوسرا دوسری۔

مثال کے طور پر ہمارے زمانے میں اہم واقعات کی ایک سے زائد توجیہات موجود رہتی ہیں۔ جیسے نائن الیون کے واقعے کے بارے میں بہت سے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ یہ امریکہ اور یہودیوں کی سازش تھی۔ اس کے برعکس امریکیوں کا موقف یہ ہے کہ اس کی ذمہ دار القاعدہ تھی۔ ایسا ہی اختلاف دنیا کے ہر اہم واقعے کے بارے میں موجود رہتا ہے۔

چوتھا مرحلہ: واقعات کے تسلسل کو تاریخ کی شکل میں مرتب کرنا

جب واقعات کو مرتب کر لیا جاتا ہے تو پھر اگلا مرحلہ ان واقعات کے تسلسل اور ان کے باہمی تعلق کو بیان کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کام مورخین کرتے ہیں اور اس کے لیے کتابیں لکھتے ہیں۔ اس طرح سے تاریخ ایک مسلسل عمل کی شکل میں ہمیں نظر آتی ہے۔ مورخ کے ذاتی رجحانات اور تعصبات اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب عالمگیر کی اپنے بھائیوں سے جو جنگیں ہوئیں اور ان کے نتیجے میں وہ سب مارے گئے۔ سیکولر قسم کے مورخین اس پر عالمگیر کے بارے میں طعنہ زنی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اورنگ زیب نے کبھی نماز نہیں چھوڑی اور نہ ہی اپنا کوئی بھائی۔" اس کے برعکس مذہبی مورخین عالمگیر کو پسند کرتے ہیں اور ان جنگوں کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بقا کی جنگ تھی۔ اگر اورنگ زیب اپنے بھائیوں کو قتل نہ کرتا تو وہ اسے قتل کر دیتے۔

اسی طرح تاریخ پاکستان کے مختلف واقعات جیسے قیام پاکستان، 1965 اور 1971 کی جنگیں، قیام بنگلہ دیش، افغان سوویت جنگ، نائن الیون، طالبان امریکہ جنگ اور اسی نوعیت کے دیگر واقعات سے متعلق مختلف مورخین اپنے اپنے تعصبات اور جھکاؤ کے مطابق تاریخی واقعات کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

تاریخی معلومات کی ترتیب و تدوین میں دور جدید اور زمانہ قدیم کے طریق ہائے کار کا موازنہ

ہمارے زمانے کے اہم واقعات کی صورت میں عینی شہادت، آثار و شواہد اور گواہیوں کو یکجا کرنے کا مرحلہ عام طور پر صحافی انجام دیتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اخباری رپورٹرز اور نیوز چینلز کے نمائندے وہاں پہنچ جاتے ہیں اور اس واقعے کو تحریری رپورٹ یا ویڈیو کی شکل میں ریکارڈ کر لیتے ہیں۔ جرم کی صورت میں یہ کام پولیس کرتی ہے اور وہی صحافیوں کو معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کے بعد تصویر کو مکمل کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ یہ کام عام طور پر تجزیہ نگار کرتے ہیں۔ مختلف اخباروں اور ٹی وی چینلز کے تجزیہ نگاروں بھاری معاوضے پر یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ جو واقعہ جتنا اہم ہوتا ہے، اسے اتنی ہی زیادہ کوریج ملتی ہے۔ کم اہم واقعات کو زیادہ کوریج نہیں مل پاتی ہے۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ تجزیہ نگاروں کے درمیان بہت سے واقعات کی تصویر کو مکمل کرنے میں اختلاف رائے پیدا ہو جاتا

ہے۔ اس کے بعد تاریخ کو مدون کرنے کا مرحلہ آتا ہے جو کہ مورخین انجام دیتے ہیں۔ عام طور پر مورخین کا کام واقعے کے کافی عرصہ بعد ہوتا ہے۔ روزانہ بنیادوں پر واقعات کی ریکارڈنگ اور تجزیہ نگاری کا کام تو واقعے کے چند دن کے اندر اندر ہو جاتا ہے لیکن مورخین اپنا کام کافی عرصہ بعد کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر مشہور سیاستدانوں جیسے بھٹو، ضیاء الحق اور بے نظیر بھٹو کے قتل کے واقعات (بالترتیب 2007 ,1988 ,1979) کو لیجیے۔ ان واقعات کی رپورٹنگ کا کام فوری طور پر کیا گیا۔ اب تک تجزیہ نگار، ان پر لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر مورخین نے اپنا کام کافی بعد میں شروع کیا۔ مثلاً تاریخ کی جو کتابیں 1990 کے عشرے میں لکھی گئیں، ان میں بھٹو کے قتل کی تفصیلات موجود ہیں۔ اسی طرح 2000 کے عشرے میں لکھی جانے والی کتب میں ہمیں ضیاء الحق کے قتل کا ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کی تحریر (2012) تک بے نظیر بھٹو کے قتل کے واقعے پر مبنی تاریخ کی کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ ممکن ہے کہ 2020 کے عشرے میں پاکستان کی تاریخ کی جو کتب لکھی جائیں گی، ان میں اس واقعے کا ذکر ہو گا۔

پہلے زمانوں میں یہ سارا کام اس درجے کی تفصیل اور نفاست (Sophistication) سے انجام نہیں دیا جاتا تھا کیونکہ اس زمانے میں نہ تو اخبارات تھے اور نہ ٹی وی چینل، نہ کمپیوٹر تھا اور نہ کیمرہ، نہ صحافیوں کا کوئی الگ طبقہ تھا اور نہ ہی معلومات کو ریکارڈ کرنے کا کوئی انتظام۔ عہد صحابہ میں تو کیفیت یہ تھی کہ کاغذ بھی آسانی سے دستیاب نہ ہوتا تھا بلکہ اسے دور دراز ممالک سے امپورٹ کرنا پڑتا تھا، اس وجہ سے کاغذ نایاب اور مہنگا تھا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر لوگ تاریخی واقعات کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں البتہ اتنا اہتمام کر لیا گیا کہ انہیں لکھا جانے لگا۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب کاغذ عام ہوا تو علم کے پورے ذخیرے کو کتابوں کی صورت میں مدون کر لیا گیا۔

عہد صحابہ کے واقعات پہلی صدی ہجری میں وقوع پذیر ہوئے تھے۔ جو لوگ ان واقعات کے عینی شاہد تھے، ان میں سے بعض نے انہیں اگلی نسل کے سامنے بیان کیا، اس اگلی نسل نے اپنے سے اگلی نسل اور اس نے اپنے سے اگلی نسل کے سامنے یہ واقعات بیان کیے۔ ایسا کم ہی ہوا کہ کسی بیان کرنے والے نے پورے واقعے کو مکمل تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہو بلکہ کسی نے مختصر اً بات بیان کی اور کسی نے کچھ تفصیل سے۔ اس طرح سے یہ واقعات بیان کرنے والوں کے "بیانات" کی صورت میں مرتب ہوئے۔ ان بیانات کو اصطلاح میں "روایت" کہا جاتا ہے اور بیان کرنے والے کو "راوی" کہا جاتا ہے۔ عالم اسلام میں یہ رواج عام ہو گیا کہ ہر روایت کو بیان کرتے ہوئے اس کے راویوں کی پوری سند (Trail) کو بیان کر دیا جائے۔ مثلاً ایک راوی احمد نے زید سے بات سنی، اس زید نے عمرو سے سنی، عمرو نے خالد سے سنی تو احمد اس روایت کو بیان کرنے سے پہلے یہ کہے گا: "زید نے ہم سے یہ روایت بیان کی، انہوں (زید) نے کہا کہ ان سے عمرو نے یہ بیان کیا اور عمرو نے کہا کہ میں نے خالد سے یہ بات سنی۔" اس کے بعد وہ اصل روایت کو بیان کرے گا۔

یہ سب کام زبانی ہو رہا تھا یا زیادہ سے زیادہ اتنا تھا کہ کسی نے اپنی ذاتی ڈائری پر یہ واقعات لکھ رکھے تھے۔ سو برس اسی طرح گزر گئے اور

دوسری صدی ہجری میں کاغذ کا وہ انقلاب آ گیا جس کی تفصیلات ہم آگے بیان کریں گے۔ دیگر علوم کی طرح علم تاریخ پر کتابیں لکھنے کا بھی آغاز ہوا۔ اس زمانے میں بعض ایسے مورخین پیدا ہوئے جنہوں نے تاریخی روایات کو اکٹھا کرنے پر غیر معمولی محنت سے کام کیا اور عالم اسلام کا سفر کر کے جس جس کے پاس جو جو روایتیں موجود تھیں، انہیں اکٹھا کیا۔ یہ لوگ "اخباری" کہلاتے تھے کیونکہ ان کا کام خبروں اور واقعات کو اکٹھا کرنا تھا۔ ان میں محمد بن اسحاق (d. 151/768)، محمد بن عمر الواقدی (d. 207/822)، سیف بن عمر التیمی (d. c. 185/800)، ابو مخنف لوط بن یحیی (d. 170/786)، محمد بن سائب الکلبی (d.c. 185/800) اور ان کے بیٹے ہشام بن محمد الکلبی (d. 204/819) کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب ماہرین حدیث (جنہیں محدثین کہا جاتا ہے) بھی اسی انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مرتب کر رہے تھے۔ یہ احادیث بھی اسی طرح روایات کی شکل میں موجود تھیں۔ ان محدثین نے احادیث نبوی کو مرتب کرنے میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا جبکہ اخباریوں کے طبقے نے اس درجے کی احتیاط کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جس کی وجہ سے تاریخی روایات میں اعلی درجے کا معیار برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی تفصیل کو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

تاریخی معلومات کیسے مسخ ہو جاتی ہیں؟

آپ نے دور جدید اور عہد قدیم تاریخی معلومات کے مرتب کرنے کے پراسیس کا جو مطالعہ کیا ہے، اس کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ یہ بات جان سکتے ہیں کہ اس پورے پراسیس میں بہت سے ایسے خلا (Loopholes) موجود ہیں، جن کی مدد سے تاریخی معلومات مسخ ہو سکتی ہیں۔ یہ کام غیر ارادی طور پر ہوتا ہے اور ارادی طور پر بھی۔ ہم ان دونوں امور کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

غیر ارادی طور پر تاریخی معلومات کا مسخ ہو جانا

آپ نے وہ کھیل تو دیکھا ہو گا جس میں شریک ایک شخص کے کان میں کوئی بات کہی جاتی ہے، وہ یہ دوسرے کے کان میں بیان کرتا ہے اور وہ تیسرے کے، لیکن جب یہ بات آخری شخص بیان کرتا ہے تو بات بالکل تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ جو واقعات تو ایسے ہوں کہ انہیں ہزاروں افراد نے دیکھا ہو، وہ بالکل ٹھیک ٹھیک اگلی نسلوں تک منتقل ہو جاتے ہیں لیکن جن واقعات کے گواہ ایک دو افراد ہی ہوں، ان کی صحیح تصویر اگلی نسلوں تک منتقل نہیں ہو پاتی ہے۔ اس کی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں۔ جیسے کوئی جنگ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہزاروں افراد شریک ہوں گے، جن میں سے اگر آٹھ دس بھی اس جنگ کے واقعہ ہونے کو بیان کر دیں تو بعد کے دور کے مورخین کے لیے تاریخ لکھنے کا کافی مستند مواد دستیاب ہو جائے گا۔ مورخ کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ وہ ان صاحبان کے بیانات کا ایک دوسرے سے موازنہ کر کے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس جنگ کے آغاز میں کسی کمانڈر نے اپنے تین قریبی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر کیا خفیہ پلاننگ کی؟ یہ وہ بات ہے کہ جس تک رسائی بہت ہی مشکل کام ہے۔ ہماری انفارمیشن ایج میں بھی شاید کوئی

صحافی یا مورخ اس کی صحیح تفصیلات بیان نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کے بارے میں تو مورخین میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہوتا ہے لیکن جزوی تفصیلات کے بارے میں ان کے ہاں اکثر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، واقعہ کی تصویر پر گرد پڑتی چلی جاتی ہے اور اس کے بارے میں تحقیق و تفتیش مشکل ہوتی چلی جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ اب سے سو سال بعد ایک مورخ ہمارے زمانے کی تاریخ لکھنا چاہتا ہے۔ اہم واقعات کی رپورٹنگ کا کام ہمارے زمانے کے صحافی کر رہے ہیں اور تجزیہ نگار ان کی تصویر مکمل کرتے جا رہے ہیں۔ سو سال بعد کا مورخ جب ہمارے زمانے کی تاریخ لکھے گا تو اس کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ واقعات کی از سر نو چھان بین کرے کیونکہ اس وقت تک واقعے کے گواہوں میں شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو۔ دیگر قرائن و آثار بھی ضائع ہو چکے ہوں گے۔ مورخ کے لیے صرف اور صرف صحافیوں اور تجزیہ نگاروں کا کیا ہوا کام باقی بچے گا۔ اگر اخبارات اور نیوز چینلز نے اپنے آرکائیوز میں پرانے اخبارات اور خبروں کی ویڈیوز سنبھال کر رکھی ہوں گی تو شاید یہ مورخ کو دستیاب ہو جائیں ورنہ صرف تجزیہ نگاروں کا کام ہی اس مورخ کو مل سکے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تجزیہ نگاروں کی تحریریں یا ویڈیوز اس مورخ کو نہ مل سکیں اور اسے دیگر وسائل جیسے سابقہ مورخین کے کام ہی پر اکتفا کرنا پڑے۔

اس مثال کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ دور جدید کے مورخین کے لیے بھی تاریخ کی تصویر پر پڑی گرد ہٹانا ایک مشکل کام ہے۔ ہمارے پڑوس میں رات کے وقت تنہائی میں کسی کو قتل کر دیا جائے تو بھی ہمارے لیے یہ بہت مشکل ہوتا ہے کہ تمام تر وسائل رکھتے ہوئے ہم صحیح مجرم تک پہنچ جائیں، کجا یہ کہ سینکڑوں برس پہلے کے کسی قتل یا اور واقعے سے متعلق ہم صحیح مجرم تک پہنچ سکیں جب نہ اخبارات تھے اور نہ صحافی، نہ نیوز چینل تھے اور نہ ہی تجزیہ نگار اور کمپیوٹر یا پریس تو بہت دور کی بات، کاغذ بھی پوری طرح دستیاب نہ تھا۔ آج کے اس دور میں جب کمیونی کیشن کا انقلاب آ چکا ہے اور وسائل نقل و حمل اس درجے میں ایجاد ہو چکے ہیں کہ چند گھنٹوں میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے کا سفر ممکن ہے، ہم یہ دعوی نہیں کر سکتے ہیں کہ ہر ہر بات بالکل صحیح طریقے پر ریکارڈ ہو رہی ہے اور بالکل ٹھیک ٹھیک اگلی نسلوں تک منتقل ہو رہی ہے۔ پھر یہ دعوی پرانے زمانے کے بارے میں کرنا کیسے ممکن ہے؟

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ محض غلط فہمی کی وجہ سے بات صحیح طور پر منتقل نہیں ہو پاتی۔ ایک شخص اس واقعے یا بات کو صحیح سمجھ نہیں سکا اور اپنی ناقص فہم کو اس نے آگے منتقل کر دیا۔ بعد میں یہ بات کتب تاریخ کا حصہ بن گئی۔

جان بوجھ کر تاریخی معلومات کا مسخ کیا جانا

اوپر دی گئی تفصیلات سے ہم یہ جان چکے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محض غلط فہمی یا لاپرواہی یا معلومات کی کمی کے باعث تاریخی معلومات صحیح طور پر اگلی نسلوں کو منتقل نہیں ہوتیں۔ اس عمل میں اس وقت زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے جب کوئی شخص یا گروہ اپنے شخصی یا گروہی مفادات کے تحت جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کرے۔ سیاسی معاملات میں چونکہ لوگ اقتدار کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں، اس وجہ سے وہ تاریخ کو بھی محض اپنا ہتھیار ہی سمجھتے ہیں اور

اسے مسخ کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں متعدد سیاسی جماعتیں وجود پذیر ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ اقتدار اسے نصیب ہو۔ اس دور کی سیاسی جماعتوں کو ہم اپنے دور کی پارٹیوں پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ اس زمانے میں جو بھی اقتدار کا خواہش مند ہوتا، اس کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ بغاوت برپا کرے اور لڑ جھگڑ کر اقتدار حاصل کر لے۔ ہر پارٹی کی کوشش یہ تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت حاصل کر لے تاکہ اسے سیاسی کارکن دستیاب ہو سکیں۔ اس کے لیے ہر پارٹی نے اپنے مقاصد کے حصول کے پراپیگنڈا کا ہتھیار استعمال کیا۔ ہٹلر کے قریبی ساتھی اور اس کی پراپیگنڈا مشینری کے انچارج گوئبلز کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ جھوٹ کو اتنی مرتبہ بولو کہ لوگ اسے سچ مان لیں۔ پراپیگنڈا گوئبلز کی ایجاد نہیں ہے بلکہ ہزاروں برس سے لوگ اسی قول پر عمل کرتے آئے ہیں جن میں مسلمانوں کی پہلی دو صدیوں کی سیاسی پارٹیاں بھی شامل ہیں۔

دوسری صدی ہجری میں جن لوگوں میں تاریخ دانی کا شوق پیدا ہوا، وہ بالعموم انہی میں سے کسی ایک پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے سیاسی تعصبات کے مطابق سچی جھوٹی ہر قسم کی روایات اکٹھی کیں اور ان پر کتابیں لکھیں۔ ان متعصب مورخین کو اس سے غرض نہ تھی کہ بات مستند ہے یا نہیں، انہیں تو اپنی تصویر مکمل کرنا تھی اور اس کے لیے انہیں جو بھی رطب و یابس ملا، قبول کر کے انہوں نے اپنے ذہن کے مطابق تصویر مکمل کرنے کی کوشش کی۔ بعد میں جب تاریخ طبری اور دیگر کتب لکھی گئیں، تو یہی سچی جھوٹی روایتیں ان کا حصہ بھی بن گئیں۔ اس کے بعد ہر ہر گروہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق جب تاریخ کی کوئی تصویر بنانا چاہتا ہے تو اسے اس کا پورا مصالحہ انہی تاریخی کتب سے مل جاتا ہے۔

تاریخ سے متعلق یہ تمام حقائق ہم اپنے پاس سے بیان نہیں کر رہے ہیں بلکہ علم التاریخ کے بانی ابن خلدون (732-808/1332-1405) نے بھی یہی بات کہی ہے۔ اپنے شہرہ آفاق مقدمہ تاریخ میں لکھتے ہیں:

> چونکہ خبر میں جھوٹ اور سچ کا امکان ہوتا ہے، اس لیے تاریخ میں بھی جھوٹ اور سچ اور غلطی کا احتمال (Probability) رہتا ہے۔ تاریخ میں غلطیوں کے کئی اسباب ہوتے ہیں:
>
> پہلا سبب اختلاف آراء و نقطہ ہائے نظر ہے۔ جب ذہن راہ اعتدال پر ہوتا ہے اور کوئی بات سنتا ہے تو اس کی تحقیق کرتا ہے اور اس میں غور و فکر کرتا ہے یہاں تک کہ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ خبر سچی ہے یا جھوٹی۔ لیکن جب ذہن کسی رائے یا نقطہ نظر میں ڈوبا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس خبر کو درست مان لیتا ہے جو اس کی رائے یا نقطہ نظر کے موافق ہو کیونکہ اس کی بصیرت پر تعصب و محبت کی پٹی بندھی ہوتی ہے جو اسے تحقیق و تنقید سے روک دیتی ہے۔ اب وہ جھوٹی خبر قبول کر کے غلطی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس جھوٹی خبر کو بلا تامل آگے نقل کر دیتا ہے۔
>
> دوسرا سبب نقل کرنے والوں پر بھروسہ ہے کہ اس کے خیال میں وہ قابل اعتماد ہیں اور غلط بیانی ان کے شایان شان نہیں ہے۔ اس وجہ سے وہ جرح و تعدیل کے اصول پر ان کے احوال کی جانچ پڑتال نہیں کرتا ہے۔

تیسرا سبب مقصد سے لاپرواہی ہے۔ بہت سے راوی اپنی مشاہدہ کی ہوئی یا سنی ہوئی خبروں کے اغراض و مقاصد سے آگاہ نہیں ہوتے ہیں۔ وہ محض اپنے گمان اور اٹکل پچو کی بنیاد پر روایت کر دیتے ہیں۔ اس لیے وہ غلطی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

چوتھا سبب کسی خبر کے بارے میں سچا ہونے کا وہم ہے۔ یہ کئی طرح سے پیدا ہوتا ہے۔ زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ راویوں پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خبروں کو (اس دور کے) دیگر خارجی واقعات سے میچ نہیں کیا جاتا ہے تاکہ اس خبر اور دیگر واقعات میں مطابقت (Reconciliation) پیدا ہو جائے۔ اس تطبیق سے عدم واقفیت کے باعث جعلی اور من گھڑت باتوں کو بھی فروغ حاصل ہو جاتا ہے اور صحیح و غلط کی تمیز نہیں رہتی ہے۔ سننے والا خبر کو جوں کا توں نقل کر دیتا ہے حالانکہ وہ جعلی ہونے کے سبب سچائی سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔

پانچواں سبب معزز اور بڑے لوگوں کی خوشامد کر کے انہیں خوش کرنا اور ان کا قرب حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اکثر خوشامدی لوگ بڑے لوگوں کی ہر بات خوبصورت رنگ میں رنگ کر اسے پھیلا دیتے ہیں اور س طرح وہ جھوٹی خبریں دنیا میں پھیل جاتی ہیں کیونکہ انسان کو فطری طور پر اپنی تعریف اچھی لگتی ہے۔ لوگ دنیا اور اس کے مال و متاع کے انتہائی حریص ہوتے ہیں اور حقیقی فضیلت اور اہل فضیلت کو نہیں چاہتے ہیں۔

چھٹا سبب جو مذکورہ بالا تمام اسباب سے زیادہ اہم ہے، اس معاشرے کے احوال سے ناواقفیت ہے (جس کی وہ خبر ہو۔) ہر زمانے کا ایک مخصوص ماحول (Ethos) ہوتا ہے اور اس زمانے کے ہر واقعے کے لیے، اس زمانے کی خصوصیات سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔ اگر خبر سننے والا، اس ماحول کے تقاضوں اور واقعات کی مخصوص خصوصیات سے باخبر ہو تو اسے اس خبر کی تحقیق میں بڑی مدد ملے گی۔۔۔۔

بعض اوقات لوگ بالکل ہی محال و ناممکن خبروں پر یقین کر کے انہیں نہ صرف مان لیتے ہیں بلکہ دوسروں سے روایت بھی کر دیتے ہیں۔ لوگ ان سے یہ خبریں نقل کرتے چلے آئے ہیں۔[24]

اس کے بعد ابن خلدون نے تاریخ کی سابقہ کتب سے بعض مثالیں نقل کی ہیں جیسے اسکندر یونانی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اس نے اسکندریہ شہر آباد کرنا چاہا تو سمندری بلاؤں نے اس کی مخالفت کی۔ اس نے شیشے کا ایک صندوق بنوایا اور اس میں بیٹھ کر سمندر میں اترا۔ یہاں اس نے تہہ میں موجود کچھ شیطانی جانوروں کی تصاویر کھینچ لیں اور واپس آکر ان کے مجسمے بنوا کر ساحل پر لگوا دیے۔ بلائیں جب رکاوٹ ڈالنے آئیں تو ڈر کر بھاگ گئیں اور اس طرح اسکندریہ کے شہر میں رکاوٹ دور ہو گئی۔ اس قسم کی بہت سی داستانیں داستان گو حضرات نے محض اس لیے گھڑیں کہ ان کی مدد سے وہ لوگوں کو محظوظ کر سکیں۔ بعض مورخین نے زیادہ تردد کیے بغیر انہیں بھی کتب تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

---

[24] ابن خلدون، مقدمہ 1/46۔ الکتاب الاول: فی طبیعۃ العمران۔ بیروت: دار الفکر۔ (ac. 30 Sep 2006) www.waqfeya.net

تاریخی معلومات کیسے منتقل ہوتی ہیں؟

تواتر اور انفرادی رپورٹس *(Perpetuity and Solitary Reports)*

عہد صحابہ بلکہ ہر دور ہی سے متعلق معلومات ہمیں بالعموم دو شکلوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک شکل تواتر (Perpetuity) کہلاتی ہے جبکہ دوسری خبر واحد (جمع اخبار احاد) یعنی انفرادی رپورٹس(Solitary Reports)۔ تاریخ میں کسی بھی قسم کی معلومات (Information)، خواہ وہ مذہبی ہوں یا نہ ہوں، کو دوسرے لوگوں اور اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے بنیادی طور پر یہی دو طریقے استعمال ہوئے ہیں۔ تواتر سے مراد وہ طریقہ ہے جس کے مطابق کسی خبر کو ہر دور میں اتنے زیادہ افراد بیان کرتے ہوں کہ اس کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اس کے برعکس خبر واحد وہ طریقہ ہے جس کے مطابق کسی خبر کو ایک دو یا چند افراد بیان کرتے ہوں اور ان کے بیان میں غلطی یا شک و شبہ کی گنجائش باقی رہ جائے۔

تواتر کی مثال یوں پیش کی جاسکتی ہے کہ امریکہ میں گیارہ ستمبر 2001 کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر تباہ ہو گیا۔ یہ واقعہ رونما ہوتے ہی اس کی خبر دنیا بھر کے ٹی وی چینلز، اخبارات اور انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا بھر میں پھیل گئی۔ اس واقعے کو موقع پر جا کر ہزاروں افراد نے دیکھا اور بیان کر دیا۔ اس معاملے میں دنیا بھر میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا کیونکہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اب سے پندرہ بیس برس تک کے بعد اس واقعے کو دنیا بھر کے اربوں افراد اپنی آنے والی نسل کو سنائیں گے، اس واقعے کے بارے مضامین لکھے جاتے رہیں گے، ویڈیو فلمیں دیکھی جاتی رہیں گی اور اس کا تذکرہ ہوتا رہے گا۔ ہمارے بعد والی نسل کے افراد انہی طریقوں سے ان معلومات کو اپنے سے اگلی نسل میں منتقل کریں گے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب سے ہزار سال بعد بھی اس بات میں کوئی شک و شبہ موجود نہیں ہو گا کہ 11 ستمبر 2001 کو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر جہازوں کے ٹکراؤ سے تباہ ہو گئے تھے۔ یہ پورا پراسیس "تواتر" کا عمل کہلاتا ہے۔

اس ذریعے سے حاصل ہونے والی معلومات حتمی اور قطعی ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں کسی شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم لوگ پوری قطعیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ 1947 میں برصغیر آزاد ہوا تھا، 1857 میں برصغیر میں جنگ آزادی ہوئی تھی، سولہویں صدی عیسوی میں اکبر نام کا ایک بادشاہ ہندوستان پر حکومت کرتا تھا، پندرہویں صدی میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا، بارہویں صدی میں صلاح الدین ایوبی نے صلیبی جنگیں لڑی تھیں، ساتویں صدی میں سانحہ کربلا وقوع پذیر ہوا تھا، اور اسی ساتویں صدی کے عرب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس وقت کی مہذب دنیا کا بڑا حصہ فتح کر لیا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں فلسطین میں سیدنا مسیح علیہ الصلوۃ والسلام نے دین حق کا علم بلند کیا تھا، 1400 قبل مسیح میں سیدنا موسی علیہ الصلوۃ والسلام کے مقابلے پر آنے والا فرعون سمندر میں غرق ہو گیا تھا، 2000 قبل مسیح میں سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام نے نمرود کی خدائی کو چیلنج کیا تھا، اور اس سے بھی کہیں پہلے سیدنا نوح علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے میں زمین پر

ایک بہت بڑا سیلاب آیا تھا۔ یہ وہ معلومات ہیں، جن کا کوئی ذی عقل اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے انکار نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی ان حقائق کا انکار کرتا ہو تو وہ سورج کے روشن ہونے، دن اور رات کی تبدیل ہونے اور زمین کے گول ہونے کا بھی انکار کر سکتا ہے۔

ہمارے علمی ذخیرے میں ایسی بہت سی معلومات ہیں جو تواتر کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا ضرور ہو سکتا ہے کہ بعض معلومات کے منتقل کرنے کا سلسلہ اگلی نسلوں میں پہنچ کر کسی وجہ سے منقطع ہو جائے اور یہ تواتر ٹوٹ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے بادشاہوں کے وجود اور زمانوں کے بارے میں تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ ان معلومات کی اتنی اہمیت نہ تھی کہ کوئی انہیں محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتا۔ اس کے برعکس انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور بعض دیگر مذاہب کے بانیوں کے بہت سے واقعات تواتر کے ساتھ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں کیونکہ ان کی اہمیت کے پیش نظر انہیں محفوظ رکھنے کا بھرپور اہتمام کیا گیا تھا۔ یہی اہتمام تواتر کہلاتا ہے۔

تاریخ میں بہت سی معلومات ہمیں خبر واحد (ایک دو افراد کی دی ہوئی خبر) کی صورت میں بھی ملتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کا منظر کسی عینی شاہد نے دیکھا۔ اس نے اپنے ذہن میں موجود تفصیلات کو کسی دوسرے تک منتقل کر دیا۔ دوسرے شخص نے ان معلومات کو تیسرے تک، تیسرے نے چوتھے تک اور چوتھے نے پانچویں شخص تک منتقل کر دیا اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان معلومات میں اس قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں کہ اس نے جہازوں کے ٹکرانے سے پہلے کسی شخص کو مشکوک انداز میں اس عمارت سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا، سب سے پہلے 79 ویں منزل تباہ ہوئی تھی، پچاسویں منزل پر موجود فلاں شخص کس طرح زندہ بچا، وغیرہ وغیرہ۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا تباہ ہونا تو تواتر سے ثابت ہے لیکن اس کی جزوی تفصیلات خبر واحد سے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی واقعے کے بارے میں مختلف اخبارات کی خبروں میں جزوی سا فرق پایا جاتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد ایک دو انسانوں کے مشاہدے اور یاد رکھنے پر ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے اخبارات کسی بھی بڑے واقعے کی جب رپورٹنگ کرتے ہیں تو ان میں اس کے بارے میں بعض تفصیلات میں اختلاف موجود ہوتا ہے۔ کسی حادثے کی صورت میں مرنے والے یا زخمی ہونے والوں کی تعداد کیا تھی، حادثے میں قصور کس کا تھا، جیسے معاملات میں اخباری رپورٹرز کے بیانات کے فرق کی وجہ سے مختلف اخبارات مختلف معلومات دیتے ہیں جبکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رونما ہوا ہے۔ یہ چیز بھی عام مشاہدے میں دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک شخص دوسرے کے سامنے واقعے کو بالکل درست بیان کر دیتا ہے لیکن دوسرا تیسرے کے سامنے بیان کرتے وقت اپنے کسی مفاد کے تحت، یا پھر محض غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے اس میں کچھ کمی بیشی بھی کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کانوں کان بات پہنچانے کے کھیل میں جب اصل جملہ آخری فرد سے پوچھا جاتا ہے تو اس کا جواب اصل جملے سے خاصا مختلف ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں تواتر سے حاصل ہونے والی معلومات سو فیصد قطعی اور یقینی (Confirm) ہوتی ہیں اور ان میں کسی قسم کے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس خبر واحد سے حاصل ہونے والی معلومات سو فیصد یقین کے درجے پر نہیں پہنچتیں

بلکہ ان میں کسی نہ کسی حد تک شک وشبہ پایا جاتا ہے۔ اس شک وشبہ کو تحقیق کے طریقوں سے کم از کم سطح پر لایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے اصول حدیث کا فن ایجاد کیا تاکہ خبر واحد سے حاصل کردہ معلومات کو پرکھا جاسکے۔

تواتر سے حاصل کردہ معلومات میں کسی قسم کی ہیرا پھیری کرنا ممکن نہیں ہوتا جبکہ انفرادی روایتوں میں جان بوجھ کر حقائق کو مسخ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ہمارے دور سے متعلق کبھی بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکے گا کہ مثلاً نائن الیون تو کبھی ہوا ہی نہیں یا امریکہ نے تو کبھی افغانستان یا عراق پر حملہ نہیں کیا۔ ہاں جزوی واقعات سے متعلق غلط بیانی کی جاسکتی ہے۔ جیسے اگر امریکیوں کے لٹریچر کا جائزہ لیا جائے تو وہ نائن الیون کا الزام مسلمانوں پر دھرتے ہیں جبکہ مسلمان اس کا الزام یہودیوں یا خود امریکیوں پر دھرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اب سے پانچ سو یا ہزار برس بعد تک یہی اختلاف موجود رہے۔

تواتر کے معاملے میں ایک ایسی صورت ہے جس میں گڑبڑ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مصنوعی سا تواتر پیدا کر دیا جائے۔ یہ پروپیگنڈا کے اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے آج کوئی شخص A قتل ہو جائے تو اس کا کوئی دوست B یہ دعوی کر دے کہ شخص C اس کا قاتل تھا۔ اس کے بعد وہ اس بات کی تشہیر کر دے، میڈیا پر بیان دے اور اخبارات میں خبریں چھپوائے۔ اس کی بات پر یقین کر کے اور دس بیس لوگ یہی بات دوہرانے لگ جائیں اور پانچ دس سال بعد یہ لوگ تعداد میں اتنے زیادہ ہو جائیں کہ ان کی بات پر تواتر کا گمان ہونے لگے۔ بعد میں کوئی مورخ اسی کی بنیاد پر اگر اپنی کتاب میں یہ لکھ دے کہ C نے A کو قتل کیا تھا تو بات پوری طرح پھیل جائے گی اور لوگ بلا تامل اسے مان لیں گے۔

ایسے مصنوعی تواتر کی جانچ پڑتال آسان ہے کیونکہ اگر B کے زمانے میں اس کے دعوے سے ہٹ کر دیگر وسائل سے اس واقعے کا جائزہ لیا جائے گا تو بات واضح ہو جائے گی کہ سوائے اس ایک شخص کے اور کوئی یہ بات نہیں کہتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تواتر کا یہ دعوی بے بنیاد ہے اور مصنوعی قسم کا تواتر پیدا کیا گیا ہے۔

عہد صحابہ کی تاریخ کے کون سے واقعات تواتر سے منقول ہیں اور کون سے اخبار احاد سے؟

عہد صحابہ کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات تواتر سے منقول ہیں جیسے خلفاء راشدین کون کون تھے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتدین سے جنگیں ہوئیں اور روم وایران سے جنگوں کا آغاز ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں روم اور ایران کو شکست دی گئی اور یہ اعلی درجے کی خوشحالی کا دور تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت نیک دل خلیفہ تھے اور باغیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں خانہ جنگیاں ہوئیں۔ حضرت حسن نے معاویہ رضی اللہ عنہما سے صلح کر لی وغیرہ وغیرہ۔

انہی واقعات کی جزوی تفصیلات ہمیں اخبار احاد کے ذریعے ملتی ہیں۔ ان میں سچی جھوٹی ہر قسم کی روایات شامل ہیں۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ یا دیگر صحابہ کے اپنے ساتھیوں سے کیا مشورے ہوئے؟ آپ کی بیعت کن حالات میں ہوئی؟ جنگ جمل وصفین کے اسباب کیا تھے؟ یہی وہ تفصیلات ہیں جن میں ہمیں بے شمار تضادات اور اختلافات ملتے ہیں۔

اخبار احاد میں سند اور متن کی اہمیت کیا ہے؟

علم روایت میں کسی بھی انفرادی روایت کے دو حصے مانے جاتے ہیں: ایک حصہ اس کی سند اور دوسرا متن۔ "سند" سے مراد وہ حصہ ہوتا ہے جس میں تاریخ کی کتاب کے مصنف (Compiler) سے لے کر واقعے کے عینی شاہد تک کے تمام راویوں (روایت بیان کرنے والوں) کی مکمل یا نامکمل زنجیر (Chain of Narrators) کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ اس کی مثال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور یہاں دوبارہ بیان کر رہے ہیں: "زید نے ہم سے لکھ کر بیان کیا، انہوں نے کہا کہ انہوں نے خالد سے یہ بات سنی۔ خالد نے کہا کہ انہوں نے اسلم سے یہ بات سنی اور اسلم نے کہا کہ میں نے یہ واقعہ ہوتے دیکھا: ۔۔۔۔" سند کے بعد روایت کا متن شروع ہوتا ہے جو کہ روایت کا اصل حصہ ہوتا ہے جس میں اصل واقعہ بیان کیا گیا ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں تاریخی تحقیق (Historical Method) کے ماہرین سند اور متن دونوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور یہ جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ روایت کس حد تک قابل اعتماد ہے۔ یہاں ہم اسی طریقہ کار کی تفصیل بیان کر رہے ہیں تاکہ اس طریقہ کار کو سیکھ کر اس کا اطلاق عہد صحابہ سے متعلق معلومات سے کیا جا سکے۔

تاریخی روایات کی جانچ پڑتال کا طریقہ کیا ہے؟

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے سیاسی مفادات کے لیے روایات ایجاد کیں اور انہیں پروپیگنڈا کے ذریعے پھیلا دیا۔ ان میں سے بہت سی روایات کتب تاریخ کا حصہ بن گئیں اور سچ کے ساتھ جھوٹ کی آمیزش ہو گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جھوٹ کو سچ سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے تاکہ ہم واقعات کی صحیح تصویر تک پہنچ سکیں؟

مثل مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ جھوٹ گھڑنے والا کوئی نہ کوئی ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے جس کی وجہ سے اس کا جھوٹ پکڑا جاتا ہے۔ اس کے بیان میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ سچ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے جبکہ جھوٹ متعدد ہو سکتے ہیں۔ اس کی ایک مثال وہ مشہور واقعہ ہے جس میں ایک راوی (Narrator) نے بیان کیا کہ میں نے فلاں شخص سے یہ حدیث سنی ہے۔ سامعین میں ایک بڑے محدث بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوچھا: "آپ کی عمر کتنی ہے؟" بولے: "اسی سال۔" محدث نے کہا: "پھر آپ یہ حدیث ان صاحب سے نہیں سن سکتے کیونکہ وہ آپ کی پیدائش سے دس برس پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔" اسی طرح کسی عباسی خلیفہ کے زمانے میں خیبر کے یہودیوں نے ایک دستاویز پیش کی جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کچھ حقوق عطا فرمائے تھے۔ وقت کے ایک محدث نے اس دستاویز کو دیکھتے ہی جعلی قرار دیا کیونکہ اس میں بطور گواہ حضرت سعد بن معاذ اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے دستخط تھے۔ ان میں سے ایک صحابی اس واقعے سے پہلے ہی شہید ہو چکے تھے اور دوسرے ابھی ہجرت کر کے مدینہ نہیں آئے تھے۔

علم تاریخ کے محققین نے اس مقصد کے لیے ایک طریقہ کار وضع کیا ہے جسے " تاریخی تحقیق کا طریقہ (Historical Method)" کہا

جاتا ہے۔ اس طریقہ تحقیق کے اصول ہم یہاں اس کے ماہرین کے حوالے سے بیان کر رہے ہیں۔ تفصیل کے لیے آپ کسی بھی انسائیکلوپیڈیا میں Historical Method کا عنوان دیکھ سکتے ہیں۔[25] بنیادی طور پر تاریخی معلومات کی جانچ پڑتال کے لیے چار اعتبار سے تحقیق کی جاتی ہے:

- ماخذ کی تحقیق (Source Criticism)
- داخلی تحقیق (Internal Criticism)
- خارجی تحقیق (External Criticism)
- تاریخی وجوہات کا تجزیہ (Historical Reasoning)

اب ہم انہیں ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں۔

ماخذ کی تحقیق *(Source Criticism)*

اس تحقیق میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ تاریخی معلومات کا ماخذ (Source) کیا ہے اور وہ کس درجے میں قابل اعتماد ہے؟ یہ معلومات محض سنی سنائی ہیں یا ان کے لیے ٹھوس ثبوت موجود ہیں؟ کیا ان معلومات کا ماخذ ایک ہی شخص ہے یا متعدد افراد ہیں؟ اگر متعدد ہیں تو ان کے درمیان کوئی باہمی تعلق تو نہیں؟ کیا معلومات کے یہ مآخذ متعصب تو نہیں۔ اگر بہت سے مآخذ سے متفقہ طور پر ایک ہی بات سامنے آ رہی ہو، تو یہ مان لیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہے۔ علم حدیث کی اصطلاح میں اسے "تواتر (Perpetuity)" کہا جاتا ہے۔ جیسے شہادت عثمان رضی اللہ عنہ یا سانحہ کربلا کا وقوع پذیر ہونا بے شمار مآخذ سے ثابت ہے۔ اگر مختلف افراد اس واقعے کے بارے میں متضاد باتیں پیش کر رہے ہوں تو تاریخی تحقیق کے ماہر کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کس شخص کی بات درست ہے؟ اس ترجیح کے اصول یہ ہوتے ہیں:

- اگر ایک شخص واقعے کا عینی شاہد ہے اور دوسرے نے کسی اور سے سن کر بات بیان کی ہے، تو عینی شاہد کی بات کو ترجیح ہو گی۔ مثلاً ایک شخص جنگ جمل میں شریک تھا، اس کا بیان اس شخص کی نسبت کہیں اہمیت رکھے گا جو سو سال بعد پیدا ہوا۔
- اگر ایک شخص واقعے سے متعلق کسی قسم کا تعصب رکھتا ہے اور دوسرا تعصب نہیں رکھتا، تو غیر متعصب کو ترجیح حاصل ہو گی۔ جیسے کسی جنگ میں فریقین کے فوجیوں کی نسبت آزاد مبصرین اور صحافیوں کی بات کو ترجیح دی جاتی ہے۔
- اگر ایک شخص کی بات کی تصدیق دوسرے آزاد ذرائع سے بھی ہو جاتی ہے، تو اس کی بات کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گی۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنے بیان میں محض منفرد ہے اور اس کے بیان کی تصدیق دوسرے آزاد ذرائع سے نہیں ہوتی، تو اس کی بات کی اہمیت کم ہو گی۔ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تصدیق کرنے والے ذرائع کا آزاد ہونا ضروری ہے۔ مثلاً

[25] Wikipedia. Article: Historical Method. en.wikipedia.org/wiki/Historical_method. ac. 16 Feb 2012

اگر ایک واقعے کو پانچ افراد A, B, C, D, E بیان کرتے ہیں۔ ان میں تین افراد A, B, C کا بیان ملتا جلتا ہے جبکہ دو افراد D, E کا بیان ان سے مختلف ہے مگر وہ آپس میں متفق ہیں۔ اب محض اس وجہ سے پہلے تین افراد کے بیان کو ترجیح حاصل نہ ہو گی کہ وہ اکثریت میں ہیں۔ یہ دیکھا جائے گا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تعلق تو نہیں رکھتے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تینوں ایک ہی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں؟ یا B, C دونوں کہیں A کے شاگرد تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ان کی گواہی کو تین نہیں بلکہ ایک فرد کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔

- اگر ایک فریق کی بات کی تصدیق دیگر ثبوتوں جیسے فنگر پرنٹس، DNA یا اسی نوعیت کی کسی اور چیز سے ہوتی ہے، تو اس کی بات قابل ترجیح ہو گی۔
- اگر کسی ایک فریق کی بات کو ترجیح دینا ممکن نہ ہو، تو پھر مورخ اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے تحقیق کے دیگر طریقے اختیار کرے گا جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔[26]

داخلی تحقیق *(Internal Criticism)*

جو تاریخی روایت مل رہی ہے، اس کے متن کا تجزیہ کر کے دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس حد تک قابل اعتماد ہے۔ چونکہ یہ تحقیق متن کے اندرونی تجزیے سے متعلق ہوتی ہے، اس وجہ سے اسے داخلی تحقیق کہا جاتا ہے۔ اس میں درج ذیل ٹیسٹ کیے جاتے ہیں:

- معلومات پر مبنی جو رپورٹ ہے، کیا اس کے اندر کوئی اندرونی تضاد موجود ہے؟
- جو شخص رپورٹ دے رہا ہے، کیا وہ عینی شاہد ہے یا اس نے کسی اور سے سن کر یہ معلومات لکھی ہیں؟ اگر یہ زبانی روایت ہے تو پھر کیا اس کی سند (Chain of Narrators) مکمل ہے یا نامکمل؟ کیا یہ تمام کے تمام راوی قابل اعتماد ہیں یا نہیں؟
- اس شخص نے واقعے کی رپورٹ کب اور کہاں بیان کی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ واقعے کی رپورٹ پچاس سال بعد بیان کر رہا ہے جب اس کے دیگر عینی شاہدین دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں؟
- اس شخص نے وہ رپورٹ کن اشخاص کے سامنے بیان کی ہے؟ کیا وہ ان پر اثر انداز ہونا چاہتا تھا یا پھر محض معلومات کی منتقلی ہی اس کا مقصد تھا؟
- جو بیان وہ دے رہا ہے، کیا وہ عقلاً ممکن ہے؟ جیسے آج کل کا کوئی شخص اگر یہ دعوی کرے کہ اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے اور کوئی حدیث بیان کرے تو یہ عقلاً محال ہے۔

[26] Bernheim (1889) and Langlois & Seignobos (1898). *Wikipedia. Article: Historical Method.* http://en.wikipedia.org/wiki/Historical_method. ac. 16 Feb 2012

- جس واقعے کے بارے میں وہ شخص بیان دے رہا ہے، کیا اسے سمجھنے کے لیے کسی خصوصی مہارت کی ضرورت ہے؟ جیسے کسی تاریخی شخصیت کی بیماری کو کوئی طبیب ہی صحیح طور پر بیان کر سکتا ہے۔[27]

خارجی تحقیق (External Criticism)

اس قسم کی تحقیق میں تاریخی معلومات کے متن سے ہٹ کر دیگر بیرونی ذرائع سے ان معلومات کی تحقیق کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے خارجی تحقیق کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ ٹیسٹ شامل ہوتے ہیں:

- معلومات کو کب بیان کیا گیا؟ کیا انہیں اصل واقعے کے فوراً بعد بیان کیا گیا یا کافی عرصہ بعد؟
- معلومات کہاں مرتب کی گئیں؟ کہیں معلومات کسی ایسے علاقے میں مرتب تو نہیں کی گئیں جو اس واقعے سے متعلق کسی متعصب فریق کا گڑھ تھا؟
- معلومات کس شخص نے مرتب کیں؟ کہیں وہ کسی متعصب گروہ سے تعلق تو نہیں رکھتا تھا؟
- معلومات کیا براہ راست ماخذ (Primary Source) سے حاصل کی گئی ہیں یا پھر کسی ثانوی ماخذ (Secondary Source) سے؟ اگر یہ ثانوی ماخذ سے حاصل کی گئی ہیں تو اس کا درجہ کیا ہے؟
- کیا معلومات اپنی اصل حالت میں ہیں یا اس میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے؟
- کیا لوگ طویل عرصے تک ان معلومات کو اسی طرح سے مانتے آئے ہیں یا کسی دور میں ان کا انکار بھی کیا گیا ہے؟
- کیا ان معلومات کا تاریخی تجزیہ کرنے کی پہلے بھی کوشش کی گئی ہے یا انہیں بغیر تحقیق کے محض عقیدت مندی یا تعصب میں بس مان لینے کا رجحان رہا ہے؟
- دیگر قرائن و آثار سے ان معلومات کی تصدیق (Corroboration) ہوتی ہے یا نہیں؟[28]

ان میں سے پہلے چار اصولوں کو بالائی تحقیق (Higher Criticism) اور بقیہ دو کو زیریں تحقیق (Lower Criticism) کا نام دیا جاتا ہے۔

تاریخی اسباب و علل کی تحقیق (Historical Reasoning)

اس طریقہ کار میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ زیر تحقیق تاریخی معلومات دیگر تاریخی معلومات اور حالات سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔ تاریخ

---

[27] R. J. Shafer. Ibid.
[28] Garrakhan. Ibid.

میں واقعات کا ایک تسلسل ہوتا ہے جس میں اسباب اور علل کی ایک زنجیر (Cause-and-effect chain) رونما ہو رہی ہوتی ہے۔ اگر ایک واقعہ اس زنجیر میں سرے سے فٹ ہی نہ بیٹھتا ہو تو اس کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ زیر تحقیق واقعے کے اسباب اور وجوہات تلاش کی جاتی ہیں، پھر ان کے نتائج پر غور کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی واقعہ غیر متوقع ہو، تو اس سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جاتی ہیں تا کہ کسی نتیجے پر پہنچا جا سکے۔ ابن خلدون (732-808/1332-1405) چونکہ علم التاریخ کے بانی ہیں، اس وجہ سے انہوں نے بھی اس معیار کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> خبروں کی تحقیق معاشرے کی طبیعت (Ethos) کو سمجھنے پر موقوف ہے اور تحقیق کا یہ طریقہ انتہائی قابل اعتماد اور اچھا ہے۔ اس سے سچی اور جھوٹی خبروں میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ اگرچہ خبروں کی سچائی، راویوں کی دیانت داری سے بھی معلوم ہو جاتی ہے لیکن اس دیانت داری کی حیثیت ثانوی ہے جبکہ معاشرے کے طبعی حالات سے تحقیق کا درجہ مقدم ہے۔ راویوں کی دیانت داری کی تحقیق تو تب کی جائے گی جب خبر میں سچائی کا امکان ہو۔ جب خبر ہی ناممکن اور بعید از عقل ہو تو پھر جرح و تعدیل سے کیا فائدہ ہے۔ بعض عقل مند لوگوں نے خبر کے سلسلے میں ایک طریقہ یہ نکالا ہے کہ الفاظ سے ناممکن معانی لے لیے جائیں یا پھر عقل سے خارج ہو کر اس واقعے کی کوئی تاویل گھڑ لی جائے۔ شرعی اخبار و آثار میں راویوں کی جانچ پڑتال ضروری ہے تا کہ کم از کم ان کی سچائی کا غالب گمان تو ہو۔[29]

کیا یہ تحقیق ہر تاریخی واقعے سے متعلق کی جاتی ہے؟

اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر تاریخی واقعے سے متعلق اتنی معلومات دستیاب نہیں ہوتی ہیں کہ اوپر بیان کردہ تمام پروسیجرز کا اطلاق اس پر کیا جا سکے۔ عام تاریخی واقعات کے بارے میں اگر کوئی اختلاف سامنے نہ آئے تو انہیں زیادہ تحقیق کے بغیر قبول کر لیا جاتا ہے۔ تفصیلی تحقیق عام طور پر ان واقعات کی ہوتی ہے جن سے کوئی بڑا علمی، سیاسی یا مذہبی اختلاف پیدا ہو رہا ہو۔ چھوٹے موٹے واقعات کی صورت میں ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے کسی سفر کے دوران کسی بادشاہ نے کہاں پڑاؤ ڈالا؟ اس نے کسی شخص کو کیا انعام دیا؟ بادشاہ کی شادی کس خاتون سے ہوئی؟ اس قسم کے عام معاملات میں زیادہ تحقیق نہیں کی جاتی ہے لیکن اہم تاریخی واقعات، جن کے بارے میں کوئی بڑا اختلاف موجود ہو، کے بارے میں یہ تحقیقات کی جاتی ہیں۔ جیسے کوئی بڑی جنگ کیوں ہوئی؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس کے نتائج کیا نکلے؟ وغیرہ وغیرہ۔

حدیث اور تاریخ سے متعلق تحقیق میں کیا فرق ہے؟

حدیث چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق معلومات کا ریکارڈ ہے، اس وجہ سے اس کے معاملے میں تحقیق کا اعلیٰ ترین معیار اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے متعلق فرمایا کہ مجھ سے جھوٹ منسوب کرنے والا اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر قسم کی احادیث کے لیے تحقیق کا کڑا معیار برقرار رکھا گیا ہو بلکہ احکام کی احادیث کی چھان بین بہت ہی باریک

---

[29] ابن خلدون۔ 1/48

بینی سے کی گئی جبکہ سیرت طیبہ سے متعلق عام تاریخی واقعات کی بہت زیادہ چھان بین نہیں کی گئی ہے۔ ہاں اگر کسی معاملے میں کوئی اختلاف پیدا ہوا ہے تو اس کی تحقیق تفصیل سے کی گئی ہے۔

تاریخی واقعات میں عام طور پر یہ معیار برقرار نہیں رکھا جا سکا ہے اور مورخین نے ہر قسم کا رطب و یابس اکٹھا کر دیا ہے۔ ان میں سے عام واقعات کی چھان بین تو بہت مشکل ہے تاہم ایسے واقعات جن سے امت کے اندر کوئی بڑا سیاسی یا مذہبی اختلاف پیدا ہوا ہے، کی چھان بین تفصیل سے کی جانی چاہیے۔ اس پر مزید بحث ہم اگلے باب میں کریں گے۔

خلاصہ باب

- تاریخی معلومات مرتب کیے جانے کا عمل چار مراحل سے گزرتا ہے: (۱) واقعہ کا رونما ہونا اور عینی شہادتیں۔ (۲) واقعہ کی تفصیلات کو نوٹ کرنا۔ (۳) اس کا تجزیہ کر کے اس کی ایک مکمل تصویر بنانا۔ (۴) مختلف واقعات کی تصاویر کو لے کر تاریخ مرتب کرنا۔
- تاریخی معلومات بہت مرتبہ راویوں کی بے احتیاطی، اضافی معلومات کی عدم دستیابی، راویوں کے تعصب اور سیاسی و مذہبی وجوہات کے سبب مسخ ہو جاتی ہیں۔
- جو تاریخی معلومات "تواتر" سے منتقل ہوتی ہیں، ان کے بارے میں شک نہیں ہوتا مگر جو انفرادی لوگوں کی خبروں سے منتقل ہوتی ہیں، ان کی صحت (Authenticity) کے بارے میں شک رہتا ہے۔ عہد صحابہ کی تاریخ کا بہت کم حصہ ہے جو تواتر سے منتقل ہوا ہے۔
- تاریخی روایات کی چھان بین کے لیے متعدد طریق ہائے کار ہیں، جن میں سے یہ نمایاں ہیں: (۱) ماخذ کی تحقیق۔ (۲) داخلی تحقیق۔ (۳) خارجی تحقیق۔ (۴) تاریخی وجوہات کی تحقیق۔
- تمام تاریخی روایات کی چھان بین نہیں کی جاتی ہے بلکہ صرف انہی روایات کی چھان بین ہوتی ہے جن میں کوئی بڑا سیاسی، علمی یا مذہبی اختلاف پیدا ہو۔

اگلے باب میں ہم دیکھیں گے کہ عہد صحابہ سے متعلق تاریخی معلومات کیسے مرتب ہوئیں اور ان کی تحقیق کا طریقہ کیا ہے؟

اسائنمنٹس

۱۔ تاریخی معلومات کس طرح اکٹھی کی جاتی ہیں؟ اس میں کون سے مراحل پیش آتے ہیں اور کس کس مرحلے میں کس کس طریقے سے ان معلومات کو مسخ کیا جا سکتا ہے؟

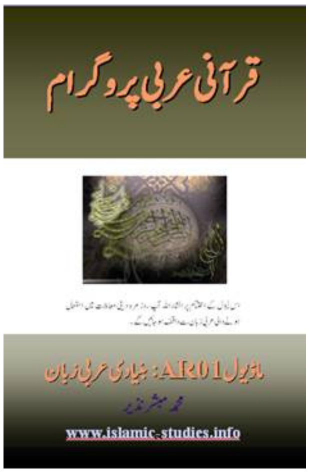
۲۔ تاریخی معلومات کے مسخ کیے جانے کے کم از کم پانچ اسباب بیان کیجیے۔

۳۔ تواتر اور خبر واحد میں کیا فرق ہے؟ دونوں کی تین تین مثالیں بیان کیجیے۔

۴۔ ماخذ کی تحقیق (Source Criticism) کے اصولوں کو نکات کی صورت میں بیان کیجیے۔

۵۔ داخلی اور خارجی تحقیق (Internal and External Criticism) میں بنیادی فرق کیا ہے؟

۶۔ تاریخی اسباب و علل کی تحقیق (Historical Reasoning) کسے کہتے ہیں؟ تاریخی واقعات کی دو مثالیں لے کر بیان کیجیے کہ کس طرح اسباب و علل کی تحقیق کے ذریعے ان کے صحیح یا غلط ہونے کو جانچا جا سکتا ہے۔





باب 2: عہد صحابہ کی تاریخ پر تحقیق

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ جان سکیں کہ:

- عہد صحابہ کی تاریخ کو پہلی تین صدیوں میں کیسے مرتب کیا گیا؟
- پہلی تین صدیوں کے اہم مورخ کون کون سے ہیں اور وہ کس درجے میں قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں؟
- قرون وسطی اور دور جدید کے اہم مورخ کون کون سے ہیں؟
- مخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کے اسباب کیا تھے؟
- عہد صحابہ کی تاریخی روایات کی جانچ پڑتال کا طریقہ کیا ہے؟
- ایک عام آدمی تاریخ کی چھان بین کیسے کر سکتا ہے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ عہد صحابہ سے متعلق تاریخی معلومات کو جانچنے اور پرکھنے کے طریق کار سے واقف ہوں۔

دور صحابہ و تابعین (11-133/632-750) کا اجمالی جائزہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے بعد تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین کا دور آتا ہے۔ صحابی اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہو جبکہ تابعی اسے کہتے ہیں جس نے کسی صحابی سے ملاقات کی ہو۔ اسی طرح تبع تابعی اس شخص کو کہتے ہیں جس نے کسی تابعی سے ملاقات کی ہو۔

عام طور پر مصنفین دور صحابہ کو 11/632 سے شروع کر کے 110/728 تک لے جاتے ہیں کیونکہ آخری صحابی اسی سال میں فوت ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ تابعین کے دور کو شمار کرتے ہیں اور کم و بیش 200/815 تک دور تابعین کو شمار کرتے ہیں کیونکہ آخری تابعی اسی زمانے میں فوت ہوئے تھے۔ تاہم دقت نظر سے دیکھا جائے تو صحابہ کرام کی اکثریت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور تک وفات پا چکی تھی اور اس زمانے میں جو صحابہ باقی رہ گئے تھے، ان کی غالب اکثریت بھی اگلے پندرہ بیس برس میں وفات پا چکے تھے۔ اس کے بعد جو اکا دکا صحابہ باقی رہ گئے، وہ اگرچہ رشد و ہدایت کا مینار تھے تاہم اس دور میں دین و دنیا کے زیادہ تر معاملات تابعین کے ہاتھ میں تھے۔ بالکل اسی طرح 133/750 تک اکثر جلیل القدر تابعین بھی وفات پا چکے تھے اور ان میں سے کچھ حضرات اگر باقی رہ بھی گئے تب بھی دین و دنیا کے معاملات عملاً تبع تابعین کے ہاتھ میں آ چکے تھے۔

عہد صحابہ و تابعین کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو سمجھنے کی خاطر ہم اس دور کو بھی مزید چھوٹے ادوار (Sub-Periods) میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ تقسیم اس بنیاد پر ہے کہ کس دور میں کون لوگ دینی اور دنیاوی قیادت کے مناصب پر فائز رہے۔ یہ تقسیم ہمارے فہم (Judgment) کے مطابق ہے اور اس میں دو چار سال اوپر نیچے کیے جا سکتے ہیں۔

1۔ کبار صحابہ کا دور (11-40/632-660): یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں کی قیادت ان صحابہ کے ہاتھ میں رہی جنہوں نے طویل عرصے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی۔ ان میں زیادہ تر حضرات وہ تھے جو عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ہی کم تھے۔ ان میں سب سے نمایاں خلفائے راشدین اور عشرہ مبشرہ کے بقیہ صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ ان کے علاوہ دیگر سابقون الاولون بھی بالعموم اسی دور کے اندر وفات پا چکے تھے۔

2۔ متوسط صحابہ کا دور (40-60/660-680): اس دور میں وہ صحابہ دینی اور دنیاوی قیادت پر فائز رہے جو عہد نبوی میں ابھی نوجوان تھے۔ ان میں سب سے نمایاں حضرت معاویہ، ابوہریرہ، ام المومنین عائشہ، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم تھے۔

3۔ صغار صحابہ کا دور (60-80/680-700): اس دور میں دینی اور دنیاوی قیادت ایک حد تک تابعین کے ہاتھ میں آ چکی تھی تاہم ابھی وہ صحابہ موجود تھے جو عہد رسالت کے آخری دور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان میں حضرت حسن، حسین، عبداللہ بن زبیر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ 80/700 کے بعد بھی تیس سال تک بعض صحابہ زندہ رہے تاہم اس کے بعد دین و دنیا کی قیادت عملاً کبار

تابعین کو منتقل ہو چکی تھی۔

4۔ کبار تابعین کا دور (80-100/680-718): صحابہ و تابعین کے ادوار کا بہت سا حصہ مشترک (Overlapping) ہے۔ کبار تابعین وہ تھے جو خلفائے راشدین کے ابتدائی ایام میں پیدا ہوئے اور ان کی پوری زندگی جلیل القدر کبار صحابہ کے ساتھ گزری۔ ان میں سے طویل عمر پانے والے بھی 100/718 کے لگ بھگ وفات پا چکے تھے۔

5۔ متوسط تابعین کا دور (100-133/718-750): یہ وہ تابعین ہیں جو متوسط صحابہ کے دور میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ان سے تربیت حاصل کی۔ ان کا دور کم و بیش اس وقت ختم ہوتا ہے جب بنو امیہ کا اقتدار ختم ہوا۔

6۔ صغار تابعین کا دور (60-200/750-815): یہ وہ تابعین ہیں جو صغار صحابہ کے دور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے صغار صحابہ یا کبار تابعین سے تعلیم و تربیت پائی۔ ان کا دور خاصا طویل ہے تبع تابعین کے دور کے ساتھ خلط ملط ہے۔

7۔ تبع تابعین کا دور (150-300/767-912) : اس میں تبع تابعین کی مختلف نسلیں (Generations) شامل ہیں جنہوں نے کبار سے لے کر صغار تابعین کا زمانہ پایا۔

اس باب میں ہم ان اس بات کا جائزہ لیں گے کہ عہد صحابہ سے متعلق تاریخ پر تحقیق کیسے کی جائے۔ اس کے لیے ہم پہلے یہ دیکھیں گے کہ عہد صحابہ کی تاریخ مرتب کیسے ہوئی اور پھر ہم دیگر امور کا جائزہ پیش کریں گے۔ گویا کہ ہم یہاں "علم تاریخ کی تاریخ" کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

پہلی صدی ہجری میں علم تاریخ

چونکہ عہد صحابہ پہلی صدی ہجری پر مشتمل ہے، اس وجہ سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کے دور ہی میں کوئی مورخ پیدا ہوتے جو اس دور کے واقعات پر کتابیں لکھتے لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ اس دور میں کاغذ کمیاب تھا اور کتابیں لکھ کر پھیلانے کا رواج نہ تھا۔ قرآن مجید ہی وہ واحد کتاب تھی جو لکھی ہوئی صورت میں موجود تھی۔ احادیث نبویہ کو بعض لوگوں نے اپنے رجسٹروں میں لکھ رکھا تھا اور اس کی حیثیت ذاتی ڈائری کی تھی۔ اس وجہ سے ہمیں پہلی صدی ہجری میں کوئی نمایاں مورخ نظر نہیں آتے۔ پہلی صدی میں مورخین کی عدم دستیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تاریخ کا ذوق رکھنے والے مسلمانوں کا زیادہ تر فوکس احادیث نبویہ پر تھا۔ انہیں پڑھنا، پڑھانا، یاد کرنا، نوٹ کرنا، اگلی نسلوں تک منتقل کرنا ہی ان کے نزدیک اہم کام تھا۔ تاریخی واقعات کی یاد چونکہ ابھی تازہ تھی، اس وجہ سے انہیں اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ان سے متعلق روایات کو کوئی شخص اکٹھا کر کے کتاب لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی صدی ہجری میں یہ روایات بکھری رہیں اور لوگ احادیث کے ساتھ ساتھ انہیں بھی روایت کرتے رہے تاہم بعض ایسی شخصیات اس دور میں پیدا ہوئیں جنہوں

نے حدیث اور تاریخ پر غیر معمولی کام کیا۔

ابن شہاب الزہری (58-124/678-742)

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں محمد بن مسلم بن شہاب الزہری کی شخصیت ایسی ہے جو فن حدیث میں نمایاں ہوئی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زہری اپنے دور میں علم روایت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ آپ بنو امیہ کے خلفاء ولید اور سلیمان کے قریب رہے۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ بنے تو انہوں نے زہری سے فرمائش کی کہ وہ احادیث نبویہ کو اکٹھا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث کی بہت بڑی تعداد زہری سے مروی ہے اور موطاء امام مالک، بخاری اور مسلم جیسی کتابوں میں ان کی مرویات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے زہری پر تنقید کی ہے مگر امت کے اہل علم کی غالب اکثریت نے ان پر اعتماد کیا ہے۔

ابن شہاب زہری سے بعض تاریخی روایات بھی منقول ہیں مگر ان روایتوں میں ایک مسئلہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جنگ جمل، صفین، تحکیم وغیرہ کے واقعات 36-38/657-659 میں پیش آئے جبکہ زہری کی پیدائش 58/678 کی ہے۔ زہری جب ان واقعات کی کوئی تفصیل بیان کرتے ہیں تو سند بیان کرنے کی بجائے براہ راست اس واقعے کی تفصیلات بیان کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس شخص کا نام نہیں بتاتے جس سے انہوں نے یہ واقعہ سن رکھا ہے۔ ان واقعات میں سے بہت سے ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی خاص صحابی کی کردار کشی ملتی ہے۔ چونکہ زہری ان واقعات کے عینی شاہد نہیں ہیں، اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص سے انہوں نے وہ واقعہ سنا، وہ کس درجے میں قابل اعتماد تھا۔ عین ممکن ہے کہ زہری نے یہ واقعات اپنے بچپن یا نوجوانی میں ایسے لوگوں سے سنے ہوں جو بعض صحابہ کے خلاف بغض رکھتے ہوں اور ان کے خلاف اٹھنے والی باغی تحریک کا حصہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی منقطع سند (Broken chain of narrators) کے واقعات قابل اعتماد نہیں ہیں۔

یونس بن یزید الایلی (d. 152/769)

یہ ابن شہاب زہری کے شاگرد خاص تھے اور ان کی کتابوں کے حافظ تھے۔ ویسے تو ایلی کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے لیکن چونکہ یہ ابن شہاب الزہری کی تاریخی روایات کا اہم حصہ انہی سے مروی ہے، اس وجہ سے ان کا ذکر یہیں کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ بعض ائمہ جرح و تعدیل نے انہیں قابل اعتماد قرار دیا ہے تاہم جن لوگوں نے ان کے معاملے میں تحقیق کی ہے، انہوں نے بیان کیا ہے کہ ان کا حافظہ کمزور تھا۔ امام احمد بن حنبل بیان کرتے ہیں کہ یونس نے زہری کی روایات لکھنے میں بکثرت غلطیاں کی ہیں اور بڑی منکر (یعنی عجیب و غریب) قسم کی روایات بیان کی ہیں۔[30]

[30] شمس الدین الذہبی (673-748/1275-1347)۔ سیر الاعلام النبلا۔ شخصیت نمبر 6894۔ ص 4300۔ عمان: بیت الافکار الدولیہ۔

زہری سے جتنی بھی ایسی منقطع تاریخی روایات منقول ہیں، جن میں صحابہ کرام کی کردار کشی ہے، تقریباً ان سب کو یونس بن یزید الایلی نے روایت کیا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں علم تاریخ

دوسری صدی ہجری میں مسلم دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب آیا جس نے لوگوں کے رہن سہن پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ ہوا یوں کہ ماوراء النہر (موجودہ ازبکستان، تاجکستان وغیرہ) کے علاقے میں مسلم فوج کی ایک جھڑپ چین کی فوج کے ساتھ ہوئی۔ اس جنگ میں بعض ایسے چینی فوجی مسلمانوں کے جنگی قیدی بنے جو کاغذ بنانے کے ماہر تھے۔ ان قیدیوں سے مسلمانوں نے کاغذ بنانے کا فن سیکھا۔ چونکہ مسلم دنیا میں کاغذ کی ڈیمانڈ بہت زیادہ تھی، اس وجہ سے بہت تیزی سے کاغذ بنانے کے کارخانے یہاں پھیل گئے اور بڑی مقدار میں سستا کاغذ بنایا جانے لگا۔ اس عظیم ٹیکنالوجیکل انقلاب کا موازنہ بعد کی صدیوں میں پرنٹنگ پریس اور پھر کمپیوٹر کی ایجاد سے کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کمپیوٹر نے ہمارے زمانے میں انسانوں کے رہن سہن، باہمی تعلقات، اداروں، کاروبار، تعلیم اور ہر چیز کو بدل دیا ہے، بالکل ویسے ہی کاغذ بنانے کے طریقے کی دریافت نے مسلم دنیا میں تعلیم، تحقیق اور زندگی کے دیگر شعبوں پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔

اس سے پہلے لوگ محض ذاتی ڈائری کے طور پر اپنے علم کو لکھ لیا کرتے تھے۔ جب طالب علم اپنے استاذ سے کچھ سیکھتا تو اسے اپنی ڈائری میں لکھ لیتا اور بسا اوقات استاذ کو پڑھ کر سنا بھی دیتا تاکہ کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ دوسری صدی ہجری کا نصف آخر اور تیسری صدی کے نصف اول میں تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر کیا جانے لگا جن میں تاریخی کتب بھی شامل تھیں۔ کتابوں کو کمرشل پیمانے پر نقل کیا جانے لگا اور "ورّاقین" کا ایک طبقہ وجود میں آیا۔ یہ کتابوں کی ہاتھ سے نقلیں تیار کرنے کے ماہر تھے اور انہوں نے باقاعدہ اپنا بازار بنا لیا۔ اگر کسی عالم کو اپنی کتاب کی مثلاً سو کاپیاں تیار کروانا ہوتیں تو وہ ان وراقین کے پاس آتے اور انہیں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دیتے۔ یہ وراقین اس کام کو آپس میں بانٹ لیتے اور چند ہی دنوں میں یہ سو کاپیاں تیار کر کے عالم کو دے دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دھڑا دھڑ کتابیں لکھی جانے لگیں اور انہیں بآسانی منتقل کیا جانے لگا۔

حافظے سے کاغذ پر علم کی منتقلی کا یہ عمل ظاہر ہے کہ ایک سال میں نہیں ہوا ہو گا بلکہ ان کارخانوں کے ارتقاء میں کم از کم تیس چالیس برس ضرور لگے ہوں گے۔ کاغذ کا ڈسٹری بیوشن نیٹ ورک بنا ہو گا، دکانیں قائم ہوئی ہوں گی اور اس کے ساتھ ساتھ ورّاقین (Scribes) کا وہ طبقہ وجود میں آیا ہو گا جس نے کتابوں کو نقل کرنے کے فن کو بہت تیز کر دیا۔ اس سارے عمل میں پچاس سے سو برس تو یقیناً لگے ہوں گے۔ ہم اپنے زمانے میں دیکھ سکتے ہیں کہ کمپیوٹر کو مختلف معاشروں میں رواج پانے کے لیے کم و بیش تیس سال (1980-2010) کا عرصہ لگا ہے اور 2012 میں بھی یہ صورتحال نہیں ہے کہ ہر شخص کے پاس اپنا ذاتی کمپیوٹر ہو۔ شاید مزید تیس چالیس برس میں یہ صورتحال ہو جائے کہ ہر شخص ذاتی کمپیوٹر کا مالک ہو۔ کچھ ایسا ہی معاملہ اس دور میں کاغذ کے ساتھ ہوا ہو گا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں ہمیں نظر آتا ہے کہ کتابیں لکھنے کے عمل کا آغاز ہوا اور تیسری صدی ہجری کے اوائل اور نصف میں جب کتابیں بڑے پیمانے پر لکھی جانے لگیں تو ان کا اسلوب وہی تھا جو اس سے پہلے زبانی روایت کا چلا آ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو ضرورت اس امر کی محسوس ہوئی کہ جو کچھ علم اب تک زبانی یا ذاتی ڈائریوں کی صورت میں چلا آ رہا ہے، اسے مرتب کر لیا جائے۔ چنانچہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، شاعری، فلسفہ غرض ہر علم میں جو کچھ دستیاب تھا، اسے لکھا جانے لگا۔ حدیث اور تاریخ کے میدان میں پہلے مرحلے پر ان روایات کو اکٹھا کیا گیا۔ اہل علم کا فوکس یہ تھا کہ علم کو مرتب کیا جائے، مستند و غیر مستند کو بعد میں اگلے مرحلے پر دیکھ لیا جائے گا۔ یہ مرحلہ دوسری صدی کے آخر سے شروع ہو کر پانچویں صدی کے آخر تک جاری رہا اور اس عمل میں تین سو سال لگے۔

دوسری صدی ہجری میں ایسے مورخین سامنے آئے جنہوں نے تاریخ پر کتابیں لکھنا شروع کیں اور روایتیں اکٹھی کیں۔ مناسب ہو گا کہ اس موقع پر ہم ان مورخین کا تعارف کروا دیں اور ان کے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کی آراء بھی نقل کر دیں۔ ائمہ جرح و تعدیل سے ہماری مراد وہ محققین ہیں جنہوں نے احادیث اور تاریخی روایات کے راویوں پر تحقیق پر اپنی زندگیاں صرف کیں اور ان کے بارے میں یہ تفصیلات بیان کیں کہ یہ لوگ کس درجے میں قابل اعتماد تھے۔ ان ائمہ میں احمد بن حنبل(164-241/780-855)، ابن معین(156-233/772-847)، بخاری(194-256/810-870)، ابن المدینی (161-234/777-848)، ابو حاتم الرازی (195-277/810-890)، نسائی (214-303/829-915) اور دار قطنی (306-385/918-995) شامل ہیں۔ یہ سب تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے مشہور ائمہ جرح و تعدیل ہیں اور ان کی رائے فن جرح و تعدیل میں اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔

مورخین اور راویوں کے بارے میں یہ تفصیلات ہم فن رجال (Biographical Studies) کے مشہور انسائیکلوپیڈیا "میزان الاعتدال" سے فراہم کر رہے ہیں اور مشہور ائمہ جرح و تعدیل، جنہوں نے مختلف راویوں کے حالات اور ان کے قابل اعتماد ہونے یا نہ ہونے پر گہری تحقیق کی ہے، کی آراء یہاں پیش کر رہے ہیں۔

محمد بن اسحاق *(85-151/703-768)*

مشہور عالم ہیں اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک مفصل کتاب لکھی تھی جس کا جزوی حصہ اب بھی موجود ہے۔ دور صحابہ کی تاریخ کے بارے میں ان سے زیادہ روایات مروی نہیں ہیں۔

ان کے بارے میں محدثین اور ماہرین جرح و تعدیل کے مابین اختلاف ہے کہ یہ ثقہ تھے یا نہیں تھے۔ علی بن مدینی اور ابن شہاب زہری نے انہیں سب سے بڑا عالم قرار دیا ہے۔ سفیان بن عینیہ انہیں امیر المومنین فی الحدیث سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس امام مالک (93-179/711-795) جو ان کے ہم عصر تھے، انہیں "دجال" کا لقب دیتے ہیں۔ ان پر شیعہ اور فرقہ قدریہ سے کا الزام ہے اور اس کے علاوہ ان پر تدلیس (غیر ثقہ راوی کا نام چھپا لینا تاکہ یہ لگے کہ حدیث مستند ہے) کے ارتکاب کا الزام بھی ہے۔ یحیی بن معین کہتے ہیں

کہ ثقہ تو تھے مگر حجت نہیں تھے۔[31]

محمد بن عمر الواقدی(130-207/747-823)

دوسری صدی کے سب سے مشہور مورخ محمد بن عمر الواقدی ہیں۔ یہ صاحب بغداد کے قاضی تھے اور بڑے عالم تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں میں جا کر تاریخی روایتیں اکٹھی کیں اور اس پر کتابیں لکھیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ کتب دوسری صدی کے نصف آخر میں لکھی گئی ہوں گی۔ انہوں نے روایات کی تفتیش و تنقید بالکل نہ کی بلکہ جو کچھ ملا، اسے لکھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ واقدی کو ماہرین جرح و تعدیل نے نہایت ہی ناقابل اعتماد اور غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ واقدی کی تصانیف مرور ایام کی نذر ہو گئیں اور ہم تک نہیں پہنچیں تاہم ان کی روایات بعد کے دور کی تصانیف کا حصہ بن گئیں۔

واقدی کے بارے میں احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ یہ کذاب ہے۔ ابن معین انہیں ثقہ نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ان کی روایت کبھی نہ لکھو۔ بخاری اور ابو حاتم انہیں متروک قرار دیتے ہیں۔ ابن المدینی، ابو حاتم اور نسائی کہتے ہیں کہ یہ روایتیں گھڑا کرتے تھے۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ ان میں ضعف پایا جاتا ہے۔ ابن المدینی کہتے ہیں کہ یہ صاحب تیس ہزار ایسی احادیث سنایا کرتے تھے جو کہ بالکل ہی اجنبی تھیں۔[32] خطیب بغدادی نے واقدی سے متعلق نقل کیا ہے کہ انہوں نے جنگ احد کے واقعے کو بیس (بروایت دیگر سو) جلدوں میں بیان کیا۔ اب چند گھنٹوں میں ہونے والی جنگ احد کو اگر بیس جلدوں میں بھی بیان کیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فاضل مصنف نے اس میں کیا کچھ اکٹھا کر دیا ہو گا۔[33]

تاریخ کی کتب میں واقدی کی روایات کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسی روایات، جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی منفی بات ہو، ان میں سے اکثر کی سند میں واقدی موجود ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ واقدی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے بارے میں متعصب تھے۔ اس کے برعکس بعض شیعہ اہل علم جیسے ابن الندیم (d. 385/995) کا کہنا ہے کہ واقدی میں تشیع پایا جاتا تھا مگر وہ تقیہ کر کے خود کو اہل سنت میں ظاہر کرتے تھے۔[34]

علی بن محمد المدائنی(135-225/752-840)

یہ بھی دوسری صدی کے مورخ ہیں۔ مذکورہ بالا ابن الندیم، جو کہ اپنے زمانے کی لائبریری سائنس کے ماہر تھے اور انہوں نے اپنے

---

[31] جمال الدین المزی (654-742/1256-1342)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، راوی نمبر 7057۔ بغداد: موسسہ دار الرسالہ۔

[32] ایضاً، راوی نمبر 7999

[33] خطیب بغدادی (392-463/1002-1071)۔ تاریخ مدینۃ السلام (بغداد)۔ باب محمد بن عمر الواقدی، نمبر 1203۔ 4/11۔ بیروت: دار الغرب الاسلامی

[34] خالد کبیر علال۔ مدرسۃ الکذابین فی روایۃ التاریخ الاسلامی و تدوینہ۔ ص 66-65۔ الجزائر: دار البلاغ

زمانے تک کی کتب کی ایک مفصل فہرست تیار کی ہے، نے مدائنی کی 239 تصانیف کے نام گنوائے ہیں۔ ان کی یہ تصانیف بھی باقی نہیں رہیں تاہم ان کی بیان کردہ روایات کا بڑا حصہ تیسری صدی کی کتب کا حصہ بن گیا۔

جرح و تعدیل کے مشہور ماہر ابن عدی ان کے بارے کہتے ہیں: "یہ حدیث کے معاملے میں قوی نہیں ہیں، اخباری ہیں اور ان کی روایات میں سے کم ہی ہیں جن کی سند مکمل ہے۔" یحیی بن معین نے البتہ انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔[35] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدائنی تاریخ میں ایک قابل اعتماد راوی سمجھے گئے ہیں مگر حدیث میں نہیں۔ بذات خود قابل اعتماد تھے لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ جن لوگوں سے روایت کر رہے ہیں، وہ قابل اعتماد اور ثقہ ہیں یا نہیں۔

ابو مخنف لوط بن یحیی *(d. 170/787)*

یہ دوسری صدی کے مشہور ترین مورخ ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بنو امیہ سے متعلق جتنی بھی منفی نوعیت کی روایتیں ملتی ہیں، ان کا غالب حصہ انہی سے مروی ہے۔ جنگ صفین، واقعہ تحکیم، سانحہ کربلا، سانحہ حرہ اور اس کے بعد کے واقعات کا زیادہ تر حصہ تاریخ طبری میں انہی سے مروی ہے۔ دار قطنی نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے، ابن معین کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں ہیں، ابن عدی نے انہیں غالی شیعہ قرار دیا ہے۔[36] ابن عدی کا کہنا یہ بھی ہے کہ ابو مخنف بہت ہی دل جلے شیعہ تھے۔[37]

مناسب رہے گا کہ ابو مخنف کے متعلق ہم اہل تشیع کی رائے پیش کر دیں۔ ابو مخنف کے متعلق اہل تشیع کے ایک مصنف قمر بخاری صاحب لکھتے ہیں:

> ابو مخنف کا نام، لوط بن یحییٰ بن سعید بن مخنف بن سُلیم ازدی ہے۔ ان کا اصلی وطن کوفہ ہے اور ان کا شمار دوسری صدی ہجری کے عظیم محدثین اور مورخین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے اموی حکومت کے آخری دور تک کے اہم حالات و واقعات پر کتابیں لکھیں، جیسے کتاب المغازی، کتاب السقیفہ، کتاب الردہ، کتاب فتوح الاسلام، کتاب فتوح العراق، کتاب فتوح خراسان، کتاب الشوریٰ، کتاب قتل عثمان، کتاب الجمل، کتاب صفین، کتاب مقتل اَمیر المؤمنین، کتاب مقتل الحسن (علیہ السلام) کتاب مقتل الحسین (علیہ السلام) ۔۔۔
>
> جو مجموعی طور پر اٹھائیس کتابیں ہیں اور ان کی تفصیل علم رجال کی کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر کتابیں ہماری دسترس میں نہیں ہیں البتہ ان کتابوں کے کچھ مطالب ان کے بعد لکھی جانے والی کتابوں میں روایت ابی مخنف کے عنوان سے موجود ہیں مثلاً تاریخ طبری

[35] شمس الدین الذہبی۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال، راوی نمبر 5927۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ www.waqfeya.com ac. 11 Dec 2009

[36] ایضاً۔ نمبر 6998

[37] ابن حجر عسقلانی (773-852/1372-1448)۔ لسان المیزان۔ راوی نمبر 6248۔ بیروت: مکتبہ مطبوعات الاسلامیہ۔

میں ابو مخنف سے مجموعی طور پر پانچ سو سے زیادہ روایتیں موضوعات پر نقل ہوئی ہیں اور ان نقل شدہ روایات میں سے اکثر کا تعلق، جو کہ تقریباً ایک سو چھبیس روایتیں ہیں، حضرت علی علیہ السلام کے دوران حکومت کے حالات و واقعات سے ہے۔ ایک سو اٹھارہ روایتیں واقعہ کربلا اور ایک سو چوبیس روایتیں حضرت مختار کے قیام کے بارے میں ہیں۔۔۔۔

اگر چہ ان کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہے لیکن ان کی تاریخ وفات عام طور سے سن 157 ہجری قمری نقل کی گئی ہے۔ ان کی تاریخ ولادت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بعض علماء رجال غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ بعض نے انہیں امام علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام، اور امام حسین علیہ السلام کا صحابی کہا ہے، جب کہ بعض علماء نے انہیں امام جعفر صادق علیہ السلام کا صحابی جانا ہے۔ جیسا کہ شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے "کشّی" سے نقل کیا ہے کہ ابو مخنف، امام علی علیہ السلام امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں۔ لیکن ان کا خود یہ نظریہ نہیں ہے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ ابو مخنف کے والد "یحیی" امام علی علیہ السلام کے صحابی تھے جب کہ خود ابو مخنف (لوط) نے آپ کا زمانہ نہیں دیکھا ہے۔۔۔۔ جو بات یقینی ہے وہ یہ کہ ابو مخنف کے پر دادا "مخنف بن سلیم" رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے اور آپ کی طرف سے شہر اصفہان کے گورنر مقرر ہوئے اور جنگ جمل کے دوران حضرت علی علیہ السلام کی فوج میں قبیلہ ازد کے دستہ کی سالاری کے فرائض انجام دیتے ہوئے اس جنگ میں شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے۔

اہل تشیع کی علم رجال سے متعلق کتابوں سے یہ بات روشن ہے کہ ابو مخنف ایک قابل اعتماد شخص تھے، شیخ نجاشی ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ابو مخنف کوفہ کے بزرگ راویوں کے شیوخ (اساتذہ) میں سے ہیں ان کی روایت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ شیخ طوسی نے اپنی علم رجال کی کتاب میں انہیں امام جعفر صادق علیہ السلام کا صحابی کہا ہے۔ شیخ عباس قمی نجاشی جیسی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ابو مخنف عظیم شیعہ مورخین میں سے ایک ہیں۔ نیز آپ فرماتے ہیں کہ ابو مخنف کے شیعہ مشہور ہونے کے باوجود طبری، اور ابن اثیر، جیسے علماء اہل سنت نے ان پر اعتماد کیا ہے، آقا بزرگ تہرانی نجاشی کی چند عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ان کے شیعہ مشہور ہونے کے باوجود علمائے اہل سنت جیسے طبری اور ابن اثیر نے ان پر اعتماد کیا ہے بلکہ ابن جریر کی کتاب تاریخ الکبیر تو ابو مخنف کی روایات سے پر ہے۔ آیت اللہ خوئی نے بھی انہیں ثقہ کہا ہے اور شیخ طوسی (رح) سے ابو مخنف تک جو سند ہے اسے آپ نے صحیح جانا ہے۔

لیکن بعض علماء اہل سنت نے ان کے شیعہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے ان کی روایت کو متروک قرار دیا ہے اور بعض افراد نے ان کے شیعہ ہونے کا ذکر کئے بغیر ان کی روایت کو ضعیف کہا ہے جیسا کہ یحیی بن معین کا کہنا ہے: ابو مخنف لیس بشیٔ یعنی ابو مخنف قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اور ابن ابی حاتم نے یحیی بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ثقہ نہیں ہیں۔ اور دوسروں سے بھی اس بات کو نقل کیا ہے کہ وہ "متروک الحدیث" ہیں۔

ابن عدی، یحیی بن معین کا قول نقل کرنے کے بعد کہتا ہے کہ گذشتہ علماء بھی اسی بات کے قائل ہیں، (یوافقہ علیہ الائمہ) اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ابو مخنف ایک افراطی قسم کے شیعہ ہیں، ان کی احادیث کی سند نہیں ہے ان کی احادیث کی سند نہیں ہے ان سے ایسی ناپسندیدہ اور مکروہ روایات نقل ہوئی ہیں جو نقل کرنے کے لائق نہیں۔

ذہبی کا کہنا ہے کہ وہ متروک ہیں اور دوسری جگہ پر کہا ہے کہ ابو مخنف نے مجہول افراد سے روایت نقل کی ہے۔ دار قطنی کا قول ہے کہ ابو مخنف

ایک ضعیف اخباری ہیں۔ ابن حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ ان پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پھر بعض علماء کا قول نقل کرتا ہے کہ ابو مخنف قابل اعتماد اور مورد اطمینان نہیں ہیں۔

لیکن ابن ندیم کا ان کے بارے میں کہنا ہے کہ میں نے احمد بن حارث خزار کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر میں دیکھا ہے کہ علماء کا کہنا ہے، کہ ابو مخنف کی عراق اور اس کی فتوحات سے متعلق روایات سب سے زیادہ اور سب سے بہتر ہیں، جس طرح سے خراسان، ہندوستان اور فارس کے بارے میں مدائنی، حجاز و سیرت کے بارے میں واقدی، اور شام کی فتوحات کے بارے میں ان تینوں کی معلومات یکساں ہیں۔ یہ عبارت یاقوت حموی نے بھی اپنی کتاب "معجم الادباء" میں ذکر کی ہے۔ مجموعی طور پر اکثر علماء اہل سنت نے یحییٰ بن معین کے قول کا سہارا لے کر ابو مخنف کو غیر ثقہ قرار دیا ہے۔

شیخ طوسی کا اپنی کتاب "فہرست" میں اور نجاشی کا اپنی کتاب "رجال" میں ان کے مذہب کے بارے میں کوئی رائے پیش نہ کرنا، ان کے شیعہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ شیخ عباس قمی اور آقا بزرگ تہرانی نے واضح طور پر ان کے شیعہ ہونے کو بیان کیا ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ ان کا شیعہ ہونا مشہور ہے لیکن آقا خوئی نے اپنی کتاب "معجم رجال الحدیث" میں ان کے شیعہ یا غیر شیعہ ہونے کو بیان کئے بغیر انہیں ثقہ کہا ہے۔

اکثر علماء اہل سنت نے ان کے شیعہ ہونے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں کیا۔یہاں تک کہ ابن قتیبہ اور ابن ندیم نے شیعہ افراد کے لئے ایک الگ باب تحریر کیا ہے لیکن ابو مخنف کے نام کا وہاں ذکر نہ ہونا ان کے غیر شیعہ ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ علماء اہل سنت میں سے ابن ابی الحدید وہ ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ ابو مخنف کا شمار محدثین میں ہوتا ہے اور وہ امامت پر اعتقاد رکھتے تھے، لیکن ان کا شمار شیعہ راویوں میں نہیں ہوتا۔ صاحب قاموس الرجال اقوال پر تنقید کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ابو مخنف کی روایت ان کے متعصب نہ ہونے کی وجہ سے قابل اعتماد ہے لیکن ان کے شیعہ ہونے کے بارے میں کوئی رائے پیش نہیں کی جاسکتی۔

لہٰذا ان کے مذہب کے بارے میں بحث کرنے کا کوئی خاص عملی فائدہ نہیں ہے لیکن اگر ابو مخنف کی روایات پر غور و فکر کیا جائے جو اکثر سقیفہ، شوریٰ، جنگ جمل، جنگ صفین، مقتل امام حسین علیہ السلام سے متعلق ہیں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ شیعی افکار کے مالک تھے، البتہ ممکن ہے کہ ان کی روایات میں بعض مطالب ایسے پائے جاتے ہوں جو کامل طور پر شیعہ عقیدہ کے ساتھ مطابقت نہ رکھتے ہوں۔ لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم ابو مخنف کے دور زندگی کو بھی پیش نظر رکھیں کیونکہ بعض اوقات ائمہ معصومین علیہم السلام بھی تقیہ کی وجہ سے ایسے مطالب بیان کرتے تھے جو اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق ہوا کرتے تھے اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ وہ ایک معتدل شخص تھے جس کی وجہ سے اہل سنت کی اکثر کتابوں میں ان کی روایات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔

ابو مخنف کی روایات کے متن کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان کام نہیں ہے کیونکہ ابو مخنف کو تاریخی روایات نقل کرنے والوں میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا دوسری روایات کے پیش نظر ان کی روایت کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ تاریخ کے تمام راوی جیسے ہشام کلبی، واقدی، مدائنی، ابن سعد وغیرہ یہ سب ان کے دور کے بعد سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی کے مرہون منت

ہیں۔[38]

بخاری صاحب کی ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل سنت اور اہل تشیع کے علماء رجال کے نزدیک ابو مخنف ایک بڑے شیعہ عالم اور مورخ تھے اور ان کے پڑدادا مخنف بن سلیم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ ایسے تمام تاریخی واقعات، جن کے بارے میں اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین اختلاف ہے، تقریباً سب کے سب کی تفصیلات ابو مخنف ہی سے مروی ہیں۔ اس وجہ سے ان معاملات میں ابو مخنف کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ مدعی اپنے نقطہ نظر کے حق میں خود گواہ نہیں بن سکتا ہے۔ راوی کی حیثیت گواہ کی ہوتی ہے۔ اگر مدعی خود ہی گواہ بن جائے تو کون سی عدالت اس کی گواہی کو قبول کرے گی؟

یہ بات درست نہیں ہے کہ صرف یحیی بن معین نے ہی ابو مخنف کو ناقابل اعتماد قرار دیا ہے اور اہل سنت کے بقیہ اہل علم ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ خود بخاری صاحب کے اقتباس میں متعدد علمائے اہل سنت کے اقوال درج ہیں جو ابو مخنف کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم بھی میزان الاعتدال اور لسان المیزان سے متعدد ماہرین جرح و تعدیل کے اقوال نقل کر چکے ہیں جن کے مطابق علمائے اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابو مخنف قابل اعتماد نہیں ہیں۔ طبری، ابن اثیر اور دیگر مورخین کا ان کی روایات کو اپنی کتب میں جگہ دینا، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ ابو مخنف کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ خود ان مورخین نے اپنی کتب کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ہم نے واقعات کی تحقیق نہیں کی ہے بلکہ انہیں صرف نقل کیا ہے۔ صحیح غلط کی ذمہ داری ان راویوں پر ہے جن کے نام ہم نے سند میں دے دیے ہیں۔ طبری اور دیگر مورخین کی حیثیت بات کو آگے نقل کرنے والے کی ہے۔ انہوں نے ہرگز یہ دعوی نہیں کیا ہے کہ جن راویوں کی روایات کو انہوں نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، وہ سب کے سب قابل اعتماد تھے اور ان کی بیان کردہ ہر ہر روایت کو قبول کر لیا جائے۔

محمد بن سائب الکلبی *(d. c. 180/795)*

یہ بھی دوسری صدی ہجری کے مورخ ہیں اور ان کا تعلق بھی ابو مخنف ہی کی پارٹی سے ہے۔ محمد بن سائب الکلبی کے بارے میں مشہور امام سفیان ثوری کہتے ہیں: "کلبی سے بچو۔" کہا گیا: "آپ بھی تو ان سے روایت کرتے ہیں؟" کہا: "میں اس کے سچ اور جھوٹ کو پہچانتا ہوں۔" سفیان ثوری کہتے ہیں کہ کلبی نے مجھ سے کہا: "میں ابو صالح سے جتنی روایتیں بیان کرتا ہوں، وہ سب جھوٹ ہیں۔" اعمش کہا کرتے تھے: "اس سبائی سے بچو، میں نے دیکھا ہے کہ لوگ اس کا نام جھوٹوں میں لیتے ہیں۔" احمد بن زہیر کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن

---

[38] قمر بخاری۔ مورخ ابی مخنف پر اک نظر۔

http://www.alqlm.org/forum/showthread.php?4183-مورخ-ابی-مخنف-پر-ایک-نظر (ac. 19 April 2012)

حنبل سے پوچھا: "کیا کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟" انہوں نے کہا: "نہیں۔" ابن معین کہتے ہیں: "کلبی ثقہ نہیں ہے۔" جوزجانی نے کلبی کو "کذاب" اور دار قطنی نے متروک قرار دیا ہے۔ مشہور محدث ذہبی کہتے ہیں کہ اس کا کتاب میں ذکر کرنا درست نہیں ہے تو پھر اس سے روایت قبول کیسے کی جائے۔[39]

ہشام بن محمد بن سائب الکلبی (d. 204/819)

یہ انہی کلبی صاحب کے بیٹے تھے اور اپنے والد سے روایات لیا کرتے تھے۔ بڑے عالم اور اخباری گزرے ہیں تاہم محدثین نے ان پر اعتماد نہیں کیا ہے۔ دار قطنی نے انہیں متروک قرار دیا ہے۔ ابن عساکر انہیں ثقہ نہیں سمجھتے۔ 150 کتب کے مصنف تھے۔[40] تاریخ طبری کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہشام کلبی کی بہت سی روایات، ابو مخنف ہی سے منقول ہیں۔ بعض ایسی روایات ہیں جنہیں ہشام نے ابو مخنف کے علاوہ کسی اور راوی سے بھی روایت کیا ہے۔ ہشام کے پڑدادا اور محمد بن سائب کے دادا جنگ جمل اور صفین میں باغی پارٹی کا حصہ تھے۔ ہشام سے ان کے بیٹے عباس بن ہشام اکثر روایت کرتے ہیں جو اسی خاندان کا حصہ ہیں۔

سیف بن عمر التیمی (d. c. 185/800)

یہ صاحب کثیر تاریخی روایات کے راوی ہیں اور اس فن پر انہوں نے کتابیں بھی لکھی ہیں۔ یحیی بن معین انہیں ضعیف قرار دیتے ہیں۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ ان کی روایات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ابو حاتم نے انہیں متروک قرار دیا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کی عام روایات "منکر" ہیں۔ ابن حبان بیان کرتے ہیں کہ ان پر زندیق ہونے کا الزام لگایا گیا تھا۔[41] ایسی بہت سی روایات، جو حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں خلفائے راشدین کی منفی تصویر پیش کرتی ہیں، سیف بن عمر ہی سے منقول ہیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ سیف بن عمر کی ان روایتوں کو قبول کیا جا سکتا ہے، جن میں صحابہ کرام کی کردار کشی نہ کی گئی ہو اور وہ عہد صحابہ کے سیاسی مسائل سے ہٹ کر ہوں۔[42]

دوسری صدی کے علم تاریخ پر مجموعی تبصرہ

یہ سب دوسری صدی ہجری کے مشہور مورخین ہیں لیکن ان کی کوئی کتابیں براہ راست ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

---

[39] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 7580

[40] ایضاً، نمبر 9245

[41] ایضاً۔ نمبر 3642

[42] برزنجی و حلاق۔ صحیح التاریخ الطبری۔ 3/6۔ دمشق: دار ابن کثیر۔

ان کتابوں کے اکثر مندرجات بعد کی بڑی کتب کا حصہ بن گئے، جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ پہلے کی کتابوں کو الگ سے محفوظ رکھا جا سکے۔ موجودہ دور میں بعض حضرات نے خاص کر ابو مخنف کی روایات کو تاریخ طبری اور دیگر کتابوں سے اخذ کر کے الگ کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔

اوپر بیان کردہ تفصیلات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سوائے ایک آدھ کے، دوسری صدی ہجری کے اکثر بڑے مورخین قابل اعتماد نہیں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب دو قسم کے ایسے محرکات (Motives) ظہور پذیر ہوئے جن کی بنیاد پر تاریخ کو جان بوجھ کر مسخ کیا گیا:

پہلا محرک سیاسی تھا۔ بنو امیہ نے تقریباً نوے برس (40-132/660-750) حکومت کی۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ان کے خلاف بنو ہاشم کی تحریک پیدا ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ امویوں کو ہٹا کر ان کی جگہ ہاشمیوں کا اقتدار قائم کیا جائے۔ یہ تحریک تین عشروں تک پھلتی پھولتی رہی اور بالآخر 132/750 میں یہ کامیاب ہوئی۔ اس کے نتیجے میں امویوں کی حکومت ختم ہوئی اور ان کی جگہ بنو عباس کا اقتدار قائم ہوا۔ ہم اپنے دور کے بارے میں جانتے ہیں کہ سیاستدان کس طرح ایک دوسرے بالخصوص حکمرانوں کی کردار کشی کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں کے خلاف عوامی جذبات کو بھڑکا کر خود اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ بنو ہاشم کے طرف داروں نے کیا اور بنو امیہ کو demonize کر کے ان کی نہایت ہی مسخ شدہ تصویر پیش کی۔ یہی تصویر تاریخی روایتوں کا حصہ بن کر کتب تاریخ میں داخل ہوئی۔ حضرت عثمان، معاویہ، مروان، عبدالملک بن مروان اور دیگر اموی حکمرانوں کی خاص طور پر کردار کشی کی گئی۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد بنو ہاشم میں پھوٹ پڑ گئی اور یہ عباسی اور علوی کیمپوں میں تقسیم ہو گئے۔ یہ لوگ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی اولادوں سے تھے۔ اقتدار چونکہ بنو عباس کے ہاتھ میں آیا، اس وجہ سے انہیں علویوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ عباسی دور میں جب تاریخ کی کتب لکھی گئیں تو ایسی بہت سی روایات ان کا حصہ بن گئیں جن میں حضرت علی اور ان کے صاحبزادوں حسن و حسین کی کردار کشی تھی۔ اگرچہ امت کے اہل علم میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے ایسی روایتوں کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا جن میں حضرت عثمان، علی، معاویہ رضی اللہ عنہم اور دیگر اکابرین امت کی کردار کشی تھی تاہم یہ روایتیں کتب تاریخ میں داخل کر دی گئیں۔ بہر حال ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تاریخ کی یہ کتب صرف جھوٹ ہی پر مشتمل ہیں کیونکہ انہی تواریخ میں بنو امیہ بالخصوص حضرت عثمان، معاویہ رضی اللہ عنہما اور ولید بن عبدالملک کے مثبت کارنامے بھی ملتے ہیں۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کتب تاریخ میں ان حضرات کی کردار کشی سے متعلق مخصوص روایات داخل کی گئی ہیں۔

دوسرا محرک مذہبی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں فرقہ بندی ارتقاء پذیر تھی۔ اہل تشیع ایک منظم گروہ کی شکل میں موجود تھے۔ خوارج اگرچہ آخری سانسیں لے رہے تھے مگر پھر بھی مسلم معاشرے کے اندر موجود تھے۔ ایک گروہ ناصبیوں کا بھی تھا، جو خود کو "شیعان عثمان" کہتے تھے۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے ساتھ تعصب رکھتے تھے۔ ان سب کے علاوہ مین

اسٹریم مسلمان تھے جو بعد میں "اہل السنۃ والجماعۃ" کہلائے۔ یہ وہ مسالک تھے جن کے اختلافات کی بنیاد "تاریخ" تھی۔ تاہم مسلمان ابھی مل جل کر رہتے تھے اور ان فرقہ بندیوں کی حدود اتنی واضح نہیں تھیں۔ اہل تشیع کے ہاں "تقیہ" کا اصول مسلمہ ہے جس کے تحت بہت سے شیعہ راوی، اپنا مسلک ظاہر نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین ایک دوسرے سے روایتیں حاصل کرتے تھے اور پھر انہیں آگے بیان کر دیتے تھے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کی عینک سے جب تاریخ کو دیکھا گیا تو لوگوں نے بہت سی ایسی روایتیں وضع کر دیں جو ان کے نقطہ نظر کی تائید اور فریق مخالف کی تردید پر مبنی تھیں۔ اگر انسان اپنی آنکھوں پر سرخ شیشوں کی عینک لگا لے تو اسے ہر چیز سرخ ہی نظر آتی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے جب تاریخ کو اپنے اپنے مسلک کے شیشوں کی عینک سے دیکھا تو انہوں نے تاریخی واقعات کی توجیہ اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحیح تاریخی روایات میں بھی اس کے اثرات پیدا ہوئے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کیا جانے لگا۔ چونکہ روایات کے تبادلے کا عمل مختلف مسالک کے لوگوں میں جاری تھا، اس وجہ سے اہل تشیع، خوارج اور ناصبیوں کی روایات مین اسٹریم مسلمانوں کی کتابوں میں داخل ہو گئیں۔

تیسری صدی ہجری میں علم تاریخ

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عہد صحابہ کے بڑے بڑے واقعات ہمیں تواتر سے ملتے ہیں لیکن ان کی جزوی تفصیلات کا ذکر انفرادی رپورٹس یا روایات میں ملتا ہے۔ متواتر معلومات کے بارے میں مورخین کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے البتہ انفرادی روایات کے بارے میں ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان روایات کو زیادہ تر دوسری صدی ہجری کے چند مورخین نے مرتب کیا اور کتابیں لکھیں۔ تیسری صدی ہجری میں جب تاریخی روایات کے بڑے بڑے مجموعے مرتب ہوئے تو دوسری صدی ہجری کی یہ کتابیں ان کا حصہ بن گئیں۔ چونکہ اس دور میں کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں، اس وجہ سے لوگوں نے بعد کی کتب کو ہاتھ در ہاتھ نقل کیا اور پرانی کتب غیر ضروری (Obsolete) ہوتی چلی گئیں۔

تیسری صدی ہجری کی کتب تاریخ اس وجہ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں کہ ہمارے پاس پہلی صدی میں رونما ہونے والے واقعات کی تاریخ سے متعلق جو قدیم ترین مواد موجود ہے، وہ زیادہ تر تیسری صدی ہی میں لکھی گئی کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس وجہ سے ہمارے پاس ان کتابوں سے متعلق تفصیلی معلومات ہونی چاہییں۔ جو شخص بھی عہد رسالت یا عہد صحابہ پر تحقیق کرے گا، اسے تیسری صدی کی کتابوں ہی کو اپنا ماخذ بنانا پڑے گا۔ بعد کی صدیوں میں جو کتب تاریخ لکھی گئیں، ان کی بنیاد بھی یہی تیسری صدی کی کتب تھیں۔ یہ بالعموم چار طرح کی کتابیں ہیں:

کتب انساب

ان کتابوں کا مقصد یہ ہے کہ مختلف شخصیات کے نسب نامے اور کارنامے بیان کیے جائیں۔ چونکہ عربوں کے ہاں نسب کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی اور اسی کی بدولت قبائل کا تشخص قائم تھا، اس وجہ سے علم الانساب کو دور جاہلیت ہی سے غیر معمولی حیثیت حاصل تھی۔ ہمارے ہاں تو دیہات میں بھانڈ اور میراثی وغیرہ چوہدریوں کے شجرہ ہائے نسب محفوظ رکھتے ہیں اور محفلوں میں انہیں گاتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں جو شخص علم الانساب کا ماہر ہوتا، اسے معاشرے میں غیر معمولی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا۔ علم الانساب میں ہر ہر خاندان کا نہ صرف شجرہ نسب بلکہ اس کی مشہور شخصیات کے پورے حالات زندگی بیان کیے جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ عربوں کا علم الانساب مرتب ہوتا رہا اور اگلی نسلوں کو یہ ذخیرہ صحیح طور پر منتقل ہوا۔ شجرہ نسب اور حالات زندگی کے علاوہ انساب کی کتب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شادیوں کی تفصیلات ملتی ہیں کہ کس کی شادی کس سے ہوئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف قبائل اور خاندانوں کے درمیان رشتوں سے ان کے باہمی تعلقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں مورخین نے بنو ہاشم اور بنو امیہ کے اختلافات کی جو تفصیل بیان کی ہے، اسے علم الانساب کی روشنی میں بآسانی پرکھا جا سکتا ہے۔

علم الانساب پر سب سے مشہور اور جامع کتاب احمد بن یحیی البلاذری (d. 279/893) کی "انساب الاشراف" ہے۔ کہنے کو تو یہ انساب کی کتاب ہے لیکن اس میں تاریخی معلومات بکثرت موجود ہیں کیونکہ مصنف نے ہر ہر شخصیت کے نسب کے ساتھ اس کے پورے حالات زندگی بیان کر دیے ہیں۔ موجودہ دور میں یہ کتاب بڑے سائز کے پانچ پانچ سو صفحات پر مشتمل 13 جلدوں میں چھپی ہے۔ مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے آغاز کرتے ہوئے نسل در نسل آپ کے ایک ایک رشتے دار کے حالات بیان کیے ہیں۔ پھر آپ کے چچا ابو طالب اور عباس رضی اللہ عنہ کے خاندان کے حالات بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد بنو امیہ، بنو زہرہ، بنو تیم، بنو مخزوم، بنو عدی اور قریش کے دیگر خاندانوں کے لوگوں کے حالات بیان کیے ہیں۔ کتاب کی ترتیب انہوں نے اس طرح رکھی ہے کہ جو خاندان نسب کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا قریب ہے، اس کے حالات انہوں نے پہلے بیان کیے ہیں۔

بلاذری سے پہلے دوسری و تیسری صدی کے نساب مصعب الزبیری (156-236/773-851) کی کتاب "نسب قریش" نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے بھی قریش کے مختلف قبائل اور خاندانوں کے باہمی رشتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے اور امام مسلم نے ان سے روایات قبول کی ہیں۔ ان کی کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں صرف نسب اور رشتوں کو بیان کیا گیا ہے اور تاریخی واقعات بیان نہیں کیے گئے۔ اس وجہ سے اس کتاب کی غیر جانبداری مسلم ہے۔ بعد میں چوتھی صدی میں ابن حزم (384-456/994-1064) کی کتاب "جمہرۃ الانساب العرب" بھی ایک اہم کتاب ہے۔

کتب طبقات

طبقات کی کتابوں میں بھی مشہور شخصیات کے حالات زندگی ہوتے ہیں جس کے ذیل میں ان شخصیات کے دور کی تاریخ بیان ہو جاتی

ہے لیکن ان کتابوں کی ترتیب طبقہ در طبقہ ہوتی ہے۔ طبقے سے مراد کسی شخص کا Peer Group یا Age Group ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ابتدائی سالوں میں ایمان لانے والے صحابہ ایک طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ہجرت کے بعد اور غزوہ بدر سے پہلے ایمان لانے والے ایک طبقہ میں، غزوہ بدر و احد کے درمیان ایمان لانے والے ایک طبقہ میں اور اسی طرح مشہور واقعات کے درمیان ایمان لانے والوں کو ایک طبقے میں رکھا جاتا ہے۔ صحابہ کرام کا آخری طبقہ وہ ہے جو فتح مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے درمیانی عرصے میں ایمان لایا۔ اس کے بعد تابعین کے طبقات شروع ہو جاتے ہیں۔

اس اسلوب پر لکھی جانے والی مشہور ترین کتاب محمد بن سعد (d. 230/845) کی "الطبقات الکبری" ہے۔ ابن سعد اگرچہ خود تو بڑے قابل اعتماد مورخ ہیں مگر وہ محمد بن عمر الواقدی (d. 207/822) کے شاگرد ہیں جنہیں محدثین نے نہایت ہی ضعیف قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے ابن سعد کی وہ روایات جو واقدی کے توسط سے منقول ہیں، قابل اعتماد نہیں مانی جاتی ہیں۔ ابن سعد نے طبقہ در طبقہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے حالات بیان کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی کتاب کو شہر وار مرتب کیا، یعنی ہر ہر شہر کے اندر جو جو طبقات موجود تھے، ان کی ترتیب سے شخصیات کے حالات بیان کیے۔

کتب مغازی

یہ وہ کتب ہیں جن میں جنگوں کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی تاریخ کے سب سے مشہور عالم یہی محمد بن عمر الواقدی ہیں جنہوں نے جنگوں سے متعلق روایات اکٹھی کیں۔ تیسری صدی میں بلاذری نے "فتوح البلدان" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو مختلف شہروں کی فتوحات سے متعلق اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

مشہور محدث امام احمد بن حنبل (164-241/780-855) کا کہنا ہے کہ مغازی، تفسیر اور ملاحم (جنگیں) کی کتابیں بے اصل ہیں۔[43] اس کتاب میں جن واقعات پر ہم تحقیق کر رہے ہیں، ان میں کتب مغازی کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

کتب تاریخ

اس اسلوب کی کتب میں تاریخی ترتیب (Chronological Order) سے روایات درج کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے مشہور کتاب ابن جریر طبری (224-310/838-922) کی "تاریخ الامم والملوک" ہے۔ یہ مختصراً "تاریخ طبری" کے نام سے مشہور ہے اور بعد کی کتب تاریخ کا ماخذ بھی ہے۔ طبری فن تاریخ میں ایک رجحان ساز (Trend-setter) شخصیت تھے۔ ان کے بعد اس اسلوب پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن یہ سب کی سب تاریخ طبری یا انساب و طبقات کی کتب سے ماخوذ تھیں۔ اس وجہ سے انہیں وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو تاریخ طبری کو حاصل ہے۔ طبری سے پہلے خلیفہ بن خیاط (160-240/777-854) اسی اسلوب پر کتاب لکھ چکے

---

[43] عسقلانی۔ لسان المیزان۔ خطبۃ الکتاب۔ 1/207۔

تھے مگر جو مقبولیت طبری کو حاصل ہوئی، وہ انہیں حاصل نہیں ہو سکی۔

تیسری صدی کے مشہور مورخین

تیسری صدی ہجری کے مشہور مورخین یہ ہیں:

1۔ محمد بن سعد کاتب الواقدی (168-230/784-845): یہ طبقات ابن سعد کے مصنف ہیں اور واقدی کے شاگرد اور سیکرٹری تھے۔ ان کی کتاب میں ان کے استاذ واقدی کی روایات بکثرت موجود ہیں جن کے قبول کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔

2۔ احمد بن یحیی البلاذری (d. 279/893): یہ انساب الاشراف اور فتوح البلدان کے مصنف ہیں۔

3۔ ابن جریر طبری (224-310/838-922): یہ علم تاریخ اور علم تفسیر کی رجحان ساز شخصیت ہیں اور انہوں نے نہایت مفصل تاریخ کو زمانی ترتیب (Chronological Order) سے بیان کیا ہے۔ ہماری اس کتاب کا بنیادی ماخذ یہی تین مصنفین ہیں لیکن اس کے علاوہ ہم نے دیگر ذرائع سے مدد بھی لی ہے۔

طبری کے بارے میں علمائے تاریخ کے مابین یہ اختلاف موجود ہے کہ وہ شیعہ تھے یا نہیں۔ ایک گروہ انہیں شیعہ قرار دیتا ہے اور دوسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھے بلکہ ان کے ہم نام ایک اور صاحب محمد بن جریر بن رستم طبری شیعہ تھے جس کی وجہ سے التباس پیدا ہوا۔ شیعہ عالم قمر بخاری کا کہنا ہے کہ اگرچہ طبری سنی مذہب تھے مگر زندگی کے آخری لمحات میں ان کے تشیع کی طرف مائل ہونے کا احتمال دیا جا سکتا ہے۔[44]

طبری کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں جہاں حضرات ابو بکر، عمر، عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہم پر تنقید پر مشتمل روایات ملتی ہیں، وہاں ان چاروں حضرات کے فضائل سے متعلق مثبت روایات بھی ان کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں اگر روایات ہیں تو ان پر تنقید پر مبنی روایتیں بھی ان کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ طبری محض ایک مورخ تھے اور انہیں جو کچھ ملا، انہوں نے اسے جمع کر دیا اور تحقیق و تفتیش کی ذمہ داری اگلی نسلوں کے سپرد کر دی۔

4۔ الجاحظ (159-255/776-869): جاحظ مورخ سے زیادہ ادیب تھے۔ ہمارے ہاں بھی ایسے مصنفین ہوئے ہیں جنہوں نے تاریخی ناول لکھے ہیں۔ ناول نگار یا ادیب کا اصل ہدف تاریخی روایات کی تحقیق و تجزیہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو بھی تاریخی واقعہ اسے ملے، وہ اسے نہایت خوبصورت اسلوب میں کہانی کی شکل میں بیان کر دے۔ اس وجہ سے ناولوں اور ادیبانہ تحریروں کو کبھی بھی تاریخ کا مستند ماخذ نہیں سمجھا گیا ہے۔ ہاں ان سے استفادہ ایک عام آدمی کے لیے بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ یہ اپنے اسلوب کے اعتبار سے ریڈر فرینڈلی کتابیں ہوتی ہیں۔ تاہم جاحظ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتب میں تحقیق کی ہے اور "شک

---

[44] قمر بخاری۔ مورخ ابی مخنف پر اک نظر۔ حوالہ بالا۔

اور تنقید" کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ علم تاریخ میں انہوں نے علی بن محمد المدائنی (135-225/752-840) کی شاگردی اختیار کی اور اس پر بعض کتابیں بھی لکھیں۔ اس کتاب میں ہم نے ان کی کتاب "العثمانیہ" سے استفادہ کیا ہے۔

5۔ ابن عبد الحکم (187-257/803-871): انہوں نے مصر اور شمالی افریقہ کی تاریخ پر کتابیں لکھیں جو کہ ہماری اس کتاب کے موضوع سے براہ راست متعلق نہیں ہیں۔

6۔ ابن ابی الدنیا (208-281/823-894): یہ ایک بہت بڑے محدث ہیں اور انہوں نے تاریخ پر بھی کتابیں لکھیں۔ ویسے ان کی زیادہ تر کتب کا موضوع تزکیہ نفس ہے۔ ان کی تاریخ سے متعلق کتب ہم تک پہنچ نہیں سکی ہیں۔

7۔ خلیفہ بن خیاط (160-240/777-854): یہ ایک بڑے مورخ ہیں۔ انہوں نے تاریخ پر ایک کتاب لکھی جو "تاریخ خلیفہ بن خیاط" کے نام سے مشہور ہے۔ غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو تاریخی ترتیب (Chronological Order) کے مطابق لکھی گئی البتہ اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو تاریخ طبری کو حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ یہ نہایت مختصر کتاب ہے اور موجودہ دور کے محض 450 صفحات میں انہوں نے 232 سال کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "طبقات" کے موضوع پر بھی کتابیں لکھیں جن میں طبقہ در طبقہ لوگوں کے احوال کے ساتھ تاریخ بھی بیان ہوئی ہے۔

8۔ ابن ہشام (d. 218/834): ابن ہشام کا شمار بڑے مورخین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے محمد بن اسحاق کی لکھی ہوئی سیرت نبوی کی کتاب کا خلاصہ تحریر کیا جو "سیرت ابن ہشام" کے نام سے مشہور ہے اور اس موضوع پر دستیاب کتابوں میں قدیم ترین ہے۔ ان کی کتاب کا تعلق چونکہ سیرت طیبہ سے ہے، اس وجہ سے ہماری اس کتاب کے موضوع سے یہ براہ راست متعلق نہیں ہے۔

9۔ ابو العباس یعقوبی (d. 284/897): یہ ایک بڑے تاریخ دان اور جغرافیہ دان تھے جن کی کتاب "تاریخ یعقوبی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک شیعہ مورخ تھے۔

10۔ عمر بن شبہ (173-262/789-876): عمر ایک بڑے عالم تھے اور انہوں نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھیں۔ تاریخ کے موضوع پر انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں کتاب الکوفہ، کتاب البصرہ، کتاب امراء المدینہ، کتاب امراء المکہ، کتاب السلطان، کتاب مقتل عثمان، کتاب التاریخ وغیرہ نمایاں ہیں۔ انہوں نے علم تاریخ میں ایک نیا رجحان پیدا کیا اور وہ یہ تھا کہ ہر شہر کی الگ تاریخ لکھی جائے۔ اس میں اس شہر کی مشہور شخصیات کا ذکر ہو۔ ویسے تو یہ رجحان طبقات ابن سعد میں بھی پایا جاتا ہے لیکن عمر بن شبہ کے بعد ہر ہر شہر کی تاریخ پر الگ الگ کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ان کی بہت سی کتب اب نایاب ہو چکی ہیں تاہم ان کی بہت سی روایات طبری میں موجود ہیں۔

11۔ الامامہ والسیاسۃ کے مصنف: اس کتاب کی نسبت ایک بڑے عالم ابن قتیبہ دینوری (213-276/828-889) کی جانب کی جاتی ہے تاہم یہ نسبت درست نہیں ہے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف غالی شیعہ ہیں جبکہ ابن قتیبہ کے بارے میں

یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وہ اہل تشیع کے سخت مخالف تھے۔ ان کی "الامامۃ و السیاسۃ" نامی کسی کتاب کا سراغ کسی اور ماخذ جیسے فہرست ابن الندیم میں نہیں ملتا ہے اور نہ ہی اس کتاب کا اسلوب بیان ان کی دیگر کتب سے ملتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ الامامۃ و السیاسۃ کسی شیعہ عالم کی کتاب ہے۔

کیا تیسری صدی ہجری کی لکھی ہوئی کتب تاریخ مستند ہیں؟

اس سوال کا جواب ہاں میں بھی ہے اور نہیں میں بھی کیونکہ ان کتب تاریخ میں مستند (Authentic) روایات بھی ہیں اور جعلی بھی۔ عام طور پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری میں جو کتب لکھی گئیں، ان میں زیادہ زور اس بات پر تھا کہ روایات کو اکٹھا کر لیا جائے اور انہیں سند کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ مستقبل کا کوئی مورخ اس سند کی مدد سے تحقیق کر سکے کہ روایت مستند ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس درجے میں ہے۔ اگرچہ روایات پر تنقید اور چھان بین کے عمل کا آغاز تیسری صدی ہجری کے نصف سے شروع ہو چکا تھا لیکن تاریخی روایات کی زیادہ چھان بین نہیں کی گئی۔ اس دور کے ناقدین نے اپنی ترجیحات یہ متعین کیں کہ جن روایات میں کوئی دینی مسئلہ ہو، ان کی چھان بین پہلے کر لی جائے۔ تاریخی روایات کی جانچ پڑتال کا معاملہ کچھ دیر سے شروع ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مورخین نے جعلی روایتوں کو اپنی کتب میں درج ہی کیوں کیا؟ یہ بات ہم جانتے ہیں کہ کوئی مصنف جب کتاب لکھتا ہے تو وہ اپنے زمانے کے لوگوں کی علمی اور ذہنی سطح ہی کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔ آج ہم جو کتب لکھ رہے ہیں، ہم زیادہ سے زیادہ اگلے پچاس سو برس کے قارئین کی علمی و ذہنی سطح کو ہی مد نظر رکھ سکتے ہیں۔ سن 2500 یا 3000 کے قارئین کی علمی و ذہنی سطح کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اس کے مطابق کتاب لکھ سکتے ہیں۔ تیسری صدی کے مورخین نے بھی جب کتب لکھیں تو ان کے پیش نظر ہم لوگ نہیں تھے بلکہ ان کے اپنے دور کے قارئین تھے۔ یہ لوگ پہلی دو صدیوں کے کم از کم مشہور راویوں اور مورخین سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگر ان کے سامنے مثلاً واقدی یا ابو مخنف یا ہشام کلبی کی کوئی روایت پیش کی جاتی تو یہ قارئین جانتے تھے کہ ان حضرات کا علمی مقام کیا ہے اور ان کی روایتوں پر کس درجے میں اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے وہ بآسانی یہ معلوم کر لیتے کہ قابل اعتماد روایت کون سی ہے اور ناقابل اعتماد کون سی۔

کتب تاریخ میں مستند اور جعلی روایتوں کے درج ہونے سے متعلق جو بات ہم نے کہی ہے، وہ اپنی جانب سے نہیں کی بلکہ خود ان مورخین نے یہی بات کہی ہے۔ ابن جریر طبری اپنی تاریخ کے مقدمہ (Preface) میں لکھتے ہیں:

> قارئین کتاب کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ میں نے جو اخبار و آثار (روایتیں) اس کتاب میں نقل کیے ہیں، اس میں میرا اعتماد انہی روایات پر ہے جنہیں میں نے ذکر کیا ہے اور جن کے ساتھ ان کی سندیں بھی موجود ہیں۔ اس میں وہ حصہ بہت ہی کم ہے جنہیں میں نے عقلی دلائل کے ادراک اور وجدانی استنباط کے بعد ذکر کیا ہے کیونکہ گزشتہ واقعات کی خبروں کا نہ ذاتی طور پر ہمارا مشاہدہ ہے اور نہ وہ زمانہ ہی ہم نے پایا ہے۔ ان کا علم ہمیں صرف ناقلین اور راویوں کی بیان کردہ خبروں ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ عقلی دلائل اور وجدانی استنباط سے۔ پس ہماری کتاب میں جو بعض ایسی

روایات ہیں، جنہیں ہم نے پچھلے لوگوں سے نقل کیا ہے، ان کے بارے میں اگر اس کتاب کے پڑھنے یا سننے والے اس بنا کر کوئی برائی یا عجیب پن محسوس کریں کہ اس میں انہیں صحت (Authenticity) کی کوئی وجہ اور معنی میں کوئی حقیقت نظر نہ آئے، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے انہیں خود اپنی طرف سے درج نہیں کیا ہے بلکہ ان کا ماخذ وہ ناقل (نقل کرنے والے) ہیں جنہوں نے وہ روایات ہمیں بیان کیں۔ ہم نے وہ روایات اسی طرح بیان کر دی ہیں جس طرح ہم تک پہنچیں۔[45]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود طبری کا نقطہ نظر یہ نہیں ہے کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔" ان تک جو روایتیں پہنچیں، انہوں نے انہیں آگے نقل کر دیا۔ اب یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ ان روایتوں کی سند اور متن کا تجزیہ کر کے ان کی چھان بین کریں۔ موجودہ دور میں تین عرب علماء محمد بن طاہر البرزنجی، محمد صبحی حسن حلاق اور شیخ یحیی ابراہیم یحیی نے پوری کی پوری تاریخ طبری پر تحقیق کر کے اس کی صحیح اور ناقابل اعتماد روایتوں کو الگ کر دیا ہے۔ ان کی کتاب کا نام ہے: " صحیح وضعیف تاریخ الطبری۔" اس کتاب کو 2007 میں دار ابن کثیر، بیروت نے شائع کیا ہے اور یہ www.waqfeya.com پر دستیاب ہے۔ ہم نے اس کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔

کیا امت کے اہل علم نے دوسری صدی کے مورخین پر اندھا اعتماد کیا ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب طبری اور دیگر مورخین نے ابو مخنف، ہشام کلبی، واقدی اور سیف بن عمر وغیرہ کی روایتیں نقل کی ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ پھر ہم ان پر اعتماد کیوں نہ کریں؟ یہ بات درست نہیں ہے کہ امت کے اہل علم نے دوسری صدی کے مورخین جیسے ابو مخنف، ہشام کلبی، واقدی اور سیف بن عمر پر اندھا اعتماد کیا ہے۔ جیسا کہ آپ طبری کے اقتباس میں دیکھ سکتے ہیں کہ انہوں نے خود بیان کر دیا ہے کہ ان کی حیثیت محض بات کو نقل کرنے والے اور مواد کو مہیا کر دینے والے کی سی ہے۔ انہوں نے ہر روایت کے ساتھ اس کی سند دے دی ہے۔ اب یہ قارئین کا کام ہے کہ وہ چھان بین خود کریں۔

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جیسے آج کمپیوٹر کے دور میں کوئی ادارہ تمام تاریخی روایات کا ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کرے۔ اب یہ ادارہ ایسا نہیں کرے گا کہ کتب تاریخ میں کانٹ چھانٹ شروع کر دے بلکہ تمام تاریخی روایات کو، جیسا کہ وہ ہم تک پہنچی ہیں، اس انسائیکلو پیڈیا میں درج کرے گا۔ پھر اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہر ہر روایت پر تبصرہ بھی شامل کتاب کر دیا جائے گا کہ یہ کس درجے میں مستند ہے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس ادارے کے نزدیک یہ تمام روایات قابل اعتماد ہیں۔

[45] طبری۔ مقدمہ۔ 1/17

قرون وسطی اور دور جدید میں علم تاریخ

قرون وسطی کی مشہور عربی کتب تاریخ کون سی ہیں؟

تیسری صدی ہجری کے بعد کے دور کی تاریخ کی کتب میں ایک رجحان یہ پیدا ہوا کہ سند کو حذف کیا جانے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روایات کی صورت میں بیان کردہ واقعات میں عبارت کی روانی اور تسلسل بر قرار نہیں رہ پاتا تھا۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعے کو لیجیے۔ روایات کی شکل میں اگر اسے بیان کیا جائے تو ایک راوی اس کا آغاز باغی تحریک کے ارتقاء سے کرتے ہیں اور پھر واقعات بیان کرتے کرتے اپنی روایت کو آپ کی شہادت پر ختم کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے راوی کا بیان شروع ہوتا ہے جو مثلاً باغیوں کی مدینہ آمد سے آغاز کرتے ہیں۔ پھر تیسرے راوی کا بیان شروع ہوتا ہے۔ قارئین کو اس طرز کی کتابوں سے شدید نوعیت کی بوریت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان میں مضامین کی بہت تکرار پیدا ہو جاتی ہے اور بسا اوقات یہ روایات ایک دوسرے کے متضاد تصویر پیش کر رہی ہوتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری سے ایسی کتابوں کا آغاز ہوا جن میں تاریخ کو ایک مسلسل بہاؤ (Stream) کی صورت میں بیان کیا جائے۔ ان کتابوں کو ادیبانہ اسلوب میں ناول یا کہانی کی طرح لکھا جانے لگا جن سے ان کا مطالعہ آسان ہو گیا لیکن دوسری طرف ان کی استنادی حیثیت (Authenticity) کمزور پڑ گئی۔ جن مصنفین نے یہ اہتمام کیا کہ واقعات کے ساتھ، سابقہ کتب کا حوالہ دے دیا جائے، ان کی کتابیں پھر بھی مستند مانی جاتی ہیں۔

اس دور میں ایک مسئلہ یہ بھی ہوا کہ مورخین نے ماخذ کی چھان بین (Source Criticism) کے عمل کو یا تو بالکل ہی نظر انداز کر دیا یا پھر اس کا استعمال بہت کم کیا۔ اسی طرح متن کی چھان بین (Internal and External Criticism and Historical Reasoning) کا عمل بھی انہوں نے بہت ہی کم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ واقدی، ابو مخنف، سیف بن عمر اور ہشام کلبی کی سچی جھوٹی روایتیں اس طرح نقل ہونے لگیں کہ گویا وہ سچ ہیں۔ بعد کی صدیوں میں تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ سند کو غیر ضروری سمجھ کر حذف کیا جانے لگا۔ اس طرح ماخذ کی چھان بین کا رواج سرے سے ختم ہو کر رہ گیا۔ مناسب ہو گا کہ ہم بعد کی صدیوں کے مشہور مورخین اور ان کی کتب تاریخ کا تعارف بھی کروا دیں تاکہ قارئین کو ان کتابوں کی صحت (Authenticity) کے بارے میں علم ہو سکے۔

1۔ علی بن حسین مسعودی (d. 346/957): مسعودی ایک بڑے شیعہ عالم اور سیاح تھے۔ انہوں نے ایک نہایت ہی مفصل تاریخ لکھی۔ قمر بخاری صاحب لکھتے ہیں:

> یہ کتاب علی بن حسین مسعودی (وفات 346 ہجری) نے لکھی ہے، ممکن ہے کہ وہ شیعہ اثنا عشری ہوں مگر اس بات کا اندازہ "مروج الذہب"

میں موجود مطالب سے نہیں لگایا جاسکتا بلکہ اس سے فقط ان کے مذہب شیعہ کی طرف مائل ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہ کتاب مقامات کے سفر کر کے نہایت تحقیق اور جستجو کے بعد لکھے جانے کی وجہ سے کافی اہمیت کی حامل ہے، انہوں نے اپنی کتاب میں ابو مخنف کا بہت ذکر کیا ہے۔[46]

چونکہ اہل تشیع کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایک خاص موقف ہے، اس وجہ سے تاریخ کے باب میں ان کا بیان معتبر نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔

2۔ ابن عبد البر (368-463/979-1071): یہ پانچویں صدی ہجری کے عالم ہیں۔ انہوں نے "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" کے نام سے سیرت صحابہ پر ایک مفصل کتاب لکھی۔ انہوں نے اس کتاب میں بیان کردہ واقعات کی سند بیان نہیں کی، اس وجہ سے ہم نہیں جانتے کہ عہد صحابہ اور ابن عبد البر کے درمیان چار سو سال میں ان روایات میں کیا چیز داخل کر دی گئی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب مستند نہیں سمجھی گئی۔ ابن عبد البر کی کتاب میں بیان کردہ جو واقعات ان سے پہلے کی کتابوں میں پائے جائیں، ان کی تحقیق کر کے ان کے مستند ہونے کو پرکھا جاسکتا ہے لیکن وہ واقعات، جو ان سے پہلے کی کتابوں میں درج نہیں ہیں، سرے سے ہی غیر مستند ہیں۔ محدثین نے اس کتاب کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے:

> ابن عبد البر کی الاستیعاب بڑی جلیل القدر اور کثیر الفوائد کتاب ہوتی اگر اس میں صحابہ کرام کے اختلافات سے متعلق روایات، محدثین کی بجائے اخباری لوگوں سے نہ لی جاتیں۔ اخباری (مورخین) عام طور پر واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اپنی بیان کردہ چیزوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔[47]

3۔ ابن الاثیر الجزری (555-630/1160-1233): یہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور مورخ ہیں اور ان کا تعلق الجزائر سے ہے تاہم ان کا وقت موصل، عراق میں بھی گزرا ہے۔ انہوں نے دو کتابیں لکھیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ ایک "الکامل فی التاریخ" اور دوسری "اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ۔" پہلی زمانی ترتیب کے مطابق لکھی اور دوسری سیرت صحابہ سے متعلق۔ انہوں نے دونوں کتابوں میں سند کا اہتمام نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کی کتب کی حیثیت مشکوک ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ عہد صحابہ کے چھ سو برس بعد کے مورخ ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ ان روایات کے ساتھ چھ سو برس میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ ان کی بیان کردہ جو روایتیں تیسری صدی کی کتب میں سند کے ساتھ مل جائیں، ان پر تحقیق تو کی جاسکتی ہے لیکن جو روایتیں ان میں بھی نہ ملیں، ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اپنی کتاب "الکامل" سے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں:

> میں یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ تاریخ سے متعلق تمام واقعات میں نے جمع کر دیے ہیں۔ اس لیے کہ موصل شہر میں رہنے والے ایک شخص کو مشرق و مغرب میں ہونے والے تمام واقعات کا علم کیسے ہو سکتا ہے۔ میں یہ دعوی بھی نہیں کرتا کہ میں نے اپنی کتاب میں وہ سب کچھ اکٹھا کر دیا ہے جو

---

[46] قمر بخاری، ایضا۔

[47] ابن صلاح، مقدمہ۔ النوع 39: معرفۃ الصحابہ۔485۔ قاہرہ: دار المعارف۔

پہلے کسی ایک کتاب میں نہیں ہے۔ جس شخص کو (کسی واقعے کی) صحت کے بارے میں شک ہو (تو میں اپنے طریقے کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔) میں نے ابو جعفر طبری کی التاریخ الکبیر سے آغاز کیا ہے۔ یہ وہ واحد کتاب ہے جس پر میں نے اعتماد کیا ہے اور اس کی اکثر روایات کو بیان کر دیا ہے۔ طبری میں (ایک ہی واقعے کی) جو متعدد روایات ہیں، انہیں میں نے کچھ کمی بیشی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ان روایات میں جو کمی پائی جاتی ہو، اسے پورا کر دیا جائے اور اس میں ان معلومات کا اضافہ کر دیا جائے جو طبری نے بیان نہیں کی ہیں۔ میں نے ہر واقعے کے بیان کی روایات کے تمام طرق (Versions) کو اکٹھا کر کے اسے ایک مسلسل واقعے کی شکل میں بیان کیا ہے۔

مشہور تاریخی کتب میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اسے اکٹھا کرنے کے بعد میں نے اس میں ان روایات کا اضافہ کر دیا ہے جو تاریخ طبری میں نہیں پائی جاتی ہیں اور ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھ دیا ہے سوائے اس کے کہ جو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واقعات پیش آئے۔ ان کے معاملے میں میں نے ابو جعفر (طبری) کی منقول روایات کے علاوہ کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا سوائے اس کے کہ کچھ تفصیلات کا اضافہ ہو، یا کسی انسان کا نام ہو، یا کوئی ایسی بات ہو جس پر کوئی اعتراض نہ کیا گیا ہو۔ میں نے مورخین میں انہی لوگوں پر اعتماد کیا ہے جو کہ ماہر ہوں، سچا عقیدہ رکھتے ہوں اور علم کو جمع کرتے ہوں۔ میں نے مذکورہ تواریخ اور مشہور کتب کے علاوہ کہیں اور سے کچھ نقل نہیں کیا ہے۔ ان مورخین کے سچائی کے ساتھ نقل کرنے اور صحت کے ساتھ مدون کرنے کا معاملہ معروف ہے۔ میں اس شخص کی طرح نہیں ہوں جو رات کی تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارے اور نہ ہی اس کی طرح ہوں جو کہ پتھر اور کنکریاں جمع کرے۔[48]

ابن اثیر کے اپنے بیان سے واضح ہے کہ ان کی حیثیت محض ناقل کی ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے کہ مشہور کتب تاریخ سے مواد اکٹھا کیا جائے اور اس معاملے میں پوری دیانتداری سے کام لیا ہو گا۔ تاہم جیسے کمپیوٹر سائنسز کی مثل مشہور ہے کہ Garbage in garbage out، بالکل اسی طرح اگر ابن اثیر کے مآخذ میں کوئی الٹی سیدھی اور غیر مستند روایت تھی تو انہوں نے اسے بھی ٹھیک ٹھیک منتقل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابن اثیر کی اپنی کتاب کی استنادی حیثیت (Authenticity) کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے جو روایات تاریخ طبری اور کسی اور مشہور کتاب سے اخذ کی ہیں، ان کی سند کو طبری وغیرہ سے دیکھ کر تحقیق کرنی چاہیے۔ ابن اثیر کی ایسی روایتیں جو طبری یا کسی اور قدیم ماخذ میں نہیں ہیں، کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ واقعہ بیان کر کے فٹ نوٹ میں ابن اثیر کا حوالہ دے دیتے ہیں، ان کا یہ طرز عمل درست نہیں ہے۔ اگر واقعہ کے بارے میں کوئی شک پایا جائے تو اس کی سند اور متن کی پوری تحقیق ضروری ہے۔

4۔ ابن عساکر (499-571/1106-1175): یہ چھٹی صدی کے بڑے عالم ہیں۔ انہوں نے شام کی تاریخ پر ایک مفصل کتاب لکھی جو کہ 80 جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب "تاریخ مدینہ دمشق" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے شام میں رہنے والے اور یہاں سفر کر کے آنے والے ہزاروں لوگوں کے حالات زندگی سند کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

[48] ابن الاثیر (d. 630/1233)۔ الکامل فی التاریخ۔ 7-1/6۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ (ac. 11 Dec 2009) www.waqfeya.com

4۔ ابن کثیر (701-774/1301-1372): ابن کثیر آٹھویں صدی کے مشہور عالم ہیں اور ان کی کتاب "البدایہ و النہایہ" کو بعد کی صدیوں میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ مشہور عالم ابن تیمیہ (661-728/1263-1327) کے شاگرد تھے۔ ابن کثیر نے تاریخ طبری ہی کو بنیاد بنایا ہے اور جہاں طبری میں بیان کردہ روایات پیش کی ہیں، وہاں اس سے مختلف تصویر پیش کرنے والی روایات بھی دیگر کتب حدیث اور تاریخ سے اکٹھی کر دی ہیں۔ اس طرح سے انہوں نے نہایت غیر جانبداری کے ساتھ تصویر کے دونوں رخ پیش کیے ہیں۔ بعض حضرات ابن کثیر سے کوئی روایت پیش کر کے یہ دعوی کر دیتے ہیں کہ یہ روایت بہت ہی مستند ہے کیونکہ ابن کثیر نے اسے نقل کر دیا ہے۔ یہ دعوی اس وجہ سے درست نہیں ہے کیونکہ ابن کثیر خود ان روایات کو درست نہیں سمجھتے ہیں اور اپنی کتاب میں کئی جگہ پر اس نوعیت کا تبصرہ انہوں نے ان روایات پر کیا ہے:

> جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اس کا بعض حصہ محل نظر ہے۔ اگر ابن جریر (طبری) وغیرہ حفاظ اور ائمہ نے اس کا ذکر نہ کیا ہوتا تو میں اسے بیان نہ کرتا۔ اس کا اکثر حصہ ابو مخنف لوط بن یحیی کی روایت سے ہے جو کہ شیعہ تھا اور ائمہ کے نزدیک واقعات بیان کرنے میں ضعیف (ناقابل اعتماد) ہے۔ لیکن چونکہ وہ اخباری اور (خبروں کا) محفوظ کرنے والا ہے اور اس کے پاس ایسی چیزیں ہیں جو اس کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہیں، اس وجہ سے اس کے بعد کے کثیر مصنفین نے اس پر کڑی تنقید کی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔[49]

اس سے ظاہر ہے کہ کسی روایت کو مستند ثابت کرنے کے لیے محض اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ ابن کثیر نے اسے نقل کیا ہے بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ ابن کثیر نے اس روایت کو کس کتاب سے نقل کیا ہے۔ پھر اس کتاب میں اس روایت کی سند دیکھی جائے گی اور پھر تاریخی تنقید کے اصولوں کے تحت فیصلہ کیا جائے گا۔

5۔ ابن خلدون (732-808/1332-1405): ابن خلدون علوم انسانیات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ انہیں علم بشریات (Anthropology) اور عمرانیات (Sociology) کا بانی کہا جاتا ہے۔ مسلم علماء میں سے جن چند شخصیات کو اہل مغرب کے ہاں غیر معمولی اہمیت دی گئی، ان میں سے ایک ابن خلدون ہیں۔ دنیا بھر کی بہت سی یونیورسٹیوں میں ان کے نام پر چیئرز قائم ہیں اور کئی اداروں کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی تاریخ کا جو شہرہ آفاق "مقدمہ" لکھا، اس میں تاریخ سے زیادہ بشریات اور عمرانیات سے متعلق مواد موجود ہے۔ ابن خلدون کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخ کو محض نقل کر دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ واقعات کا عمرانی تجزیہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ جس دور سے وہ واقعہ منسوب ہے، اس کے مجموعی حالات (Ethos) میں اس واقعے کا ہونا عقلاً ممکن ہے بھی یا نہیں۔ پچھلے باب میں ہم نے تاریخی تنقید کے جو اصول بیان کیے ہیں، اگرچہ وہ ابن خلدون سے پہلے دریافت ہو چکے تھے مگر تاریخ پر ان کا بڑے پیمانے پر اطلاق ابن خلدون ہی نے کیا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے جو تجزیہ کر دیا ہے، وہ حرف آخر ہے اور اس پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کتاب میں ہم نے بھی ایک حد تک ابن خلدون کے بیان کردہ انہی

[49] ابن کثیر 11/577

اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاں تاریخ کی بنیاد پر فرقہ بندی اپنے عروج کو پہنچی اور یہ تقسیم گہری ہوتی چلی گئی۔ اس سے پہلے تمام مسلمان، خواہ ان کے سیاسی اور تاریخی نظریات کچھ بھی ہوں، اکٹھے نماز پڑھتے تھے اور مل جل کر رہتے تھے۔ اگلے دو تین سو برس میں یہ تقسیم گہری ہوتی چلی گئی اور ان فرقوں میں باہم مناظرے بازی نے جنم لیا۔ ان مناظروں میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق روایات پیش کی جائیں۔ چھٹی ساتویں صدی ہجری تک علمی و ذہنی سطح تبدیل ہو چکی تھی اور مختلف علوم میں بہت وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ اب عام پڑھے لکھے شخص کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ سابقہ صدیوں کے ہر بڑے راوی کے بارے میں معلومات رکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں روایات کی تنقید کے عمل نے زور پکڑا۔ چوتھی صدی ہی میں روایات کی تنقید اور راویوں کے حالات سے متعلق فنون پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدی میں ان کتابوں میں موجود معلومات کو یکجا (Amalgamation) کر کے جامع ترین انسائیکلو پیڈیا تیار ہوئے۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں صدی میں تاریخی روایتوں کی چھان بین بھی کی جانے لگی۔ اس زمانے میں بڑے بڑے تاریخی نقاد پیدا ہوئے جن میں ابن کثیر (701-774/1301-1372)، ابن خلدون (732-808/1332-1405) اور ابن حجر عسقلانی (773-852/1371-1448) نمایاں تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی ٹرینڈ کسی معاشرے میں جاری ہو تو نیا ٹرینڈ آ جانے سے پرانا ٹرینڈ یک دم ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے دور میں کمپیوٹر کی ایجاد سے پرنٹنگ پریس کا دور ختم نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بھی پانچ سو سال بعد تک ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں چلتی رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح تیسری صدی ہجری کے مورخین نے جو ٹرینڈ شروع کیا تھا کہ ہر طرح کی روایت کو اکٹھا کر لیا جائے، بہر حال جاری رہا۔ ابن عبد البر (368-463/979-1071) اور ابن اثیر (555-630/1160-1233) کی کتابیں اسی رجحان کے مطابق لکھی گئیں۔ تاہم پانچویں صدی میں آ کر ایک تبدیلی یہ پیدا ہوئی کہ سند کو غیر ضروری سمجھ کر حذف کیا جانے لگا تا کہ عبارت کا تسلسل بر قرار رہے۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک رجحان ثابت ہوا اور اس کے نتیجے میں بہت سی روایات بغیر کسی چھان بین کے مورخین میں عام رواج پا گئیں۔

دسویں صدی سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک پانچ سو برس کا زمانہ مسلمانوں کے ہاں علمی جمود، شخصیت پرستی اور اندھی تقلید کا دور ہے۔ اگرچہ بڑی علمی شخصیات اس دور میں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں جنہوں نے تاریخی روایات کا ناقدانہ جائزہ لیا، لیکن اہل علم کی اکثریت بس اسی کو کافی سمجھتی رہی ہے کہ قرون وسطی میں لکھی ہوئی کتابوں کے مندرجات کو محض اس وجہ سے قبول کر لیا جائے کہ اسے کسی بڑے عالم نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ چنانچہ کسی بات کو مقبول بنانے کے لیے یہ کہنا ہی کافی ہو گیا کہ ابن اثیر، ابن کثیر یا ابن خلدون نے اسے اپنی کتب تاریخ میں درج کیا ہے۔

اب پندرہویں صدی ہجری یا اکیسویں صدی عیسوی میں اس رجحان میں تبدیلی آ رہی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے مسلم

نوجوانوں کے ذہنوں کو وسیع کرنے کے عمل کا آغاز کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سابقہ چودہ صدیوں کا علمی ریکارڈ انٹرنیٹ پر بلا معاوضہ دستیاب ہو چکا ہے۔ لوگوں میں دینی علم کو سیکھنے، آن لائن کتابیں پڑھنے اور اندھی تقلید اور شخصیت پرستی سے ہٹ کر معاملات کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا رجحان پرورش پا رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سابقہ مورخین کے کام کو کافی نہ سمجھیں بلکہ فن تاریخ کے مسلمہ اصولوں کے تحت روایات کا تنقیدی جائزہ لے کر ہی کسی بات کو قبول یا رد کریں۔

اردو کی کتب تاریخ کون سی ہیں؟

اردو زبان میں کتابیں لکھے جانے کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اردو زبان، ایک علمی زبان کے طور پر ابھرنا شروع ہوئی اور انیسویں صدی کے وسط میں اس میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اردو میں تاریخ پر زیادہ تر کام بیسویں صدی میں ندوۃ العلماء اور دار المصنفین اعظم گڑھ کے اداروں میں ہوا۔ ان دونوں اداروں کے بانی مولانا شبلی نعمانی (1857-1915) تھے۔ جن ندوی علماء نے اسلام کے اولین دور کی تاریخ لکھی ان میں شاہ معین الدین ندوی نمایاں تھے۔ اسی دور میں مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی (1875-1938) نے بھی اپنی کتاب "تاریخ اسلام" لکھی۔ شیعہ عالم جسٹس امیر علی (1849-1928) نے اس موضوع پر انگریزی میں دو کتابیں Short History of Saracens اور Spirit of Islam لکھیں جن کے اردو تراجم شائع ہوئے۔

ان تمام اہل علم نے اپنی تواریخ لکھتے ہوئے قرون وسطی کی کتب تاریخ جیسے تاریخ ابن اثیر، ابن کثیر، ابن عبد البر، ابن خلدون اور اسی نوعیت کے دیگر مآخذ پر انحصار کیا۔ بہت کم ہی ایسا ہوا ہے کہ اردو یا انگریزی کے کسی مورخ نے ابتدائی صدیوں کی کتب تاریخ میں جا کر واقعات کے اصل مآخذ کی جانچ پڑتال (Source Criticism) سے کام لیا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخی اعتبار سے بالکل ہی گئی گزری روایات کو اس طرح بیان کیا جانے لگا کہ یہ گویا کہ بالکل ہی سچے اور حقیقی واقعات ہیں۔ اکبر شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں ایک حد تک درایت (Internal Criticism) کے اصولوں سے کام لیا ہے، تاہم تمام واقعات کے بارے میں انہوں نے یہ روش اختیار نہیں کی ہے اور بہت سے واقعات کی تحقیق کیے بغیر انہیں سابقہ مورخین پر اعتماد کرتے ہوئے بیان کر دیا ہے۔

بہت سے اہل علم نے جزوی طور پر بعض واقعات جیسے شہادت عثمان، عہد معاویہ اور شہادت حسین رضی اللہ عنہم کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں اور ان میں تاریخی تنقید کے اصولوں سے کام لیا ہے تاہم ابھی تک کوئی ایسی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزر سکی جس میں مصنف نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پورے دور سے متعلق واقعات کی چھان بین کی ہو۔ اردو کے تاریخی لٹریچر میں موجود اس خلا نے ہمیں یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا ہے۔

صحابہ کرام کی کردار کشی

اس سیکشن میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ کون سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کی گئی اور اس کے اسباب کیا تھے؟ اس

کے ساتھ ساتھ ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ کردار کشی کن لوگوں نے کی اور یہ روایتیں تاریخ کی کتابوں میں منتقل کیسے ہوئیں؟

کردار کشی کی مہم کے اسباب بنیادی طور پر تین قسم کے تھے: سیاسی، مذہبی اور قبائلی۔ ہم ان کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

1۔ سیاسی اسباب

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں حکومت وقت کے خلاف متعدد باغیانہ تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کی یہ ضرورت تھی کہ عوامی حمایت حاصل کی جائے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے کارکنان کے جذبات کو مشتعل کرنے کی ضرورت تھی۔ ان باغیانہ تحریکوں کے قائدین کو یہ کام آسان لگا کہ ماضی کی شخصیتوں کا نام استعمال کر کے لوگوں کی حمایت حاصل کی جائے اور ان کے جذبات کو مشتعل کیا جائے۔

اس مقصد کے لیے جس ہستی کے نام کو سب سے زیادہ استعمال کیا گیا، وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ذات تھی۔ ایک پارٹی نے آپ سے غیر معمولی عقیدت کا اظہار کیا اور آپ کی شخصیت کو ایک دیوتا کی سی حیثیت دینے (Idolization) کی کوشش کی۔ بعض لوگوں نے آپ کو صحابہ کرام میں سب سے افضل قرار دیا تو بعض نے آپ کا درجہ نبی بلکہ اس سے بھی بلند کرنے کی کوشش کی۔ بعض افراد نے آپ کو خدا کا اوتار قرار دیا اور بعض نے یہ کہا کہ آپ کے اندر خدا حلول کر گیا تھا۔ اس کے برعکس مخالف پارٹیوں نے آپ کی کردار کشی (Demonization) کی کوشش کی اور آپ کو جلیل القدر صحابی کے درجے سے اتار کر آپ پر معاذ اللہ کفر کا فتوی عائد کیا یا پھر آپ کو قاتل عثمان بنانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ جن صحابہ کرام کا اختلاف رائے حضرت علی کے ساتھ ہوا، انہیں بھی مختلف پارٹیوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق ہیرو یا ولن بنانے کی کوشش کی۔ ان میں خاص طور پر حضرت طلحہ، زبیر، عائشہ، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خلفائے ثلاثہ حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کی گئی۔

بعینہ یہی معاملہ سانحہ کربلا کے ساتھ ہوا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے واقعات سنا کر چونکہ لوگوں کے جذبات مشتعل کر کے تحریک اٹھانا آسان تھا، اس وجہ سے اس پورے واقعے کو رومانوی رنگ (Romanticizing) دے دیا گیا۔ اس کے برعکس حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی حکومت کی قربانی دے کر مسلمانوں میں جو اتحاد پیدا کیا، اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ باغیانہ تحریکوں کے لیے اس میں کوئی ایسی مثال موجود نہ تھی جس سے وہ لوگوں کے جذبات کو ابھار سکتے۔ جن لوگوں کو حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سے کسی وجہ سے بغض تھا، انہوں نے ان حضرات کی کردار کشی بھی کی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خاص کر ان حضرات کی کردار کشی کی گئی ہے جو کسی نہ کسی درجے میں سیاسی امور میں شریک رہے۔ ایسے صحابہ جو سیاست سے دور رہے، کے بارے میں ہمیں بہت ہی کم کردار کشی پر مبنی روایات ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تنقیدی روایات مل جاتی ہیں لیکن ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اسی طرح حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی کردار کشی کی گئی ہے لیکن انہی کے عابد و زاہد فرزند عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا سبھی

احترام کرتے ہیں۔

انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے مفادات کی عینک سے دنیا کو دیکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر جھوٹ سے بھی کام چلا لیتا ہے۔ دنیاوی اور دینی معاملات سبھی میں ایسا ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے دور کا جائزہ لیں تو ایسا ہی نظر آتا ہے۔ جو لوگ بھی سیاست کے میدان میں اترتے ہیں، ان کی اخبارات بھی جی کھول کر کردار کشی کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ جو خاموشی سے علمی مشاغل یا عبادت میں مشغول رہتے ہیں، ان کے بارے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹی موٹی مساجد کے امام صاحبان محفوظ رہتے ہیں جبکہ بڑی بڑی مساجد کے ائمہ کے خلاف سازشیں کر کے انہیں معزول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت اور کاروباری اداروں کے چھوٹے موٹے ملازمین کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا مگر بڑے بڑے عہدوں پر فائز لوگوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا ہے۔

2۔ مذہبی اسباب

صحابہ کرام کی کردار کشی کے مذہبی محرکات بھی انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ جن لوگوں کو اسلام سے نفرت تھی اور انہوں نے مجبوراً اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، نے اسلام کو بدنام کرنے کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ جلیل القدر صحابہ کی کردار کشی کی جائے تاکہ اسلام کو بدنام کیا جا سکے۔ اس میں خاص کر عبد اللہ بن سبا اور اس کی پارٹی کے لوگ نمایاں تھے۔ نویں صدی کے مشہور محدث ابن حجر عسقلانی (773-852/1371-1448)، ابو زرعۃ الرازی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

> جب آپ کسی ایسے شخص کو دیکھیں جو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی کی کردار کشی کرتا ہے تو جان لیجیے کہ وہ شخص زندیق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں، قرآن برحق ہے اور جو کچھ حضور لائے ہیں، حق ہے۔ یہ سب کچھ ہم تک صحابہ کرام ہی کے واسطے سے پہنچا ہے تو ان صحابہ پر اعتراض کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے گواہوں کو مجروح کریں تاکہ اس طرح قرآن اور حدیث ہی کو بے کار بنا کر رکھ دیں۔ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ خود ایسے لوگوں کو قابل اعتراض اور مجروح قرار دیا جائے۔ [50]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کا یہ مذہبی محرک ابتدائی صدیوں میں نمایاں رہا ہے۔ اسلام نے جزیرہ نما عرب اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر غلبہ پا لیا تھا، اس وجہ سے یہاں پر پہلے سے موجود مذاہب کے لوگوں میں ایک بے چینی پائی جاتی تھی کیونکہ وہ اسلام کو اپنے مذاہب کے لیے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ ان میں خاص کر عرب کے قدیم مشرکانہ دین، یہودیت، مجوسیت اور مانی ازم کے لوگ نمایاں تھے۔ ان لوگوں نے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے اپنے تئیں یہ کوشش کی کہ وہ بظاہر مسلمانوں کے لبادے میں سامنے آئیں اور اسلام سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کریں۔ عربوں میں یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ارتداد کی تحریک پیدا کی اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت برپا کی۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں انہی لوگوں نے فتنہ و فساد برپا کیے رکھا۔

---

[50] ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ مقدمہ۔ 1/24۔ قاہرہ: مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیہ و اسلامیہ۔

پہلی صدی ہجری میں ان میں صرف ایک شخصیت ایسی ہے جو غیر معمولی طور پر نمایاں ہے اور اس کا نام ہے عبد اللہ بن سبا۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے خاص کر اسی مقصد کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا اور عبادت و ریاضت سے اپنا سکہ مسلمانوں پر جمانے کی کوشش کی۔ اس نے مختلف شہروں میں ڈیرہ ڈال کر یہ کوشش کی کہ حکومت وقت کے خلاف ایک باغیانہ تحریک پیدا کر دی جائے اور اس کے لیے اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کو خوب استعمال کیا۔ موجودہ دور کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابن سبا کوئی حقیقی نہیں بلکہ محض ایک افسانوی شخصیت تھی۔ اس موضوع پر ہم تفصیل سے آگے گفتگو کریں گے۔

دوسری صدی ہجری میں جب بنو عباس بر سر اقتدار آئے تو ان کے ساتھ ایران اور خراسان کے باشندوں کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان میں قدیم ایرانی مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے۔ انہوں نے پہلی صدی ہجری کی باغی تحریک کے ساتھ تعلق قائم کیے اور ان کے ساتھ مل کر ایسی روایتیں وضع کیں جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کردار کو مجروح کر کے ان پر سے امت کا اعتماد اٹھایا جائے۔ چونکہ صحابہ کرام ہی کے ذریعے قرآن اور حدیث امت تک پہنچی ہے، اس وجہ سے ان پر اعتماد اٹھ جانے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگوں کا قرآن و حدیث پر ہی اعتماد اٹھ جاتا۔ چنانچہ کثیر تعداد میں روایتیں گھڑی گئیں اور انہیں مسلمانوں میں پھیلایا گیا۔ دوسری صدی کے مورخین کے بارے میں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ان کی غالب اکثریت ایسی تھی جو ہر قسم کے رطب و یابس کو قبول کر لیتی تھی۔ انہوں نے ان روایتوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی کتب تاریخ کا حصہ بنا لیا۔ ان سے یہ روایتیں تیسری صدی ہجری کی کتب تاریخ میں آئیں اور وہاں سے بعد کی صدیوں کی کتب تاریخ کا حصہ بن گئیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ان لوگوں کا یہ داؤ کامیاب ہو گیا ہو۔ اللہ تعالی نے چونکہ اپنے دین کی حفاظت کرنا تھی، اس وجہ سے اس نے محدثین کی صورت میں اس فتنہ کا سدباب کر دیا۔ انشاء اللہ مسلمانوں کی علمی تاریخ کے ضمن میں ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ اس موقع پر محدثین میں ایک عجیب تحریک پیدا ہوئی اور وہ یہ تھی کہ حدیث کو بیان کرنے والے راویوں کے حالات کا سراغ لگایا جائے اور یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ یہ لوگ کس درجے میں قابل اعتماد تھے۔ اس کے لیے جو غیر معمولی محنت ان محدثین نے کی، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اب جانتے ہیں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ سے متعلق معلومات کے قابل اعتماد مآخذ کون سے ہیں اور ناقابل اعتماد کون سے۔ اگرچہ محدثین کا فوکس احادیث کے راویوں پر تھا لیکن انہوں نے اسی کے ضمن میں تاریخی روایات کے راویوں سے متعلق بھی اہم معلومات ہم تک پہنچا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی روایتیں گھڑنے کے باوجود امت نے بحیثیت مجموعی صحابہ کرام کے بارے میں ان روایات کو قبول نہیں کیا اور آج بھی امت کی غالب اکثریت سبھی صحابہ سے دل و جان سے محبت کرتی ہے۔

3۔ قبائلی اسباب

اس کے علاوہ ایک اور فیکٹر بھی ایسا ہے جس کی وجہ سے بعض مخصوص لوگوں کی کردار کشی کی گئی جن میں سے بعض صحابہ ہیں اور بعض

تابعین۔ ہم جانتے ہیں کہ مختلف عرب قبائل میں ایک دوسرے دشمنیاں پائی جاتی تھیں۔ ان میں بنو کلاب، بنو طے، بنو ازد، بنو نخع، بنو کندہ وغیرہ وہ قبائل تھے جو عراق کی فتح کے بعد بصرہ اور کوفہ میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کی باہمی چپقلش اسلام کے بعد بھی جاری رہی۔ جب راویوں نے تاریخی روایات بیان کرنا شروع کیں تو انہوں نے قبائلی دشمنی میں اپنے مخالف افراد کے نام مختلف جرائم کے ضمن میں بیان کر دیے۔ حضرت عثمان کی شہادت ہو یا حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی، جنگ جمل ہو یا جنگ صفین، سانحہ حرہ ہو یا کوئی اور واقعہ۔۔۔راویوں نے اپنے مخالف قبائل اور ذیلی قبائل کو بدنام کرنے کے لیے ان کے نام جھوٹ منسوب کیا۔ اس وجہ سے تاریخی روایات کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جس شخص کی کردار کشی کی جا رہی ہے، اس کے قبیلے اور راوی کے قبیلے میں کوئی دشمنی تو نہیں تھی؟ اس کے لیے عرب قبائل کے باہمی تعلقات اور تاریخی شخصیات اور راویوں کے شجرہ نسب کا مطالعہ نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اس کے لیے انساب کی کتب سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

تاریخی روایات (Historical Reports) اور ان کے راویوں (Narrators) کی چھان بین

اوپر ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ تاریخی معلومات کی تحقیق اور تجزیہ کیسے کیا جاتا ہے؟ خاص کر ایسی تاریخی روایات جن سے کوئی بڑا سیاسی یا مذہبی اختلاف پیدا ہو، کی تفصیلی چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے اور ماخذ کی تحقیق، داخلی تحقیق، خارجی تحقیق اور تاریخی اسباب کا تجزیہ کے تمام طریقوں کو اختیار کرنا وہاں ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف عام طور پر انہی روایات میں پایا جاتا ہے جن میں مخصوص صحابہ کرام کی کردار کشی کی گئی ہے۔ اس سیکشن میں ہم دیکھیں گے کہ ان تاریخی روایات کی چھان بین کیسے کی جائے؟

کون سے راویوں نے صحابہ کرام سے جھوٹ منسوب کیا؟

اگر ہم کتب تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور دیگر شخصیات کی کردار کشی پر مبنی روایات کا 99% حصہ صرف چند افراد سے مروی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جو دوسری یا تیسری صدی ہجری کے مشہور "اخباری" ہیں۔ ان میں ابو مخنف لوط بن یحیی، محمد بن سائب الکلبی، ہشام بن محمد الکلبی، محمد بن عمر الواقدی اور سیف بن عمر التیمی نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں لیکن ان سے مروی ایسی روایات کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

ان مورخین کے بارے میں اوپر جو تفصیلات جرح و تعدیل کے ماہرین نے بیان کی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام کے تمام راوی شدید ضعیف، متعصب اور ناقابل اعتماد تھے۔ ان میں سے اکثر پر یہ الزام ہے کہ جھوٹ گھڑ کر صحابہ کرام کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ فن تاریخ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اگر ایک شخص کسی معاملے میں متعصب ہو، تو اس کی بات کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ یہ تمام حضرات عہد صحابہ کے ساٹھ ستر سال بعد پیدا ہوئے۔ یہ ان واقعات کے چشم دید گواہ نہ تھے بلکہ انہوں نے ادھر ادھر سے

روایتیں جمع کر کے اپنی کتابیں مرتب کر لیں جو بعد کی کتب کا حصہ بن گئیں۔ پھر یہ جن راویوں کی بنیاد پر یہ واقعات بیان کرتے ہیں، ان میں سے اکثر کے حالات زندگی معلوم نہیں ہیں اور اس بات کا تعین نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ راوی قابل اعتماد تھے یا نہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان متعصب اخباریوں نے اپنی روایتوں کے متن کی طرح سندیں بھی گھڑ کر ان کے ساتھ لگا لی ہوں۔ چونکہ انہوں نے نامعلوم راویوں کے نام نقل کیے ہیں، اس وجہ سے ہمیں معلوم نہیں کہ وہ راوی بھی قابل اعتماد تھے یا نہیں تھے، یا ان کا کوئی وجود بھی تھا یا نہیں تھا۔

کیا راویوں کی چھان بین حسن ظن کے قرآنی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

یہاں پر ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب ہمیں قرآن مجید نے حسن ظن کا حکم دیا ہے تو پھر ان راویوں سے متعلق بھی حسن ظن ہی کیوں نہ رکھا جائے اور ان کی باتوں کو قبول کیوں نہ کیا جائے۔ اس کے جواب کے لیے ایک مثال پر غور کیجیے۔ اگر ہمیں کسی شخص سے کروڑوں کی ڈیل کرنا ہو یا اس کے ساتھ اپنی بچی کا رشتہ کرنا ہو اور ہمارا کوئی قابل اعتماد دوست ہمیں آ کر یہ بتائے کہ یہ شخص دراصل بہت بڑا فراڈیا اور دھوکے باز ہے تو کیا ہمیں حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس شخص سے معاملہ کر لینا چاہیے؟ یقینی طور پر ہمیں اس شخص سے حسن ظن تو رکھنا چاہیے مگر اس سے ڈیل میں احتیاط برتنی چاہیے۔ ہم یا تو اس شخص کے بارے میں تحقیقات کریں گے اور اگر تحقیق ممکن نہ ہوئی اور ڈیل کرنے سے اجتناب کریں گے۔ بعینہ یہی معاملہ ان راویوں کے ساتھ بھی کرنا چاہیے کہ ان سے حسن ظن رکھتے ہوئے ان کی روایتوں کو قبول کرنے میں احتیاط برتنا چاہیے۔ یہ احتیاط حسن ظن کے خلاف نہیں ہے۔ سورۃ الحجرات میں جہاں ہمیں حسن ظن کا حکم دیا گیا ہے، وہاں اس بات کا حکم بھی موجود ہے کہ کسی غلط شہرت رکھنے والے کی بات پر قدم اٹھانے سے پہلے اس بات کی تحقیق کر لینا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ.

اے اہل ایمان! اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی فاسق خبر لے آئے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی گروہ کو جہالت میں نقصان پہنچا بیٹھیں اور پھر اپنے فعل پر نادم ہوں۔ (الحجرات 49:6)

اب چونکہ ان راویوں کے بارے میں ہمیں نہایت ہی قابل اعتماد اہل علم میں سے ایک دو نہیں بلکہ دسیوں افراد نے بتا دیا ہے کہ یہ متعصب اور جھوٹ گھڑنے والے لوگ ہیں، اس وجہ سے ہمیں چاہیے کہ ان کی بیان کردہ روایات کی چھان بین ضرور کر لیں۔ ہمیں ان راویوں کی ذات سے کوئی دشمنی نہیں رکھنی چاہیے لیکن ان کی بیان کردہ روایات کو قبول کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔

ان راویوں سے متعلق معلومات کا ماخذ کیا ہے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن ماہرین نے ان مورخین کو غیر مستند قرار دیا ہے، ان کی معلومات کا ماخذ کیا ہے؟ انہوں نے کس بنیاد پر ان مورخین کو غیر مستند قرار دیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں فن رجال کے ارتقاء کو دیکھنا ہو گا۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ دور جاہلیت ہی سے عربوں میں "فن انساب" کو غیر معمولی حیثیت حاصل تھی اور ان کے ماہرین مختلف قبائل، ان کے خاندانوں اور نمایاں افراد کے حالات کو ریکارڈ کیا کرتے تھے۔ دور جاہلیت میں کتابیں لکھنے کا رجحان نہیں تھا بلکہ ان معلومات کو سینوں میں محفوظ کیا جاتا تھا۔ جو شخص ان معلومات کا بڑا حافظ ہوتا، اسے معاشرے میں نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا کیونکہ یہی قبائلی تاریخ تھی جس کی بنیاد پر اہل عرب اپنے اپنے قبیلے پر فخر کیا کرتے تھے۔ اسلام کے بعد کتابیں تحریر کرنے کا رجحان پیدا ہوا جو کہ دوسری صدی ہجری میں بہت نمایاں ہو گیا۔ اس میں دیگر علوم کی طرح انساب اور طبقات کی کتابیں بھی لکھی جانے لگیں جن میں مختلف افراد کے حالات زندگی اکٹھے کیے جاتے۔ جو لوگ یہ کام کرتے تھے، انہیں افراد یا قبائل سے کوئی ذاتی قسم کا تعلق نہ ہوتا تھا بلکہ وہ نہایت ہی غیر جانبداری سے ان افراد کے حالات زندگی (Biography) مرتب کرتے۔ ممکن ہے کہ کوئی ایک ماہر، کسی ایک شخص کے بارے میں متعصب ہو اور اس کے بارے میں کچھ لکھ دے، لیکن تمام کے تمام ماہرین اس شخص سے تو متعصب نہ ہو سکتے تھے۔

حالات زندگی مرتب کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ماہرین کا ایک اور طبقہ بھی تھا جسے "ماہرین جرح و تعدیل" کہا جاتا ہے۔ ان میں یہ لوگ نمایاں ہیں:

- یحیی بن معین(158-233/775-848)
- ابن المدینی(161-234/777-848)
- احمد بن حنبل(164-241/780-855)
- بخاری(194-256/810-870)
- ابو حاتم الرازی(195-277/811-890)
- نسائی(214-303/829-915)
- ابن حبان(270-354/883-965)
- ابن عدی(277-365/890-976)
- دار قطنی(306-385/918-995)

اس فن کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے متعلق روایات کی جانچ پڑتال کر کے یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کون سی روایت مستند ہے اور کون سی نہیں۔ ان حضرات نے اس فن میں مہارت حاصل کی کہ ان لوگوں کے حالات کی جانچ پڑتال کر کے یہ فیصلہ کریں کہ کون سا شخص لائق اعتماد ہے اور کس درجے میں ہے اور کون سا شخص ناقابل اعتماد ہے اور اس کا

درجہ کیا ہے؟ ان حضرات نے بارہ درجوں کا ایک اسکیل مرتب کیا جس میں چھ درجات جرح (نا قابل اعتماد ہونا) اور چھ درجات تعدیل (قابل اعتماد ہونا) کے مقرر کیے۔ ان میں سب سے نچلا درجہ "کذاب" کا تھا جس میں انتہائی درجے کا جھوٹا شخص شمار کیا جاتا۔ ابو مخنف، واقدی، سیف بن عمر اور ہشام کلبی کا شمار اسی آخری طبقے میں کیا گیا ہے۔

جرح و تعدیل کے ماہرین نے عالم اسلام کے مختلف شہروں کے سفر کیے اور ان راویوں سے متعلق معلومات اکٹھا کیں۔ یہ حضرات متعدد بنیادوں پر کسی راوی کو ثقہ یا ضعیف یا کذاب قرار دیتے تھے:

- ایک تو اس راوی سے ملنے جلنے والوں سے اس کے حالات معلوم کیے جاتے۔ اگر وہ راوی ان کے زمانے میں زندہ ہوتا تو اس سے مل کر اور اس کے حالات کی جانچ پڑتال کرتے ورنہ ان لوگوں سے رائے لیتے، جو اس شخص کو جانتے تھے۔
- اس راوی کی بیان کردہ روایات کا موازنہ اس کے ہم سبق دیگر راویوں کی بیان کردہ روایات سے کرتے اور اگر یہ دیکھتے کہ اس راوی کی روایات میں فرق ہے تو پھر اس کی مزید چھان بین کر کے اس کے متعلق فیصلہ کرتے۔ مثلاً ایک استاذ کے دس شاگرد ہیں۔ ان میں سے نو تو اپنے استاذ کی روایت کو ایک طرح بیان کرتے ہیں جبکہ دسواں اس سے مختلف بات کرتا ہے۔ اس فرق کی چھان بین کی جاتی اور یہ دیکھا جاتا فرق سنجیدہ نوعیت کا ہے یا معمولی ہے اور کیا یہ شخص کیا ہر روایت میں ایسا کر رہا ہے یا کسی ایک آدھ جگہ اس سے ایسا ہوا ہے۔ جس شخص کی روایات میں انہیں بہت زیادہ فرق ملتا، اس کے فرق کے تناسب سے اس کا درجہ متعین کیا جاتا۔

ان حضرات نے اس فن پر کتابیں لکھیں اور یہ فن مرتب ہوتا چلا گیا۔ آٹھویں صدی ہجری میں اس فن کے ایک بہت بڑے ماہر گزرے جن کا نام ابو الحجاج یوسف المزی (654-742/1256-1341) ہے۔ انہوں نے سابقہ ماہرین کی کتابوں کو ایک انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں اکٹھا کر دیا، جس کا نام "تہذیب الکمال" ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی بیروت کے طبع شدہ ایڈیشن کی 35 جلدیں ہیں جن میں سے ہر ایک 500 صفحات پر مشتمل ہے۔ مزی ہی کے ایک شاگرد شمس الدین ذہبی (673-748/1275-1347) نے "میزان الاعتدال" کے نام سے اس کا ایک خلاصہ تیار کیا جو اب پانچ پانچ سو صفحات کی آٹھ جلدوں میں چھپتا ہے۔ ہم نے اس کتاب میں اسی کو بنیاد بنایا ہے کیونکہ اس میں علم جرح و تعدیل کی سابقہ کتابوں کا خلاصہ آ گیا ہے۔ ذہبی نے ایک اور کتاب بھی لکھی جو "سیر الاعلام النبلا" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے 4300 صفحات میں 6895 مشہور لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھی ہمارا ماخذ رہی ہے۔

راویوں سے متعلق معلومات کس حد تک مستند ہیں؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ماہرین نے جو معلومات مرتب کی ہیں، وہ بذات خود کس درجے میں مستند ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان ماہرین نے اپنے کسی تعصب کے سبب کسی راوی کو کذاب کہہ دیا ہو۔

عقلی اعتبار سے ایسا ممکن ہے کہ ایک ماہر کسی شخص سے تعصب کی بنیاد پر اسے کذاب کہہ دے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ماہر ہی اسے تعصب کی بنیاد پر کذاب کہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ مختلف شہروں اور مختلف زمانوں سے تعلق رکھنے والے ان ماہرین نے مل کر یہ سازش کی ہو کہ چلو فلاں فلاں کو مل کر "کذاب" قرار دے ڈالیں۔ جرح و تعدیل کے ماہرین میں آپس میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے لیکن ہمارے زیر بحث مورخ راویوں کے بارے میں یہ سب کے سب متفق ہیں کہ یہ حضرات قابل اعتماد نہیں ہیں۔

ویسے بھی اگر ہمیں کسی سے رشتہ کرنا ہو یا اس سے کوئی کاروباری ڈیل کرنا ہو اور اس کے بارے میں ہمیں اڑتی اڑتی خبر بھی مل جائے کہ وہ قابل اعتماد نہیں تو ہم یا تو اس سے معاملہ کرنے میں احتیاط کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جب ان مورخین کے بارے میں بہت سے ماہرین نے ہمیں یہ بتا دیا کہ یہ نا قابل اعتماد ہیں تو پھر عقل کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی روایات کو قبول کرنے میں احتیاط کی جائے۔

کیا تاریخ پر تحقیق کے لیے علم جرح و تعدیل سے مدد لینا درست ہے؟

اس سوال کا جواب ہاں میں ہے کیونکہ علم رجال ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ روایات بیان کرنے والے لوگ کس درجے میں قابل اعتماد ہیں۔ علم رجال کی تحقیق وہی چیز ہے جسے اہل مغرب Source Criticism کہتے ہیں۔ امت کی اکثریت کا موقف یہی ہے تاہم بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ علم جرح و تعدیل کو تاریخ پر تحقیق میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں ہم فریقین کے دلائل پیش کر رہے ہیں۔ قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ کون سا موقف درست ہے۔

علم جرح و تعدیل سے مدد نہ لینے والوں کے دلائل

علم جرح و تعدیل سے مدد نہ لینے والوں کے دلائل یہ ہیں:

> بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے، اور فلاں راوی جس وقت کا واقعہ بیان کرتا ہے اس وقت تو وہ بچہ تھا یا پیدا ہی نہیں ہوا تھا، اور فلاں ایک روایت جس کے حوالے سے بیان کرتا ہے اس سے تو وہ ملا ہی نہیں۔ اسی طرح وہ تاریخی روایات پر تنقید حدیث کے اصول استعمال کرتے ہیں اور اس بنا پر اس کو رد کر دیتے ہیں کہ فلاں واقعہ سند کے بغیر نقل کیا گیا ہے، اور فلاں روایت کی سند میں انقطاع ہے۔
>
> یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لیے اختیار کیے ہیں، کیوں کہ ان پر حرام و حلال، فرض و واجب اور مکروہ و مستحب جیسے اہم شرعی امور کا فیصلہ ہوتا ہے اور یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ دین میں کیا چیز سنت اور کیا چیز سنت نہیں ہے. یہ شرائط اگر تاریخی واقعات کے معاملہ میں لگائی جائیں، تو اسلامی تاریخ کے ادوار مابعد کا تو سوال ہی کیا ہے، قرن اول کی تاریخ کا بھی کم از کم 9/10 حصہ غیر معتبر قرار پائے گا، اور ہمارے مخالفین ان ہی شرائط کو سامنے رکھ کر ان تمام کارناموں کو ساقط الاعتبار قرار دے دیں گے جن پر ہم فخر کرتے ہیں، کیوں کہ اصول حدیث اور اسماء الرجال کی تنقید کے معیار پر ان کا بیشتر حصہ پورا نہیں اترتا۔ حد یہ ہے کہ سیرت پاک میں بھی مکمل طور پر اس شرط کے ساتھ مرتب نہیں کی جاسکتی کہ ہر روایت ثقات سے ثقات نے متصل سند کے

ساتھ بیان کی ہو۔

خاص طور پر واقدی اور سیف بن عمر اور ان جیسے دوسرے راویوں کے متعلق ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال نقل کر کے بڑے زور کے ساتھ یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ حدیث ہی نہیں، تاریخ میں بھی ان لوگوں کا کوئی بیان قابل قبول نہیں ہے۔ لیکن جن علماء کی کتابوں سے ائمہ جرح و تعدیل کے یہ اقوال نقل کیے جاتے ہیں، انہوں نے صرف حدیث کے معاملہ میں ان لوگوں کی روایات کو رد کیا ہے۔ رہی تاریخ، مغازی اور سیر، تو انہی علماء نے اپنی کتابوں میں جہاں کہیں ان موضوعات پر کچھ لکھا ہے، وہاں وہ بکثرت واقعات انہی لوگوں کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حافظ ابن حجر کو دیکھیے، جن کی "تہذیب التہذیب" سے ائمہ رجال کی یہ جرحیں نقل کی جاتی ہیں۔ وہ اپنی تاریخی تصنیفات ہی میں نہیں بلکہ اپنی شرح بخاری (فتح الباری) تک میں جب غزوات اور تاریخی واقعات کی تشریح کرتے ہیں تو اس میں جگہ جگہ واقدی اور سیف بن عمر اور ایسے ہی دوسرے مجروح راویوں کے بیانات بے تکلف نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح حافظ ابن کثیر اپنی کتاب "البدایہ والنہایہ" میں خود ابو مخنف کی سخت مذمت کرتے ہیں، اور پھر خود ہی ابن جریر طبری کی تاریخ سے بکثرت وہ واقعات نقل بھی کرتے ہیں، جو انہوں نے اس کے حوالہ سے بیان کیے ہیں۔ اسے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم حدیث کے اکابر علماء نے ہمیشہ تاریخ اور حدیث کے درمیان واضح فرق ملحوظ رکھا ہے اور ان دونوں کو خلط ملط کر کے وہ ایک چیز پر تنقید کے وہ اصول استعمال نہیں کرتے جو درحقیقت دوسری چیز کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ یہ طرز عمل صرف محدثین ہی کا نہیں، اکابر فقہاء تک کا ہے جو روایات کو قبول کرنے میں اور بھی زیادہ سختی برتتے ہیں۔ مثال کے طور پر امام شافعی ایک طرف واقدی کو سخت کذاب کہتے ہیں اور دوسری طرف کتاب الام میں غزوات کے متعلق اس کی روایات سے استدلال بھی کرتے ہیں۔

اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ یہ لوگ ان مجروح راویوں کے تمام بیانات کو آنکھیں بند کر کے قبول کرتے چلے گئے ہیں۔ دراصل انہوں نے نہ ان لوگوں کے تمام بیانات کو رد کیا ہے اور نہ سب کو قبول کر لیا ہے۔ وہ ان میں سے چھانٹ چھانٹ کر صرف وہ چیزیں لیتے ہیں، جو ان کے نزدیک نقل کرنے کے قابل ہوتی ہیں، جن کی تائید میں بہت سا دوسرا تاریخی مواد بھی ان کے سامنے ہوتا ہے، اور جن میں سلسلہ واقعات کے ساتھ مناسبت بھی پائی جاتی ہے۔ اس لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد، ابن عبد البر، ابن کثیر، ابن جریر، ابن اثیر، ابن حجر اور ان جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کیے ہیں، انہیں رد کر دیا جائے۔ یا جو باتیں ضعیف یا منقطع سندوں سے لی ہیں، یا بلا سند بیان کی ہیں، ان کے متعلق یہ رائے قائم کر لی جائے کہ وہ بالکل بے سروپا ہیں، محض گپ ہیں اور انہیں بس اٹھا کر پھینک ہی دینا چاہیے۔[51]

علم جرح و تعدیل سے مدد لینے کے قائلین کے دلائل

عام اہل علم کا موقف یہ ہے کہ علم جرح و تعدیل کا استعمال جیسے حدیث کی چھان بین کے لیے ہوتا ہے، ویسے ہی تاریخ پر بھی کیا جانا چاہیے۔ علم تاریخ میں ماخذ کی تحقیق (Source Criticism) ایک مسلمہ اصول ہے اور سبھی ممالک کے مورخین اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بات تو مانی جا سکتی ہے کہ عام سے معاملات میں ماخذ کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے لیکن جن روایات کی بنیاد پر امت میں

[51] سید ابو الاعلی مودودی۔ خلافت و ملوکیت۔ حدیث و تاریخ کا فرق۔ ص 304-302

فرقے بنے ہوئے ہوں، تاریخ ہی نہیں بلکہ عقائد میں بھی اختلاف پیدا ہوا ہو اور جن کی بنیاد پر ماضی کے کسی انسان کے کردار پر انگلی اٹھائی گئی ہو، ان کے معاملے میں تو ضروری ہے کہ علم رجال کی بنیاد پر پوری طرح چھان بین کے بعد ہی کسی بات کو قبول یا مسترد کیا جائے۔ اس کی وضاحت ہم ایک مثال کے ذریعے کرتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ ایک بڑے دینی عالم کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ مالی امور میں وہ ایک دیانت دار شخص تھے۔ ان کی دیانت داری کے واقعات مشہور و معروف ہیں اور اس معاملے میں ان کے کردار پر ان کے کسی دشمن نے بھی کبھی اعتراض نہیں کیا ہے۔ یہ عالم 1950 میں وفات پا جاتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو بالفرض 1965 میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ وہ کسی مذہب دشمن سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، دینی شخصیات کے بارے میں متعصب ہے اور ان کے متعلق جھوٹا پراپیگنڈا کرتا ہے۔ اب یہ شخص کوئی ایسا واقعہ بیان کرے جس کے مطابق وہ عالم اپنے مدرسے کے فنڈ میں کرپشن کرتے تھے تو کیا ہمیں اس شخص کی بیان کردہ روایت کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینا چاہیے؟

یقیناً ہمارا جواب نفی میں ہو گا۔ سب سے پہلے تو ہم اس روایت کو اسی بنیاد پر مسترد کر دیں گے کہ اس کو بیان کرنے والا خود قابل اعتماد نہیں ہے اور وہ دینی شخصیات سے متعلق جھوٹا پراپیگنڈا کرتا ہے۔ پھر اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ وہ تو ان عالم کی وفات کے 15 سال بعد پیدا ہوا، وہ اس واقعے کا عینی شاہد تو ہو نہیں سکتا۔ اس نے یہ بات کس سے سنی ہے؟ اگر وہ شخص کسی کا نام نہ بتا سکے تو یہی کہا جائے گا کہ اس نے جو روایت بیان کی ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے شخص کا نام بتا دے تو اس شخص کے بارے میں بھی لازماً تجزیہ کیا جائے گا کہ وہ شخص کون ہے؟ اس کے حالات کیا تھے؟ کیا وہ کسی کے بارے میں متعصب تھا یا نہیں؟ کیا وہ کسی سیاسی جماعت کے پراپیگنڈا ونگ میں شامل تو نہیں تھا؟ یہ سب باتیں دیکھی جائیں گی اور تب ہی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ واقعہ درست ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر جرح و تعدیل کو تاریخ میں استعمال نہ کرنے کے قائلین میں سے کسی شخص کے استاذ یا والدین کے بارے میں کوئی کرپشن یا بدکاری یا اسی نوعیت کا کوئی گھناؤنا الزام عائد کر دے تو یہ حضرات لازماً انہی اصولوں پر عمل کا مشورہ دیں گے۔ اگر موجودہ دور کی کسی شخصیت کا یہ معاملہ ہے تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں متعصب لوگوں اور ان کی مخالف جماعتوں کے پراپیگنڈا ونگ کے لوگوں کے بارے میں اس سے بڑھ کر ہی احتیاط کرنی چاہیے۔

یہ بات کہ "قرن اول کی تاریخ کا بھی کم از کم 9/10 حصہ غیر معتبر قرار پائے گا، اور ہمارے مخالفین ان ہی شرائط کو سامنے رکھ کر ان تمام کارناموں کو ساقط الاعتبار قرار دے دیں گے جن پر ہم فخر کرتے ہیں، کیوں کہ اصول حدیث اور اسماء الرجال کی تنقید کے معیار پر ان کا بیشتر حصہ پورا نہیں اترتا۔" بھی درست نہیں ہے۔ قرن اول میں سے عہد رسالت کی تاریخ کا بڑا حصہ قرآن مجید اور صحیح احادیث میں بیان ہوا ہے۔ عہد صحابہ کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات، جن میں ان کے تمام مثبت کارنامے شامل ہیں، پورے تواتر سے ہم تک منتقل ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی غیر مسلم مورخ بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ کوئی ایک دو روایتیں نہیں بلکہ ہزار ہا روایتیں ہیں جو مل کر کم از کم معنوی حد تک حد تواتر تک پہنچتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کا انکار کرنا چاہے تو وہ دن میں سورج کی موجودگی کا انکار بھی

کر سکتا ہے اور یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ زمین پر ہوا اور پانی موجود نہیں ہیں۔

یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ طبری، ابن اثیر، ابن حجر اور ابن کثیر جیسے محقق علماء نے واقدی اور ابو مخنف وغیرہ کی تمام روایتوں کو قبول کیا ہے۔ ان حضرات نے عام سے معاملات میں ان لوگوں کی روایتوں کو قبول کیا ہے لیکن جہاں صحابہ کرام کی کردار کشی جیسا حساس معاملہ ہے، وہاں ان پر تنقید کی ہے۔ اوپر آپ طبری، ابن اثیر اور ابن کثیر کے اقتباسات پڑھ ہی چکے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتب کے متعلق خود یہ کہہ دیا ہے کہ ہم نے بات کو محض نقل کیا ہے، اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کی ذمہ داری اس شخص پر ہے جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے۔

کیا ان ناقابل اعتماد راویوں کی تمام روایتوں کو رد کر دیا جائے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ان ناقابل اعتماد راویوں کی تمام روایتوں کو رد کر دیں کیونکہ اگر ہم ایسا کریں گے تو پھر عہد صحابہ کی تاریخ کا 90% حصہ ضائع ہو جائے گا اور ہمیں اس ضمن میں کچھ بھی علم نہ ہو سکے گا۔ اول تو یہ دعوی ہی درست نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہماری تاریخ انہی چند راویوں کی مرہون منت ہے۔ طبری میں ان چار پانچ افراد یعنی واقدی، سیف بن عمر، ابو مخنف اور ہشام کلبی کی روایتوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو یہ 90% نہیں بلکہ کافی کم بنتا ہے۔ ڈاکٹر خالد کبیر علال نے ان راویوں کی کل روایات کی تعداد 1819 گنوائی ہے[52] جو کہ طبری کی روایات کا 90% بہر حال نہیں ہے۔ پھر ان چاروں راویوں کی تمام کی تمام روایتوں کو دریا برد کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف انہی روایتوں پر تنقید کی جائے گی جن میں انہوں نے خاص طور پر حقائق کو مسخ کرتے ہوئے صحابہ کرام کی کردار کشی کی کوشش کی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عام تاریخی واقعات میں انہیں کوئی گڑبڑ کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن جن معاملات میں یہ متعصب تھے، ان میں انہوں نے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اپنی زندگیوں میں یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ عام طور پر جھوٹ نہیں بولتے لیکن جہاں معاملہ ان کے مفادات یا تعصبات کا آ جائے، وہاں پھر وہ جھوٹ سے کام لیتے ہیں۔ یہی معاملہ ان متعصب راویوں کا ہے کہ جہاں انہیں تعصب کا مرض لاحق ہوا، وہاں انہوں نے جھوٹی روایت گھڑی یا سچی روایت میں جعلی جملے داخل کر دیے لیکن جہاں تعصب کا معاملہ نہیں تھا، وہاں انہیں بھی جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

تاریخی روایات میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بعض واقعات تو پورے کے پورے خود گھڑے ہیں لیکن اکثر مشہور تاریخی روایات کے ضمن میں ایک آدھ ایسے جملے یا پیراگراف کا اضافہ کر دیا ہے کہ جس سے وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا واقعہ مشہور ہے۔ اسے بالعموم یہ ٹھیک بیان کرتے ہیں لیکن بیچ بیچ میں کوئی ایک آدھ لفظ یا جملہ ایسا لگا جاتے ہیں، جس سے

[52] خالد کبیر علال۔ مدرسۃ الکذابین فی روایۃ التاریخ الاسلامی و تدوینہ۔ 115۔ الجزائر: دار البلاغ

ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس مثلاً جنگ صفین اور سانحہ کربلا کے واقعات میں پوری پوری جعلی روایتیں موجود ہیں۔ اس وجہ سے لازم ہے کہ ہم ان چاروں راویوں اور ان کے دیگر ساتھیوں کی ان روایات پر قبول نہ کریں جن میں صحابہ کی کردار کشی کی گئی ہو۔ ہاں عام واقعات جن میں ایسا نہ ہو، کو قبول کرنے میں حرج نہیں ہے۔ تاہم اگر کوئی بہت محتاط ہو اور وہ ان راویوں کی کسی روایت کو بھی قبول نہ کرے، تو اس کا طرز عمل بھی ٹھیک ہے اور اس کے طریقہ کار پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے، مگر پھر وہ تفصیلی تاریخ مرتب نہ کر سکے گا۔

ہم اپنے زمانے میں بھی دیکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ روزانہ اخبار میں بے شمار ایسے واقعات کا ذکر ہوتا ہے جو عام نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے کہیں کوئی حادثہ پیش آیا، یا کسی نے غرباء کی مدد کی یا کسی ملک میں جنگ چھڑ گئی یا کہیں سیلاب آ گیا۔ اس معاملے میں کسی راوی کو جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے، اس وجہ سے ان کے بارے میں کوئی تردد نہیں کرتا ہے کہ خبر کی جانچ پڑتال کرے۔ انہیں عام طور پر درست تسلیم کر لیا جاتا ہے اور اگر ان کی تردید اگلے چند روز میں شائع نہ ہو تو یہ مسلمہ حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر اخبار میں کسی ایسے شخص کے بارے میں خبر چھپے، جس کا اعلی کردار معلوم و معروف ہو۔ مثلاً عبد الستار ایدھی صاحب یا مدر ٹریسا صاحبہ کے بارے میں کوئی شخص بے ہودہ قسم کے الزامات عائد کرے تو ہر شخص چونک اٹھے گا اور یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ اخبار کو یہ خبر کہاں سے ملی ہے۔ پھر اس تحقیق میں یہ معلوم ہو کہ یہ خبر کسی ایسے رپورٹر نے لگوائی ہے، جو ان شخصیات سے کسی وجہ سے تعصب رکھتا ہے، تو پھر ہر معقول شخص کا فیصلہ یہی ہو گا کہ یہ خبر جھوٹ ہے۔ ہاں، جو شخص کسی وجہ سے ان شخصیات کے بارے میں متعصب ہو، وہ ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کرے گا اور اس خبر کے درست ہونے پر اصرار کرے گا۔

اس طریق کار پر ایک سوال مزید وارد ہوتا ہے کہ کیا یہ طرز عمل "میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو" کے مترادف نہیں ہے اور کیا اسے دوغلی پالیسی نہیں کہا جائے گا؟ اس کے جواب کے لیے ہم ایک اور مثال سے وضاحت کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ کوئی ایسا شخص، جس کا اپنا کیریکٹر مشکوک ہو، ہمیں آ کر یہ بتائے کہ ہمارے دادا نے فلاں وقت فلاں شہر کا سفر کیا تھا اور اس وقت انہوں نے اس شخص کو سو روپے دے کر اس کی مدد کی تھی۔ ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے دادا نیک آدمی تھے اور ہر ضرورت مند کی مدد کرتے تھے اور سفر بھی کرتے رہتے تھے۔ کیا اس بات پر یقین کرنے میں ہمیں کوئی تردد ہو گا؟ اس کے برعکس اگر وہ آ کر یہ کہے کہ جناب آپ کے دادا رشوت لیتے تھے، یا انہوں نے کسی طوائف سے ناجائز تعلقات قائم کیے تھے، یا وہ خود کسی طوائف کی اولاد تھے۔ کیا اس شخص کی بات پر ہم فوراً ایمان لے آئیں گے ؟ اول تو ہم فوراً ہی اس کی بات کی تردید کریں گے۔ اگر وہ اپنے دعوی کے حق میں کوئی ثبوت پیش کرے گا تو اس کی ہر ممکن جانچ پڑتال کی کوشش کریں گے اور جب تک آخری درجے میں ٹھوس ثبوت نہ ملیں گے، اس وقت تک اس کی بات کا اعتبار نہ کریں گے۔

بالکل اسی طرح عام تاریخی روایات جن میں عام سے واقعات ہوں اور کوئی اختلافی بات نہ ہو، ایک ناقابل اعتماد راوی سے بھی قبول کی جا سکتی ہے لیکن اختلافی امور میں، خاص کر جب اس شخص کی روایت دیگر صحیح روایتوں کے خلاف ہو، کو رد کرنا لازم ہے۔ اس کو ایک اور

مثال سے سمجھیے۔ ہمارے دور میں اکثر صحافی کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ جب وہ کچھ لکھتے ہیں تو اپنی پارٹیوں کی حمایت کرتے ہیں اور مخالف پارٹیوں کی کردار کشی کرتے ہیں۔ کچھ صحافی ایسا کھلے عام کرتے ہیں اور کچھ ذرا فنکاری کے ساتھ ڈھکے چھپے انداز میں لکھتے ہیں۔ ایسا کرنے پر انہیں اپنی اپنی پارٹیوں کی جانب سے پیسہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ایسی تحریروں کا کوئی اعتبار نہ کیا جائے گا لیکن اگر یہی صحافی کسی ایسے معاملے میں کچھ بیان کریں جس کا کوئی تعلق اس پارٹی بازی سے نہ ہو، مثلاً سماجی نوعیت کا کوئی آرٹیکل لکھیں، یا دنیا کے کسی اور ملک کے بارے میں کچھ لکھیں تو اس کا اعتبار کر لیا جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان متعصب راویوں کی عام باتوں کو بھی کیوں لیا جائے۔ چونکہ یہ معلوم ہے کہ وہ جھوٹ گھڑتے تھے، تو پھر ان کی تمام کی تمام روایات ہی کو دریا برد کیوں نہ کر دیا جائے؟ آئیڈیل تو یہی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن اس میں ایک عملی مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ان راویوں کی تمام روایتوں کو اٹھا کر پھینک دیا جائے تو پھر تاریخی کتب میں جزوی تفصیلات نہ مل سکیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جنہیں تاریخ میں دلچسپی تھی اور انہوں نے اس سے متعلق ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں اکٹھی کیں۔ اس زمانے تو کیا، خود ہمارے دور کے بارے میں بھی یہی حال ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے زمانے کی تاریخ لکھنے بیٹھے اور یہ اصول طے کر لے کہ کسی بھی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے کسی بھی صحافی کی بیان کردہ کوئی بھی رپورٹ قبول نہیں کی جائے گی تو وہ تاریخ لکھ ہی نہ سکے گا کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا صحافی ہو گا جس کا تعلق کسی بھی پارٹی سے نہ ہو۔ اس وجہ سے درست اصول یہی ہے کہ ان راویوں کی عام روایتیں قبول کر لی جائیں لیکن جس معاملے میں یہ متعصب ہوں، اس معاملے میں ان کی روایات کو قبول نہ کیا جائے۔ اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو بالکل ہی غیر جانبدار ہو تو پھر اس کی بات کو باقی سب پر یقیناً ترجیح دی جائے گی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مذکورہ چار جھوٹے راویوں کی روایتیں بھی بہت زیادہ نہیں ہیں اور مخصوص واقعات ہی میں ان کی روایات زیادہ ملتی ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی راوی کسی شخص کے بارے میں متعصب ہے لیکن وہ ایسی روایت پیش کرتا ہے جو اس کے اپنے تعصبات کے خلاف ہے تو کیا اس روایت کو قبول کیا جائے؟ اس سوال کا جواب ہاں میں ہے۔ ہمارے زمانے میں ایک شخص مثلاً پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتا ہو اور کوئی ایسی بات کہے جو مسلم لیگ کے حق میں ہو، یا پیپلز پارٹی کے خلاف ہو، تو اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ یہ گھر کی گواہی ہے۔ اسی طرح مسلم لیگ کے لوگوں کی ایسی بات جو ان کے خلاف اور پیپلز پارٹی کے حق میں ہو، تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح ابو مخنف، سیف بن عمر، ہشام کلبی اور اس نوعیت کے دیگر راویوں کی جو روایتیں صحابہ کرام کے حق میں ہوں، انہیں قبول کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

مورخین نے ناقابل اعتماد روایتیں اپنی کتب میں درج کیوں کی تھیں؟

ایک عام طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ متعصب راویوں کی یہ روایتیں مورخین نے اپنی کتابوں میں درج ہی کیوں کیں اور انہیں اٹھا کر باہر کیوں نہ پھینک دیا؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مورخین، ان متعصب راویوں پر اعتماد کرتے تھے؟ اس

سوال کا جواب ہم اوپر دے چکے ہیں تاہم اس کے اہم پہلو یہاں دوبارہ بیان کر رہے ہیں۔

یہ سوال اصل میں اس دور کے علمی مزاج اور ماحول سے لاعلمی کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے۔ اس ماحول کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ تاریخ کے جو اولین مآخذ ہمیں دستیاب ہیں، یہ بالعموم تیسری صدی ہجری میں لکھے گئے ہیں جب دور صحابہ کی تاریخ کو دو سو برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ دوسری صدی کے نصف تک مسلم دنیا میں کاغذ کمیاب تھا، اس وجہ سے کتابیں لکھنے کر پھیلانے کا رواج نہیں تھا بلکہ جو لوگ لکھتے تھے، اس کی حیثیت ان کی ذاتی ڈائری کی سی ہوا کرتی تھی۔ جب مسلمانوں نے 140/757 کے لگ بھگ چینیوں سے کاغذ بنانے کا فن سیکھا تو ان کے ہاں کتابیں لکھنے کے عمل کا آغاز ہوا اور تیسری صدی ہجری کے اوائل اور نصف میں جب کتابیں بڑے پیمانے پر لکھی جانے لگیں تو ان کا اسلوب وہی تھا جو اس سے پہلے زبانی روایت کا چلا آ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو ضرورت اس امر کی محسوس ہوئی کہ جو کچھ علم اب تک زبانی یا ذاتی ڈائریوں کی صورت میں چلا آ رہا ہے، اسے مرتب کر لیا جائے۔ چنانچہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، شاعری، فلسفہ غرض ہر علم میں جو کچھ دستیاب تھا، اسے لکھا جانے لگا۔ حدیث اور تاریخ کے میدان میں پہلے مرحلے پر ان روایات کو اکٹھا کیا گیا۔ اہل علم کا فوکس یہ تھا کہ علم کو مرتب کیا جائے، صحیح و غلط کو بعد میں اگلے مرحلے پر دیکھ لیا جائے گا۔ یہ مرحلہ دوسری صدی کے آخر سے شروع ہو کر پانچویں صدی کے آخر تک جاری رہا اور اس عمل میں تین سو سال لگے۔ روایات پر تنقید اور چھان بین کے عمل کا آغاز تیسری صدی ہجری کے نصف سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے۔ اس دور کے ناقدین نے اپنی ترجیحات یہ متعین کیں کہ جن روایات میں کوئی دینی مسئلہ ہو، ان کی چھان بین پہلے کر لی جائے۔ تاریخی روایات کی جانچ پڑتال کا معاملہ کچھ دیر سے شروع ہوا۔

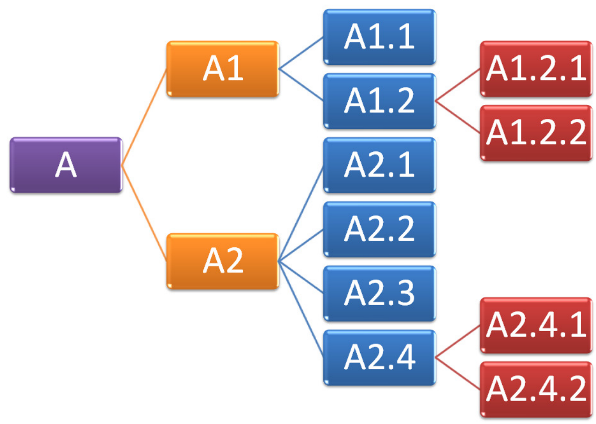
یہ بات ہم جانتے ہیں کہ کوئی مصنف جب کتاب لکھتا ہے تو وہ اپنے زمانے کے لوگوں کی علمی اور ذہنی سطح ہی کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔ آج ہم جو کتب لکھ رہے ہیں، ہم زیادہ سے زیادہ اگلے پچاس سو برس کے قارئین کی علمی و ذہنی سطح کو ہی مد نظر رکھ سکتے ہیں۔ ابن سعد، طبری اور بلاذری وغیرہ نے بھی جب کتب لکھیں تو ان کے پیش نظر ہم لوگ نہیں تھے بلکہ ان کے اپنے دور کے قارئین تھے۔ یہ لوگ پہلی دو صدیوں کے کم از کم مشہور راویوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگر ان کے سامنے مثلاً واقدی یا ابو مخنف کی کوئی روایت پیش کی جاتی تو وہ جانتے تھے کہ واقدی اور ابو مخنف کا علمی مقام کیا ہے اور ان کی روایتوں پر کس درجے میں اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے وہ بآسانی یہ معلوم کر لیتے کہ قابل اعتماد روایت کون سی ہے اور ناقابل اعتماد کون سی۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین نے ان کی روایتوں کو درج کر دیا کیونکہ ان کے سامنے اپنے دور کے لوگ تھے جو صحیح اور ضعیف روایتوں میں فرق کر سکتے تھے۔

اصل میں یہ بعد کے ادوار کے مورخین کی غلطی ہے کہ انہوں نے مکھی پر مکھی مارتے ہوئے سابقہ مورخین کی بیان کردہ روایتوں کو آنکھیں بند کر کے قبول کیا اور پھر سند کے بغیر اپنی کتب میں درج کر لیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ قدیم مورخین کی بیان کردہ روایتوں کی چھان بین کر کے اپنی کتب لکھتے لیکن روایت پرستی کی وجہ سے انہوں نے ایسا نہ کیا۔ تاہم محقق مورخین جیسے ابن کثیر (701-774/1301-1372) اور ابن خلدون (732-808/1332-1405) نے روایتوں پر تنقید بھی کی ہے لیکن ان حضرات نے بھی ہر اہم مقام پر ایسا نہیں

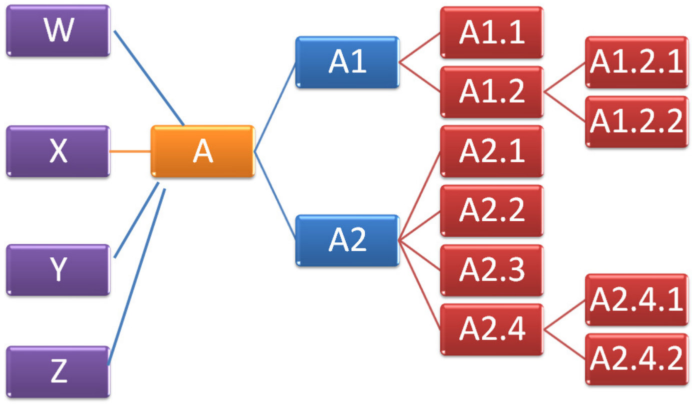
کیا ہے بلکہ بعض مخصوص مواقع پر ہی ایسا کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی شاید یہ رہی ہو گی کہ تاریخ کے جو معاملات ان کے زمانے میں اہمیت اختیار کر گئے، انہوں نے ان پر تاریخی تنقید کے اصول استعمال کیے لیکن جو معاملات ان کے زمانے میں زیادہ اہم نہیں سمجھے گئے، وہاں انہوں نے تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہمارا بھی معاملہ یہی ہے کہ ہم انہی مسائل پر زیادہ گہرائی میں تحقیق کرتے ہیں جو ہمارے زمانے میں ہاٹ ایشوز بن جاتے ہیں اور دیگر معاملات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

کیا ایک روایت کا متعدد کتب میں پایا جانا اس کے مستند ہونے کی دلیل ہے؟

اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مورخین نے روایتوں کو ایک دوسرے سے نقل کیا ہے۔ ایک مورخ اگر دوسرے مورخ سے کوئی روایت نقل کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روایت میں کوئی اضافی مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعد کی کڑیوں میں جتنے مرضی لوگ روایت کرتے رہیں، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ واقعے کے عینی شاہدین کی تعداد کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں۔ ہم اپنے دور میں دیکھتے ہیں کہ کوئی مشہور آدمی قتل ہو گیا ہے۔ کوئی شخص یہ بیان کر دیتا ہے کہ اسے فلاں نے قتل کیا ہے۔ اس سے سن کر دس آدمی یہ بیان کرتے ہیں کہ فلاں نے فلاں کو قتل کیا ہے۔ پھر ان دس سے سن کر سو اور سو سے سن کر ہزار آدمی یہی بات بیان کرتے ہیں۔ عدالت میں ان سب کی گواہی صرف ایک ہی شخص کی مانی جائے گی کیونکہ اصل عینی شاہد ایک ہے۔ اگر وہ عینی شاہد قابل اعتماد نہیں ہے تو عدالت اس کی گواہی پر فیصلہ نہیں کر سکتی ہے۔



ڈایاگرام ۱



ڈایاگرام ۲

آپ ڈایاگرام ا میں دیکھ سکتے ہیں کہ راوی A نے کوئی بات دو افراد A1, A2 سے بیان کی۔ A1 نے وہ بات آگے دو مزید افراد A1.1, A1.2 سے کہی اور پھر A1.2 نے اسے مزید دو افراد A1.2.1 اور A1.2.2 سے کہہ دی۔ اسی طرح دوسرے شخص A2 نے اس بات کو زیادہ پھیلایا اور چار افراد تک یہی بات پہنچادی اور انہوں نے آگے اس بات کو پہنچا دیا۔ ڈایاگرام کے اندر اگرچہ تیرہ افراد اس بات کو کہہ رہے ہیں لیکن در حقیقت یہ بات ایک ہی شخص A کی کہی ہوئی بات ہے۔ اگر یہی شخص A قابل اعتماد نہیں ہے تو بات بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ جعلی تاریخی روایات میں یہ چیز عام ہے کہ کسی واقعے کو بیان کرنے والا ایک ہی شخص ہوتا ہے جس کا اپنا چال چلن مشکوک ہوتا ہے۔

واقعے سے متعلق ان شہادتوں کی ایک اور شکل ہو سکتی ہے جو ڈایاگرام ۲ میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں دیکھیے تو بظاہر اس واقعے کو چار افراد W, X, Y, Z بیان کر رہے ہیں اور دعوی موجود ہے کہ وہ عینی شاہد ہیں۔ لیکن ان چاروں کی بات کو صرف اور صرف ایک شخص A بیان کر کے آگے پھیلا رہا ہے۔ اس وجہ سے پوری بات کے مستند ہونے کا دارو مدار اسی ایک شخص پر ہے۔ اگر یہ شخص جھوٹ بولتا ہو تو ممکن ہے کہ اپنے سے پہلے دس بیس پچاس عینی شاہد پیدا کر لے۔ جعلی تاریخی روایات میں بالعموم یہی معاملہ ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ایک روایت کو کئی مورخین بیان کرتے ہیں لیکن اس کی سند کسی ایک شخص جیسے ابو مخنف یا واقدی پر پہنچ کر یہی شکل اختیار کر لیتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ اس کے بعد یہی شخص اپنے اوپر کے بہت سے راوی پیدا کر لیتا ہے۔

کچھ اس کتاب کے بارے میں

آپ کی یہ کتاب جانبدارانہ کیوں ہے؟

اس کتاب پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس کتاب میں جگہ جگہ تعصب کی مذمت کی ہے اور قارئین کو غیر متعصبانہ رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ دوسری جانب آپ نے صحابہ کرام کے حق میں جانب داری کا مظاہرہ کیا ہے اور ان تمام روایات کو مسترد کر دیا ہے جن میں ان کے خلاف کوئی بات جاتی ہو اور ان روایات کو قبول کیا ہے جن میں کوئی بات ان کے حق میں جاتی ہو۔ کیا یہ دوغلی پالیسی اور تعصب نہیں ہے؟

اس کے جواب میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہرگز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں بھی متعصب نہیں ہیں۔ ان سے متعلق جو معلومات ہمیں قرآن، حدیث اور تاریخی روایات کی صورت میں ملتی ہیں، اس کے دو حصے ہیں: قرآن مجید اور صحیح احادیث سے تو ان کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ حضرات انسانی اخلاق کے اعلی ترین مرتبہ پر فائز تھے۔ اسلام دشمن کفار کے مقابلے میں یہ سخت تھے اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے سراپا رحمت تھے۔ تاریخی روایات کا بڑا حصہ بھی ان کی یہی تصویر پیش کرتا ہے اور اس کی مثالیں ہم اس کتاب کے شروع میں پیش کر چکے ہیں اور مزید مثالیں آگے آ رہی ہیں۔ اس کے برعکس تاریخی روایات کا ایک قلیل حصہ، جس کے راوی ہشام کلبی، ابو مخنف، واقدی اور سیف بن عمر ہیں، اس کے برعکس یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ بعض صحابہ آپس میں ایک دوسرے سے بغض رکھتے تھے اور انسانی اخلاق کے پست ترین مرتبہ پر فائز تھے۔ ان چاروں مورخین کے بارے میں یہ بات ائمہ فن نے بیان کر دی ہے کہ یہ مورخین جھوٹ گھڑ کر پھیلایا کرتے تھے۔ تاریخی تحقیق کے مسلمہ اصول جن پر اہل مغرب اور اہل مشرق سبھی کا اتفاق ہے، یہ ہیں:

- کسی شخص یا گروہ کے بارے میں ایسی منفی بات جو اس کے تعصب رکھنے والے بیان کرتے ہوں، قابل قبول نہ ہو گی۔
- کسی شخص یا گروہ کے بارے میں ایسی بات، جو اس کے مجموعی کردار سے مطابقت نہ رکھتی ہو، قابل قبول نہ ہو گی۔

ہم نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ ان اصولوں کا بے لاگ اطلاق کرتے ہوئے مذکورہ بالا مورخین کی ان روایات کو، جو ان اصولوں سے مطابقت نہ رکھتی ہوں، مسترد کر دیا ہے۔ کیا اس رویے کو جانبداری اور تعصب کہا جا سکتا ہے؟ اب اگر اسے کوئی بھی شخص صحابہ کرام کے حق میں تعصب کہتا ہے، تو وہ کہہ لے لیکن تاریخ کے غیر جانبدار ماہرین ایسا ہرگز نہ کہیں گے۔ غیر مسلم ماہرین تحقیق سے اس سلسلے میں رائے لی جا سکتی ہے کیونکہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات سے انہیں تو کوئی سروکار نہ ہو گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بعض لوگ یہ رویہ اختیار کرتے ہیں کہ کسی ایک کے حق میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ اس سے دوسرے صحابہ کی تنقیص ہوتی ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس رویے سے بچتے ہوئے تمام صحابہ کا یکساں احترام کریں۔ اگر ان

کے درجات میں فرق ہے تو وہ اللہ تعالی کے ہاں ہو گا۔ ہمارے لیے یہ سب سروں کے تاج ہیں۔

مثبت روایات کی تحقیق کیوں نہیں کی گئی؟

اس کتاب پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس میں جو مثبت روایات دی گئی ہیں، ان کی فن رجال اور جرح و تعدیل کے تحت تحقیق کیوں نہیں کی گئی ہے؟ ان میں سے بہت سی روایتیں ضعیف ہوں گی۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کتاب میں ہم نے جو مثبت روایات بیان کی ہیں، اگر ان کی فن رجال کے تحت تحقیق کی جائے تو ان میں سے بہت سی روایتیں ضعیف اور بہت سی روایتیں صحیح ثابت ہوں گی۔ اس کے برعکس اگر منفی روایتوں کو دیکھا جائے تو وہ سب کی سب ضعیف بلکہ موضوع (Fake) کے درجے کی ہیں۔ اس طرح منفی ضعیف روایتوں کے مقابلے پر مثبت ضعیف روایتیں ہی موجود ہیں۔ مثبت روایات کو ہم نے محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا کہ یہ فن جرح و تعدیل کے تحت صحت کے درجے پر پورا اترتی ہیں بلکہ اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ یہ قرآن مجید اور صحیح احادیث سے مطابقت رکھتی ہیں۔

اب اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ فن جرح و تعدیل کے معیار پر جو بھی روایت پوری نہ اترے، خواہ وہ منفی ہو یا مثبت، تو اسے رد کر دینا چاہیے۔ ہم اس رائے کا احترام کریں گے اور یہ کہیں گے کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ تاہم اس صورت میں انہیں صرف اور صرف قرآن مجید اور صحیح احادیث ہی پر اعتماد کرنا چاہیے اور بحیثیت مجموعی صحابہ کرام کے بارے میں یہ نظریہ رکھنا چاہیے کہ وہ "رحماء بینہم" تھے۔ پھر انہیں کسی بھی منفی روایت پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ موجودہ دور میں مسعود احمد صاحب نے اپنی کتاب "تاریخ الاسلام والمسلمین" میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور صرف قرآن مجید، صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔

جب مثبت اور منفی روایات دونوں ہی موجود ہوں اور دونوں ہی ضعیف کے درجے پر ہوں تو پھر عقلاً یہ صورتیں ممکن ہیں:

1. مثبت اور منفی دونوں قسم کی روایات کو قبول کر لیا جائے۔ یہ عقلاً محال ہے۔
2. منفی روایات کو قبول اور مثبت کو مسترد کیا جائے۔ بہت سے لوگوں نے ایسا کیا ہے۔ جن لوگوں کو حضرت عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہما کے خلاف تعصب ہے، انہوں نے ان سے متعلق ایسا کیا ہے جبکہ جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تعصب ہے، انہوں نے ان کے متعلق ایسا کیا ہے۔ یہ رویہ یقیناً متعصبانہ ہے۔
3. سبھی صحابہ کے بارے میں مثبت روایات کو قبول اور منفی کو مسترد کیا جائے۔ ہمارے خیال میں یہی کرنا چاہیے کیونکہ قرآن مجید اور صحیح احادیث اسی کی تائید کرتی ہیں۔ اس رویے کو اگر کوئی متعصبانہ اور جانبدارانہ کہے تو بہر حال یہ درست نہیں ہو گا۔
4. دونوں قسم کی روایات کو مسترد کر دیا جائے۔ یہی غیر جانبداری ہو سکتی ہے لیکن اس صورت میں کسی قسم کی تاریخی

بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس وجہ سے ہم نے تیسری صورت کو اختیار کیا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ مثبت رویہ ہم نے تمام ہی تاریخی شخصیات کے بارے میں روا رکھا ہے۔

تمام تاریخی شخصیات کے بارے میں آپ نے مثبت رویہ اختیار کیوں کیا ہے؟

اس کتاب پر یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے صرف صحابہ کرام ہی نہیں بلکہ تمام تاریخی شخصیات کے بارے میں مثبت رویہ اختیار کیوں کیا ہے۔ حتیٰ کہ جن شخصیات کے بارے میں نہایت منفی باتیں کتب تاریخ میں ملتی ہیں، ان کے بارے میں بھی حسن ظن کی آپ تلقین کیوں کرتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہم قرآن مجید کی یہ آیت پیش کر سکتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنْ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلا تَجَسَّسُوا وَلا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ.

اے اہل ایمان! آپ لوگوں کو چاہیے کہ بہت زیادہ گمان کرنے سے بچا کریں۔ یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ (کسی کی ذات سے متعلق) تجسس نہ کیا کریں اور نہ ہی آپ میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا آپ میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ آپ لوگ یقیناً اس سے کراہت محسوس کریں گے۔ اللہ سے ڈرتے رہیے کہ یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات 49:12)

جو لوگ ہمارے زمانے سے پہلے گزر گئے، ہمارے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے کہ ہم ان کے اعمال کی جانچ پڑتال کر کے ان پر حکم لگا سکیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو اپنی حدود سے تجاوز ہو گا۔ تاریخی روایات کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ ان میں بہت سا جھوٹ داخل کیا گیا ہے۔ لوگوں نے اپنے قبائلی، گروہی اور فرقہ وارانہ تعصبات کی بنیاد پر ایک دوسرے پر الزام تراشی کی ہے، جو کہ تاریخی روایات کا حصہ بن گئی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس نے کیا جھوٹ ان روایات میں داخل کیا ہے؟ اس وجہ سے ہمیں کسی خاص شخصیت کے بارے میں منفی رائے نہیں رکھنی چاہیے بلکہ اس کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ ان شخصیات کے بارے میں دو غلط صورتیں ممکن ہیں:

1۔ یہ واقعی برے ہوں اور ہم ان کے بارے میں اچھی رائے رکھ بیٹھیں۔

2۔ یہ فی الحقیقت اچھے ہوں اور ہم ان کے بارے میں بری رائے اختیار کر لیں۔

پہلی صورت میں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات پر ہرگز سزا نہ دیں گے کہ ہم نے کسی برے شخص کے بارے میں اچھی رائے کیوں اختیار کر لی تھی لیکن دوسری صورت انتہائی خطرناک ہے۔ ایک شخص فی الحقیقت اچھا تھا، لیکن ہم نے محض تاریخی روایات کے سبب اس کے بارے میں بری رائے اختیار کر لی تو کم از کم ہمیں اس بات کے لیے تیار ضرور رہنا چاہیے

کہ روز قیامت اگر اللہ تعالی نے پوچھ لیا کہ مشکوک معلومات کی بنیاد پر تم نے بدگمانی اور غیبت کا ارتکاب کیوں کیا تو ہم کیا جواب دیں گے؟

ان مخصوص مورخین کے بارے میں حسن ظن کیوں نہ رکھا جائے؟

یہاں یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ پھر ابو مخنف، ہشام کلبی، واقدی اور سیف بن عمر کے بارے میں بھی حسن ظن رکھنا چاہیے کہ انہوں نے سچ ہی لکھا ہو گا۔ ان پر جھوٹ کا الزام لگانا کیا بدگمانی اور غیبت نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن ظن اور چیز ہے اور کسی معاملے میں احتیاط اور چیز۔ فرض کیجیے کہ اگر ہمیں کسی شخص سے کروڑوں کی ڈیل کرنا ہو یا اس کے ساتھ اپنی بچی کا رشتہ کرنا ہو اور ہمارا کوئی قابل اعتماد دوست ہمیں آ کر یہ بتائے کہ یہ شخص دراصل بہت بڑا فراڈیا اور دھوکے باز ہے تو کیا ہمیں حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس شخص سے معاملہ کر لینا چاہیے؟ یقینی طور پر ہمیں اس شخص سے حسن ظن تو رکھنا چاہیے مگر اس سے ڈیل میں احتیاط برتنی چاہیے۔ ہم یا تو اس شخص کے بارے میں تحقیقات کریں گے اور اگر تحقیق ممکن نہ ہوئی اور ڈیل کرنے سے اجتناب کریں گے۔

بعینہ یہی معاملہ ان راویوں کے ساتھ بھی کرنا چاہیے کہ ان سے حسن ظن رکھتے ہوئے ان کی روایتوں کو قبول کرنے میں احتیاط برتنا چاہیے۔ یہ احتیاط حسن ظن کے خلاف نہیں ہے۔ سورۃ الحجرات میں جہاں ہمیں حسن ظن کا حکم دیا گیا ہے، وہاں اس بات کا حکم بھی موجود ہے کہ کسی غلط شہرت رکھنے والے کی بات پر قدم اٹھانے سے پہلے اس بات کی تحقیق کر لینا چاہیے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ.

اے اہل ایمان! اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی فاسق خبر لے آئے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی گروہ کو جہالت میں نقصان پہنچا بیٹھیں اور پھر اپنے فعل پر نادم ہوں۔ (الحجرات 49:6)

اب چونکہ ان راویوں کے بارے میں ہمیں نہایت ہی قابل اعتماد اہل علم نے بتا دیا ہے کہ یہ متعصب اور جھوٹ گھڑنے والے لوگ ہیں، اس وجہ سے ہمیں چاہیے کہ ان کی بیان کردہ روایات کی چھان بین ضرور کر لیں۔ ہمیں ان راویوں کی ذات سے کوئی دشمنی نہیں رکھنی چاہیے لیکن ان کی بیان کردہ روایات کو قبول کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ پھر ان راویوں کی اپنی روایات میں تضاد موجود ہے۔ ان کی بعض روایات صحابہ کرام کی بڑی مثبت تصویر پیش کرتی ہیں اور بعض منفی۔ دونوں قسم کی روایات میں سے ایک ہی قسم درست ہو سکتی ہے۔ بیک وقت دونوں قسم کی روایات کو قبول کرنا عقلاً ممکن نہیں ہے۔ اب یہ ہر شخص کا اپنا انتخاب ہے کہ وہ مثبت تصویر والی روایتوں کو قبول کرے جو قرآن مجید اور صحیح احادیث کے مطابق ہیں یا پھر منفی تصویر والی روایتوں پر ریجھ جائے۔ بس یہ خیال رکھیے کہ دونوں صورتوں کا آخرت میں کیا انجام ہو سکتا ہے؟

اس کتاب کا مقصد کیا ہے؟

اس کتاب کے لکھنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہمارے ہاں جو روایات پائی جاتی ہیں، فرقہ وارانہ تعصبات سے ماوراء ہو کر ان کا تجزیہ کیا جائے اور علم تاریخ کی رو سے ان کا جائزہ لیا جائے۔ اس کتاب کے لکھنے میں جو محنت صرف ہوئی ہے، اس پر میں اللہ تعالی کے سوا کسی سے بدلے کا طالب نہیں ہوں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ جنت میں جب حضرت ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، معاویہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں گے اور اپنے ان محبین سے ملاقات کریں گے جنہوں نے ان کا ساتھ دیا ہو گا اور ان کی کچھ خدمت کی ہو گی، تو ان محبین اور خدمت گاروں کی فہرست میں اللہ تعالی اس بندہ ناچیز کا نام بھی لکھ دیں اور ان جلیل القدر صحابہ کی محفل میں کہیں آخری کونے میں جگہ عنایت فرما دیں۔

ایک عام آدمی تاریخی روایات کی چھان بین کیسے کر سکتا ہے؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب ان تاریخی روایات کی چھان بین تو وہی کر سکتا ہے جسے عربی زبان اور فن تاریخ میں مہارت حاصل ہو۔ ایک عام آدمی یہ کیسے جانچ سکتا ہے کہ کس کی بات درست ہے اور کس کی غلط۔ اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ ایک عام آدمی بھی اگر اپنی عقل کو استعمال کرے تو وہ بآسانی یہ جانچ پڑتال کر سکتا ہے کہ کیا بات درست ہے۔ اس کتاب میں ہم نے ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے یہی کوشش کی ہے۔ آپ اگر ان نکات پر عمل کریں تو اس کتاب میں ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے، اس کی تصدیق آپ خود کر سکتے ہیں:

1۔ سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ اردو کی کتب تاریخ میں جو مواد ملتا ہے، وہ بالعموم پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد نہیں لکھا گیا ہے۔ اردو کی کوئی کتاب پڑھتے وقت جس واقعے سے متعلق کوئی سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہو، اس کے بارے میں دیکھیے کہ مصنف نے ماضی کی کس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ اگر انہوں نے یہ حوالہ قرون وسطی (جیسے ابن اثیر، ابن کثیر، ابن خلدون وغیرہ) کی کسی کتاب کا دیا ہے تو ان کتب میں جا کر دیکھیے کہ قرون وسطی کے ان مصنفین نے تیسری صدی ہجری کی کون سی کتاب سے وہ بات بیان کی ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہد صحابہ کی تاریخ کے قدیم ترین ماخذ جو اس وقت دستیاب ہیں، وہ تیسری صدی میں لکھے گئے اور عام تاریخی روایات کا 95% حصہ تین کتابوں میں ملتا ہے جو ابن سعد، بلاذری اور طبری نے لکھی ہیں۔ اگر قرون وسطی کے کسی مورخ نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے تو پھر یہ بات لائق اعتماد نہیں ہے۔ اگر حوالہ دیا ہے تو پھر تیسری صدی ہجری کی متعلقہ کتب میں دیکھیے کہ اس واقعے کی سند کیا ہے؟

2۔ سند میں جند راویوں کے نام بیان ہوئے ہیں، ان پر غور کیجیے۔ اگر یہ ابو مخنف لوط بن یحیی، ہشام بن محمد کلبی، واقدی یا سیف بن عمر التیمی میں سے کوئی ایک ہے، تو روایت کو بلا تامل مسترد کر دیجیے۔ عام طور پر جن روایات میں مسئلہ پیدا ہوتا ہے، وہ انہی چاروں میں سے

کسی کی روایت کردہ ہوتی ہیں۔ اگر ان چاروں کے علاوہ کوئی اور شخص ہے تو آپ علم جرح و تعدیل کے کسی انسائیکلوپیڈیا میں اس راوی کے حالات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ راویوں کے نام ہجائی ترتیب (Alphabetical order) میں ہوتے ہیں اور انہیں ڈھونڈنا بہت آسان ہے۔ چونکہ یہ کتب عربی میں ہیں، اس وجہ سے اگر آپ عربی نہیں جانتے تو مشکل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ آپ کسی بھی عربی جاننے والے سے پڑھوا کر دیکھ لیجیے۔ ویسے علم جرح و تعدیل کی کتب کی زبان بہت سادہ ہوتی ہے اور آپ اگر چند الفاظ کے معانی سیکھ لیں تو یہ جان سکتے ہیں کہ اس راوی کی حیثیت کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

- ثقہ: قابل اعتماد
- حجۃ: بہت ہی زیادہ قابل اعتماد
- مجروح: جس پر جرح کی گئی ہو، یعنی ایک حد تک نا قابل اعتماد
- صدوق: سچا آدمی ہے۔ یہ لفظ ایسے راوی کے بارے میں کہا جاتا ہے جو جھوٹ تو نہ بولتا ہو لیکن روایت کو محفوظ رکھ کر منتقل کرنے میں کمزور ہو۔
- لا باس بہ: اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ جملہ ایسے راوی کے متعلق کہا جاتا ہے جو نا قابل اعتماد نہ ہو مگر بہت زیادہ قابل اعتماد بھی نہ ہو۔
- غیر ثقہ / ضعیف: نا قابل اعتماد
- متروک: بہت زیادہ نا قابل اعتماد
- کذاب: جھوٹا آدمی جو روایتیں گھڑتا ہو۔ انتہائی نا قابل اعتماد۔
- دجال: انتہا درجے کا جھوٹا آدمی جو جھوٹ کے علاوہ مکر و فریب سے بھی کام لیتا ہو۔
- مدلس: وہ شخص جو روایتوں کی سند میں ایک خاص قسم کی گڑبڑ کرتا ہو یعنی کمزور راویوں کو چھپا لیتا ہو۔

3۔ تاریخ طبری، انساب الاشراف، طبقات ابن سعد وغیرہ انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر لیجیے۔ ان کتب کے اوریجنل عربی ورژن اور اس کے ساتھ اردو تراجم ڈاؤن لوڈ کر لیجیے۔ ان کے لنک یہاں دیے جا رہے ہیں۔ یہ 2012 میں ہماری اس تحریر کے وقت کو کام کر رہے تھے۔ اگر یہ لنک بعد میں تبدیل ہو جائیں تو آپ کسی سرچ انجن سے ان کتابوں کو تلاش کر سکتے ہیں۔ مکتبہ وقفیہ پر آپ مینو میں سے متعلقہ سیکشن تلاش کر سکتے ہیں اور اس سیکشن کے مختلف ویب پیج پلٹتے جائیے۔ آپ کو یہ کتب مل جائیں گی۔ اسی طرح مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ پر بھی آپ سیکشن کے ذریعے یہ کتب تلاش کر سکتے ہیں۔ کتاب و سنت ڈاٹ کام پر ہم نے کتاب کی بجائے مصنف کا مین پیج دے دیا ہے، جو امید ہے کہ جلد تبدیل نہیں ہو گا۔

- تاریخ الرسل والملوک از طبری۔۔۔عربی پی ڈی ایف ورژن: (مکتبہ وقفیہ، سیکشن: التاریخ)

http://www.waqfeya.com/category.php?cid=7&st=135

- تاریخ الرسل والملوک از طبری۔۔۔عربی ورڈ ورژن: (مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ، سیکشن: "التاریخ الاسلامی")

http://www.almeshkat.net/books/open.php?cat=13&book=620

- تاریخ الرسل والملوک از طبری۔۔۔اردو ترجمہ پی ڈی ایف ورژن: (کتاب و سنت ڈاٹ کام، مصنف: محمد بن جریر الطبری)

http://www.kitabosunnat.com/kutub-library/musannifeen/article/190-authors/1749-allama-abi-jafar-mohammad-bin-jurair-al-tabri.html

- طبقات ابن سعد۔۔۔عربی پی ڈی ایف ورژن (مکتبہ وقفیہ، سیکشن: التراجم والاعلام)

http://www.waqfeya.com/category.php?cid=25&st=225

- طبقات ابن سعد۔۔۔اردو پی ڈی ایف ورژن: (کتاب و سنت ڈاٹ کام، مصنف: محمد بن سعد کاتب الواقدی)

http://www.kitabosunnat.com/kutub-library/musannifeen/article/190-authors/1726-muhammad-bin-sad-katib-alwaqdi.html

- انساب الاشراف۔۔۔عربی پی ڈی ایف ورژن

http://www.ahlalhdeeth.com/vb/showthread.php?t=115007

- میزان الاعتدال۔۔۔عربی پی ڈی ایف ورژن (مکتبہ وقفیہ، سیکشن: الجرح والتعدیل)

http://www.waqfeya.com/category.php?cid=14&st=120

- میزان الاعتدال۔۔۔عربی ورڈ ورژن (مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ، سیکشن: علم رجال الحدیث)

http://www.almeshkat.net/books/open.php?cat=23&book=651

- سیرت الاعلام النبلا۔۔۔عربی آن لائن انسائیکلوپیڈیا جس میں تمام راویوں کے حالات آن لائن موجود ہیں اور آپ ان کے نام کے کسی حصے سے انہیں سرچ بھی کر سکتے ہیں۔ بس آپ کو عربی میں ٹائپ کرنا آتا ہو۔ عربی کا کی بورڈ اردو سے تھوڑا سا مختلف ہے اور بعض حروف جیسے اَ، یَ، وَ، ي، ی میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ اگر آپ ٹائپ نہ کر سکتے ہوں تو ان ناموں کو کاپی پیسٹ کر کے بھی کام چلا سکتے ہیں۔

http://www.islamweb.net/hadith/RawyList.php

4۔ اس کتاب میں آپ جو حوالہ پڑھیں، اس کا مکمل ریفرنس فٹ نوٹس میں دیا گیا ہے۔ عام طور پر 4/200 کا مطلب ہے کہ متعلقہ کتاب کی جلد نمبر 4 کا صفحہ نمبر 200۔ تاریخ طبری کو تاریخ وار مرتب کیا گیا ہے اور اس کی جلدیں جس طرح شائع ہوئی ہیں، ان میں سے ہر جلد کے اندر دو دو حصے بنا دیے گئے ہیں۔ اس وجہ سے اس کا حوالہ ہم نے اس طرح دیا ہے 25H/4/2-200 ۔ اس کا مطلب ہے 25 ہجری کے باب میں جلد 4 کے حصہ 2 کا صفحہ 200۔ سال کا ریفرنس دینے کا فائدہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس طبری کا کوئی اور ورژن ہو تو آپ

اس سال کے باب میں جا کر متعلقہ اقتباس کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اس طرح ریفرنس کے مطابق متعلقہ کتاب میں جا کر دیکھ لیجیے اور اس کی تصدیق کر لیجیے۔ ورڈ ورژن کو آپ سرچ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں جبکہ پی ڈی ایف ورژن کو آپ مطالعہ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ دیگر کتب میں بھی حوالہ ایسے طریقے سے دیا جائے کہ اگر آپ کے پاس کتاب کا کوئی اور ورژن بھی ہو، تو آپ اس حوالے کو متعلقہ کتاب سے نکال کر اس کی تصدیق کر سکیں۔

طبری کے حوالے ہم نے اردو ورژن کے دیے ہیں تا کہ عام قارئین اس سے فائدہ اٹھا سکیں لیکن اردو ورژن میں مسئلہ یہ ہے کہ اکثر اوقات روایتوں کی سند کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ روایت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اصل عربی ورژن سے اس روایت کی سند بھی بیان کر دی جائے۔ اگر آپ سند کی تصدیق کرنا چاہیں تو عربی ورژن میں متعلقہ سال کے باب میں دیکھ سکتے ہیں۔

5۔ جن روایات پر ہم نے تنقید کی ہے، ان کی مکمل سندیں اس کتاب کے اندر ہم نے فراہم کی ہیں۔ ان اسناد کو چیک کر لیجیے اور جن راویوں کی بنیاد پر ہم نے روایات کو غیر مستند قرار دیا ہے، ان کے حالات آپ شمس الدین ذہبی (673-748/1275-1347) کی کتابوں میزان الاعتدال اور سیر الاعلام النبلا میں پڑھ سکتے ہیں جو کہ فن رجال کے جامع انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ان کتب کا اوریجنل عربی ورژن ہی دستیاب ہے، اردو ترجمہ نہیں ہوا۔ لیکن اس کی زبان بالکل آسان اور سادہ ہے اور آپ متعلقہ راوی کو تلاش کر کے اس کے متعلق محدثین کی آراء پڑھ سکتے ہیں۔ جیسے لفظ کذاب، یا ثقہ، یا صدوق وغیرہ تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں۔ جہاں جہاں ہم نے راویوں پر جرح و تعدیل نقل کی ہے، وہاں ان کتب سے ہم نے متعلقہ راوی کا نمبر دے دیا ہے۔ اگر یہ نمبر کچھ آگے پیچھے ہو جائے تو ان کے نام ان کتب میں حروف تہجی کی ترتیب میں ہیں۔

اس طریقے سے ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی تصدیق آپ خود کر سکتے ہیں۔ جہاں پر ہم نے روایات کا تجزیہ کیا ہے اور اپنے دلائل پیش کیے ہیں، اس تجزیے کو آپ اپنی عقل سے پرکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ درست محسوس ہو تو مان لیجیے ورنہ آپ خود ان روایات کا اپنا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالی نے ہمیں عقل اسی لیے دی ہے کہ ہم اسے تجزیہ کرنے کے لیے استعمال میں لائیں۔ کسی بات کو محض اس وجہ سے ہرگز نہ مانیے کہ اسے ماضی کی کسی عظیم شخصیت نے درج کیا ہے بلکہ اپنے ذہن کو استعمال کیجیے۔ مسلمہ تاریخی اصولوں کو مد نظر رکھیے اور ان کی خلاف ورزی نہ کیجیے۔ ہم نے اس کتاب میں جو باتیں بیان کی ہیں، انہیں ہرگز اس وقت تک تسلیم نہ کیجیے جب تک کہ آپ ان کی خود تصدیق نہ کر لیں۔

6۔ ان تفصیلات کو پڑھنے کے بعد بھی جو سوالات آپ کے ذہن میں رہ جائیں، وہ آپ بلا تکلف ہمیں نیچے دیے ہوئے ایڈریس پر ای میل کر دیجیے۔ ہم کوشش کریں گے کہ جلد از جلد آپ کی خدمت میں اس کا جواب پیش کر دیا جائے۔ ایڈریس یہ ہے:

mubashirnazir100@gmail.com

خلاصہ باب

یہاں ہم اوپر کی بحث کا خلاصہ چند اصولوں کی صورت میں بیان کر رہے ہیں:

- اصول نمبر 1: ایسی روایت، جس میں کسی خاص شخصیت کی کردار کشی ہو اور اسے بیان کرنے والا کوئی راوی اس شخصیت کے خلاف تعصب رکھتا ہو، ہر گز قابل قبول نہیں ہے۔ ہاں اس راوی کی دیگر عام باتوں کو قبول کیا جا سکتا ہے۔
- اصول نمبر 2: روایت میں جو بات بیان ہوئی ہے، اسے اس زمانے کے مجموعی مزاج اور کیفیت سے مطابقت رکھنی چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہمیں قرآن مجید سے معلوم ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ہزاروں روایتیں بھی اسی بات کی تائید کرتی ہیں اور یہ بات تواتر سے ثابت ہے۔ اس وجہ سے کوئی بھی ایسی روایت، جو صحابہ کرام کے درمیان باہمی بغض اور نفرت کو ظاہر کرتی ہو، جھوٹی اور جعلی روایت ہے۔ اس بات کی مزید تصدیق اصول نمبر 1 سے کی جا سکتی ہے۔
- اصول نمبر 3: حسن ظن سے کام لیجیے کہ اللہ تعالی نے ہمیں حسن ظن کا حکم دیا ہے۔ تاریخی روایات اگر حد تواتر کو نہ پہنچیں تو ان سے محض "ظن" اور "گمان" ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی تاریخی شخصیت کے کسی عمل کے بارے میں اس وقت تک منفی رائے قائم نہ کیجیے جب تک کہ تواتر سے اس کے بارے میں منفی بات معلوم نہ ہو جائے۔ اس کے بعد بھی اپنی رائے کو اس کے عمل تک ہی محدود رکھیے۔ اس کی شخصیت پر کفر، فسق وغیرہ کا حکم نہ لگائیے کہ یہ صرف اللہ تعالی کا کام ہے۔ وہی فیصلہ کرے گا کہ کون کافر ہے اور کون فاسق۔ ہماری رائے زیادہ سے زیادہ یہ ہونی چاہیے کہ کیا عمل درست تھا اور کیا غلط؟

اس کے علاوہ ہم نے اس باب میں مختلف ادوار میں مرتب کی جانے والی تاریخ کی تاریخ بیان کی ہے اور اہم مورخین کے نام اور ان کے قابل اعتماد ہونے یا نہ ہونے پر بحث کی ہے۔

اگلے باب سے ہم خلفاء راشدین میں سے ایک ایک کے دور کو لے کر اس زمانے سے متعلق اہم سوالات پر بحث کریں گے۔

اسائن منٹس

۱۔ مسلم امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کے اہم مورخین کون کون سے ہیں؟ ان کے نام اور زمانے کا تعین کیجیے۔

۲۔ عہد صحابہ سے متعلق تاریخی روایات کے سب سے قدیم مآخذ کون سے ہیں؟ ان کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

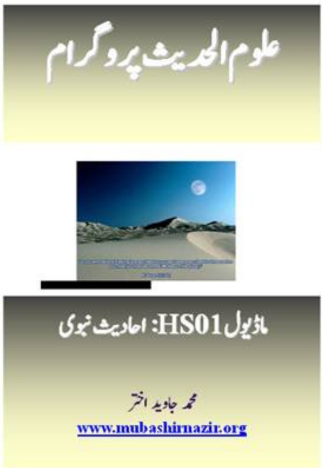
۳۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کردار کشی جن مورخین اور راویوں نے کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے اسباب کیا تھے؟

۴۔ علم جرح و تعدیل کیا ہے؟ کیا تاریخی روایات کی جانچ پڑتال کے لیے علم جرح و تعدیل کو استعمال کرنا چاہیے؟ اس ضمن میں کون سے

دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں؟ دونوں نقطہ ہائے نظر کے دلائل بیان کر کے اس پر اپنی رائے بیان کیجیے کہ کون سا نظریہ درست ہے؟

۵۔ "ایک عام آدمی تاریخی روایات کی چھان بین کیسے کر سکتا ہے؟" کے عنوان کے تحت جو کچھ بیان ہوا ہے، اس کی پریکٹس کیجیے۔ کوئی سی تین تاریخی روایت لے کر اس عنوان کے تحت بیان کردہ طریقہ کار کا اس پر اطلاق کیجیے۔





باب 3: عہد صدیقی و فاروقی

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ ہم حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ادوار کے بارے میں یہ جان سکیں کہ:

- خلافت راشدہ کا سیاسی نظام کیا تھا؟
- حضرت ابو بکر کی بیعت کن حالات میں ہوئی؟
- فتنہ ارتداد کیوں اٹھ کھڑا ہوا؟
- حضرت ابو بکر و عمر کے ادوار میں روم اور ایران سے جنگیں کیوں ہوئیں؟
- حضرت عمر اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کے درمیان کیا معاملہ ہوا؟
- حضرت عمر کی شہادت کے اسباب کیا تھے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ عہد صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما سے متعلق اہم تاریخی سوالات کے جواب دے سکیں۔

اس باب میں ہم حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ادوار سے متعلق تاریخی سوالات کا جائزہ لیں گے۔

خلافت راشدہ کا سیاسی نظام

یہ سوال خلافت راشدہ کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی کی بنیاد پر اگلے بہت سے سوالوں کے جواب ملتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا سیاسی نظام کیا تھا اور اس کے خدوخال کیا تھے؟ دنیا میں انسانوں نے حکومت کے بہت سے نظام تیار کیے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی خصوصیات دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں بادشاہت، آمریت، تھیوکریسی، سیکولرازم، ارسٹوکریسی، فیوڈل ازم، قبائلی نظام، جمہوریت وغیرہ شامل ہیں۔ پھر جمہوریت میں پارلیمانی اور صدارتی نظام رائج ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف زمانوں میں یہ سب کے سب نظام رائج رہے ہیں۔ اس بات کا تعین کرنے سے پہلے کہ خلافت راشدہ کا نظام کیا تھا، مناسب ہو گا کہ ہم ان نظاموں کی بنیادی خصوصیات بیان کرتے چلیں۔ پھر اس کی مدد سے ہم اس بات کا تعین کرنے کی کوشش کریں گے کہ خلافت راشدہ کے دور میں کون سا سیاسی نظام رائج ہوا؟ واضح رہے کہ یہاں کسی نظام کی تائید یا تردید مطلوب نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مختلف سیاسی نظاموں کا تقابلی مطالعہ کر کے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ عہد خلافت راشدہ اور پھر بعد کے ادوار میں کون سا نظام حکومت رائج ہوا۔

بادشاہت یا ملوکیت (Monarchy)

بادشاہت یا ملوکیت وہ نظام ہے جس میں حکومت کو ایک خاص خاندان (Bloodline) کا حق مان لیا جاتا ہے۔ اس خاندان کے ایک شخص کو بادشاہ بنا دیا جاتا ہے جو اپنے کارندوں کی مدد سے حکومت کرتا ہے۔ یہ بادشاہ بالعموم قوانین سے ماوراء ہوتا ہے اور اسے استثنا حاصل ہوتا ہے۔ بادشاہ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ قانون ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے دوران کوئی شخص یا گروہ اسے حکومت سے اتار نہیں سکتا اور ایسا کرنے والے کو باغی سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے یا خاندان کے کسی اور شخص کو بادشاہ بنایا جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بادشاہ مرنے سے پہلے اپنے کسی بیٹے یا بھائی کو ولی عہد نامزد کر دیتا ہے۔ ملکی خزانے کو بادشاہ کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور وہ اسے جیسے چاہے خرچ کرے، کوئی اس کا احتساب نہیں کر سکتا ہے۔ لوگوں کی ذہنی تربیت کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ خود کو بادشاہ کا غلام سمجھیں۔ حکومت پر تنقید کی اجازت نہیں ہوتی ہے اور بالعموم آزادی اظہار رائے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔

اس وقت دنیا کے صرف چند ہی ممالک میں بادشاہت موجود ہے جن میں برونائی، خلیجی ریاستیں، مراکش وغیرہ شامل ہیں لیکن ان ممالک میں بھی یہ خالص بادشاہت نہیں ہے بلکہ ان کا نظام حکومت ملوکیت، تھیوکریسی اور جمہوریت کا ملغوبہ ہے جس میں ملوکیت کا عنصر زیادہ ہے۔ اسی طرح برطانیہ، ہالینڈ اور جاپان میں بھی ملوکیت اور جمہوریت کا ملغوبہ ہی رائج ہے لیکن وہاں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہے۔

آمریت (Autocracy)

یہ بھی بادشاہت سے ملتا جلتا نظام ہے جس میں ایک شخص کو تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ خود ہر قسم کے قانون سے ماوراء ہوتا ہے۔ اسے آمر یا ڈکٹیٹر کہا جاتا ہے۔ بادشاہت اور آمریت میں فرق یہ ہے کہ بادشاہت میں حکومت کو ایک خاندان کا حق مان لیا جاتا ہے جبکہ آمریت میں اسے اس شخص تک محدود رکھا جاتا ہے۔ ڈکٹیٹر کے مرنے یا اس کے زوال کے بعد اس کی جگہ دوسرا ڈکٹیٹر لے لیتا ہے۔ عام طور پر آمریت، فوجی طاقت کی بنیاد پر حاصل کی جاتی ہے۔ دنیا کے کئی ممالک میں فوجی آمریت قائم رہی ہے جن میں حافظ الاسد کا شام، صدام حسین کا عراق، قذافی کا لیبیا، شمالی کوریا اور کافی حد تک پاکستان بھی شامل ہے۔ چین میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کو بھی آمریت کہا جا سکتا ہے۔

تھیوکریسی (Theocracy)

اس نظام میں اختیارات کا منبع کوئی بادشاہ نہیں بلکہ خدا ہوتا ہے اور اسی خدا کا قانون چلتا ہے۔ حکمران سمیت حکومت کے تمام کارندوں کو اسی قانون پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس قانون کی تشریح و توضیح مذہبی علماء کے پاس ہوتی ہے۔ عملاً اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت مذہبی علماء کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور وہ بادشاہ کو بھی مجبور کر سکتے ہیں۔ یہ مذہبی علماء عام طور پر ایک خاص تنظیم کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور پھر اس تنظیم کا سربراہ ہی اصل حکمران ہوتا ہے۔ سلطنت کا حکمران بالعموم علماء کی اس تنظیم کے ماتحت ہوتا ہے اور اس کے احکام سے سرتابی نہیں کر سکتا ہے۔ قرون وسطی میں یورپ میں تھیوکریسی کا نظام رائج تھا اور کیتھولک پوپ کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ بادشاہوں کو اس سے ملنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ موجودہ دور میں ایران کا نظام حکومت تھیوکریسی کے قریب ہے۔ اسی طرح خلیجی ریاستوں کے نظام میں بھی تھیوکریسی کا عنصر نمایاں ہے۔

سیکولرازم (Secularism)

یہ نظام تھیوکریسی کا متضاد ہے۔ اس میں یہ مان لیا جاتا ہے کہ مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور حکومتی اور اجتماعی معاملات میں مذہب کو دخل حاصل نہ ہو گا۔ اس طرح سے مذہبی علماء کا اقتدار ختم کر دیا جاتا ہے۔ سیکولرازم کے فلسفے کے تحت بننے والا نظام بادشاہت، آمریت، جمہوریت، ارسٹوکریسی کسی بھی عنصر پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

ارسٹوکریسی (Aristocracy / Oligarchy)

اس نظام میں اختیارات کا منبع ایک خاص طبقہ ہوتا ہے جو کہ اشرافیہ (Aristocrat) کہلاتا ہے۔ یہ ملک کے امیر لوگوں کا طبقہ ہوتا ہے جو مل کر نظام حکومت چلاتے ہیں۔ ان میں سیاستدان، جاگیردار، بڑے تاجر، بیوروکریٹ، فوجی جرنیل، مذہبی علماء، میڈیا ٹائی کون وغیرہ سبھی شامل ہوتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں یہی نظام رائج ہے۔ قرون وسطی میں ارسٹوکریسی بھی بادشاہت کی طرح خاندانی ہوتی تھی اور جو شخص کسی غریب گھرانے میں پیدا ہو گیا، وہ کبھی ارسٹوکریٹس میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ موجودہ دور میں

ترقی یافتہ ممالک میں یہ پابندی بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے تاہم پس ماندہ ممالک میں اب بھی یہ پابندی برقرار ہے۔ معاشی نظام کے اعتبار سے ارسٹو کریسی کی کئی شکلیں ہیں جن میں جاگیر داریت (Feudalism)، سرمایہ داریت (Capitalism) اور اشتراکیت (Socialism) دنیا میں رائج رہے ہیں۔

جاگیر داریت (Feudalism) ارسٹو کریسی کی ایسی شکل ہے جو بالعموم زرعی معاشروں میں رائج رہی ہے۔ زرعی معاشرے میں چونکہ تمام معاشی سرگرمیوں کا محور زمین ہی ہوتی ہے، اس وجہ سے جاگیر دار ہی اشرافیہ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ حکمران طبقہ اپنے وفادار افراد کو زمین کا بڑا سا ٹکڑا دے دیتا ہے۔ اس زمین پر کام کرنے والے مزارع عملاً جاگیر دار کے غلام ہوتے ہیں جو اس کے زرعی کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ اسے فوجی طاقت بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ حالت امن میں زمین کو کاشت کرتے ہیں اور حالت جنگ میں اپنے جاگیر دار کے شانہ بشانہ لڑتے ہیں۔ اس کے بدلے جاگیر دار انہیں فصل اور مال غنیمت میں سے کچھ حصہ دے دیتا ہے۔ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنے جاگیر دار کو چھوڑ کر دوسرے کے پاس چلا جائے۔ ہاں جن علاقوں میں جاگیر دارانہ نظام کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے، وہاں مزارع اسے چھوڑ بھی جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) میں معاشی سرگرمی کا اصل محور صنعتیں اور کاروبار ہوتے ہیں۔ اس طرح سے دولت کا بڑا حصہ ان صنعتی اور تجارتی ایمپائرز کے مالکوں کے پاس ہوتا ہے۔ یہی لوگ مل کر ارسٹو کریسی تشکیل دیتے ہیں جو حکومت چلاتی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کی نسبت، اس میں کارکنوں میں اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایک کمپنی کو چھوڑ کر دوسری کے پاس ملازمت کر لیں۔

اشتراکیت (Socialism) میں تمام زمینوں، صنعتوں اور کاروباری کمپنیوں کو حکومتی تحویل میں لے لیا جاتا ہے۔ ملک کو ایک پارٹی چلاتی ہے۔ کہنے کو تو یہ نظام فیوڈل ازم اور کیپیٹل ازم کو ختم کرنے کے لیے وجود میں آیا لیکن اس کے نتیجے میں عملاً کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کی حکومت قائم ہو گئی جو بذات خود ایک ارسٹو کریسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شمار ہم نے ارسٹو کریسی میں کیا ہے۔

قبائلی نظام (Tribalism)

اس نظام میں سیاسی سرگرمی کا محور و مرکز قبیلہ ہوتا ہے۔ قبیلہ دراصل ایک بہت بڑا خاندان ہوتا ہے جس میں ہر شخص دوسرے کا رشتے دار ہوتا ہے۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا ہے۔ قبیلوں کے اندر آمریت، جمہوریت یا ارسٹو کریسی کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اگر کسی جگہ بہت سے قبائل رہتے ہوں تو وہ مل جل کر رہنے کے لیے ایک وفاق یا پنچایت مقرر کرتے ہیں جس میں قبائلی سردار مل کر اجتماعی فیصلے کر لیتے ہیں۔ اپنے اندرونی معاملات میں ہر قبیلے کو آزادی حاصل ہوتی ہے۔ قدیم عرب میں یہ رواج تھا کہ خاندان سے باہر کے لوگوں کو بھی قبیلے کا حصہ بنا لیا جاتا تھا۔ یہ لوگ اس قبیلے کے "حلیف" یا "موالی" کہلاتے تھے۔

جمہوریت (Democracy)

اس نظام میں طاقت کا سرچشمہ عوام کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو معاشرے میں برابر سمجھا جاتا ہے اور اسے یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ

اقتدار حاصل کرنے کے لیے پارٹی بنائے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کرے، حکومت پر تنقید کرے اور اپنی رائے کا اظہار کرے۔ حکمران کا انتخاب عام لوگوں کے ووٹوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ حکمران قانون سے بالاتر نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا احتساب بھی کیا جاسکتا ہے۔عدلیہ اور میڈیا حکومت کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں اور حکومت کا احتساب کرتے ہیں۔ ہر اہم معاملہ پارلیمنٹ کے مشورے سے طے کیا جاتا ہے۔ قانون سازی کے لیے پارلیمنٹ سے منظوری ضروری ہوتی ہے۔

جمہوریت میں دو طرح کے نظام رائج ہیں، ایک پارلیمانی جمہوریت کہلاتا ہے اور دوسرا صدارتی۔ پارلیمانی جمہوریت میں عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں اور یہ نمائندے اپنے میں سے ایک وزیر اعظم کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ وزیر اعظم پارلیمنٹ کو جوابدہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس صدارتی نظام میں عوام، ملک کے سربراہ کو براہ راست منتخب کرتے ہیں جسے بالعموم "صدر" کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ عوام پارلیمنٹ کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔ ان دونوں کے اختیارات میں توازن رکھا جاتا ہے اور یہ دونوں مل کر حکومت چلاتے ہیں۔ پارلیمانی جمہوریت کی مثال برطانیہ ہے اور صدارتی جمہوریت کی مثال امریکہ کا نظام حکومت ہے۔

اس وقت جمہوریت کو آئیڈیل نظام حکومت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں جمہوریت رائج ہے تاہم عملی اعتبار سے یہ ارسٹو کریسی ہی کی ایک نسبتاً بہتر شکل ہے۔ پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے لیے دولت اور خاندانی بیک گراؤنڈ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ تاہم ترقی یافتہ جمہوریتوں میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ معاشرے کے کمزور طبقات جیسے مزدور، کسان، خواتین اور اقلیتوں کے لیے پارلیمنٹ میں نشستیں مخصوص کی جائیں تاکہ حکومت میں ان کی نمائندگی کو یقینی بنایا جاسکے۔

خلافت راشدہ کا نظام

قرآن مجید میں اللہ تعالی نے کسی ایک نظام حکومت کو اپنانے کا حکم نہیں دیا کیونکہ مختلف حالات میں مختلف نظام حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم قرآن میں ایک بنیادی اصول بیان کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان جو بھی نظام حکومت اپنائیں، اس کی بنیاد "مشورے" پر ہونی چاہیے اور حکومت کے تمام امور لوگوں کو مل جل کر باہمی مشورے سے چلانے چاہییں۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ.

وہ لوگ جو اپنے رب کی بات کا جواب دیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ان کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (الشوری 42:38)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اگرچہ کسی سے مشورہ کرنے کے محتاج نہ تھے، مگر آپ کو بھی یہی حکم دیا گیا تھا:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ.

ان سے درگزر کیجیے، ان کے لیے مغفرت کی دعا کیجیے، معاملات میں ان سے مشورہ کیجیے۔ پھر جب آپ فیصلہ کر لیں تو اللہ پر توکل کیجیے، یقیناً اللہ توکل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ (آل عمران 3:159)

ان آیات سے واضح ہے کہ مسلمانوں کا کوئی بھی اجتماعی نظام مشورے سے چلنا چاہیے۔ حکمران کسے بنایا جائے؟ حکومتی فیصلے کیسے کیے جائیں؟ حکمران کو معزول کیسے کیا جائے؟ ان سب کا فیصلہ مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہو گا۔ ایسا نہیں کہ حکمران مشورے تو سب کے سن لے اور پھر اپنی من مانی کرے بلکہ معاملات کا فیصلہ لوگوں کے مشورے ہی سے ہو گا۔ جو مشورہ لوگوں کی اکثریت دے، حکمران کو اسے قبول کرنا ہو گا۔

خلفائے راشدین نے اپنے دور کے لحاظ سے جو نظام حکومت اختیار کیا، اسے ہم قبائلی وفاق کا نظام کہہ سکتے ہیں۔ اس نظام میں مشورے کی روح پوری طرح کار فرما تھی۔ عرب میں دور جاہلیت سے بہت سے قبائل آباد تھے۔ ان قبائل کو اپنی خود مختاری بہت عزیز تھی اور یہی وجہ تھی کہ یہ صدیوں سے کسی ایک حکومت پر متفق نہ ہو سکے تھے اور آپس میں جنگیں کرتے رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اپنی حکومت قائم فرمائی تو معاہدوں کے ذریعے ان قبائل کو اسلامی مملکت کا حصہ بنالیا۔ ان معاہدوں میں یہ شرط ہوتی تھی کہ اپنے اندرونی معاملات میں قبیلہ خود مختار رہے گا اور ان پر ان کی مرضی کے خلاف کسی کو حکمران مقرر نہ کیا جائے گا۔ بین القبائلی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت مدینہ کی مرکزی حکومت کو حاصل ہو گی۔ خلفائے راشدین نے بھی یہی نظام حکومت جاری رکھا۔

ہر قبیلے سے متعلق معاملات اس قبیلے کے ساتھ مشورے ہی سے طے پاتے۔ مرکزی حکومت کے لیے طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا کہ تمام قبائل نے متفقہ طور پر یہ تسلیم کر لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قبیلہ قریش کی حکومت کو تسلیم کریں گے۔ چنانچہ خلیفہ کے انتخاب کا معاملہ قبیلہ قریش کے سپرد کیا گیا کہ وہ اپنے میں سے کسی شخص کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ اب کس شخص کو خلیفہ منتخب کیا جائے؟ اس کے لیے مدینہ کے سبھی باشندوں سے رائے لی جاتی۔ ان میں خاص کر ان صحابہ کی رائے کو اہمیت دی جاتی جنہوں نے نہایت تکالیف کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ اس میں وہ صحابہ شامل تھے جو جنگ بدر سے پہلے ایمان لائے۔ ان کے بعد صلح حدیبیہ میں شامل بقیہ صحابہ کا درجہ تھا اور ان کے بعد باقی سب صحابہ کا۔ اعلی حکومتی عہدوں پر وہ دس صحابہ فائز تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن میں بالکل ابتدائی سالوں میں شریک ہوئے تھے اور انہوں نے دین کی خاطر بڑی قربانیاں دی تھیں۔ انہیں "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

1. ابو بکر صدیق (573-634CE/13H): آپ پہلے خلیفہ تھے اور آپ کو دور حکومت 11-13/632-634 تھا۔
2. عمر فاروق (586-645/23H): آپ دوسرے خلیفہ تھے اور آپ نے 13-23/634-644 کے دوران حکومت کی۔ پہلے خلیفہ کے دور میں آپ ان کے دست راست رہے اور محکمہ قضاء کی ذمہ داری آپ ہی کے سپرد تھی۔
3. عثمان غنی (579-656/35H): آپ تیسرے خلیفہ تھے اور آپ کا دور حکومت 23-35/644-656 پر محیط ہے۔ آپ پہلے دو خلفاء کے دور میں مرکزی کابینہ کے رکن تھے اور متعدد ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔

4. علی المرتضی (598-661/40H): چوتھے خلیفہ۔ آپ کا دور حکومت 35-40/656-661 ہے۔ پہلے تین خلفاء کے دور میں آپ وفاقی کابینہ میں شامل رہے اور عدلیہ کے سربراہ بھی رہے۔

5. طلحہ بن عبید اللہ (595-656/36H): سب سے پہلے ایمان لانے والے دس افراد میں شامل ہیں۔ دین کی خاطر زبردست قربانیاں دیں، جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر برسنے والی تلواروں کو اپنے ہاتھ پر روکا۔ آپ پہلے تین خلفاء کے دور میں مرکزی کابینہ میں شامل تھے۔

6. زبیر بن عوام (594-656/36H) جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے "حواری" کا خطاب دیا۔ آپ بھی پہلے تین خلفاء کے دور میں مرکزی کابینہ میں شامل تھے۔

7. ابو عبیدہ بن الجراح (580-652/31H) جو "امین الامت" کے لقب سے مشہور ہیں اور شام کو فتح کرنے والی فوج کے سپریم کمانڈر تھے۔ اس کے علاوہ آپ محکمہ مالیات کے سربراہ بھی رہے۔

8. سعد بن ابی وقاص (595-664/43H): آپ ایران کو فتح کرنے والی فوج کے سربراہ تھے۔ عراق کے گورنر بھی رہے اور مرکزی کابینہ کے رکن بھی تھے۔

9. عبدالرحمن بن عوف (580-652/32H): آپ بھی مرکزی کابینہ کے رکن رہے۔ آپ کو مالی امور پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔

10. سعید بن زید (593-673/51H): آپ حکومتی اور سیاسی معاملات میں زیادہ شریک نہیں رہے۔ رضی اللہ عنہم

عام حکومتی معاملات کو ان ہی دس صحابہ کی ایک کابینہ مل کر چلایا کرتی تھی جس کا سربراہ خلیفہ وقت ہوتا تھا۔ بڑے اور اہم مسائل کے حل کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب فیصلہ کرنا مقصود ہوتا تو "صلوۃ الجامعہ" کا اعلان کر دیا جاتا جس سے دار الحکومت کے تمام افراد مسجد نبوی میں جمع ہو جاتے جن میں خواتین بھی شامل ہوا کرتی تھیں۔ مسئلے کو ان کے سامنے رکھا جاتا اور ہر شخص کو اپنی رائے بیان کرنے کی مکمل آزادی ہوتی۔ اس کے بعد اجتماعی طور پر لوگ جس رائے پر متفق ہوتے، اسے اختیار کر لیا جاتا۔ بہت بڑے مسائل کی صورت میں قبائل اور صوبوں کے نمائندوں کو بھی طلب کیا جاتا اور ان کے ساتھ مل کر فیصلے کیے جاتے۔ ایران پر بڑے حملے کا فیصلہ اسی طرح ہوا تھا۔ ان میں آفیشل نمائندوں کے علاوہ کسی بھی عام شخص کو مشورے میں شریک ہونے کا حق حاصل ہوتا تھا اور وہ جب چاہے، دربار خلافت میں آ کر اپنا مشورہ پیش کر سکتے تھے۔ دربار خلافت کسی عالی شان محل میں نہیں بلکہ مسجد کے فرش پر لگتا تھا جس میں کوئی کسی کو داخل ہونے سے نہ روک سکتا تھا۔

اگر خلیفہ وقت کی رائے، عام لوگوں کی رائے سے مختلف ہوتی تو وہ اس وقت تک اپنی رائے کو نافذ نہ کر سکتے تھے جب تک کہ وہ انہیں

قائل نہ کر لیتے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب عراق کی زمینوں کے انتظام کا مسئلہ در پیش ہوا تو اکثر صحابہ کی رائے یہ تھی کہ انہیں فاتحین میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ انہیں حکومتی ملکیت میں رکھا جائے اور کسانوں کے ساتھ پارٹنر شپ پر معاملہ کر لیا جائے۔ اس مسئلے پر کئی دن بحث ہوئی اور بالآخر جب صحابہ حضرت عمر کی رائے سے متفق ہوئے تو اسے نافذ کیا گیا۔ ہاں اگر کسی معاملے میں قرآن و سنت کا کوئی واضح حکم موجود ہوتا، تو پھر اسے بلا تامل نافذ کر دیا جاتا۔

حکومتی معاملات سے لوگوں کو آگاہ رکھا جاتا اور اس کے لیے جمعہ کی نماز کے موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا۔ جمعہ کی نماز کے لیے نہ صرف اہل مدینہ بلکہ گرد و نواح کے دیہات سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ خلیفہ وقت جمعہ کا خطبہ دیتے اور اس میں اہم حکومتی امور بھی زیر بحث لاتے اور حکومت کی پالیسی کو بیان کرتے۔ اگر کسی کو اختلاف ہوتا تو اسے اجازت تھی کہ وہ بر سر منبر ہی خلیفہ کو ٹوک کر اپنی رائے بیان کرے۔ مالی معاملات میں شفافیت (Transparency) کا یہ عالم تھا کہ مال کی تقسیم کھلے عام مسجد میں ہوتی تھی اور ہر شخص کو اعتراض کرنے اور اپنی رائے بیان کرنے کا حق حاصل تھا۔ سال میں ایک مرتبہ بیت المال کے اکاؤنٹس کلوز کیے جاتے اور اس میں موجود تمام مال لوگوں میں ان کی خدمات کے مطابق تقسیم کیا جاتا۔ بیت المال کو صاف کر کے اس میں جھاڑو دے دی جاتی۔

جب خلافت راشدہ کے صوبے قائم ہونا شروع ہوئے تو وہاں بھی یہی ماڈل اختیار کیا گیا۔ ہر شہر کے گورنر کا تعین اس شہر کے لوگوں کی رائے کے مطابق ہوتا۔ مشہور ہے کہ اہل کوفہ اور اہل بصرہ نے حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے ادوار میں کئی مرتبہ اپنے گورنر کو ہٹا کر کسی دوسرے کو گورنر بنانے کا مطالبہ کیا تو اسے مان لیا گیا۔ گورنروں کو حکم تھا کہ وہ اپنے تمام فیصلے اہل شہر کے مشورے سے ہی انجام دیں۔ اگر کسی بھی شخص کو گورنر کے خلاف کوئی شکایت ہوتی تو اسے براہ راست خلیفہ تک رسائی حاصل تھی۔ حج کے موقع پر خلفاء راشدین ایسی مجالس لگایا کرتے تھے جن میں کوئی بھی شخص گورنروں کے خلاف اپنی درخواست پیش کر سکتا تھا اور اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ در پیش نہ ہوتا تھا۔

اس طرح سے خلفائے راشدین نے ایک ایسا شورائی (Participative) نظام حکومت قائم کیا جس کی مثال دور جدید کی امریکی اور یورپی جمہوریتوں میں بھی ملنا مشکل ہے۔ ان جدید جمہوری ریاستوں میں بھی بہت سے امور عوام سے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور عام آدمی حکومتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن خلافت راشدہ میں ایک عام آدمی کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ کا احتساب کر سکے اور یہ احتساب بھی کسی منفی جذبے سے نہیں بلکہ خلیفہ اور عام مسلمانوں کے لیے خیر خواہی کے جذبے کے تحت ہوا کرتا تھا۔

خلیفہ کا انتخاب قبیلہ قریش ہی سے کیوں کیا گیا؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اسلام مساوات کا قائل ہے اور ہر مسلمان کو برابر قرار دیتا ہے لیکن دوسری طرف اس زمانے میں خلیفہ کے انتخاب کے لیے اس کے قریشی ہونے کی شرط کیوں لگائی گئی؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اس دور کے تمدنی حالات کو دیکھنا ہو گا۔ علم عمرانیات (Sociology) کے بانی ابن خلدون (-732

(808/1332-1405) کے مطابق، کسی بھی قوم کی بنیاد "عصبیت" پر ہوتی ہے۔ عصبیت اس جذبے کو کہتے ہیں جس کے تحت انسان خود کو کسی گروپ سے وابستہ سمجھتا ہے اور اس کی بدولت اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔ اسی عصبیت کی بدولت انسان کے ذہن میں "ہم" اور "وہ" کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ عصبیت ملک، صوبے، علاقے، زبان، مذہب، رنگ، نسل کسی بھی بنیاد پر پیدا ہو سکتی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں اہل پاکستان، خود کو ہندوستانیوں سے ایک الگ قوم سمجھتے ہیں۔ اسی طرح پنجابی، سندھی، بلوچ، پٹھان، کشمیری، بلتی وغیرہ خود کو الگ الگ قومیں تصور کرتے ہیں۔ ان سب کے پیچھے عصبیت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ اگر عصبیت کمزور ہو جائے تو قوم بکھر جاتی ہے لیکن اگر یہ مضبوط ہو تو قوم کی تشکیل اسی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

عربوں کے ہاں یہ کیفیت تھی کہ ان کا بنیادی معاشرتی یونٹ "قبیلہ" تھا اور عصبیت کی بنیاد اسی پر تھی۔ قبائلی عصبیت کو مذہب کی سی حیثیت حاصل تھی۔ عرب اپنے قبیلے پر کسی بیرونی قوت کی بالا دستی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جب اسلام نے مساوات کا درس دیا تو اس کے نتیجے میں یہ ممکن نہ تھا کہ عرب اپنی صدیوں کی روایت کو ایک دن میں چھوڑ دیں۔ جو لوگ علم عمرانیات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ معاشرتی تبدیلی کبھی ایک دن میں نہیں آتی۔ خاص کر جو تعصبات اور عصبیتیں لوگوں میں قائم ہو جائیں انہیں ختم ہونے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ مثلاً ہمارے قبائلی علاقوں میں اگر آج کوئی ایسی مہم شروع کر دی جائے جس میں انہیں قبائلی عصبیتوں کو ترک کر دینے کی ترغیب ہو، تو یہ عمل کئی صدیوں میں مکمل ہو گا۔ اب سے پانچ سو برس پہلے تک پنجاب بھی ایک قبائلی علاقہ تھا۔ یہاں صدیوں کے عمل کے نتیجے میں قبائل ختم ہو گئے لیکن اب بھی ان کی باقیات برادریوں (جیسے جٹ، ارائیں، راجپوت وغیرہ) کی صورت میں موجود ہیں اور ووٹ دیتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ اپنی برادری کے نمائندے ہی کو ووٹ دیا جائے۔

دور جاہلیت کے عرب میں ہزاروں سال کے پراسیس کے نتیجے میں جو قبائل بنے تھے، انہیں چند دن میں ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ ان قبائل کی عصبیتوں کو ختم کر کے انہیں اسلام کی عصبیت میں یکجا (Integration) کے لیے سینکڑوں برس درکار تھے۔ فی الحقیقت تین چار سو برس کے بعد ہی یہ عصبیتیں ختم ہوئیں مگر ان میں سے بعض قبائل نے اپنی شناخت آج تک برقرار رکھی ہوئی ہے۔

دور جاہلیت ہی سے ایک ایسی روایت قائم ہو گئی جس کے نتیجے میں قبیلہ قریش کو عرب میں سردار قبیلے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ قریش حضرت اسماعیل علیہ الصلوۃ والسلام کی اولاد تھے اور یہ خانہ کعبہ کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ حج کا انتظام کرتے تھے۔ اہل عرب چونکہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام کی امت تھے اور آپ کے تعلق کی بنا پر خانہ کعبہ کو ان کے ہاں مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس وجہ سے وہ قریش کا بہت احترام کرتے تھے۔ دور جاہلیت میں حج متحدہ عرب قومیت کا مظہر بن چکا تھا اور اس کے علاوہ ان میں کسی قسم کی کوئی اجتماعیت نہ تھی۔ کسی عرب قبیلے کا تجارتی قافلہ اگر دوسرے قبیلے کے علاقے میں داخل ہوتا تو اسے لوٹ لیا جاتا تھا لیکن قریشیوں کے تجارتی قافلے یمن سے لے کر شام تک بلا روک ٹوک سفر کرتے اور انہیں ہر قبیلے کی جانب سے امن (Amnesty) حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر قبائل کے لوگوں نے بھی قریشی قافلوں میں انوسٹمنٹ کرنا شروع کر دی۔ اس طرح سے قریش عرب میں ایک زبردست معاشی قوت بن گئے۔

ان حالات میں اگر سوائے قریش کے کسی بھی قبیلے کے کسی بھی شخص کو خلیفہ بنایا جاتا تو بقیہ تمام عرب قبائل اس کے خلاف بغاوت کر دیتے کیونکہ ان میں قبائلی عصبیت موجود تھی۔ وہ کسی اور قبیلے کے شخص کو اپنی ناک کٹ جانے کے مترادف سمجھتے اور فضول اور لامتناہی جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ قریش کے معاملے میں ایسا نہ تھا کیونکہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوۃ والسلام اور خانہ کعبہ سے تعلق کی بنا پر سوائے چند ایک کے سبھی عرب ان کا احترام کیا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا دعوی صرف دو قبائل کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک قریش تھے اور دوسرے انصار۔ قریشی صحابہ نے مکی زندگی میں بے پناہ قربانیاں دی تھیں، ظلم سہے تھے اور اپنا گھر بار اور مال و دولت اللہ تعالی کے دین پر نثار کر دیا تھا۔ دوسری طرف انصار مدینہ تھے جنہوں نے پورے عرب کی مخالفت لے کر مہاجرین قریش کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ ان کی خدمات سے کسی کو انکار نہ تھا لیکن جمہوری اصول پر دیکھا جائے تو یہ مہاجرین قریش ہی تھے جنہیں عرب کے کم و بیش سبھی قبائل کی حمایت تھی۔ اس کے برعکس انصار مدینہ کو اپنے سوا کسی اور قبیلے کی حمایت حاصل نہ تھی۔ پھر انصار دو مزید قبائل میں منقسم تھے جو اوس اور خزرج کہلاتے تھے۔ ان قبائل میں دور جاہلیت سے دشمنی چلی آ رہی تھی جسے اسلام نے ختم کر کے انہیں بھائی بھائی بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں اس قضیے کا فیصلہ فرما دیا تھا کہ آپ کی وفات کے فوراً بعد خلافت کس قبیلے کو ملے گی۔

فتح مکہ سے پہلے مدینہ کی ریاست میں انصار کو اکثریت حاصل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن، خیبر وغیرہ کے علاقوں جو گورنر مقرر فرمائے، ان کا تعلق انصار ہی سے تھا۔ اگر بالفرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات فتح مکہ سے پہلے ہو جاتی تو عین ممکن ہے کہ پہلا خلیفہ راشد بھی انصار ہی سے ہوتا۔ لیکن فتح مکہ کے بعد صورتحال بدل گئی اور نہ صرف پورے قبیلہ قریش بلکہ عرب کے تمام قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔ اب قریش کے حمایتیوں کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قضیے کا فیصلہ فرما دیا۔

وحدثنا محمد بن رافع. حدثنا عبدالرزاق. حدثنا معمر عن همام بن منبه. قال: هذا ما حدثنا أبو هريرة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم. فذكر أحاديث منها: وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم (الناس تبع لقريش في هذا الشأن. مسلمهم تبع لمسلمهم. وكافرهم تبع لكافرهم.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگ اس معاملے میں قریش کے تابع ہیں۔ ان کے مسلمان قریش کے مسلمانوں کے اور ان کے کفار قریش کے کفار کی پیروی کرتے ہیں۔"[1]

اسی بات کو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنو ساعدہ میں ان الفاظ میں بیان کیا:

فأما العرب فلن تعرف هذا الأمر الا لهذا الحي من القريش. جہاں تک عربوں کا تعلق ہے تو وہ اس معاملے [سرداری] میں

[1] مسلم، کتاب الامارہ، حدیث 1818

قریش کے سوا کسی اور قبیلے کو جانتے ہی نہیں ہیں۔۔۔ عربوں کے نیک، قریش کے نیک لوگوں کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے برے، قریش کے بروں کی۔[2]

واضح رہے کہ یہ دائمی نوعیت کا حکم نہیں تھا بلکہ اس وقت تک کے لیے تھا جب تک قریش کے لیے یہ حمایت برقرار رہے۔ یہ صورتحال چوتھی صدی ہجری میں اس وقت تک رہی جب تک بنو عباس کو اقتدار حاصل رہا۔ اس کے بعد خلافت برائے نام ہی قائم رہی۔ جب غیر عرب قوموں کی طاقت عربوں سے بڑھ گئی تو ترکی کے سلطان سلیم اول (918-926/1512-1520) نے 922/1517 میں خلافت کو عربوں سے ترکوں کی طرف منتقل کر دیا اور عالم اسلام نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ جب ترکوں کی طاقت ختم ہوئی تو خلافت عثمانیہ کا بھی 1343/1924 میں خاتمہ ہو گیا۔

حضرت ابو بکر صدیق کی بیعت

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت دو مراحل میں ہوئی۔ پہلے مرحلے پر سقیفہ بنو ساعدہ میں اور دوسرے مرحلے پر عام لوگوں میں۔ سقیفہ بنو ساعدہ انصار مدینہ کے ایک خاندان کا چھپر تھا جس کے نیچے بیٹھ کر وہ باہمی مشورے کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر کچھ انصار کو یہ خیال گزرا کہ ان کی خدمات کے باعث خلیفہ انصار ہی میں سے بننا چاہیے مگر تمام انصار اس بات پر متفق نہ تھے۔ جب جلیل القدر مہاجر صحابہ کو اس بات کا علم ہوا کہ عام مسلمانوں کے مشورے کے بغیر انصار خلیفہ مقرر کرنا چاہتے ہیں تو وہ ان کے پاس پہنچے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ انصار میں چونکہ دین کی خدمت کا بہت جذبہ تھا، اس وجہ سے وہ قائل ہو گئے اور بالاتفاق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد اگلے دن مسجد نبوی میں عام لوگوں کے سامنے یہ بات پیش ہوئی اور سب لوگوں نے بیعت کر کے متفقہ طور پر آپ کو خلیفہ منتخب کر لیا۔

سقیفہ بنو ساعدہ میں کیا واقعات پیش آئے؟

صحیح بخاری، مسند احمد، تاریخ طبری، طبقات ابن سعد اور الانساب الاشراف وغیرہ کتابوں میں ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ کا واقعہ پیش آیا۔ انصار مدینہ میں سے بعض لوگوں نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (جو کہ ایک جلیل القدر صحابی اور انصار کے قبیلہ خزرج کے سربراہ تھے) کو خلیفہ بنانا چاہا۔ مہاجرین، جن میں حضرت عمر اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر بزرگ شامل تھے، نے انہیں اس بات پر قائل کر لیا کہ خلیفہ قبیلہ قریش میں سے بنانا چاہیے کیونکہ اہل عرب قریش کے سوا کسی اور قبیلے کی حکمرانی قبول نہیں کریں گے۔ انصار قائل ہو گئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کے

[2] طبری۔ 11H/2/1-408۔ حدیث سقیفہ۔

لیے حضرت عمر یا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما کا نام پیش کیا لیکن ان دونوں حضرات نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور پھر انصار نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔

یہاں تک اس واقعے میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ انصار مدینہ نے دین کے لیے بہت سی قربانیاں دی تھیں۔ یہ ایک فطری امر تھا کہ وہ خود کو خلافت کا حق دار سمجھتے تاہم اس دور میں ابھی قبائلی عصبیتیں ختم نہ ہو سکی تھیں اور بہت سے قبائل دین میں ابھی داخل ہوئے تھے۔ دور جاہلیت ہی سے ان قبائل کی باہمی دشمنیاں چلی آ رہی تھیں۔ دور جاہلیت ہی سے قبیلہ قریش کو عرب میں امتیازی مقام حاصل تھا۔ اگر خلیفہ کسی اور قبیلے کا بنایا جاتا تو اس کے مخالفین اٹھ کھڑے ہوتے اور خانہ جنگی کی نوبت آ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد کی صورتحال کے پیش نظر یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "حکمران قریش میں سے ہوں گے۔[3]" اور آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت کے لیے نامزد کر کے آپ کی جانب اشارہ بھی فرما دیا تھا۔[4]

انصار مدینہ نے دین کی خاطر بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ انہوں نے اپنی جائیدادوں تک کو مہاجرین کے ساتھ تقسیم کر لیا تھا۔ اس وجہ سے یہ ایک فطری خواہش تھی کہ دین کی خدمت کے لیے ان کے سردار کو خلیفہ بنا لیا جاتا۔ لیکن اس صورت میں عرب قبائل بغاوت کر دیتے اور حالات بگڑ جاتے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ انصار خود قبیلہ اوس و خزرج میں تقسیم تھے اور ان دونوں قبیلوں میں دور جاہلیت ہی سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ مدینہ میں اسلام کی دعوت پہنچنے سے پہلے ان میں ایک بڑی جنگ ہو چکی تھی، جو جنگ بعاث کہلاتی ہے اور اس جنگ میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے۔ اگر ان میں سے کسی ایک قبیلے سے خلیفہ منتخب کیا جاتا تو دوسرا قبیلہ اسے پسند نہ کرتا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر جب حضرت ابو بکر، عمر اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تو وہ قائل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو دل و جان سے خلیفہ تسلیم کر لیا اور ایسا کیا کہ اس کے بعد کبھی بھی ان کے مقابلے میں خلافت کے مدعی نہ بنے۔

یہاں البتہ بعض روایات نے ایک سوال پیدا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کی بیعت نہ کی تھی اور سقیفہ کے موقع پر کچھ تلخ کلامی اور مار پیٹ بھی ہوئی تھی۔ بعد میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت نہیں کی، پھر وہ شام کی طرف چلے گئے جہاں راستے میں پراسرار طریقے سے فوت ہو گئے۔ نظریہ سازش کے علمبردار ان کی وفات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پہلے ہم تفصیل سے یہ روایتیں پیش کریں گے اور پھر تاریخی تنقید کے مسلمہ اصولوں کے تحت ان کا تجزیہ پیش کریں گے۔ یہاں ہم آپ سے گزارش کریں گے کہ اگر آپ نے پہلے دو ابواب کا مطالعہ نہیں کیا تو پہلے ان کا مطالعہ کر لیجیے کیونکہ ان میں تاریخی روایات کی چھان بین کا پروسیجر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

[3] بخاری۔ کتاب الاحکام۔ حدیث 6720

[4] ایضاً۔ کتاب العلم۔ حدیث 646

سقیفہ بنو ساعدہ کی روایت صحیح بخاری میں کچھ یوں آئی ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ۔۔۔۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر عمر فوت ہو جائیں تو میں فلاں کی بیعت کر لوں۔ خدا کی قسم! ابو بکر کی بیعت اتفاقاً ہو گئی تھی۔۔۔۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھے اور انہوں نے ایک خطبہ دیا۔ اس میں انہوں نے کہا: ۔۔۔۔ "مجھے خبر ملی ہے کہ آپ لوگوں میں سے کوئی کہتا ہے کہ اگر عمر فوت ہو جائیں تو میں فلاں کی بیعت کر لوں۔ کوئی شخص آپ لوگوں کو یہ کہہ کر دھوکہ نہ دے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اتفاقاً مکمل ہو گئی تھی۔ سن لیجیے کہ وہ ایسی ہی تھی لیکن اللہ نے اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس میں ابو بکر جیسی فضیلت ہو۔ جس شخص نے کسی کے ہاتھ پر مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر بیعت کر لی تو اس کی بیعت اس وجہ سے نہ کی جائے کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔

جس وقت اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات دے دی تو ہمیں خبر ملی کہ انصار ہم سے اختلاف رائے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے۔ علی، زبیر اور ان کے ساتھیوں نے بھی ہم سے اختلاف کیا اور جو ان کے ساتھ تھے۔ مہاجرین ابو بکر کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ میں نے ابو بکر سے کہا: "ابو بکر! اپنے انصاری بھائیوں کے پاس چلیے۔" ہم ان کی طرف جانب چلے، جب ہم قریب پہنچے تو ان کے دو نیک افراد ہمیں ملے۔ ان دونوں نے وہ بات بیان کی جس کی طرف وہ لوگ مائل تھے۔" پھر انہوں نے پوچھا: "اے گروہ مہاجرین! آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ہم نے کہا: "اپنے انصار بھائیوں کے پاس۔" وہ بولے: "آپ کے لیے مناسب نہیں ہے کہ ان کے پاس جائیں بلکہ آپ خود اپنے معاملے کا فیصلہ کر لیجیے۔" میں نے کہا: "واللہ! ہم ان کے پاس جائیں گے (اور خود فیصلہ کرنے کی بجائے پہلے انہیں قائل کریں گے۔)"

ہم ان کے پاس سقیفہ بنو ساعدہ میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ان کے درمیان چادر اوڑھے بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا: "یہ کون صاحب ہیں؟" وہ بولے: "یہ سعد بن عبادہ ہیں۔" میں نے کہا: "انہیں کیا ہوا؟" وہ بولے: "انہیں بخار ہے۔" ہم وہاں تھوڑی دیر ہی بیٹھے تھے کہ ان کے ایک خطیب کلمہ شہادت پڑھ کر اللہ کی حمد و ثنا، جیسا کہ اس کا حق ہے، بیان کرنے لگے۔ پھر وہ بولے: "اما بعد۔ ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں اور اے مہاجرین! آپ لوگ وہ گروہ ہیں کہ آپ کی قوم کے کچھ لوگوں کا ارادہ یہ ہے کہ وہ ہمیں جڑ سے اکھاڑ پھینک کر اس امر [حکومت] کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔"

جب وہ خاموش ہوئے تو میں (عمر) نے بولنا چاہا۔ میں نے ایک بات سوچ رکھی تھی کہ جسے میں ابو بکر کے سامنے بیان کرنا چاہتا تھا۔ میں ان کا ایک حد تک لحاظ کرتا تھا۔ جب میں نے بولنا چاہا تو ابو بکر نے گفتگو کی اور وہ مجھ سے زیادہ حلیم اور باوقار تھے۔ واللہ! جو بات میری سمجھ کے مطابق اچھی تھی، انہوں نے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بہتر پیرایہ میں فی البدیہ بات مکمل کی۔ انہوں نے کہا: "(اے انصار!) آپ حضرات نے جو خوبیاں بیان کی ہیں، حقیقتاً وہ آپ میں موجود ہیں۔ لیکن یہ امر (خلافت) صرف قریش ہی کے لیے مخصوص ہے کیونکہ یہ لوگ عرب میں نسبت اور بیت اللہ سے تعلق کے لحاظ سے افضل مانے جاتے ہیں۔ میری رائے میں آپ ان دو افراد میں سے جسے پسند کریں، اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے میرا اور ابو عبیدہ بن جراح کا ہاتھ پکڑا جو کہ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔

(عمر کہتے ہیں:) "مجھے اس کے سوا ان کی اور کوئی بات ناگوار نہ گزری۔ واللہ! میں اس جماعت کی سربراہی پر، جس میں ابو بکر (میرے ماتحت)

ہوں، اپنی گردن اڑائے جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ یا اللہ! میرا یہ نفس موت کے وقت مجھے اس چیز کو اچھا کر دکھائے جو مجھے اب میرے اندر محسوس نہیں ہوتی۔" اتنے میں انصار میں سے ایک شخص نے کہا: "ہم اسلام کی جڑ اور اس کے بڑے ستون ہیں۔ اے قریش! ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک آپ لوگوں میں سے۔" اتنے میں شور وغل برپا ہو گیا اور آوازیں بلند ہوئیں۔ مجھے اختلاف کا خوف ہوا تو میں نے کہا: "ابو بکر! اپنا ہاتھ بڑھائیے۔" انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان کی بیعت کی۔ مہاجرین نے بھی بیعت کی، پھر انصار نے ان کی بیعت کی۔ ہم لوگ سعد بن عبادہ پر غالب آ گئے۔ کسی نے آواز لگائی: "تم نے سعد بن عبادہ کو تو گویا مار ہی ڈالا۔" میں نے کہا: "اللہ نے سعد کو مار دیا، (ہم نے نہیں۔)"

عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "(سقیفہ میں) جو معاملہ ہوا تھا، ہمیں یہ خطرہ تھا کہ اگر ہم یہاں سے ہٹ گئے تو ابو بکر کی بیعت نہ کی تو یہ لوگ ہمارے پیچھے کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے (اور یوں عرب قبائل میں بغاوت پیدا ہو جائے گی۔) اس صورت میں یا تو ہم کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں، جو ہماری مرضی کے خلاف ہوتا یا ہم اس کی مخالفت کرتے اور فساد ہوتا۔ جس نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کی بیعت کی، اس کی پیروی نہ کی جائے۔ اور نہ ہی اس شخص کی پیروی کی جائے، جس نے بیعت کی۔ ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔" [5]

اس واقعے میں تین باتیں ایسی ہیں جن پر صحابہ کرام کا کوئی ناقد، سوال اٹھا سکتا ہے:

- انصار مدینہ نے عام مسلمانوں کے مشورے کے بغیر خود میں سے خلیفہ منتخب کرنا کیوں چاہا؟
- مشورہ مکمل ہونے سے پہلے ہی حضرت عمر نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ پر بیعت کیوں کر لی؟
- حضرت عمر نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کے متعلق سخت الفاظ کیوں کہے کہ "اللہ نے انہیں مار ڈالا۔"

جہاں تک **پہلے سوال** کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ انصار مدینہ بھی مکمل طور پر اس بات پر متفق نہ تھے کہ خلیفہ انہی میں سے بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مختلف تجاویز پیش کیں۔ پہلی تجویز تو یہ تھی کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ دوسری یہ تھی کہ ایک خلیفہ مہاجرین میں سے اور ایک انصار میں سے بنایا جائے۔ جب مشورہ کیا جا رہا ہو تو ہر شخص کو اپنی رائے قائم کرنے کی آزادی ہوتی ہے جس سے اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں برائی بھی کوئی نہیں ہے۔ ہاں جب مشورہ مکمل ہو جائے اور مسلمان ایک بات پر متفق ہو جائیں تو پھر تفرقہ پیدا کرنا ایک برائی ہے۔ اختلاف رائے کی آزادی اس وقت بھی حاصل ہے لیکن اس اختلاف رائے کو بنیاد بنا کر تفرقہ پیدا کرنا ایک جرم ہے۔ انصار نے محض اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ جب ان کے سامنے دلائل پیش کیے گئے تو انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا کہ خلیفہ مہاجرین میں سے ہو۔ اس وجہ سے انصار پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا سوال کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورے کے دوران ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی جو کہ درست نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر جانتے تھے کہ حضرت ابو بکر ایسی شخصیت ہیں جن پر کوئی اختلاف نہیں کرے گا۔ آپ بلا تفریق

[5] بخاری۔ کتاب المحاربین من اہل الکفر والردۃ، حدیث 6442

مہاجرین و انصار کے کمزوروں کا خیال کرتے تھے، ان کی خدمت کرتے تھے اور ہر شخص کی مدد کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جیسے ہی حضرت ابو بکر کی بیعت کی، تو سب لوگ آپ کی بیعت پر ٹوٹ پڑے۔ انصار کے اس مجمع میں مہاجرین کی نسبت انصار کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اگر انصار آپ کی بیعت نہ کرنا چاہتے تو وہ کم از کم اس وقت انکار کر سکتے تھے لیکن اس کے برعکس وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اکثریت بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا رائے رکھتی تھی؟

بعض دیگر روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمر نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کا نام پیش کیا تو انصار آپ کی بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے بھی کھلے دل سے حضرت ابو بکر کی خلافت کو قبول کیا۔ روایات یہ ہیں:

حدثنا عبد الله حدثني أبي حدثنا معاوية بن عمرو حدثنا زائدة حدثنا عاصم وحسين بن علي عن زائدة عن عاصم عن زر عن عبد الله قال: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب انصار نے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو گا اور ایک آپ لوگوں میں سے، تو حضرت عمر نے ان سے کہا: "اے گروہ انصار! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو لوگوں کی امامت کا حکم دیا ہے۔ آپ میں سے کس کا دل یہ چاہتا ہے کہ وہ ابو بکر سے آگے بڑھے؟" انصار نے جواب دیا: "ہم ابو بکر سے آگے بڑھنے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔"[6] [شعیب ارناووط کہتے ہیں: اس حدیث کی سند حسن (درمیانے درجے کی لائق اعتماد) ہے۔ اس کی سند میں عاصم ہیں جو کہ ابن ابی النجود ہیں۔ یہ حسن الحدیث (درمیانے درجے کے قابل اعتماد) ہیں۔ باقی تمام راوی انتہائی قابل اعتماد ہیں اور بخاری و مسلم نے ان سے روایت کیا ہے۔]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے آپ (ابو بکر) کا ہاتھ پکڑا تو انصار کے ایک آدمی نے مجھ پر سبقت کی اور آپ کے ہاتھ پر میرے ہاتھ رکھنے سے پہلے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر میں نے آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور لوگوں نے بیعت کر لی۔" بعض روایات میں ان کا نام بشیر بن سعد آیا ہے جو کہ نعمان بن بشیر کے والد تھے۔[7]

حضرت ابو بکر نے تقریر کی اور جو کچھ انصار کے بارے میں (قرآن میں) نازل ہوا تھا، اس میں کوئی بات نہ چھوڑی اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق بیان فرمایا تھا، اسے بھی بیان کیا۔ فرمایا: "آپ حضرات کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: 'اگر لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار دوسری میں تو میں انصار کی وادی میں چلوں گا۔' سعد! آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا اور اس وقت آپ بھی وہیں بیٹھے تھے کہ 'قریش اس امر (خلافت) کے والی ہیں۔ (دوسرے قبائل کا) نیک آدمی، ان کے نیک آدمی کا اور ان کا برا آدمی ان کے برے آدمی کا تابع ہے۔'" حضرت سعد نے کہا: "آپ نے سچ فرمایا ہے۔ آپ لوگ امراء ہیں اور ہم آپ کے

---

[6] احمد بن حنبل۔ المسند۔ مسند عمر۔ حدیث 135۔ 1/98۔ بیروت: دار الفکر۔ www.waqfeya.com (ac. 16 Dec 2009)

[7] ابن کثیر بحوالہ طبقات ابن سعد۔ 5/342

وزیر ہیں۔[8]

تیسرا سوال یہ ہے کہ حضرت عمر نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں سخت الفاظ کیوں کہے۔ یہ سوال اصل میں عرب کلچر سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ عرب سادہ مزاج کے لوگ تھے اور بات کرنے کے لیے ڈپلومیٹک انداز کم ہی اختیار کرتے تھے۔ جو بات دل میں ہوتی، وہ بغیر کسی منافقت کے کھل کر اس کا اظہار کر دیا کرتے تھے اور اگلا شخص بھی اس کا برا نہیں مانتا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہمارے دیہات میں لوگ کھل کر ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو شہروں کے رہنے والوں کو ناگوار محسوس ہوتی ہے لیکن سننے والا دیہاتی اس کا برا نہیں مانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی عربی میں اللہ تمہیں مارے، تمہاری ماں تمہیں روئے، تمہاری ناک پر مٹی پڑے، قسم کے بہت سے محاورے موجود ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اردو میں "تمہارا بیڑہ غرق، خدا تمہیں غارت کرے" کہا جاتا ہے۔ ان تمام محاوروں کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کہنے والا واقعی یہ چاہتا ہے کہ اگلا سچ مچ غارت ہو جائے۔ یہ محض بے تکلفانہ انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی دوستوں میں لوگ بے تکلفی سے یہ جملے بولتے ہیں اور سننے والا برا نہیں مانتا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ کا ہے۔ اگر وہ سچ مچ قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی سخت بات کہتے تو قبیلہ خزرج کے انصار انہیں کم از کم تنبیہ تو کرتے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اتنی کثرت سے بیعت کے لیے لپکے کہ حضرت سعد ان کے درمیان دب کر رہ گئے۔ اس پر کسی نے یہ جملہ کہا کہ تم نے تو سعد کو مار دیا، اس پر حضرت عمر نے جواباً مزاح فرمایا کہ نہیں اللہ نے مار دیا۔

اگر انصار مدینہ سے زبردستی بیعت لی گئی ہوتی تو پھر عہد خلافت راشدہ میں ان کا وہ کردار نہ ہوتا جو انہوں نے ادا کیا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جبر سے جو کام کروایا جائے، اس میں انسان کبھی اس درجے کی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا، جو اپنی رضا و رغبت سے کیے گئے کام میں کرتا ہے۔ انصار کے بارے میں معلوم ہے کہ انہوں نے خلفائے راشدین کے پراجیکٹس میں کھلے دل سے حصہ لیا۔ مرتدین کے خلاف جنگیں ہوں یا روم اور ایران کی فتح، مفتوحہ علاقوں کی ایڈمنسٹریشن کا معاملہ ہو یا بیت المال سنبھالنے کا، ہر ہر معاملے میں انصار کے بہت سے لوگ شریک رہے اور انہوں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔

انصار کے متعدد لوگوں کو گورنر مقرر کیا گیا اور اعلی فوجی عہدے دیے گئے۔ ان میں حضرت معاذ بن جبل، عبادہ بن صامت، حذیفہ بن یمان، ابو ایوب انصاری، زید بن ثابت، قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضرت معاذ، حضرت ابو عبیدہ کے بعد شام میں اسلامی افواج کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے اور ان کی وفات کے بعد فوج کے کمانڈر انچیف بنے۔ قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں گورنر اور پولیس چیف رہے۔ حضرت عبادہ بن صامت، حذیفہ بن یمان اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم اہم افواج کے کمانڈر رہے۔ حضرت ابو ایوب کی وفات بھی قسطنطنیہ کے جہاد میں ہوئی اور ان کی قبر آج بھی

[8] احمد بن حنبل۔ المسند۔ مسند ابی بکر۔ حدیث 19، 1/60

استنبول میں موجود ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر نے قائم مقام خلیفہ مقرر کیا۔

اوپر بیان کی گئی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے خود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کیا۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب (سقیفہ بنو ساعدہ میں) خطبہ دیا تو انصار کے فضائل میں کوئی بات نہ چھوڑی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی فضیلت میں جو کچھ فرمایا تھا، اسے بیان کر دیا اور کہا: میں جانتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "اگر لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار دوسری میں، تو میں انصار کی وادی میں چلوں گا۔ اے سعد! آپ یقیناً جانتے ہیں کہ جب آپ بیٹھے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "اس امر (خلافت) کے حقدار قریش ہیں کیونکہ لوگوں کے نیک لوگ ان کے نیک لوگوں کے تابع ہیں اور لوگوں میں سے برے لوگ، ان قریش کے برے لوگوں کے تابع ہیں۔" سعد نے جواب دیا: "آپ نے سچ کہا۔ ہم وزیر ہوں گے اور آپ لوگ امیر ہوں گے۔"[9]

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں انصار کا کردار اس بات کا گواہ ہے کہ انہوں نے پوری رضا اور رغبت سے بیعت کی تھی۔ اگر ان سے زبردستی بیعت لی گئی ہوتی تو وہ اس طرح ذوق و شوق سے اجتماعی کاموں میں شریک نہ ہوتے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی عام بیعت کیسے ہوئی؟

سقیفہ کے واقعے کے بعد کیا ہوا، اس کی تفصیل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یوں بیان کی ہے:

انس کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اگلے دن خطبہ دیتے ہوئے سنا۔ ابو بکر خاموش بیٹھے تھے اور کچھ نہیں بول رہے تھے۔ عمر نے کہا: "میں امید کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہیں گے اور ہمارے بعد انتقال فرمائیں گے۔ پھر اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے تو اللہ نے آپ کے سامنے نور (قرآن) پیدا کر دیا ہے کہ جس کے ذریعے آپ ہدایت پاتے ہیں اور جس سے اللہ تعالی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو بکر، جو غار میں آپ کے دوسرے ساتھی تھے، مسلمانوں میں سے آپ کے امور کے معاملے میں زیادہ اہل ہیں۔ اس لیے اٹھیے اور ان کی بیعت کر لیجیے۔" ان لوگوں میں سے ایک گروہ پہلے ہی سقیفہ بنو ساعدہ میں آپ کی بیعت کر چکا تھا۔ عام بیعت منبر پر ہوئی۔

زہری نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی بات نقل کی ہے کہ میں نے عمر کو اس دن سنا کہ ابو بکر سے بار بار کہہ رہے تھے: "منبر پر آئیے۔" وہ بار بار کہتے رہے یہاں تک کہ ابو بکر منبر پر بیٹھے اور لوگوں نے ان کی بیعت کی۔[10]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پسند کرتی تھی اور انہیں ہی خلیفہ دیکھنا چاہتی تھی۔

---

[9] ایضاً۔ مسند عمر۔ حدیث 135، 1/98

[10] بخاری، کتاب الاحکام، حدیث 6793

کیا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو قتل کروایا گیا؟

بعض مستشرقین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خفیہ طریقے سے قتل کروادیا تاکہ وہ حکومت کے لیے خطرہ نہ بنیں۔ یہ بے اصل اعتراض ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلہ خزرج کے سردار اور انصار کے سابقون الاولون میں سے ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ آپ ان صحابہ میں ہیں جنہوں نے مدینہ میں اسلام کی دعوت کو پھیلانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ آپ نہایت سخی تھے اور اصحاب صفہ کے اسی اسی افراد کو کھانا کھلاتے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ پیدا کرتے جبکہ خود انصار نے متفقہ طور پر حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی تھی؟

عہد صدیقی میں آپ مدینہ منورہ میں رہے اور مسلسل قبیلہ خزرج کے سردار رہے، پھر حضرت عمر کے زمانے میں بھی دو تین سال مدینہ میں رہے۔ اس کے بعد 15 یا 16 ہجری میں آپ شام جارہے تھے کہ راستے میں حوران کے مقام پر آپ نے وفات پائی۔[11] بلاذری نے انساب الاشراف میں تین روایتیں ایسی بیان کی ہیں، جن سے یہ سازشی تھیوری اخذ کی گئی ہے۔ ان کی سند کو دیکھتے ہی سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ بلاذری بیان کرتے ہیں:

> حدثنا محمد بن مصفى الحمصي، ثنا **بقية بن الوليد**، عن الزبيري، عن الزهري: سب لوگوں نے (حضرت ابو بکر) کی بیعت کر لی سوائے سعد بن عبادہ کے۔ وہ غچہ دے کر نکل گئے اور پھر شام چلے گئے۔[12]

اس روایت کی سند میں بقیہ بن ولید ہیں جو کہ قابل اعتماد راوی نہیں ہیں۔

دوسری روایت یہ ہے:

> حدثني **روح بن عبد المؤمن**، حدثني علي بن المدائني، عن سفيان بن عينية، عن عمرو بن دينار، عن أبي صالح: سعد بن عبادہ شام کی طرف نکل گئے اور وہاں قتل کیے گئے۔[13]

اس روایت کی سند میں روح بن عبد المومن ہیں جن کے بارے میں کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی کہ یہ کس درجے میں قابل اعتماد ہیں۔ اس روایت میں یہ واضح طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو کس نے قتل کروایا تھا۔

تیسری روایت اس موضوع پر بالکل واضح ہے اور یہی نظریہ سازش کی بنیاد ہے:

---

[11] محمد بن سعد بن منیع الزہری (d. 230/844)۔ **الطبقات الکبیر**۔ صحابی نمبر 353۔ 3/570۔ قاہرہ: مکتبہ الخانجی www.waqfeya.com (ac. 6 May 2011)

[12] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ امر السقیفہ۔ 2/264۔ بیروت: دار الفکر۔ www.waqfeya.com (ac. 27 Oct 2007)

[13] ایضاً۔ 2/272

المدائني عن **ابن جعدبة** عن صالح بن كيسان، وعن **أبي مخنف**، عن **الكلبي** وغيرهما: سعد بن عبادہ نے ابو بکر کی بیعت نہیں کی اور شام کی طرف چلے گئے۔ عمر نے ایک شخص کو بھیجا اور کہا: "انہیں بیعت کی طرف بلانا اور انہیں پریشان کرنا۔ اگر وہ انکار کریں تو ان کے خلاف اللہ سے مدد مانگنا۔ یہ شخص شام آیا تو اسے سعد حوران کے ایک احاطے میں ملے۔ اس نے انہیں بیعت کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: "میں کسی قریشی کی کبھی بیعت نہ کروں گا۔" وہ بولا: "پھر میں آپ سے لڑوں گا۔" انہوں نے کہا: "کیا تم مجھ سے لڑوگے؟" اس نے کہا: "آپ اس امت میں داخل ہیں یا خارج؟" وہ بولے: "میں اس بیعت سے باہر ہوں۔" اس نے آپ کو نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ سعد پر حمام میں حملہ کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بیٹھ کر پیشاب کر رہے تھے کہ ایک جن نے انہیں تیر مار کر قتل کر دیا۔[14]

اگر آپ نے پہلے دو ابواب کا مطالعہ نہیں کیا تو اب کر لیجیے تا کہ پہلی دو صدیوں کے مشہور مورخین کا تعارف ہو سکے۔ اس روایت کی دو اسناد ہیں اور ہر ایک میں ایسے نام ہیں جس سے سارے نظریہ سازش کی بنیاد سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ایک تو مشہور مورخ ابو مخنف ہیں جن کے بارے میں ہم دوسرے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ ان کا دل صحابہ کرام کے بغض سے بھرا ہوا تھا۔ یہ کلبی سے روایت کر رہے ہیں جن کا صحابہ کرام سے بغض مشہور ہے۔ دوسرے مورخ ابن جعدبہ ہیں جن کا پورا نام یزید بن عیاض بن جعدبہ ہے۔ انہیں امام بخاری نے منکر الحدیث کہا ہے، امام مالک نے جھوٹا قرار دیا ہے، دار قطنی نے ضعیف کہا ہے اور یحیی بن معین نے کہا ہے کہ وہ روایات میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتے تھے، اس لیے ان کی روایات کو نہ لکھا جائے۔[15] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتماد ہے اور کسی ایسے شخص نے گھڑی ہے جو صحابہ کرام بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہے۔

درایت کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو بتا کر قاتل کو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں بھیجا تھا؟ اگر انہوں نے اعلانیہ قاتل کو بھیجا تھا تو حضرت سعد کی اولاد، خاندان اور قبیلہ والے کیوں خاموش رہے؟ اور اگر انہوں نے قاتل کو خفیہ طور پر بھیجا تھا تو ان راویوں کو علم کیسے ہوا؟ پھر اگر آپ کو قتل کروانا مقصود ہوتا تو اس کے لیے تین سال انتظار کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ کسی تاریخی روایت میں ایسی کوئی تفصیلات نہیں ملتیں جن کے مطابق حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کبھی حکومت کے لیے خطرہ بننے کی کوشش کی ہو اور نہ ہی کوئی ایسا سراغ ملتا ہے کہ آپ کی اولاد اور اہل قبیلہ نے حکومت پر آپ کے قتل کی سازش کا الزام عائد کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ سازش محض افسانہ ہے اور اس کا مقصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی وفات کیسے ہوئی؟ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت نقل کی ہے:

أخبرنا يزيد بن هارون عن سعيد بن أبي عروبة قال سمعت محمد بن سيرين يحدث: سعد بن عبادہ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ جب وہ

---

[14] ایضاً

[15] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ 7/259۔ راوی نمبر 9748۔

واپس آئے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "مجھے کوئی چیز اپنے جسم پر رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔" پھر انہوں نے وفات پائی اور ساتھیوں نے کسی جن کو یہ شعر پڑھتے سنا: "ہم نے خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو قتل کر دیا ہے اور انہیں دو ایسے تیروں سے مارا ہے جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا ہے۔"[16]

اسی صفحے پر دی ہوئی واقدی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک سوراخ میں پیشاب کیا تھا اور جب وہ فوت ہوئے تو ان کی جلد سبز پڑ گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انہوں نے پیشاب کیا تھا، وہ کسی سانپ کا بل ہو گا، جس نے نکل کر انہیں کاٹ لیا۔ جسم پر کوئی چیز رینگنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سانپ ان کے لباس میں گھس گیا ہو۔ رہی جنات کے شعر پڑھنے والی بات، تو ممکن ہے کہ وہ سانپ جن ہو یا پھر یہ محض ان کے ساتھیوں کا وہم ہو کہ پراسرار واقعہ پیش آ جانے پر لوگوں میں اس نوعیت کے وہم پیدا ہو ہی جاتے ہیں اور آوازیں سی سنائی دے جاتی ہیں۔ یہ سانحہ 15/636 میں پیش آیا اور ڈیڑھ سو برس تک حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے کسی بیٹے، پوتے یا قبیلے کے آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سازش کا الزام عائد نہیں کیا۔ یہ خیال اس واقعے کے ڈیڑھ سو سال بعد ابن جعدبہ، ابو مخنف اور کلبی کو آیا اور انہوں نے یہ روایت بیان کر دی۔ انہی کی روایت کی بنیاد پر بعض مستشرقین نے کہانی گھڑ لی۔

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت نہیں کی؟

اس معاملے میں کتب تاریخ میں جو روایات مروی ہیں، ان کا تجزیہ اس جدول میں دیا گیا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ تاریخی روایتوں کا بڑا حصہ ناقابل اعتماد راویوں کے توسط سے کتب تاریخ میں آیا ہے۔

تاریخ کی کتاب	بیعت علی سے متعلق روایات	ناقابل اعتماد روایات کی تعداد	ناقابل اعتماد راویوں کے نام اور ان کی بیان کردہ روایات	بقیہ روایات
بلاذری (d. 279/893)	16	8	محمد بن عمر الواقدی: 3 روایتیں۔ ابو مخنف: 1۔ ہشام کلبی: 2۔ مسلمہ بن محارب: 1۔ نامعلوم راوی: 1	8
طبری (224-310/838-922)	5	4	ہشام کلبی: 1۔ سیف بن عمر: 1۔ ابن الحر: 1۔ نامعلوم راوی: 1	1
مجموعہ	**21**	**12**	**12**	**9**

اس معاملے میں جو تاریخی روایات بیان ہوئی ہیں اور یہ تین طرح کی ہیں:

- پہلی قسم کی روایات کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوری رضا اور رغبت کے ساتھ اگلے دن ہی بیعت کر لی تھی۔
- دوسری قسم کی روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے کچھ پس و پیش کیا تھا لیکن دیگر صحابہ کے سمجھانے پر کچھ ہی عرصہ بعد

[16] ابن سعد۔ طبقات الکبری۔ سعد بن عبادہ، صحابی نمبر 353۔ 3/570۔ قاہرہ: مکتبہ خانجی۔

بیعت کر لی تھی۔

- تیسری قسم کی روایات مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خلیفہ بننا چاہتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے بیعت سے انکار کر دیا تھا اور حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے ان کے گھر پر حملہ کر دیا اور ان کا دروازہ جلا دیا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر بھی تشدد کیا جس سے ان کا حمل ضائع ہوا اور حضرت علی کو مجبور کر کے ان سے بیعت لی گئی۔ اس کے بعد پہلے تین خلفاء راشدین کے زمانے میں خفیہ سازشوں میں مصروف رہے اور ان کا تختہ الٹنے کی کوشش کرتے رہے۔

پہلے گروپ کی روایات

برضا و رغبت بیعت والی روایتیں متعدد ہیں اور یہاں ہم انہیں پیش کر رہے ہیں۔

وَحَدَّثَنَا أَبُو عَبْدِ اللَّهِ الْحَافِظُ ، وَأَبُو مُحَمَّدٍ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ أَبِي حَامِدٍ الْمُقْرِئُ ، قِرَاءَةً عَلَيْهِ ، قَالا : حَدَّثَنَا أَبُو الْعَبَّاسِ مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ ، ثنا جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ شَاكِرٍ , ثنا عَفَّانُ بْنُ مُسْلِمٍ , ثنا وُهَيْبٌ , ثنا دَاوُدُ بْنُ أَبِي هِنْدَ , ثنا أَبُو نَضْرَةَ , عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ منبر پر بیعت لینے کے لیے منبر پر چڑھے تو آپ نے دیکھا کہ حضرت علی موجود نہ تھے۔ آپ نے ان کے بارے میں پوچھا۔ انصار میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انہیں بلا لائے۔ جب وہ آئے تو ان سے فرمایا: "اے رسول اللہ کے چچازاد بھائی اور داماد! کیا آپ مسلمانوں کے عصا (طاقت) کو توڑنا پسند کریں گے؟" انہوں نے بھی یہی کہا: "اے رسول اللہ کے خلیفہ! مجھے ملامت نہ کیجیے۔" اور پھر ان کی بیعت کر لی۔ پھر آپ نے دیکھا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ غیر حاضر ہیں۔ آپ نے انہیں بلا بھیجا۔ جب حضرت زبیر آئے تو ان سے فرمایا: "اے رسول اللہ کے پھوپھی زاد بھائی اور آپ کے حواری! کیا آپ مسلمانوں کے عصا (طاقت) کو توڑنا پسند کریں گے؟" انہوں نے کہا: "اے رسول اللہ کے خلیفہ! مجھے ملامت نہ کیجیے۔" پھر کھڑے ہو کر انہوں نے بیعت کر لی۔[17]

حدثنا عبيد الله بن سعد ، قال : أخبرني عمي ، قال : أخبرني سيف ، عن عبد العزيز بن ساه ، عن حبيب بن أبي ثابت: حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے انہیں بتایا کہ مسجد میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیعت لے رہے ہیں۔ اس وقت حضرت علی نے محض ایک طویل کرتا پہن رکھا تھا اور تہمد نہ باندھ رکھا تھا۔ آپ دیر ہو جانے کے خوف سے اٹھے اور بغیر تہمد باندھے بھاگم بھاگ مسجد میں پہنچے اور بیعت کر کے صدیق اکبر کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کے بعد آپ نے گھر سے بقیہ لباس منگوا کر پہنا۔[18]

محمد بن سعد، ثنا محمد بن عمر الواقدي، عن أبي معمر، عن المقبري، و يزيد بن رومان مولى آل زبير، عن ابن شهاب: (سقیفہ کے واقعہ کے بعد) حضرت علی نے ابو بکر رضی اللہ عنہما سے کہا: "ابو بکر! آپ جانتے نہیں کہ اس معاملے (مشورہ) میں ہمارا بھی حق تھا؟"

---

[17] بیہقی۔ الاعتقاد الی سبیل الرشاد۔ باب اجتماع المسلمین علی بیعۃ ابی بکر۔ حدیث 325۔ بلاذری، انساب الاشراف۔ 2/267۔
www.islamweb.net/hadith/display_hbook.php?bk_no=663&pid=141193&hid=325 (ac. 11 May 2012)

[18] ابن جریر طبری۔ حدیث سقیفہ۔ 11H/2/1-410

انہوں نے فرمایا: "جی ہاں، لیکن مجھے انتشار کا خوف تھا اور مجھ پر بڑا معاملہ آن پڑا تھا۔" علی نے فرمایا: "میں جانتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو نماز کی امامت کا حکم دیا تھا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ غار (ثور) میں ثانی اثنین ہیں۔ ہمارا حق تھا (کہ ہم سے مشورہ کیا جائے) لیکن ہم سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ بہر حال اللہ تعالی آپ کو معاف کرے۔" یہ کہہ کر انہوں نے بیعت کر لی۔[19]

حدثن عن الحسن بن عرفة، عن علي بن هشام بن اليزيد، عن أبيه، عن أبي الجحاف: جب ابو بکر کی لوگوں نے بیعت کر لی تو آپ نے کھڑے ہو کر تین بار اعلان کیا: "اے لوگو! (اگر آپ چاہیں) تو میری بیعت کو ختم کر سکتے ہیں۔" علی نے کہا: "خدا کی قسم، ہم نہ تو آپ کی بیعت کو ختم کریں گے اور نہ ہی آپ کو استعفی دینے دیں گے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں آپ کو امام بنایا تھا تو پھر کون ہے جو (دنیاوی امور کی امامت) میں آپ سے آگے بڑھے؟"[20]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علی اور زبیر رضی اللہ عنہما نے برضا و رغبت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔ بعد میں پہلے تینوں خلفاء کے دور میں وہ جس طرح امور حکومت میں پوری دلجمعی کے ساتھ شریک رہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پوری رضا و رغبت سے بیعت کی تھی۔ سند کے اعتبار سے ان میں سے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت سب سے زیادہ مستند ہے۔ بقیہ روایتیں اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہیں تاہم حضرت علی اور زبیر نے پہلے تینوں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایتیں بالکل درست ہیں۔

دوسرے گروپ کی روایات

بیعت میں پس و پیش کرنے سے متعلق روایات کے مطابق سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے باغ فدک کی وراثت کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ ایک باغ تھا جس کی آمدنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان پر خرچ ہوتی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ یہ باغ سرکاری ملکیت ہے، جس کی وجہ سے اس کی وراثت تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس کی آمدنی میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کو حصہ ملتا رہے گا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اس بات پر ناراض ہو گئیں اور چھ ماہ بعد اپنی وفات تک انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بات نہیں کی۔ باغ فدک کی روایت یہ ہے:

حدثنا عبد العزيز بن عبد الله: حدثنا إبراهيم بن سعد، عن صالح، عن ابن شهاب قال: أخبرني عروة بن الزبير: أن عائشة أم المؤمنين رضي الله عنها أخبرته : سیدہ عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی وفات کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آپ کی میراث تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی نے بطور فئی (وہ مال غنیمت جو جنگ کے بغیر حاصل ہو) دیا تھا۔ ابو بکر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہمارا (انبیا کا) ورثہ تقسیم نہیں ہوتا ہے،

---

[19] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 2/263

[20] ایضاً۔ 2/270

ہم جو چھوڑیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔" (ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ) فاطمہ رضی اللہ عنہا غضب ناک ہو گئیں اور ابو بکر کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ پھر وہ ان سے اپنی وفات تک نہ ملیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔[21]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں چھ ماہ بند رہے اور انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی۔ سیدہ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر ان کے پاس گئے اور ان سے گفت و شنید کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے فضائل بیان کیے اور اس کے بعد حضرت علی نے حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی۔ روایت کچھ یوں ہے:

حدثنا أبو صالح الضرار ، قال : حدثنا عبد الرزاق بن همام ، عن معمر ، عن الزهري ، عن عروة ، عن عائشة : حضرت فاطمہ اور عباس، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مطالبہ کیا اور کہا کہ فدک اور خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ ہے، وہ ہمیں دیا جائے۔ ابو بکر نے کہا: اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات نہ سنی ہوتی کہ ہمارے املاک میں ورثہ نہیں، جو ہم چھوڑتے ہیں، وہ صدقہ ہے تو ضرور یہ املاک آل محمد کو مل جاتیں۔ ہاں اس کی آمدنی میں سے آپ کو بھی ملے گا۔ بخدا میں ہر اس بات پر عمل کروں گا جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا ہے۔

(زہری نے) بیان کیا کہ اس واقعے کی وجہ سے فاطمہ نے پھر وفات تک اس معاملے سے متعلق ابو بکر سے کوئی بات نہیں کی اور قطع تعلق کر لیا۔ جب فاطمہ کا انتقال ہوا تو علی نے رات میں ان کو دفن کر دیا اور ابو بکر کو نہ تو ان کی وفات کی اطلاع دی اور نہ دفن میں شرکت کی دعوت دی۔ فاطمہ کی وفات کے بعد ان لوگوں کا خیال علی کی طرف پلٹ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ ماہ فاطمہ اور زندہ رہیں اور پھر انہوں نے وفات پائی۔

معمر کہتے ہیں کہ زہری سے ایک شخص نے پوچھا کہ کیا علی نے چھ مہینے تک ابو بکر کی بیعت نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں کی اور جب تک انہوں نے نہیں کی، تو بنو ہاشم میں سے کسی نے نہیں کی۔ مگر فاطمہ کی وفات کے بعد جب علی نے دیکھا کہ لوگوں کا وہ خیال باقی نہیں رہا، جو فاطمہ کی زندگی میں تھا تو وہ ابو بکر سے مصالحت کے لیے جھکے اور انہوں نے ابو بکر کو کہلا بھیجا کہ مجھ سے تنہا آکر ملیے اور کوئی ساتھ نہ ہو۔ چونکہ عمر سخت طبیعت کے آدمی تھے، علی کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ وہ بھی ابو بکر کے ساتھ آئیں۔ عمر نے ابو بکر سے کہا کہ آپ تنہا بنو ہاشم کے پاس نہ جائیں۔ ابو بکر نے کہا: "نہیں، میں تنہا جاؤں گا۔ مجھے اس کی توقع نہیں کہ میرے ساتھ کوئی بدسلوکی کی جائے گی۔" ابو بکر، علی کے پاس آئے تو تمام بنو ہاشم جمع تھے۔ علی نے کھڑے ہو کر تقریر کی۔ اس میں حمد و ثنا کے بعد کہا: "اے ابو بکر! آج تک ہم نے آپ کے ہاتھ پر جو بیعت نہیں کی، اس کی وجہ آپ کی کسی فضیلت سے انکار یا اللہ کی آپ کو دی گئی بھلائیوں پر حسد نہ تھا۔ بلکہ ہم اس خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے مگر آپ نے زبردستی اسے ہم سے لے لیا۔" اس کے بعد علی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قرابت اور اپنے حق کو بیان کیا۔ علی نے ان باتوں کو تفصیل سے بیان کیا یہاں تک کہ ابو بکر رو پڑے۔ علی جب خاموش ہوئے تو ابو بکر نے تقریر شروع کی۔ کلمہ شہادت پڑھا اور اللہ تعالی کے شایان شان حمد و ثنا کے بعد انہوں نے کہا: "واللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء مجھے اپنے رشتہ داروں کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہیں۔ میں نے ان املاک کے

[21] بخاری۔ کتاب خمس۔ حدیث 2926

متعلق جو میرے اور آپ کے درمیان اختلاف کا باعث بنی ہیں، میں صرف واجبی کمی کی تھی۔ نیز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہمارے مال میں وراثت نہیں جو ہم چھوڑیں۔ وہ صدقہ ہے۔ہاں اس کی آمدنی میں سے آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتا رہے گا اور میں اللہ سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی بات کا ذکر کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو اور خود اس پر عمل نہ کروں۔"

علی نے کہا: "اچھا! آج شام ہم آپ کی بیعت کریں گے۔" ظہر کی نماز کے بعد ابو بکر نے منبر پر سب کے سامنے تقریر کی اور بعض باتوں کی علی سے معذرت کی۔ پھر علی کھڑے ہوئے اور انہوں نے ابو بکر کے حق کی عظمت اور ان کی فضیلت اور اسلام میں پہلے شرکت کا اظہار اور اعتراف کیا اور پھر ابو بکر کے پاس جا کر ان کی بیعت کی۔[22]

اس واقعے کا تجزیہ دو اعتبار سے کیا جا سکتا ہے، ایک سند کے اعتبار سے اور دوسرا درایت کے اعتبار سے اور دونوں اعتبار سے اس میں کچھ مسائل موجود ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان تمام روایتوں کی سند میں دیکھیے تو ان میں ابن شہاب الزہری (58-124/678-742) موجود ہیں۔ محدثین کے نزدیک زہری ایک جلیل القدر محدث اور قابل اعتماد راوی ہیں تاہم ان کے ساتھ کچھ مسائل موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ احادیث میں "ادراج" کیا کرتے تھے۔ ادراج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حدیث بیان کرتے ہوئے اس میں اپنی جانب سے تشریحی جملے شامل کر دیے جائیں۔ اس پر زہری کو ان کے معاصر ربیعہ کہتے تھے کہ وہ ایسا نہ کریں کیونکہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا ہے۔ اگر ایسا کرنا ضروری بھی ہو تو اسے الگ سے بیان کریں تاکہ ان کی رائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات میں مل نہ جائے۔[23] دوسرے یہ کہ وہ "تدلیس" کیا کرتے تھے یعنی حدیث کی سند میں اگر کوئی کمزوری ہو تو اسے چھپا لیتے تھے۔

باغ فدک سے متعلق جتنی بھی روایات ہیں، ان سب کو اگر اکٹھا کر لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ناراضی کا ذکر صرف انہی روایات میں ملتا ہے جن کی سند میں زہری موجود ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناراضی والی بات زہری کا ادراج (اضافہ) ہے۔ چھ ماہ تک ناراض رہنے والی بات صرف زہری ہی نے بیان کی ہے جو کہ اس واقعہ کے پچاس سال بعد پیدا ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ زہری اس واقعے کے عینی شاہد تو نہیں تھے۔ انہوں نے یہ بات کس سے سنی اور جس سے سنی، وہ کس درجے میں قابل اعتماد تھا؟ ان کے علاوہ کسی اور نے تو یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ مشہور محدثین جیسے بیہقی اور ابن حجر عسقلانی نے بھی زہری کی اس بات کو منقطع قرار دے کر اسے مسترد کیا ہے۔[24]

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ناراضی والی بات درایت کے نقطہ نظر سے بالکل غلط معلوم ہوتی ہے۔ اس میں تو کوئی اشکال نہیں کہ سیدہ فاطمہ

---

[22] طبری۔ ایضاً۔ 11H/2/1-411

[23] بخاری۔ التاریخ الکبیر۔ راوی نمبر 976۔ 3/135۔ (ac. 28 Apr 2007) www.almeshkat.net

[24] ابن حجر عسقلانی۔ فتح الباری شرح بخاری۔ 7/495۔ زیر حدیث 4240۔ ریاض: مکتبہ سلفیہ۔

رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے حصول کا خیال گزرا تو انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ان سے بات کی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ، حضرت صدیق اکبر کو جائز حکمران تسلیم کرتی تھیں، تبھی ان کے پاس مقدمہ لے کر گئیں۔ حضرت ابو بکر نے وضاحت فرمادی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام مال کو صدقہ قرار دیا تھا اور باغ فدک تو ایک سرکاری جائیداد تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت نہ تھی بلکہ حکومت کی ملکیت تھی۔ اس کی صرف آمدنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت پر بطور تنخواہ خرچ ہوتی تھی کیونکہ آپ بطور سربراہ حکومت فل ٹائم کام کرتے تھے اور آپ کی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اس کی آمدنی بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت پر خرچ ہو گی۔

حضرت ابو بکر نے دلیل سے بات کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو بطور دلیل پیش کیا تھا۔ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس سے اختلاف ہوتا تو وہ بھی جوابی دلیل پیش کرتیں لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ آپ کی بات کو سمجھ گئی تھیں۔ سیدہ کے زہد و تقوی، اعلی کردار اور دنیا سے بے رغبتی کو مد نظر رکھا جائے تو آپ سے ہر گز یہ توقع نہیں کی جاسکتی ہے کہ آپ اس بات پر ناراض ہو جائیں گی کہ آپ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پیش کیا جائے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو زہری کی روایت میں کسی اور نے یہ ناراضی والا جملہ شامل کر دیا ہے یا پھر یہ جملہ خود انہوں نے کسی غلط فہمی کے سبب کہہ دیا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ باغ فدک کے دعوے داروں میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی نظر آتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ یہ بات بالکل معروف اور متعین ہے کہ قرآن مجید کے قانون وراثت کی رو سے چچا کا میراث میں حصہ نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ان کا دعوی کرنا سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ خاندان کے بزرگ کے طور پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ چلے گئے تھے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث سے صرف سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کو محروم نہ کیا تھا بلکہ ان دونوں نے اپنی اپنی بیٹیوں سیدہ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کو بھی اس وراثت سے محروم کیا تھا۔ عام طور پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بات کو بہت اچھالا گیا ہے لیکن سیدہ عائشہ و حفصہ اور دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ وراثت میں بیوی کا حصہ بھی ہوتا ہے۔

پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر اور عمر نے سیدنا علی رضی اللہ عنہم کو اس کا ٹرسٹی مقرر کر دیا تھا۔ آپ اس کی بطور ٹرسٹ حیثیت کو مانتے تھے تبھی آپ نے اس کا ٹرسٹی بننا قبول کیا۔ اگر باغ فدک واقعی اہل بیت کی ملکیت ہوتا تو آپ کم از کم اپنے دور خلافت میں تو اسے ان کے حوالے کر سکتے تھے۔ ان کا ایسا نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بھی اسے اہل بیت کی ملکیت نہ سمجھتے تھے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس باغ کو مروان بن حکم نے حکومت سے خرید لیا تھا، اس وجہ سے حضرت علی نے ایسا نہ کیا۔ لیکن یہ بات درست نہیں، اگر یہ

واقعتاً اہل بیت کا حق تھا تو حضرت علی کو چاہیے تھا کہ وہ اسے اس کے حق داروں تک پہنچاتے اور مروان کو ان کی رقم واپس کروا دیتے۔

چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ خود حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کے پڑپوتے، حضرت زید بن علی بن حسین رحمہ اللہ نے فرمایا: "اگر میں ابو بکر کی جگہ ہوتا تو فدک کے بارے میں وہی فیصلہ کرتا جو انہوں نے کیا تھا۔[25]

ساتواں مسئلہ یہ ہے کہ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے مرد مومن سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ محض ایک باغ کی وجہ سے آپ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کو چھوڑ کر گھر بیٹھ رہیں اور نماز پڑھنے کے لیے بھی مسجد میں تشریف نہ لائیں؟ آپ نے اسلام کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں، کیا یہ ممکن تھا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جیسے نازک موقع پر پیچھے بیٹھ رہتے جب متعدد عرب قبائل نے بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ اگر آپ کو حضرت ابو بکر سے کوئی شکایت تھی تو براہ راست ان کے پاس جا سکتے تھے اور ان سے معاملات پر گفتگو کر سکتے تھے لیکن اس کی بجائے یہ کہنا کہ آپ اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر گھر بیٹھ رہے، یہ بات کسی طرح آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ جب سب کے سب صحابہ کرام نے حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت علی ایسا نہ کرتے اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت علی کی بیعت نہ کرنے والی روایات دراصل حضرت ابو بکر پر نہیں بلکہ حضرت علی پر بہتان ہیں اور آپ کی کردار کشی کی کوشش ہیں۔

آٹھواں مسئلہ یہ ہے کہ عہد رسالت میں مال غنیمت میں سے جو حصہ بنو ہاشم کے لیے مقرر تھا، اس کی تقسیم کی ذمہ داری حضرت علی ہی کے سپرد تھی۔ حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہم، برابر اس مال کو حضرت علی ہی کو دیتے رہے جو کہ ان پر اعتماد کی علامت ہے۔ اگر ان کے درمیان عدم اعتماد کی فضا ہوتی تو پھر ایسا نہ ہوتا۔

> حدثنا عباس بن عبد العظيم، ثنا يحيى بن أبي بُكير، ثنا أبو جعفر الرَّازي، عن مُطرِّف، عن عبد الرحمن بن أبي ليلى قال: سمعت عليّاً يقول: حضرت علی نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خمس کے پانچویں حصے (کی تقسیم) کا ذمہ دار بنایا۔ میں نے اسے رسول اللہ کی حیات طیبہ میں اس کے مخصوص مقامات پر خرچ کیا۔ پھر ابو بکر اور عمر کی زندگی میں بھی اسی طرح ہوتا رہا۔ پھر کچھ مال آیا تو عمر نے مجھے بلایا اور فرمایا: "لے لیجیے۔" میں نے کہا: "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے کہا: "لے لیجیے، آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں۔" میں نے کہا: "ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے (کہ پہلے ہی ہمارے پاس کافی مال ہے، کسی ضرورت مند کو دے دیجیے۔)" چنانچہ انہوں نے اسے بیت المال میں جمع کر دیا۔"[26]

نواں مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں متعدد ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن کے مطابق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ برابر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عیادت کے لیے تشریف لاتے رہے۔ جب سیدہ کا انتقال ہوا تو حضرت علی نے اصرار کر کے حضرت ابو بکر ہی کو نماز جنازہ پڑھانے کے

---

[25] بیہقی، ایضاً۔ حدیث 12744۔ 6/493

[26] ابو داؤد۔ سنن۔ کتاب الخراج والفئی والامارہ۔ حدیث 2983

لے کہا۔ سیدہ فاطمہ کو غسل حضرت ابو بکر کی اہلیہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہم نے دیا۔ اب اگر روایات ہی کو ماننا ہے تو پھر ان روایات کو کیوں نہ مانا جائے جو اصحاب رسول اور اہل بیت اطہار کے کردار کے عین مطابق ہیں۔ روایات یہ ہیں:

أَخْبَرَنَا أَبُو عَبْدِ اللَّهِ الْحَافِظُ حَدَّثَنَا أَبُو عَبْدِ اللَّهِ : مُحَمَّدُ بْنُ يَعْقُوبَ الْحَافِظُ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ حَدَّثَنَا عَبْدَانُ بْنُ عُثْمَانَ الْعَتَكِيُّ بِنَيْسَابُورَ حَدَّثَنَا أَبُو ضَمْرَةَ عَنْ إِسْمَاعِيلَ بْنِ أَبِي خَالِدٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ: شعبی کہتے ہیں کہ جب سیدہ فاطمہ بیمار ہوئیں تو ابو بکر صدیق ان کے پاس آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ علی نے کہا: "فاطمہ! یہ ابو بکر آئے ہیں اور اندر آنے کی اجازت مانگ رہے ہیں؟" انہوں نے کہا: "آپ کیا انہیں اجازت دینا چاہتے ہیں؟" فرمایا: "ہاں۔" انہوں نے اجازت دے دی تو ابو بکر اندر داخل ہوئے اور سیدہ کو راضی کرنے کی کوشش کی اور فرمایا: "واللہ! میں نے اپنا گھر، مال، اہل و عیال اور خاندان کو صرف اللہ اور اس کے رسول اور آپ اہل بیت کی رضا ہی کے لیے چھوڑا تھا۔" پھر وہ انہیں راضی کرتے رہے یہاں تک کہ سیدہ ان سے راضی ہو گئیں۔[27]

حافظ ابن کثیر (701-774/1301-1372) نے پہلی اور دوسری قسم کی روایات کو تطبیق (Reconcile) دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت شروع ہی میں کر لی تھی۔ باغ فدک کی وجہ سے سیدہ رضی اللہ عنہا کے ذہن میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ کشیدگی کا پیدا ہو جانا ایک انسانی معاملہ ہے جو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بلند رتبہ کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا جب بیمار پڑیں تو ان کی تیمار داری کے باعث حضرت علی زیادہ باہر نہ نکلے۔ دوسرے یہ کہ آپ قرآن مجید کو نزولی ترتیب سے جمع کرنا چاہتے تھے جو کہ ایک علمی نوعیت کی کاوش تھی۔ اس بات کی تائید بلاذری کی اس روایت سے ہوتی ہے:

حدثنا سلمة بن الصقر، وروح بن عبد المؤمن قالا: ثنا عبد الوهاب الثقفي، أنبأ أيوب، عن ابن سيرين قال: ابن سیرین کہتے ہیں کہ ابو بکر نے علی رضی اللہ عنہما سے پوچھا: "کیا آپ میرے امیر بننے کو ناپسند کرتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "نہیں۔ اصل میں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ قسم کھائی ہے کہ جب تک میں قرآن مجید کو نزولی ترتیب سے جمع نہ کر لوں، اس وقت تک باہر نہ آؤں گا۔[28]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باہر نہ نکلنے سے بعض لوگوں کو گمان گزرا کہ ان حضرات میں کچھ ناراضگی موجود ہے حالانکہ حضرت ابو بکر صدیق، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کے گھر آ کر انہیں راضی کر چکے تھے۔ صدیق اکبر کا فیصلہ شریعت کے عین مطابق تھا تاہم انہوں نے پھر بھی سیدہ کی دلجوئی کی جس سے آپ کی اہل بیت کے لیے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ سیدہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان کے نقطہ نظر کو قبول کیا اور ان سے راضی ہو گئیں۔[29] آپ کے انتقال کے بعد حضرت علی نے اس وجہ سے علی الاعلان صدیق اکبر کی دوبارہ بیعت کی تا کہ

---

[27] بیہقی۔ سنن الکبری۔ حدیث 12375۔ 6/491۔ (ac. 17 May 2005) www.waqfeya.com

[28] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 2/269

[29] ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ۔ 5/389

لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے اور انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اصحاب رسول میں کوئی ناراضی نہیں ہے اور وہ یکجان کئی قالب ہیں۔ اس ضمن میں بلاذری نے یہ روایت بیان کی ہے جس سے اس سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کردار واضح ہوتا ہے۔

المدائني، عن عبد الله بن جعفر، عن أبي عون: ابو عون کہتے ہیں کہ جب عربوں نے ارتداد اختیار کیا تو عثمان، علی کے پاس گئے اور علی کہنے لگے: "میرے چچازاد بھائی! کوئی بھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔" عثمان نے کہا: "یہ دشمن (مرتدین) ہیں اور آپ نے بیعت نہیں کی۔" عثمان، علی کے پاس اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک کہ وہ ان کے ساتھ چل نہ پڑے اور ابو بکر کے پاس آ نہ گئے۔ ابو بکر انہیں دیکھ کر کھڑے ہوئے اور ان سے گلے ملے۔ اس کے بعد یہ دونوں حضرات روئے اور علی نے ابو بکر کی بیعت کر لی۔ لوگ اب جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور لشکر روانہ کیے گئے۔[30]

تیسرے گروپ کی روایات

جبراً بیعت لی جانے والی روایات روایات بالعموم اہل تشیع کی کتب میں آئی ہیں۔ ان کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے گھر پر حملہ کیا اور دروازہ جلا دیا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آگے آئیں تو انہیں گرا دیا جس سے ان کا حمل ضائع ہو گیا اور ان کی پسلی ٹوٹ گئی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کر کے ان سے زبردستی بیعت لی۔ جبری بیعت والی روایات زیادہ تر ابو مخنف لوط بن یحیی (d. 157/774) سے مروی ہیں جن کا صحابہ کرام کے بارے میں تعصب مشہور ہے اور صحابہ کی کردار کشی سے متعلق جتنی روایات ہمیں ملتی ہیں، ان کا زیادہ تر حصہ انہی سے منقول ہے۔ ابو مخنف سے ہٹ کر صرف ایک روایت ایسی ملتی ہے جو بلاذری نے نقل کی ہے:

المدائني، عن **مسلمة بن محارب**، عن سليمان التيمي، وعن **ابن عون**: ابو بکر نے علی کو پیغام بھیجا کہ وہ آ کر بیعت کریں۔ انہوں نے بیعت نہ کی۔ عمر ان کے گھر آئے اور ان کے ہاتھ میں ایک مشعل تھی۔ فاطمہ گھر کے دروازے پر آئیں اور کہنے لگیں: "ابن خطاب! کیا آپ میرے گھر کا دروازہ جلا دیں گے؟" انہوں نے کہا: "ہاں۔ یہ اس سے زیادہ مضبوط طریقہ ہے جو آپ کے والد لے کر آئے تھے۔" اتنے میں علی آ گئے اور انہوں نے بیعت کر لی اور کہا: "میرا تو ارادہ صرف یہ تھا کہ میں اس وقت تک گھر سے نہ نکلوں جب تک کہ قرآن جمع نہ کر لوں۔[31]

اس روایت میں سند میں دو مسائل ہیں:

- مسلمہ بن محارب کے حالات نامعلوم ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس درجے کے قابل اعتماد راوی ہیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمہ بن محارب کو مشہور ماہر جرح و تعدیل، ابن حبان نے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ یہ ابن حبان کی ذاتی رائے ہو سکتی ہے لیکن ان کے علاوہ کسی اور ماہر جرح و تعدیل نے مسلمہ بن محارب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ

---

[30] بلاذری۔ 2/570

[31] ایضاً۔ 2/268

معروف راوی نہیں تھے، جس کی وجہ سے ماہرین کو ان کے حالات کا زیادہ علم نہیں ہو سکا ہے۔

- یہ روایت ابن عون بیان کر رہے ہیں جو کہ (d. 151/768) میں فوت ہوئے۔[32] اگر ابن عون کی عمر کو سو سال بھی مان لیا جائے، تب بھی وہ اس واقعے کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ابن عون نے یہ واقعہ کس سے سنا اور جس سے سنا، وہ کس درجے میں قابل اعتماد تھا؟

اس ایک روایت کے علاوہ کسی اور ذریعے سے یہ روایات نہیں ملتی ہیں۔ جس شخص نے بھی جبری بیعت کی یہ روایت گھڑی ہے، اس نے نہ صرف حضرات ابو بکر و عمر بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہم کی شہرت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے اور ایسی باتوں کو آپ سے منسوب کیا ہے جو آپ کے شایان شان نہیں ہیں۔ حضرت علی کی شجاعت ضرب المثل ہے۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ کوئی آکر آپ کے گھر پر حملہ کرے اور خاتون جنت کے ساتھ گستاخی کرے اور حضرت علی اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیں اور پھر سر جھکا کر بیعت بھی کر لیں؟ ہمارے دور کا کوئی غیرت مند شوہر ایسا برداشت نہ کرے گا، کجا سیدنا علی شیر خدا جیسے عظیم بہادر کے بارے میں یہ تصور کیا جائے؟ روایت کے الفاظ پر غور کیجیے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ کسی طرح بھی آپ کے شایان شان نہیں ہے۔

اب یہ ہر شخص کے اپنے ضمیر پر ہے۔ چاہے تو ان منقطع اور جھوٹی روایتوں کو مانے اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بدگمان رہے اور چاہے تو ان روایتوں کے جھوٹ کو جھوٹ مانے اور صحابہ کرام سے متعلق اپنا دل صاف رکھے۔ پہلی صورت میں پھر اسے یہ بھی ماننا ہو گا کہ معاذاللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ناکام رہی اور آپ پر جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے آپ کی وفات کے فوراً بعد آنکھیں پھیر لیں اور آپ کے خاندان پر ظلم و ستم ہوتا دیکھتے رہے۔ جو شخص یہ سوچنا چاہے، سوچے لیکن پھر اسے پھر ان ہزاروں روایات کی توجیہ بھی پیش کرنا ہو گی جن میں اصحاب رسول اور اہل بیت کی باہمی محبت اور تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ محبت والی روایتیں، بغض والی روایتوں کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ کوئی غیر متعصب غیر مسلم مورخ بھی انہیں نظر انداز کر کے صرف بغض والی روایتوں کو قبول نہیں کر سکتا ہے۔ ان میں سے متعدد روایات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ایک اور روایت پیش خدمت ہے:

> حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بِشْرٍ ، حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ ، حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ ، عَنْ أَبِيهِ أَسْلَمَ: اسلم عدوی روایت کرتے ہیں: "جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی تو علی اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور ان سے مشورہ کرنے لگے۔ اس بات کا علم جب عمر رضی اللہ عنہ کو ہوا تو وہ سیدہ کے گھر آئے اور کہنے لگے: "اے رسول اللہ کی بیٹی! ہمارے نزدیک تمام مخلوق میں آپ کے والد سے بڑھ کر کوئی محبت و عقیدت کے لائق نہیں ہے اور آپ کے والد کے بعد کوئی آپ سے بڑھ کر عقیدت کے لائق نہیں ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے سیدہ سے گفتگو کی۔ سیدہ نے علی اور زبیر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: "آپ دونوں پلٹ کر ہدایت پا لیجیے۔" یہ

[32] ذہبی۔ سیر الاعلام النبلاء۔ شخصیت نمبر 3328۔ ص 2451۔

دونوں واپس پلٹے اور جا کر (ابو بکر کی) بیعت کر لی۔[33]

درایت کے اعتبار سے بھی حضرت عمر اور علی رضی اللہ عنہما پر یہ الزام غلط ہے۔ بے شمار روایات سے معلوم ہے کہ پہلے تینوں خلفاء راشدین کے دور میں حضرت علی ان کے ساتھ رہے، ان کے ساتھ امور سلطنت میں ہاتھ بٹایا اور ان کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا۔ حضرت ابو بکر کی وفات کے بعد ان کی بیوہ اسماء بنت عمیس سے حضرت علی نے شادی کی۔ حضرت ابو بکر کے ان سے ایک بیٹے تھے جن کا نام محمد بن ابی بکر تھا۔ ان کی پرورش حضرت علی نے اپنے بیٹوں کی طرح کی۔ اگر آپ پر جبر و تشدد کر کے بیعت لی گئی ہوتی تو کیا آپ یہ سب کچھ کر سکتے تھے؟ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے بطور تقیہ ایسا کیا تو یہ معاذ اللہ حضرت علی پر ایک تہمت ہو گی کہ آپ دل سے جس بات پر قائل نہیں تھے، اس کے لیے آپ نے پوری جانفشانی سے جدوجہد کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب یروشلم کی فتح کے لیے خود شام گئے تو اپنے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو قائم مقام خلیفہ بنا کر گئے جو کہ ان پر اندھے اعتماد کی علامت ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اقتدار پر قبضہ کر سکتے تھے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ نہج البلاغہ کی روایت کے مطابق جب حضرت عمر ایران کو فتح کرنے کے لیے خود جانا چاہتے تھے تو حضرت علی نے خود انہیں روکا۔ حضرت علی نے اپنے بیٹوں کے نام ابو بکر، عمر اور عثمان رکھے،[34] جو ان تینوں خلفاء سے ان کی محبت کی علامت ہے اور ان میں سے دو بیٹے ابو بکر اور عثمان سانحہ کربلا میں شہید ہوئے۔[35] اگر حضرت علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا پر جبر و تشدد کیا گیا ہوتا تو کیا اس کا امکان تھا کہ آپ پہلے خلفاء کے ساتھ اتنے خلوص اور محبت سے پیش آتے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین سے پہلے خلافت کا مسئلہ کیوں طے کیا گیا؟

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا خلافت کا معاملہ اتنا اہم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین سے بھی پہلے اسے طے کرنے کی کوشش کی گئی؟ جو لوگ سیاسی امور سے واقف ہیں، وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ قوم کو اکٹھا رکھنا اور فتنہ و فساد کا ذرہ برابر بھی موقع نہ دینا ایسا امر ہے جو دوسرے تمام امور سے اہم ہے۔ اگر ایک دن کے لیے بھی حکومت باقی نہ رہے، تو ملک میں فتنہ و فساد پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے جس کے نتیجے میں لوگوں کی جان، مال اور آبرو کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور میں آئین میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ اگر سربراہ مملکت فوت ہو جائے تو اس کی جگہ قومی اسمبلی کا اسپیکر یا سینٹ کا چیئرپرسن قائم مقام صدر بن جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ کی امت کو افتراق و انتشار سے بچایا جائے۔ دوسرے تاخیر میں حکمت یہ

---

[33] ابن ابی شیبہ۔ المصنف۔ جلد 21۔ حدیث 38200۔ www.almeshkat.net (ac. 23 Feb 2008)

[34] مصعب الزبیری (156-236/773-851)۔ نسب قریش۔ باب ولد علی بن ابی طالب۔ 42, 43۔ www.waqfeya.com (ac. 14 Aug 2012)

[35] ابن حزم۔ جمہرۃ الانساب۔ 38۔ قاہرہ: دار المعارف

بھی تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ حاضر ہو کر آپ کی آخری مرتبہ زیارت کر لیں۔

کیا بنو امیہ و بنو ہاشم نے حضرت ابو بکر کے خلاف سازشیں کیں؟

بنو امیہ اور بنو ہاشم کے سبھی لوگوں نے دل و جان سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کو قبول کر لیا۔ بنو امیہ میں حضرت عثمان اور بنو ہاشم میں حضرت علی رضی اللہ عنہما نمایاں شخصیات تھیں اور ان کے بارے میں تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے دل و جان سے حضرت ابو بکر کی خلافت کو قبول کیا۔ بعض روایتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق بنو امیہ کے دو افراد، حضرت ابو سفیان اور حضرت خالد بن سعید اور بنو ہاشم کے ایک فرد حضرت عباس رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور ان کے خلاف سازشیں کیں۔ مناسب ہو گا کہ ہم ان روایتوں کا جائزہ لیتے چلیں۔

حدثني محمد بن عثمان بن صفوان الثقفي ، قال : حدثنا أبو قتيبة ، قال : حدثنا مالك - يعني ابن مغول - عن **ابن الحر**: ابن الحر کہتے ہیں کہ ابو سفیان نے علی رضی اللہ عنہما سے کہا: "یہ کیا بات ہوئی کہ حکومت قریش کے سب سے چھوٹے خاندان میں چلی گئی ہے۔ واللہ! اگر آپ چاہیں تو میں گھوڑوں اور آدمیوں سے بھری ایک فوج لے کر حکومت کو ابو بکر سے چھین لوں۔" علی نے کہا: "ابو سفیان! تم ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن رہے مگر تمہاری دشمنی سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ ہم نے ابو بکر کو حکومت کا اہل سمجھ کر ان کی بیعت کی ہے۔" (بلاذری نے اس واقعے کی سندیوں بیان کی ہے: حدثني محمد بن سعد، عن **الواقدي**، عن يزيد بن عياض، عن **ابن جعدبة**، عن محمد بن المنكدر. دوسری سندیوں ہے: المدائني، عن الربيع بن صبيح، **عمن حدثه**، عن الحسين، عن أبيه.)

حدثني محمد بن عثمان الثقفي ، قال : حدثنا أمية بن خالد ، قال : حدثنا حماد بن سلمة ، عن ثابت: جب ابو بکر خلیفہ بنے تو ابو سفیان نے کہا: "ہمیں ان سے کیا لینا دینا، یہ (حکومت) تو بنو عبد مناف کا حق ہے۔ کسی نے ان سے کہا: "ابو بکر نے آپ کے بیٹے (یزید) کو گورنر بھی تو بنایا ہے۔" کہنے لگے: "ہاں، اس معاملے میں انہوں نے صلہ رحمی کی ہے۔"

حدثت عن **هشام** ، قال : حدثني عوانة: جب سب لوگ ابو بکر کی بیعت کے لیے تیار ہو گئے تو ابو سفیان ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: "مجھے یقین ہے کہ اس کاروائی سے ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور خونریزی ہو گی۔ اے آل عبد مناف! ابو بکر کو تمہارے معاملات میں مداخلت کا کیا حق ہے؟ وہ دونوں کمزور کدھر گئے؟ کہاں ہیں علی اور عباس؟ ابو الحسن (علی!) اپنا ہاتھ کھولیے، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔" مگر علی نے ان کی بات نہ مانی۔ ابو سفیان نے اس وقت متلمس کے یہ شعر پڑھے: "سوائے دو کمزور چیزوں کے کوئی اور ظلم کو برداشت نہیں کرتا۔ ایک خاندان کا گدھا اور دوسری خیمے کی میخ۔ میخ پر جب ضرب لگائی جاتی ہے تو اس کا سر دب جاتا ہے۔ گدھے پر جب بوجھ لادا جاتا ہے تو وہ کراہتا ہے مگر اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔" علی نے ابو سفیان کو ڈانٹا اور بولے: "اس تجویز سے آپ کا مقصد فتنہ و فساد برپا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپ نے ہمیشہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں آپ کی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔"[36] (طبری نے دوسری سند یہ بیان کی ہے: قال **هشام**

[36] طبری۔ 2/1-411

بن محمد : وأخبرني أبو محمد القرشي: ۔)

سند کے اندر خط کشیدہ ناموں کو دیکھیے تو یہ روایتیں بیان کرنے والے وہ لوگ ہیں جو متعصب اور جھوٹی روایتوں کے لیے مشہور ہیں:

- ابن الحر جنہوں نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا اور یہ بنو امیہ سے تعصب رکھتے تھے۔[37] ان کا پورا نام عبید اللہ بن حر الجعفی (d. 68/687) ہے۔
- دوسرے شخص محمد بن عمر الواقدی ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں۔
- تیسرے راوی ابن جعدبہ ہیں جن کے جھوٹا ہونے پر ماہرین کا اتفاق ہے اور ان کی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں۔
- چوتھے صاحب ہشام بن محمد کلبی ہیں جن کا صحابہ کرام سے بغض مشہور ہے اور ان کی تفصیلات ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہ چاروں کے چاروں وہ راوی ہیں جو ناقابل اعتماد ہیں۔ درایت کے نقطہ نظر سے دیکھیے تو اس روایت میں چند مسائل موجود ہیں:

- سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے اس میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ، خلیفہ وقت کے خلاف سازش کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسر تھے اور اس معاملے میں ان کا رشتہ وہی تھا جو حضرت ابو بکر کا تھا۔ یہ درست ہے کہ قومی تعصب میں انہوں نے چند سال (غزوہ احد سے لے کر فتح مکہ تک) اسلام کی مخالفت کی لیکن جب فتح مکہ کے موقع پر آپ ایمان لائے تو اس کے بعد مخلص مومن ثابت ہوئے۔ سوائے اس ایک روایت کے، اور کوئی روایت ہمیں نہیں ملتی ہے جس میں کوئی منفی بات ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت درست نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا مستحق سمجھنے کی رائے رکھتے ہوں اور کبھی اس کا اظہار بھی کیا ہو، جس پر حضرت علی نے انکار کر دیا ہو۔
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد حضرت ابو سفیان کو نجران کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ نجران اور مدینہ میں کم و بیش 1300 کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ عہد صحابہ کے ذرائع آمد و رفت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ فاصلہ کم از کم پچیس چھبیس دن میں طے ہوتا تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیمار ہوتے ہی حضرت ابو سفیان کو خبر پہنچانے کے لیے مدینہ سے ہرکارہ دوڑایا گیا ہو گا، تو بھی یہ ممکن نہیں کہ خبر ملنے کے بعد وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت تک وہ مدینہ پہنچ سکیں۔
- حضرت ابو سفیان کے خاندان پر حضرت ابو بکر کس درجے کا اعتماد کرتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کے دو بیٹوں یزید اور معاویہ کو شام میں اعلی عہدے دیے۔ یہ دونوں شام کو فتح کرنے والے لشکر میں شریک تھے۔ فتح

---

[37] www.al-kawthar.com/husainia/mosoa/355.htm, http://shiaonlinelibrary.com/کتب/3679_کتاب-الفتوح-أحمد-بن-أعثم-الكوفي-ج-٥/الصفحة_72 (ac. 22 Aug 2012)

کے بعد حضرت ابو بکر نے یزید کو شام کا گورنر مقرر فرمایا اور معاویہ کو ان کا نائب بنایا۔ پھر یزید کی وفات کے حضرت عمر نے معاویہ کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ اگر حضرت ابو سفیان ایسی کسی سازش میں شریک ہوتے، تو ان کے خانوادے پر حضرات ابو بکر و عمر اتنا اعتماد نہ کرتے۔ رضی اللہ عنہم۔

حضرت خالد بن سعید بن عاص اموی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی، جو کہ سابقون الاولون میں شمار ہوتے ہیں کے بارے میں بلاذری نے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما سے کہا: "آپ دونوں (اپنے اپنے خاندان) کا شعار ہیں نہ کہ عام لوگ۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ یہ حکومت بنو عبد مناف سے باہر چلی جائے۔" اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ اللہ کا معاملہ ہے، وہ جسے چاہے، عطا کرے۔" ممکن ہے کہ حضرت خالد کی رائے یہ رہی ہو مگر انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کی بیعت کر لی تھی۔

بنو ہاشم میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسی روایات بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیعت نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ روایت یہ ہے:

> حدثني **عباس بن هشام، عن أبيه، عن جده**، عن أبي صالح عن جابر بن عبد الله: عباس نے علی سے کہا: "آپ کو کس چیز نے پیچھے رہ جانے پر مجبور کیا ہے؟" جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عباس، علی سے کہا کرتے تھے: "باہر نکلیے تا کہ میں سب کے سامنے آپ کی بیعت کروں۔ اس معاملے میں کوئی اختلاف نہ کرے گا۔" حضرت علی نے انکار کر دیا اور کہا: "کیا کوئی ایسا ہے جو ہمارے حق کا انکار کرے اور ہم پر غلبہ پا لے؟" عباس نے کہا: "عنقریب آپ یہ بات دیکھ لیں گے۔" جب ابو بکر کی بیعت ہوئی تو علی سے عباس نے کہا: "علی! میں آپ کو کیا کہتا تھا؟" [38]

روایت کی سند دیکھیے تو اس میں ہشام کلبی کے بیٹے عباس، اپنے والد اور اپنے دادا سے روایت کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا روایت ایک ہی خاندان کی تین نسلوں میں چل رہی ہے اور اس پورے خاندان کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ لوگ صحابہ کرام کے متعلق شدید بغض دل میں رکھتا ہے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے وقت بھی ایسی ہی روایات بیان کی ہیں جن میں حضرت عباس، حضرت علی کو سازش کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں۔

ان تمام روایتوں کی سند سے واضح ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اختلاف سے متعلق جتنی روایات بیان کی گئی ہیں، ان کے موجد وہی ہیں جو صحابہ کرام سے بغض رکھتے تھے۔ ان روایات کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ محض مخصوص حضرات کو بدنام کرنے کے لیے بطور پراپیگنڈا وضع کی گئی ہیں۔

[38] بلاذری۔ 2/265

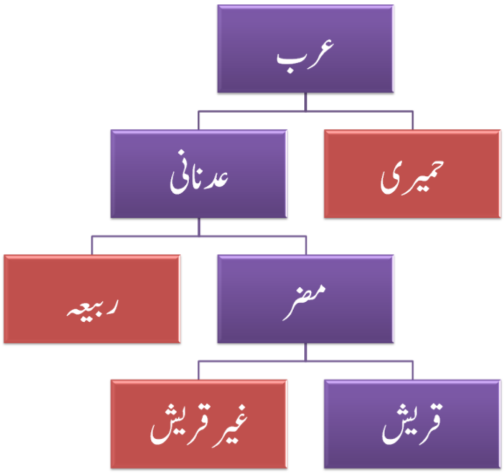
فتنہ ارتداد

خلافت راشدہ کی اولین تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں نجد میں مسیلمہ اور یمن میں اسود عنسی سے نبوت کا دعوی کر دیا تھا۔ اس کے بعد اور کئی لوگوں نے نبوت کا دعوی کیا اور ان کے بہت سے پیروکار بھی اکٹھے ہو گئے۔ بعض لوگوں نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت مسلمانوں کو ان تمام مرتدین سے جنگ کی اور ایک سال کی جنگ کے بعد ان سب پر قابو پایا۔ عام طور پر تواریخ میں چونکہ محض یہ واقعات بیان کر دیے جاتے ہیں اور ان کے عمرانی اسباب پر بات نہیں کی جاتی ہے، اس وجہ سے بہت سے طالب علموں کے ذہن میں یہ سوال برقرار رہتا ہے کہ یکایک ایسا کیا واقعہ پیش آ گیا تھا کہ عرب کے بہت سے قبائل نے اس طریقے سے بغاوت کر دی تھی۔ مناسب رہے گا کہ ہم ان وجوہات کو تفصیل سے بیان کر دیں۔

فتنہ ارتداد کے اسباب کیا تھے؟

اس تفصیل کو سمجھنے کے لیے ہمیں عربوں کے قبائلی نظام کی ساخت اور باہمی سیاست کو سمجھنا پڑے گا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس زمانے میں قوم یا قبیلے کا تشخص کسی بڑی شخصیت سے قائم ہوتا تھا۔ ایسا ضروری نہیں تھا کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں تو وہ دونوں ہی الگ الگ قبیلے کے بانی بن جائیں بلکہ ان میں سے جس نے غیر معمولی کارنامے سر انجام دیے ہوتے اور اپنے خاندان کو اکٹھا رکھا ہوتا اور پھر یہ عمل سو دو سو سال تک جاری رہتا، اسی کی اولاد ایک قبیلے کی شکل اختیار کرتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک باپ کے دو بیٹوں میں مخاصمت پیدا ہو جاتی اور دونوں ہی باصلاحیت ہوتے، جس کے باعث دونوں ہی الگ الگ قبیلے کی بنیاد رکھتے۔ بسا اوقات ان میں طویل دشمنیاں چلتیں لیکن اپنے جد اعلی کے نام پر وہ کبھی اکٹھے بھی ہو جایا کرتے تھے۔

جیسا کہ آپ ڈایا گرام میں دیکھ سکتے ہیں کہ جزیرہ نما عرب میں دو قسم کے قبائل آباد تھے۔ ایک تو یمن کے حمیری قبائل تھے اور دوسرے حجاز کے وہ قبائل جو حضرت اسماعیل علیہ الصلوۃ والسلام کی اولاد میں سے تھے۔ دور جاہلیت میں ان کے مابین کشمکش برپا رہتی تھی۔ حمیریوں نے ایک زمانے میں یمن میں ایک بڑی تہذیب کی بنیاد رکھی تھی اور وہ پورے عرب میں ایک علاقائی سپر پاور کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی (عہد رسالت سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے) میں ان کا مشہور ڈیم "سد مآرب" ٹوٹ گیا اور حمیری تہذیب پر زوال آیا۔ اس واقعے کو قرآن مجید میں سورۃ سبا میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری جانب حجازی قبائل نے قوت پکڑی اور اب عرب میں انہیں غلبہ حاصل ہو گیا۔ ہم انسانی نفسیات کے بارے میں یہ جانتے ہی ہیں کہ غلبہ پا لینے والوں کے بارے میں مغلوبین کے دلوں میں بغض کی سی کیفیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے، خاص کر اس وقت جب غالب آنے والوں نے مغلوبین کو شکست دے کر ان پر غلبہ حاصل کیا ہو۔ مثلاً موجودہ دور کے مسلمانوں میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے خلاف اسی قسم کی نفرت پائی جاتی ہے اور اس سے پہلے قرون وسطی کے یورپ میں مسلمانوں کے خلاف ایسی ہی نفرت پائی جاتی تھی۔



دوسری طرف حضرت اسماعیل علیہ الصلوۃ والسلام کی اولاد میں جس شخص کی نسل تیزی سے پھیلی، ان کا نام عدنان تھا۔ عدنان کی اولاد کچھ عرصہ بعد متعدد قبائل میں تقسیم ہو گئی جن میں ربیعہ اور مضر کے قبائل کو غیر معمولی طاقت حاصل ہو گئی اور نتیجتاً ان کے درمیان ایک دوسرے پر غلبے کی جدوجہد شروع ہوئی۔ مضر قبائل زیادہ طاقتور تھے اور ان کی ایک شاخ "قریش" تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جس کے نتیجے میں قریش کا اسٹیٹس تمام قبائل میں مزید بلند ہو گیا۔ آپ کی حیات طیبہ ہی میں اسلام پورے جزیرہ نما عرب میں پھیل گیا، جس سے عدنانی قبائل کی مضری شاخ اور مضری قبائل کی قریشی شاخ کو ایک خاص اسٹیٹس حاصل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک جانب ربیعہ قبائل (جو کہ زیادہ تر نجد میں آباد تھے)، دوسری جانب حمیری قبائل (جو کہ یمن میں آباد تھے) اور تیسری طرف غیر قریشی مضر قبائل میں ان کے خلاف بغض اور حسد پیدا ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان قبائل کے سبھی لوگوں میں یہ بغض موجود تھا۔ ان میں بھی بہت سے لوگ پورے خلوص نیت کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے اور وہ اپنے دین پر عمل پیرا تھے لیکن ایک طبقہ ایسا تھا جس نے محض اسلام کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر اطاعت قبول کی تھی، مگر ان کے دلوں میں اسلام ابھی پوری طرح داخل نہ ہوا تھا۔

ہر قوم میں کچھ ایڈونچر پسند لوگ ہوتے ہیں جو کسی بڑے فائدے کے لیے بڑا خطرہ مول لے لیتے ہیں۔ اس کائنات کا ایک اصول ہے کہ بڑے فائدے کے لیے بڑا خطرہ مول لینا پڑتا ہے اور چھوٹے فائدے کے لیے چھوٹا۔ High risk, high return and .... low risk, low return۔ درمیانے فائدے کے لیے درمیانے درجے کے خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رسک مینجمنٹ میں ایک تصور موجود ہے جسے "خطرات مول لینے کا ذوق (Risk Appetite)" کہا جاتا ہے۔ یہ ہر شخص اور گروہ میں دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض حضرات کا ذوق یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے بڑے خطرات مول لے لیتے ہیں۔ کامیاب ہو جائیں تو انہیں بڑی کامیابی ملتی ہے اور ناکام ہو جائیں تو اپنی اور اپنے خاندان کی مکمل تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ انہی کو ایڈونچر پسند لوگ کہا جاتا ہے۔ حمیری اور ربیعہ قبائل میں جو بغض موجود تھا، اسے بعض ایسے ہی ایڈونچر پسند لوگوں نے استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس طرح حمیریوں کو اسود عنسی اور ربیعہ قبائل کو مسیلمہ کی شکل میں قومی راہنما مل گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی نبوت کے اور بھی دعوے دار پیدا ہو گئے۔

قبائلی تعصب کا یہ عالم تھا کہ مسیلمہ کے ایک پیروکار سے بعض صحابہ نے مکالمہ کیا اور مسیلمہ کے جھوٹ کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ اس کا جواب یہ تھا: "میں مضر قبائل کے سچے نبی کی بجائے ربیعہ قبائل کے جھوٹے نبی کا ساتھ دینا پسند کروں گا۔" تاہم ایسا نہیں تھا کہ عربوں کا بہت بڑا حصہ ان جھوٹے نبیوں کا پیروکار بن گیا تھا۔ ان قبائل میں بھی کم ہی تعداد ان لوگوں کی تھی جو ان نبیوں کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھی اور ان کی تعداد پورے عرب کا شاید دس فیصد بھی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف کاروائی کی تو محض ایک سال کے عرصے میں پورے عرب میں امن قائم ہو گیا اور یہ جھوٹے نبی محض تاریخی قصہ بن کر رہ گئے۔ انہی میں سے بعض حوصلہ مند افراد جیسے طلیحہ بن خویلد اسدی نے دوبارہ ایمان لا کر ایران کے خلاف معرکوں میں داد شجاعت دی۔

روم و ایران پر حملہ

ایک جدید قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں روم اور ایران پر حملہ کیوں کیا گیا؟ کیا یہ دوسری قوموں کی آزادی میں مداخلت نہیں تھی؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں دو چیزوں کا جائزہ لینا پڑے گا۔ ایک تو رسولوں کے بارے میں اللہ تعالی کا ایک خاص قانون اور دوسرے اس زمانے کی عالمی سیاست کے اصول۔

رسولوں کے بارے میں اللہ تعالی کا خاص قانون کیا ہے؟

رسولوں کے بارے میں اللہ تعالی کے قانون کی وضاحت ہم اپنی دوسری تحریروں میں کر چکے ہیں۔ اس تفصیل کا مطالعہ وہاں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم اسے مختصراً بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالی کا قاعدہ یہ ہے کہ اس نے بارہا اس روئے زمین پر کسی قوم کا انتخاب کر کے اس میں اپنے رسول کو بھیجا۔ اس رسول نے ہر ممکن طریقے سے حق کو ان لوگوں کے سامنے واضح کر دیا اور یہ بتا دیا کہ جزا و سزا کا جو معاملہ سب انسانوں کے ساتھ آخرت میں ہونے والا ہے، وہ اس قوم کے ساتھ اسی دنیا میں ہو جائے گا۔ ایک خاص وقت کے بعد اللہ تعالی کا عذاب اس رسول کے منکرین پر آیا اور انہیں نیست و نابود کر دیا گیا۔ دوسری طرف رسول کے ماننے والوں کو ان کی جگہ اس خطے کا اقتدار دے دیا گیا۔ قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب علیہم الصلوۃ والسلام کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا اور ان پر آسمانی آفتوں کی صورت میں اللہ کا عذاب نازل ہوا۔

انسانیت کی معلوم تاریخ میں دو مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ رسول پر اتنی زیادہ تعداد میں لوگ ایمان لائے کہ اس جزا و سزا کے نفاذ کا کام انہی کے ہاتھوں لیا گیا۔ یہ حضرت موسی اور محمد علیہما الصلوۃ والسلام تھے۔ جو عذاب دیگر قوموں پر سیلاب، زلزلے یا کسی اور آسمانی آفت کی صورت میں نازل ہوا، وہ ان دونوں پیغمبروں کے امتیوں کے ہاتھوں ان کے مخاطبین پر نافذ ہوا۔ حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام پر بنی اسرائیل کے لاکھوں لوگ ایمان لائے۔ جب فرعون کو سمندر میں غرق کر دیا گیا تو یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ ارد گرد کی اقوام پر واضح ہو گیا کہ حضرت موسی علیہ السلام اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اس کے بعد بھی جب انہوں نے آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو بنی اسرائیل

کے ہاتھوں انہیں سزا دی گئی۔ حضرت موسی کے خلفائے راشدین یوشع اور کالب علیہم الصلوۃ والسلام کے ہاتھوں دریائے فرات سے لے کر دریائے نیل تک (موجودہ فلسطین، اردن، شام اور مصر) کے پورے علاقے کو فتح کر کے یہاں بنی اسرائیل کا اقتدار قائم کر دیا گیا۔

بعینہ یہی معاملہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ہاتھوں پیش آیا۔ جس زمانے میں پورے عرب کے قبائل نے مل کر مدینہ پر حملہ کیا اور آپ نے خندق کھود کر ان کا مقابلہ کیا، اسی وقت آپ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ عنقریب زمین کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ آنے والے ہیں۔[39] یہ ایسا وقت تھا جب بظاہر مسلمان صفحہ ہستی سے مٹتے نظر آتے تھے۔ اس موقع پر کی گئی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ چند ہی سالوں میں پورا عرب اسلام کے جھنڈے تلے اکٹھا ہوا۔ یہ بات روم اور ایران کے بادشاہوں کے لیے اتمام حجت تھی اور ان پر واضح ہو گیا کہ محمد، اللہ کے سچے رسول ہیں۔ اس کے بعد بھی جب انہوں نے سرتابی کی، تو ان پر اللہ کا عذاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تلواروں کے ذریعے نافذ کر دیا گیا اور قرآن مجید کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی:

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمْ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ.

ان سے جنگ کرو۔ اللہ تمہارے ہاتھوں ہی سے انہیں عذاب دے گا، انہیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور اس طرح صاحب ایمان قوم کے سینوں کو ٹھنڈک پہنچائے گا۔ (التوبہ 9:14)

ایک صحابی حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں اپنی اس کاروائی کا یہ مقصد بیان کیا تھا کہ "ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنے کے لیے آئے ہیں۔"[40] اس زمانے میں ریاستیں مذہبی بنیادوں پر قائم ہوا کرتی تھیں اور غالب قوم، اپنے مذہب کو مغلوب قوموں پر مسلط کر دیا کرتی تھی۔ بادشاہ کے مذہب کو نہ ماننا بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا یہ حصہ تھا کہ اس وقت کی متمدن دنیا کے مرکزی علاقے میں ایک ایسی ریاست قائم کر دی جائے، جس میں ہر شخص کو مذہبی آزادی ہو۔ جو لوگ دنیا کے کسی بھی خطے میں ایمان لانا چاہیں، ان کے لیے یہ موقع موجود ہو کہ وہ ہجرت کر کے اس آزاد خطے میں آباد ہو جائیں اور اپنے ضمیر کے مطابق زندگی بسر کریں۔

اس تفصیل کو پڑھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے ایک مسلمان تو مطمئن ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر مانتا ہے، غیر مسلم کیسے مطمئن ہو سکتا ہے جو آپ کو رسول نہیں مانتا؟ غیر مسلموں کے لیے بھی اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے سچا ہونے کا ثبوت ہے۔ اگر آپ اللہ کے سچے نبی اور رسول نہ ہوتے تو آپ اور آپ کے صحابہ کو کبھی دنیا پر غلبہ نصیب نہ ہوتا۔ تاریخ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی نے یہ خاص اہتمام کیا ہے کہ جھوٹے نبیوں کو کبھی غلبہ نصیب نہیں ہوتا ہے۔ کبھی ایسا ضرور ہوتا ہے کہ انہیں کسی خطے کا اقتدار وقتی طور پر مل جاتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ کبھی طویل عرصے تک پھل پھول نہیں پاتے اور اللہ تعالی ان کے

[39] بخاری۔ کتاب التعبیر۔ حدیث 6611

[40] طبری۔ 14H/2/2-287

جھوٹ کا پردہ چاک کر کے رکھ دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش گوئی کر کے اپنے وقت کی سپر پاورز پر غلبہ پا لینا آپ کی نبوت کے سچا ہونے کی دلیل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ نے جو کاروائی کی تھی، وہ اپنے زمانے کے مروجہ بین الاقوامی قانون کے عین مطابق تھی۔ فوجی کاروائی کا آغاز روم اور ایران کی طرف سے ہوا تھا۔ مسلمانوں نے اس میں نہ تو کسی بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی تھی اور نہ ہی کسی اخلاقی ضابطے کی پامالی۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

ساتویں صدی کا بین الاقوامی قانون کیا تھا؟

ساتویں صدی تو کیا، ابھی 1945 سے پہلے تک عالمی سیاست کا اصول "جس کی لاٹھی، اس کی بھینس" تھا۔ اقوام متحدہ کے قیام کے ساتھ دنیا کے تمام ممالک نے ایک دوسرے سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ اگر کوئی ملک کسی پر زیادتی کرے گا تو اقوام متحدہ کے تحت اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگرچہ عالمی طاقتوں نے اقوام متحدہ کے قوانین کی کئی مرتبہ خلاف ورزی کی ہے، مگر پھر بھی ہمارے زمانے میں دور قدیم کی نسبت جنگ و جدل میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔ دور قدیم میں عالمی سطح پر کوئی معاہدہ موجود نہ تھا۔ ہاں ایسا ہوتا تھا کہ دو ممالک آپس میں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیں۔ ایسے معاہدوں کی پابندی ضروری سمجھی جاتی تھی اور خلاف ورزی کرنے والے کو بری نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ معاہدے بھی عام طور پر متعین مدت کے ہوا کرتے تھے۔ عام اصول یہی تھا کہ جس حکومت کو طاقت حاصل ہو، وہ دیگر ممالک پر لشکر کشی کر سکتا ہے۔ اس اصول کے تحت جس بادشاہ کو طاقت مل جاتی، وہ دوسری قوموں پر لشکر کشی کر دیتا تھا۔ عہد رسالت میں روم اور ایران بڑی طاقتیں تھیں اور اسی زمانے میں ان کے درمیان بڑی جنگیں برپا رہی تھیں۔ اس زمانے میں عرب قبائل میں تقسیم قوم تھے اور آپس ہی میں جنگ و جدل برپا کیے رکھتے تھے۔

روم اور ایران نے اپنے اور عربوں کے درمیان باج گزار ریاستیں قائم کر رکھی تھیں تاکہ یہ عرب قبائل کو کنٹرول کریں اور یہ رومی اور ایرانی سلطنت کے لیے درد سر نہ بنیں۔ روم اور عرب کے درمیان "غسان" کی عیسائی سلطنت تھی جو موجودہ اردن اور شمالی سعودی عرب کے بعض علاقوں پر قائم تھی۔ اسی طرح ایران اور عرب کے درمیان "حیرہ" کی سلطنت تھی جو موجودہ عراق کے جنوبی علاقوں پر قائم تھی۔ دور جاہلیت کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شمال اور مشرق میں رہنے والے مختلف عرب قبائل غسان اور حیرہ کی ان سلطنتوں کے حلیف تھے۔ ان دونوں سلطنتوں میں جنگیں بھی ہوا کرتی تھیں جن میں عرب قبائل اپنی اپنی حلیف سلطنت کا ساتھ دیتے تھے۔

روم اور ایران کی سلطنتوں کو جزیرہ نما عرب پر براہ راست قبضے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس علاقے پر قبضہ کرنے کے اخراجات (Cost) اس کے فوائد (Benefits) سے کہیں زیادہ تھے کیونکہ عرب اپنے اوپر کوئی براہ راست اقتدار برداشت نہ کرتے تھے اور مسلسل بغاوتیں برپا کیے رکھتے تھے۔ دوسری طرف صحرائے عرب میں زراعت نہ ہوتی تھی جس کی وجہ سے اس پر قبضہ کرنے کا کوئی

فائدہ نہ تھا۔ تیل اس وقت دریافت نہ ہوا تھا اور نہ ہی یہ اس وقت کی جیو پالیٹکس کا مرکز و محور تھا۔ ہاں جزیرہ نما عرب کے زرخیز خطوں پر ان دونوں بڑی طاقتوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ شام اور اردن کے علاقے سلطنت روم کے ماتحت تھے اور یمن کا زرخیز علاقہ عہد رسالت میں ایران کی قبضے میں تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کی قیادت میں پورا عرب ایک مرکز پر اکٹھا ہو گیا تو روم اور ایران کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ دونوں سپر پاورز نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی تیسری طاقت کھڑی ہو جائے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کاروائی میں پہل کی۔ ایران کے بادشاہ خسرو پرویز (r. 590-628/6H) کے پاس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پہنچا تو اس نے یمن کے گورنر باذان (d. 10/632) کو حکم دیا کہ وہ فوجی کاروائی کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ گرفتار کر کے ایران بھجوا دے۔ اس طرح اس نے آپ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب باذان نے واقعے کی تحقیق کروائی تو ان پر حق واضح ہو گیا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح یمن، جو کہ ایرانیوں کی ایک کالونی تھی، ایرانی سلطنت سے الگ ہو گئی۔ [41]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایران کے سرحدی علاقوں پر مسلمانوں کی دعوت کے نتیجے میں جو لوگ مسلمان ہوئے، حکومت ایران نے ان کے خلاف کاروائی کی اور انہیں مرتد ہونے پر مجبور کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلم علاقے میں رہنے والے عرب قبائل پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک قبیلے بنو شیبان کے سردار حضرت مثنی بن حارثہ رضی اللہ عنہ (d. 14/635) مدینہ آئے اور انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو قائل کیا کہ وہ ان کے تحفظ کے لیے کچھ کریں۔ آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک لشکر ایران کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ اس کے بعد ایران سے جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔

دوسری طرف روم نے بھی کاروائی میں پہل کی۔ سلطنت غسان کے فرمانروا کے پاس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ پہنچے تو اس نے انہیں قتل کروا دیا۔ بین الاقوامی قانون کے تحت سفیر کا قتل ایک بہت بڑا جرم تھا اور ایک طرح سے اعلان جنگ تھا۔ اس کے خلاف آپ نے کاروائی کے لیے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک لشکر کو بھیجا۔ غسانی سلطنت نے روم سے مدد حاصل کی اور قیصر روم نے اپنا لشکر ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ موتہ کے مقام پر ان میں جنگ ہوئی اور حضرت زید، جعفر اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی اور اپنی جنگی حکمت عملی کے ساتھ اس لشکر کو بحفاظت نکال لائے۔

صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ملنے پر قیصر روم، جو اس وقت یروشلم میں موجود تھا، نے تحقیقات کیں۔ اس وقت قریش مکہ کا ایک قافلہ وہاں تجارت کے لیے آیا ہوا تھا جس کے سربراہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ تھے جو ابھی ایمان نہ لائے تھے۔ قیصر نے ان سے سوال و جواب کیے تو اسے یقین ہو گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔

---

[41] ایضاً۔ 7H/2/1-272

اہل کتاب ہونے کے سبب وہ اس بات سے واقف تھا کہ رسولوں کے مقابلے پر دنیا کی کوئی طاقت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے اس نے یہ تاریخی جملہ کہا: "اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان کے پاس حاضر ہوتا۔ یہ لکھ لو کہ اس وقت جو زمین میرے قدموں تلے ہے، وہ ضرور ان کے قبضے میں آئے گی۔"[42] تاہم قیصر کے ساتھیوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں سے جنگ کرے اور اس جنگ میں اسے ناکامی ہوئی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجی کاروائی کا آغاز ایران اور روم کی جانب سے ہوا۔ پھر مسلمانوں نے جوابی کاروائی کی اور متعدد جنگوں میں انہیں پے در پے شکست دے کر موجودہ عراق، ایران، شام، فلسطین، مصر اور شمالی افریقہ کے علاقوں کو فتح کر لیا۔ ایرانی سلطنت اب وسط ایشیا اور رومی سلطنت اناطولیہ (ترکی) تک محدود ہو چکی تھی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خواہش کی کہ کاش ان کے اور ہمارے درمیان آگ کا دریا حائل ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آپ جنگوں کے اس سلسلے کو روکنا چاہتے تھے لیکن روم و ایران نے کاروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایرانی بادشاہ یزدگرد (r. 10-30/631-651) نے مسلمانوں کے علاقے میں مسلسل بغاوتیں برپا کروانا شروع کر دیں۔ اس پر اس کے خلاف فوجی کاروائی کرنا پڑی جس کے نتیجے میں افغانستان اور ماوراء النہر (Transoxiana) کے علاقے فتح ہوئے اور ایرانی سلطنت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ رومی بادشاہ ہرقل نے صلح کر لی اور مسلمانوں نے اس کی جانب پیش قدمی روک دی۔ تاہم بعد میں رومیوں نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس کے نتیجے میں آرمینیا کا علاقہ فتح ہوا۔

ان جنگوں کے دوران صحابہ کرام نے صرف اور صرف حکومت اور اس کی مسلح افواج کے خلاف کاروائی کی۔ انہوں نے کسی عام شہری کو نشانہ نہیں بنایا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر یہ ہدایت نامہ (Guidelines) جاری کر دیا تھا:

> خبردار! آپ لوگ زمین میں فساد نہ مچایے اور نہ ہی احکامات کی خلاف ورزی کیجیے۔ کھجور کے درخت نہ کاٹیے اور نہ جلائیے۔ چوپایوں کو ہلاک نہ کیجیے اور نہ ہی پھل دار درختوں کو کاٹیے۔ کسی عبادت گاہ کو مت گرائیے اور نہ ہی بوڑھوں، بچوں اور خواتین کو قتل کیجیے۔ آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے خود کو گرجا گھروں میں بند کر رکھا ہے اور دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ [43]

حضرت موسی، داؤد اور سلیمان علیہم الصلوۃ والسلام کے صحابہ کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ وہ پہلا گروہ تھے، جنہوں نے جنگ کو بھی اخلاقیات کے دائرے میں لانے میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے عام شہری پر لگی ہوئی پابندیوں کو ختم کیا۔ انہیں مکمل مذہبی آزادی عطا کی۔ اسلام کی دعوت کو ان کے سامنے پیش کیا لیکن لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ "دین میں کوئی جبر نہیں" کے اصول کے تحت کسی پر کوئی پابندی نہ لگائی۔ بعد کے مسلمانوں نے اسے برقرار رکھا اور ایران، افغانستان اور پھر ہندوستان کے غیر مسلموں کو مکمل آزادی دیے رکھی۔ مسلم مفتوحہ علاقوں شام، فلسطین، لبنان، اردن اور عراق میں موجود عیسائی آبادی اور ہندوستان کی ہندو اکثریت

---

[42] بخاری۔ حدیث 7۔

[43] بیہقی۔ سنن الکبری۔ حدیث 18125۔ 9/145۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ www.waqfeya.com (ac 17 May 2007)

اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ انہیں مکمل مذہبی آزادی دی گئی اور ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کی گئی۔ اگر کسی پرجوش حکمران نے ایسا کرنے کی کوشش کی، تو خود مسلم علماء نے آگے بڑھ کر ان غیر مسلموں کا تحفظ کیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کسی قوم سے اس کی آزادی نہیں چھینی بلکہ لوگوں کو قیصر و کسری کی غلامی سے آزاد کیا۔ اس طرح سے دنیا بھر کے حق پرستوں کے لیے یہ موقع پیدا ہوا کہ اگر وہ اپنے ضمیر کے مطابق مذہبی آزادی چاہیں تو اس علاقے میں چلے آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ سے بہت سے یہودی اور ایسے عیسائی، جو کلیسا سے اختلاف رکھتے تھے، آ آکر مسلم علاقوں میں آباد ہوتے رہے اور آزادی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔

حضرت عمر کی نامزدگی

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور پر جو آخری سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ کیا اس طرح سے آپ نے شوری کے مسلمہ قرآنی اصول کی خلاف ورزی نہیں کی؟

کیا حضرت عمر کی نامزدگی شوری کے اصول کی خلاف ورزی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں آپ کی وفات کے زمانے کی صورتحال پر غور کرنا پڑے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جو صورتحال تھی، اس میں دو سال میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ وہی عرب قبائل تھے جو کہ قبیلہ قریش کو اپنا سربراہ مانے ہوئے تھے۔ انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ایک قریشی خلیفہ کی وفات پر دوسرا قریشی خلیفہ بن جائے۔ یہ بالکل ایسی ہی صورتحال تھی کہ ایک برسر اقتدار پارٹی کا صدر یا وزیر اعظم اگر اپنی حکومت کی مدت کے دوران فوت ہو جائے تو الیکشن نہیں کروائے جاتے بلکہ اسی پارٹی کے کسی اور شخص کو صدر یا وزیر اعظم بنا دیا جاتا ہے۔ قریش کا اقتدار ابھی ختم نہ ہوئی تھی بلکہ عرب قبائل بدستور انہی کو اپنا قائد مانتے تھے۔

ان حالات میں صدیق اکبر بیمار پڑے تو ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی مرضی سے خلیفہ بنا کر سب پر مسلط کر دیا ہو۔ بلکہ انہوں نے مناسب یہ سمجھا کہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو مشورہ ان کی وفات کے بعد ہونا ہے، وہ آپ کی وفات سے پہلے ہو جائے۔ چنانچہ طبری، انساب الاشراف، طبقات اور دیگر کتب تاریخ کی روایات کے مطابق آپ نے ایک ایک صحابی کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کی مکمل آزادی تھی۔ بعض صحابہ نے حضرت عمر کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا تو حضرت ابو بکر نے انہیں دلائل سے قائل کیا۔ جب سب لوگ متفق ہو گئے تو آپ نے وصیت لکھوا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی توثیق کر دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب نامزدگی سے نہیں بلکہ شوری سے ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ مشورہ صدیق اکبر کی وفات کے بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے مکمل ہو گیا تھا۔ روایات یہ ہیں:

ابو بکر نے اپنی وفات کے وقت عبد الرحمن بن عوف کو بلایا اور ان سے پوچھا: "یہ بتائیے کہ عمر کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟" انہوں نے کہا: "اے خلیفہ رسول! وہ اور لوگوں کی نسبت اس سے بھی بہتر ہیں جو آپ کی ان کے متعلق رائے ہے مگر ان کے مزاج میں شدت ہے۔" ابو بکر نے کہا: "یہ شدت اس وجہ سے تھی کہ میں نرم تھا۔ جب حکومت خود ان کے حوالے ہو گی تو اس قسم کی اکثر باتوں کو چھوڑ دیں گے۔ اے ابو محمد (عبد الرحمن!) میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے کہ جب میں کسی شخص پر کسی معاملے میں ناراض ہوتا تھا تو عمر مجھے اس سے راضی ہونے کا مشورہ دیتے تھے اور جب میں کسی پر نرم پڑتا تھا وہ مجھے اس پر سختی کا مشورہ دیتے۔ ابو محمد! یہ باتیں جو میں نے آپ سے کہی ہیں، ان کا ذکر اور سے ذکر نہ کیجیے گا۔" عبد الرحمن نے کہا: "بہت بہتر۔"

اس کے بعد ابو بکر نے عثمان بن عفان کو بلایا اور ان سے کہا: "ابو عبد اللہ! یہ بتائیے کہ عمر کیسے ہیں۔" انہوں نے کہا: "آپ انہیں سب سے زیادہ جانتے ہیں۔" ابو بکر نے کہا: "ہاں، اے ابو عبد اللہ! اس بات کی ذمہ داری مجھ ہی پر ہے۔" پھر عثمان نے کہا: "یا اللہ! میں عمر کے باطن کو ان کے ظاہر سے بہتر سمجھتا ہوں، ہم میں ان کے جیسا دوسرا شخص نہیں ہے۔" ۔۔۔

ابو السفر کی روایت ہے کہ ابو بکر نے اپنے گھر سے (مسجد میں) جھانکا۔ (آپ کی اہلیہ) اسماء بنت عمیس، جس کے ہاتھوں پر مہندی لگی تھی، آپ کو پکڑے ہوئے تھیں۔ آپ نے فرمایا: "لوگو! میں جس شخص کو آپ پر خلیفہ مقرر کرنے لگا ہوں، کیا آپ اسے پسند کرتے ہیں؟ کیونکہ میں نے اس کے متعلق غور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں نے اپنے کسی رشتے دار کو منتخب نہیں کیا ہے بلکہ عمر بن خطاب کو آپ کا خلیفہ بنایا ہے۔ آپ ان کا حکم سنیے اور ان کی اطاعت کیجیے۔" یہ سن کر سب نے کہا: "ہم دل و جان سے منظور کرتے ہیں کہ ہم ان کی اطاعت کریں گے۔" (رضی اللہ عنہم اجمعین) [44]

عہد فاروقی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور، اسلام کی پوری تاریخ کا سنہرا دور ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمان پوری طرح متحد تھے اور ان کی افواج روم اور ایران کے خلاف فتح پر فتح حاصل کیے جا رہی تھیں۔ بلوچستان سے لے کر مصر تک علاقہ اسی دور میں فتح ہوا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان علاقوں کے عام لوگوں کو قیصر و کسری کی غلامی سے نکال کر انہیں مذہبی اور دنیاوی امور میں آزادی عطا کی اور ایک نیا نظام معاشرت ترتیب دیا۔ اس دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان کوئی قابل ذکر اختلافات نہیں ہوئے، اس وجہ سے اس دور سے متعلق تاریخی سوالات بھی بہت کم ہیں۔ یہاں ہم ان چند سوالات کا جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

حضرت عمر نے حضرت خالد بن ولید کو معزول کیوں کیا؟

حضرت عمر نے منصب خلافت سنبھالتے ہی پہلا اہم کام یہ کیا کہ حضرت خالد بن ولید کو سپہ سالاری کے عہدے سے معزول کر کے ان

[44] طبری۔ حضرت ابو بکر کی وفات کے حالات۔13H/2/2-204

کی جگہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم کو سپہ سالار مقرر فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں "سیف من سیوف اللہ" یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار قرار دیا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں انہوں نے عراق کا بیشتر حصہ فتح کر لیا تھا اور اب شام میں اپنی غیر معمولی جنگی حکمت عملی کے جوہر دکھا رہے تھے۔ مسلم تاریخ میں اگر فوجی جرنیلوں کی رینکنگ کی جائے تو بلاشبہ حضرت خالد اس میں پہلے نمبر پر ہوں گے۔ تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے انہیں معزول کیوں کیا جبکہ حضرت خالد کی کارکردگی غیر معمولی تھی؟

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حضرت عمر نے حضرت خالد کو معزول ہرگز نہیں کیا بلکہ انہیں سپہ سالار اعظم کی بجائے سیکنڈ ان کمانڈ بنا دیا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں جن میں سب سے نمایاں یہ تھی کہ حضرت خالد جنگوں میں اپنی غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے بہت زیادہ خطرات مول لے لیا کرتے تھے۔ آپ فی الحقیقت ایک بہت بڑے risk-taker تھے اور بسا اوقات تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن پر جھپٹ پڑتے اور اسے شکست دے ڈالتے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنی احتیاط کے باوجود اس معاملے میں حضرت خالد کو ڈھیل دیتے تھے۔ اس کے برعکس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت محتاط تھی اور آپ مسلمانوں کو خطرے میں ڈالنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے حضرت خالد کو امین الامت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما کے تحت کر دیا تاکہ وہ اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کے سبب، حضرت خالد کو ضرورت سے زیادہ خطرات مول لینے سے روکیں اور ان کی جنگی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں۔ یہ بات طبری کی روایت سے واضح ہو جاتی ہے جس میں حضرت ابوعبیدہ کے نام حضرت عمر کا خط نقل کیا گیا ہے۔

> میں آپ کو اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں جو کہ باقی رہنے والا ہے اور جس کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اسی نے ہمیں گمراہی سے نکال کر راہ راست پر لگایا اور اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل فرمایا۔ میں آپ کو خالد کے لشکر کا امیر مقرر کرتا ہوں۔ آپ مسلمانوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائیے۔ مال غنیمت کے لیے **مسلمانوں کی جان خطرے میں نہ ڈالیے** اور نہ ہی کسی اجنبی مقام کے حالات اور نتائج کو معلوم کیے بغیر انہیں وہاں ٹھہرائیے۔ جب آپ کسی لشکر کو جنگ کے لیے بھیجیں تو معقول تعداد کے بغیر نہ بھیجیے۔ مسلمانوں کو ہلاکت (کے خطرے) میں ہرگز مبتلا نہ کیجیے۔ اللہ نے آپ کا معاملہ میرے ہاتھ میں اور میرا معاملہ آپ کے ہاتھ میں دیا ہے۔ دنیا کی محبت سے اپنی آنکھیں بند کر لیجیے اور اپنے دل کو اس سے بے نیاز کر لیجیے۔ خبردار! گزرے ہوئے لوگوں کی طرح انہیں ہلاکت میں نہ ڈالیے۔ ان کے بچھڑنے کے میدان آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔[45]

حضرت خالد کافی عرصہ تک حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما کی کمان میں لڑتے رہے۔ حضرت ابوعبیدہ تمام پلاننگ انہی کے مشورے سے کرتے تھے اور یہ دونوں کمانڈر مل کر جنگی تیاری کرتے تھے۔ تاہم اس پلان پر عمل درآمد حضرت خالد کروایا کرتے تھے۔ چار سال بعد 17/638 میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں تمام جنگی خدمات کو چھوڑ کر مدینہ آنے کا حکم دیا۔ طبری نے اس سلسلے میں سیف

[45] ایضاً۔ 13H/2/2-208

بن عمر کی روایت نقل کی ہے جو کہ نہایت ہی ضعیف راوی ہے اور جھوٹی روایات کے لیے مشہور ہے۔ اس روایت سے یہ تاثر ملتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت عمر، خالد رضی اللہ عنہما سے متعلق دل میں کینہ رکھتے تھے۔ خلافت سنبھالتے ہی انہوں نے حضرت خالد کو معزول کر کے مدینہ واپس بلا لیا، ان کی تذلیل کی اور ان کا آدھا مال لے کر بیت المال میں داخل فرما دیا۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت خالد نے معاذ اللہ مال غنیمت میں کرپشن کی ہے۔ یہ ایک نہایت ہی ناقابل اعتماد اور ضعیف روایت ہے اور ان دونوں بزرگوں پر بہتان ہے۔

ہاں ایسا ضرور ممکن ہے کہ حضرت خالد سے مال غنیمت کے حصوں کی تقسیم میں کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ حضرت عمر نے حساب کیا تو ان کی طرف کچھ رقم زائد نکلی جو حضرت عمر نے ان سے لے کر بیت المال میں داخل کر دی اور شام کے لوگوں کو تحریر لکھ کر بھیجی جس میں حضرت خالد کی معزولی کی وجوہات بیان کیں۔ روایت یہ ہے:

> جب خالد، عمر کے پاس پہنچے تو ان سے شکایت کی اور کہا: "میں نے آپ کی یہ شکایت مسلمانوں کے سامنے بھی بیان کی تھی۔ واللہ! آپ نے مجھ سے اچھا سلوک نہیں کیا۔" حضرت عمر نے فرمایا: "یہ بتائیے کہ آپ کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی؟" انہوں نے جواب دیا: "مال غنیمت اور میرے مقرر حصوں سے۔ ساٹھ ہزار سے زائد جو رقم ہو، وہ آپ (بیت المال) کی ہے۔" اس پر حضرت عمر نے ان کے ساز و سامان کی قیمت لگائی تو ان کی طرف بیس ہزار نکلے۔ اس رقم کو انہوں نے بیت المال میں داخل کر دیا تو حضرت عمر نے فرمایا: "خالد! واللہ! آپ میرے نزدیک نہایت ہی معزز شخصیت ہیں۔ میں آپ کو بہت پسند کرتا ہوں اور آج کے بعد آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"
>
> عدی بن سہیل کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے تمام شہر والوں کو لکھ کر بھیجا: "میں نے خالد کو ناراضگی یا بددیانتی کی وجہ سے معزول نہیں کیا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان ان سے محبت کرنے لگے ہیں۔ اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ ان پر بے حد بھروسہ اور اعتماد نہ کریں اور کسی دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس لیے میں نے چاہا کہ انہیں حقیقت معلوم ہو جائے کہ در حقیقت اللہ تعالی ہی کارساز ہے، اس لیے انہیں کسی فتنے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔"[46]

دلچسپ بات ہے کہ یہ روایت بھی سیف بن عمر ہی نے روایت کی ہے اور ان صاحب کی دونوں روایتوں میں تضاد موجود ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دوسری روایت ہی درست ہے۔ اس روایت سے حضرت خالد کی معزولی کی ایک اور وجہ سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض مسلمانوں کے اندر یہ تصور پیدا ہو گیا تھا کہ جو فتوحات ہو رہی ہیں، وہ حضرت خالد کی موجودگی کی وجہ سے ہیں۔ اس طرح سے ان میں شخصیت پرستی پیدا ہو رہی تھی جسے ختم کرنے کے لیے حضرت عمر نے یہ اقدام کیا۔ مسلمان تو مسلمان، دشمن افواج کو بھی جب علم ہوتا کہ کسی فوج میں حضرت خالد موجود ہیں، تو وہ جم کر مقابلہ نہ کرتے اور میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ ایسے میں یہ خدشہ تھا کہ لوگ کہیں شخصیت پرستی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

بہر حال حضرت خالد رضی اللہ عنہ میں ایسی کوئی اخلاقی خرابی نہ تھی جس کی وجہ سے انہیں معزول کرنا پڑا۔ یہ محض ان کی خطرات مول

---

[46] ایضاً۔ 17H/3/1-79

لینے کی عادت اور مسلمانوں میں پیدا ہونے والی شخصیت پرستی تھی، جس کے باعث انہیں فوجی ذمہ داریوں سے الگ کر کے دیگر ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ حضرت خالد اور عمر رضی اللہ عنہما کے باہمی تعلقات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 21/643 میں اپنی وفات کے وقت حضرت خالد نے حضرت عمر کو اپنی مال و دولت کا نگران مقرر کیا کہ وہ اسے مناسب انداز میں تقسیم کریں۔[47]

حضرت عمر سختی کیوں کرتے تھے؟

راویوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایسا امپریشن بنانے کی کوشش کی ہے کہ آپ بہت سخت مزاج تھے۔ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے اور سامنے والی کی بے عزتی کر کے رکھ دیتے یا اسے کوڑوں سے پیٹ ڈالتے۔ یہ ایک بالکل ہی غلط امپریشن ہے۔ ایسا تو ضرور ہے کہ آپ اللہ تعالی کے احکام کو نافذ کرنے میں حد درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس معاملے میں کسی شخص کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرتے تھے۔ آپ اس معاملے میں بہت سختی کرتے تھے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ لیکن آپ نہایت نرم دل انسان تھے۔ اس کا اندازہ ان مثالوں سے ہو سکتا ہے جو تاریخ کی متعدد کتب میں بیان ہوئی ہیں۔

1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا کہ خواتین کا حق مہر بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ اس کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کی جائے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے جمعہ کے خطبہ میں کیا تو ایک خاتون نے اس پر کڑی تنقید کی کہ جس چیز کی حد اللہ تعالی نے مقرر کی ہے، آپ اس کی حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ حضرت عمر نے فرمایا: عمر نے غلطی کی اور خاتون نے صحیح بات کی۔

2۔ مشہور واقعہ ہے کہ مال غنیمت میں سے سب کو ایک ایک چادر ملی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ طویل القامت تھے اور آپ کا لباس دو چادروں سے بنا۔ بھرے مجمع میں ایک شخص نے حساب طلب کیا کہ یہ دو چادریں آپ کے پاس کہاں سے آئیں؟ آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اشارہ کیا تو انہوں نے وضاحت کی کہ میں نے اپنے حصے کی چادر والد صاحب کو دے دی ہے۔

3۔ قحط کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزیدار کھانوں کا استعمال بالکل ترک کر دیا اور پیٹ بھر کر کھانا چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عوام بھوکے مریں اور عمر پیٹ بھر کر کھانا کھائے۔

4۔ ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب نے حضرت سلمان فارسی سے پوچھا: میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ انھوں نے جواب دیا: اگر آپ نے مسلمانوں کے محصولات میں سے ایک درہم بھی ناحق استعمال کر لیا تو خلیفہ نہیں بادشاہ سمجھے جائیں گے۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے یہی سوال پھر اور لوگوں کے سامنے رکھا تو جواب آیا کہ خلیفہ صرف حق سے لیتا ہے اور حق ہی سے دیتا ہے، آپ کی مثال بھی یہی ہے۔ بادشاہوں کی مثال اس کے برعکس ہے، وہ ظلم و جور کر کے مال حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح خرچ کر دیتے ہیں۔

---

[47] ابن حجر عسقلانی۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ۔ باب خالد بن ولید، صحابی نمبر 2210۔ 3/178۔ قاہرہ: مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیہ والاسلامیہ۔ www.waqfeya.com (7 Jan 2012)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سختی عام آدمی کے لیے نہ تھی بلکہ اپنے قریبی ساتھیوں اور بالخصوص گورنروں کے لیے تھی۔ آپ یہ ہرگز برداشت نہ کرتے تھے کہ کوئی سرکاری اہل کار کسی عام آدمی پر ظلم کرے۔

حضرت عمر کے دور میں کوئی بغاوت یا فتنہ کیوں پیدا نہیں ہوا؟

یہ بات درست نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوا کیونکہ انسانی تاریخ کا کوئی دور بھی بغاوتوں اور فتنوں سے خالی نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایرانیوں کو شکست ہوئی تھی اور عراق و ایران کے ملک ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ آخری ساسانی بادشاہ یزد گرد (r. 10-30/631-651) ابھی زندہ تھا اور وہ ایران کے مختلف علاقوں میں بغاوتوں کو شہ دیتا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایران میں کئی بغاوتیں اٹھیں جنہیں مقامی گورنروں نے بآسانی فرو کر دیا۔ یہ درست ہے کہ حضرت عمر کے دور میں عرب میں کوئی فتنہ یا بغاوت نہیں اٹھی۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں:

1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالی نے حسن انتظام کی بہترین صلاحیت عطا کی تھی۔ آپ ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام دیا کرتے تھے۔ آپ نے مختلف عرب قبائل کے بہترین لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق کسی نہ کسی کام میں مشغول کر دیا۔ ایران اور شام کی فتح اور اس کے بعد ان ملکوں کا انتظام پہاڑ جیسا کام تھا۔ جب لوگوں کو کسی مثبت کام میں مشغول کر دیا جائے تو وہ منفی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دور میں عرب ان کاموں میں مصروف رہے۔

2۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالی نے ایسے ساتھی دیے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ حضرات نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ آپ کے شانہ بشانہ کام کرتے۔ کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ پہلے خلفاء کی نسبت آپ کے دور میں فتنے زیادہ کیوں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ ہم جیسوں پر حکومت کرتے تھے اور میں تم جیسوں پر حکومت کرتا ہوں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی مثال سب کے سامنے ہے کہ ان کے درجے کے سپہ سالار کو جب معزول کیا گیا تو انہوں نے کسی بغاوت کا عزم نہیں کیا۔

3۔ باغی تحریکوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں شکست کھا کر یہ عموماً ختم نہیں ہوتیں بلکہ کچھ عرصے کے لیے زیر زمین چلی جاتی ہیں۔ کچھ عرصے میں یہ دوبارہ تیاری کر کے پھر نمودار ہوتی ہیں۔ یہ باغی اور مفسد عناصر ہر دور میں موجود رہتے ہیں اور کبھی ختم نہیں ہوتے۔ عربوں کے مفسد عناصر ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک بڑی بغاوت پیدا کر چکے تھے۔ اب اگلی بغاوت کی تیاری کے لیے انہیں وقت درکار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت عمر کے دس سالہ دور اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور کے پہلے دس برس تک تیاری کرتے رہے۔ بیس سال کی تیاری کے بعد وہ یکایک دور عثمانی کے آخر میں نمودار ہوئے اور پھر انہوں نے پانچ سال تک فتنہ و فساد برپا کیے رکھا۔

کیا حضرت عمر کی شہادت کسی عجمی سازش کا نتیجہ تھی؟

حضرت عمر کی شہادت کا واقعہ یوں ہے کہ ابو لؤلؤ فیروز حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا غلام تھا۔ یہ کاریگر آدمی تھا اور بہت سے ہنر جانتا تھا۔ بڑھئی اور لوہار کے کام کے علاوہ یہ چکیاں بنانے کا ماہر بھی تھا۔ حضرت مغیرہ نے اسے کام کے لیے آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ اپنا کام کر کے ایک طے شدہ رقم یہ حضرت مغیرہ کو دے دیتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ حضرت عمر سے شکایت کی کہ اس پر خراج زیادہ ہے۔ آپ نے خراج کی رقم پوچھی تو یہ نہایت معمولی رقم تھی جو کہ دو یا چار درہم روزانہ تھی جو کہ فیروز کی کاریگری کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ اگلے روز اس نے آپ پر حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کئی صحابہ کو زخمی کیا اور بالآخر خود کشی کر کے مر گیا۔ اس وجہ سے صحیح طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے قتل اپنی مرضی سے کیا ہے یا اس کے پیچھے کوئی سازش تھی۔

اس واقعے کی توجیہ میں دو تھیوریز پیش کی گئی ہیں۔ پہلی تھیوری یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت فیروز کے وقتی اشتعال کا نتیجہ تھی اور اس کے پیچھے کوئی گہری سازش نہیں تھی۔ دوسری تھیوری یہ ہے کہ آپ کی شہادت ایک گہری ایرانی سازش کا نتیجہ تھی۔ مشہور ایرانی سپہ سالار ہرمزان (d. 23/645) اس وقت اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ میں مقیم تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنگی منصوبوں میں اس سے رائے بھی لیا کرتے تھے۔ ہرمزان کی فوج کو مسلمانوں نے پے در پے شکست دی تھی جس کی وجہ سے اسے شدید رنج تھا۔ اس نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مدینہ میں رہائش اختیار کر لی۔ پھر جب موقع ملا تو فیروز کو ساتھ ملا کر اسے آپ کے قتل پر آمادہ کر دیا۔

یہ دونوں توجیہات محض تھیوریز ہی ہیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس کے ذریعے کسی ایک کی تصدیق کی جا سکے۔ ہرمزان کے بارے میں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کے واقعہ سے ایک آدھ دن پہلے اس کے اور فیروز کے درمیان خفیہ بات انداز میں بات چیت ہوئی تھی اور اس میں آلہ قتل، یہ ایک دو منہ والا خنجر تھا، فیروز کے ہاتھ سے پھسل کر گر گیا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ انہوں نے یہ بات حضرت عمر کی شہادت کے بعد سب کو بتائی۔ یہ سن کر عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو شدید غصہ آیا اور انہوں نے جا کر ہرمزان کو قتل کر دیا۔

اس طرح سے اس واقعے کی تحقیقات کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فیروز نے ہرمزان سے اتفاقاً ہی ملاقات کی تھی۔ ہرمزان ایک سچا مسلمان تھا اور اس نے ایسے ہی یہ خنجر فیروز کو دے دیا تھا۔ بعض لوگ نظریہ سازش پر یقین رکھتے ہیں۔ اس واقعے میں کعب الاحبار کا نام بھی لیا جاتا ہے جو کہ ایک سابقہ یہودی عالم تھے اور اسلام قبول کر کے مدینہ میں مقیم تھے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تین دن پہلے انہیں آپ کی شہادت سے خبر دار کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کم از کم اس سازش سے باخبر ضرور تھے۔ بعد میں کسی نے ان سے تفتیش نہیں کی۔ نظریہ سازش کے بعض علمبردار کعب الاحبار پر بھی اس سازش میں شرکت کا الزام لگاتے ہیں لیکن یہ محض بدگمانی ہے۔ روایات سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فیروز کے منصوبے سے

واقف تھے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہلے سے خبر دار کر دیا تھا تاکہ آپ اپنا بچاؤ کر لیں۔ ہمیں کعب الاحبار اور ہرمزان دونوں کے بارے میں ہرگز بدگمانی نہیں کرنی چاہیے کہ دلوں کا حال ہم نہیں جان سکتے ہیں۔

عبید اللہ بن عمر نے ہرمزان کو شدید اشتعال میں قتل کیا تھا اور وہ ایسا کرتے وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفہ مقرر ہونے کے بعد نے عبید اللہ کو ہرمزان کے بیٹے قماذبان کے حوالے کر دیا کہ وہ اپنے والد کا قصاص لے لیں لیکن انہوں نے عبید اللہ کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد حکومت کی جانب سے ایک جیوری مقرر ہوئی جس نے عبید اللہ پر قصاص کی بجائے دیت کی سزا عائد کی۔ حضرت عثمان نے اپنی جیب خاص سے ہرمزان کی دیت ادا کر دی۔

بارہ سال بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب باغیوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے اس مقدمے کو دوبارہ کھولا اور عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو قتل کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان باغیوں کو ہرمزان سے خاص ہمدردی تھی۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے ایسا کر کے اپنے ایرانی ساتھیوں کے جذبات کی تسکین کرنا چاہی ہو۔ تاہم یہ سب قیاس آرائیاں ہی ہیں، قماذبان کی روایت سے اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ ہرمزان بے گناہ تھے اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ قتل سے ایک دن پہلے فیروزان سے گپ شپ لگا رہا تھا۔ ہمیں بھی ان کے بارے میں حسن ظن سے کام لینا چاہیے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ موجودہ دور کے بعض قوم پرست ایرانی اس نظریہ سازش کو قبول کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ چونکہ عربوں نے ایرانیوں کو شکست دے کر ان کی قومی توہین کی تھی، اس وجہ سے ایرانی اس بات میں حق بجانب تھے کہ وہ اپنا انتقام لیتے۔ فیروز نے حضرت عمر کو شہید کر کے ایرانیوں کی طرف سے یہ فریضہ انجام دے دیا۔ جب سولہویں صدی عیسوی میں ایران میں صفوی خاندان کو غلبہ نصیب ہوا تو یہاں کے شہر کاشان میں فیروز کا ایک شاندار مزار تعمیر کیا گیا اور اسے قومی ہیرو کو درجہ دے دیا گیا۔ موجودہ دور میں دیگر مسلم حکومتوں نے اس مقبرے کو گرانے کا مطالبہ کیا تو ایران میں اس کے خلاف شدید مظاہرے ہوئے۔ محمد علی ای، جو کہ ایرانی ورثے کی حفاظت میں شامل تحریک کا حصہ ہیں، نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا، جس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

> فیروزان کا مقبرہ جو کہ امام ابولؤلؤ کہلاتے ہیں، صوبہ اصفہان کے شہر کاشان میں ہے اور اس وقت زائرین کے لیے بند کیا جا رہا ہے۔ یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ اس مقبرے کو اسلامی حکومت توڑنے کا حکم دے رہی ہے۔
>
> ایرانیوں کا ایک بڑا مجمع منگل، 26 جون (2007) کو گورنر کے دفتر کے باہر اکٹھا ہوا اور اس نے ایرانی ورثے اور ایک ایسے مزار کی ممکنہ تباہی اور بندش کے خلاف آواز اٹھائی جو کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب حملہ آوروں کے خلاف ایرانی جدوجہد کی علامت ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ [فیروز] ایک قابل احترام صوفی اور شیعہ تھے۔ عمر بن خطاب، مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ 645 میں فیروز کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے ۔۔۔۔" فیروزان کا یہ عمل اس ظلم کے خلاف رد عمل تھا جو عرب مسلمان حملہ آوروں نے ایران میں کیے تھے اور جس کے نتیجے میں ہمارے ملک میں قتل عام، ریپ اور لوٹ مار کے واقعات ہوئے۔ ہم ایرانی اپنے خلاف ہونے والے جرائم کو نہ تو کبھی معاف کریں گے اور نہ ہی بھولیں

گے۔" ایک احتجاج کرنے والے نے کہا۔

بعض عرب اور مسلمان تاریخ دان، فیروزان کی بہادری اور ہیرو ازم پر پردہ ڈالنے کے لیے دعوی کرتے ہیں (جو کہ ابن شہاب کی بیان کردہ روایت ہے کہ) فیروزان نے عمر کو جزیہ پر بحث کرنے کی وجہ سے قتل کیا تھا۔ صفوی دور حکومت میں جب شیعہ مسلمان اقتدار میں آئے، تو اس خاندان نے انہیں [فیروزان کو] باباشجاع الدین (مذہب کے لیے بہادری کا مظاہرہ کرنے والا) کا لقب دیا اور یہ دعوی کیا کہ وہ ایک پکے شیعہ اور شہید تھے۔

ایک اور احتجاج کرنے والے نے غصے میں کہا: "وہ کہتے ہیں کہ وہ یہاں دفن نہیں ہے۔۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہی نہیں تھے۔۔۔ تو پھر کیا ہوا؟ کچھ بھی ہے، یہ مقبرہ ان کی علامت ہے، یہ ہمارے مذہب اور غیر مہذب حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد کی علامت ہے۔" ایک اور احتجاج کرنے والے نے اضافہ کیا: "اگر ابو لؤلؤ کوئی عرب ہوتا تو وہ اسے گرانے کی بجائے اس کے مزار پر سونے کا گنبد بنواتے۔ لیکن نہیں، نہیں۔۔۔ وہ اس مقبرے کو گرانا چاہتے ہیں، محض اس وجہ سے کہ وہ ایک ایرانی تھا۔ ایک معزز ایرانی۔ یہ ایرانی قوم کی توہین ہے۔"۔۔۔

فیروزان کا مقبرہ کاشان نے فنس جانے والی سڑک پر ہے۔ اسے گیارہویں صدی میں تعمیر کیا گیا اور اس کا آرکی ٹیکچر ایرانی اور خوارزمی شاہی خاندانوں کے طرز تعمیر کا ہے۔ اس میں ایک صحن، ایک پورچ اور مخروطی گنبد ہے جس پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلیں لگی ہیں اور اس کی چھت پر پینٹ کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کی اصل تاریخ نامعلوم ہے لیکن چودھویں صدی کے نصف آخر میں اسے بھرپور انداز میں بنایا گیا اور اس کی قبر کے اوپر ایک نیا پتھر نصب کیا گیا۔[48]

حضرات ابو بکر و عمر کے دور میں حضرت علی کا کردار کیا تھا؟

حضرت علی، حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم کے دور میں مرکزی کابینہ کے رکن تھے۔ اس کابینہ میں ان کے علاوہ حضرت عثمان، عبدالرحمن بن عوف، طلحہ، زبیر، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔[49] تمام معاملات مشورے سے طے کیے جاتے تھے جس میں حضرت علی پوری دیانتداری سے شریک ہوتے اور ان کے مشورے کو بے پناہ اہمیت دی جاتی۔ یہاں ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں:

1۔ مرتدین کے خلاف جنگ کے لیے صدیق اکبر بذات خود نکلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہما نے انہیں یہ کہہ کر روکا: ''اے خلیفہ رسول اللہ! آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟ اب میں آپ کو وہی بات کہوں گا جو احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو فرمائی تھی۔ اپنی تلوار نیام میں رکھیے اور اپنی ذات کے متعلق ہمیں پریشانی میں مبتلا نہ کیجیے۔ اللہ کی قسم! اگر آپ کے ذات کے سبب

[48] The Circle of Ancient Iranian Studies (CAIS), http://www.cais-soas.com/News/2007/June2007/28-06.htm, accessed 12 Sep 2011

[49] ابن سعد۔ 2/302۔ باب اہل العلم والفتوی من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہمیں کوئی مصیبت پہنچی تو آپ کے بعد اسلام کا یہ نظام درست نہ رہ سکے گا۔"[50]

2۔ غزوہ روم کے موقع پر حضرت علی مشورہ میں شریک ہوئے اور بہترین رائے دی جسے حضرت ابو بکر نے پسند کیا۔

3۔ مرتدین کی جانب سے مدینہ پر حملے کا خطرہ ہوا تو حضرت ابو بکر نے مدینہ آنے والے راستوں پر لشکر مقرر کیے جن کے سربراہ حضرت علی، زبیر، طلحہ اور عبداللہ بن مسعود تھے۔ رضی اللہ عنہم۔[51]

4۔ حضرت علی، عہد فاروقی میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز رہے۔[52]

6۔ حضرت عمر نے ارادہ کیا کہ ایران کی جنگوں میں وہ خود قیادت کریں۔ حضرت علی نے انہیں منع کیا اور کہا: " ملک میں نگران کی منزل مہروں کے اجتماع [تسبیح] میں دھاگے کی ہوتی ہے کہ وہی سب کو جمع کیے رہتا ہے اور وہ اگر ٹوٹ جائے تو سارا سلسلہ بکھر جاتا ہے اور پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتا ہے۔ آج عرب اگرچہ قلیل ہیں لیکن اسلام کی بنا پر کثیر ہیں اور اپنے اتحاد و اتفاق کی بنا پر غالب آنے والے ہیں۔ لہذا آپ مرکز میں رہیں اور اس چکی کو انہی کے ذریعہ گردش دیں اور جنگ کی آگ کا مقابلہ انہی کو کرنے دیں۔ آپ زحمت نہ کریں کہ اگر آپ نے اس سرزمین کو چھوڑ دیا تو عرب چاروں طرف سے ٹوٹ پڑیں گے اور سب اس طرح شریک جنگ ہو جائیں گے کہ جن محفوظ مقامات کو آپ چھوڑ کر گئے ہیں ، ان کا مسئلہ جنگ سے زیادہ اہم ہو جائے گا۔ ان عجمیوں نے اگر آپ کو میدان جنگ میں دیکھ لیا تو کہیں گے کہ عربیت کی جان یہی ہے۔ اس جڑ کو کاٹ دیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راحت مل جائے گی اور اس طرح ان کے حملے شدید تر ہو جائیں گے اور وہ آپ میں زیادہ ہی طمع کریں گے۔۔"[53]

7۔ حضرت عمر نے دو مرتبہ شام کا سفر کیا تو دونوں مرتبہ قائم مقام خلیفہ حضرت علی کو بنا کر گئے۔[54]

کتب حدیث و آثار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بے شمار مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلے دونوں خلفاء کے دور میں پوری طرح ان کا ساتھ دیا اور حکومتی معاملات میں شریک رہے۔ اگلے باب میں ہم بیان کریں گے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں تو آپ نائب خلیفہ تھے۔

---

[50] ابن کثیر۔11H/9/446۔ بحوالہ دار قطنی۔ ابن عساکر30/316۔ بیروت: دار الفکر۔

[51] طبری۔11H/2/2-54

[52] ابن سعد۔2/93۔ باب علی بن ابی طالب۔ ابن کثیر۔13H/9/602۔

[53] سید شریف رضی۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ نمبر146۔ طبری۔21H/3/1-139

[54] ابن کثیر۔9/656۔ طبری۔17H/3/1-75

خلاصہ باب

- حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام مہاجرین و انصار بشمول حضرت علی، زبیر اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم کا اتفاق تھا۔
- قبائلی چپقلش کے باعث فتنہ ارتداد پیدا ہوا لیکن صحابہ کرام نے یکجہتی کے ساتھ اسے ختم کر دیا۔
- حضرت عمر کو باہمی مشورے کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما نے نامزد کیا۔
- حضرت عمر نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کو ان کی خطرات مول لینے کی عادت اور مسلمانوں میں پیدا ہونے والی شخصیت پرستی کے سبب معزول کیا۔ ان دونوں بزرگوں میں بہترین تعلقات رہے اور خالد نے اپنی جائیداد بھی حضرت عمر کے ذریعے ہی تقسیم کروائی۔
- حضرت عمر کی شہادت ایک ایرانی کے جوش انتقام کا نتیجہ تھی تاہم اس سلسلے میں کسی نظریہ سازش کے لیے کچھ زیادہ ثبوت موجود نہیں ہیں۔

اسائن منٹس

ا۔ دنیا کے مختلف سیاسی نظاموں کا ایک چارٹ تیار کیجیے اور یہ بتائیے کہ کس نظام کی کون سی خصوصیت خلافت راشدہ سے مطابقت رکھتی ہے اور کون سی خصوصیت اس کے خلاف ہے؟

۲۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بعض عرب قبائل نے بغاوت کیوں کی؟ اس کے قبائلی، مذہبی، سیاسی، عمرانی اور معاشی اسباب کی ایک فہرست تیار کیجیے۔

۳۔ حضرت علی اور ابو بکر رضی اللہ عنہما کی بیعت کے معاملے میں روایات کے تین گروپ کون سے ہیں؟ آپ کے خیال میں ان میں سے کون سا گروپ حقیقت کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے؟

۴۔ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں انصار مدینہ کے کردار پر ایک نوٹ لکھیے اور یہ بتائیے کہ ان کا جو کردار سقیفہ بنو ساعدہ کی روایات میں بیان کیا گیا ہے، کیا وہ ان کے مجموعی کردار سے مطابقت رکھتا ہے؟

۵۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں فتنہ و فساد کیوں پیدا نہیں ہوا؟ اس کے عمرانی (Sociological) اسباب کو نکات کی صورت میں بیان کیجیے۔

باب 4: عہد عثمانی

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے بارے میں یہ جان سکیں کہ:

- تیسرے خلیفہ راشد کا انتخاب کیسے ہوا؟
- حضرت عثمان کے خلاف باغی تحریک پیدا ہونے کے اسباب کیا تھے؟ اس تحریک نے عالم اسلام پر کیا اثرات مرتب کیے؟
- حضرت عثمان کو کیسے شہید کیا گیا اور ان کے دفاع میں دیگر صحابہ کا کردار کیا تھا؟
- باغیوں نے حضرت عثمان پر کیا الزامات لگائے اور تاریخی روایات کی روشنی میں ان کا جواب کیا ہے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ عہد عثمانی سے متعلق اہم تاریخی سوالات کے جواب دے سکیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد ہوئے۔ آپ کے دور کا زیادہ تر حصہ نہایت خوشحالی کا دور تھا اور اس سے متعلق کوئی خاص تاریخی سوالات موجود نہیں ہیں۔ صرف آپ کے انتخاب سے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے یا پھر آپ کے آخری ایام میں زبردست باغی تحریک اٹھی جس کے نتیجے میں آپ شہید ہوئے۔ اس تحریک کے زیر اثر بعض الزامات آپ پر عائد کیے گئے جن کا جائزہ ہم اس باب میں لیں گے۔

تیسرے خلیفہ کا انتخاب

جیسا کہ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے کچھ پہلے چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی تھی جس کے ذمے خلیفہ کا انتخاب تھا۔ انتخاب کے وقت عشرہ مبشرہ کے تین صحابہ ابو بکر، عمر اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم وفات پا چکے تھے جبکہ سات ابھی باقی تھے۔ ان میں سے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ چونکہ حضرت عمر کے بہنوئی اور قریبی رشتہ دار تھے اور خلافت کے امور میں دلچسپی بھی نہ رکھتے تھے، اس وجہ سے آپ نے انہیں اس کمیٹی میں شامل نہ کیا بلکہ بقیہ چھ صحابہ علی، عثمان، عبدالرحمن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو اس کمیٹی میں شامل کیا۔ اس میں بطور مبصر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو شامل کیا گیا لیکن وہ خلیفہ کے انتخاب میں ووٹ نہیں دے سکتے تھے۔ ہاں انہیں یہ اجازت ضرور تھی کہ اگر دو افراد کے حق میں تین تین ووٹ آ جائیں تو وہ اس جانب ووٹ دیں گے، جس میں عبدالرحمن رضی اللہ عنہ شریک ہوں گے۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر جانتے تھے کہ عبدالرحمن خلافت کے امیدوار نہیں ہیں اور اس معاملے میں کسی شخص کے حق میں جانبدار بھی نہیں ہیں۔ اس معاملے میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

خلیفہ کے انتخاب کو چھ افراد کے سپرد کرنا کیا شوری کے اصول کی خلاف ورزی تھی؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے انتخاب کو چھ افراد ہی میں کیوں رکھا؟ کیا یہ شوری کے اصول کی خلاف ورزی نہ تھی؟ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی یہ طے ہو چکا تھا کہ خلیفہ قریش میں سے ہو گا کیونکہ عرب قبائل ان کے سوا کسی اور قبیلے کے شخص کو بطور خلیفہ قبول نہ کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت بھی یہی صورتحال باقی تھی۔ اب قریش کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنے اندر سے کس شخص کو خلیفہ کے طور پر منتخب کرتے۔ یہ بالکل ایسا ہی معاملہ تھا جیسے ہمارے دور میں اگر ایک پارٹی کی حکومت ہو اور سربراہ حکومت وفات پا جائے تو دوبارہ انتخابات کی بجائے پارلیمنٹ نئے سربراہ کا انتخاب کر لیتی ہے۔ قریش کی حکومت کو سبھی عرب تسلیم کرتے تھے اور اب مہاجرین ہی نے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنے میں سے کسے خلیفہ منتخب کرتے ہیں۔

اس انتخاب کا معیار (Criteria) دینی خدمات تھیں۔ ان خدمات میں وہی صحابی ممتاز تھے، جنہوں نے بالکل شروع سے اسلام کے لیے

قربانیاں دی تھیں اور جو "السابقون الاولون" کہلاتے تھے۔ ان سابقون الاولون میں عشرہ مبشرہ کے صحابہ کو غیر معمولی مقام حاصل تھا جن میں سے سات صحابہ اس وقت زندہ تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پورے زمانے میں اپنی جانشینی کے معاملے میں متردد رہے تھے۔ ان کی نظر میں دو صحابہ ایسے تھے جو اگر خلیفہ بنتے تو کسی کو اختلاف نہ ہوتا۔ ان میں سے ایک حضرت ابوعبیدہ تھے اور دوسرے ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہم۔ لیکن یہ دونوں حضرات، حضرت عمر سے بھی پہلے شہید ہو چکے تھے۔ آپ نے طویل عرصے تک غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خلافت کے معاملے میں اگر لوگوں میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے تو وہ صرف انہی چھ افراد کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی ایسا ساتواں شخص نہیں ہے جسے لوگ خلیفہ بنانا چاہیں۔[1] یہی وجہ ہے کہ آپ نے انہی چھ افراد کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا کہ وہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔

شوریٰ نے خلیفہ کا انتخاب کیسے کیا؟

چھ صحابہ کی اس کمیٹی نے شورائی انداز میں کام کیا اور ایسے کردار کا مظاہرہ کیا جو ان کے شایان شان تھا۔ حضرت طلحہ اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے۔ ان کا تین دن انتظار کیا گیا مگر وہ نہ آئے اور جب آئے تو انہوں نے خوشدلی سے حضرت عثمان کو بطور خلیفہ قبول کر لیا۔ بعض روایات کے مطابق وہ آ گئے تھے اور حضرت عثمان کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔ حضرت زبیر، سعد اور عبدالرحمن دستبردار ہو گئے۔ ان صحابہ کا کردار اس معاملے میں غیر معمولی تھا کہ چار صحابہ تو خود ہی دستبردار ہو گئے جس سے ان کی بے غرضی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عثمان سے پوچھا گیا کہ آپ خلیفہ نہ بنیں تو کسے بنایا جائے تو انہوں نے حضرت علی کا نام لیا۔ یہی سوال حضرت علی سے کیا گیا تو انہوں نے حضرت عثمان کا نام لیا۔ حضرت عثمان اور علی نے متفقہ طور پر حضرت عبدالرحمن کو اجازت دی کہ وہ عوام الناس کی رائے معلوم کریں۔ انہوں نے مدینہ کے ہر ہر شخص کے علاوہ حج سے واپس آنے والے دیگر قبائل کے لوگوں کی رائے معلوم کی۔ اکثریت کی رائے حضرت عثمان کے حق میں تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ یہ تفصیل صحیح بخاری کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ روایت حضرت مسور بن مخرمہ کی بیان کردہ ہے جن کی ذاتی رائے یہ تھی کہ خلیفہ حضرت علی کو ہونا چاہیے۔ رضی اللہ عنہم۔

حدثنا عبد الله بن محمد بن أسماء: حدثنا جويرية، عن مالك، عن الزُهريّ: أنَّ حميد بن عبد الرحمن أخبره: أنَّ المسور بن مخرمة أخبره: مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وہ (چھ) افراد جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا اختیار دیا تھا، جمع ہوئے اور انہوں نے مشورہ کیا۔ عبدالرحمن (بن عوف) نے ان سے کہا: "اس معاملے میں میں آپ سے تنازعہ نہیں کروں گا (یعنی میں خلیفہ نہیں بنوں گا۔) اگر آپ چاہیں تو آپ ہی میں سے کسی کو آپ کا خلیفہ منتخب کر دوں۔" چنانچہ ان لوگوں نے یہ معاملہ عبدالرحمن پر چھوڑ دیا۔ جب ان

[1] طبری۔ 23H/3/1-254

لوگوں نے عبدالرحمن کو ذمہ داری دی تو بقیہ لوگوں میں سے کسی کے پاس ایک آدمی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ عبدالرحمن لوگوں سے ان راتوں میں مشورہ کرتے رہے حتی کہ وہ رات آگئی جس کی صبح ہم نے عثمان کی بیعت کی تھی۔

مسور بیان کرتے ہیں کہ تھوڑی رات گزر جانے کے بعد عبدالرحمن نے میرا دروازہ اس زور سے کھٹکھٹایا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے کہا: "آپ سو رہے ہیں جبکہ واللہ! ان راتوں میں میری آنکھ بھی نہیں لگی۔ آپ جائیے اور زبیر اور سعد کو میرے پاس بلا لائیے۔" میں ان دونوں کو بلا لایا۔ پھر انہوں نے کہا: "علی کو بلا لائیے۔" میں انہیں بھی بلا لایا۔ وہ بہت رات گئے تک ان سے مشورہ کرتے رہے۔ پھر علی کے پاس سے اٹھے تو ان کے دل میں خلافت کی خواہش تھی۔ عبدالرحمن کو خدشہ تھا کہ اگر علی خلیفہ بنے تو اس سے امت میں اختلاف پڑ جائے گا (کیونکہ اکثریت عثمان کے حق میں تھی۔) پھر عبدالرحمن نے کہا: "عثمان کو بلا لائیے۔" اس کے بعد وہ ان سے مشورہ کرتے رہے یہاں تک کہ صبح کی اذان ہو گئی۔

جب انہوں نے لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی تو یہ لوگ منبر کے پاس جمع ہوئے۔ یہاں مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ موجود تھے، آپ نے انہیں بلوایا اور سردار لشکر کو بھی بلوایا۔ یہ سب لوگ وہ تھے جو حضرت عمر کے ساتھ حج میں شریک ہوئے تھے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو عبدالرحمن نے ایک خطبہ دیا اور کہا: "اما بعد۔ علی! میں نے لوگوں کے حالات پر غور کیا ہے تو دیکھا ہے کہ **وہ عثمان کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے ہیں**۔ اس لیے آپ اپنے دل میں میری طرف سے کچھ خیال نہ کیجیے گا۔" علی نے عثمان سے کہا: "میں اللہ اور اس کے رسول اور آپ کے دونوں خلفاء کی سنت پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔" عبدالرحمن نے بھی بیعت کی اور پھر تمام لوگوں، جن میں مہاجرین و انصار، سرداران لشکر اور عام مسلمان تھے، نے بیعت کی۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)[2]

خلیفہ کے انتخاب میں حضرت علی کا کردار کیا تھا؟

صحیح بخاری کی اوپر بیان کردہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں اگرچہ یہ خواہش موجود تھی کہ وہ خلیفہ بنیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اکثریت کا احترام کرتے ہوئے برضا و رغبت سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اس سے آپ کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ملت اسلامیہ کے مفاد کو ذاتی خواہش پر ہر حال میں ترجیح دینے والے تھے۔ قوم کی خدمت کے لیے خلافت کی خواہش کرنا کوئی بری بات نہیں ہے لیکن اس کے لیے فتنہ و فساد برپا کرنا ایک برا عمل ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ میں ایسی کسی بات کا شائبہ بھی نہ پایا جاتا تھا بلکہ انہوں نے نہایت ہی بے غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوشدلی کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔

بخاری کی اس روایت کی روشنی میں دیکھا جائے تو کتب تاریخ میں جو بعض سازشانہ روایات موجود ہیں، ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی ہے۔ اس کے بعد عہد عثمانی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کردار ادا کیا، اس سے بھی صحیح بخاری کی اسی روایت کی تائید ہوتی ہے۔

[2] بخاری۔ کتاب الاحکام۔ حدیث 6781

آپ مسلسل بارہ برس حضرت عثمان کے دست راست بن کر رہے اور عملاً آپ ہی نائب خلیفہ تھے۔ حضرت عثمان کو شہید کرنے کے لیے جب باغی آئے تو یہ حضرت علی ہی تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر ان باغیوں کو واپس کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں ایسا کوئی لالچ نہ تھا، جس کے سبب آپ مسلمانوں میں رخنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

کتب تاریخ کی روایات

اگر آپ نے اب تک پہلے دو ابواب کا مطالعہ نہیں کیا تو پہلے ان کا مطالعہ کر لیجیے کیونکہ ان میں تاریخی روایات کی چھان بین کا پروسیجر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس پروسیجر کا اطلاق ہم یہاں کر رہے ہیں۔ شوری کے اس واقعے کی کل 32 روایات ہمیں طبری، بلاذری اور ابن سعد کی کتابوں سے مل سکی ہیں۔ ان میں سے طبری نے 3، بلاذری نے 20 اور ابن سعد نے 9 روایات بیان کی ہیں۔ ان تینوں کی متعدد روایات مشترک ہیں۔ روایات کے تجزیے کو ہم نے جدول میں بیان کیا ہے:

تاریخ کی کتاب	شوری سے متعلق کل روایات	ناقابل اعتماد روایات کی تعداد	ناقابل اعتماد راویوں کے نام اور ان کی بیان کردہ روایات	بقیہ روایات
ابن سعد (168-230/784-845)	9	8	محمد بن عمر الواقدی: 8 روایتیں	1
بلاذری (d. 279/893)	20	16	واقدی: 10 روایتیں۔ ابو مخنف: 4۔ عباس بن ہشام کلبی: 1۔ عبید اللہ بن موسی: 1	4
طبری (224-310/838-922)	3	1	ابو مخنف: 1	2
مجموعہ	**32**	**25**	**25**	**7**

اس طرح سے واقعہ شوری کی 32 تاریخی روایتوں میں سے صرف 7 ایسی ہیں جو ابو مخنف، واقدی اور ہشام کلبی سے ہٹ کر بیان ہوئی ہیں جبکہ بقیہ 25 روایتیں انہی حضرات کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں۔

اب ہم ان تینوں کتب میں بیان کردہ روایات کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہیں اور اس کا آغاز طبری سے کرتے ہیں کیونکہ سب سے زیادہ تفصیل سے انہوں ہی نے اس واقعے کو بیان کیا ہے۔

طبری کی شوری سے متعلق روایات میں کیا بات بیان ہوئی ہے؟

طبری نے اگرچہ صرف تین روایتیں بیان کی ہیں مگر یہ خاصی طویل اور مفصل ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

1۔ **پہلی روایت** میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زخمی ہونے کا واقعہ ہے اور اس بات کا بیان ہے کہ آپ نے کمیٹی کیسے بنائی اور اپنی شہادت سے پہلے انہیں کیا نصیحتیں کیں۔ اس روایت میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اس کی سند یہ ہے اور اس میں کوئی قابل

اعتراض راوی نہیں ہے: حدثني سلم بن جنادة، قال: حدثنا سليمان بن عبد العزيز بن أبي ثابت بن عبد العزيز بن عمر بن عبد الرحمن بن عوف، قال: حدثنا أبي، عن عبد الله بن جعفر، عن أبيه، عن المسور بن مخرمة.۔

2۔ **دوسری روایت** میں طبری نے خلیفہ کے انتخاب کے پورے واقعے کو تسلسل سے بیان کیا ہے۔ اس میں کمیٹی کے اراکین کے بارے میں زیادہ تر مثبت نوعیت کی تفصیلات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہی بے غرض قسم کے لوگ تھے اور انہوں نے بے غرضی اور غیر جانبداری سے خود میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنالیا۔ البتہ پورے بیان میں بعض جملے ایسے ہیں جس میں حضرت عباس اور عمار رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان کے خلاف سازش کی اور حیلے بہانے سے حضرت علی رضی اللہ عنہما کو مشورہ دیا کہ وہ شوری سے دور رہیں۔ تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی بات نہ مانی۔ جب فیصلہ حضرت عثمان کے حق میں ہو گیا تو حضرت علی کو بڑا افسوس ہوا اور حضرت عباس نے بھی انہیں بے نقط سنائیں۔

طبری نے اس روایت کی دو اسناد دی ہیں۔ انہوں نے اسناد کو شروع میں دے کر پھر پورے واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دونوں کے مضمون کو ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیا ہے۔ سند کچھ یوں ہے: حدثني عمر بن شبة، قال: حدثنا علي بن محمد، عن وكيع، عن الأعمش، عن إبراهيم ومحمد بن عبد الله الأنصاري، عن ابن أبي عروبة، عن قتادة، عن شهر بن حوشب **وأبي مخنف**، عن يوسف بن يزيد، عن عباس بن سهل ومبارك بن فضالة، عن عبيد الله بن عمر ويونس بن أبي إسحاق، عن عمرو بن ميمون الأوديّ.

چونکہ طبری نے ان دونوں اسناد سے بیان کردہ روایات کو مکس کر دیا ہے، اس وجہ سے اس بات کا تعین مشکل ہے کہ روایت میں کون سا جملہ کس راوی کا ہے۔ بہر حال آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سند میں ابو مخنف موجود ہیں۔ جس طرح ان صاحب نے دیگر واقعات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق طرح طرح کے جھوٹ منسوب کیے ہیں، اسی طرح اس روایت میں بھی یہ بات واضح ہے کہ حضرت علی، عباس اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم سے بھی انہوں نے جھوٹ منسوب کیا ہے۔ حضرت علی، عباس اور عمار رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر بزرگوں سے ہمیں ہرگز یہ امید نہیں ہے کہ انہوں نے امت کے اکثریتی فیصلے کو کھلے دل سے تسلیم نہ کیا ہو گا۔ بلاذری کی انساب الاشراف کا جائزہ لیا جائے تو انہوں نے اس واقعے کی اسناد کو الگ الگ بیان کیا ہے اور وہاں یہ صاف نظر آتا ہے کہ جن جن روایتوں میں حضرت علی، عباس اور عمار رضی اللہ عنہم کی طرف منفی نوعیت کے جملے منسوب ہیں، ان سب کی سند میں ابو مخنف یا ہشام کلبی موجود ہیں اور ان پر تبصرہ آگے آ رہا ہے۔ طبری کی دوسری اور نیچے دی گئی تیسری روایت میں موجود مثبت پہلو مشترک ہیں جبکہ منفی پہلو صرف دوسری روایت میں بیان کیے گئے ہیں جس کی سند میں ابو مخنف صاحب موجود ہیں۔

3۔ طبری نے جو تیسری روایت بیان کی ہے، وہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اوپر بیان کردہ صحیح بخاری والی روایت کا تفصیلی ورژن ہے، جس میں انہوں نے گویا ایسا سماں باندھ دیا ہے کہ واقعے کی نہ صرف پوری تصویر سامنے آگئی ہے بلکہ ارکان شوری کے دل کے حالات بھی گویا کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ یہ روایت واقعے کی نہایت ہی دلنواز تصویر پیش کرتی

ہے البتہ اس کے آخر میں کچھ جملے قابل اعتراض ہیں۔ مناسب ہو گا کہ ہم اس روایت کو نقل کر دیں تا کہ صورت واقعہ پوری طرح سامنے آ جائے۔ آپ سے گزارش ہے کہ شوری کے سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے جو بیانات اس روایت میں نقل ہوئے ہیں، ان کا مطالعہ پورے غور سے کیجیے گا:

حدثني سلم بن جنادة أبو السائب، قال: حدثنا سليمان بن عبد العزيز ابن أبي ثابت بن عبد العزيز بن عمر بن عبد الرحمن بن عوف، قال: حدثنا أبي، عن عبد الله بن جعفر، عن أبيه، عن السمور بن مخرمة: مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی میت کو مجلس شوری کے پانچوں اراکین (عثمان، علی، زبیر، سعد اور عبد الرحمن رضی اللہ عنہم) نے قبر میں اتارا۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے تو عبد الرحمن نے کہا: "آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ میرے ساتھ آیئے۔" سب ان کے ساتھ ہو گئے اور وہ انہیں فاطمہ بنت قیس فہریہ کے گھر لے گئے جو ضحاک بن قیس فہری رضی اللہ عنہما کی بہن تھیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ان (عبد الرحمن) کی اہلیہ تھیں اور بہت عقل مند خاتون تھیں۔

وہاں پہنچ کر عبد الرحمن نے گفتگو کا آغاز کیا اور فرمایا: "بھائیو! میری ایک رائے ہے، آپ لوگ اسے غور سے سنیے اور پھر جواب دیجیے۔ آپ سمجھ لیجیے کہ ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ ناخوشگوار میٹھے شربت سے بہتر ہے۔ آپ حضرات (امت کے) لیڈر ہیں جن سے لوگ راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور آپ ایسے اہل علم ہیں جن کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ باہمی اختلاف سے اپنی اس پوزیشن کو خراب نہ کیجیے گا اور نہ ہی دشمن کے مقابلے پر اپنی تلواریں نیام میں رکھیے گا۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، اور ہر قوم کا ایک سربراہ ہوتا ہے جس کے حکم کو سب تسلیم کرتے ہیں اور اس کے منع کرنے سے کسی کام سے باز آ جاتے ہیں۔ آپ اپنی جماعت میں سے کسی ایک کو سربراہ بنا لیجیے تو آپ امن سے رہیں گے اور اندھے فتنے اور پریشان کن گمراہی سے بچے رہیں گے۔ اس طرح آپ بد نظمی اور انارکی سے بچ سکیں گے۔ ذاتی اور نفسانی خواہشات کی پیروی سے بچتے رہیے اور ناانصافی اور تفرقہ بازی کی زبان کبھی استعمال نہ کیجیے کیونکہ زبان کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ رواداری اور کھلے دل سے بات چیت کیجیے اور باہمی رضامندی سے کوئی فیصلہ کیجیے۔ آپ کسی فتنہ پرداز کی باتوں سے متاثر نہ ہوں اور کسی مخلص آدمی کی مخالفت نہ کیجیے۔ میں اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں اور اللہ سے اپنے لیے اور آپ کے لیے بخشش کا طلب گار ہوں۔ (کاش! آج کے مسلمان بھی حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اس نصیحت کو سمجھ سکیں۔)

ان کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بات کی اور فرمایا: "حمد و ثنا اسی ذات کے لیے ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی اور رسول بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے انہیں قریبی اور دور کے رشتہ داروں کے مقابلے میں فتح و نصرت عطا فرمائی۔ اللہ نے ہمیں آپ کا تابع بنایا ہے۔ ہم آپ ہی کے احکام کے ذریعے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور آپ ہمارے لیے نور (ہدایت) ہیں۔ آپس کے اختلاف ہوں یا دشمنوں سے بحث، ہر صورت میں ہم آپ ہی کے احکام کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالی نے ہمیں آپ کے طفیل اور آپ کی اطاعت کی بدولت ہی لیڈر اور حکمران بنایا ہے اور ہمارے معاملات، ہم لوگ ہی طے کرتے ہیں اور سوائے بے وقوفی اور بے اعتدالی کرنے والوں کے اور کوئی اس میں مداخلت نہیں کرتا ہے۔ عبد الرحمن! آپ نے جو بات کہی ہے، اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی اور آپ کی دعوت کو قبول نہ بھی کیا گیا تو میں سب سے پہلے آپ کی بات کو تسلیم کروں گا اور آپ کی دعوت پر لبیک کہوں گا۔ میں جو بات کہتا ہوں، پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں

اور اللہ سے اپنے لیے اور آپ سب کے لیے مغفرت کا طلب گار ہوں۔"

پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بات کی اور فرمایا: "جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے، اس سے کوئی ناواقف نہیں رہ سکتا ہے اور جو شخص باہمی اختلاف اور افتراق کے موقع پر اس دعوت کو قبول کر لے، وہ ہر گز ناکام اور رسوا نہیں ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، اس میں وہی شخص کوتاہی کر سکتا ہے جو راہ حق سے بھٹک جائے۔ جو آپ کی دعوت کو قبول نہ کرے، وہ بدبخت ہے۔ اگر اللہ تعالی کے حدود و فرائض مقرر نہ ہوتے، جن پر عمل کرنا ضروری ہے تو موت، حکومت سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ اس طرح حکومت سے گریز کر کے ہی ایک شخص گناہوں سے بچ سکتا تھا (کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔) لیکن اللہ کی دعوت کو قبول کرنا اور سنت پر عمل کرنا ہمارے لیے ضروری ہے تاکہ ہم (انارکی کا شکار ہو کر) اندھی موت نہ مریں اور عہد جاہلیت کی طرح اندھادھند نہ بھٹکتے پھریں۔ (عبدالرحمن!) میں آپ کی دعوت پر لبیک کہتا ہوں اور اس معاملے میں آپ کا مددگار ہوں۔ اصل قدرت و اختیار تو اللہ تعالی ہی کو حاصل ہے۔ میں بھی اپنے لیے اور آپ سب کے لیے مغفرت کا طالب ہوں۔"

پھر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بات شروع کی: "اول و آخر حمد و ثنا کا مستحق اللہ تعالی ہی ہے۔ میں اس کی حمد و ثنا اس لیے کرتا ہوں کہ اس نے مجھے گمراہی سے نجات دی اور راستہ بھٹکنے سے محفوظ رکھا۔ اللہ کے راستے پر چل کر نجات حاصل کرنے والا کامیاب ہوتا ہے اور اس کی رحمت سے پاکیزہ انسان فلاح و کامرانی حاصل کر سکتا ہے۔ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ نے راہ (ہدایت) روشن کی اور آپ ہی کی بدولت راہیں ہموار ہو گئیں، حق و صداقت کا بول بالا ہوا اور باطل مٹ گیا۔ میرے ساتھیو! دھوکے میں مبتلا لوگوں کی خواہش پرستی اور جھوٹ سے بچتے رہیے کیونکہ اسی قسم کی تمناؤں کی وجہ سے آپ سے پہلے لوگ (بنی اسرائیل) زوال کا شکار ہوئے جو انہی علاقوں (فلسطین و شام) کے وارث تھے، جن پر اب آپ کو اقتدار حاصل ہے۔ جو کچھ آپ حاصل کر چکے ہیں، وہ سب انہیں بھی حاصل تھا مگر (ان کی بداعمالی اور سرکشی کے سبب) اللہ تعالی نے انہیں اپنا دشمن قرار دیا اور ان پر سخت لعنت فرمائی۔ چنانچہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ، كَانُوا لا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ. 'داؤد اور عیسی کی زبان سے بنی اسرائیل کے کفار پر لعنت بھیجی گئی کیونکہ وہ نافرمان اور سرکش ہو گئے تھے اور انہوں نے حدود کو پار کر لیا تھا۔ وہ برے کاموں سے نہیں بچتے تھے اور جو کرتے تھے، وہ نہایت ہی برا ہوتا تھا۔'[3] میں اپنے ہتھیار ڈال رہا ہوں اور اس معاملہ (حکومت کی امیدواری) سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے اپنے لیے پسند کیا ہے، وہی طلحہ بن عبید اللہ (جو اس وقت موجود نہ تھے) کے لیے بھی پسند کر رہا ہوں۔ ان کا ذمہ میں لیتا ہوں اور جو بات کہی ہے، اس کا پابند ہوں۔ عبدالرحمن! یہ معاملہ آپ کے سپرد کر دیا گیا ہے لہذا آپ خیر خواہی کی نیت سے حسب استطاعت اپنی کوشش کیجیے۔ صحیح راستہ دکھانا اللہ تعالی کا کام ہے اور اسی کی طرف ہر معاملے میں رجوع کرنا چاہیے۔ میں بھی اپنے لیے اور آپ سب کے لیے اللہ تعالی سے مغفرت کا طلب گار ہوں اور آپ لوگوں کی مخالفت سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔"

اس کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بات کی اور فرمایا: "اللہ تعالی ہی حمد و ثنا کا مستحق ہے، جس نے ہمارے اندر سے محمد صلی اللہ

[3] المائدہ 5:78-79

علیہ وسلم کو ہماری جانب رسول اور نبی بنا کر بھیجا۔ ہم لوگ (یعنی تمام صحابہ) نبوت کا مرکز ہیں اور اس حکمت (نبوت) کا خزانہ ہیں۔ اہل زمین ہم سے ہی امان حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ نجات کے طالب ہوں، ان کے لیے ہم نجات کا سبب بنتے ہیں۔ یہ خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر آپ دیں گے تو ہم اسے قبول کر لیں گے اور نہیں دیں گے تو اونٹوں کی پشت پر سوار ہو کر چلے جائیں گے خواہ ہمیں اس کے لیے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **ہمارے لیے کوئی معاہدہ فرما دیتے تو ہم اس کو نافذ کرواتے** اور اگر ہم سے کوئی بات کہتے تو ہم مرتے دم تک اس بات پر ڈٹے رہتے۔ لیکن دعوت حق اور (آپ لوگوں کے ساتھ) **صلہ رحمی میں کوئی مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے**۔ قدرت اور اختیار اللہ تعالی ہی کو حاصل ہے۔ آپ لوگ میری بات سن لیجیے اور ذہن نشین کر لیجیے۔ خطرہ ہے کہ اس میٹنگ کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ تلواریں بے نیام ہو گئی ہیں اور امانت میں خیانت ہونے لگی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گمراہ لوگ لیڈر بن جائیں اور جاہل لوگ ان کی پیروی کرنے لگیں۔ (پھر یہ شعر پڑھے کہ) اگر تباہی بڑی ہو جائے تو میں وہی کروں گا جو بنو عبد بن ضخم نے کیا۔ ہر طوفان کی صورت میں **میں فرمانبردار بن کر رہوں گا اور ہر ستارے کے مرکز کو دیکھتا رہوں گا۔**"

عبدالرحمن بن عوف بولے: "آپ میں سے کون برضا و رغبت اس معاملے (خلافت) سے دست بردار ہو کر دوسرے کو خلیفہ بنانے پر تیار ہے؟" لوگ کچھ دیر خاموش رہے تو عبدالرحمن نے کہا: "میں اس معاملے سے اپنے آپ اور اپنے پھوپھی زاد (سعد بن ابی وقاص) کو نکال رہا ہوں۔" اس پر تمام لوگوں نے (خلیفہ کے انتخاب کے) معاملے کو ان کے سپرد کر دیا۔ اس وقت عبدالرحمن نے ان سب (ارکان شوری) سے منبر کے قریب حلف اٹھوایا۔ سب نے یہ حلف اٹھایا کہ وہ اس شخص کی بیعت کریں گے جس کے ہاتھ پر عبدالرحمن بیعت کریں گے۔ اب عبدالرحمن رضی اللہ عنہ تین دن تک مسجد نبوی کے قریب اپنے گھر میں مقیم رہے جو آج کل (راوی کے زمانے میں) رحبۃ القضاء کے نام سے مشہور ہے اور اس کا یہ نام، اسی فیصلہ کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ان تین دنوں میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ (وصیت فاروقی کے مطابق) نماز کی امامت کرتے رہے۔

عبدالرحمن نے علی رضی اللہ عنہما کو بلوا کو پوچھا: "اگر میں آپ کے ہاتھ پر بیعت نہ کروں، تو مشورہ دیجیے (کہ کسے خلیفہ بنایا جائے؟)" علی نے جواب دیا: "عثمان کو۔" پھر انہوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو بلوا کر پوچھا: "اگر میں آپ کی بیعت نہ کروں تو بتائیے کہ کسے خلیفہ بنایا جائے؟" انہوں نے جواب دیا: "علی کو۔" اس کے بعد انہوں نے زبیر رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور پوچھا: "اگر میں آپ کی بیعت نہ کروں تو آپ مجھے کس کے حق میں مشورہ دیں گے؟" انہوں نے کہا: "عثمان کے۔" پھر انہوں نے سعد رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور پوچھا: "ہم دونوں تو خلیفہ بننا نہیں چاہتے ہیں، اب آپ کا ووٹ کس کے حق میں ہے؟" وہ بولے: "عثمان کے۔" (اس طرح چار میں سے تین ووٹ حضرت عثمان کے حق میں آ گئے جبکہ حضرت عثمان کا ووٹ حضرت علی کے حق میں تھا۔)

مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب تیسری رات آئی تو عبدالرحمن نے آواز دی: "مسور!" میں نے کہا: "جی ابھی آیا۔" وہ بولے: "آپ سو رہے ہیں، واللہ! تین راتوں سے مجھے نیند نہیں آئی۔" آپ جائیے اور علی اور عثمان کو بلا لائیے۔" میں نے کہا: "ماموں! پہلے کسے بلاؤں؟" وہ بولے: "جسے آپ چاہیں۔" میں نکل کر علی کے پاس گیا کیونکہ میرا میلان طبع انہی کی طرف تھا اور ان سے کہا: "میرے ماموں آپ کو بلا رہے ہیں۔" انہوں نے پوچھا: "کیا انہوں نے آپ کو کسی اور کو بھی بلانے بھیجا ہے؟" میں نے جواب دیا: "جی ہاں، عثمان کو۔" انہوں

نے پوچھا: "پہلے کسے بلانے کا انہوں نے کہا ہے؟" میں نے کہا: "میں نے اس بارے میں ان سے پوچھا تھا تو انہوں نے یہ کہا کہ جسے آپ چاہیں۔ اس وجہ سے میں پہلے آپ کے پاس آیا ہوں کیونکہ میں آپ کی حمایت کرتا ہوں۔" پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے ساتھ چلے اور اپنی جگہ آ پہنچے اور حضرت علی وہاں بیٹھ گئے۔

اب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ فجر کی (سنت) نماز کے ساتھ وتر کی نماز ملا کر پڑھ رہے ہیں۔ (فارغ ہوئے تو) میں نے عرض کیا: "میرے ماموں آپ کو بلا رہے ہیں۔" انہوں نے پوچھا: "کیا انہوں نے آپ کو کسی اور کو بھی بلانے کا کہا ہے؟" میں نے جواب دیا: "جی ہاں، علی کو۔" انہوں نے پوچھا: "انہوں نے پہلے کسے بلانے کا کہا ہے؟" میں نے کہا: "میں نے اس بارے میں ان سے پوچھا تھا تو انہوں نے یہ کہا کہ جسے آپ چاہیں۔ علی وہیں بیٹھے ہیں۔" پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی میرے ساتھ چلے اور ہم وہاں اکٹھے پہنچے۔ میرے ماموں (عبد الرحمن) قبلہ رو کھڑے (سنت) نماز پڑھ رہے تھے۔ جب انہوں نے ہمیں دیکھا تو نماز (مختصر کر کے) ختم کی اور حضرات علی و عثمان رضی اللہ عنہما سے کہنے لگے: "میں نے آپ دونوں کے علاوہ دیگر لوگوں (طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہما) کے بارے میں بہت سے لوگوں سے پوچھا ہے تو ان کی حمایت آپ سے زیادہ نہیں ہے۔ علی! کیا آپ میرے ساتھ، اللہ تعالی کی کتاب، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پالیسی پر چلنے کا وعدہ کرتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "نہیں، بلکہ میں اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق عمل کروں گا۔" پھر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "کیا آپ میرے ساتھ کتاب اللہ، سنت نبوی اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طریقہ پر عمل کا وعدہ کرتے ہیں؟" انہوں نے فرمایا: "ہاں۔"

اس پر انہوں نے ہاتھ سے اٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم لوگ کھڑے ہو کر مسجد نبوی میں داخل ہوئے۔ اعلان کرنے والے نے "الصلوۃ جامعۃ" کا اعلان کیا۔ (یہ اعلان تب ہوتا تھا جب مدینہ کی پوری آبادی کو اکٹھا کرنا مقصود ہوتا تھا۔) عثمان کہتے ہیں کہ میں اپنی شرم کے باعث پیچھے رہ گیا جبکہ علی تیز رفتاری سے مسجد میں چلے گئے جبکہ میں مسجد کے آخری حصے میں آن پہنچا۔ اتنے میں عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی آن پہنچے۔ انہوں نے وہ عمامہ باندھ رکھا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر باندھا تھا اور اپنی تلوار کو انہوں نے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ وہ منبر پر چڑھے اور کافی دیر کھڑے رہے۔ پھر وہ دعا کی جس کے الفاظ لوگ سن نہ سکے۔ (اس سے ان کے احساس ذمہ داری کا اندازہ ہوتا ہے۔)

"لوگو! میں نے خفیہ اور اعلانیہ آپ کے خلیفہ کے بارے میں آپ لوگوں سے مشورہ کیا تو معلوم ہوا کہ آپ صرف ان دونوں (عثمان یا علی) میں سے کسی ایک کے حامی ہیں۔ اب یا تو آپ علی کے طرف دار ہیں یا عثمان کے۔ علی! اٹھیے اور ادھر آئیے۔" اس پر حضرت علی منبر کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ عبد الرحمن نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا: "کیا آپ میرے ساتھ، اللہ تعالی کی کتاب، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پالیسی پر چلنے کا وعدہ کرتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "نہیں، بلکہ اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق۔" اس کے بعد انہوں نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پکار کر کہا: "عثمان! ادھر آئیے۔" پھر انہیں حضرت علی کے مقام پر کھڑا کر کے پوچھا: "کیا آپ میرے ساتھ، اللہ تعالی کی کتاب، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پالیسی پر چلنے کا وعدہ کرتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "جی ہاں۔" اس پر انہوں نے اپنا سر مسجد نبوی کی چھت کی طرف بلند کیا۔ اس وقت ان کا ہاتھ حضرت عثمان کے ہاتھ میں تھا اور وہ یہ کہہ رہے تھے: "اے اللہ! گواہ رہنا۔ میں نے وہ (ذمہ داری) جو میری گردن میں تھی، عثمان کی گردن میں ڈال دی ہے۔"

اس کے بعد لوگ ٹوٹ پڑے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے لگے، یہاں تک کہ ہر طرف وہ چھا گئے۔ اس وقت عبد الرحمن منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیٹ پر بیٹھے تھے اور عثمان کو انہوں نے دوسری سیڑھی پر بٹھا رکھا تھا۔[4]

اس روایت کو دیکھیے تو واقعہ کی کیا خوبصورت تصویر کشی حضرت مسور رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور پانچوں صحابہ حضرت عبد الرحمن، سعد، علی، زبیر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے احساس ذمہ داری اور بے نفسی کو تو گویا اس طرح کھول کر سامنے رکھ دیا ہے کہ کوئی غیر مسلم بھی کھلے ذہن سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ تاہم روایت کے آخری حصے میں ایک ٹکڑا ایسا ہے، جو اصل روایت سے بالکل ہی بے جوڑ محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے:

لوگ بیعت کر رہے تھے اور علی پیچھے تھے۔ عبد الرحمن نے کہا: "جو عہد شکنی کرے گا، اس کی عہد شکنی اس کی اپنی ذات کے لیے نقصان دہ ہو گی اور جس نے اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کیا، وہ عنقریب اسے بڑا اجر دے گا۔" حضرت علی لوگوں کی صفیں چیرتے ہوئے آگے آئے اور بیعت کر لی۔ حضرت علی لوگوں کی صفیں چیرتے ہوئے آئے اور بیعت کر لی لیکن یہ کہا: "دھوکہ، کیسا بڑا دھوکہ۔"

عبد العزیز بن ابی ثابت کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دھوکہ اور فریب کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مجلس شوری کی راتوں میں حضرت علی سے ملے اور کہا: "عبد الرحمن بن عوف محنت و مشقت کرنے والے انسان ہیں۔ اگر آپ ان کے سامنے مصمم ارادہ ظاہر کریں گے تو وہ آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ اس لیے آپ حسب استطاعت کا لفظ استعمال کیجیے، اس سے وہ آپ کی طرف متوجہ ہوں گے۔" اس کے بعد وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملے اور ان سے کہا: "عبد الرحمن بن عوف محنت و مشقت کرنے والے انسان ہیں۔ واللہ! وہ آپ کی اس وقت تک بیعت نہیں کریں گے جب تک آپ عزم مصمم کا اظہار نہ کریں۔" ان دونوں نے ان کی یہ بات مان لی۔ اس وجہ سے حضرت علی نے دھوکہ کا جو لفظ کہا تھا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

یہ اضافہ راوی عبد العزیز بن ابی ثابت کا ہے جو کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پوتے کے پوتے ہیں۔ یہ ایک کمزور راوی تھے۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ ان کی احادیث کو نہیں لکھنا چاہیے۔ نسائی نے انہیں متروک قرار دیا ہے اور یحیی بن معین کہتے ہیں کہ وہ ثقہ نہیں تھے۔[5] یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ عبد العزیز اگر قابل اعتماد نہیں تھے تو پھر پوری روایت کو قبول کیوں کیا جائے؟ روایت کے آخری ٹکڑے کے علاوہ بقیہ پوری روایت کو قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ صحیح بخاری کی روایت کے عین مطابق ہے۔

بخاری میں یہ واقعہ بھی حضرت مسور رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے اور وہاں اس کی سند دوسری ہے: حدثنا عبد الله بن محمد بن أسماء: حدثنا جويرية، عن مالك، عن الزُهريِّ: أنَّ حميد بن عبد الرحمن أخبره: أنَّ المسور بن مخرمة أخبره۔ **اس روایت میں** حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کوئی ایسے الفاظ نہیں ہیں جن میں آپ نے دھوکہ یا فریب کہا ہو اور نہ ہی آپ کے پیچھے رہ جانے کا ذکر

[4] طبری 23H/3/1-265 to 271

[5] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 5124۔ 4/369

ہے۔ وہاں یہ بیان ہوا ہے کہ "امابعد۔ علی! میں نے لوگوں کے حالات پر غور کیا ہے تو دیکھا ہے کہ وہ عثمان کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنے دل میں میری سے کچھ خیال نہ کیجیے گا۔" علی نے عثمان سے کہا: "میں اللہ اور اس کے رسول اور آپ کے دونوں خلفاء کی سنت پر آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔" عبدالرحمن نے بھی بیعت کی اور پھر تمام لوگوں، جن میں مہاجرین وانصار، سرداران لشکر اور عام مسلمان تھے، نے بیعت کی۔

روایت کے دونوں ورژنز دیکھیے تو بخاری والے ورژن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سب سے پہلے بیعت کرنے کا ذکر ہے جبکہ طبری والے ورژن میں بعد میں اور وہ بھی "دھوکہ" کے الفاظ کہہ کر۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے تعصب رکھنے والے کسی شخص نے یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دی ہے۔ عبد العزیز چونکہ ایک کمزور راوی ہیں اور زیادہ محتاط نہیں ہیں، اس وجہ سے انہوں نے سوچے سمجھے بغیر یہ بات قبول کر کے اسے بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے فوراً بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر بھی ایک منفی تبصرہ موجود ہے۔ اس سے یہ کسی ایسے شخص کی کارستانی لگتی ہے جو حضرات عمرو اور مغیرہ رضی اللہ عنہما دونوں ہی کے بارے میں شدید بغض کا شکار ہے۔

درایت کے اعتبار سے بھی روایت کے اس حصے پر یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

1۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بدگمانی کی جا سکتی ہے کہ ان کے دل میں خلافت کی طلب ایسی شدید تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کا سن کر ہی وہ دل گرفتہ ہو گئے؟ عہد عثمانی میں ان کا جو کردار سامنے آیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغی تحریک کا انہوں نے جس طرح مقابلہ کیا، اس سے تو ان کی بالکل ہی مختلف تصویر سامنے آتی ہے۔

2۔ روایت میں تاثر یہ دیا گیا ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کا فیصلہ اس بنیاد پر کیا کہ ان کے سوال "کیا آپ میرے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی کتاب، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پالیسی پر چلنے کا وعدہ کرتے ہیں؟" کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "حسب استطاعت" کا لفظ استعمال کیا جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ قرآن مجید کے حکم کے مطابق ہر مسلمان پر دینی ذمہ داریاں اس کی طاقت اور استطاعت کے تحت ہی عائد کی گئی ہیں اور یہ لفظ استعمال کرنا کوئی برائی نہیں ہے۔ اس بات سے حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ یقیناً ناواقف تو نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس بخاری کی روایت سے واضح ہے کہ حضرت عثمان کا انتخاب اس وجہ سے ہوا تھا کہ صحابہ کرام کی غالب اکثریت انہیں خلیفہ دیکھنا چاہتی تھی۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں خلیفہ بنانے کے حق میں تھے۔

اس آخری حصے سے ہٹ کر روایت کا پہلا حصہ یقیناً نہایت ہی پاکیزہ بیان ہے جس میں شوریٰ کے پانچوں صحابہ کے جو بیان نقل کیے گئے ہیں، ان پر اگر مسلمان آج عمل کر لیں تو ان کی کھوئی ہوئی سیاسی قوت بحال ہو جائے۔

بلاذری کی روایات میں کیا بات بیان ہوئی ہے؟

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بلاذری نے شوری سے متعلق 20 روایات بیان کی ہیں جن میں سے 10 واقدی اور 5 ہشام کلبی اور ابو مخنف سے مروی ہیں۔ بقیہ پانچ میں سے بھی ایک روایت مشکوک ہے۔ اس طرح باقی چار روایات رہ جاتی ہیں جن میں کوئی منفی بات نہیں ہے۔ یہاں ہم ان روایات کو درج کر رہے ہیں، تفصیل کو آپ متعلقہ کتاب میں دیکھ سکتے ہیں:

1۔حدثنا عبيد الله بن معاذ العنبري، حدثنا أبي، أنبأنا شعبة، أنبأنا قتادة، عن سالم بن أبي الجعد، عن معدان اليعمري: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن لوگوں کو خطبہ دیا اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا اور پھر کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ مجھے کھود رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری موت کا وقت قریب آ رہا ہے۔ قوم مجھے یہ مشورہ دے رہی ہے کہ میں کسی کو خلیفہ بنا جاؤں۔ یقیناً اللہ اپنے دین اور اپنی خلافت کو ضائع نہ ہونے دے گا کیونکہ وہ وہی ہے جس نے اپنے نبی کو بھیجا۔ اگر میری موت جلد واقع ہو جائے تو خلافت کا معاملہ ان چھ افراد کے مشورے سے طے ہو گا۔ یہ وہی ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **اپنی وفات کے وقت تک راضی تھے**۔ میں جانتا ہوں کہ اس معاملے میں وہ قومیں طعنہ زنی کریں گی جن پر میں نے اسلام کی ضرب لگائی ہے۔ اگر وہ ایسا کریں تو یہی اللہ کے گمراہ دشمن ہیں۔

2۔ حدثني محمد بن سعد، حدثني شهاب بن عبادة، حدثنا إبراهيم بن حميد، عن ابن خالد، عن جبير بن محمد بن جبير بن مطعم: ہمیں خبر پہنچائی گئی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی سے کہا: "اگر آپ کو لوگوں کے اس معاملے (خلافت) کی ذمہ داری دی جائے تو بنو عبد المطلب کو ان کی گردنوں پر سوار نہ کیجیے گا۔" اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہم) سے کہا: "اگر آپ کو لوگوں کے اس معاملے (خلافت) کی ذمہ داری دی جائے تو بنو ابو معیط کو ان کی گردنوں پر سوار نہ کیجیے گا۔"

3۔المدائني، عن عبد الله بن سلم الفهري وابن جعدبة: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو اس شرط پر شوری میں شامل کیا کہ وہ خلیفہ نہ بن سکیں گے۔ انہیں صرف (ووٹ دینے) کا اختیار تھا (اور وہ بھی اس صورت میں کہ بقیہ چھ حضرات کے تین تین ووٹ برابر ہوں۔)

4۔ جدثنا عفان بن مسلم، جدثنا حماد بن سلمة، أنبأنا عاصم بن بهدلة، عن أبي وائل أن عبد الله بن مسعود: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے کوفہ کا سفر آٹھ دن میں طے کیا۔ (پھر وہاں خطبہ دیا) اور اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد کہا: "امیر المومنین عمر بن خطاب شہید ہو گئے۔ میں نے اس دن سے زیادہ کوئی رلا دینے والا دن نہیں دیکھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے بڑھ کر کوئی خیر ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہم نے عثمان بن عفان کی بیعت کر لی ہے، آپ لوگ بھی انہی کی بیعت کر لیجیے۔ (بلاذری اور ابن سعد نے اس روایت کی تین اسناد بیان کی ہیں۔) [6]

[6] بلاذری۔ انساب الاشراف۔129-6/119۔ ابن سعد۔ الطبقات الکبری۔59-3/57

ان چار روایتوں میں دیکھیے تو کوئی منفی بات نہیں ہے بلکہ آخری روایت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہ متفق تھے۔ جن چھ افراد کو شوری میں شامل کیا گیا، ان کا مقام یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے وقت ان سے راضی تھے۔ جس روایت کو ہم نے مشکوک کہا ہے، وہ یہ ہے:

حدثني حسين بن علي بن الأسود، حدثنا **عبيد الله بن موسى**، أنبأنا إسرائيل عن أبي إسحاق عن عمرو بن ميمون: عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ جس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر خنجر سے وار کیا گیا، اس دن میں موجود تھا۔ پھر انہوں نے اس واقعے کو پوری تفصیل سے بیان کیا اور پھر بتایا کہ حضرت عمر نے کہا: "علی، عثمان، طلحہ، زبیر، عبد الرحمن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص کو بلا لائیے۔" انہوں نے سوائے علی اور عثمان کے کسی اور سے بات نہیں کی اور فرمایا: "علی! امید ہے کہ یہ سب لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے رشتے اور دامادی سے واقف ہوں گے اور اس بات سے بھی کہ اللہ نے آپ کو دین کی سمجھ اور علم عطا کیا ہے۔ اگر آپ اس معاملے (خلافت) کے ذمہ دار بنائے جائیں تو اس معاملے میں اللہ تعالی سے ڈرتے رہیے گا۔" پھر عثمان کو بلا کر کہا: "عثمان! امید ہے کہ یہ قوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے دامادی کے رشتے اور آپ کی عمر (اور تجربہ) کے معاملے میں واقف ہو گی۔ اگر آپ کو اس معاملے کی ذمہ داری سونپی جائے تو اللہ سے ڈرتے رہیے اور آل ابی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ ہونے دیجیے۔"

پھر فرمایا: "صہیب کو بلائیے۔" انہیں بلایا گیا تو فرمایا: "آپ لوگوں کو تین دن تک نماز پڑھائیے اور ان (چھ) افراد کو گھر میں تنہا چھوڑ دیجیے۔ اگر وہ اپنے میں سے کسی ایک پر متفق ہو جائیں تو پھر جو بھی اس کی مخالفت کرے، اس کی گردن اڑا دیجیے۔" جب یہ لوگ حضرت عمر کے پاس سے نکلے تو انہوں نے کہا: "اگر یہ لوگ ان گنجے صاحب (حضرت علی) کو خلیفہ بنا لیں تو یہ اپنی راہ پر گامزن رہیں گے۔" ابن عمر نے کہا: "امیر المومنین! پھر آپ کو کس سے روکا ہے (کہ انہیں خلیفہ نامزد نہ کریں؟)" فرمایا: "میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ زندگی میں بھی اس (خلافت) کا بوجھ اٹھائے پھروں اور مرنے کے بعد بھی۔"

اس روایت کی سند کو دیکھیے تو اس میں عبید اللہ بن موسی ہیں۔ اگرچہ انہیں ماہرین جرح و تعدیل نے ثقہ قرار دیا ہے لیکن ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ "شیعی محترق" یعنی دل جلے شیعہ تھے۔[7] اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محدثین کسی شخص کی جرح و تعدیل کے وقت کسی مسلکی تعصب کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اگر کسی دوسرے مسلک کا شخص سچا محسوس ہوتا تو اسے ثقہ ہی کہتے تھے، ہاں اس کے مخصوص تعصبات پر مبنی روایتوں کو قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ اوپر بیان کردہ دوسری روایت سے واضح ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی اور عثمان رضی اللہ عنہم دونوں ہی کو نصیحت کی تھی کہ وہ آل عبد المطلب اور آل ابو معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کریں۔ اس کے برعکس عبید اللہ کی روایت میں حضرت علی کو کی گئی نصیحت کو حذف کر دیا گیا ہے جس سے راوی کا تعصب ظاہر ہوتا ہے۔

اس نصیحت کی وجہ شاید یہ رہی ہو گی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان خاندانوں کے لوگوں میں عہدوں کی طلب دیکھی ہو گی تو

[7] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 5405۔ 5/21

حضرت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما دونوں ہی کو نصیحت کر دی کہ ان خاندانوں کے لوگوں کو عہدے نہ دیے جائیں۔

بلاذری کی بقیہ 15 روایتوں میں سے 10 تو ابن سعد اور واقدی سے مروی ہیں۔ ان کا ذکر ہم آگے ابن سعد کے عنوان کے تحت کریں گے۔ چار روایتیں ایسی ہیں جو ابو مخنف اور ہشام کلبی سے مروی ہیں۔ ان دونوں حضرات کا صحابہ کرام سے بغض ہم اس کتاب میں بار بار بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعلق منفی روایات کا غالب حصہ انہی حضرات سے مروی ہے۔ انہی چار روایتوں میں شوری کے واقعے سے متعلق منفی نوعیت کی معلومات پائی جاتی ہیں کہ حضرت عباس نے حضرت علی رضی اللہ عنہما کو شوری میں شریک ہونے سے منع کیا۔ حضرت علی نے اس مشورے کو تو نہ مانا مگر شوری کے دوسرے رکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی منت سماجت کر کے انہیں اپنی حمایت پر تیار کیا۔ یہی روایتیں طبری میں بھی موجود ہیں مگر طبری نے ان کی اسناد کو مکس کر دیا ہے۔ ان روایات کو ایجاد کر کے ہشام کلبی اور ابو مخنف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ الٹا ان کی ایک منفی تصویر پیش کی ہے۔

بلاذری نے ایک دلچسپ روایت ہشام کلبی سے نقل کی ہے جس کی سند میں ابو مخنف نہیں ہیں۔ روایت یہ ہے:

> حدثني **عباس بن هشام الكلبي**، عن **أبيه**، عن أبو صالح، عن ابن عباس: ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ شوری کے اراکین میں سے عبد الرحمن بن عوف کے بعد جس شخص نے عثمان کی سب سے پہلے بیعت کی، وہ علی تھے اور اس معاملے میں انہوں نے ذرا سی ہچکچاہٹ بھی ظاہر نہیں کی۔[8]

ہمارے خیال میں یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شایان شان ہے کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ امت کی غالب اکثریت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ دیکھنا چاہتی ہے تو انہوں نے اپنی ذاتی خواہش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے امت کے مفاد کو ترجیح دی اور اس معاملے میں ایسی کشادہ دلی اور ٹیم اسپرٹ کا مظاہرہ کیا جو انہی کا خاصہ تھی۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں وہ ان کے دست راست بن کر رہے اور ہر مشکل میں ان کا ساتھ نبھایا۔

ابن سعد کی روایات میں کیا بات بیان ہوئی ہے؟

ابن سعد نے واقعہ شوری سے متعلق نو روایتیں بیان کی ہیں جن میں آٹھ ان کے استاذ محمد بن عمر الواقدی کی روایتیں ہیں۔ ان میں کوئی منفی بات سامنے نہیں آتی ہے بلکہ واقعے کی مثبت تصویر ہی بیان ہوئی ہے۔ ان میں سے اکثر امور حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی اوپر بیان کردہ روایت کے مطابق ہیں البتہ واقدی نے بعض نئے پہلو بیان کیے ہیں جن میں ووٹنگ کا پروسیجر شامل ہے۔ ان روایات کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ اگر چار آدمیوں کی رائے ایک جانب ہو اور دو کی ایک تو پھر فیصلہ اکثریت پر ہو گا۔ چونکہ اراکین شوری چھ تھے، اس وجہ سے یہ خدشہ تھا کہ اگر تین تین کی رائے دو جانب ہوئی تو پھر کیا جائے؟ اس صورت میں

[8] بلاذری 6/128۔ باب عثمان بن عفان۔

حضرت عمر نے حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہما کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبد الرحمن نے ان کی زندگی ہی میں خلافت سے دستبر داری کا اعلان کر دیا تھا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت عمر نے حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا تھا کہ وہ انصار کے 50 آدمیوں کو لے کر اس مکان پر پہرہ دیں جس کے اندر اصحاب شوری مشورہ کر رہے ہیں اور کسی کو اندر نہ جانے دیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ باہر کا کوئی شخص اس مشورے پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ ایک اور روایت کے مطابق سب سے پہلے حضرت عثمان کی بیعت حضرت عبد الرحمن نے کی اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہم نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بیعت کر لی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شوری کی پوری کاروائی نہایت ہی کشادہ دلی اور باہمی محبت سے ہوئی۔ جن روایات میں کچھ منفی جملے ہیں، ان کی سند دیکھیے تو ان میں ابو مخنف یا ہشام کلبی نظر آتے ہیں جن کا صحابہ کرام سے بغض اظہر من الشمس ہے۔

عہد عثمانی کی باغی تحریک

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے آخری دو سالوں میں ان کے خلاف ایک تحریک اٹھی اور اس کے دو تین ہزار لوگوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نے ہر ممکن طریقے سے ان باغیوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے خلیفہ کو شہید کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تحریک کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا طریقہ کار کیا تھا؟ یہ کس طرح منظم ہوئی اور کیسے پھیلی؟ اس سے متعلق صحابہ کرام کا طرز عمل کیا تھا؟

ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس موضوع سے متعلق تمام تاریخی روایات کا تفصیلی مطالعہ کرنا پڑے گا کیونکہ یہ بغاوت اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت ہی پیچیدہ تھی۔ اس مطالعے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم باغی تحریکوں سے متعلق عمومی نوعیت کے کچھ امور کو سمجھ لیں کیونکہ ان کی مدد سے ہمیں حضرت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اٹھنے والی اس باغی تحریک کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

باغی تحریکوں کا لائف سائیکل اور اس کی خصوصیات

اگر ہم مختلف زمانوں میں اٹھنے والی باغی تحریکوں کا مجموعی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرح ان تحریکوں کا بھی ایک لائف سائیکل ہوتا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ نہایت ہی کمزور بچہ ہوتا ہے۔ اس کے والدین اس کی پرورش کرتے ہیں۔ اپنے گردوپیش سے وہ ہوا اور غذا حاصل کرتا ہے۔ اپنے والدین اور اساتذہ سے وہ ذہنی اور روحانی غذا حاصل کرتا ہے اور اس طرح سے جوان ہو جاتا ہے۔ تجربہ حاصل کر کے وہ پختہ عمری کو پہنچتا ہے جو اس کی زندگی کا نقطہ عروج (Climax) ہوتا ہے۔ اس کے بعد پہلے اس کا جسم اور پھر ذہن زوال کا شکار ہوتا ہے اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ کمزور ہو جاتا ہے اور پھر ایک دن موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ کسی انسان کے

مرنے کے بعد ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ اس کی نسل بھی ختم ہو جاتی ہے بلکہ وہ اپنے بچوں کی صورت میں مزید انسان پیدا کر جاتا ہے جن کا اسی طرح سے ایک لائف سائیکل ہوتا ہے۔ ہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان کی اولاد نہیں ہوتی اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی اس کی نسل بھی ختم ہو جاتی ہے۔

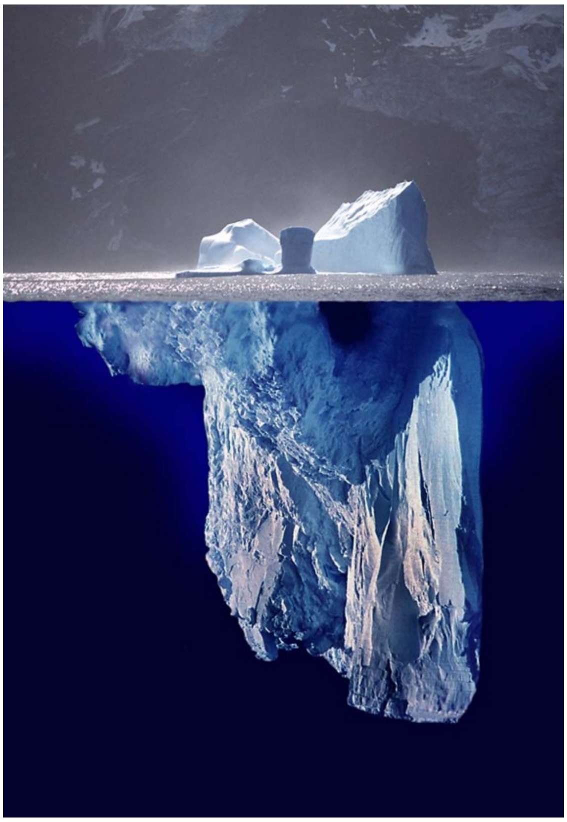
باغی تحریکوں (بلکہ شاید ہر قسم کی تحریکوں) کا لائف سائیکل بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ یہ تحریک ابتدا میں کسی ایک یا چند اشخاص کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے مثلاً حکومت وقت سے کسی بات پر اختلاف، دوسروں پر غلبہ کی خواہش، نظام وقت کو تبدیل کرنے کی خواہش وغیرہ۔ یہ تحریک اس شخص کے ذہن میں جب پیدا ہوتی ہے تو وہ اس پر سوچتا ہے اور قابل اعتماد لوگوں سے اس پر بات کرتا ہے۔ اگر متعدد افراد کے ذہن میں یہ تحریک موجود ہو تو وہ اپنے مشترکہ مقصد کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل (Strategy) موجود ہو تو وہ اس پر کام کرنے لگتے ہیں اور مزید ہم خیال لوگ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریک کا فکری کام بھی جاری رہتا ہے جس سے لائحہ عمل مزید واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس دور کو ہم تحریک کا بچپن کہہ سکتے ہیں۔

جیسے کبھی بچے بھی کسی حادثے یا بیماری کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں، ویسے ہی کسی داخلی بحران یا خارجی حادثے کے سبب تحریک بھی بچپن میں موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر حکومت مضبوط ہو اور اس کا انٹیلی جنس کا نظام اچھا ہو تو وہ اسی موقع پر باغی تحریک سے واقف ہو جاتی ہے اور اس کے بچپن ہی میں اس کا قلع قمع کر دیتی ہے۔ اگر حکومت اس تحریک سے واقف نہ ہو سکے یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے صرف نظر کر دے تو یہ تحریک جاری رہتی ہے۔ جیسے جیسے تحریک کو مزید ساتھی ملتے جاتے ہیں، ویسے ویسے اس کے وسائل اور قوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت وہ آتا ہے جب یہ تحریک ایک تناور درخت بن جاتی ہے۔

اگر باغی تحریک کو ایسے قائدین مل جائیں جو عقل مند اور تجربہ کار ہوں، تو وہ کسی بھی اقدام کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرتے ہیں لیکن اگر یہ قائدین جذباتی اور عاقبت نااندیش ہوں تو یہ جلد بازی سے کام لیتے ہوئے جلد ہی راست اقدام (Direct Action) کر ڈالتے ہیں۔ پہلی صورت میں بالعموم تحریک کامیاب ہو جاتی ہے اور حکومت کا تختہ الٹ جاتا ہے لیکن دوسری صورت میں تحریک عین جوانی میں دم توڑ دیتی ہے اور اس کی موت کو اس نوجوان سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کسی حادثے یا لڑائی میں مارا جائے۔ اگر کوئی باغی تحریک ایک تناور درخت بن جائے تو اس کی جڑیں بالعموم دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ ایسی باغی تحریک کی حیثیت ایک آئس برگ کی سی ہوا کرتی ہے جو سمندر کی اوپری سطح پر چھوٹا سا نظر آتا ہے لیکن سمندر کے اندر یہ کئی گنا بڑا ہوتا ہے۔

ایسی صورت میں اگر اس کا مقابلہ حکومت سے ہو جائے اور حکومت اس پر قابو بھی پا لے، تب بھی اس کی جڑیں معاشرے میں خفیہ طور پر پیوست رہتی ہیں کیونکہ شکست کی صورت میں جذبات ختم نہیں ہوتے بلکہ انتقام کا جذبہ مزید طاقتور ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ان جڑوں سے دوبارہ تنا نکل آتا ہے اور شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں اور پھر کسی موقع پر ایک اور بغاوت جنم لیتی ہے۔ اس طرح سے بغاوتیں بار

بار اٹھتی ہیں اور سروں کی فصل بار بار کٹتی ہے۔ ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں حکومت کی توانائی کا بڑا حصہ خرچ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً اپنے دور میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انگریز حکومت کے خلاف مسلسل دو سو برس تک باغی تحریکیں اٹھتی رہیں۔ انگریزوں نے انہیں پھانسیاں دیں، کالے پانی کی سزا دی اور قید و بند میں مبتلا رکھا لیکن ایک بغاوت کے فرو ہونے کے بعد دوسری تحریک کھڑی ہو جاتی۔ بالکل اسی طرح اسپین کے مسلم دور میں وہاں مقامی آبادی کی جانب سے بار بار بغاوتیں اٹھتی رہیں۔



باغی تحریکوں کے قائدین کی اگر نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بعض خصوصیات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں:

- باغی قائدین بالعموم حوصلہ مند اور اولوالعزم (Ambitious) ہوتے ہیں۔
- باغی قائدین میں حکومت پر قبضہ کر کے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی شدید خواہش پائی جاتی ہے۔
- باغی قائدین عوام الناس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اپنی کرشماتی صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے جذبات کو مختلف طریقے سے اپیل کرتے ہیں۔ اس اپیل میں مذہب، قوم پرستی، ظلم کے خلاف جہاد جیسے نعروں کا استعمال عام ہوتا ہے۔
- باغی قائدین اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اکثر اوقات مذہب کو بھی استعمال کر لیتے ہیں کیونکہ اس کی مدد سے لوگوں کے جذبات کو اچھی طرح بھڑکایا جا سکتا ہے۔

عام طور پر ایک بغاوت اگر ناکام ہو جائے تو اس کے قائدین مارے جاتے ہیں یا گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد باغی تحریک بالعموم کیموفلاج ہو جاتی ہے اور خفیہ طریقے سے نئے قائدین اور کارکنوں کی تیاری کا کام شروع کر دیتی ہے۔ اس عمل میں کئی سال لگتے ہیں اور اس کے بعد پھر نئی بغاوت کھڑی کر دی جاتی ہے۔ ایک باغی قائد کی موت کے نتیجے میں دس باغی پیدا ہوتے ہیں کیونکہ اسے شہید قرار دے کر اس کی لاش پر سیاست کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ کوئی باغی تحریک مکمل طور پر اپنی قوت نہ کھو بیٹھے یا پھر حکومت وقت کمزور پڑ کر ختم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ فلاں بادشاہ نے فلاں باغی لیڈر کو معاف کر دیا، اسے مراعات دیں اور اسے کسی علاقے کا حاکم بھی مقرر کر دیا۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ جنگ کے ذریعے بغاوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل مند حکمران باغیوں کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اور ان کو کچھ دے دلا کر مصالحت کی کوشش کرتے ہیں تاکہ باغیوں کے ذہنوں کو تبدیل کیا جائے اور آئندہ بغاوت اٹھنے کا امکان نہ رہے۔

بغاوت کو عام طور پر کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اسے عوام الناس کی اکثریت کی تائید حاصل ہو جائے۔ اگر باغی اقلیت میں ہوں اور انہیں کسی ایک جنگ میں کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو بھی یہ دیرپا نہیں ہوتی ہے۔ مکمل کامیابی عوام کی غالب اکثریت کی تائید ہی سے ہوتی ہے۔ اگر بغاوت کامیاب ہو جائے تو اس صورت میں حکومت بدل جاتی ہے اور پہلی قوت کی جگہ دوسری قوت لے لیتی ہے۔ پھر اس دوسری حکومت کے خلاف بھی کوئی نہ کوئی باغیانہ تحریک یا تحریکیں کھڑی ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ دوسری حکومت کی جگہ کوئی تیسری حکومت نہ آ جائے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ لامتناہی طور پر جاری رہتا ہے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری صدی ہجری میں بنو امیہ کے خلاف بنو عباس نے تحریک چلائی اور ان کے اقتدار کا خاتمہ کیا۔ پھر جب بنو عباس خلیفہ بنے تو ان کے خلاف اسی طرح سے دو سو سال تک تحریکیں چلتی رہیں یہاں تک کہ عباسی خلافت کمزور نہ پڑ گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں جن قوتوں کو اقتدار ملا، انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ عباسیوں ہی کو نام کا خلیفہ بنا کر رکھا جائے۔

تاریخ انسانی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بغاوت در بغاوت کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ موجودہ دور کے ایسے ممالک، جہاں جمہوریت کی جڑیں گہری ہیں، میں ایک خاص بات یہ پیدا ہوئی ہے کہ حکومت کو تبدیل کرنے کا طریقہ آئینی طور پر طے کر دیا گیا ہے۔ اس طرح سے حکومت سے اختلاف رکھنے والوں کو بطور اپوزیشن آئینی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور انہیں یہ موقع فراہم کر دیا گیا ہے کہ وہ آئین اور قانون کی حدود میں کھلے عام کام کرتے رہیں اور جب انہیں عوام کی اکثریت کی تائید حاصل ہو جائے تو حکومت انہی کے سپرد کر دی جائے۔ جن ممالک میں جمہوری نظام مضبوط نہیں ہے، وہاں بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں لیکن مضبوط جمہوریت والے ممالک میں بغاوتوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

باغی تحریکوں کی ایک سب سے نمایاں خصوصیت ان کا پراپیگنڈا اسیل ہوتا ہے اور اس کام میں وہ ید طولی رکھتی ہیں۔ گوئبلز کا قول ہم بیان کر ہی چکے ہیں کہ پروپیگنڈا کا اصول یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ کو اتنی مرتبہ اور اتنے تواتر سے بولو کہ لوگ اسے سچ مان لیں۔ اب سفید جھوٹ کو تو منوانا مشکل ہوتا ہے، اس وجہ سے یہ تحریکیں جھوٹ اور سچ کو ملا کر اتنے اعتماد سے پیش کرتی ہیں کہ لوگ اسے تسلیم کر لیتے

ہیں۔ معمولی معمولی باتوں کو ایشو بنا کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو قیامت آ جائے گی۔ اس طرح ان کی حمایت حاصل کر کے یہ تحریکیں اپنا مشن آگے بڑھاتی ہیں۔ عام لوگوں بالخصوص نوجوانوں کے جذبات کو مذہب یا قوم پرستی کی بنیاد پر بھڑکایا جاتا ہے اور پھر انہیں قربانی کا بکرا بنا کر قائدین کے اقتدار کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔ باغیوں کے نزدیک ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کا قتل کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ ہمارے زمانے میں کمیونسٹ تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی انقلابی تحریکوں میں کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور اس پر کسی افسوس کا اظہار تو کجا، الٹا فخر کا اظہار کیا گیا۔

باغی تحریکوں کو اگر وقتی طور پر شکست ہوتی ہے تو وہ اس سے بھی بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں۔ دوران جنگ اپنے سورماؤں کی بہادری کے قصوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے اور حکومت وقت کو ہر ممکن طریقے سے ظالم ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت کی ایک غلطی کو سو گنا کر کے پیش کیا جاتا ہے جبکہ اپنی ہر غلطی کی پردہ پوشی کی جاتی ہے۔ شکست کے بعد " لٹ گئے، برباد ہو گئے، ظالموں نے مار ڈالا" قسم کی باتیں کر کے لوگوں کی ہمدردیاں بٹوری جاتی ہیں۔ اگر حکومتی فوجیوں سے کوئی زیادتی ہو جائے تو رائی کا پہاڑ بنا لیا جاتا ہے لیکن اگر نہ ہو، تو خود اپنے حمایتیوں کے خلاف کوئی خفیہ اقدام کر کے اس کا الزام حکومت کے سر پر تھوپ دیا جاتا ہے۔ خواتین کی عزت و حرمت کے بارے میں چونکہ ہر قوم حساس ہوتی ہے، اس وجہ سے ان کی پامالی کو خاص طور پر اچھالا جاتا ہے۔ حکومت وقت کو شیطان بنانا (Demonization) اور اپنے لیڈروں کو فرشتہ بلکہ خدا بنا کر پیش کرنا (Idolization) ان تحریکوں کا خاص ہتھیار ہوتا ہے۔ بغاوت جیسے قبیح عمل، جس میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے اور لوگوں کی جان، مال اور عزت داؤ پر لگتی ہے، کو رومانوی رنگ (Romanticization) دینا ان تحریکوں کا خاص شیوہ ہوتا ہے۔

ہم نے یہاں جو تفصیل بیان کی ہے، وہ بہت سی باغی تحریکوں کے مطالعے سے اخذ کی گئی ہے۔ آپ موجودہ دور کی مسلم اور غیر مسلم باغی تحریکوں جیسے آئرش ری پبلکن آرمی، تامل ٹائیگرز، خالصتانی تحریک، ماؤ نواز باغیوں، کشمیری اور فلسطینی عسکریت پسندوں اور کسی بھی باغیانہ تحریک کا تفصیلی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اوپر بیان کردہ سبھی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان سب تحریکوں پر ان کے حامیوں اور مخالفین کی کتابوں کے مطالعے سے یہی تفصیلات ملتی ہیں۔

باغی تحریکوں کے بارے میں ان عمومی تفصیلات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والی باغی تحریک کو سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت عثمان کے خلاف باغیانہ تحریک کیسے اور کب پیدا ہوئی؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغی تحریک کب شروع ہوئی، اس کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خفیہ تحریک تھی۔ اس کی صرف وہی باتیں تاریخی روایتوں کے ذریعے میں ہم تک پہنچی ہیں جو کسی ایسے کھلے اقدام پر مبنی تھیں جو سب کو نظر آ گیا یا پھر اس تحریک کے کسی رکن نے اپنی کسی اندرونی بات کا بھانڈہ خود پھوڑ دیا۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ کوئی تحریک چند دنوں میں

کھڑی نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے پیچھے سالوں کی محنت درکار ہوتی ہے۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس باغی تحریک کا آغاز حضرت عمر، بلکہ شاید حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کے دور میں ہو گیا ہو۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتدین کی بغاوت کا قلع قمع کیا گیا تو یقیناً ان سب باغیوں نے تو دل و جان سے اطاعت قبول نہ کی ہو گی۔ ان کے لیڈروں اور سورماؤں کی بڑی تعداد تو جنگوں میں ماری جا چکی تھی لیکن ان کے دوسرے اور تیسرے درجے کے راہنما اور کارکن ان جنگوں میں بچ گئے تھے اور انہیں جنگی قیدی بنا لیا گیا تھا۔

حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے ان قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ انہیں اسلام کے از سر نو مطالعے کا موقع دیا گیا اور ان میں سے بہت سے لوگ پورے خلوص کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ ان میں طلیحہ بن خویلد اسدی رحمہ اللہ کا نام ملتا ہے جنہوں نے پہلے تو نبوت کا دعوی کیا تھا لیکن پھر خلوص نیت سے مسلمان ہوئے اور ایران کی فتح میں انہوں نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ تاہم اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ مخلصین کے برعکس بہت سے لوگوں نے پورے خلوص کے ساتھ اسلام قبول نہ کیا تھا بلکہ صحابہ کرام کی طاقت سے مرعوب ہو کر انہوں نے محض اطاعت قبول کی تھی۔ انہوں نے اندر ہی اندر ایک خفیہ تحریک شروع کی جو کہ اس کا عہد طفولیت تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی نئی نسل پروان چڑھی جو بیس برس کے عرصے میں تیار ہوئی۔ مرتدین کے خلاف جنگیں 11/633 میں ہوئی تھیں جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تحریک کہیں جا کر 34/656 میں منظر عام پر آئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 22-23 برس تک یہ تحریک زیر زمین کام کرتی رہی۔

باغی تحریک دور فاروقی میں کیا کرتی رہی؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سوائے آپ کی شہادت کے، اور کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے، جسے اس تحریک کی طرف منسوب کیا جا سکے۔ ہم اوپر آپ کی شہادت کے ضمن میں بحث کر چکے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب باغیوں کو غلبہ نصیب ہوا تو انہوں نے عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ہرمزان کے مقدمے میں قتل کرنے کی کوشش کی حالانکہ ان کے وارث عبید اللہ کو معاف کر چکے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ باغی شاید اپنے اندر موجود ایرانی عنصر کی دلجوئی کے لیے ایسا کرنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاتل فیروز بھی اسی تحریک کا حصہ رہا ہو۔ اس کے برعکس اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ انہوں نے ہرمزان کے مقدمے کو محض اس لیے کھولا ہو کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید برائے تنقید کرنا چاہتے ہوں۔ ان میں سے کون سا امکان درست ہے؟ تاریخ کی کتب میں ہمیں اس کا جواب نہیں مل سکا ہے۔

اس ایک واقعے کے علاوہ اس باغی تحریک کی دیگر سرگرمیوں کا ہمیں دور فاروقی میں سراغ نہیں ملتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عربوں کو روم اور ایران کی فتح میں مصروف کر دیا تھا۔ جب کوئی دشمن سامنے ہو تو اندرونی مسائل بالعموم دب جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں یہ باغی تحریک ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔ ساتھیوں کی تلاش، ان کی برین واشنگ اور پھر مزید ہم خیال لوگوں کی تلاش ایک نہایت ہی سست عمل ہے اور اس کے لیے انہیں پندرہ بیس برس درکار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ

عنہ کے دور میں انٹیلی جنس کا نظام بھی بہت اچھا تھا اور معمولی معمولی واقعے کی رپورٹس خلیفہ کو ملتی تھیں، اس کی وجہ سے یہ لوگ کھلم کھلا کام نہ کر سکتے تھے۔

ان باغیوں میں سے کوفہ کے لوگ زیادہ جذباتی اور سرکش قسم کے لوگ تھے، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے ہی میں پر پرزے نکالنا شروع کر دیے تھے۔ اس کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا کہ حضرت عمر کے پاس آ آ کر اپنے گورنر کی شکایتیں کرنے لگے۔ پہلے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے خلاف مدینہ آ کر شکایتیں لگائیں اور پھر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو معزول کروایا۔ حضرت عمر نے یہاں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو یہاں کا گورنر مقرر کیا تو انہوں نے ان پر بدکاری کی تہمت لگا کر انہیں معزول کروانے کی کوشش کی۔ اس پر حضرت عمر نے تجربہ کار صحابی ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو یہاں کا گورنر مقرر کیا اور ان سے فرمایا:

> ابو موسی! آپ کو میں ایسی سرزمین کی طرف بھیج رہا ہوں جہاں شیطان نے انڈے دے دیے ہیں اور ان میں سے چوزے بھی نکل آئے ہیں۔ اس لیے جو طریقہ آپ کو معلوم ہے، اس کی پابندی کیجیے گا۔ اور تبدیل مت ہو جایئے گا ورنہ اللہ بھی اپنا طریقہ آپ کے ساتھ تبدیل کر لے گا۔[9]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ میں ہونے والی تبدیلیوں پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گہری نظر تھی۔ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمائش کی کہ ان کے ساتھ مددگاروں کے طور پر مہاجرین و انصار کے صحابہ کو بھیجا جائے کہ یہ امت کے کاموں میں ایسے ہیں جیسے کھانے میں نمک۔ حضرت عمر نے اسے منظور کر کے انہیں اجازت دی کہ وہ جسے لے جانا چاہیں، لے جائیں۔ وہ اپنے ساتھ 29 صحابہ کو لے کر گئے جن میں انس بن مالک، عمران بن حصین اور ہشام بن عامر رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ ابو موسی نے کوفہ جا کر حضرت مغیرہ پر الزام کی تحقیق کی اور جب یہ جھوٹا ثابت ہوا تو الزام لگانے والوں پر قذف (جھوٹا الزام) کی سزا نافذ کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یہ لوگ حضرت ابو موسی کے خلاف شکایات لے کر پہنچ گئے۔

اس وقت کوفہ کی آبادی ایک لاکھ کے قریب تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پریشان تھے کہ یہ عجیب شہر ہے جہاں کے لوگ ہر گورنر کے خلاف شکایتیں لے کر آ جاتے ہیں۔ آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کوفہ پر کیسا حاکم مقرر کیا جائے، نرم اور متقی پرہیز گار یا سخت۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے رائے دی کہ سخت حاکم بہتر رہے گا۔ حضرت عمر نے انہی کو پھر کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔[10] پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے اور گورنر ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ پر شراب نوشی کا الزام عائد کر دیا اور پھر دوسرے گورنر سعید بن عاص رحمہ اللہ کے زمانے میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

---

[9] طبری۔ 13H/3/1-81

[10] ایضاً۔ 17H/3/1-183

باغی تحریک عہد عثمانی میں پروان کیسے چڑھی؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں انٹیلی جنس کا نیٹ ورک اس درجے میں قائم نہ رہ سکا، جس کی وجہ سے اس تحریک کو کام کرنے میں آسانی ہوئی۔ پھر بھی انہیں مزید دس برس لگے اور تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئے کہ بغاوت برپا کر سکیں۔ اس زمانے میں انہوں نے مختلف قسم کے عناصر کو اکٹھا کیا جو کسی نہ کسی سبب سے حکومت وقت سے ناراض تھے۔ ان عناصر کے اپنے اپنے محرکات تھے اور اس تحریک کو بجا طور پر بھان متی کا کنبہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب عناصر بعد میں چونکہ الگ الگ ہوئے، اس وجہ سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں کون کون سے گروہ شامل تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

- **پہلا عنصر** باغیوں کے ان لوگوں کا تھا، جو خلفائے راشدین کی حکومت سے مطمئن نہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہر حکومت کے باغی ہی ہوتے ہیں۔ انہیں صرف وہی حکومت پسند آتی ہے جو ان کی اپنی ہو ورنہ یہ ہر حکومت پر سوائے تنقید کے اور کچھ نہیں کرتے اور اگر ان کا بس چلے تو بغاوت بھی برپا کر دیتے ہیں۔ ہمارے دور میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں اور انہیں انارکسٹ (Anarchist) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض کو کوفہ کے گورنر سعید بن عاص رحمہ اللہ نے گرفتار کر کے شام میں بھیج دیا تھا۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ ان میں بعض جرائم پیشہ چور اور ڈاکو بھی شامل تھے جن میں باغی تحریک کے بصرہ چیپٹر کا سربراہ حکیم بن جبلہ بھی شامل تھا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ جب مسلم فوج کہیں جاتی تھی تو یہ بھی ساتھ چلا جاتا تھا اور جب فوج واپس آتی تو یہ رک جاتا اور غیر مسلموں کے علاقے میں لوٹ مار کرتا۔[11]
- **دوسرا عنصر** وہ لوگ تھے جو محض اقتدار کے لالچ میں بغاوت میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں کی حکومت افغانستان سے لے کر لیبیا تک پھیل چکی تھی۔ حکومت کے خراج کی آمدنی کروڑوں میں تھی۔ باغیوں کو تکلیف یہ تھی کہ اس دولت کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں کیوں نہیں ہے؟ چنانچہ یہ لوگ بغاوت میں شریک ہو گئے۔ کوفہ کے زیادہ تر باغی اسی قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض نے جذبات میں آ کر کوفہ کے گورنر سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہنگامہ برپا کیا جس کی نتیجے میں انہیں قید کی سزا بھگتنا پڑی۔ مالک اشتر جو بعد میں باغیوں کا سرغنہ بنا اسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔[12]
- **تیسرا عنصر** وہ متقی و پرہیز گار لوگ تھے جو ایک قسم کے مذہبی تکبر کا شکار تھے۔ انگریزی میں ان کے لیے Self-righteous اور Holier than thou کے محاورات مستعمل ہیں۔ یہ اپنے سوا سب ہی کو کافر، فاسق اور گمراہ سمجھتے تھے اور ایسے لوگ ہمارے زمانے میں بھی موجود ہیں۔ باغیوں میں یہ حضرات نہایت ہی عبادت گزار قسم کے تھے جس کے باعث یہ خود کو

[11] ایضاً۔ 35H/3/1-369

[12] ایضاً۔ 35H/3/1-366

دوسروں سے بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے سابقون الاولون کو بھی اسی نگاہ سے دیکھا اور ان کے اقتدار کے خلاف جدوجہد کی۔ بعد میں یہ گروہ باغی تحریک سے الگ ہو گیا اور "خوارج" کہلایا۔ چونکہ ان میں تنگ نظری، شدت پسندی اور دوسروں کے بارے میں محاکمہ (Judgment) کرنے کی عادت بہت پختہ تھی، اس وجہ سے ان میں آپس میں بھی اتحاد قائم نہ رہ سکا اور یہ جلد ہی بہت سے فرقوں میں تقسیم ہو کر آپس میں لڑنے لگے اور بالآخر تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے۔

- **چوتھا عنصر** یہودیوں کا تھا۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق مدینہ کے تحت انہیں پورے حقوق دیے لیکن انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ ان کے خلاف کاروائی ہوئی تو یہ خیبر میں جا کر قلعہ بند ہو گئے۔ جنگ خیبر میں یہودیوں کی پوری قوت ٹوٹ گئی اور اس کے بعد یہ مکمل طور پر مسلمانوں کے فرمانبردار بن گئے۔ تاہم ان یہودیوں میں ایک طبقہ وہ تھا جو اندر ہی اندر مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا کام کرتا تھا۔ ان میں سے بعض نے بظاہر اسلام قبول کر بھی لیا اور پھر باغی تحریک کو منظم کیا۔ اس تحریک کے مشہور لیڈر عبداللہ بن سبا کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا۔
- **پانچواں عنصر** بعض نااہل نوجوانوں کا تھا جو کہ عہدہ نہ ملنے کے سبب حکومت سے ناراض ہوئے۔ ان میں محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ نمایاں تھے۔ حضرت ابو بکر اور ابو حذیفہ رضی اللہ عنہما دونوں جلیل القدر صحابی تھے۔ محمد بن ابی بکر، حضرت ابو بکر کے سگے اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سوتیلے بیٹے تھے اور انہوں نے ان کی پرورش کی تھی۔ دوسری طرف محمد بن ابی حذیفہ کی پرورش خلیفہ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے اخراجات حضرت عثمان نے اٹھائے تھے کیونکہ آپ بہت سے یتیموں کی کفالت کرتے تھے۔ یہ دونوں جب جوان ہوئے تو انہیں خواہش ہوئی کہ انہیں بھی حکومت میں اعلی عہدے ملیں مگر یہ ان کے اہل نہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں مصر بھیج دیا تاکہ یہ وہاں کے گورنروں کے ساتھ رہ کر تجربہ حاصل کریں لیکن انہوں نے وہاں سرکشی کا رویہ اختیار کر لیا۔ جب مصر میں باغی تحریک منظم ہوئی تو یہ اس کا حصہ بن گئے۔[13]
- **چھٹا عنصر** ان لوگوں کا تھا جن کے کسی قریبی رشتے دار کو کسی جرم کی پاداش میں حکومت نے سزا دی تھی۔ یہ انتقامی جذبے سے باغیوں کا حصہ بن گئے تھے۔ ان میں خاص کر وہ لوگ شامل تھے جنہیں حضرت عثمان نے جلاوطنی یا قید کی سزا دی۔ ان میں کعب بن ذی الحبکہ، مالک بن عبداللہ اور ضابی بن حارث کے نام طبری نے بیان کیے ہیں۔ اسی ضابی کا بیٹا عمیر آپ کی شہادت میں شریک تھا اور اس نے کود کر آپ کی کئی پسلیاں توڑ دی تھیں۔[14]
- **ساتواں عنصر** وہ لوگ تھے جو مذہبی بنیادوں پر اسلام سے بطور دین سے دشمنی رکھتے تھے اور اس کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی

[13] ایضاً۔ 35H/3/1-457

[14] ایضاً۔ 35H/3/1-460

وہ گروہ ہے جو بعد میں زنادقہ ، ملاحدہ (Atheists) وغیرہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ لوگ بالعموم کسی قسم کی اخلاقیات کے قائل نہیں ہوتے اور موجودہ دور میں Nihilist کہلاتے ہیں۔

- **آٹھواں عنصر** ان سادہ لوح مخلص لوگوں کا تھا جو باغیوں کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ ان میں سے متعدد ان کے ساتھ آ تو گئے لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں سمجھایا تو یہ واپس ہو لیے۔
- **نواں عنصر** غیر حجازی قبائل کے وہ لوگ تھے جنہیں مہاجرین و انصار کے اقتدار سے حسد محسوس ہوتا تھا۔ یہ بنیادی طور پر قبائلی تعصب تھا۔ ان لوگوں کو اس بات کی تکلیف تھی کہ اقتدار ان کی بجائے، مہاجرین و انصار کے ہاتھ میں کیوں ہے۔ یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی تھی کہ ان لوگوں کو بغاوت پر ابھارنے میں حسد کا بنیادی کردار تھا۔[15]

ابن خلدون اس تحریک کا تجزیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جس وقت اللہ تعالی نے مسلمانوں کو کامل فتح عنایت فرمادی اور اکثر ممالک ملت اسلامیہ کے زیر نگیں آ گئے، اس وقت اہل عرب نے بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں اپنے اور دیگر اقوام کے سرحدی علاقوں میں رہائش اختیار کر لی۔ اقتدار ان لوگوں کے سپرد تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف سے ممتاز اور آپ کی دی گئی ہدایت کے پوری طرح پیروکار وہ لوگ تھے جن کا تعلق مہاجرین، انصار، قریش اور اہل حجاز سے تھا۔ باقی عرب بنو بکر بن وائل، عبد القیس، ربیعہ، ازد، کندہ، تمیم اور قضاعہ وغیرہ اس عزت و شرف سے ممتاز نہیں تھے۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب نہیں ہوئی تھی اور اگر ان میں سے چند ایک لوگوں کو یہ صحبت ملی بھی تھی تو نہایت مختصر۔ چونکہ (روم و ایران کی) فتوحات میں انہی کا حصہ زیادہ تھا، اس وجہ سے یہ خود کو سابقون الاولون صحابہ سے افضل سمجھنے لگے اور اپنے حقوق کو زیادہ خیال کرنے لگے۔
>
> (دور جاہلیت میں یہ لوگ) نبوت، وحی اور نزول ملائکہ کے بارے میں تردد میں تھے۔ پھر (روم و ایران کے خلاف جنگ شروع ہوئی تو یہ مصروف ہو گئے۔) عام لشکر کشی کے زمانے میں انہیں اس کا احساس نہ ہوا لیکن فتوحات کے بعد جب مصلحتاً سلسلہ فتوحات کو روکنا پڑا تو انہوں نے اس معاملے کو محسوس کیا کہ ان پر مہاجرین، انصار، قریش اور ان کے علاوہ اور قبائل کے لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ اس پر یہ دل ہی دل میں کشیدہ ہونے لگے۔ اسی اثنا میں امیر المومنین عثمان کا آخری زمانہ خلافت آ گیا۔ اب ان لوگوں نے ممالک اسلامیہ کے گورنروں کے خلاف زبان طعن و تشنیع دراز کرنا شروع کی ۔ امیر المومنین کے احکام میں سستی کرنے لگے اور انتظامی امور پر سوال اٹھانے لگے۔ کبھی کسی گورنر کی تبدیلی کی درخواست کرتے اور کبھی کسی اور عہدے دار کی معزولی کی التجا کرتے۔ غرض یہ لوگ ہر طرح سے امیر المومنین عثمان کی مخالفت پر تل گئے۔[16]

واضح رہے کہ ہم نے اوپر بیان کردہ لوگوں کے نام محض تاریخ طبری سے نقل کر لیے ہیں تاہم ہم اس بات کو درست نہیں سمجھتے ہیں کہ محض تاریخی روایات کی بنیاد پر کسی کی کردار کشی کی جائے۔ ان لوگوں کے نام زیادہ تر واقدی اور سیف بن عمر کی روایات میں نقل ہوئے

---

[15] ایضاً۔ 3/2-107

[16] ابن خلدون۔ دیوان المبتدا و الخبر فی تاریخ العرب و البربر۔ 2/586۔ بیروت: دار الفکر۔ (ac. 29 June 2009) www.waqfeya.com

ہیں جو کہ بذات خود قابل اعتماد نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ لوگ ویسے نہ ہوں جیسا کہ تاریخی روایات میں بیان کیا گیا ہے۔ قاتلین عثمان چونکہ نہایت ہی بدنام گروہ ہے، اس وجہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی راوی نے اپنی ذاتی یا قبائلی دشمنی کے سبب کسی کا نام قاتلین عثمان میں شامل کر دیا ہو۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ہر شخص کے بارے میں حسن ظن سے کام لیں اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں۔ ہاں کسی شخص کے بارے میں اگر تواتر سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے کوئی جرم کیا تھا، تو پھر اس پر یقین کیا جا سکتا ہے۔

باغی تحریک کا مرکز کون سے علاقے بنے؟

یہ بات بھی معلوم اور معروف ہے کہ باغیوں کے مراکز عراق اور مصر تھے اور یہیں سے ان کی بڑی تعداد مدینہ پر حملہ آور ہوئی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں ایسی کیا خصوصیت تھی جس کے سبب باغیوں کی تحریک یہاں پھلی پھولی اور دوسرے شہروں میں یہ کامیاب نہ ہو سکی؟ یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ پورے کا پورا عراق یا مصر باغی تحریک سے متاثر نہیں ہوا بلکہ صرف تین شہر تھے جو اس تحریک سے متاثر ہو سکے اور یہ کوفہ، بصرہ اور فسطاط (موجودہ قاہرہ کا ایک حصہ) کے شہر تھے۔ باغیوں نے عالم اسلام کے بہت سے شہروں میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی لیکن انہیں اس میں ناکامی ہوئی البتہ ان تینوں شہروں میں انہیں کچھ ساتھی میسر آ گئے جس کی کچھ خاص عمرانی (Sociological) وجوہات تھیں۔

ہم لوگ یہ عام مشاہدہ کرتے ہیں کہ قدیم بستیوں میں جرائم کی شرح کم ہوتی ہے جبکہ نئی آبادیوں میں جرائم زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پرانے دیہات اور محلوں میں سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور کسی بھی غلط رجحان کا لوگوں کو فوراً علم ہو جاتا ہے اور پھر اس کے خلاف کاروائی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان محلوں میں اگر کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا بھی ہے تو وہ شریف بن کر ہی رہتا ہے اور اپنی مجرمانہ سرگرمیاں محلے سے باہر ہی انجام دیتا ہے۔ اس کے برعکس نئی آبادیوں میں لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے، جس کی وجہ سے قتل اور اغوا کے مجرم، طوائفیں، غنڈے اور اس قبیل کے لوگ یہاں آ کر آباد ہو جاتے ہیں۔ بعد میں جب یہ علاقے اچھی طرح آباد ہو جاتے ہیں اور لوگ ایک دوسرے کو جاننے لگتے ہیں، تو پھر یہ جرائم پیشہ لوگ کوئی اور نئی بستی تلاش کرتے ہیں۔ اس عمل میں بسا اوقات پچاس سو سال بلکہ اس سے بھی زائد کا عرصہ بھی لگ جاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں سرحدی علاقوں میں تین بڑے شہر آباد کیے گئے جو کہ کوفہ، بصرہ اور فسطاط کہلائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تیونس میں قیروان کے شہر پر کام شروع ہوا۔ ان الگ شہروں کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ مفتوحہ علاقوں میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت تھی۔ اس بات کا خطرہ موجود تھا کہ ان میں سابقہ بادشاہوں کے ساتھی بھی موجود ہوں گے جو کسی بھی وقت کوئی مسئلہ کھڑا کر سکیں گے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عرب جو صحرائی طرز زندگی کے عادی تھے، کے لیے شہروں میں ایڈجسٹ ہونا مشکل تھا۔ فوج کے گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے بھی ایسے مقامات درکار تھے جہاں انہیں اپنا قدرتی ماحول ملے اور ساتھ ہی چارہ کی فراوانی ہو۔ اس وجہ سے ضرورت تھی کہ ان علاقوں میں بڑی فوجی چھاؤنیاں آباد کی جائیں تا کہ یہاں مسلمانوں کا

اقتدار مستحکم ہو سکے۔ اسی مقصد کے لیے یہ تینوں شہر آباد کیے گئے جو کہ بنیادی طور پر گیریژن ٹاؤن تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فوجی چھاؤنیوں میں غیر فوجی خدمات کی ضرورت پڑتی ہے، اس وجہ سے وہاں بڑی تعداد میں سویلین بھی آباد ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی تقریباً ہر شہر کے کینٹ کے علاقے میں بہت سے سویلین رہتے ہیں۔ اس زمانے میں فوجی اور سویلین کی تقسیم نہ تھی بلکہ ہر شخص ہی عسکری تربیت یافتہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں باقاعدہ تنخواہ دار فوج قائم ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان تینوں شہروں میں بڑی تعداد میں عام لوگ بھی رہنے لگے۔ چونکہ آبادیاں نئی تھیں، اس وجہ سے ان میں جرائم پیشہ اور باغیانہ ذہن رکھنے والے لوگ بھی آ کر آباد ہوئے۔ یہی وہ لوگ تھے، جن میں باغی تحریک کو پذیرائی ملی۔ عبداللہ بن سبا کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں، ان کے مطابق اس نے بہت سے شہروں کا دورہ کیا اور ہر جگہ اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ سبھی شہروں میں اسے ناکامی ہوئی البتہ ان تین شہروں میں اسے کچھ ساتھی مل گئے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عراق اور ایران کے علاقوں میں تو بغاوتیں اٹھیں کیونکہ مسلمانوں نے یہاں کی ساسانی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن شام میں ایسا کیوں نہ ہوا؟ یہاں بھی تو مسلمانوں نے قیصر روم کو شکست دی تھی اور اسے شام سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، پھر شام کس طرح مسلمانوں کی قوت کا مرکز بن گیا اور یہاں پر باغی تحریک کامیاب نہ ہو سکی؟ اس کی اصل میں دو وجوہات ہیں: ایک تو یہ کہ شام کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ان کا انٹیلی جنس نظام بہت مضبوط تھا اور انہوں نے یہاں کی پوری آبادی کو ایک بڑی سرگرمی میں مصروف کر دیا تھا۔ بغاوتیں عام طور پر ان علاقوں میں اٹھتی ہیں جہاں لوگ فارغ رہتے ہوں اور ان کے پاس کرنے کا کام نہ ہو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے علاقے میں صنعت کو بہت ترقی دی۔ انہوں نے خاص کر بحری جہازوں کی صنعت قائم کی، جس میں ہزاروں لوگ مصروف ہو گئے۔ انہوں نے عوام کی فلاح و بہبود پر خصوصی توجہ دی اور انہیں پوری طرح مطمئن رکھا۔ ابن سبا کے حالات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شام میں بھی اپنی جماعت کی شاخ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کا بہت جلد علم ہو گیا۔ اس وجہ سے اسے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔

دوسری وجہ مذہبی نوعیت کی تھی۔ شام کے علاقے میں عیسائیوں کے دو بڑے فرقے موجود تھے جو کہ یعقوبی (Jacobites) اور نسطوری (Nasturian) کہلاتے تھے۔ قیصر روم کا تعلق رومن کیتھولک چرچ سے تھا جو کہ اس وقت کے عیسائیوں کا مرکزی فرقہ تھا۔ یعقوبی اور نسطوری فرقے رومن کیتھولک چرچ سے اختلاف رکھتے تھے، جس کی وجہ سے انہیں شدید مذہبی جبر کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جب مسلمانوں نے شام اور مصر کو فتح کیا تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ مسلمانوں کو عیسائیوں کے اندرونی اختلافات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور انہوں نے ان کے سبھی فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی عطا کی۔ شام کے عیسائی فرقوں کے لیے چونکہ مسلمان رحمت کا باعث بنے تھے، اس وجہ سے انہوں نے ان کے خلاف کوئی بغاوت برپا نہ کی اور ایرانیوں کے برعکس مکمل طور پر مسلمانوں کے وفادار رہے۔

سازشوں کا اصل مرکز کوفہ تھا۔ یہاں پر ایسے مفسد لوگ موجود تھے جو انارکی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو حضرت عمر رضی

اللہ عنہ جیسے سخت ایڈمنسٹریٹر کے دور میں بھی اپنے گورنروں کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ کوفہ کے تمام باشندے ایسے تھے۔ ان کی غالب اکثریت دین پر چلنے والے نیک لوگوں کی تھی البتہ یہاں کی آبادی میں فسادیوں کا تناسب دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ تھا۔ انہوں نے 30/651 میں یہاں پر پہلا فساد برپا کیا اور ایک نوجوان ابن حیسمان خزاعی کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کو اس کے ایک پڑوسی صحابی ابو شریح رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے شور مچا کر ان لوگوں کو گرفتار کروا دیا۔ مقدمے کی سماعت ہوئی اور گورنر کوفہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان سے پوچھ کر ان فسادیوں کو قتل کروا دیا۔ ابو شریح رضی اللہ عنہ اس وجہ سے کوفہ منتقل ہوئے تھے کہ وہ جہاد میں حصہ لے سکیں۔ یہ صورتحال دیکھ کر انہیں خطرے کا احساس ہوا اور وہ اپنے اہل و عیال سمیت واپس مدینہ چلے آئے۔[17]

باغی تحریک کے بارے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں اس کی جڑیں کافی دور تک پھیل گئی تھیں اور وہ تمام لوگ جو بظاہر مسلمان اور اندر سے منافق تھے، اس کا حصہ بن چکے تھے۔ اس سلسلے میں طبری نے ایک پر اسرار شخصیت عامر بن عبد قیس کا واقعہ نقل کیا ہے۔ ان صاحب کی عادات عجیب و غریب تھیں۔ ان پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ یہ نہ تو نکاح کرتے ہیں، نہ جمعہ کی نماز میں شریک ہوتے ہیں اور نہ ہی گوشت کھاتے ہیں اور اپنے معاملات کو خفیہ رکھتے ہیں۔ بصرہ کے گورنر سعید بن عامر نے انہیں گرفتار کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے پاس بھجوا دیا۔ انہوں نے انہیں اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور ان سے ان باتوں کے بارے میں پوچھا۔ عامر نے جواب دیا: "میں جمعہ کی نماز میں شریک ہوتا ہوں لیکن آخری صف میں اور نماز ختم ہوتے ہی واپس آ جاتا ہوں۔ نکاح کا مسئلہ یہ ہے کہ میں جہاں شادی کا پیغام بھیجتا ہوں تو لوگ وہیں اپنا رشتہ بھیج دیتے ہیں اور معاملہ طے نہیں ہو پاتا۔ گوشت کھانے میں قائل ہوں لیکن اس وقت سے میں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا جب سے میں نے ایک قصاب کو دیکھا کو وہ بکری کو گھسیٹ کر لے گیا اور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینے کی بجائے "نفاق، نفاق" کہتا رہا۔"[18] اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر منافقین اس معاشرے میں موجود تھے اور یہی وہ لوگ تھے جو باغیوں کے ساتھی بنے۔ یہ غالباً وہی لوگ ہوں گے جن کے دلوں میں اسلام سے بغض ہو گا مگر اسلام کی طاقت سے مرعوب ہو کر انہوں نے بظاہر اسلام قبول کر لیا ہو گا۔ اب جب انہیں باغی تحریک کی صورت میں ایک راستہ نظر آیا تو یہ اس میں شامل ہوتے چلے گئے۔

ولید بن عقبہ اس وقت تک کوفہ میں محبوب ترین شخصیت تھے کیونکہ وہ عام لوگوں، خاص کر غلاموں اور لونڈیوں کی کفالت کرتے تھے۔[19] وہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کے منتظم تھے اور آرمینیا کے بہت سے علاقوں کے فاتح تھے۔ اب باغیوں نے انہیں بدنام کرنے کی

[17] طبری۔ 35H/3/1-307

[18] ایضاً۔ 35H/3/1-372

[19] ایضاً۔ 35H/3/1-285

ٹھائی۔ ولید اپنے گھر کا دروازہ کھلا رکھتے تھے تا کہ کوئی بھی فریادی ان کے پاس ہر وقت آ سکے۔ باغیوں نے رات کے وقت ان کے گھر میں گھس کر ان کی انگوٹھی چرا لی۔ پھر ولید پر شراب نوشی کا الزام عائد کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ کر ولید کے خلاف گواہیاں بھی پیش کر دیں اور اپنی گواہی کے ثبوت میں انگوٹھی پیش کر دی۔ حضرت عثمان جانتے تھے کہ الزام جھوٹا ہے لیکن عدالتی فیصلے ظاہری شہادت پر ہوتے ہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا: "ہم حد شرعی کو قائم کریں گے۔ جھوٹے گواہ کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ میرے بھائی! تم صبر کرو۔" اس کے بعد انہوں نے ولید کو شراب نوشی کی سزا سنائی۔[20] بعد میں انہی باغیوں کے پیروکاروں نے وہ جھوٹی روایت گھڑی جس کے مطابق سورۃ الحجرات کی آیت 6، ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس روایت کا مقصد بھی سوائے ولید کو بدنام کرنے کے اور کچھ نہ تھا۔ ان کی معزولی پر کوفہ کے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور لونڈیوں نے مرثیے کہے۔

اس کے بعد حضرت عثمان نے سعید بن عاص رضی اللہ عنہما کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ سعید بھی یتیم تھے اور ان کی پرورش حضرت عثمان نے کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں متعدد عہدوں پر قائم رکھا تھا۔ سعید کوفہ میں ایک خاص مجلس منعقد کرتے تھے جس میں وہ اہم معاملات طے کرتے تھے۔ ایک دن اس مجلس میں بعض فسادی موجود تھے۔ باتوں ہی باتوں میں تلخ کلامی ہوئی اور انہوں نے ایک نوجوان کو حضرت سعید کے سامنے زدو کوب کر کے بے ہوش کر دیا۔ ان میں مالک اشتر، ابن ذی الحبکہ، جندب، صعصعہ، ابن الکواء بن کمیل اور عمیر بن ضابی نمایاں تھے اور یہ سب کے سب وہ لوگ ہیں جن کے نام قاتلین عثمان کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں تاہم ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ محض تاریخی روایات ہی ہیں اور ان کی بنیاد پر کسی کی کردار کشی نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت سعید نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی لیکن کوفہ میں فساد پھیلتا گیا۔ حضرت عثمان نے انہیں لکھ کر بھیجا کہ ان مفسدین کو شام میں جلاوطن کر دیں۔ وہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں نظر بند رکھا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا، انہیں اپنے ساتھ صبح شام کھانا کھلایا اور ان کی دلجوئی کی۔ آپ نے انہیں بھرپور طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ لوگ قبیلہ قریش بالخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں دل میں شدید بغض رکھتے تھے۔ یہاں ہم طبری کی روایت کے مطابق حضرت معاویہ کی ان لوگوں کے ساتھ گفتگو نقل کر رہے ہیں، جس سے ان کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے:

> **معاویہ:** آپ لوگ عرب قوم میں سے ہیں، آپ نے اسلام کے ذریعہ عزت حاصل کی اور اسی کی بدولت دوسری قوموں پر غالب آئے اور ان کے مراتب اور میراث آپ کو ملی۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ قریش سے ناراض ہیں۔ اگر قریش کا قبیلہ نہ ہوتا تو آپ اسی طرح ذلیل و خوار رہتے جیسا کہ پہلے تھے۔ [دور جاہلیت میں عرب کے سرحدی قبائل روم اور ایران کے تحت رہنے پر مجبور تھے۔] آپ کے حکمران آج تک آپ لوگوں کے لیے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے آپ اپنی ڈھال سے الگ نہ رہیے۔ آپ کے حکام آج کل آپ کی زیادتیوں پر صبر کر رہے ہیں اور آپ کی دی گئی تکالیف کو برداشت کر رہے ہیں۔ خدا کی قسم! اپنی حرکتوں سے باز آ جایئے ورنہ اللہ آپ کے اوپر وہ حاکم مسلط فرمائیں گے جو آپ پر ظلم و ستم کرے گا اور اسے صبر و تحمل کا کوئی خیال نہیں ہو گا۔ اس طرح آپ لوگ اپنی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی عوام پر ظلم کرنے

[20] ایضاً۔ 35H/3/1-312

میں ان لوگوں کے شریک اور ذمہ دار سمجھے جائیں گے۔

ایک باغی (غالباً صعصعہ بن صوحان): آپ نے قریش کا ذکر کیا ہے، مگر قریش کا قبیلہ عرب میں اکثریت میں نہیں ہے اور نہ ہی وہ دور جاہلیت میں سب سے طاقتور قبیلہ تھا کہ آپ ہمیں اس سے خوفزدہ کریں۔ آپ نے ڈھال کا ذکر کیا ہے تو ڈھال جب ٹوٹ جائے گی تو ہمارے لیے میدان خالی ہو جائے گا۔

معاویہ: اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ آپ لوگوں کی اپنی حماقت نے آپ کو یہ باتیں کہنے پر مجبور کیا ہے۔ آپ تو اس گروہ کے نمائندہ ہیں مگر مجھے آپ کے اندر عقل نظر نہیں آتی۔ میں آپ پر اسلام کے دور کی اہمیت کو واضح کر رہا ہوں اور اس کی بات کر رہا ہوں جبکہ آپ مجھے دور جاہلیت کی باتیں سنا رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کو نصیحت کی ہے مگر اپنی کم عقلی کی بنا پر آپ ڈھال کے ٹوٹنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو رسوا کرے جنہوں نے آپ لوگوں کے معاملات کو اہمیت دی اور اسے خلیفہ تک پہنچا دیا۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ قریش کو دور جاہلیت اور دور اسلام میں محض اللہ تبارک و تعالیٰ کی بدولت عزت حاصل ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ قریش کا قبیلہ اکثریت میں نہیں تھا اور نہ ہی سب سے طاقتور تھا۔ مگر حسب و نسب کے اعتبار سے انہیں سب سے زیادہ عزت والا سمجھا جاتا تھا۔ اس کا مرتبہ سب سے بلند مانا جاتا تھا اور شرافت اور مروت میں وہ کامل ترین تھے۔ دور جاہلیت میں جب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کو کھائے چلا جا رہا تھا، اس وقت اللہ کی مہربانی سے قریش محفوظ رہے کیونکہ اللہ جسے عزت بخشتے ہیں، اسے ذلیل نہیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔

پھر اللہ نے چاہا کہ وہ ان لوگوں کو جنہیں اللہ نے عزت بخشی ہے، دنیا کی ذلت اور آخرت کے برے انجام سے نجات دلائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے بہترین بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتخاب کیا اور پھر ان کے لیے بہترین ساتھیوں کو منتخب فرمایا۔ آپ کے بہترین صحابہ، قریش میں سے تھے۔ پھر انہوں نے اس اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اور ان خلیفہ (عثمان) کو مقرر کیا گیا اور یہی ان کے لیے موزوں تھے۔۔۔۔

اے صعصعہ! آپ کی بستی عرب کی بدترین آبادی تھی، اس کی پیداوار سب سے زیادہ بدبودار تھی اور اس کی وادی گہری تھی جو کہ شر و فساد میں اتنی مشہور تھی۔ یہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتے تھے اور اگر کوئی شریف آدمی بھی یہاں آ کر ٹھہر تا تو اسے گالیاں ہی سننا پڑتیں اور وہ بدنام ہو جاتا۔ یہ لوگ پورے عرب میں بہت بدنام تھے اور تمام قوموں سے جھگڑتے تھے۔ یہ لوگ ایرانیوں کی رعایا تھے جب ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچی۔ آپ تو چونکہ بحرین کی بجائے عمان میں رہے ہیں، اس لیے آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ آپ اپنی قوم کے بدترین لوگوں میں سے ہیں۔[21]

باغی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی باتوں کو سمجھنے پر تیار نہ ہوئے اور یہی کہتے رہے کہ "آپ لوگ حکومت کے اہل نہیں ہیں۔" بالآخر بات بڑھ گئی اور انہوں نے حضرت معاویہ پر حملہ کر دیا اور ان کے سر اور داڑھی کے بالوں کو پکڑ کر کھینچنے لگے۔ اس پر آپ نے فرمایا: ٹھہر جاؤ! یہ کوفہ نہیں ہے۔ واللہ! اگر اہل شام کو یہ علم ہو گیا کہ تم نے میرے ساتھ، جو ان کا حاکم ہے، یہ سلوک کیا ہے، تو میں انہیں تمہیں قتل

[21] ایضاً۔ 35H/3/1-361

کرنے سے نہیں بچاسکوں گا۔ میری جان کی قسم! تمہاری باتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ان کے پاس سے اٹھ گئے اور فرمایا: "واللہ! میں اب تمہیں کبھی نہیں بلواؤں گا۔" [22]

اس کے بعد حضرت معاویہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو ایک خط لکھا جس میں ان مفسدین کی یہ تفصیلات بیان فرمائیں:

امیر المومنین! آپ نے میری طرف ان لوگوں کو بھیجا ہے، جو شیطان کی زبان سے گفتگو کرتے ہیں اور شیطان ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کے پاس آکر دعوی کرتے ہیں کہ **یہ قرآن کی تعلیم پیش کر رہے ہیں**۔ اس طرح یہ مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں کیونکہ ہر شخص ان کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ان **کا مقصد تفرقہ اور انتشار پھیلانا ہے** اور یہ فتنہ و فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ اسلام انہیں گراں گزرتا ہے اور یہ اس سے بیزار ہیں بلکہ شیطان کی غلامی ان کے دل میں سرایت کر چکی ہے۔ ان لوگوں نے کوفہ میں اپنے گرد بہت سے لوگوں کو خراب کر دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ اہل شام کے درمیان رہے تو یہاں کے لوگوں کو بھی **اپنی جادو بیانی اور فسق فجور کے ذریعے خراب کریں گے**۔ آپ انہیں ان کے شہر لوٹا دیجیے تاکہ یہ اسی شہر میں رہیں جہاں سے ان کی منافقت پھوٹی ہے۔ والسلام۔ [23]

حضرت معاویہ کے اس خط سے باغیوں کے اصل مقصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریک کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ فتنہ و فساد اور انتشار پھیلا کر اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ اس کے بعد انہوں نے ان لوگوں کو شام کے شہر حمص کی طرف بھیج دیا جہاں کے حاکم عبدالرحمن بن خالد بن ولید تھے جو کہ حضرت معاویہ کے ماتحت تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ ان کے شایان شان سلوک کیا اور کہا:

"مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہیں کیسے مخاطب کروں۔ آیا تم عرب ہو یا عجمی؟ مجھ سے اس طرح بات نہ کرنا جیسی میری اطلاع کے مطابق تم معاویہ سے کرتے تھے۔ میں خالد بن ولید کا بیٹا ہوں اور وہ وہ شخص ہیں جنہیں آزمانے والے آزما چکے ہیں۔ میں مرتدین کی کمر توڑنے والے کا بیٹا ہوں۔ خدا کی قسم! اے کمینے صعصعہ! اگر مجھے معلوم ہوا کہ میرے کسی ساتھی نے تمہاری ناک توڑ دی ہے اور پھر تمہارا خون چوس لیا ہے تو میں تمہیں ہی اڑا کر رکھ دوں گا۔"

عبدالرحمن نے انہیں خوب ذلیل کیا اور وہ خود سوار ہو کر نکلتے تو انہیں ساتھ پیدل دوڑاتے۔ تنگ آکر ان باغیوں نے معافی مانگی۔ مالک اشتر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور معافی کا طلب گار ہوا۔ نیک دل خلیفہ نے اسے معاف کر کے آزاد کر دیا۔ [24]

ایک موقع پر باغیوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ خاموشی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا جائے۔ دو باغی عمیر بن ضابی اور کمیل بن زیاد مدینہ روانہ ہوئے اور انہوں نے خلیفہ کے معمولات پر نظر رکھنا شروع کی۔ کمیل نے ایک موقع پر گھات لگا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنا چاہا۔ آپ نے اسے بھانپ لیا اور اس پر پہلے وار کر دیا جس سے یہ زخمی ہو گیا۔ اس نے واویلا مچا دیا: "امیر

---

[22] ایضاً۔ 35H/3/1-368

[23] ایضا

[24] ایضاً۔ 35H/3/1-364

المومنین! آپ نے مجھے زخمی کر دیا ہے۔" آپ نے فرمایا: "تم مجھ پر اچانک حملہ نہیں کرنا چاہتے تھے؟" اس نے کہا: "اس اللہ کی قسم! جو میرا معبود ہے! ایسا نہیں تھا۔" اتنے میں اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور اس کی تلاشی لینے کا ارادہ کیا مگر خلیفہ نے انہیں روک دیا اور فرمایا: "واللہ! میرا خیال یہی تھا کہ تم (مجھے قتل کرنے کے) ارادے سے آئے ہو۔ اگر میں سچا ہوں تو اللہ اجر عظیم عطا کرے گا اور اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تمہیں ذلیل کرے گا۔" یہ کہہ کر آپ اپنے پاؤں پر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے: "کمیل! تم مجھ سے بدلہ لے لو۔" یہ کہہ کر آپ دوزانو ہو گئے۔ اس نے کہا: "میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔"[25] اس طرح سے یہ سازش بھی ناکام ہو گئی۔

ان واقعات سے باغی تحریک پر کوئی اثر نہ پڑا بلکہ انہوں نے اپنی سرگرمیاں خفیہ طریقے سے جاری رکھیں اور کوفہ، بصرہ اور مصر میں کچھ ساتھی اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت انٹیلی جنس کا نظام کچھ کمزور پڑ گیا تھا ورنہ ان لوگوں کے ہاتھ آ جانے کے بعد ان کے بقیہ ساتھیوں کا سراغ لگانا مشکل نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عثمان، معاویہ، سعید بن عاص اور عبدالرحمن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اس تحریک کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ نہ لگا سکے جو آئس برگ کی طرح اندر ہی اندر پھیل چکی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی اور اس تحریک کو انڈر اسٹیمیٹ کیا۔

بدلتے ہوئے سماجی حالات سے باغی تحریک نے کیسے فائدہ اٹھایا؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے دور سے بعض ایسی سماجی تبدیلیوں کا آغاز ہو چکا تھا، جن کا فائدہ باغیوں نے اٹھایا۔ حضرت عمر کے آخری دور تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد قریبی صحابہ یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے جس کی وجہ سے اگلی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بقیہ صحابہ پر آ پڑی تھی۔ ان کی تعداد بہر حال محدود تھی جبکہ ان کے زیر تربیت عام لوگوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص پر انفرادی توجہ دے کر اس کی دینی اور اخلاقی تربیت ایک مشکل کام بن گیا۔ اس وقت بعض لوگوں نے قبائلی بنیادوں پر گروہ بندیوں کا آغاز کر دیا۔ حضرت عمر نے انہیں اس پر سخت تنبیہ کی اور فرمایا:

> مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ لوگوں نے (مخصوص) گروپ بنا لیے ہیں۔ جب دو اشخاص ملتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں کے ساتھیوں میں سے ہیں اور وہ فلاں کے۔ اس طرح کی مجلسوں اور محفلوں کی کثرت ہو گئی ہے۔ واللہ! یہ چیز تمہارے دین میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ نیز آپ لوگوں عزت اور شرافت اور خود آپ کی ذات میں بھی دخل انداز ہو رہی ہے۔ مجھے تو وہ زمانہ نظر آ رہا ہے کہ آپ کے بعد جو لوگ آئیں گے، وہ یہ کہیں گے: "یہ فلاں کی رائے ہے۔" اس طرح یہ لوگ اسلام کو کئی حصوں میں بانٹ دیں گے۔ آپ اپنی مجالس کو وسیع کیجیے اور مل کر بیٹھا کیجیے۔ اس طرح آپ کا اتحاد و اتفاق ہمیشہ قائم رہے گا اور دوسرے لوگوں میں آپ کا رعب زیادہ قائم رہے گا۔ اے اللہ! لگتا ہے کہ یہ لوگ مجھ سے اکتا گئے ہیں۔ میرے احساسات ان کے خیالات سے مختلف ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہماری حالت کیا ہو گی۔ مجھے اتنا علم ہے کہ ان کا صرف اپنے قبیلہ

---

[25] ایضاً۔ 35H/3/1-461

ہی سے تعلق ہے۔ مجھے اپنی جانب اٹھا لے۔[26]

حضرت عمر نے قریش اور انصار پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی کسی دوسرے شہر میں آباد نہ ہو۔ اس پابندی کا مقصد یہ تھا کہ مرکز مضبوط رہے اور صحابہ کرام کی اولادوں کی تربیت خالص دینی ماحول میں ہو۔ دیگر شہروں میں بہت سے غیر مسلم اور ایسے لوگ آباد تھے جن کے ساتھ اختلاط کی صورت میں اندیشہ تھا کہ صحابہ کرام کی اگلی نسل میں کچھ مسائل نہ پیدا ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اگر سرداران قریش مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہو جاتے تو ان کی فیاضی اور کردار کی وجہ سے لوگ ان کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے۔ ممکن ہے کہ ایک دو نسلوں کے بعد یہ گروپ سیاسی پارٹیوں کی شکل اختیار کر جاتے اور امت میں انتشار پیدا ہوتا۔

روایات سے ایسا لگتا ہے کہ لوگ حضرت عمر کی اس پالیسی سے نالاں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے یہ پالیسی تبدیل کی اور مہاجرین و انصار کی بڑی تعداد مدینہ سے نکل کر دوسرے شہروں میں آباد ہوئی۔ اس میں دینی مقاصد بھی تھے کہ ان شہروں میں نو مسلموں کی دینی تربیت کی جائے اور دنیاوی اعتبار سے بھی ان علاقوں کے انتظام میں ان حضرات کے لیے ملازمتیں موجود تھیں اور کاروبار کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ اس پالیسی کی وجہ سے حضرت عثمان بہت مقبول ہو گئے تھے۔[27] تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کے مرکز میں مین پاور کم پڑ گئی جس سے باغیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

حضرت علی، طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم نے مختلف علاقوں میں زمینیں خریدیں اور ان کی آمدنی کا بڑا حصہ ان علاقوں کے غرباء و مساکین پر خرچ کرنے لگے جس کی وجہ سے یہ حضرات مختلف علاقوں میں بہت مقبول ہو گئے۔ حضرت علی مصر میں، حضرت طلحہ بصرہ میں اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کوفہ میں جب مقبول ہوئے تو لوگوں نے اس قسم کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ اگلے خلیفہ علی ہوں گے، یا طلحہ ہوں گے یا زبیر ہوں گے۔ باغیوں نے اس صورتحال سے اس طرح فائدہ اٹھایا کہ انہی مقبول عام شخصیات کے نام کو استعمال کیا اور ان کے نام سے جعلی خطوط لکھ لکھ کر لوگوں کو ورغلانا شروع کر دیا۔

حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانوں میں پہلے فتوحات اور پھر مفتوحہ زمینوں کے خراج کی وجہ سے بے پناہ مال و دولت عالم اسلام میں آنے لگا۔ اس سے عرب نوجوانوں میں وہ برائیاں پیدا ہونے لگیں جو کہ امیر والدین کی اولاد میں پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ ان کا وقت کھیل تماشوں میں گزرنے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کاروائی کرنا پڑی۔ مدینہ اور دیگر شہروں کے بہت سے لڑکے کبوتر بازی کے شوقین بن گئے تھے اور اس میں وقت گزارنے لگے تھے۔ کھیل کود ایک حد میں رہے تو ٹھیک رہتا ہے لیکن یہ بہت زیادہ ہو گیا تو حضرت عثمان نے اس پر پابندی لگائی۔ بعض نوجوانوں نے نشہ کرنا بھی شروع کر دیا۔ طبری کے بیان کے

---

[26] ایضاً۔ 23H/3/1-236

[27] ایضاً۔ 35H/3/1-454

مطابق سوائے شام کے، بقیہ شہروں میں دولت مندی کے یہ مسائل پیدا ہوئے۔[28] کہتے ہیں کہ فارغ ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ چنانچہ باغیوں کو ان نوجوانوں کو ورغلانے کا موقع مل گیا۔

باغیوں نے پراپیگنڈا کے ہتھیار سے کام کس طرح لیا اور یہ کس حد تک کامیاب ہوا؟

پراپیگنڈا کا اصول ہے کہ جھوٹ کو اتنی مرتبہ بولو کہ لوگ اسے سچ مان لیں۔ یہ کام کس کیسے کرتا ہے؟ موجودہ دور میں اس کی مثالیں روزانہ کے اخبارات، اداریوں، کالمز، ٹی وی ٹاک شوز اور کتابوں کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دور قدیم میں اس کا طریقہ کار کچھ مختلف ہوا کرتا تھا کیونکہ ذرائع نقل و حمل اور ذرائع ابلاغ اتنے ترقی یافتہ نہ تھے۔ اسے ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں:

فرض کیجیے کہ آپ قدیم دور کے کسی شہر میں رہتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے آپ کا رابطہ صرف انہی لوگوں کے ذریعے قائم ہے جو تجارت یا کسی اور غرض سے دوسرے شہروں کا سفر کرتے ہیں۔ اچانک ایک شخص باہر سے سفر کر کے آتا ہے۔ شکل و صورت سے وہ بڑا ہی معتبر اور مذہبی آدمی نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور مذہبی سے لوگ ہیں جو اس کے زہد و تقوی کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ آپ سے کہتا ہے کہ میں فلاں شہر گیا تھا، وہاں کا گورنر تو بہت ظلم کر رہا ہے۔ اس طرح اس "ظلم" کے چند ایک واقعات وہ آپ کو سنا دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اس کی بات کا اعتبار نہ کریں۔ کچھ دن بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی ایسی ہی کہانیاں سنا دیتا ہے۔ اگر دس بارہ ایسے افراد آ کر آپ کو اس تواتر سے کہانیاں سنائیں تو آہستہ آہستہ آپ ان سے متاثر ہونے لگیں گے اور دوسرے شہر کی حکومت کے بارے میں بدگمان ہو جائیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پراپیگنڈا اسی طرح کیا گیا اور بعض لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم تو بڑے اچھے حالات میں ہیں لیکن دوسرے تمام شہروں میں حکام بڑا ظلم و ستم کر رہے ہیں۔

ظلم و ستم کی داستانیں بھی بڑی دلچسپ تھیں۔ یہ کہا گیا کہ امیر المومنین کے لیے سفید پوستین حاصل کرنے کے لیے ہماری بکریوں کو ذبح کر کے ان کی کھال اتار لی جاتی ہے۔ ہم تو یہ بھی برداشت کرتے رہے لیکن اب تو ہماری ہر خوبصورت لڑکی کو یہ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ذاتی نوعیت کے الزامات لگائے گئے کہ آپ اقربا پروری کرتے ہیں، اپنے خاندان کے لوگوں کو حکومتی عہدوں پر مسلط کرتے ہیں، سرکاری خزانے کو اپنے رشتہ داروں پر لٹاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام الزامات کا ہم علیحدہ سیکشنز میں مطالعہ کریں گے۔

باغیوں کا یہ پراپیگنڈا مجموعی طور پر ناکام رہا اور اس سے کوئی بہت زیادہ لوگ متاثر نہ ہوئے۔ عالم اسلام کی اس وقت کی آبادی کروڑوں میں تو رہی ہو گی جبکہ ان تینوں شہروں یعنی بصرہ، کوفہ اور مصر کی آبادی بھی اس وقت لاکھوں میں تھی مگر ان باغیوں کو بمشکل چند ہزار لوگ مل سکے۔ اپنی نرمی اور حلم کی وجہ سے حضرت عثمان ایک نہایت ہی محبوب خلیفہ تھے۔ اگر مسلم دنیا کی آبادی کی اکثریت میں یہ

[28] ایضاً۔ 35H/3/1-456

پراپیگنڈا کامیاب ہو گیا ہوتا تو آپ کے قصاص کے لیے کبھی اتنے لوگ نہ نکلتے کہ جنگ و جدال کی نوبت آ جاتی۔ تاہم ان چند ہزار انقلابیوں نے اتنا ضرور کر لیا کہ خلیفہ مظلوم کو شہید کر کے عالم اسلام میں چند سال فتنہ برپا کیے رکھا۔

باغیوں کا ایک خاص طریقہ یہ تھا کہ وہ صحابہ کرام کے ناموں سے فرضی خطوط لکھا کرتے تھے اور نیچے ان کی دستخط بھی کر دیتے اور مہر بھی لگا دیتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انگوٹھی تھی جس سے حضور مہر لگایا کرتے تھے۔ یہ انگوٹھی آپ کے بعد خلفائے راشدین میں منتقل ہوتے ہوتے حضرت عثمان کے پاس آئی۔ اس انگوٹھی کی حیثیت سرکاری مہر کی تھی اور خلفائے راشدین اس سے اپنے خطوط پر مہر لگایا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک بار کنویں کے کنارے بیٹھے تھے۔ انگوٹھی انگلی میں کچھ ڈھیلی تھی، اس وجہ سے وہ کنویں میں گر گئی۔ لوگوں نے اس کنویں میں اسے تلاش کیا اور اس کا سارا پانی نکال دیا لیکن انگوٹھی نہ ملی۔ ممکن ہے کہ یہ باغیوں کے کسی ایجنٹ کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ بعد میں باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام سے جعلی خطوط لکھے جن پر یہ مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ویسی ہی ایک مہر بنوا لی ہو۔ ان باغیوں نے خاص کر حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے نام سے جھوٹے خطوط لکھے۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ ایک طرف حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کھڑی ہو جائے اور اس میں جو کچھ غلط ہو، اس کا الزام حضرت علی، طلحہ اور زبیر پر آ جائے۔

عبداللہ بن سبا کا کردار کیا تھا؟

طبری کی روایات کے مطابق عبداللہ بن سبا کا تعلق یمن سے تھا۔ یہ حمیری قبائل سے تعلق رکھنے والا ایک یہودی تھا جس نے بظاہر اسلام قبول کیا اور اس کے بعد اس نے ایک ایک شہر جا کر وہاں باغی تحریک کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ یہ خاص کر اس بات کی دعوت دیتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت کی تھی لیکن پہلے تین خلفاء نے ان کا حق غصب کر لیا۔[29] ملوکیت کے پروردہ لوگوں کے لیے اس بات کو سمجھنا آسان تھا کہ بادشاہ کا جانشین اس کے خاندان ہی سے ہونا چاہیے۔ اس طرح سے ابن سبا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کا غلط استعمال کر کے بعض لوگوں کو ورغلا لیا۔

موجودہ دور کے بعض اہل تشیع ابن سبا کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ابن سبا سے متعلق طبری کی تمام روایات صرف سیف بن عمر سے منقول ہیں اور سیف کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک جھوٹا راوی ہے۔ تاہم یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ ابن سبا سے متعلق روایات تاریخ ابن عساکر میں بھی موجود ہیں جن میں سیف بن عمر کے علاوہ دیگر راوی بھی اسے روایت کرتے ہیں۔ ابن عساکر نے شخصیت نمبر 3306 پر ابن سبا کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے ابن سبا کے تذکرے کی بہت سی اسناد بیان کی ہیں، جن میں سے چند ایک کو ہم بطور مثال یہاں درج کر رہے ہیں۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں سے کسی میں سیف بن عمر کا نام نہیں ہے:

- أخبرنا أبو البركات الأنماطي أنا أبو طاهر أحمد بن الحسن وأبو الفضل أحمد بن الحسن قالا أنا عبد الملك بن

[29] ایضاً۔ 35H/3/1-388

محمد بن عبد الله أنا أبو علي بن الصواف نا محمد بن عثمان بن أبي شيبة نا محمد بن العلاء نا أبو بكر بن عياش عن مجالد عن الشعبي

- أنبأنا أبو عبد الله محمد بن أحمد بن إبراهيم بن الحطاب أنا أبو القاسم علي بن محمد بن علي الفارسي ح وأخبرنا أبو محمد عبد الرحمن بن أبي الحسن بن إبراهيم الداراني أنا سهل بن بشر أنا أبو الحسن علي بن منير بن أحمد بن منير الخلال قالا أنا القاضي أبو الطاهر محمد بن أحمد بن عبد الله الذهلي نا أبو أحمد بن عبدوس نا محمد بن عباد نا سفيان نا عبد الجبار بن العباس الهمداني عن سلمة بن كهيل عن حجية بن عدي الكندي
- أخبرنا أبو القاسم يحيى بن بطريق بن بشرى وأبو محمد عبد الكريم بن حمزة قالا أنا أبو الحسن بن مكي أنا أبو القاسم المؤمل بن أحمد بن محمد الشيباني نا يحيى بن محمد بن صاعد نا بندار نا محمد بن جعفر نا شعبة عن سلمة عن زيد بن وهب عن علي[30]

ابن عساکر کی ایک روایت کو یہاں ہم ترجمے کے ساتھ نقل کر رہے ہیں:

أخبرنا أبو بكر أحمد بن المظفر بن الحسين بن سوسن التمار في كتابه وأخبرني أبو طاهر محمد بن محمد بن عبد الله السنجي بمرو عنه أنا أبو علي بن شاذان نا أبو بكر محمد بن جعفر بن محمد الآدمي نا أحمد بن موسى الشطوي نا أحمد بن عبد الله بن يونس نا أبو الأحوص عن مغيرة عن سباط: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ ابن سوداء حضرات ابو بکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کے بارے میں گستاخیاں کرتا ہے۔ انہوں نے اسے بلوایا اور تلوار منگوالی۔ (یا راوی نے یوں بیان کی کہ) آپ نے اس کے قتل کا ارادہ فرما لیا۔ اس کے بارے میں لوگوں نے سفارش کی تو آپ نے فرمایا: "یہ اس شہر میں نہیں رہے گا، جہاں میں ہوں۔" پھر اسے مدائن کی طرف جلاوطن کر دیا۔[31]

صرف اہل سنت ہی نہیں، بلکہ متقدمین شیعہ علماء بھی ابن سبا کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہاں ہم مشہور شیعہ عالم محمد بن عمر بن عبد العزیز الکشی (d. 385/995) کی علم رجال پر لکھی گئی مشہور کتاب "رجال الکشی" سے عبد اللہ بن سبا کے بارے میں موجود تمام روایات نقل کر رہے ہیں جن میں خود اہل تشیع کے راویوں نے ائمہ اہل بیت کے بیانات، عبد اللہ بن سبا کے بارے میں نقل کیے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ اسناد ان کے ہاں کس درجے کی ہیں، مگر بہر حال ان کی سند میں سیف بن عمر موجود نہیں ہے۔ یہ روایتیں اتنی زیادہ اور متنوع (Diverse) ہیں کہ یہ حد تواتر تک پہنچ جاتی ہیں:

حدثني محمد بن قولوية، قال حدثني سعد بن عبدالله بن أبي خلف القمي قال حدثني محمد بن عثمان العبدي عن يونس بن عبد الرحمن عن عبدالله بن سنان قال حدثني أبي عن أبي جعفر عليه السلام: ابو جعفر (محمد باقر) علیہ السلام نے فرمایا: عبد اللہ بن سبا نبوت کا دعوی کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ امیر المومنین (علی) علیہ السلام ہی اللہ تعالی تھے۔ امیر المومنین علیہ السلام تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے اسے

---

[30] ابن عساکر۔ تاریخ مدینہ دمشق۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ جلد 42۔ ص 222۔ بیروت: دار الفکر۔ جلد 29 ص 3۔ شخصیت نمبر 3306 http://www.almeshkat.net/books/open.php?cat=13&book=513 (ac. 10 May 2012)

[31] ایضاً۔ 29/9, 42/221

بلایا اور اس بارے میں پوچھا۔ اس نے اس کا اقرار کیا اور کہا: "جی ہاں۔ آپ ہی وہ (اللہ تعالی) ہیں۔ میرے دل میں یہ بات القاء کی گئی ہے کہ آپ اللہ ہیں اور میں نبی ہوں۔" امیر المومنین علیہ السلام نے اس سے فرمایا: "تمہارا ستیاناس۔ شیطان نے تم پر قبضہ کر لیا ہے۔ اپنی اس بات سے رجوع کر لو اور توبہ کرو۔" اس نے انکار کر دیا۔ آپ نے اسے قید کر دیا اور اسے تین دن تک توبہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ جب اس نے توبہ نہ کی تو آپ نے اسے آگ میں جلوا دیا اور فرمایا: "شیطان نے اسے گمراہ کر دیا تھا۔ وہ اس کے پاس آ کر اس کے دل میں بات القا کرتا تھا۔

حدثني محمد بن قولوية، قال حدثني سعد بن عبدالله قال حدثنا يعقوب بن يزيد ومحمد بن عيسى عن ابن أبي عمير عن هشام بن سالم، قال سمعت أبا عبدالله عليه السلام يقول: ابو عبداللہ (جعفر الصادق) علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کے سامنے عبداللہ بن سبا کی بات بیان کی کہ وہ امیر المومنین علی بن ابی طالب کے بارے میں رب ہونے کا دعوی کرتا تھا۔ انہوں نے بیان کیا: جب اس نے اس بات کا دعوی کیا تو امیر المومنین علیہ السلام نے اسے توبہ کرنے کی تلقین کی۔ اس نے انکار کیا تو اسے آگ میں جلوا دیا۔

حدثني محمد بن قولوية، قال حدثني سعد بن عبدالله قال حدثنا يعقوب بن يزيد ومحمد بن عيسى عن علي بن مهزبار عن فضالة بن أيوب الأزدي عن أبان بن عثمان ، قال سمعت أبا عبدالله عليه السلام يقول: ابو عبداللہ (جعفر الصادق) علیہ السلام نے فرمایا: "اللہ تعالی، عبداللہ بن سبا پر لعنت فرمائے۔ وہ امیر المومنین علیہ السلام کے رب ہونے کا دعوی کرتا تھا۔ واللہ! امیر المومنین علیہ السلام تو اللہ کے فرمانبردار بندے تھے۔ ہلاکت ہو اس شخص پر، جس نے جھوٹ کر ہماری طرف منسوب کیا۔ یہ گروہ ہماری جانب ایسی باتیں منسوب کرتا ہے جو ہم اپنے بارے میں نہیں کہتے ہیں۔ ہم اللہ کے ہاں ان سے بری الذمہ ہیں۔ ہم اللہ کے ہاں ان سے بری الذمہ ہیں۔

عن يعقوب بن يزيد عن ابن أبي عمير وأحمد بن محمد بن عيسى عن أبيه والحسين بن سعيد عن ابن أبي عمير عن هشام بن سالم عن أبي حمزة النمالي قال، قال علي بن حسين صلوات الله عليهما: حضرت علی بن حسین (زین العابدین) صلوۃ اللہ علیہما نے فرمایا: "اللہ اس شخص پر لعنت فرمائے جس نے علی کے بارے میں جھوٹ گھڑا۔ جب میں عبداللہ بن سبا کا ذکر کرتا ہوں تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یقیناً اس نے بہت بڑے امر کا دعوی کیا تھا جس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ علی علیہ السلام تو خدا کی قسم! اللہ کے صالح بندے تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بھائی تھے۔ ان کی جو بھی بزرگی تھی، وہ اللہ کی جانب سے تھی اور اس کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کو بھی صرف اطاعت (خداوندی) کے سبب ہی بزرگی ملی تھی۔

عن محمد بن خالد الطيالسي عن ابن أبي نجران عن عبدالله قال قال أبو عبدالله عليه السلام: ابو عبداللہ (جعفر الصادق) علیہ السلام نے فرمایا: "ہم اہل بیت سچے ہیں۔ ہم کسی ایسے کذاب کو نہ چھوڑیں گے جو ہم سے جھوٹ منسوب کرے اور ہماری سچائی کو لوگوں کے سامنے اپنے جھوٹ سے زائل کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ بات چیت کے معاملے میں لوگوں میں سب سے سچے تھے اور تمام مخلوق میں سب سے بڑے سچے تھے۔ مسیلمہ نے آپ کے بارے میں جھوٹ گھڑا۔ اور امیر المومنین علیہ السلام، رسول اللہ کے بعد نیک لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے۔ وہ شخص جس نے آپ کے بارے میں جھوٹ گھڑا، آپ کی سچائی کی تکذیب کی، اور اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا، وہ عبداللہ بن سبا تھا۔

الکشی کہتے ہیں: بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ وہ اسلام لایا اور علی علیہ السلام کا حمایتی بن گیا۔ وہ جب یہودی تھا تو

حضرت یوشع بن نون، جو حضرت موسی (علیہما الصلوۃ والسلام) کے وصی (خلیفہ) تھے، کے بارے میں غلو کیا کرتا تھا۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی وفات کے بعد اسلام میں داخل ہوا تو علی علیہ السلام کے بارے میں اسی قسم کی باتیں کرنے لگا۔ اس معاملے میں مشہور ہونے والے لوگوں میں وہ پہلا شخص تھا جو علی کی امامت کا اعلان کرتا تھا اور آپ کے دشمنوں سے آپ کی براءت ظاہر کرتا تھا اور آپ کے مخالفین کی کردار کشی کرتا تھا اور انہیں کافر قرار دیتا تھا۔ یہیں سے شیعوں کے مخالفین کو باتیں بنانے کا موقع مل گیا اور انہوں نے کہا کہ تشیع اور رفض کا ماخذ یہودیت ہے۔ زط شہر میں ستر آدمیوں کا گروہ ایسا تھا جو امیر المومنین علیہ السلام کے رب ہونے کی دعوت دیا کرتا تھا۔

حدثني الحسين بن الحسن بن بندار القمي، قال حدثني سعد بن عبدالله بن أبي خلف القمي، قال حدثنا أحمد بن محمد بن عيسه وعبدالله بن محمد بن عيسى ومحمد بن الحين بن أبي الخطاب عن الحسن بن محبوب عن صالح بن سهل عن مسمع بن عبد الملك أبي سيار عن رجل عن أبي جعفر عليه السلام: ابو جعفر (محمد باقر) علیہ السلام نے فرمایا: جب علی علیہ السلام اہل بصرہ کی جنگ (جمل) سے فارغ ہوئے تو ان کے پاس زط سے ایسے ستر آدمی لائے گئے۔ انہوں نے آپ سے اپنے لیڈر کے ذریعے بات کی اور آپ نے ان کے لیڈر کی باتوں کی تردید فرمائی۔ آپ نے ان سے فرمایا: "جیسا کہ آپ لوگ کہہ رہے ہیں، میں ویسا نہیں ہوں۔ میں تو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہوں۔" انہوں نے آپ کی بات سے انکار کر دیا اور کہا: "آپ ہی وہ (اللہ تعالی) ہیں۔" آپ نے ان سے فرمایا: "اگر آپ لوگوں نے اس بات سے رجوع نہ کیا جو آپ کہہ رہے ہیں اور اللہ تعالی سے توبہ نہ کی تو میں ضرور ضرور آپ لوگوں کو مار ڈالوں گا۔" انہوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے لیے ایک گڑھا کھودا جائے جس میں انہیں مار ڈالا جائے۔ انہوں نے گڑھا کھودا اور پھر اس میں کپڑے بھر دیے، پھر اس میں انہیں پھینکا، پھر جب یہ بھر گیا تو اس میں آگ لگا دی اور انہیں اس دھویں میں داخل کر دیا۔ وہ لوگ اسی سے مر گئے۔[32]

اہل سنت اور اہل تشیع کی قدیم کتب میں موجود ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا ایک حقیقی شخص تھا۔ اردن کے ڈاکٹر سامی عطا حسن نے ابن سبا کی شخصیت پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے ابو مخنف جیسے قدیم راوی کے حوالے سے ابن سبا اور اس کے پیروکاروں کے وجود پر بحث کی ہے۔ ابن سبا کے پیروکار "سبئیہ" کہلاتے تھے۔[33]

یہ بات درست ہے کہ ابن سبا کی شخصیت کے گرد کتب تاریخ میں ایک دھند سی موجود ہے۔ اس کے تفصیلی حالات تاریخ کی کتب میں نہیں ملتے اور ملنے بھی نہیں چاہییں۔ آخر وہ ایک بڑی مافیا کا ڈان تھا، اگر اس کی شخصیت کا ہر کس و ناکس کو پتہ چل جاتا تو پھر اس میں اس کا کمال کیا ہوتا؟ اس کا لقب "ابن سوداء" بھی تھا جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کی والدہ کا رنگ سیاہ تھا۔ اس لقب کے استعمال میں بھی کنفیوژن پھیلائی گئی اور یہاں تک کہ صحابی رسول سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو ابن سوداء قرار دے دیا گیا۔ یہ سب ان باغیوں کا پراپیگنڈا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ کنفیوژن پھیلائی جائے۔

---

[32] محمد بن عمر بن عبد العزیز الکشی۔ معرفۃ اخبار الرجال۔ بمبئی: مطبع مصطفویہ 1899ء۔ ص 72-70
http://www.4shared.com/office/35Byd8a-/____.html (ac. 10 May 2012)

[33] سامی عطا حسن۔ عبد اللہ بن سبا الیہودی الیمانی بین الحقیقۃ والخیال۔ ص 8-7۔ اردن: جامعہ آل بیت۔ (www.ssaid.net (ac. 13 Aug 2012)

سیف بن عمر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا مدینہ بھی آیا مگر یہاں اس کی دال نہیں گلی۔ اس کے بعد وہ شام گیا، وہاں اس نے جلیل القدر صحابہ حضرت ابو ذر غفاری اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کو ورغلانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کے لیے اس نے ان حضرات کے ایک خاص رجحان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ان دونوں حضرات کا موقف یہ تھا کہ دولت کو جمع کرنا درست نہیں ہے بلکہ سب کی سب دولت کو فقراء و مساکین میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ اس کے برعکس جمہور صحابہ کا موقف یہ تھا کہ دولت میں سے زکوۃ ادا کر دی جائے اور مزید صدقات دیے جاتے رہیں تو اسے جمع کرنا جائز ہے۔ ابن سبا نے اسی پہلو سے ان حضرات کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے تو اسے جھڑک کر بھگا دیا جبکہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے صرف اتنا کیا کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنا موقف پیش کیا۔ بہر حال ابن سبا کی سازش ناکام رہی۔ اس کی دعوت کو کامیابی بصرہ، کوفہ اور فسطاط میں ہوئی۔ بالآخر وہ فسطاط میں جا کر مقیم ہو گیا اور وہاں اس نے اپنی تحریک کو منظم کیا۔

ابن سبا اور اس کی پارٹی کے ستر آدمیوں کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیے جانے اور پھر اسے جلا کر ہلاک کیے جانے کا واقعہ ہمارے علم کی حد تک صرف اہل تشیع ہی کتابوں میں نقل ہوا ہے اور وہیں سے اہل سنت نے بھی اسے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ہمیں اس بات کی توقع حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی سے نہیں ہے کہ انہوں نے ایسا کیا ہو گا۔ آخری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا کی موت دھویں سے ہوئی تھی۔

حکومت نے باغی تحریک کے خلاف کیا اقدامات کیے؟

تاریخی روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے باغی تحریک کو بڑی حد تک انڈر اسٹیمیٹ کیا، جس کی وجہ سے اس کی بیخ کنی نہ کی جا سکی۔ چونکہ یہ مسلم تاریخ کی پہلی خفیہ تحریک تھی، اس وجہ سے شاید حکومتی اہل کاروں کو اس کی شدت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ چونکہ ان حضرات کی توجہ بیرونی فتوحات کی طرف زیادہ تھی، اس وجہ سے اندرونی انٹیلی جنس کا نظام زیادہ مضبوط نہ کیا جا سکا۔ حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے ادوار میں امن و امان اس درجے میں تھا کہ ایک اکیلی خاتون زیور پہن کر یمن سے چل کر حج کرنے آتی تھی مگر اسے کوئی خطرہ نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انٹیلی جنس قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جا سکی۔ ہمارے دور میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جب سکیورٹی کی کوئی خامی سامنے آتی ہے، تبھی اس کے انتظامات سخت کیے جاتے ہیں۔ امریکہ، یورپ اور عرب ممالک میں بھی نائن الیون تک اتنی سخت سکیورٹی نہیں تھی لیکن جب یہ واقعہ پیش آیا، تبھی انہوں نے سخت انتظامات کیے۔

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت یہ تحریک آشکار ہو جاتی تو اس کے ایام طفولیت ہی میں اسے گربہ کشتن روز اول کے تحت جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاتا۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اس تحریک کے کوفہ چیپٹر کے کچھ لوگوں کو حضرت سعید بن عاص نے گرفتار کر لیا تھا اور حضرت عثمان کی ہدایت پر انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے پاس بھیج دیا تھا۔ انہوں نے انہیں نہایت نرمی سے سمجھایا بجھایا لیکن انہوں نے سرکشی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے پھر انہیں عبدالرحمن بن خالد بن ولید کے حوالے کر دیا جنہوں نے ان پر سختی کی

اور یہ لوگ توبہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ افسوس کہ ان لوگوں سے تفتیش کے دوران ان کے دیگر ساتھیوں کا پتہ نہ لگایا جا سکا، جس کی وجہ سے یہ تحریک اور بھی مضبوط ہوئی۔ بہر حال یہ انٹیلی جنس کی ناکامی (Intelligence Failure) تھی۔

بصرہ کے گورنر سعید بن عامر رضی اللہ عنہ نے بھی باغی تحریک کے مقامی لیڈر حکیم بن جبلہ کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس سے بھی تفتیش میں اس کے مزید ساتھیوں کا پتہ نہ چلایا جا سکا، جس کی وجہ سے بصرہ چیپٹر بھی مضبوط ہو گیا۔ سب سے بڑا خلا مصر کے سیکورٹی اقدامات میں نظر آتا ہے جہاں یہ تحریک بہت مضبوط ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسکندریہ کے مقامی باشندوں نے دو مرتبہ بغاوت کی جسے فرو کرنے کے لیے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو وہاں جانا پڑا۔ اس کے بعد مصر کے گورنر حضرت سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے زیادہ توجہ لیبیا اور سوڈان کو فتح کرنے پر مرکوز کر دی۔ بغاوتوں اور مزید فتوحات کی وجہ سے حکومت کی توجہ اندرونی معاملات کی طرف نہ رہ سکی۔ محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ نے وہاں کھلم کھلا اپنے نظریات کا اظہار کیا لیکن انہیں صرف تنبیہ ہی کی گئی اور ان کے خلاف کوئی سنجیدہ اقدام نہیں کیا گیا۔ ابن سبا کے بارے میں معلوم ہے کہ اسے بھی سب سے زیادہ پذیرائی مصر ہی میں ملی اور وہیں رہ کر اس نے پوری تحریک کو منظم کیا۔

اس موقع پر مناسب رہے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس شاندار اقدام کی تفصیل بھی بیان کر دی جائے، جو "خود احتسابی" کی اعلی مثال ہے۔ ہوا یوں کہ جب باغیوں کے گورنروں کے خلاف جھوٹے الزامات ان تک پہنچے تو انہوں نے ان الزامات کی تحقیق کروائی۔ حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں یہ روایت تھی کہ حج کے موقع پر تمام گورنر اکٹھے ہوتے اور اس موقع پر ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ گورنر کے خلاف اپنی شکایت پیش کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہر شخص، کسی بھی وقت مدینہ پہنچ کر اپنے گورنر کے خلاف شکایت کر سکتا تھا۔ اس طرح گورنروں پر بھی رعب رہتا کہ وہ احتساب سے بالاتر نہیں ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو گورنروں کے خلاف الزامات کی تحقیقات پر متعین کیا:

- کوفہ: محمد بن مسلمہ
- بصرہ: اسامہ بن زید
- شام: عبداللہ بن عمر
- مصر: عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم

یہ تمام کے تمام صحابہ نہایت ہی جلیل القدر تھے۔ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری بہت عرصے سے محکمہ احتساب کے سربراہ تھے۔ حضرت اسامہ بن زید ماہر جنگجو تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کا تقوی معروف ہے اور حضرت عمار بن یاسر سابقون الاولون میں سے تھے اور ان کے والدین اسلام کے پہلے شہیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ رضی اللہ عنہم۔ سوائے حضرت عمار کے باقی سب صحابہ نے متعلقہ علاقوں میں جا کر تحقیقات کیں اور واپس آ کر اپنی رپورٹ مدینہ کے عام لوگوں کے سامنے پیش کی جو کچھ یوں تھی:

اے لوگو! ہم نے وہاں ایسی کوئی قابل اعتراض بات نہیں دیکھی اور نہ ہی وہاں کے خاص اور عام لوگوں کو کسی ناخوشگوار معاملے کا علم ہے۔ مسلمانوں کو اپنے معاملات پر اختیار حاصل ہے، ان کے حکام ان کے درمیان عدل و انصاف کرتے ہیں اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔[34]

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما واپس نہیں آ سکے۔ چونکہ باغیوں کا مصری چیپٹر مضبوط تھا اور ابن سبا وہاں بذات خود موجود تھا، اس وجہ سے یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ باغیوں نے انہیں شہید کر دیا ہو۔ مصر کے گورنر عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا خط مدینہ آیا جس میں لکھا تھا کہ حضرت عمار کو مصر کے ایک گروہ نے اپنی طرف مائل کر لیا ہے اور ان کے پاس لوگ اکٹھے ہونے لگے ہیں جن میں عبداللہ بن سودا (سبا)، خالد بن ملجم، سودان بن حمران اور کنانہ بن بشر شامل ہیں۔[35]

غالی راویوں جیسے سیف بن عمر نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو خاص ہدف بنا کر ان کے متعلق روایات وضع کی ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمار کو حضرت عثمان کا مخالف ثابت کیا جائے اور انہیں اپنی باغی تحریک کا ایک رکن ظاہر کیا جائے۔ باغیوں کو بھی اس کی ضرورت رہی ہو گی کہ کم از کم کچھ صحابہ کو اپنا ساتھی ظاہر کیا جائے تاکہ ان کی تحریک کو سند جواز حاصل ہو۔ اوپر بیان کردہ روایت بھی اسی نوعیت کی ہے جو کہ سیف بن عمر نے بیان کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ باغیوں نے، جو جعل سازی کے فن میں ید طولی رکھتے تھے، ابن ابی سرح کے نام سے یہ خط خود ہی لکھ لیا ہو تاکہ اصحاب رسول میں پھوٹ ڈلوائی جا سکے یا پھر ابن ابی سرح تک غلط اطلاعات پہنچائی گئی ہوں۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو باغیوں نے قید کر لیا ہو اور پھر انہیں "ابن سوداء" مشہور کر دیا ہو۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو واپسی میں کچھ دیر ہو گئی تو ان باغیوں نے آپ کے بارے میں مشہور کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ مل گئے ہیں۔ ایک اور روایت میں تو حضرت عمار ہی کو "ابن سوداء" قرار دیا گیا ہے۔ سیف بن عمر ہی کی روایت میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمار اور عباس بن عتبہ بن ابی لہب میں لڑائی ہو گئی تھی جس پر حضرت عثمان نے انہیں کچھ علامتی سزا دی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علامتی سزا ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے بالکل اوائل میں اسلام لانے والا ایک صحابی، جس نے اپنے والدین کو اپنے سامنے شہید ہوتے دیکھا ہو، اور پھر خود بھی کفار مکہ کی ماریں سہی ہوں، آخر عمر میں آ کر خلیفہ وقت اور تمام صحابہ کرام کو چھوڑ کر باغیوں سے مل جائے؟ اگر ایسا ہوتا تو دیگر صحابہ جیسے حضرت علی، طلحہ، زبیر، سعد رضی اللہ عنہم انہیں کم از کم ملامت تو کرتے لیکن ایسے کسی واقعے کی کوئی روایت نہیں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جب مختلف علاقوں سے رپورٹیں پہنچیں کہ ان کے حکام نے کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا اور یہ سب باغیوں کا پراپیگنڈا ہے، تو انہوں نے مختلف شہروں میں ایک خط بھیجا:

---

[34] طبری۔ 35H/3/1-387

[35] ایضاً۔ 3/1-388

میں نے حکام کے لیے یہ مقرر کر دیا ہے کہ ہر موسم حج میں مجھ سے ملاقات کریں۔ جب سے میں خلیفہ مقرر کیا گیا ہوں، میں نے امت اسلامیہ کے لیے یہ اصول مقرر کر دیا ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برے کاموں سے روکا جائے۔ اس لیے جس حق کا مطالبہ میرے یا میرے مقرر کردہ حکام کے سامنے پیش کیا جائے گا، وہ حق ادا کر دیا جائے گا۔ عام لوگوں کے حقوق میرے اہل و عیال کے حقوق پر مقدم ہوں گے۔ اہل مدینہ کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کچھ لوگ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں اور کچھ لوگوں نے مار پیٹ کا راستہ اختیار کیا ہے۔ پوشیدہ طور پر ملامت کرنا، گالیاں دینا اور زد و کوب کرنا بہت بری بات ہے۔ جو کوئی کسی حق کا دعوے دار ہو، تو وہ موسم حج میں آئے اور اپنا حق حاصل کرے، خواہ وہ مجھ سے لیا جائے یا میرے مقرر کردہ حکام سے لیا جائے۔ اگر آپ لوگ معاف کر دیں تو ایسی صورت میں اللہ معاف کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔

جب یہ خط شہروں میں پڑھ کر سنایا گیا تو عام لوگ رونے لگے اور انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دعا کی اور کہنے لگے کہ قومی سطح کی مصیبت کے آثار اب نظر آنے لگے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کس درجے میں عام لوگوں میں مقبول تھے۔

اب مسئلے کے حل کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے متعلقہ علاقوں کے گورنروں کی ایک کانفرنس منعقد کی جن میں حضرت معاویہ (گورنر شام)، عبداللہ بن عامر (گورنر بصرہ)، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح (گورنر مصر)، سعید بن عاص (گورنر کوفہ) شامل تھے۔ ان کے ساتھ حضرت عمرو بن عاص (مصر کے فاتح اور سابق گورنر) رضی اللہ عنہم کو بھی شریک مشورہ کیا گیا۔ حضرات علی، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم بھی مشورے میں پوری طرح شریک تھے۔ سعید بن عاص نے مشورہ دیا کہ ان باغیوں سے سختی سے نمٹا جائے اور انہیں قتل کروا دیا جائے۔ ابن ابی سرح نے نرمی کا مشورہ دیا کہ کچھ دے دلا کر ان باغیوں کے دلوں کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ حضرت معاویہ نے بیان کیا کہ ان کے علاقے میں کوئی شورش نہیں ہے اور انہوں نے دوسرے گورنروں کے علاقوں میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ عمرو بن عاص نے البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرمی والی پالیسی پر تنقید کی اور کہا کہ آپ حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرح جہاں سختی کرنا ہو، وہاں سختی کیجیے اور نرمی کے موقع پر نرمی سے کام لیجیے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ سنایا:

آپ حضرات نے مجھے جو مشورے دیے ہیں، وہ میں نے سن لیے ہیں۔ ہر کام کو انجام دینے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ وہ بات جس کا اس امت کو اندیشہ ہے، ہو کر رہے گی۔ اس فتنہ کا جو دروازہ بند ہے، **اسے نرمی، موافقت اور اطاعت کے ذریعے بند رکھنے کی کوشش کی جائے گی**، البتہ اللہ کے حدود و قوانین کی حفاظت کی جائے گی۔ اگر اس فتنہ کے دروازہ کو بند رکھنا ہے، تو نرمی کا طریقہ بہتر ہے۔ تاہم یہ (اگر کھلنا ہے) تو کھل کر رہے گا اور کوئی اسے روک نہیں سکے گا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے لوگوں اور اپنی ذات کی بھلائی کے لیے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ واللہ! فتنہ و فساد کی چکی گردش میں آ کر رہے گی۔ عثمان کے لیے کیا ہی اچھا ہے کہ وہ اس فتنہ کو برپا کرنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ آپ لوگ (فتنہ و فساد) کو روکیے، ان لوگوں (باغیوں) کے حقوق ادا کیجیے اور انہیں معاف کرتے رہیے۔ البتہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں سستی نہ کیجیے۔[36]

---

[36] ایضاً۔ 3/1-388-389

اس خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ سختی سے کام لیا گیا تو فتنہ وفساد زیادہ پھیلے گا اور باغیوں کو اس بات کا موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے اوپر ظلم ہونے کا واویلا کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے دور میں بھی جب حکومت چور ڈاکوؤں اور باغیوں پر کریک ڈاؤن کرتی ہے تو وہ "مر گئے، لٹ گئے" قسم کا واویلا مچاتے ہیں۔ آپ نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ باغیوں کو پورے حقوق دیے جائیں، ان سے نرمی کی جائے اور جب وہ فتنہ وفساد کرنے لگیں تو انہیں طاقت سے روک دیا جائے۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ یہ حکمت عملی، حکومت کی اجتہادی غلطی تھی۔ اگر اس وقت سختی سے کام لے لیا گیا ہوتا تو ان باغیوں کا وہیں قلع قمع ہو جاتا اور بعد کے فتنے نہ اٹھتے۔ ہماری رائے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہایت دانش مندانہ فیصلہ کیا کیونکہ اگر وہ اس وقت باغیوں کو قتل کروا دیتے تو ان کی باقیات کو ہمیشہ کے لیے "مظلومیت" کا لبادہ مل جاتا اور چند "شہید" میسر آ جاتے۔ پھر ان کے بچ جانے والے ساتھی اسے کیش کروا کے کہیں زیادہ لوگوں کو بغاوت پر اکساتے اور عین ممکن ہے کہ اس سے کہیں بڑا فتنہ پیش آ جاتا۔ ہمارے زمانے میں کئی علاقوں میں کی جانے والی فوجی کاروائی کی مثال سب کے سامنے ہے کہ چند باغیوں کو قتل کر دینے سے علیحدگی کی پوری تحریک کھڑی ہو گئی۔ بالکل اسی طرح مشرقی پاکستان میں بغاوت کی صورت میں یہی ہوا کہ چند باغیوں کے قتل کے بعد بغاوت کے شعلے بری طرح بھڑک اٹھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ پہل ان کی جانب سے نہ ہو۔ پھر جو واقعات بعد میں وقوع پذیر ہوئے، انہیں اس کی امید بھی نہ تھی۔ ان کی زیادہ سے زیادہ توقع یہی تھی کہ باغی انہیں شہید کر دیں گے اور پھر اس فساد پر قابو پا لیا جائے گا۔

ان گورنروں میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا ٹھیک اندازہ لگایا۔ جب آپ واپس جانے لگے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے:

> "امیر المومنین! اس سے پہلے کہ وہ لوگ آپ پر حملہ آور ہوں، جن کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے، آپ میرے ساتھ شام چلے چلیے، کیونکہ اہل شام ابھی فرمانبردار ہیں۔" ۔ حضرت عثمان نے جواب دیا: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوس کسی چیز کے بدلے میں فروخت نہیں کروں گا خواہ اس کی وجہ سے میری گردن کی شہ رگ کٹ جائے۔" معاویہ نے کہا: "میں آپ کے پاس ایک لشکر بھیج دوں گا جو اہل مدینہ کے قریب رہے گا تا کہ وہ مدینہ میں یا آپ کے ساتھ کوئی ناگہانی حادثہ پیش آ جائے، تو اس وقت کام آئے۔" خلیفہ نے فرمایا: "اس فوج کو یہاں ٹھہرا کر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسیوں کے رزق میں تنگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔" معاویہ بولے: "امیر المومنین! واللہ آپ پر اچانک حملہ ہو گا یا پھر آپ کو جنگ کرنی پڑے گی۔" آپ نے فرمایا: "اللہ میرے لیے کافی ہے اور وہی عمدہ کارساز ہے۔"[37]

اس کے بعد حضرت معاویہ، حضرات علی، سعد، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس آئے، انہیں سلام کیا اور اپنی کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور ان سے کہا:

---

[37] ایضاً۔ 3/1-393

"جب (دور جاہلیت میں) لوگوں پر گنتی کے چند لوگ غالب آ جاتے تھے، اس وقت آپ کے ہر خاندان اور قبیلے میں ایسے لوگ ہوتے تھے جو اپنی قوم کے خود مختار اور مطلق العنان سردار بن کر حکومت کرتے تھے۔ وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتے تھے۔ پھر جب اللہ تبارک و تعالی نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کی پیروی کرنے والوں کو عزت بخشی، اس کے بعد وہ باہمی مشورے سے حاکم مقرر کرنے لگے۔ اس معاملے وہ ان کی اسلام قبول کرنے میں سبقت، سابقہ خدمات اور ذاتی صلاحیت و محنت کو ترجیح دیتے تھے (یعنی ٹھیک میرٹ پر فیصلے کرتے تھے۔) اگر آئندہ بھی انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا اور اس طریقہ پر قائم رہے تو ان کی حکومت بر قرار رہے گی اور لوگ ان کی پیروی کریں گے۔ اگر یہ دنیادار بن گئے اور طاقت کے ذریعے دنیا طلبی میں لگ گئے تو ان سے یہ نعمت چھن جائے گی اور اللہ تعالی ان میں سے پھر رئیسانہ نظام کو قائم کر دے گا۔ اور ایسا نہ ہوا تو پھر غیروں کے تسلط کا خوف بھی رہے گا کیونکہ اللہ تعالی تبدیل کرنے پر قادر ہے اور اپنی مخلوق پر اسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ میں ان بزرگ (عثمان) کو آپ کے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے اور ان کے ساتھ تعاون کیجیے۔ اسی کے سبب آپ خوش بخت ہوں گے۔"

اس کے بعد حضرت معاویہ ان سے رخصت ہوئے۔ حضرت علی نے فرمایا: "میری رائے میں یہ خبر (کہ بغاوت کا خدشہ ہے) صحیح نہیں ہے۔" حضرت زبیر نے فرمایا: "نہیں، واللہ! اس شخص (معاویہ) کی جیسی عظمت آج ہمارے اور آپ کے دل میں ہے، پہلے کبھی نہیں تھی۔"[38] رضی اللہ عنہم۔

اس واقعے سے حضرت معاویہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالی اور متعصب راویوں نے یہاں بھی اپنی فنکاری دکھائی ہے اور ایسی روایات وضع کی ہیں جن کے مطابق اس موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں لالچ پیدا ہوا تھا کہ وہ اپنی خلافت کی راہ ہموار کریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں تنبیہ کی تھی۔

جب یہ گورنر واپس ہوئے تو انہوں نے باغیوں کی نگرانی شروع کر دی جس سے ان کے باہمی رابطے منقطع ہو گئے۔ اس سے تنگ آ کر باغیوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ہی دن تینوں شہروں بصرہ، کوفہ اور فسطاط میں بغاوت کر دیں۔ اس میں سے صرف کوفہ ہی میں وہ کچھ لوگ اکٹھا کر سکے لیکن وہاں مسلم افواج کی کمان حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ جیسے عظیم بہادر کے ہاتھ میں تھی۔ یہ وہی قعقاع ہیں جنہوں نے ایران کی فتح میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا اور اپنی بہادری اور جنگی حکمت عملی میں ان کا شمار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے جلیل القدر کمانڈروں میں کیا جا سکتا ہے۔ جب حضرت قعقاع نے ان باغیوں کو قابو کر لیا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم تو صرف گورنر کی تبدیلی چاہتے تھے۔ انہوں نے حضرت عثمان کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا تو آپ نے اسے بھی مان کر حضرت سعید بن عاص کی جگہ ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہما کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا اور ان پر آخری حجت بھی تمام کر دی۔ حضرت ابو موسی نے وہاں جا کر جو پہلا خطبہ دیا، اس میں فرمایا:

---

[38] ایضاً۔ 3/1-391

لوگو! آپ لوگ ایسی باتوں کے لیے دوڑا کیجیے۔ آئندہ ایسی باتیں نہ کیجیے بلکہ اپنی حکومت کا ساتھ دیجیے اور اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کیجیے۔ جلد بازی کے کاموں سے بچیے بلکہ صبر سے کام لیا کریں۔ آپ سمجھ لیجیے کہ ایک امیر آپ کے اوپر ہے۔" لوگوں نے کہا: "آپ ہمیں نماز پڑھائیے۔" انہوں نے فرمایا: "میں اس وقت تک نماز نہ پڑھاؤں گا جب تک آپ لوگ عثمان بن عفان کے احکام کو سننے اور اطاعت کرنے کا اقرار نہ کریں گے۔" وہ بولے: "ہم عثمان کی فرمانبرداری کا اقرار کرتے ہیں۔" [39]

اب باغیوں کے پاس کوئی راستہ نہ بچا تھا، جس سے وہ اپنی کاروائی آگے بڑھا سکتے۔ بالآخر انہوں نے اپنے آخری منصوبے پر عمل کا فیصلہ کر لیا۔

باغیوں کا آخری منصوبہ کیا تھا اور کیا یہ کامیاب رہا؟

جب باغیوں کی ایک قابل ذکر تعداد اکٹھی ہو گئی تو انہوں نے عالم اسلام کی حکومت پر قبضے کا ایک سادہ سا منصوبہ بنایا جس کے چار مراحل تھے:

- پہلا مرحلہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہٹا کر نام کے خلیفہ کو مسند اقتدار پر بٹھانا اور اس کے پردے میں خود اقتدار پر قبضہ کرنا۔
- دوسرا مرحلہ: کمزور گورنروں کی تقرری اور ان کے پردے میں صوبوں پر خود حکومت کرنا۔
- تیسرا مرحلہ: عالم اسلام کے اقتدار اور دولت پر مکمل کنٹرول۔
- چوتھا مرحلہ: اسلام کے فروغ کے اس عمل کو ریورس کرنا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع فرمایا تھا اور جسے پہلے تین خلفاء نے اپنے عروج پر پہنچا دیا تھا۔

واضح رہے کہ باغیوں کی اکثریت کے پیش نظر پہلے تین مراحل ہی تھے لیکن ان کی لیڈر شپ کا ایک حصہ چوتھے مرحلے کی تکمیل بھی چاہتا تھا۔ یہ وہی گروہ تھا جس کی قیادت عبداللہ بن سبا کے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح سے بقیہ باغی دراصل ابن سبا کے ہاتھوں استعمال ہو رہے تھے۔

ان باغیوں کے لیے یہ تو ممکن نہ تھا کہ اپنے کسی ساتھی کو مسند اقتدار پر بٹھا دیتے کیونکہ پھر اسے کوئی تسلیم نہ کرتا۔ اکابر صحابہ اس زمانے میں بہت مقبول تھے۔ حضرت عثمان، علی، طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم نے اپنی آمدنی سے زمینیں خریدیں اور ان کی آمدنی کو عام لوگوں پر خرچ کرنے لگے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں معلوم ہے کہ لوگ ان کے پاس امانتیں رکھواتے تھے۔ جیسے ہی کوئی ان کے پاس رقم رکھواتا، وہ اسے غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیتے اور جب وہ شخص واپس مانگنے آتا تو اپنے کاروبار کی آمدنی میں

[39] ایضاً۔ 3/1-377

سے اسے یہ رقم واپس کر دیتے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی جائیداد کی پوری آمدنی اسی قسم کے کاموں کے لیے وقف تھی اور وہ لوگوں میں "طلحۃ الخیر" کے لقب سے مشہور تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معاملہ تھا۔ یہ سب حضرات اپنی رقم سے غلاموں کو خرید خرید کر آزاد کرتے تھے۔ عرب کا دستور یہ تھا کہ آزاد کردہ غلام کو آزاد کرنے والے کے خاندان کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ موالی (واحد مولی) کہلاتے تھے۔ حضرت طلحہ کی مقبولیت بصرہ میں تھی، حضرت زبیر کی کوفہ میں اور حضرت علی کی مصر میں۔ چونکہ باغی تحریک انہی علاقوں میں زیادہ پھیلی، اس وجہ سے ان باغیوں نے ان اکابر صحابہ کی مقبولیت کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان باغیوں نے پلان یہ بنایا کہ ان کا ایک گروہ نکل کر عین حج کے موقع پر مدینہ منورہ کا محاصرہ کر لے جب اکثر جوان لوگ حج کے لیے گئے ہوں اور مدینہ میں کوئی لڑنے والا موجود نہ ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد بقیہ جلیل القدر صحابہ یعنی علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا دیا جائے اور ان کی نگرانی پر اپنے ساتھی مقرر کر دیے جائیں جو ہر وقت ان کے ساتھ لگے رہیں اور ان سے اپنی مرضی کے اقدامات کرواتے رہیں۔ مصری باغی حضرت علی، کوفی حضرت زبیر اور بصری حضرت طلحہ کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب وہ اپنی مرضی کا خلیفہ بنوا لیں تو پھر اسے مجبور کر کے ایسے لوگوں کو گورنر مقرر کروایا جائے جو ایڈمنسٹریشن میں کمزور ہوں اور بالکل اسی طرح ان کے ساتھ بھی اپنے ساتھی لگا دیے جائیں۔ اس طرح سے خلیفہ اور اس کے گورنر کٹھ پتلی کی طرح ان کے اشاروں پر ناچتے رہیں اور اصل حکومت ان کے ہاتھ میں ہو۔ اس کا ایک فائدہ باغیوں کو یہ بھی ہوتا کہ حضرت عثمان کی شہادت کا الزام اس شخص پر آتا جسے خلیفہ بنایا جاتا۔

مسلمانوں کی افواج تو مدینہ سے بہت دور سرحدی علاقوں پر مصروف تھیں اور انہیں پہنچنے کے لیے کئی مہینے کا وقت درکار تھا۔ اس طرح باغیوں کو یقین تھا کہ ان کا منصوبہ کامیاب رہے گا اور وہ عالم اسلام پر اپنا کنٹرول مکمل کر لیں گے لیکن انہیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں گے۔ جنگ ایک ایسا معاملہ ہے جسے چھیڑنا ایک فریق کے لیے ممکن ہوتا ہے لیکن فریق مخالف کے رد عمل کو کنٹرول کرنا پھر اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کے بعد جنگ اپنا راستہ خود مقرر کرتی ہے۔ باغی اقدام تو کر بیٹھے لیکن پھر اس کے بعد حضرت علی، طلحہ، زبیر، عائشہ، معاویہ، حسن اور دیگر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جس طرح ان کے منصوبوں کو خاک میں ملایا، وہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باغیوں نے ان کا قصور آج تک معاف نہیں کیا اور ان کے پراپیگنڈے سے متاثر لوگ آج بھی انہی صحابہ کی کردار کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض گروہ حضرت علی اور حسن، اور دیگر گروہ حضرت طلحہ، زبیر، عائشہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ انہیں اس کا شدید دکھ ہے کہ ان حضرات نے بروقت کاروائی کر کے ان کا منصوبہ کامیاب کیوں نہ ہونے دیا۔ اپنے دل کے پھپھولوں کو یہ تاریخی روایات کے پردوں میں پھوڑتے نظر آتے ہیں۔

انہی باغیوں یا ان سے متاثر ہونے والے راویوں کی جھوٹی تاریخی روایات سے متاثر ہو کر بہت سے مخلص مسلمان، خواہ ان کا تعلق کسی

بھی فرقے سے ہو، یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ صحابہ کرام آپس میں لڑ پڑے اور ہزاروں مسلمان مارے گئے حالانکہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ صحابہ کرام عہد رسالت کی طرح یک جان کئی قالب رہے، انہوں نے آپس میں کوئی جنگ نہیں کی بلکہ انہوں نے نہایت ہی دانشمندانہ انداز میں باغیوں کی سازش کو ناکام بنایا اور اس میں پوری طرح کامیاب رہے۔ باغی بے چارے تو اس کے بعد اپنی بقا کی جنگ ہی لڑتے رہے۔ ہمارے اس دعوے سے بہت سے قارئین چونک اٹھیں گے کیونکہ جمل اور صفین کی جنگیں بہر حال وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگیں اگرچہ ہوئیں، لیکن انہی کی بدولت دراصل باغیوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ جنگیں صحابہ کرام کی باہمی خانہ جنگیاں نہ تھیں بلکہ دراصل باغیوں کے خلاف ان کی جنگ تھی۔ ان جنگوں میں کسی صحابی کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ انہوں نے نہایت دانشمندی کے ساتھ باغیوں کی قوت کو پاش پاش کر دیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور سے متعلق سوالات کے جواب میں انشاء اللہ اسی کی تفصیلات اس طرح واضح کر دیں گے کہ تاریخ کا کوئی بھی طالب علم انہیں خود بھی چیک کر کے اصل حقیقت تک رسائی حاصل کر سکے گا لیکن اس سے پہلے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے متعلق کچھ سوالات کے جواب حاصل کر لینا ضروری ہے۔

باغیوں نے مدینہ میں کیا کاروائی کی؟

باغیوں کے تین گروہ تھے جو بصرہ، کوفہ اور مصر سے آئے تھے۔ انہوں نے مدینہ کے باہر بالترتیب ذو خشب، اعوص اور ذوالمروہ کے مقامات پر پڑاؤ ڈالا۔ ان کے کچھ نمائندے امہات المومنین، سیدنا علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور انہیں ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ان باغیوں کو جھڑک کر بھگا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے آ کر مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس موقع پر مہاجرین و انصار کو لے کر نکلے اور ان کے ساتھ مذاکرات کر کے انہیں قائل کر لیا کہ وہ محاصرہ ختم کر کے چلے جائیں۔ اس موقع پر ان باغیوں کا یہ مطالبہ بھی مان لیا گیا کہ ان کے گورنر تبدیل کر دیے جائیں۔ ان کے مطالبے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا گورنر مقرر کر دیا۔ اب باغیوں کے پاس کوئی بہانہ نہ تھا چنانچہ انہیں پلٹنا پڑا۔ کچھ دور جا کر یہ واپس پلٹ آئے اور ایک جعلی خط دکھایا جس میں اس وقت کے گورنر مصر عبداللہ بن ابی سرح کو لکھا تھا کہ جب یہ لوگ مصر پہنچیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ ان خط دکھانے والوں میں بصرہ اور کوفہ کے لوگ نمایاں تھے۔ حضرت علی نے ان سے فرمایا کہ تم لوگ تو الگ الگ سمت میں گئے تھے تو پھر خط لے کر صرف اہل مصر کو آنا چاہیے تھا۔ بصرہ اور کوفہ کے باغیوں کو کیسے علم ہوا کہ اہل مصر نے کوئی خط پکڑا ہے؟ اس سے واضح ہے کہ تم نے مدینہ ہی سے یہ منصوبہ بنایا تھا۔[40]

باغیوں نے شہر پر کنٹرول حاصل کر لیا لیکن ابھی نماز کی امامت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کیا کرتے تھے۔ اس دور میں اس بات کا کوئی تصور موجود نہیں تھا کہ خلیفہ یا اس کے مقرر کردہ حاکم کے علاوہ کوئی اور نماز کی امامت کرے۔ اسی زمانے میں حضرت عثمان رضی

---

[40] ایضاً۔ 3/1-400

اللہ عنہ نے بصرہ، کوفہ، شام اور مصر کے گورنروں کو خطوط لکھ کر افواج طلب کیں لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ ان تمام علاقوں سے افواج کی آمد کے لیے کم از کم ایک سے ڈیڑھ ماہ چاہیے تھا۔ مدینہ کے کچھ لوگوں نے باغیوں سے جنگ کے لیے جوش دکھایا جن میں سعد بن مالک، ابوہریرہ، زید بن ثابت اور حسن بن علی رضی اللہ عنہم نمایاں تھے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اس کی اجازت نہ دی کیونکہ آپ اپنی جان کے لیے کسی صاحب ایمان کو خطرے میں ڈالنا پسند نہ کرتے تھے۔

ایک دن جمعہ کی نماز میں حضرت عثمان نے خطبہ دیا تو باغیوں نے ان پر پتھراؤ کر دیا جس سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد باغیوں نے آپ کو نماز کی امامت سے روک دیا اور باغی لیڈر غافقی نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نماز پڑھاتے رہے۔ باغی مدینہ منورہ میں مسلسل حضرت عثمان کے خلاف پراپیگنڈا کرتے رہے اور ان پر جھوٹے الزامات عائد کرتے رہے۔ ایک دن حضرت علی کے مشورے پر عثمان رضی اللہ عنہما مسجد میں آئے اور انہوں نے نہایت ہی عجز و انکسار کے ساتھ اعلان کر دیا کہ اگر میں نے کوئی غلطی کی ہو، تو اس کی اللہ تعالی کے حضور توبہ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

> اے لوگو! واللہ آپ میں سے جس کسی نے تنقید کی ہے، اس سے میں ناواقف ہوں۔ بلکہ جو کام میں نے کیے ہیں، ان سے میں واقف ہوں۔ تاہم میرے نفس نے مجھے ورغلایا اور دھوکہ دیا تھا جس کی وجہ سے میری عقل جاتی رہی تھی۔ بہر حال میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: "جو لغزش کرے، وہ توبہ کرے اور جو غلطی کرے، وہ بھی توبہ کرے اور تباہی کی طرف بڑھتا نہ جائے کیونکہ جو (اپنی جان پر) ظلم کرتا رہے گا، وہ راہ راست سے دور ہوتا جائے گا۔" اس لیے میں سب سے پہلے نصیحت قبول کرتا ہوں۔ میں اللہ سے اپنے کاموں کی معافی مانگتا ہوں اور اسی کے سامنے توبہ کرتا ہوں۔"
>
> اب میں نے معافی مانگی ہے اور توبہ کی ہے، اس لیے آپ کے معزز حضرات میرے پاس آئیں اور اپنی رائے ظاہر کریں۔ واللہ! اگر اللہ تعالی مجھے غلام بنا دے تو میں غلام کے طریقے پر چلوں گا اور اس غلام کی طرح عاجزی اختیار کروں گا جو غلامی کی حالت پر صبر کرتا ہے اور آزاد ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے نکل کر کہیں ٹھکانہ نہیں ہے، پھر اسی کی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اس لیے آپ کے نیک افراد کو میرے پاس آنے سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر میرا دایاں ہاتھ انکار کرے گا تو میرا بایاں ہاتھ اس کی پیروی کرے گا۔[41]

یہ سن کر اہل مدینہ پر رقت طاری ہو گئی اور سب لوگ رونے لگے۔ خلیفہ وقت کا کوئی قصور نہ تھا لیکن انہوں نے ایک عاجز بندے کی حیثیت سے پھر بھی توبہ کی لیکن باغی ہر قیمت پر انہیں معزول کرنا چاہتے تھے۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: "امیر المومنین! جو آپ کے ساتھ نہیں ہے، وہ آپ سے نہیں ملے گا۔ اس لیے آپ خود اپنے بارے میں اللہ تعالی سے ڈرتے رہیے اور جو کچھ آپ نے فرمایا ہے، اس کی تکمیل کیجیے۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ دیتے وقت ایک عصا کا سہارا لیتے تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا تھا جو آپ کے بعد آپ

---

[41] ایضاً۔ 3/1-412

کے خلفائے راشدین کے ہاتھ میں آیا تھا۔ ایک دن ایک باغی جہجاہ غفاری نے آپ سے یہ عصا چھین کر اسے توڑ دیا۔ باغی مسلسل آپ کی معزولی کا مطالبہ کرتے رہے۔ ایک دن انہوں نے بہت شور و شغب کیا۔ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ ابھی یہ لوگ حملہ کریں گے۔ چنانچہ وہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے سمجھا بجھا کر ان باغیوں کو واپس بھیج دیا۔[42]

باغیوں نے ایک اور پراپیگنڈا یہ کرنا شروع کیا کہ اکابر صحابہ کے نام لے لے کر ان کے متعلق یہ ڈس انفارمیشن پھیلانا شروع کی کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔ ان میں حضرت طلحہ، عمار بن یاسر اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ چنانچہ انہی کی پھیلائی ہوئی یہ ڈس انفارمیشن طبری وغیرہ کی روایات میں موجود ہے۔[43] مروان بن حکم، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کزن تھے۔ وہ نہایت ہی جوشیلے تھے اور باغیوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوشش یہ تھی کہ مصالحت سے معاملہ طے پا جائے تاکہ وقت مل جائے اور صوبوں سے چلی ہوئی افواج مدینہ پہنچ جائیں۔ اس وجہ سے آپ کی تلخ کلامی بھی ہوئی اور آپ نے حضرت عثمان کو تنبیہ کی کہ وہ مروان کو سنبھالیں۔ کہیں ان کا جوش معاملہ خراب نہ کر دے۔ ایک موقع پر بنو امیہ کے ان لوگوں نے حضرت علی سے تلخ کلامی بھی کی کیونکہ آپ مصالحت ہی سے معاملہ طے کرنا چاہتے تھے۔ بعض لوگوں کو یہ خیال گزرا کہ شاید آپ باغیوں کو شہ دے کر اپنی خلافت کی راہ ہموار کر رہے ہیں اور انہوں نے حضرت علی پر یہ الزام بھی عائد کیا۔ اس میں بھی باغیوں کا پراپیگنڈا کام کر رہا تھا جو خلیفہ وقت کی شہادت کا الزام دیگر صحابہ پر ڈالنا چاہتے تھے۔[44] عین ممکن ہے کہ ان باغیوں کے جو ساتھی مدینہ میں کام کر رہے تھے، ان حضرات کے پاس جا جا کر حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے خلاف الزام تراشی کرتے ہوں۔

ایک دن باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پر حملہ کر کے اس کے دروازوں کو آگ لگا دی۔ وہ ساری رات آتش گیر مادہ آپ کے گھر پر پھینکتے رہے جس سے دروازے جل گئے۔ مروان بن حکم اور ان کے ساتھی جنگ کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں روک دیا اور فرمایا:

> آگ لگنے کے بعد اب کچھ نہ کیا جائے کیونکہ لکڑیاں اور دروازے جل گئے ہیں۔ جو میرا فرمانبردار ہے، وہ صرف اپنا گھر بچائے کیونکہ یہ لوگ صرف میرے ہی درپے ہیں۔ واللہ! بہت جلد میرے قتل پر یہ پشیمان ہوں گے۔ اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دیں تو اس وقت بھی انہیں معلوم ہو گا کہ میں زندگی کا لالچ نہیں رکھتا۔ میرا حال بہت خراب ہو چکا ہے، میرے دانت ٹوٹ گئے ہیں اور ہڈیاں نرم پڑ گئی ہیں۔[45]

اس وقت مروان نوجوان تھے اور ان کا خون گرم تھا۔ انہوں نے اس کے باوجود باغیوں پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں وہ خود شدید زخمی

---

[42] ایضاً۔ 3/1-430

[43] ایضاً۔ 3/1-434

[44] ایضاً۔ 3/1-417

[45] ایضاً۔ 3/1-436

ہو گئے۔ باغی اب اس درجے کی شقاوت میں مبتلا ہو گئے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا پانی بھی بند کر دیا۔ اب ضرورت کی کوئی چیز آپ کے گھر نہ جا سکتی تھی۔ ایک دن ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہ نے پانی کا ایک مشکیزہ رکھ کر خلیفہ کے گھر جانا چاہا تو باغیوں نے آپ کی خچر کی رسی کاٹ دی۔ قریب تھا کہ آپ گر تیں کہ لوگ آئے اور انہوں نے آپ کو بچایا۔ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو یہ موقع مل سکا کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ضروری اشیاء پہنچاتے رہے۔[46] آپ نے ان باغیوں سے فرمایا:

اے لوگو! تم جو حرکتیں کر رہے ہوں، وہ نہ اہل ایمان جیسی ہیں اور نہ کفار جیسی۔ تم ان صاحب کی ضروریات بند نہ کرو کیونکہ روم اور ایران کے جو لوگ گرفتار کیے جاتے ہیں، انہیں بھی کھانا پینا مہیا کیا جاتا ہے۔ ان صاحب (عثمان) نے تو تمہارا مقابلہ بھی نہیں کیا ہے، پھر تم کس وجہ سے انہیں محصور کرنا اور قتل کرنا روا رکھتے ہو؟[47]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے باغی اس وجہ سے بھی دبتے تھے کہ ان کے بہت سے ساتھی آپ ہی کے نام پر ہی ان کے ساتھ چلے آئے تھے۔ اس حالت میں بھی حضرت عثمان نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کو امیر حج بنا کر بھیجا جو کہ حضرت عثمان کے دروازے پر نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے آپ نے عرض بھی کیا: "امیر المومنین! واللہ، ان لوگوں سے جہاد کرنا مجھے حج کرنے سے زیادہ پسند ہے۔" لیکن حضرت عثمان نے انہیں حکم دیا کہ وہ حج کے لیے روانہ ہو جائیں۔[48] روایات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا یقین ہو چکا تھا۔ آپ کا خیال یہ تھا کہ آپ کو شہید کیے جانے سے معاملہ ختم ہو جائے گا۔ اسی دوران کوفہ، بصرہ اور شام سے سرکاری افواج آ جائیں گی اور اہل مدینہ کو باغیوں سے نجات مل جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ہر شخص کو اپنی جان بچانے کا حکم دیا۔ آپ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بلوا کر انہیں کچھ وصیتیں کیں۔

ایک دن باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پر حملہ کر دیا۔ دروازے پر حضرت حسن بن علی، عبداللہ بن زبیر، محمد بن طلحہ، مروان بن حکم اور سعید بن عاص رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ انہوں نے باغیوں کا مقابلہ شروع کیا تو اندر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے منع فرمایا۔[49] آپ خود باہر نکلے اور اپنے ساتھیوں کو اندر لے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد مغیرہ بن اخنس اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نے اپنے ساتھیوں سمیت ان کا مقابلہ کیا جس میں مغیرہ شہید ہو گئے۔

ایک دن حضرت عثمان اپنے گھر میں تھے اور آپ کے پاس حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ حضرت عثمان نے ان سے

---

[46] ایضاً۔ 3/1-441 to 442

[47] ایضاً۔ 3/1-436

[48] ایضاً۔ 3/1-442

[49] ایضاً۔ 3/1-443

فرمایا: "آپ کے والد ایک اہم ترین کام میں مشغول ہیں، میں آپ کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ انہی کے پاس چلے جائیے۔" پھر آپ قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگے۔ اتنے میں کچھ باغی آپ کے گھر میں آگھسے جن میں محمد بن ابی بکر کا نام بھی لیا گیا ہے۔ اس نے خلیفہ کے ساتھ گستاخی کرتے ہوئے ان کی داڑھی پکڑ لی۔ آپ نے فرمایا: "تم نے جس چیز کو پکڑا ہے اور میرے ساتھ جیسا سلوک کیا ہے، تمہارے والد اسے نہیں پکڑتے تھے اور نہ ہی ایسا سلوک کرتے تھے۔" محمد بن ابی بکر یہ سن کر بہت شرمندہ ہوئے اور باہر چلے گئے۔ ان کے دیگر ساتھیوں نے خلیفہ مظلوم کو شہید کر دیا۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ آپ کا خون قرآن مجید کی اس آیت پر گرا: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ "عنقریب اللہ ہی آپ کو کافی ہو گا، وہ سننے اور جاننے والا ہے۔"[50] یہ نسخہ اب بھی تاشقند کے میوزیم میں محفوظ ہے اور اس آیت کریمہ پر اب بھی یہ نشان پایا جاتا ہے۔

طبری، بلاذری اور ابن سعد کی روایات کے مطابق باغیوں کے ایک سردار غافقی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لوہے کی سلاخ سے وار کیا اور آپ کے نسخہ قرآن کو لات بھی ماری۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ملحد قسم کے لوگ تھے اور ان کے دل میں اسلام اور قرآن کا کوئی احترام نہ تھا۔ ایک اور باغی سودان بن حمران نے حضرت عثمان پر تلوار کا وار کیا۔ آپ کی اہلیہ سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا نے اسے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا جس سے ان کی انگلیاں کٹ گئیں۔ حضرت عثمان کے کچھ آزاد کردہ غلام بھی انہی کے گھر میں رہتے تھے۔ انہوں نے مزاحمت کی تو ان میں سے بھی ایک کو قتل کر دیا۔ ایک باغی بھی ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ فرار ہو گئے۔[51] اس موقع پر مشہور باغی صعصعہ بن صوحان کے بھائی زید بن صوحان نے کہا:

> آج کے دن دلوں میں نفرت پھیل گئی۔ اس کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اب قیامت تک ان دلوں میں محبت پیدا نہ ہو گی۔[52]

جلیل القدر صحابہ کی اولاد میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہ آخری شخص تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی۔ جب حضرت عثمان کا جنازہ اٹھایا گیا تو یہ باغی راستے میں بیٹھ گئے اور انہوں نے آپ کے جنازے پر پتھر برسانے شروع کر دیے۔ باغی یہ چاہتے تھے کہ آپ کو جنت البقیع کی بجائے یہودیوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور ان کی کوششوں سے باغیوں نے آپ کی میت کو دفن کرنے کی اجازت دی۔[53]

صحابہ کرام کی موجودگی میں باغیوں نے حضرت عثمان کو شہید کیسے کر دیا؟

تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی، طلحہ، زبیر، سعد اور دیگر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ

---

[50] ایضاً۔ 3/1-449

[51] ایضاً۔ 3/448

[52] ابن عساکر۔ 59/490

[53] طبری۔ 3/1-472

عنہم کی موجودگی میں حضرت عثمان کو باغیوں نے شہید کیسے کر دیا؟

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی کہ مہاجرین کو مدینہ سے منتقل نہ ہونے دیا جائے، میں تبدیلی کے باعث مہاجرین و انصار کی ایک بڑی تعداد دوسرے شہروں میں منتقل ہو چکی تھی۔ باغیوں نے حملے کے لیے ایسے وقت کا انتخاب کیا، جب مسلمانوں کی کثیر تعداد حج کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ ان باغیوں کی تعداد اگرچہ دو یا تین ہزار سے زائد نہ تھی لیکن ان کے مقابلے پر مدینہ میں بھی سات سو کے قریب افراد موجود تھے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کرام تو اپنے سے کئی گنا بڑی فوج سے ٹکرا جایا کرتے تھے، اس وقت ان سات سو افراد نے مقابلہ کیوں نہ کیا؟ اس کی سب سے بڑی وجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حلم تھا۔ آپ کسی کو یہ اجازت دینے کو تیار نہ تھے کہ آپ کی جان بچانے کے لیے باغیوں پر حملے میں پہل کی جائے۔ حضرت علی، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم نے بارہا آپ سے مقابلے کی اجازت مانگی لیکن آپ نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ان حضرات نے اپنے جواں سال بیٹوں حضرت حسن، حسین، محمد بن طلحہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو آپ کے گھر پر پہرے پر مقرر کیا لیکن حضرت عثمان نے انہیں خدا کے واسطے دے دے کر لڑائی نہ کرنے پر مجبور کیا۔ اہل مدینہ آپ کے پاس اکٹھے ہو کر گئے کہ آپ باغیوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت دیں لیکن آپ نے قسمیں دے کر انہیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔[54]

یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات آپ کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ پھر جب حملہ آوروں نے آپ کے گھر پر حملہ کیا، تو حضرت حسن، عبداللہ بن زبیر، محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہم دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ ایک موقع پر انہی حضرات نے باغیوں کا بھرپور مقابلہ کیا اور اس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ زخمی بھی ہوئے۔ اس کے بعد قاتلین دیوار پھاند کر آئے اور آپ کو شہید کر دیا۔ جب تک ان حضرات کو خبر ہوتی، قاتل اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔

تاریخ کے طالب علموں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا جواب ہابیل اور قابیل کے قصے میں ہے۔ جیسے قابیل نے جب ہابیل کو قتل کی دھمکی دی تو انہوں نے یہ کہا تھا: لَئِنْ بَسَطتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِي إِلَيْكَ لأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ. "تم اگر مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاؤ گے تو میں تمہیں قتل کرنے کے لیے (پہلے) اپنا ہاتھ نہ اٹھاؤں گا کیونکہ میں اللہ، رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔"[55] یہی ہابیلی مزاج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا تھا۔ آپ ہرگز اس بات کو درست نہ سمجھتے تھے کہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی ایک مسلمان کا خون بہائیں ورنہ اہل مدینہ تو اپنے خون کا آخری قطرہ بھی آپ کے لیے بہانے کو تیار تھے۔ بالکل یہی مزاج حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پایا تھا اور وہ اپنے رشتے کے

---

[54] ایضاً۔ 3/1-440

[55] المائدہ 5:28

تایا اور خالو (حضرت عثمان) کے اس طرز عمل سے بہت متاثر تھے۔

حضرت علی اور دیگر اکابر صحابہ نے حضرت عثمان کے دفاع میں کیا اقدامات کیے؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چلیے، جنگ نہ سہی لیکن حضرت علی اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفاع میں کیا اقدامات کیے؟ تاریخی روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے لیے جنگ کے علاوہ اور جو کچھ بھی ممکن تھا، وہ کر گزرے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

1۔ باغیوں کا ابتدائی منصوبہ یہ تھا کہ حضرت علی، طلحہ یا زبیر رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کو خلافت کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا جائے اور ان کی مدد سے حضرت عثمان کو معزول کر دیا جائے۔ اس طرح جو الزام ہے، وہ ان صحابہ پر آئے اور ان کا مقصد پورا ہو جائے۔ چنانچہ جب انہوں نے مدینہ سے باہر ذو المروہ، ذو خشب اور اعوص نامی مقامات پر پڑاؤ ڈالا تو ان بزرگوں کے پاس پہنچ کر یہی منصوبہ پیش کیا۔ اہل مصر حضرت علی، اہل بصرہ حضرت طلحہ اور اہل کوفہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور انہیں اس بات کی ترغیب دی کہ وہ ان حضرات کو خلیفہ بنانے پر تیار ہیں۔ حضرت علی نے جب ان کی تجویز سنی تو آپ ان پر چلائے اور انہیں لعنت ملامت کرتے ہوئے فرمایا: "نیک لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ ذو المروہ اور ذو خشب کے لشکر پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ تم واپس جاؤ، اللہ تمہاری صحبت سے مجھے بچائے۔" اہل بصرہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہی بات رکھی تو انہوں نے فرمایا: "اہل ایمان کو یہ بات معلوم ہے کہ ذو المروہ، ذو خشب اور اعوص کی فوجوں پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔" حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی جواب دیا۔[56]

2۔ حضرت علی نے اپنے بیٹوں حسن اور حسین، حضرت طلحہ نے اپنے بیٹوں محمد اور موسی اور حضرت زبیر نے اپنے بیٹے عبد اللہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ یہ وہ وقت تھا جب باغی مدینہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور کسی بھی وقت خلیفہ وقت کو شہید کر سکتے تھے۔ اس طرح ان جلیل القدر صحابہ نے اپنے جوان بیٹوں کو ایک نہایت ہی پر خطر کام پر لگا دیا۔ ان تمام نوجوان صحابہ کی عمر اس وقت تیس سال کے قریب ہو گی۔[57] جب حضرت علی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی شہادت کی اطلاع ملی تو وہ دوڑے آئے اور اپنے بیٹوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو مارا اور عبد اللہ بن زبیر اور محمد بن طلحہ کو برا بھلا کہا اور فرمایا کہ تمہارے ہوتے ہوئے یہ سانحہ کیسے پیش آ گیا۔[58]

3۔ چونکہ مصری باغیوں کی اکثریت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دار تھی، اس وجہ سے آپ بار بار ان کے پاس گئے اور جا کر یہ

---

[56] طبری۔ 3/399

[57] ایضاً۔ 3/399

[58] بلاذری۔ 6/186

کوشش کی کہ ان میں پھوٹ پڑ جائے اور یہ واپس چلے جائیں۔ ایک موقع پر آپ مہاجرین و انصار کے پورے وفد کو لے گئے۔ مہاجرین کی جانب سے حضرت علی اور انصار کی طرف سے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے ایسی گفتگو کی کہ باغیوں میں جو لوگ محض پراپیگنڈا کا شکار ہو کر چلے آئے تھے، واپس جانے پر رضا مند ہو گئے۔

4۔ متعدد صحابہ و تابعین جن میں سعید بن عاص، ابوہریرہ، عبداللہ بن سلام اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم شامل تھے، نے باغیوں کو سمجھانے بجھانے کی بھرپور کوشش کی۔ امہات المومنین نے بھی خلیفہ مظلوم کا ساتھ دیا جن میں سیدہ عائشہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما نمایاں تھیں۔ سیدہ عائشہ نے اپنے بھائی محمد بن ابی بکر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ سیدہ ام حبیبہ، خلیفہ شہید کو پانی پہنچاتے ہوئے خود شہید ہوتے ہوتے بچیں۔

مروان بن حکم کا کردار کیا تھا؟

مروان بن حکم کے کردار پر بعض مورخین نے بہت تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ منافق تھے اور انہی کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ فی الحقیقت مروان کا شمار صحابہ صغار یا تابعین کبار میں ہوتا ہے۔ یہ حضرت عثمان کے داماد اور حضرت علی کے ہم زلف تھے۔ اگر طبری کی روایات میں مروان کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پرجوش حامی تھے۔ باغیوں کے حملے میں انہوں نے آپ کا بھرپور دفاع کیا اور اس سلسلے میں خود بھی شدید زخمی ہوئے۔ اگر وہ حضرت عثمان سے مخلص نہ ہوتے تو ایسا نہ ہوتا اور وہ زخمی نہ ہوتے۔ ان روایات سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مروان بہت جوشیلے تھے اور ان کے جوش کی وجہ سے مسائل بھی پیدا ہوتے تھے۔ اس سلسلے کی چند روایات یہ ہیں:

1۔ واقدی کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر گورنروں کے تقرر کے معاملے میں تنقید کی گئی تو مروان نے ناقدین سے کہا: "اگر تم چاہو تو ہم تمہارے اور اپنے درمیان تلوار سے فیصلہ کروا سکتے ہیں۔" اس پر حضرت عثمان نے فرمایا: "آپ خاموش رہیے، اور مجھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھوڑ دیجیے۔ آپ کیسی گفتگو کر رہے ہیں۔ کیا میں نے آپ سے نہ کہا تھا کہ آپ ایسے معاملات میں نہ بولا کریں۔"[59]

2۔ جب باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے مدینہ میں اکٹھے ہوئے تو مروان نے ان سے کہا: "کیا بات ہے؟ تم لوگ اس طرح اکٹھے ہوئے ہو کہ جیسے لوٹ مار کرنے آئے ہو۔ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمارے ہاتھوں سے حکومت چھین لو؟ یہاں سے نکل جاؤ، بخدا اگر تم نے ہماری جانب رخ کیا تو ہم تم سے ایسا سلوک کریں گے جو تمہیں پسند نہیں آئے گا اور اس کا انجام بھی برا ہو گا۔ تم اپنے گھروں کی طرف واپس جاؤ کیونکہ بخدا ہم لوگ مغلوب اور عاجز نہیں ہیں۔" اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باغیوں کو

---

[59] طبری۔ 3/1-385

سمجھا بجھا کر واپس بھیجنے میں مشغول تھے۔ مروان کی اس تقریر کی وجہ سے ان کی کوششوں پر پانی پھر گیا اور وہ بہت غضب ناک ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔[60]

3۔ مروان کے غلام ابو حفصہ بیان کرتے ہیں کہ جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا تو انہوں نے مروان سے کہا: "آپ گھر میں بیٹھے رہیے اور باہر نہ جائیے۔" مگر مروان نے آپ کا حکم نہیں مانا اور کہا: "واللہ! آپ کو کوئی شہید نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی آپ کا بال بیکا کر سکتا ہے جب تک میں زندہ ہوں اور آواز سن سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر آئے۔ اس وقت میں (ان کے غلام) نے کہا: "اب میرے آقا کو نہیں چھوڑا جائے گا۔" چنانچہ میں ان کی حمایت میں نکلا۔ اس وقت ہماری تعداد کم تھی۔ مروان رجزیہ اشعار پڑھ رہے تھے اور چلا کر کہہ رہے تھے: "کون ہے جو مجھ سے مقابلہ کرے گا؟" اس وقت ان کی زرہ کا نچلا حصہ ابھر آیا تھا جسے انہوں نے اپنے پٹکے سے ملا لیا تھا۔ ان کے مقابلے پر ابن النباع آگے آیا اور پیچھے سے ان کی گردن پر تلوار کا ایک وار کیا جو کارگر ثابت ہوا اور وہ زمین پر گر پڑے۔ ان کی نبضیں چھوٹ گئیں۔ میں انہیں ابراہیم العدی کی والدہ فاطمہ بنت اوس کے گھر اٹھا کر لے گیا۔[61]

ان روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مروان بن حکم کے جوش کے باعث ان بزرگوں کی کاوشوں کو نقصان پہنچ رہا تھا جو پر امن طریقے سے باغیوں کو رخصت کرنا چاہتے تھے۔ اس وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی غصہ آ جاتا تھا اور کبھی وہ مروان کو سخت سست بھی کہہ دیتے تھے۔ بعض راویوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت علی، مروان کو مخلص نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ رائے درست نہیں ہے کیونکہ اگر حضرت علی انہیں مخلص نہ سمجھتے تو ان کی دو بیٹیوں کی شادیاں، مروان کے بیٹوں عبد الملک اور معاویہ بن مروان سے نہ ہوتیں۔[62] یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت علی، مروان کو منافق سمجھتے ہوں اور پھر ان کی بیٹیوں کی شادی ان کے گھر میں ہو جائے؟ معاویہ بن مروان کی اہلیہ سیدہ رملہ بن علی رضی اللہ عنہما تھیں۔ مروان، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ کے گورنر رہے اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما انہی کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔ امام مالک نے موطاء میں مروان کے عدالتی فیصلوں کو بطور سنت صحابہ نقل کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مروان سے متعلق ان روایات میں کچھ الفاظ داخل کیے گئے ہیں۔ بنو امیہ کے دور میں خلافت آل مروان کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور ان کے بیٹے عبد الملک بن مروان اور پانچ پوتے ولید و سلیمان بن عبد الملک، عمر بن عبد العزیز، یزید بن عبد الملک اور ہشام بن عبد الملک خلیفہ بنے۔ ان خلفاء کے خلاف بغاوتیں اٹھانے کے لیے علویوں اور عباسیوں نے ان کے خلاف زبردست پراپیگنڈا کیا اور

[60] ایضاً۔ 3/1-414

[61] ایضاً۔ 3/1-436

[62] ابن حزم، جمہرۃ الانساب العرب۔ 87 ,38۔ قاہرہ: دار المعارف۔

انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ان روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے مروان کو جو کچھ کہلایا گیا ہے، وہ اسی پراپیگنڈے کا حصہ تھیں۔

دیگر شہروں کے صحابہ و تابعین نے حضرت عثمان کے دفاع میں کیا اقدامات کیے؟

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خطوط مختلف شہروں کے گورنروں کے پاس پہنچے جس میں مدینہ کے حالات بیان کیے گئے تھے تو ان حضرات نے فوری طور پر افواج تیار کر کے مدینہ بھجوائیں۔ شام سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حبیب بن مسلمہ فہری کو اور مصر سے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے معاویہ بن خدیج سکونی کو فوج دے کر بھیجا۔ اہل کوفہ میں سے حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے۔ کوفہ کے صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دلائی۔ ان میں حضرت عقبہ بن عمرو، عبداللہ بن ابی اوفی اور حنظلہ بن الربیع تمیمی رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔

کوفہ میں چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی رہ چکے تھے اور وہاں آپ کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ پایا جاتا تھا۔ ان میں مسروق بن اجدع، اسود بن یزید، شریح بن الحارث اور عبداللہ بن حکم رحمہم اللہ نمایاں تھے۔ یہ لوگ کوفہ میں چل پھر کر مختلف محفلوں میں تقریریں کرتے تھے اور مسلمانوں کو خلیفہ کی مدد کے لیے تیار کرتے تھے۔ بصرہ میں حضرت عمران بن حصین، انس بن مالک اور ہشام بن عامر رضی اللہ عنہم اسی طرح تقریریں کر کے لوگوں کو تیار کر رہے تھے اور تابعین میں سے کعب بن سور، حرم بن حیان عبدی رحمہما اللہ جیسے لوگ ان کے ساتھ تھے۔ شام میں حضرت عبادہ بن صامت، ابو درداء اور ابو اسامہ اور مصر میں خارجہ رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے جنہوں نے اس نوعیت کی کاوشیں کر کے لشکر تیار کیے اور مدینہ روانہ کیے۔[63] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کس درجے میں عوام میں مقبول تھے اور باغیوں کے پراپیگنڈا نے عام لوگوں پر کوئی خاص اثر مرتب نہ کیے تھے۔

یہ افواج ابھی راستے ہی میں تھیں کہ انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی۔ اب یہ گومگو کا شکار ہو گئیں کہ کیا کریں کیونکہ مرکز میں اب کوئی خلیفہ باقی نہ رہا تھا۔ حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم وہاں موجود تھے جن میں سے کسی ایک کو خلیفہ بننا تھا۔ اس وجہ سے ان افواج نے انتظار کیا کہ ان حضرات کی جانب سے کوئی اطلاع ملے۔ دوسری طرف باغیوں نے ان حضرات کی نگرانی شروع کر دی اور ان کے رابطے بقیہ دنیا سے منقطع کر دیے۔ اس کی مزید تفصیل آگے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آ رہی ہے۔

[63] طبری۔ 3/1-401

قاتلین عثمان کا انجام کیا ہوا؟

باغی تحریک کے تین دائرے یا حلقے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں براہ راست شریک تھا۔ دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جو قتل میں براہ راست تو شریک نہ تھے لیکن وہ مدینہ پر حملہ آور ہونے والے باغیوں میں شامل تھے۔ تیسری قسم کے باغی وہ تھے، جو مدینہ پر حملہ آور نہ ہوئے تھے لیکن باغی تحریک سے تعلق رکھتے تھے اور بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں مل گئے تھے۔ ان سب کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کی تفصیل کا مطالعہ تو ہم آگے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے تحت کریں گے۔ یہاں ہم اجمالاً ذکر کر دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلی دو قسم کے باغیوں کا انجام بہت ہی برا ہوا۔ ان کے اپنے راویوں ابو مخنف اور ہشام کلبی نے ان کی موت کا جو حال لکھا ہے، اس کے مطابق جنگ جمل سے پہلے ان کے بصرہ چیپٹر کا حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی افواج نے مکمل صفایا کر دیا جس میں ان کا لیڈر حکیم بن جبلہ مارا گیا۔ اس کے بعد جنگ جمل اور جنگ صفین میں ان کی بہت بڑی تعداد ماری گئی۔ محمد بن ابی بکر مصر کا گورنر بن گیا تو اس کے خلاف پورے مصر میں بغاوت بھڑک اٹھی۔ اسے مصر میں قتل کر کے اس کی لاش گدھے کی کھال میں بھر کر جلا دی گئی۔[64] محمد بن ابی حذیفہ نے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی۔ لوگوں نے اسے وہاں تلاش کیا اور غار سے نکال کر مار ڈالا۔[65] محمد بن ابی بکر کے بعد مالک الاشتر گورنری سنبھالنے مصر گیا تو راستے میں اسے ایک کسان نے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔[66]

حضرت حسن نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے اتحاد کیا تو ابتدا میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے باغی تحریک سے کچھ عرصہ کے لیے چشم پوشی کی کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے امان طلب کی تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ان باغیوں نے جتھا بنا کر بغاوت کا آغاز کیا تو حضرت معاویہ نے ان کے خلاف کاروائی کی۔ اب یہ قاتلین عثمان ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی افواج نے انہیں جگہ جگہ تلاش کیا۔ انہوں نے حمص شہر کے قریب ایک قید خانہ خاص طور پر قاتلین عثمان کے لیے بنوایا تھا جہاں رکھ کر ان سے تفتیش کی جاتی اور جس شخص پر قتل عثمان کا الزام ثابت ہوتا، اسے قصاص میں قتل کر دیا جاتا۔[67] اس طرح باغیوں کا اصل مقصد پورا نہ ہو سکا اور وہ حکومت پر قبضے کی آس میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

باغیوں کے اس منصوبے کو چونکہ سب سے زیادہ نقصان حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وجہ سے پہنچا، اس وجہ سے ان کی اگلی نسلوں نے اس کا انتقام آپ کو بدنام کر کے لیا۔ آپ کے خلاف ڈھیروں روایات وضع کر کے آپ کی کردار کشی کی گئی۔ بعد میں یہ روایات تاریخی

---

[64] ایضاً۔ 3/2-305

[65] ایضاً۔ 3/2-308

[66] ایضاً۔ 3/2-296

[67] یاقوت حموی۔ معجم البلدان۔ باب جیم ولام۔ الجلیل۔ 2/157۔ بیروت: دار الصادر۔

کتب کا حصہ بن گئیں۔ جو لوگ اپنی سادہ لوحی میں ان جھوٹی روایتوں سے متاثر ہوئے، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو آج تک برا بھلا کہتے ہیں۔

کیا شہادت عثمان، عجم کی سازش تھی؟

بعض حضرات نے "عجم کی سازش" کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں اور قتل عثمانی کو عجم کی سازش کہا ہے۔ جہاں تک ہم نے اس بغاوت کی تحقیق کی ہے، تو یہی نظر آیا ہے کہ اس کے تمام لیڈر عرب ہی تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے حکومت وقت سے خوش نہیں تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اقتدار ان کے سپرد کیا جائے۔ مختلف تاریخی روایات میں ایران کے شہر ہمدان کے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو ان جنگوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے۔ ممکن ہے کہ عربوں ہی نے ان عجمیوں کو استعمال کیا ہو لیکن لیڈر شپ بہر حال عرب ہی تھی۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہادت عثمانی میں عراق اور مصر کے لوگ نمایاں تھے۔ بعد میں مصر ان باغیوں سے پوری طرح پاک کر دیا گیا البتہ عراق ان کا گڑھ بنا رہا۔ اس کے بعد یہ طویل عرصہ تک ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے اور مرکزی حکومتوں کے خلاف بغاوتیں اٹھاتے رہے۔ اہل ایران تو اس منظر نامے میں بہت بعد میں آ کر شریک ہوئے۔ وہ اپنی چھوٹی موٹی بغاوتیں تو اٹھاتے رہے جس کا قلع قمع مقامی گورنر بآسانی کرتے رہے تاہم اس مرکزی نوعیت کی بغاوت میں اہل عراق نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس میں بھی عراق کے سبھی باشندے شریک نہ تھے بلکہ ان کا ایک شر پسند طبقہ تھا جو اپنے اقتدار کے لیے بغاوتیں اٹھانے اور امن میں خلل ڈالنے کو برا نہ سمجھتا تھا۔

اگر خلیفہ کوئی اور ہوتا تو کیا حالات مختلف ہوتے؟

بہت سے مورخین نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد ہوتے تو شاید حالات مختلف ہوتے۔ ہماری رائے میں یہ سمجھنا کہ خلیفہ کے مختلف ہونے سے حالات مختلف ہو جاتے، درست نہیں ہے۔ اس کی وجوہات یہ ہیں:

1۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ باغی تحریکوں کا ایک لائف سائیکل ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اچانک ہی بغاوت اٹھ کھڑی ہو بلکہ اس کے پیچھے سالوں کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس باغی تحریک کی بنیادیں حضرت عمر بلکہ شاید ابو بکر رضی اللہ عنہما کے دور میں رکھی جا چکی تھیں۔ اس وجہ سے تیسرا خلیفہ کوئی بھی ہوتا، باغی تحریک نے تو اٹھنا ہی تھا۔ اس صورت میں شہید ہونے والے خلیفہ شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ ہوتے اور آپ کے بعد جو بھی چوتھا خلیفہ بنتا، اس کے نام کو باغی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ شاید حضرت عثمان، طلحہ یا زبیر رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک کے نام پر کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ کھڑا کر دیا جاتا۔

2۔ جو بھی حکومتی پالیسیاں تھی، خلیفہ کے بدلنے سے اس کا بدلنا بھی ممکن نہ تھا کیونکہ پالیسی سازی کا کام صحابہ کرام مل کر مشورے سے کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے دور میں حضرت علی، طلحہ، زبیر، سعد رضی اللہ عنہم سب مل کر ہی فیصلے کرتے تھے۔ اس وجہ سے اگر خلیفہ ان حضرات میں سے کوئی ہوتا تو بھی پالیسیاں وہی رہتیں لیکن شاید اتنی نرم مزاجی اختیار نہ کی جاتی۔

3۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باغیوں کے معاملے میں جس نرمی کا مظاہرہ کیا، اس بات کا امکان البتہ موجود ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ ہوتے تو وہ شاید اس درجے کی نرمی نہ کرتے۔ گربہ کشتن روز اول کے مصداق وہ باغی تحریک کو ابتدا ہی میں کچل کر رکھ دیتے تو شاید یہ جوانی کی منزلوں تک نہ پہنچ پاتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باغی تحریک اس صورت میں اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاتی جاتی اور شاید 35/655 کی بجائے کچھ سال بعد نمودار ہوتی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں پر بعض لوگوں نے یہ تنقید کی ہے کہ انہوں نے باغی تحریک کے مقابلے میں بہت نرمی دکھائی۔ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہیے تھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بعد میں کیا۔ تاہم، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جس وقت حضرت عثمان نے ان کے خلاف نرمی دکھائی، اس وقت باغی تحریک کے برگ و بار پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عثمان کا خیال تھا کہ اگر انہیں قتل کیا گیا تو یہی بغاوت کہیں دس گنا بڑی ہو کر سامنے نہ آ جائے۔ تاہم بعد میں وہ سختی کے قائل ہو گئے تھے اور انہوں نے کوفہ، شام وغیرہ سے افواج بھیجنے کا حکم جاری فرمایا لیکن اس وقت دیر بہت ہو چکی تھی اور باغی معاملات کو اپنے کنٹرول میں لے چکے تھے۔

حضرت عثمان پر کیا الزامات لگائے گئے؟

باغی پارٹی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف الزامات کی ایک چارج شیٹ مرتب کی اور اسی کو بنیاد بنا کر پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ یہی چارج شیٹ انہوں نے اپنی روایات میں بھی داخل کر دی تاکہ اس کی مدد سے صحابہ کرام کو بدنام کر دیا جائے۔ یہی روایات چونکہ طبری وغیرہ میں موجود ہیں، اس وجہ سے مناسب ہے کہ ان الزامات کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ الزامات یہ تھے:

- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ بن عمر سے قصاص نہ لے کر دین کی خلاف ورزی کی ہے۔
- انہوں نے اپنے رشتے داروں کو اعلی عہدے دیے ہیں۔
- یہ گورنر ظلم کرتے ہیں، ان کا کردار اچھا نہیں ہے اور یہ گورنر طلقاء میں شامل ہیں۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سرکاری خزانے میں سے اپنے اقرباء پر خرچ کرتے ہیں۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دین میں نئی نئی بدعات نکالی ہیں جیسے مکہ میں انہوں نے قصر کی بجائے پوری نماز پڑھی اور

لوگوں کو قرآن مجید کے ایک سرکاری نسخے پر اکٹھا کر دیا ہے۔

- حضرت عثمان نے چراگاہوں کو اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔
- اکابر صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اقدامات سے مطمئن نہیں ہیں۔

مناسب رہے گا کہ اس موقع پر ہم وہ پوری روایت نقل کر دیں جس میں باغیوں نے آپ کے خلاف چارج شیٹ مرتب کی تھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہل مدینہ کے سامنے ان کے ایک ایک اعتراض کو لے کر اس کا جواب دیا تھا:

(جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو حضرت عثمان) نے اہل کوفہ اور اہل بصرہ کو خطوط لکھے اور "صلوۃ جامعہ" کا اعلان کرایا۔ (واضح رہے کہ صلوۃ جامعہ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ مدینہ کی پوری آبادی مسجد میں حاضر ہو کر مشورے میں شریک ہو۔) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو آپ نے حمد و ثنا کے بعد ان لوگوں کے حالات سے انہیں مطلع کیا اور وہ دونوں (حضرات جو باغیوں کا جائزہ لینے گئے تھے) کھڑے ہو گئے۔ سب صحابہ نے متفق ہو کر یہ کہا: "آپ ان سب کو قتل کر دیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص مسلمانوں کا خلیفہ ہوتے ہوئے اپنے یا کسی اور شخص کے لیے پروپیگنڈا کرے، تو اس پر اللہ کی لعنت ہے، تم اسے قتل کر دو۔" حضرت عمر بن خطاب نے بھی فرمایا ہے: "میں ایسے شخص (جو پروپیگنڈا کر کے اپنی حکومت کا اعلان کرے) کو کوئی رعایت نہیں دیتا ہوں۔ اسے مار دینا چاہیے اور میں اس کام میں تمہارا شریک ہوں۔"

یہ سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم انہیں معاف کرتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں اور اپنی کوشش کے مطابق انہیں دیکھتے رہیں گے۔ ہم کسی سے دشمنی نہیں رکھیں گے جب تک وہ کسی حد شرعی کے گناہ کا مرتکب نہ ہو یا کھلے کفر کا اظہار نہ کرے۔ ان لوگوں نے ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے جنہیں وہ اسی طرح جانتے ہیں جیسے آپ لوگ جانتے ہیں مگر وہ مجھے اس لیے یاد دلانا چاہتے ہیں کہ ناواقف لوگوں کے سامنے ان کی اشاعت کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں:

1۔ "میں نے سفر میں پوری نماز پڑھی حالانکہ وہ اس صورت میں قصر کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایسے شہر (مکہ) میں تھا جہاں میرے اہل و عیال تھے، اس لیے میں نے پوری نماز پڑھائی۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟" لوگوں نے کہا: جی ہاں۔

2۔ "وہ لوگ (باغی) کہتے ہیں کہ میں نے چراگاہ کو مخصوص کیا۔ میں نے واللہ اپنے لیے کوئی چراگاہ مخصوص نہیں کی۔ مجھ سے پہلے بھی چراگاہیں مخصوص کی گئیں۔ میں نے چراگاہ کو کسی ایک مخصوص آدمی (کے جانوروں) کے لیے مخصوص نہیں کیا تاکہ اہل مدینہ اس پر غالب نہ آ سکیں۔ پھر انہوں (سرکاری چرواہوں) نے رعایا میں سے کسی کو نہیں روکا بلکہ ان چراگاہوں کو مسلمانوں کے صدقات (بیت المال کے مویشیوں) کے لیے مخصوص کر رکھا ہے تاکہ کسی کے ساتھ جھگڑا اور تنازعہ نہ ہو اور کسی کو ان میں نہیں روکا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو دو سواریوں کے علاوہ میرے پاس کوئی مویشی نہیں ہے۔ نہ بکریاں ہیں اور نہ بھیڑیں اور نہ کوئی اور جانور۔ جب میں خلیفہ مقرر ہوا تھا تو اس وقت اہل عرب میں سب سے زیادہ بھیڑ بکریاں اور اونٹ میرے پاس تھے مگر اب حج کی سواری کے لیے دو اونٹوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟" لوگوں نے کہا: جی ہاں۔

3۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کئی کتابوں میں تھا، میں نے اسے ایک کر دیا ہے۔ قرآن کریم ایک ہے جو خدائے واحد کی طرف سے نازل ہوا۔ میں اس معاملے میں ان لوگوں (سابقہ خلفاء) کا تابع ہوں۔ کیا ایسا ہی ہے؟" لوگوں نے کہا: "جی ہاں۔ بے شک۔" پھر وہ مطالبہ کرنے لگے کہ ان باغیوں کو قتل کیا جائے۔ آپ نے مزید فرمایا۔

4۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے حکم (بن ابی العاص) کو واپس بلا لیا ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جلا وطن کر دیا تھا۔ حکم مکہ کے باشندے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مکہ سے طائف جلا وطن کیا، پھر حضور ہی نے انہیں واپس بلا لیا۔ اس طرح یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی جنہوں نے انہیں جلا وطن کیا اور پھر واپس بلا لیا۔ کیا ایسا ہی ہے؟" لوگوں نے کہا: "بے شک۔"

5۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے نوجوانوں کو حاکم بنا دیا ہے۔ میں نے انہی افراد کو حاکم بنایا ہے جو اہلیت رکھتے ہیں اور لوگ انہیں پسند کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ ان لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں جو ان گورنروں کی عمل داری میں رہتے ہیں اور ان کے شہروں کے باشندے ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی کم عمر شخص کو حاکم بنایا گیا تھا۔ (یاد کیجیے جب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ (بن زید) کو افسر بنایا تھا تو اس وقت آپ پر اس سے زیادہ اعتراض کیا گیا تھا، جو مجھ پر اعتراض کیے جا رہے ہیں۔ کیا ایسا ہی ہے؟" لوگوں نے کہا: "جی ہاں۔ بے شک۔ یہ لوگ ایسے اعتراضات کرتے ہیں جنہیں وہ ثابت نہیں کر سکتے ہیں۔"

6۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی سرح کو مال غنیمت میں سے خاص عطیہ دیا۔ میں نے انہیں مال غنیمت کے خمس کا خمس (1/25) حصہ انعام کے طور پر دیا تھا (کیونکہ انہوں نے بڑے معرکے میں غیر معمولی فتح حاصل کی تھی۔) یہ ایک لاکھ کی رقم تھی۔ ایسے احکام ابو بکر اور عمر نے بھی جاری کیے تھے۔ جب فوج نے اس بات کو ناپسند کیا تو میں نے یہ رقم واپس لے کر انہی میں تقسیم کر دی تھی حالانکہ یہ ابن ابی سرح کا حق نہیں تھا؟ کیا یہی بات ہے؟" لوگوں نے کہا: "جی ہاں۔"

7۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر والوں سے محبت کرتا ہوں اور انہیں مال دیتا ہوں۔ جہاں تک گھر والوں کی محبت کا تعلق ہے تو ان کی وجہ سے میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا بلکہ صرف ان کے حقوق ادا کیے ہیں اور **صرف اپنے مال ہی سے انہیں عطیات دیے ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک مسلمانوں کا مال اپنی ذات یا کسی اور کو دینے کے لیے حلال نہیں ہے۔** میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابو بکر و عمر کے زمانے میں اپنی ذاتی ملکیت میں سے بہت زیادہ خیرات کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں کفایت شعار اور کنجوس تھا۔ اب جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری عمر فنا ہو رہی ہے اور یہ تمام سرمایہ میں گھر والوں کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس زمانے میں یہ ملحد ایسی باتیں بنا رہے ہیں۔ واللہ! میں نے کسی شہر میں سے اضافی مال حاصل نہیں کیا جس کی وجہ سے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میں یہ مال انہی کو لوٹا دیتا تھا اور میرے پاس صرف پانچواں حصہ ہی پہنچتا تھا اور اس میں سے بھی کوئی چیز میں نے اپنے لیے کبھی نہیں رکھی۔ مسلمان اس مال کو وہاں کے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے، میرا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ **اللہ کے مال میں سے ایک پائی بھی ضائع نہیں کی گئی اور میں صرف اپنے ذاتی مال میں سے گزر اوقات کرتا ہوں۔**

8۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو زمینیں دیں۔ ان زمینوں میں مہاجرین و انصار کے وہ لوگ شریک ہیں جنہوں نے انہیں فتح کیا۔ لہذا جو

شخص ان فتوحات کے مقام پر رہتا ہے، وہ اس کا مالک ہے اور جو اپنے اہل و عیال کے پاس آ گئے، تو ان کے ساتھ وہ زمینیں منتقل نہیں ہوئیں۔ اس لیے میں نے اس قسم کی زمینوں کے بارے میں غور کیا تو اصل مالکوں کی اجازت اور مرضی سے عرب کی زمینوں کے ساتھ ان کا تبادلہ کیا گیا۔ اس طرح یہ زمینیں انہی لوگوں کے قبضہ میں ہیں، میرے قبضے میں نہیں۔

(راوی کہتے ہیں کہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا مال و متاع اور زمینیں بنو امیہ میں تقسیم کر دی تھیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اس میں عام حصہ دار بنایا تھا۔ اس تقسیم کا آغاز انہوں نے ابو العاص کی اولاد سے کیا تھا۔ چنانچہ (ابو العاص کے بیٹے) حکم کی اولاد میں سے ہر ایک کو دس دس ہزار دیے، اس طرح ان سب نے کل ایک لاکھ کی رقم حاصل کی۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو بھی اتنی ہی رقم دی تھی۔ اس کے علاوہ بنو عاص، بنو عیص اور بنو حرب میں اپنے مال کو تقسیم کر دیا تھا۔[68]

نئی باتیں نکالنے والے اعتراض کا شافی جواب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود ہی دے دیا۔ آپ پر یہ نئی باتیں نکالنے کا اعتراض کیا گیا تھا کہ آپ نے مکہ میں پوری نماز پڑھی تھی اور مدینہ کی بعض چراگاہوں کو بیت المال کے مویشیوں کے لیے خاص کر دیا تھا۔ اس کا جواب تو آپ دے چکے ہیں۔ بقیہ اعتراضات پر مزید تفصیلات ہم یہاں فراہم کر رہے ہیں۔

عبید اللہ بن عمر سے قصاص

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے ہرمزان اور ابو لؤلؤ فیروز کو کھسر پھسر کرتے دیکھا تھا۔ عبد الرحمن کو دیکھ کر فیروز تیزی سے چلا تو اس کے لباس میں سے ایک دو شاخہ خنجر گر گیا۔ اس وقت انہوں نے خیال نہ کیا لیکن اگلے روز جب اسی خنجر سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر وار کیا گیا تو انہیں یہ واقعہ یاد آیا اور انہوں نے سب کے سامنے بیان کر دیا۔ یہ سن کر حضرت عمر کے جواں سال بیٹے عبید اللہ کو جوش آیا اور انہوں نے جا کر ہرمزان اور اس کے ایک ساتھی جفینہ کو قتل کر دیا۔ لپیٹ میں فیروز کی ایک بیٹی بھی آ گئی اور وہ بھی قتل ہو گئی۔ عبید اللہ، عبد اللہ بن عمر کے چھوٹے بھائی تھے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر ہرمزان اور جفینہ اس سازش میں شریک بھی تھے، تو اس کی باقاعدہ تحقیقات کی جاتیں۔ تفتیش کر کے اگر ہرمزان پر جرم ثابت ہوتا تو انہیں سزا دی جاتی، ورنہ بری کر دیا جاتا لیکن عبید اللہ یہ سن کر اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے اور انہوں نے جا کر ان تینوں کو قتل کر دیا۔ وہ تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ مدینہ کی آبادی کے تمام غیر عرب باشندوں کو قتل کر دیں گے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور صہیب رضی اللہ عنہما نے انہیں بمشکل قابو کیا اور لا کر گھر میں قید کر دیا۔ اس وقت تک خلیفہ کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد یہ مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے بجائے خود فیصلہ کرنے کے ایک جیوری

[68] طبری۔ 35H/3/1/397-398

کے سامنے یہ مقدمہ پیش کیا جس میں تمام جلیل القدر صحابہ، مہاجرین اور انصار شامل تھے۔ قانون کو ہاتھ میں لینے کا جرم بہر حال ثابت تھا۔ بعض صحابہ، جن میں حضرت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما شامل تھے، کی رائے یہ تھی کہ عبید اللہ کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ دیگر لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ ان کی نفسیاتی حالت کے پیش نظر ان پر قصاص کی سزا نافذ نہ کی جائے۔ جرم کرتے وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھے اور جب آدمی جنون کی سی کیفیت میں ہو، تو اس پر شرعی احکام کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ابھی کل ہی حضرت عمر شہید ہوئے ہیں اور آج ان کے جواں سال بیٹے کو قتل کر دینا مناسب نہ ہو گا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ واقعہ اس وقت ہوا ہے جب کوئی خلیفہ موجود نہ تھا۔ اس جیوری کی اکثریت کا موقف مانا گیا اور عبید اللہ پر قصاص کی بجائے دیت کی سزا نافذ کی گئی۔ ان کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ وہ دیت ادا کر سکتے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جائیداد کا بڑا حصہ قرض چکانے میں نکل چکا تھا۔ حضرت عثمان نے اس مسئلے کا حل یہ کیا کہ اپنی ذاتی جیب سے ان کی دیت ادا کر دی۔ [69]

اس مقدمے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قصاص کی سزا نافذ نہ کر کے ایک غلط کام کیا۔ یہ اعتراض خاص کر ان باغیوں نے اٹھایا تھا جنہوں نے آپ کو شہید کیا تھا۔ یہ اعتراض کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ حضرت عثمان کی اپنی رائے قصاص لینے ہی کی تھی۔ پھر جو فیصلہ ہوا جو جیوری کی اکثریت نے کیا جن میں تمام مہاجرین و انصار شامل تھے۔ طبری ہی کی ایک اور روایت کے مطابق، جیوری کے اس فیصلے سے قبل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کے بیٹے قماذبان کو قصاص لینے کی اجازت دے دی تھی۔

> قماذبان اپنے والد (ہرمزان) کے قتل کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں: اہل عجم مدینہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ایک دن فیروز میرے والد کے پاس سے گزرا، اس کے ہاتھ میں دو شاخہ خنجر تھا۔ (میرے والد) نے اسے پکڑا اور پوچھا: "تم اس ملک میں اس کا کیا کرو گے؟" وہ بولا: "میں اسے استعمال کروں گا۔" ایک آدمی (عبد الرحمن بن ابی بکر) نے اسے اس حالت میں دیکھا تھا۔ جب حضرت عمر پر حملہ ہوا تو اس شخص نے کہا: "میں نے اس (قاتل) کو ہرمزان کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے یہ خنجر فیروز کو دیا تھا۔" لہذا عبید اللہ نے آ کر انہیں (میرے والد کو) قتل کر دیا۔
>
> جب حضرت عثمان خلیفہ بنے تو انہوں نے مجھے (قماذبان کو) بلایا اور مجھے اس کا اختیار دیتے ہوئے کہا: "میرے بیٹے! یہ تمہارے والد کا قاتل ہے اور تم ہم سے زیادہ اس پر حق رکھتے ہو۔ جاؤ اور اسے قتل کر دو۔" میں اسے (عبید اللہ) کو ساتھ لے گیا۔ اس وقت اس مقام کا ہر شخص میرے ساتھ تھا مگر وہ سب مجھ سے اس کے بارے میں کچھ مطالبہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: "کیا میں اسے قتل کر دوں؟" وہ بولے: "ہاں۔" انہوں نے عبید اللہ کو برا بھلا کہا۔ پھر میں نے ان سے پوچھا: "کیا آپ لوگ اسے قتل کرنے سے منع کرتے ہیں؟" وہ بولے: "نہیں۔" انہوں نے پھر عبید اللہ کو برا بھلا کہا۔

---

[69] ایضاً۔ 23H/3/1-272

میں نے اللہ کی رضا کے لیے انہیں چھوڑ دیا اور ان لوگوں (مسلمانوں) کی خاطر انہیں رہا کر دیا۔ اس کے بعد لوگوں نے مجھے اوپر اٹھالیا۔ واللہ! میں لوگوں کے سروں اور ہاتھوں (کندھوں) پر سوار ہو کر گھر پہنچا۔[70]

اس روایت سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قصاص ہی کا حکم جاری کیا تھا لیکن جب قماذبان نے عبید اللہ کو معاف کر دیا تو حکومت نے بھی انہیں معاف کر دیا۔ قماذبان نے عبید اللہ کو معاف کر کے جس اعلی کردار کا ثبوت دیا کہ وہ ایک مخلص مسلمان تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے والد ہرمزان کسی سازش میں شریک نہ تھے بلکہ اتفاقاً ہی فیروز سے ان کی ملاقات ہو گئی جس میں اس کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ ہمیں بھی ہرمزان کے بارے میں حسن ظن ہی رکھنا چاہیے۔ ہاں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ بارہ برس بعد باغیوں نے اس انتقام کو از سر نو لینے کی کوشش کیوں کی۔ ممکن ہے کہ وہ فتنہ برائے فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہوں تاکہ مسلمانوں میں پھوٹ پڑے اور ان کے مقاصد پورے ہوں یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے وہ اپنے ایرانی ساتھیوں کو خوش کرنا چاہتے ہوں جن کے نزدیک حضرت عمر کا قاتل فیروز ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ جب مقتول کے وارث نے قاتل کو معاف کر دیا تھا تو پھر جیوری بٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟ اصل میں مسئلہ یہ تھا کہ عبید اللہ نے ایک مرکب جرم (Compound Crime) کا ارتکاب کیا تھا جس میں دو جرائم تھے: ایک تو قتل اور دوسرے قانون کو ہاتھ میں لینا۔ قتل کا قصاص مقتول کے وارثوں کا حق تھا جسے انہوں نے معاف کر دیا۔ قانون کو ہاتھ میں لینا ایسا جرم تھا جس کی سزا ابھی باقی تھی۔ مہاجرین و انصار کی جیوری کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا اور ان کی اکثریت نے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ یہ جرم حالت جنون میں ہوا ہے، اس وجہ سے قصاص کی بجائے دیت کی سزا نافذ کی جائے۔ چونکہ عبید اللہ کے پاس مال نہ تھا، اس وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ دیت اپنی جیب سے ادا کر کے معاملے کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے سلجھا دیا۔

اقربا پروری کی تہمت

باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سب سے بڑا الزام یہ عائد کیا کہ انہوں نے عہدوں کی تقسیم میں اقرباء پروری سے کام لیا اور میرٹ کو نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے اپنے ان رشتہ داروں کو گورنر بنا دیا، جو اسلام کے ساتھ مخلص نہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو فتح مکہ کے بعد مجبوراً اسلام لائے تھے اور عہدوں کے اہل نہ تھے۔ بعد کے ادوار میں جو لوگ باغیوں کے اس پراپیگنڈا سے متاثر ہوئے، انہوں نے بھی اسی قسم کی باتیں کہیں۔

عہد جاہلیت ہی سے بنو امیہ سیاسی مناصب پر فائز چلے آرہے تھے کیونکہ ان میں اس کی صلاحیت تھی۔ مکہ ایک شہری ریاست (City State) تھا بعثت نبوی کے زمانے میں بنو امیہ مکہ کے اہم سیاسی مناصب پر فائز تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت

[70] ایضاً۔ 3/1-276

پیش کی تو بنو امیہ کے نیک دل لوگ آگے بڑھ کر ایمان لائے جن میں حضرت عثمان اور خالد بن سعید رضی اللہ عنہما نمایاں تھے۔ بنو امیہ کے لوگوں کی تقرری خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد عہدوں پر کی تھی کیونکہ یہ اس کے اہل تھے۔ آپ نے اکیس سالہ اموی نوجوان عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا گورنر مقرر فرمایا، مشہور اموی سردار ابو سفیان کو نجران، ان کے بیٹے یزید بن ابی سفیان کو تیماء، خالد بن سعید کو صنعاء (یمن)، عمرو بن سعید کو تبوک، حکم بن سعید کو وادی القری، اور ابان بن سعید رضی اللہ عنہم کو بحرین کا گورنر مقرر فرمایا۔ اسی طرح حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے بھی بنو امیہ کے لوگوں کو اہم عہدے دیے کیونکہ ان میں اس کی صلاحیت موجود تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کے اس الزام کے جواب میں ہم پہلے ایک چارٹ پیش کریں گے جس میں عہد عثمانی کے تمام عہدے داروں کے نام دے رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم ایک ایک شخص کا جائزہ لے کر یہ بیان کریں گے کہ اس کی تقرری کیسے ہوئی؟ یہ معلومات ہم تاریخ طبری کے اس مقام سے نقل کر رہے ہیں، جہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا باب مکمل ہوتا ہے۔ ان میں اکثر لوگ اس وقت گورنر تھے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔

نمبر شمار	عہدے دار [71]	علاقہ	قبیلہ	تقرری
	صوبہ حجاز و یمن			
1.	عبداللہ بن حضرمی	مکہ	یمن کا ایک قبیلہ	
2.	قاسم بن ربیعہ ثقفی	طائف	بنو ثقیف (طائف)	
3.	یعلیٰ بن امیہ تیمی	یمن	بنو تیم (قریش)	
4.	عبداللہ بن ربیعہ الغنزی	الجند	بنو مخزوم (قریش)	
5.	خالد بن عاص مخزومی	مکہ	بنو مخزوم (قریش)	
6.	عبداللہ بن حارث بن نوفل	مکہ	بنو ہاشم (قریش)	
	صوبہ عراق و ایران			
7.	عبداللہ بن عامر	بصرہ	بنو امیہ	حضرت عثمان
8.	سعد بن ابی وقاص	کوفہ	بنو زہرہ	حضرت عمر
9.	ولید بن عقبہ بن ابی معیط	الجزیرہ۔ کوفہ	بنو امیہ	حضرت عمر و عثمان

[71] طبری۔ 3/1-480۔ مزید تفصیلات ابن سعد، ابن عبد البر وغیرہ کی کتابوں میں ان عہدے داروں کے ناموں کے تحت دیکھی جا سکتی ہیں۔

نمبر شمار	عہدے دار[71]	علاقہ	قبیلہ	تقرری
10.	سعید بن عاص	کوفہ	بنو امیہ	حضرت عمر
11.	ابو موسی اشعری	کوفہ	بنو اشعر (یمن)	حضرت عمر و عثمان
12.	جریر بن عبد اللہ بجلی	قرقیسیا	بنو بجیلہ	
13.	اشعث بن قیس الکندی	آذربائیجان	بنو کندہ	
14.	عتیبہ بن النہاس	حلوان	نامعلوم	
15.	مالک بن حبیب الیربوعی	ماہ	بنو تمیم	
16.	سعید بن قیس	رے (موجودہ تہران)	ایرانی	
17.	سائب بن اقرع	اصفہان	بنو ثقیف	
18.	نسیر	ہمدان	ایرانی	
19.	جیش	ماسبدان	ایرانی	
20.	حکیم بن سلامہ الخرامی	موصل	بنو خرام	
21.	عبد اللہ بن مسعود	بیت المال کوفہ	حلیف بنو مخزوم	
22.	عقبہ بن عمرو	بیت المال کوفہ	انصار	
23.	جابر بن فلان المزنی	کلیکٹر عراق	بنو مزینہ	
24.	سماک انصاری	کلیکٹر عراق	انصار	
25.	قعقاع بن عمرو	کمانڈر کوفہ	بنو تمیم	
	صوبہ مصر			
26.	عمرو بن عاص	مصر	بنو مخزوم	حضرت عمر
27.	عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح	مصر	بنو عامر	حضرت عمر
	صوبہ شام			
28.	معاویہ بن ابی سفیان	شام	بنو امیہ	حضرت عمر
29.	عبد الرحمن بن خالد بن ولید	حمص، الجزیرہ	بنو مخزوم (قریش)	

نمبر شمار	عہدے دار [71]	علاقہ	قبیلہ	تقرری
.30	حبیب بن مسلمہ فہری	قنسرین	بنو فہر (قریش)	
.31	ابو الاعور بن سفیان سلمی ذکوانی	اردن	بنو ذکوان	
.32	علقمہ بن حکیم کنانی	فلسطین	بنو کنانہ	
.33	عبد اللہ بن قیس فزاری	ساحلی علاقے	بنو فزارہ	
.34	ابو درداء	قاضی دمشق	بنو خزرج (انصار)	
	دار الحکومت			
.35	علی، طلحہ، زبیر، سعد	مرکزی کابینہ		
.36	مروان بن حکم	کاتب خلیفہ	بنو امیہ	حضرت عثمان
.37	زید بن ثابت رضی اللہ عنہم	قاضی مدینہ اور بیت المال (وزیر خزانہ)	بنو خزرج (انصار)	
.38	مغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبد المطلب	قاضی	بنو ہاشم	
.39	عبد اللہ بن ارقم	بیت المال (وزیر خزانہ)	بنو زہرہ (قریش)	
.40	عبد اللہ بن قنفذ	پولیس چیف	بنو تیم (قریش)	

اب اس چارٹ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کل چھ افراد بنو امیہ کے نظر آتے ہیں۔ اب ہم ان حضرات کے کارناموں کی تفصیل بیان کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو گا کہ ان کی تقرری کس نے کی اور اس کے اسباب کیا تھے؟ ان میں سے بھی چار کی تقرری حضرت ابو بکر یا عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں ہو چکی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ ان کی پرفارمنس کے اعتبار سے انہیں پروموشن دی جو کہ کسی بھی سول سروس یا فوج کا عام معمول ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان گورنروں کی پرفارمنس کیا تھی، جس کی بنیاد پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے متعلق فیصلے کیے۔

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ سول ایڈمنسٹریشن ان کی تقرری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی تھی جن کی مردم شناسی ضرب المثل ہے۔ حضرت عمر نے انہیں "الجزیرہ" کا حاکم مقرر کیا تھا جو کہ شمالی عراق میں دجلہ و فرات کی زرخیز وادی کو کہا

جاتا ہے۔ انہوں نے اس علاقے کا بہترین انتظام کیا اور اس سے متعلق کوئی شکایت بھی تاریخ کی کتب میں موجود نہیں ہے۔ یہاں سے آگے بڑھ کر انہوں نے شمال میں آرمینیا کے متعدد علاقے فتح کیے۔ طبری کے مطابق وہ جب جہاد کے لیے روانہ ہوتے تھے تو دور دراز مقامات تک پہنچ جاتے تھے، کسی چیز میں کوتاہی نہ کرتے تھے اور ایسے انتظامات کرتے تھے کہ دشمن ان کے مقابلے پر آنے سے احتراز کرتا تھا۔[72] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کا تبادلہ کر کے انہیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ طبری کی روایت کے مطابق جب یہ کوفہ آئے تو لوگوں کی مقبول ترین شخصیت بن گئے کیونکہ ان کا سلوک نرم تھا۔ پانچ سال تک ان کا طرز عمل یہ تھا کہ انہوں نے اپنے گھر میں دروازہ نہیں بنایا تاکہ کسی شخص کو بھی گورنر تک اپنی بات پہنچانے میں مشکل نہ ہو۔[73] اس کردار کے گورنر کے تبادلے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کی جگہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو کیوں مقرر فرمایا؟ اس کا واقعہ یوں تھا کہ حضرت سعد نے بیت المال سے ذاتی ضروریات کے لیے کچھ قرض لیا اور اسے وقت پر ادا نہ کر سکے۔ جب بیت المال کے سربراہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مطالبہ کیا تو حضرت سعد نے مزید مہلت مانگی۔ اس پر ان کے مابین کچھ تلخ کلامی ہو گئی اور لوگ اکٹھے ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مدینہ بلوا لیا۔ واضح رہے کہ اس دور میں "معزولی" کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ ایک شخص کو بالکل ہی تمام معاملات سے الگ کر دیا جائے بلکہ اس کا مطلب تبادلہ (Transfer) ہوتا تھا جو کہ آج بھی فوجی اور سول ایڈمنسٹریشن میں عام معمول ہے۔ حضرت عثمان نے حضرت سعد رضی اللہ عنہما کو کوفہ کی بجائے دار الحکومت میں ذمے داریاں دے دیں اور کوفہ میں ولید بن عقبہ کو مقرر کر دیا۔[74]

بعض لوگوں حضرت عثمان پر زبان طعن دراز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے ولید کو الجزیرہ کے غیر اہم علاقے سے ہٹا کر کوفہ جیسے مرکزی مقام کا عہدہ دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ سول اور فوجی ایڈمنسٹریشن میں تبادلے ایک عام معمول ہے اور عہدے داروں کو ضرورت کے مطابق تبدیل کیا جاتا ہے۔ ولید بن عقبہ کے بارے میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ وہ کوفہ کی محبوب ترین شخصیت تھے اور ان کے کردار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پانچ سال تک گھر کا دروازہ نہیں لگایا تاکہ کسی سائل کو ان تک رسائی میں مشکل نہ ہو۔ جب کوفہ میں باغی تحریک نے قدم جمانے شروع کیے تو ان کے بعض لوگوں نے ایک شخص ابن حیسمان الخزاعی کو قتل کر دیا۔ یہ مقدمہ گورنر کے پاس پیش ہوا اور صحابی ابو شریح رضی اللہ عنہ کی گواہی پر فیصلہ ہوا جو واقعے کے عینی شاہد تھے۔ ولید نے معاملے کو

[72] ایضاً۔30H/3/1-309

[73] ایضاً۔35H/3/1-285

[74] ایضاً۔26H/3/1-285

حضرت عثمان کے پاس لکھ بھیجا جنہوں نے قصاص میں قاتلوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا اور اس سزا کو نافذ کر دیا گیا۔ اب ان قاتلوں کے باپوں اور دیگر وارثوں نے گورنر کے خلاف محاذ بنا لیا۔ حضرت ولید رضی اللہ عنہ دعوتی ذہن رکھتے تھے اور غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرتے تھے۔ ان کی دعوت سے ایک عیسائی شاعر ابو زبید نے اسلام قبول کیا تھا اور اکثر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ باغیوں نے ان پر الزام عائد کیا کہ وہ ابو زبید کے ساتھ مل کر شراب پیتے ہیں۔ انہوں نے پورے شہر میں یہ پراپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔

جب یہ بات بیت المال کے سربراہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا: "جو ہم سے کوئی عیب چھپائے، ہم اس کی پردہ دری نہیں کرتے اور اس کی ٹوہ نہیں لگاتے۔"[75] ولید نے اس پر انہیں بلا کر سرزنش کی کہ آپ کا جواب مناسب نہ تھا۔ ایسا جواب تو مشتبہ افراد کے بارے میں دیا جاتا ہے، جبکہ میرا معاملہ تو آپ کے سامنے ہے۔ اس پر ان کے مابین کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی۔ باغیوں میں سے کچھ لوگوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شکایت کی تو آپ نے فرمایا: "تم بدگمانی کرتے ہو اور مسلمانوں میں غلط باتیں پھیلاتے ہو اور بغیر اجازت کے چلے آتے ہو، واپس چلے جاؤ۔" ان لوگوں نے اب سازش تیار کی اور چونکہ ولید کے گھر پر دروازہ نہ تھا، اس وجہ سے رات کے وقت ان کی انگوٹھی چرا لائے اور مدینہ آ کر باقاعدہ مقدمہ پیش کیا کہ ہم نے ولید رضی اللہ عنہ کو شراب نوشی کرتے دیکھا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم ان کی انگوٹھی اتار لائے اور انہیں علم نہیں ہو سکا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ولید کو طلب کیا اور ان سے فرمایا: "جھوٹے گواہ کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اے میرے بھائی! تم صبر کرو۔" اس کے بعد انہوں نے ولید پر شراب کی سزا نافذ کی کیونکہ عدالت میں فیصلہ ظاہری گواہی پر ہوتا ہے۔[76]

طبری ہی کی ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب نوشی کا یہ واقعہ سر تا سر جھوٹ تھا اور محض حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کروانے کے لیے گھڑا گیا تھا۔ کوفہ کے یہ شر پسند اسی طرح سے حضرت عمر کے زمانے میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما پر بدکاری کی تہمت لگوا کر انہیں معزول کروانے کی کوشش کر چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قتل کے واقعے کے بعد باغی تحریک کے لیے کوفہ میں پنپنا مشکل ہو رہا تھا، چنانچہ انہوں نے الزام تراشی کے ذریعے ایک کمزور گورنر لانا چاہا تا کہ وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں لیکن ان کے لیے مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جس نئے گورنر کو مقرر کیا، وہ بھی نہایت ہی بیدار مغز تھے۔ ہماری مراد سعید بن عاص رحمہ اللہ سے ہے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

ولید بن عقبہ کے بارے میں ایک اور جھوٹی روایت وضع کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بنو عبد المصطلق کی طرف صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا تو یہ صدقات وصول کیے بغیر واپس آ گئے اور آ کر کہہ دیا کہ یہ لوگ تو جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس پر سورۃ الحجرات کی یہ آیت نازل ہوئی کہ۔ إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا

[75] ایضاً۔30H/3/1-309

[76] ایضاً۔3/1-314

فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ. "اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی تصدیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی میں نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے فعل پر نادم ہو جاؤ۔" [77]

یہ روایت بھی محض ولید کی کردار کشی کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اس کی سند میں متعدد مسائل موجود ہیں۔ یہ روایت مسند احمد بن حنبل میں آئی ہے اور اس کی سند یوں بیان ہوئی ہے: حدثنا عبد الله حدثني أبي حدثنا محمد بن سابق حدثنا عيسى بن دينار حدثنا أبي أنه سمع الحرث بن ضرار الخزاعي قال۔ ان راویوں کے ناموں پر غور کیجیے تو اس میں تین راوی نمایاں ہیں:

- محمد بن سابق ایسے راوی ہیں جن کے قابل اعتماد ہونے یا نہ ہونے پر ائمہ جرح و تعدیل میں اختلاف ہے۔ بعض ماہرین انہیں ثقہ اور بعض ضعیف بلکہ منکر قرار دیتے ہیں۔ ان میں ابن المدینی، ابو حاتم اور یحیی بن معین شامل ہیں۔ [78]
- دوسرے راوی عیسی بن دینار ہیں جو کہ اسپین کے قاضی تھے۔ ان کے حالات کی زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے کہ یہ کس درجے میں قابل اعتماد تھے۔
- تیسرے راوی ان کے والد دینار ہیں جن کا پورا نام معلوم نہیں ہے۔ میزان الاعتدال میں دینار نام سات راویوں کے حالات ملتے ہیں اور وہ سب کے سب ضعیف یا متروک ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب ابو عمر دینار تھے جو بنو امیہ کے خلاف اٹھنے والے مختار ثقفی کی پولیس میں شامل تھے۔ اگر یہ دینار یہی صاحب تھے تو پھر واضح ہے کہ یہ روایت انہوں ہی نے گھڑی ہو گی۔ [79]

اس کے برعکس مسند احمد کی روایت کے مطابق ولید بن عقبہ خود فرماتے ہیں کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر چند لڑکوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے سب کے سر پر دست مبارک پھیرا سوائے ولید کے کیونکہ ان کے سر میں خوشبودار تیل لگا تھا۔ پھر آپ نے ان سب کے لیے دعا فرمائی۔ اب اگر ولید، فتح مکہ کے موقع پر لڑکے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لڑکے کو کیسے صدقات کی وصولی جیسے ذمہ دارانہ کام کے لیے بھیج سکتے تھے۔ اس کے بعد انہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ قضاعہ سے صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا جو ان پر اعتماد کی علامت ہے۔ اگر یہ روایت درست ہوتی تو حضرت ابو بکر انہیں اسی کام پر نہ بھیجتے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ اہم جنگی خدمات انجام دیتے رہے اور انہوں نے انہیں الجزیرہ کا گورنر بنا دیا۔ باغیوں کو چونکہ حضرت ولید سے خاص بغض تھا، اس وجہ سے انہوں نے یہ روایت وضع کی ہے۔

---

[77] الحجرات 49:6

[78] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 7574۔ 6/157

[79] ایضاً۔ راوی نمبر 2694۔ 3/48

ابن جریر طبری، جو مورخ کے علاوہ بڑے رجحان ساز مفسر بھی ہیں، نے اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ کے تحت یہ واقعہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل ہوا ہے اور وہاں رجلا (ایک شخص) کے الفاظ ہیں اور ولید بن عقبہ کا نام نہیں ہے۔ اس کے بعد طبری نے متعدد اسناد سے نقل کی ہیں لیکن ان اسناد کی حیثیت یہ ہے کہ ان میں راویوں کے نام بس مختصر سے دیے ہوئے ہیں جس کے باعث یہ سراغ لگانا ممکن نہیں ہے کہ ان میں سے کون سا راوی کس درجے میں قابل اعتماد ہے۔[80]

سعید بن عاص رحمہ اللہ

سعید بن عاص رحمہ اللہ کے جو حالات طبری نے لکھے ہیں، ان کے مطابق یہ یتیم تھے اور ان کی پرورش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ دمشق میں مقیم تھے اور بیمار تھے۔ حضرت عمر نے ان کے بارے میں پوچھا اور پھر انہیں بلا بھیجا۔ یہ مدینہ آ کر تندرست ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: "میرے بھتیجے! مجھے تمہاری قابلیت اور صلاحیت کی خبر ملی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دو، اللہ تمہیں ترقی دے گا۔" پھر حضرت عمر نے انہیں شادی کا مشورہ دیا۔

سعید بن عاص نے سیدہ ام کلثوم بنت علی کو نکاح کا پیغام بھیجا اور اس وقت ایک لاکھ درہم بطور مہر دیے۔ اس رشتے پر حضرت علی، حسن اور ام کلثوم تیار تھے البتہ حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو کچھ اعتراض تھا۔ حضرت حسن نے اس شادی پر اصرار کیا مگر سعید نے کہا: ”میں ایسے معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا جسے حسین پسند نہ کرتے ہوں۔“ انہوں نے منگنی ختم کر دی اور ایک لاکھ درہم بھی واپس نہ لیے۔ اس سے ان کی شرافت اور اہل بیت کے ساتھ ان کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔[81]

سعید کی ملاقات ایک چشمے پر کچھ بے سہارا خواتین سے ہوئی۔ یہ ان کے حالات سے بہت متاثر ہوئے اور ان میں سے ایک سے انہوں نے شادی کر لی اور دیگر بے سہارا خواتین میں سے ایک سے حضرت عبدالرحمن بن عوف اور ایک سے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہما نے شادی کر لی۔ سعید کے چچا خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ (دادا پوتے کا نام ایک ہی تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابہ میں سے تھے اور انہوں نے زبردست خدمات انجام دی تھی۔ سعید نے بھی اپنے چچا کے نقش قدم پر بہترین خدمات انجام دیں۔ انہوں نے طبرستان کے جہاد میں قیادت کی اور کامیاب رہے۔ انہوں نے جارجیا اور طبرستان کا وسیع علاقہ فتح کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے ان کا شمار بھی مشہور لوگوں میں ہونے لگا تھا۔[82]

اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعید بن عاص رحمہ اللہ کی تقرری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی تھی اور وہ اپنی پرفارمنس سے انہیں متاثر کر چکے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو ان کا محض تبادلہ کیا تھا اور ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں ایک مشکل

---

[80] ابن جریر طبری۔ تفسیر الجامع البیان فی تاویل القرآن۔ زیر آیت 49:6۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ (ac. 19 Feb 2008) www.almeshkat.net/

[81] ذہبی۔ سیر الاعلام النبلا۔ 1809۔ شخصیت نمبر 2274

[82] طبری۔ 3/1-314

صوبے "کوفہ" کی گورنری دی تھی جو کہ اس وقت تک باغی تحریک کا گڑھ بن چکا تھا۔

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ

یہ بھی ایک جلیل القدر صحابی تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی تھے۔ ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ یہ ان لوگوں میں سے تھے جو اسلام لا کر مرتد ہو گئے تھے اور جن کے بارے میں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کا حکم دیا تھا۔ حضرت عثمان نے انہیں سمجھایا تو یہ ایمان لے آئے اور پھر حضرت عثمان کی کوششوں سے ہی انہیں معافی ملی۔[83] اس کے بعد یہ مخلص مومن رہے اور انہوں نے خلفائے راشدین کے زمانے میں بہترین ایمان کا مظاہرہ کیا۔ ویسے بھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو معاف فرما دیں تو پھر کسے اعتراض کی گنجائش ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سعد کو اس فوج کا افسر مقرر کیا تھا، جو مصر پر حملہ آور ہوئی تھی۔ فتح کے بعد انہیں بالائی مصر (جنوبی مصر) کا گورنر مقرر فرمایا تو انہوں نے آگے بڑھ کر شمالی سوڈان کا علاقہ بھی فتح کر لیا جو ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں زیریں مصر (شمالی مصر) کا گورنر مقرر کیا اور انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کیا کہ وہ اس منصب کے حق دار تھے اور لیبیا تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ فسطاط شہر چونکہ باغی تحریک کا مرکز بن چکا تھا اور حضرت عبداللہ نے ان پر کچھ سختی کی تھی، اس وجہ سے ان باغیوں نے آپ کو خاص ہدف بنا کر آپ پر تنقید کی۔

عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ

یہ بنو امیہ سے تعلق رکھنے والے وہ واحد شخص تھے جنہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گورنر مقرر کیا اور ایسا ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے ہوا۔ اس وقت ان کی عمر محض 25 سال تیھ۔ ابن عامر نوجوانی ہی میں نہایت ہی سادہ طرز زندگی کے عادی تھے۔ دن کو روزہ اور رات کو عبادت ان کا معمول تھا۔ ابن عامر ایک صالح نوجوان تھے اور اپنے ساتھ ہمیشہ نیک لوگوں ہی کو رکھا کرتے تھے۔ دوران جہاد آپ کہا کرتے تھے: "مجھے عراق کی کسی چیز پر حسرت نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہاں دوپہر کی گرمی میں موذنوں کی آوازیں اکٹھی گونجتی ہیں اور اسود بن کلثوم (جیسے دیندار) ساتھی۔"[84]

صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ گورنر بننے کے بعد انہوں نے فتوحات کی رفتار تیز کر دی۔ 31/651 میں انہوں نے موجودہ مشرقی ایران اور مغربی افغانستان کا بڑا حصہ انہوں نے فتح کیا جن میں طوس، بیورو، نسا اور سرخس شامل تھے جبکہ مرو شہر کے باشندوں نے صلح کر لی۔ اس کے بعد انہوں نے خراسان بھی فتح کیا۔ سجستان کی فتح بھی ابن عامر ہی کا کارنامہ تھی جس میں موجودہ افغانستان اور پاکستان کے بعض حصے

[83] نسائی۔ کتاب تحریم الدم۔ حدیث 4067

[84] طبری۔ 31H/3/1-341

شامل تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا: "کسی اور کے ہاتھوں اتنے علاقے فتح نہیں ہوئے جتنے آپ کے ہاتھوں ہوئے ہیں۔ ان میں فارس، کرمان، سجستان اور تمام خراسان کا علاقہ شامل ہے۔" ابن عامر نے جواب دیا: "نہایت ضروری ہے کہ میں (ان کامیابیوں پر) اللہ کا شکر اس طرح ادا کروں کہ اسی مقام پر احرام باندھ کر عمرہ ادا کروں۔" اس طرح وہ نیشاپور (شمال مشرقی ایران) سے احرام باندھ کر چلے اور عمرہ ادا کیا۔ اس سے ان کے زہد و تقوی کا اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا طویل راستہ احرام کی پابندیوں میں بسر کیا۔ اس کے بعد جب وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو آپ نے اسے پسند نہیں فرمایا کیونکہ یہ حد سے تجاوز تھا اور فرمایا: "کاش! آپ اسی میقات سے احرام باندھتے جہاں سے سبھی مسلمان احرام باندھتے ہیں۔"[85]

اس کے بعد بھی خراسان کے علاقے سے متعدد بغاوتیں اٹھتی رہیں جنہیں ابن عامر ہی فرو کرتے رہے۔ چونکہ انہوں نے حضرت عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے زمانے میں اٹھنے والی باغی تحریک کے خلاف زبردست اقدام کیے، اس وجہ سے باغیوں نے انہیں خاص طور پر نشانہ بنایا۔

مروان بن حکم رحمہ اللہ

ان کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ یہ صحابی ہیں یا تابعی۔ ان کے والد حکم بن ابی العاص کو ان کی اسلام دشمنی کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف میں جلاوطن کر دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نہایت نرمی کے ساتھ اپنے قبیلے اور خاندان کے لوگوں کو اسلام میں لانے کا شوق تھا، اس وجہ سے انہوں نے ان کی سفارش کی اور یہ اسلام قبول کر کے مکہ واپس آ گئے۔ مروان ایک بڑے عالم اور عبادت گزار آدمی تھے اور ان کی تربیت براہ راست اکابر صحابہ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ امام مالک نے موطاء میں مروان کے متعدد عدالتی فیصلوں کو بطور "سنت ثابتہ" درج کیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مروان کو کوئی سرکاری عہدہ نہیں دیا البتہ ان سے کتابت کی خدمات لیتے رہے۔ سرکاری خطوط اور فرامین وغیرہ ان سے لکھواتے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسا عہدہ نہیں ہے جس پر اعتراض ہو سکے۔ بعض حضرات نے انہیں حضرت عثمان کا سیکرٹری کہا ہے اور ان پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ انہوں نے اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ مروان کو زیادہ سے زیادہ حضرت عثمان کا "پرسنل سیکرٹری" کہا جا سکتا ہے نہ کہ "سیکرٹری آف دی اسٹیٹ۔" ان کی ملازمت کی نوعیت کلیریکل نوعیت کی تھی کہ حضرت عثمان جو فیصلہ لکھوانا چاہیں، ان سے لکھوا لیں۔ انہیں کوئی انتظامی اختیارات حاصل نہ تھے، جس سے وہ فائدے اٹھا سکتے۔

جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو مروان، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پر جوش حامی بن کر ابھرے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جو

[85] ایضاً۔ 3/1-355

تلوار کے ذریعے باغیوں کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ باغیوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں یہ شدید زخمی بھی ہوئے جو کہ ان کے خلوص کا ثبوت ہے۔ طبری کی روایات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ان پر تنقید موجود ہے۔ یہ تنقید بھی ان کے حد سے بڑھے جوش سے متعلق ہے ورنہ بعد میں خود حضرت علی کی دو بیٹیوں کی شادیاں مروان کے دو بیٹوں سے ہوئیں۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔ چونکہ بعد میں مروان خود ایک سال کے لیے خلیفہ بنے اور ان کے بعد ان کے بیٹوں اور پوتوں میں خلافت منتقل ہوئی جن کے خلاف باغی مسلسل تحریک چلاتے رہے، اس وجہ سے ان کے خلاف روایتیں وضع کر کے ان کی کردار کشی کی گئی۔

معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما

باغی راویوں نے جس ہستی کو سب سے زیادہ شدید تنقید اور تہمتوں کا نشانہ بنایا ہے، وہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بے مثال حکمت و دانش سے باغی تحریک کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی مزید تفصیل ہم آگے حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما سے متعلق ابواب میں بیان کریں گے۔

حضرت معاویہ کے بارے میں یہ الزام تراشی کی جاتی ہے کہ وہ ایک بڑے اسلام دشمن کے بیٹے تھے اور دل میں اسلام سے بغض رکھتے تھے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان کے والد ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے چند برس اسلام دشمنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگوں کی قیادت کی لیکن فتح مکہ کے موقع پر وہ مسلمان ہوئے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نجران کا گورنر مقرر فرمایا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابو سفیان دل سے مسلمان ہو چکے تھے ورنہ انہیں ایک اہم اور حساس علاقے کا گورنر کیوں بنایا جاتا جہاں کی آبادی کی اکثریت عیسائی تھی۔ ویسے بھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاف فرما دیں، اس کے خلاف کسی بدزبانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ حضرت معاویہ اور ان کے بڑے بھائی یزید رضی اللہ عنہما، عہد نبوی کی جنگوں یعنی بدر، احد اور خندق وغیرہ کے زمانے میں ابھی بچے تھے اور ان کا کسی جنگ میں کسی کردار کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہ تذکرہ ضرور ملتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ مدینہ منورہ منتقل ہو گئے تاکہ آپ کی تربیت اسلامی ماحول میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا کاتب مقرر فرمایا اور آپ قرآن مجید کی وحی کی کتابت بھی کرتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو شمالی عرب میں "تیماء" کا گورنر مقرر فرمایا جو کہ ایک سرحدی شہر تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قیصر روم سے جو جنگیں ہوئیں، ان میں یزید ایک بڑی فوج کے کمانڈر تھے اور معاویہ ان کے تحت افسر تھے۔ فتح کے بعد حضرت ابو بکر نے شام کا گورنر یزید کو مقرر کیا اور معاویہ ان کے نائب تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یزید نے وفات پائی تو ان کی جگہ معاویہ کو شام کا گورنر مقرر کیا گیا۔ شام وہ سرحدی علاقہ تھا جو مسلمانوں نے قیصر روم کی افواج سے حاصل کیا تھا۔ قیصر اس علاقے کو واپس لینا چاہتا تھا اور اس پر لشکر کشی کے منصوبے بناتا تھا۔ حضرت معاویہ نے اپنی بے مثال شجاعت اور حکمت سے قیصر کے منصوبوں کو ناکام بنایا اور اس کے متعدد علاقوں میں مزید فتوحات حاصل کر کے موجودہ ترکی کا بھی

چالیس فیصد علاقہ فتح کر لیا۔ اس طرح قیصر کی حکومت اب موجودہ ترکی کے ساٹھ فیصد علاقے تک محدود رہ گئی۔

حضرت عمر اپنے کسی گورنر سے کم ہی مطمئن ہوتے تھے اور اکثر ان کا تبادلہ کیے رکھتے تھے لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا کہ حضرت عمر اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے انہیں نہ صرف ان کے عہدے پر برقرار رکھا بلکہ ان کے زیر نگیں علاقوں میں بھی اضافہ کرتے چلے گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں شام کا صوبہ شمال مشرق میں دریائے فرات سے لے کر مغرب میں دریائے نیل تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ شام، لبنان، فلسطین اور اردن کے پورے پورے ممالک صوبہ شام کا حصہ تھے جبکہ عراق اور ترکی کے بعض حصے بھی اسی صوبے میں شامل تھے۔ شام ایک غیر معمولی صوبہ تھا کیونکہ اس کی سرحدیں بازنطینی ایمپائر کے ساتھ لگتی تھیں جس کا سربراہ قیصر روم تھا۔ قیصر کی کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے مقبوضات واپس لے لے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ شام پر کسی غیر معمولی صلاحیتوں والے گورنر کو مقرر کیا جاتا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو 20/642 میں یہاں کا گورنر مقرر کیا۔ شام میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی آباد تھے۔ یہاں کی عیسائی آبادی چونکہ ان کے اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھتی تھی اور رومن چرچ نے انہیں مرتد قرار دے رکھا تھا، اس وجہ سے ان کی حمایت مسلمانوں کے لیے تھی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام کی مسلم اور غیر مسلم آبادی کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ سبھی آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ سے بے پناہ محبت کرنے لگے۔ ملکی دولت عوام کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ ہوا کرتی تھی اور ہر شخص کو اس کا حق ملتا تھا۔ حضرت معاویہ نے حضرت عمر سے بارہا ایک مضبوط بحریہ (Navy) تیار کرنے کی اجازت طلب کی لیکن آپ نے بحری جنگ کے خطرات کے سبب یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمان نے اپنے دور میں اس شرط پر اس کی اجازت دی کہ کسی سپاہی کو بحریہ میں شمولیت پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بحیرہ روم کے ساحلوں پر جہاز رانی کی ایک بہت بڑی صنعت قائم کی جس سے بے شمار لوگوں کو روزگار ملا اور ملک خوشحال ہوا۔ مسلم نیوی نے بحیرہ روم پر قیصر روم کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ جلد ہی جزیرہ قبرص (Cyprus) فتح ہو گیا اور ایک مہم قیصر کے دار الحکومت قسطنطنیہ (Constantinople) کے لیے روانہ ہوئی۔ دوسری طرف موجودہ ترکی کے مشرقی علاقے میں جنگ بندی کی سی کیفیت تھی۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے مقرر کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقربا پروری کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ حضرت معاویہ کی ذمہ داریوں میں اس طرح اضافہ کیا کہ انہوں نے جو علاقے فتح کیے، وہ انہی کے تحت رہنے دیے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقے مرکزی دار الحکومت سے اتنے دور تھے کہ مرکز کے لیے انہیں کنٹرول کرنا مشکل تھا۔ اس کے برعکس دمشق سے ان علاقوں کو اچھی طرح کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب ان علاقوں میں ایسا حسن انتظام کیا کہ قیصر روم کو یہاں کوئی کامیابی بھی

حاصل نہ ہو سکی۔ حضرت عثمان کے زمانے میں باغی تحریک کو بصرہ، کوفہ اور مصر میں قدم جمانے کا موقع ملا لیکن شام میں اسے ذرہ برابر بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی جو کہ حضرت معاویہ کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بنو امیہ کے صرف ایک شخص کو مقرر کیا اور وہ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے اپنی فتوحات اور حسن انتظام سے ثابت کیا کہ ان کی تقرری ٹھیک میرٹ پر ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بقیہ چار گورنر ولید بن عقبہ، عبداللہ بن سعد، سعید بن عاص اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سول سروس میں داخل کر چکے تھے اور یہ حضرات اپنے کارناموں کے سبب پروموشن پا کر گورنر کے عہدوں پر پہنچے۔ گورنر بننے سے پہلے اور اس کے بعد انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ان کی پروموشن بھی ٹھیک میرٹ پر ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی باغیوں کے اعتراض کے جواب میں یہی بات کی تھی:

> "یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے نوجوانوں کو حاکم بنا دیا ہے۔ میں نے انہی افراد کو حاکم بنایا ہے **جو اہلیت رکھتے ہیں اور لوگ انہیں پسند کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ ان لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں جو ان گورنروں کی عمل داری میں رہتے ہیں اور ان کے شہروں کے باشندے ہیں۔** مجھ سے پہلے بھی کم عمر شخص کو حاکم بنایا گیا تھا۔ (یاد کیجیے جب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ (بن زید) کو افسر بنایا تھا تو اس وقت آپ پر اس سے زیادہ اعتراض کیا گیا تھا، جو مجھ پر اعتراض کیے جا رہے ہیں۔ کیا ایسا ہی ہے؟" لوگوں نے کہا: "جی ہاں۔ بے شک۔ یہ لوگ ایسے اعتراضات کرتے ہیں جنہیں وہ ثابت نہیں کر سکتے ہیں۔"[86]

ان پانچ افراد کے علاوہ بقیہ جتنے بھی گورنر تھے، ان کا کوئی تعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتے داروں سے نہیں تھا۔

کیا اکابر صحابہ کی بجائے طلقاء کو آگے بڑھایا گیا؟

ان پانچ افراد کے علاوہ بقیہ جتنے بھی گورنر تھے، ان کا کوئی تعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رشتے داروں سے نہیں تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے اکابر صحابہ کو معزول کر کے ان کی جگہ "طلقاء" کو دی۔ طلقاء وہ لوگ تھے جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے۔ یہ لفظ ان حضرات کے لیے ایک اعزاز کا باعث تھا جسے بعد میں لوگوں نے بطور طعنہ استعمال کیا۔ اعزاز اس وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ قبول فرمائی تھی اور انہیں معاف کر دیا تھا۔ اس کے بعد کسی شخص کو ان کے بارے میں زبان طعن دراز کرنے کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ تمام افراد کو طلقاء نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہ فتح مکہ کے موقع پر ابھی بچے تھے۔ ان کے والدین اور دیگر اعزا نے جب اسلام قبول کیا تو اس کے بعد ان کی پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی اور وہ سچے اور پکے مسلمان بنے۔ بعد میں انہوں نے

---

[86] طبری۔ 35H/3/1/397-398

اپنے طرز عمل سے خود کو سچا مسلمان ثابت کیا۔ مناسب ہو گا کہ ایک ایک کر کے ان کے والدین کا بھی جائزہ لیا جائے۔

- ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے والد عقبہ طلقاء میں شامل تھے اور فتح مکہ کے موقع پر انہیں امان دی گئی تھی۔ ولید فتح مکہ کے موقع پر ابھی بچے تھے۔
- سعید بن عاص بن سعید بن عاص بن امیہ کا باپ عاص بن سعید جنگ بدر میں مارا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ سعید بن عاص اپنے دادا کے اور ان کے والد، اپنے دادا کے ہم نام تھے۔ ان کی پرورش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی جو یتیموں کی پرورش کا خاص شوق رکھتے تھے۔ سعید کے دو چچا خالد بن سعید اور عمرو بن سعید رضی اللہ عنہما سابقون الاولون صحابہ میں شامل تھے۔
- عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کا تعلق بنو امیہ سے نہیں تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ بچے تھے۔
- عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو امیہ سے نہیں بلکہ بنو عامر بن لوئی سے تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا۔ ہاں یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رضاعی بھائی ضرور تھے۔
- مروان بن حکم بن ابی العاص کے والد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلاوطن کر دیا تاہم اس کے بعد یہ ایمان لائے اور انہیں معاف فرما دیا۔ مروان کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ صحابی ہیں یا تابعی۔ اگر صحابی بھی ہیں تو بھی یہ فتح مکہ کے موقع پر ابھی بچے تھے۔
- معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے والد فتح مکہ کے دن اسلام لائے اور اس کے بعد مخلص مسلمان ثابت ہوئے۔ حضرت معاویہ اس وقت نوجوان تھے اور مسلمانوں کے خلاف کبھی کسی جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے۔ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ حضرت معاویہ نے صلح حدیبیہ کے وقت اسلام قبول کر لیا تھا تاہم اس کا اظہار فتح مکہ کے موقع پر کیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے عبداللہ بن سعد کے، کسی اور شخص کو طلقاء میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب مخلص مسلمان تھے جن کی پرورش اکابر صحابہ کے ہاتھوں ہوئی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکابر صحابہ کی بجائے ان نوجوانوں کو گورنر کیوں مقرر کیا گیا تھا۔ اگر ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور 23-35/643-655 کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اکابر صحابہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو صحابی، عہد نبوی میں چالیس برس کا ہو گا، وہ اس زمانے میں لازماً 65-60 برس کا ہو چکا ہو گا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ نوجوان نسل کو آگے لایا جائے تاکہ تیزی سے پھیلتی ہوئی سرحدوں کا موثر اور مضبوط انتظام کیا جائے۔ اکابر صحابہ نے اپنا تجربہ اس نسل تک منتقل کیا اور پھر اس نسل نے ذمہ داریاں سنبھال لیں اور بزرگ صحابہ نے پلاننگ جیسے کام اپنے ذمہ لے لیے۔

ایسا نہیں تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی مرضی سے گورنر مقرر فرما دیتے تھے اور عوام کی رائے کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا تھا۔ آپ کے تمام مقرر کردہ گورنر لوگوں کی رائے کے مطابق ہی مقرر کیے جاتے اور اگر کسی شہر کے لوگ اپنے گورنر کو پسند نہ کرتے تو اسے تبدیل کر دیا جاتا۔ امام بخاری، اپنی کتاب "تاریخ الصغیر" میں روایت کرتے ہیں:

حدثني محمد بن أبي بكر المقدمي ثنا حصين بن نمير ثنا جبير حدثني جهيم الفهري: جہیم الفہری کہتے ہیں کہ اس معاملے کا میں گواہ ہوں۔ عثمان نے کہا: "ہر اس شہر کے لوگ کھڑے ہو جائیں جو اپنے گورنر کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں اسے معزول کر دوں گا اور اس شخص کو گورنر مقرر کروں گا جسے وہ پسند کریں گے۔" اہل بصرہ نے کہا: "ہم عبداللہ بن عامر سے خوش ہیں۔" انہوں نے انہیں مقرر کیے رکھا۔ اہل کوفہ نے کہا: "سعید بن عاص کو ہٹا کر ابو موسی (اشعری) کو مقرر کر دیجیے۔" انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اہل شام نے کہا: "ہم معاویہ سے خوش ہیں۔" انہوں نے انہیں برقرار رکھا۔ اہل مصر نے کہا: "ابن ابی سرح کو ہٹا کر عمرو بن عاص کو مقرر کیجیے۔" حضرت عثمان نے ایسا ہی کیا۔[87]

یہ غالباً اس زمانے کا واقعہ ہے جب باغی تحریک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ اس تبادلے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے چارج لینے سے پہلے ہی حضرت عثمان شہید ہو گئے تھے۔

بیت المال میں کرپشن کی تہمت

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر باغیوں نے یہ الزام عائد کیا کہ آپ نے سرکاری اموال کی تقسیم میں اقرباء پروری سے کام لیا اور اپنے رشتہ داروں کو دولت دی۔ یہی الزام بعض تاریخی روایات میں بھی نقل ہو گیا ہے۔ اس بات میں تو شبہ نہیں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر باغیوں نے یہ الزام لگایا لیکن اس کی حقیقت کیا ہے، اس پر بھی ہم یہاں گفتگو کریں گے۔

حضرت عثمان نے اس الزام کا جواب کیا دیا؟

یہ الزام سراسر جھوٹ تھا اور اس کا جواب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود دیا۔

حدثني عبد الله بن أحمد بن شبوبه، قال: حدثني أبي، قال: حدثني عبد الله، عن إسحاق بن يحيى، عن موسى بن طلحة: (حضرت عثمان نے اہل مدینہ کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا:) ان لوگوں (باغیوں) نے ایسی باتیں کی ہیں جنہیں وہ بھی اسی طرح جانتے ہیں جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں۔ مگر وہ اس وجہ سے ان کا تذکرہ کر رہے ہیں تاکہ ناواقف لوگوں کے سامنے پراپیگنڈا کر سکیں۔۔۔۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی سرح کو مال غنیمت میں سے خاص عطیہ دیا۔ میں نے انہیں مال غنیمت کے خمس کا خمس (1/25) حصہ انعام کے طور پر دیا تھا جو کہ ایک لاکھ کی رقم تھی۔ ایسے احکام ابو بکر اور عمر نے بھی جاری کیے تھے۔ جب فوج نے اس بات کو ناپسند کیا تو میں نے یہ رقم

[87] بخاری۔ التاریخ الصغیر۔ روایت نمبر 334۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔

واپس لے کر انہی میں تقسیم کر دی تھی حالانکہ یہ ابن ابی سرح کا حق نہیں تھا؟ کیا یہی بات ہے؟" لوگوں نے کہا: "جی ہاں۔"

یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے گھر والوں سے محبت کرتا ہوں اور انہیں مال دیتا ہوں۔ جہاں تک گھر والوں کی محبت کا تعلق ہے تو ان کی وجہ سے میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا بلکہ **صرف ان کے حقوق ادا کیے ہیں اور صرف اپنے مال ہی سے انہیں عطیات دیے ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک مسلمانوں کا مال اپنی ذات یا کسی اور کو دینے کے لیے حلال نہیں ہے۔** میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابو بکر و عمر کے زمانے میں اپنی ذاتی ملکیت میں سے بہت زیادہ خیرات کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں کفایت شعار اور کنجوس تھا۔ اب جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری عمر فنا ہو رہی ہے اور یہ تمام سرمایہ میں گھر والوں کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس زمانے میں یہ ملحد ایسی باتیں بنا رہے ہیں۔ واللہ! میں نے کسی شہر میں سے اضافی مال حاصل نہیں کیا جس کی وجہ سے لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میں یہ مال انہی کو لوٹا دیتا تھا اور میرے پاس صرف پانچواں حصہ ہی پہنچتا تھا اور اس میں سے بھی کوئی چیز میں نے اپنے لیے کبھی نہیں رکھی۔ مسلمان اس مال کو وہاں کے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے، میرا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ اللہ کے مال میں سے ایک پائی بھی ضائع نہیں کی گئی اور میں صرف اپنے ذاتی مال میں سے گزر اوقات کرتا ہوں۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو زمینیں دیں۔ ان زمینوں میں مہاجرین و انصار کے وہ لوگ شریک ہیں جنہوں نے انہیں فتح کیا۔ لہٰذا جو شخص ان فتوحات کے مقام پر رہتا ہے، وہ اس کا مالک ہے اور جو اپنے اہل و عیال کے پاس آ گئے، تو ان کے ساتھ وہ زمینیں منتقل نہیں ہوئیں۔ اس لیے میں نے اس قسم کی زمینوں کے بارے میں غور کیا تو اصل مالکوں کی اجازت اور مرضی سے عرب کی زمینوں کے ساتھ ان کا تبادلہ کیا گیا۔ اس طرح یہ زمینیں انہی لوگوں کے قبضہ میں ہیں، میرے قبضے میں نہیں۔

(راوی کہتے ہیں کہ) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا مال و متاع اور زمینیں بنو امیہ میں تقسیم کر دی تھیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اس میں عام حصہ دار بنایا تھا۔ اس تقسیم کا آغاز انہوں نے ابو العاص کی اولاد سے کیا تھا۔ چنانچہ (ابو العاص کے بیٹے) حکم کی اولاد میں سے ہر ایک کو دس دس ہزار دیے، اس طرح ان سب نے کل ایک لاکھ کی رقم حاصل کی۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو بھی اتنی ہی رقم دی تھی۔ اس کے علاوہ بنو عاص، بنو عیص اور بنو حرب میں اپنے مال کو تقسیم کر دیا تھا۔[88]

اس روایت سے واضح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سرکاری مال کی ایک پائی بھی اپنے کسی رشتے دار کو نہیں دی بلکہ ان کی کفالت ہمیشہ اپنے مال سے کی۔ انہوں نے تو بیت المال سے اپنی خدمات کے عوض تنخواہ بھی کبھی وصول نہیں کی۔ آپ کو صلہ رحمی کا شوق تھا، اس وجہ سے آپ اپنا ذاتی مال اپنے غریب رشتے داروں کو دیا کرتے تھے اور متعدد یتیموں اور بیواؤں کی کفالت کیا کرتے تھے۔ باغیوں نے اس بات کو پکڑ کر یہ پراپیگنڈا کیا کہ آپ سرکاری مال کو اپنے رشتے داروں پر لٹا رہے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے مذکورہ تقریر فرمائی اور اس میں اس اعتراض کا نہ صرف جواب دیا بلکہ اہل مدینہ سے اس کی تصدیق بھی کروائی۔ اگر حضرت عثمان، بیت

---

[88] طبری۔ 3/1-396

المال میں سے اپنے رشتے داروں کو کچھ دیتے تو یہ بات اہل مدینہ سے ہرگز چھپی نہ رہتی کیونکہ بیت المال کی ذمہ داری حضرت زید بن ثابت اور عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہما کے سپرد تھی اور عطیات کی تقسیم کا کام رات کی تاریکی میں نہیں ہوتا تھا بلکہ مسجد نبوی میں یہ کام سب کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ پھر بیت المال سے کسی کو کوئی رقم دے دینا محض خلیفہ کی صوابدید پر نہ ہوتا تھا بلکہ یہ سب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہوتا تھا۔ ہر سال بیت المال کے اکاؤنٹس کی کلوزنگ ہوتی اور سارا حساب لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ اس وجہ سے اگر اس میں کوئی بدعنوانی ہوتی تو اہل مدینہ فوراً اعتراض کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال میں خرد برد کا یہ الزام سراسر جھوٹ تھا۔

بیت المال میں کرپشن سے متعلق روایات کی پوزیشن کیا ہے؟

اس موضوع پر ہم نے تاریخ کی تینوں قدیم ترین کتب میں ایسی روایتیں تلاش کی ہیں جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا گیا ہو اور ہمیں کل 16 روایتیں ایسی مل سکی ہیں جن میں یہ الزام موجود ہے۔ ان روایتوں کا تجزیہ اس جدول میں دیا گیا ہے:

تاریخ کی کتاب	بیت المال سے متعلق روایات	ناقابل اعتماد روایات کی تعداد	ناقابل اعتماد راویوں کے نام اور ان کی بیان کردہ روایات	بقیہ روایات
ابن سعد (168-230/784-845)	2	2	محمد بن عمر الواقدی: 2 روایتیں	-
بلاذری (d. 279/893)	13	13	واقدی: 9۔ ابو مخنف: 3۔ محمد بن حاتم بن میمون اور حجاج اعور: 1	-
طبری (224-310/838-922)	1	1	واقدی: 1	-
ٹوٹل	**16**	**16**	**16**	**-**

مناسب رہے گا کہ اگر آپ تنقید تاریخ کے اصولوں پر پہلے دو ابواب میں ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے اور پھر ان روایتوں پر غور کیجیے۔ آپ کے سامنے ایک عجیب بات آئے گی۔ بلاذری نے جو 13 روایتیں نقل کی ہیں، وہ تقریباً سب کی سب ابن سعد سے نقل کی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ابن سعد کی "الطبقات الکبری" میں ان میں سے صرف دو روایتیں ہی موجود ہیں، بقیہ روایتیں ابن سعد کی اپنی کتاب میں غائب ہیں لیکن بلاذری انہیں ابن سعد ہی کے حوالے سے لکھ رہے ہیں۔ مناسب رہے گا کہ یہاں ہم ان روایتوں کی سند اور روایت کا خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان روایات کا ماخذ کیا ہے۔ روایتوں کی سند میں خط کشیدہ ناموں کو غور سے دیکھیے:

1. حدثني محمد بن سعد عن <u>**الواقدي**</u>، عن عبد الله بن جعفر، عن أم بكر بنت المسور بن مخرمة، عن أبيها: حضرت عثمان نے کہا: ابو بکر اور عمر اس مال کے معاملے میں خود پر اور اپنے رشتے داروں پر سختی کرتے تھے جبکہ میرا خیال ہے کہ اس میں صلہ رحمی سے کام لینا چاہیے۔

2. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن عبد الله بن جعفر، حدثني محمد بن عبد الله عن الزهري: حضرت عثمان چھ سال تک محبوب ترین شخصیت رہے۔ پھر انہوں نے اپنے رشتے داروں کو عہدے دیے، مروان کو افریقہ کا خمس دیا اور اپنے رشتے داروں کو مال دیا اور اسے صلہ رحمی قرار دیا۔ انہوں نے انہیں بیت المال سے قرضے دیے، اس پر لوگوں نے ان پر تنقید کی۔

3. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن محمد بن عبد الله الزهري: حضرت عثمان گھوڑوں کی زکوۃ میں سے کچھ لے لیا کرتے تھے۔

4. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن أسامة بن زيد بن أسلم، عن نافع مولى الزبير، عن عبد الله بن الزبير: حضرت عثمان نے مروان بن حکم کو غنیمت کا پانچواں حصہ دیا۔

5. حدثني **عباس بن هشام الكلبي**، عن **أبيه**، عن **لوط بن يحيي أبي مخنف** عمن حدثه: ابو مخنف نے کسی شخص سے یہ روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح، حضرت عثمان کے رضاعی بھائی اور مغرب کے گورنر تھے۔ انہوں نے 27 ہجری میں افریقہ میں جہاد کیا اور مروان بن حکم ان کے ساتھ تھے۔ مروان نے ایک لاکھ یا دو لاکھ دینار میں غنیمت کا پانچواں حصہ خرید لیا۔ انہوں نے حضرت عثمان سے بات کی تو انہوں نے یہ انہیں تحفے میں دے دیا۔ اس پر لوگوں نے آپ پر تنقید کی۔

6. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن عبد الله بن جعفر، عن أم بكر بنت المسور بن مخرمة: مروان نے مدینہ میں گھر بنایا اور لوگوں کی دعوت کی اور کہا: "واللہ اس گھر کی تعمیر میں میں نے مسلمانوں کے مال میں سے ایک درہم بھی خرچ نہیں کیا۔" اس پر مسور نے کہا: اگر آپ کھانا کھائیں اور چپ رہیں تو یہ آپ کے لیے بہتر ہو گا۔ آپ نے ہمارے ساتھ افریقہ میں جہاد کیا اور آپ کے پاس مال، لونڈی غلام اور ساتھی سب سے کم تھے۔ پھر ابن عفان نے آپ کو افریقہ کا خمس دیا اور آپ کو صدقات پر مقرر کیا تو آپ نے مسلمانوں کے مال سے لے لیا۔"

7. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن عبد الله بن جعفر، عن أم بكر بنت المسور بن مخرمة، عن أبيها: حضرت عثمان کے پاس اونٹوں کے صدقات آئے تو انہوں نے اسے حارث بن حکم بن ابی العاص کو تحفے میں دے دیا۔

8. حدثني **محمد بن حاتم بن ميمون**، حدثنا **الحجاج الأعور**، عن ابن جريج عن عطاء عن ابن عباس: حضرت عثمان نے حکم بن ابی العاص کو قضاعہ سے صدقات وصول کرنے بھیجا جو کہ تین لاکھ درہم کی رقم دی۔ جب وہ لے کر آئے تو حضرت عثمان نے یہ رقم انہی کو دے دی۔

9. قال **أبو مخنف والواقدي** في روايتهما: حضرت عثمان نے سعید بن عاص کو کو ایک لاکھ درہم دیے تو علی، زبیر، طلحہ،

سعد اور عبد الرحمن بن عوف نے ان پر تنقید کی۔

10. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن ابن أبي سبرة، عن **أشياخه**، قالوا: ابن ابی سبرہ نے اپنے استادوں سے روایت کی اور انہوں نے کہا: جب بارش ہوئی تو حضرت عثمان نے کچھ لوگوں کو صدقات وصول کرنے بھیجا۔ انہوں نے ذمہ داری ان لوگوں کو تفویض کی اور انہوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا۔ اس پر نہ تو آپ نے انہیں تبدیل کیا اور نہ ہی ان سے باز پرس کی۔ اس پر لوگوں کو آپ کے خلاف جرأت ہوئی اور انہوں نے ان عہدے داروں کے کام کو آپ سے منسوب کیا۔

11. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن زيد بن السائب، عن خالد مولى أبان بن عثمان: مروان نے تیس اونٹ مدینہ میں بیچے تو اعلان کروایا کہ امیر المومنین انہیں خریدنا چاہتے ہیں جبکہ حضرت عثمان انہیں خریدنا نہیں چاہتے تھے۔

12. حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي**، عن عيسى بن عبد الرحمن، عن أبي إسحاق الهمداني: حضرت علی نے حضرت عثمان سے شکایت کی کہ آپ کو حضرت عمر نے کہا تھا کہ بنو امیہ اور بنو ابو معیط کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کیجیے گا۔

13. قال **أبو مخنف** في إسنادة: حضرت عثمان نے حضرت زید بن ثابت کو ایک لاکھ درہم دیے تو اسلم بن اوس، جس نے حضرت عثمان کو بقیع میں دفن ہونے سے روکا تھا، نے یہ اشعار پڑھے: "۔۔۔ انہوں نے مروان کو ظالمانہ طور پر خمس دیا۔"[89]

14. ذكر **محمد بن عمر (الواقدي)** أن عبد الله بن جعفر حدثه عن أم بكر بنت المسور بن مخرمة، عن أبيها: حضرت عثمان نے حکم بن ابی العاص کو صدقات کے اونٹ دیے۔ جب یہ بات حضرت عبد الرحمن بن عوف تک پہنچی تو انہوں نے یہ واپس لے کر لوگوں میں تقسیم کر دیے۔[90]

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ 14 میں سے 13 روایتیں یا تو محمد بن عمر الواقدی کی روایت کردہ ہیں یا پھر ابو مخنف کی۔ ان دونوں حضرات کے بارے میں ہم اس کتاب میں جگہ جگہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ کسی درجے میں قابل اعتماد راوی نہیں ہیں۔ روایت نمبر 8 میں البتہ سند میں نہ تو واقدی ہیں اور نہ ابو مخنف۔ اس کی سند میں محمد بن حاتم بن میمون (d. 235/850) ہیں جن کے قابل اعتماد ہونے کے بارے میں

[89] بلاذری۔ 6/138-149

[90] طبری۔ 3/1-418

اختلاف ہے۔ یحیی بن معین اور ابن المدینی نے انہیں کذاب قرار دیا ہے۔[91] دوسرے راوی حجاج الاعور ہیں جن کا پورا نام حجاج بن علی ہے۔ ان صاحب کے حالات نامعلوم ہیں البتہ یہ معلوم ہے کہ یہ ابو مخنف کے استاذ تھے۔[92]

ابن سعد کی طبقات میں ان میں سے صرف دو روایتیں نقل ہوئی ہیں اور دونوں کی دونوں واقدی سے مروی ہیں۔ طبری میں اس سلسلے میں صرف ایک ہی روایت ہے جو کہ واقدی سے مروی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی تمام روایات کا کُھرا (Trail) واقدی یا ابو مخنف ہی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔

کیا افریقہ کے خمس میں سے ابن ابی سرح اور مروان کو کچھ دیا گیا؟

اس ضمن میں دو روایتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ ایک تو وہی روایت جس کا ذکر اوپر ہوا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو افریقہ کے مال غنیمت کے خمس کا خمس عطا کیا تھا۔ دوسری روایت کے مطابق یہ خمس مروان بن حکم کو دے دیا تھا۔

ان روایات کی وضاحت سے پہلے مناسب یہ ہو گا کہ خمس کا قاعدہ بیان کر دیا جائے۔ قرآن مجید کا اس معاملے میں حکم یہ ہے:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِنْ كُنتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ.

اگر آپ اللہ پر ایمان رکھتے ہوں تو جان لیجیے کہ جو کوئی چیز آپ کو مال غنیمت میں ملے، اس کا پانچواں حصہ (1/5) اللہ، اس کے رسول، آپ کے رشتے داروں، یتیموں، مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔ (الانفال 8:41)

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت اور حکومت کی ذمہ داریوں سے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ آپ اپنے معاش کا انتظام کر لیں، اس وجہ سے یہ قانون بن گیا کہ جنگوں کے دوران مسلمانوں کو دشمن افواج سے جو مال غنیمت ملے، اس کا 4/5 فوج میں تقسیم کر دیا جائے اور اس کا خمس یعنی 1/5 مرکزی حکومت کو بھیجا جائے۔ اس خمس میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل و عیال، یتیموں، مساکین اور مسافروں پر خرچ فرماتے۔ آپ کے اہل و عیال کو بھی اس میں سے جو کچھ ملتا، وہ بھی اس کا بیشتر حصہ اپنی ضروریات کی بجائے انہی یتیموں اور مساکین پر خرچ کرتے۔ اس خمس کا خمس یعنی 1/25 حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی فنڈ قرار پایا جسے آپ اللہ تعالی کی ہدایت کے مطابق خرچ کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہی خمس مرکزی حکومت کو ملنے لگا جس کی حیثیت ایک Benevolent Fund کی ہو گئی۔ چونکہ اب قیصر و کسری کے خزانے فتح ہو رہے تھے، اس وجہ سے خمس کی مقدار بھی بہت زیادہ ہونے لگی اور اسے مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر

---

[91] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 7336۔ 6/94

[92] ایضاً۔ راوی 1475۔ 2/203

خرچ کیا جانے لگا۔ امام شافعی نے کتاب الام میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خمس کے خرچ کا طریقہ یہ طے فرمایا کہ اس خمس کا خمس یعنی 1/25 حصہ حکمران کا صوابدیدی فنڈ ہو گا۔[93] خمس کے بقیہ چار حصے یتیموں، مساکین اور دیگر کمزور طبقات پر خرچ ہونے لگے۔ اس طرح سے مال غنیمت میں دشمن افواج سے جو بھی اموال ملتے، ان کا 24/25 مسلمانوں پر تقسیم ہو جاتا اور 1/25 خلیفہ کے حصے میں آتا۔ اس رقم کو بھی خلفاء بالعموم امت کے مفاد میں خرچ کرتے تھے اور کبھی اس ضمن میں بعض کمانڈروں کو بطور incentive انعام دے دیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ incentive دیا تھا کہ اگر وہ لیبیا اور تیونس کے علاقے کو فتح کر لیں تو مال غنیمت کا 1/25 حصہ انہیں ملے گا۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ مہم سر کر لی جس میں بے پناہ مال غنیمت ملا۔ کمانڈر عبداللہ اس 1/25 کے حقدار ٹھہرے جو کہ ایک لاکھ درہم کے قریب بنتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ رقم دی تو ان کی فوج کو یہ بات پسند نہ آئی۔ فوج کے مورال کو بچانے کے لیے حضرت عثمان نے انہیں وہ رقم واپس کرنے کا حکم دیا اور پھر یہ رقم ان کی فوج پر تقسیم کر دی گئی۔[94] حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کسی تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا اور رقم واپس کرنے کے بعد بھی اسی طرح تن دہی سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس سے ان کے خلوص نیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے افریقہ کی فتوحات کا پورا خمس مروان بن حکم کو دے دیا تھا۔ یہ بھی محض ایک تہمت ہے۔ علامہ ابن خلدون (732-808/1332-1405) بیان کرتے ہیں:

> ابن زبیر نے فتح کی خوش خبری اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ مدینہ بھیجا جسے مروان نے پانچ لاکھ دینار میں خرید لیا۔ بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ حضرت عثمان نے مروان کو عطا کیا تھا، یہ بات درست نہیں ہے۔[95]

باغیوں کو پراپیگنڈا کے لیے بہانہ چاہیے تھا، انہوں نے مروان کی اس خریداری کو عطیہ بنا دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جھوٹے الزامات عائد کرنا شروع کر دیے۔ اگر انہیں اس کا موقع نہ بھی ملتا تب بھی انہوں نے کوئی اور اعتراض کر دینا تھا۔ اوپر بیان کردہ روایات میں آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ مروان کو افریقہ کا خمس دیے جانے کی روایت ابو مخنف ہی سے مروی ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کا صحابہ کرام سے بغض مشہور ہے اور یہ اسی باغی تحریک کی چوتھی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو آپ کے خلاف اٹھی تھی۔

---

[93] محمد بن ادریس الشافعی۔ کتاب الام۔ قسم الفئی والغنیمۃ، الوجه الثالث۔ نمبر 1843۔ ص 5/315۔ المنصورۃ: دار الوفا۔ www.waqfeya.com (ac. 6 Jan 2010)

[94] طبری۔ 3/1-396

[95] ابن خلدون۔ تاریخ۔ فتح افریقہ کا باب۔ 2/574۔ بیروت: دار الفکر 2000۔

کیا حضرت عثمان کا لائف اسٹائل شاہانہ تھا؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ وہ نرم اور عمدہ غذا کھاتے تھے جبکہ ان کے پیشرو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کھانا نہایت سادہ ہوتا تھا۔ اس کا جواب آپ نے کیا دیا:

> عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: قریش کے جو لوگ بوڑھے ہو جاتے تھے، وہ نرم کھانا پسند کرتے تھے۔ ایک رات میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہایت عمدہ پکا ہوا کھانا کھایا۔ اس سے پہلے میں نے اس سے زیادہ عمدہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس میں بکری کے پیٹ کا گوشت بھی تھا اور اس کے علاوہ دودھ اور گھی بھی تھا۔ عثمان نے پوچھا: "آپ کے خیال میں یہ کھانا کیسا ہے؟" میں نے کہا: "یہ سب سے عمدہ کھانا ہے جو میں نے کھایا ہے۔" اس پر عثمان نے فرمایا: "اللہ تعالی عمر بن خطاب پر رحم کرے، کیا آپ نے ان کے ساتھ بھی اس قسم کا کھانا کھایا تھا؟" میں نے کہا: "ہاں! مگر جب میں اپنا لقمہ منہ کی طرف لے جاتا تھا تو وہ لقمہ میرے ہاتھ سے نکل پڑتا تھا۔ اس میں نہ تو گوشت تھا اور نہ دودھ۔ سالن میں البتہ کچھ گھی ہوتا تھا۔"
>
> عثمان نے فرمایا: "آپ سچ کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر نے اپنے جانشینوں کے کام کو مشکل کر دیا ہے۔ وہ اشیائے خورونوش میں سے معمولی چیز استعمال کرتے تھے۔ مگر میں جو کھانا کھاتا ہوں، وہ مسلمانوں کے مال کو خرچ کر کے نہیں کھاتا ہوں بلکہ اپنے ذاتی مال سے کھاتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں قریش میں سب سے زیادہ مالدار تھا اور تجارت میں سب سے زیادہ محنت کرتا تھا۔ میں ہمیشہ سے اچھا کھانا کھاتا رہا ہوں اور اب تو ایسی عمر کو پہنچ گیا ہوں کہ سب سے عمدہ کھانا مجھے مرغوب ہے۔ اس معاملے میں کسی کی حق تلفی نہیں کرتا ہوں۔[96]

اکابر صحابہ کا عدم اطمینان

باغی راویوں نے اپنی روایتوں میں کوشش کی ہے کہ ایسا تاثر پیش کیا جائے جس سے ظاہر ہو کہ اکابر صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں سے خوش نہ تھے۔ ایسا کر کے وہ اپنی بغاوت کو جسٹی فائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی متعدد روایات تاریخ کی اولین کتب میں بیان ہوئی ہیں۔ ہمیں ایسی 19 روایتیں مل سکی ہیں جن کا تجزیہ جدول میں پیش کیا جا رہا ہے۔

طبری میں ایسی روایات بھری ہوئی ہیں جن کے مطابق جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو اکابر صحابہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کیا۔ انہوں نے باغیوں کے الزامات کے جواب دیے اور حضرت عثمان کی سکیورٹی کے لیے اپنے جواں سال بیٹوں کی جان خطرے میں ڈالی۔ ان میں سب سے نمایاں حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم تھے۔ پھر جب آپ کو شہید کر دیا گیا تو انہی صحابہ نے قاتلین کے خلاف زبردست رد عمل ظاہر کیا۔ اگر اکابر صحابہ مطمئن نہ ہوتے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ایسا زبردست رد عمل ظاہر نہ کرتے۔ تمام اکابر صحابہ نہ صرف حضرت عثمان سے مطمئن تھے بلکہ ان کی پالیسی سازی میں خود بھی شریک تھے۔ یہاں ہم چند

[96] طبری۔ 3/1-459

صحابہ کے ارشادات کو نقل کر رہے ہیں جس سے ان کی رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ کی کتاب	ناراضی سے متعلق روایات	ناقابل اعتماد روایات کی تعداد	ناقابل اعتماد راویوں کے نام اور ان کی بیان کردہ روایات	بقیہ روایات
ابن سعد(168-230/784-845)	1	1	قتافہ عقیلی: 1	-
بلاذری (d. 279/893)	16	16	واقدی: 8۔ ابو مخنف: 4۔ ہشام کلبی: 1۔ بہز بن اسد: 2۔ نامعلوم: 1	-
طبری (224-310/838-922)	2	2	واقدی: 1۔ سیف بن عمر: 1	-
ٹوٹل	**19**	**19**	**19**	**-**

طبری نے مختلف جلیل القدر صحابہ کے الفاظ نقل کیے ہیں جو انہوں نے خلیفہ مظلوم کی شہادت کی اطلاع سننے پر کہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا:

"اللہ عثمان پر رحم کرے اور ہمیں خیر و عافیت عطا فرمائے۔" کچھ لوگوں نے عرض کیا: " اب یہ (باغی) لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔" اس پر آپ نے یہ آیت پڑھی: "یہ لوگ شیطان کی طرح ہیں کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر اختیار کر لو۔ پھر جب وہ کافر بن جاتا ہے تو شیطان کہتا ہے: میں تم سے بری الذمہ ہوں، میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔"[97]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ عثمان پر رحم کرے اور ان کا مددگار رہے۔" لوگوں نے بتایا: "یہ لوگ اب پریشان ہو رہے ہیں۔" فرمایا: "انہوں نے سازش کی اور جو وہ چاہتے تھے، وہ پورا نہیں ہو سکا۔ ان کے لیے ہلاکت ہے۔" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔ "وہ نہ وصیت کر سکتے ہیں اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔"[98]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا:

یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں اکارت گئیں۔ حالانکہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔" پھر فرمایا: "اے اللہ! انہیں اپنے کاموں میں پریشان کر کے رکھ دے اور پھر انہیں اپنی گرفت میں لے لے۔"[99]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

---

[97] ایضاً۔ 3/1-448

[98] ایضا

[99] ایضا

لوگ عثمان پر تہمتیں لگاتے تھے اور ان کے گورنروں کو مجرم قرار دیتے تھے۔ یہ لوگ مدینہ ہمارے پاس آتے اور عمال کے حالات بیان کر کے ہم سے مشورہ طلب کرتے۔ ان کی ظاہری گفتگو سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اصلاح کے طلب گار اور نیک لوگ ہیں۔ لیکن جب ہم حالات کی چھان بین کرتے تو ہمیں عثمان نہایت متقی اور ان الزامات سے بری نظر آتے۔ وہ لوگ، جو ان کی شکایات کرتے تھے، وہ تقوی کے بھیس میں فاجر اور کذاب نظر آتے۔ ان کا ظاہر کچھ ہوتا اور باطن کچھ اور۔ ان لوگوں نے جب اس دھوکہ اور فریب سے قوت مہیا کر لی تو مدینہ پہنچ کر عثمان کو ان کے گھر میں محصور کر لیا اور انہیں شہید کر کے ایک حرام خون کو حلال کر لیا۔ پھر انہوں نے اس مال کو لوٹا جس کا لینا حرام تھا اور بغیر کسی جواز کے مدینۃ الرسول کی بے حرمتی کی۔ وہ جس چیز کے طلب گار ہیں، وہ آپ لوگوں کے لیے مناسب نہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ قاتلین عثمان سے قصاص لیجیے اور اللہ عزوجل کے حکم کو قائم کیجیے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: أَلَمْ تَرَى إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيباً مِنْ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ "کیا آپ ان لوگوں کو، جنہیں کتاب دی گئی تھی، نہیں دیکھتے کہ جب انہیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ کتاب اللہ کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جائے تو ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر کر اور اعراض کر کے چل دیتا ہے۔" (آل عمران 3:23) [100]

اب ہم ان چند روایات کو پیش کر رہے ہیں جن سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکابر صحابہ، حضرت عثمان کی پالیسیوں سے مطمئن نہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم ان روایتوں کا روایت اور درایت کے اصولوں (Source and Internal Criticism) کے تحت جائزہ لیں گے۔

کیا حضرت عمر کو اپنے بعد کوئی خدشہ تھا؟

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خدشہ تھا کہ آپ کے بعد قبائلی عصبیتیں نہ اٹھ کھڑی ہوں۔ اس وجہ سے آپ خاص کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں محتاط تھے۔ اس ضمن میں وہ ایک من گھڑت روایت پیش کرتے ہیں جسے بلاذری نے نقل کیا ہے اور وہیں سے یہ آگے پھیلی ہے۔ اس کے بعد ابن عبد البر نے "الاستیعاب" میں اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں کسی راوی نے خاصا مرچ مصالحہ لگا دیا ہے۔ ابن عبد البر کی روایت کچھ یوں ہے:

حدثنا **عبد الوارث بن سفيان** قراءة مني عليه من كتابي وهو ينظر في كتابه قال، حدثنا أبو محمد قاسم بن أصبغ، حدثنا أبو عبيد بن عبد الواحد البزار، حدثنا **محمد بن أحمد بن ايوب**، قال قاسم وحدثنا محمد بن إسماعيل بن سالم الصائغ حدثنا **سليمان بن داود** قالا حدثنا إبراهيم بن سعد حدثنا محمد بن إسحاق عن الزهري عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، آپ کہتے ہیں: میں ایک حضرت عمر کے ساتھ چلا جا رہا تھا کہ آپ نے ایک گہری سانس لی اور مجھے ایسا لگا کہ کہیں آپ کی پسلیاں نہ چٹخ گئی ہوں۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ! امیر المومنین! بخدا یہ تو کوئی بڑی بات ہے جس کے سبب آپ نے ایسی سانس

[100] ایضاً۔ 36H/3/2-68

بھری ہے۔" وہ بولے: "افسوس! ابن عباس! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کروں۔" میں نے عرض کی: "یہ کیا بات ہوئی؟ آپ کو اختیار حاصل ہے کہ کسی قابل اعتماد شخص کو اس (خلافت) کے لیے نامزد کر دیں۔" فرمایا: "آپ مجھے یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے صاحب یعنی علی رضی اللہ عنہ سب لوگوں سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔" میں نے کہا: "جی ہاں! میں یہ ان کی اسلام میں سبقت، ان کے علم، ان کی قرابت اور ان کی دامادی کے سبب کہتا ہوں۔" فرمایا: "ہاں، وہ ایسے ہی ہیں لیکن ان میں ظرافت بہت ہے۔"

میں نے عرض کیا: "عثمان کے بارے میں خیال ہے؟" فرمایا: "واللہ! اگر میں نے انہیں نامزد کر دیا تو وہ ابو معیط کی اولاد کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے کہ وہ ان کے معاملے میں اللہ کی نافرمانی کریں۔ واللہ! اگر میں نے ایسا کیا تو وہ یہی کام کریں گے۔ پھر لوگ ان پر پل پڑیں گے اور انہیں قتل کر دیں گے۔"

میں نے کہا: "طلحہ بن عبید اللہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" فرمایا: "ارے وہ خود پرست! اس (خلافت) کا مقام ان سے کہیں ارفع ہے، خدا نہ کرے کہ امت محمدی کے معاملات میں ان جیسے مغرور شخص کے سپرد کروں۔"

میں نے کہا: "زبیر بن عوام؟" کہنے لگے: "وہ تو لوگوں کو صاع (پیمانوں) سے ناپ ناپ کر دیں گے۔"

میں نے کہا: "سعد بن ابی وقاص کے بارے میں کیا خیال ہے؟" فرمایا: "وہ اس کام کے نہیں، وہ تو بس اس کام کے ہیں کہ سواروں کا دستہ لے کر جنگ کریں۔"

میں نے کہا: "اور عبد الرحمن بن عوف؟" فرمایا: "آدمی اچھے ہیں مگر یہ کام ان کے بس کا نہیں۔ واللہ! ابن عباس! اس کام (خلافت) کے لائق تو بس وہ ہے جو طاقتور ہو مگر تند خو نہ ہو۔ نرم رو ہو مگر کمزور نہ ہو۔ سخی ہو مگر اسراف نہ کرتا ہو۔ کنٹرول کرنا جانتا ہو مگر بخل کے بغیر۔" ابن عباس کہتے ہیں: "واللہ عمر ایسے ہی تھے۔"[101]

اس روایت کی سند اور متن دونوں ہی میں مسائل ہیں۔ روایت کا لفظ لفظ پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا گھڑنے والا سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے، شوری کے بقیہ تمام صحابہ سے شدید بغض رکھتا ہے۔ اس وجہ سے اس نے اپنے بغض کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے ادا کروانے کی کوشش کی ہے۔ حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے چونکہ باغی تحریک کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی، اس وجہ سے ان کے بارے میں خاص بغض اس روایت کے الفاظ میں ٹپک رہا ہے۔

متن کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ روایت، ان روایتوں کے بالکل مخالف تصویر پیش کرتی ہے جن کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شوری کو متعین کرتے ہوئے فرمایا تھا:

آپ کے سامنے وہ جماعت ہے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ ضرور جنت میں داخل ہوں گے۔ سعید بن زید بن عمرو بن نفیل بھی انہی میں سے ہیں مگر میں انہیں اس شوری میں شامل نہیں کروں گا۔ ان لوگوں میں سے علی اور عثمان تو بنو عبد مناف میں سے

---

[101] ابن عبد البر (368-463/979-1071)۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ 2/59، باب علی۔

ہیں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار ہیں۔) عبدالرحمن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں ہیں۔ زبیر بن عوام آپ کے حواری اور پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ اور انہی میں طلحۃ الخیر بن عبید اللہ بھی ہیں۔[102]

راوی نے اس روایت کو گھڑتے ہوئے حضرت عثمان کے بارے میں حضرت عمر کے جو الفاظ نقل کیے ہیں، ان سے خود اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ الفاظ یہ ہیں: " واللہ! اگر میں نے انہیں نامزد کر دیا تو وہ ابو معیط کی اولاد کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے کہ وہ ان کے معاملے میں اللہ کی نافرمانی کریں۔ واللہ! اگر میں نے ایسا کیا تو وہ یہی کام کریں گے۔ پھر لوگ ان پر پل پڑیں گے اور انہیں قتل کر دیں گے۔" اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے تو ابو معیط کی اولاد میں سے کسی کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ صرف ایک ولید بن عقبہ بن ابی معیط تھے جن کی تقرری خود حضرت عمر نے کی تھی، نہ کہ حضرت عثمان نے۔ ان کے علاوہ حضرت عثمان نے ابو معیط کے کسی بیٹے یا پوتے کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ رضی اللہ عنہم

اب ہم سند کو دیکھتے ہیں۔ ابن عبد البر (368-463/979-1071) نے اس کی یہ سند بیان کی ہے: حدثنا **عبد الوارث بن سفيان** قراءة مني عليه من كتابي وهو ينظر في كتابه قال، حدثنا أبو محمد قاسم بن أصبغ، حدثنا أبو عبيد بن عبد الواحد البزار، حدثنا محمد بن أحمد بن ايوب، قال قاسم وحدثنا محمد بن إسماعيل بن سالم الصائغ حدثنا **سليمان بن داود** قالا حدثنا إبراهيم بن سعد حدثنا **محمد بن إسحاق** عن الزهري عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس۔

1۔ عبدالوارث بن سفیان جن سے ابن عبد البر نے روایت کی ہے، کے حالات نامعلوم ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ وہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں۔

2۔ سلیمان بن داؤد نام کے بہت سے راوی ہیں جن میں سوائے ایک کے سبھی ضعیف ہیں۔ میزان الاعتدال میں اس نام کے آٹھ راویوں کا ذکر ملتا ہے جو کہ نمبر 3458-3451 پر درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلے سلیمان بن داؤد خولانی ہیں جو کہ ضعیف ہیں۔ دوسرے سلیمان بن داؤد الیمامی ہیں اور وہ بھی ضعیف اور متروک ہیں۔ تیسرے ابو داؤد سلیمان بن داؤد طیالسی (d. 204/819) ہیں جو کہ ثقہ ہیں لیکن بکثرت غلطیاں کرتے ہیں۔ چوتھے سلیمان بن داؤد المنقری الشاذ کونی (d. 234/848) ہیں جو کہ نہایت ہی ضعیف اور متروک الحدیث ہیں اور ان پر جھوٹ گھڑنے کا الزام بھی ہے۔ پانچویں سلیمان بن داؤد القرشی ہیں جن کے احوال کا علم نہیں ہے۔ چھٹے سلیمان بن داؤد الجزری ہیں جو کہ متروک ہیں۔ ساتویں سلیمان بن داؤد بن قیس المدنی ہیں جن کے ثقہ ہونے پر تنقید کی گئی ہے۔ آٹھویں سلیمان بن داؤد مولی یحیی بن معمر ہیں جن کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

اس میں سے سب سے زیادہ چانسز اس بات کے ہیں اس روایت کے اصل راوی الشاذ کونی ہیں جو کہ سخت ضعیف ہیں اور ان پر جھوٹ گھڑنے کا الزام ہے۔

---

[102] طبری۔ 3/1-254

3۔ روایت کی سند میں محمد بن احمد بن ایوب ہیں۔ اس نام کے کسی راوی کا ذکر رجال کے انسائیکلوپیڈیاز میں نہیں ملتا۔ میزان الاعتدال میں محمد بن احمد نام کے ساٹھ راویوں کا ذکر ملتا ہے جو کہ نمبر 7198-7139 تک ہیں مگر اس میں محمد بن احمد بن ایوب نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ان کے قابل اعتماد ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک اور صاحب احمد بن محمد بن ایوب ضرور ہیں جنہیں متروک اور کذاب قرار دیا گیا ہے۔ ان کا ذکر نمبر 535 پر موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کاتب نے احمد بن محمد بن ایوب کی جگہ محمد بن احمد بن ایوب لکھ دیا ہو۔

بلاذری نے اس کی سند یوں بیان کی ہے: حدثنا محمد بن سعد، حدثنا **الواقدي**، عن **محمد بن عبيد الله الزهري** عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة، عن ابن عباس: اس سند میں پہلے واقدی ہیں جن کا کذاب ہونا مشہور ہے۔ دوسرے راوی محمد بن عبید اللہ الزہری ہیں جنہیں ابو حاتم نے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ یحیی بن معین کہتے ہیں کہ ان کی حدیث کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور ابن عدی کا کہنا ہے کہ وہ کوفہ کی باغی پارٹی کے ممبر تھے۔[103] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی کوئی سند بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔

کیا حضرت علی، حضرت عثمان کی پالیسیوں سے مطمئن تھے؟

طبری نے ایسی چند روایتیں نقل کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی پالیسیوں سے مطمئن نہ تھے۔ جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں:

> قال **محمد بن عمر**: وحدثني **عبد الله بن محمد**، عن أبيه: "میں بار بار آپ کو مشورہ دیتا رہا ہوں اور ہر موقع پر ہماری گفتگو ہوتی رہی ہے۔ ہر موقع پر آپ مروان بن حکم، سعید بن عاص، ابن عامر اور معاویہ کے مشوروں پر عمل کرتے رہے اور میرے مشورے کی مخالفت کرتے رہے۔" عثمان نے فرمایا: "اب میں آپ کی ہر بات مانوں گا اور ان کی بات کو تسلیم نہیں کروں گا۔"۔۔۔ کیا آپ مروان سے مطمئن ہیں؟ وہ آپ کی عقل اور دین کو خراب کر کے چھوڑے گا۔ اس کے سامنے آپ ایک سواری کے اونٹ کی طرح ہیں، وہ جس طرف چاہتا ہے، آپ کو ہنکا دیتا ہے۔ بخدا! مروان عقل مند اور دیندار نہیں ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ آپ کو ہلاکت کی طرف لے جائے گا۔ جہاں سے آپ نکل نہیں سکیں گے۔ اب میں اس کے بعد آپ کو مشورہ دینے کے لیے کبھی نہیں آؤں گا کیونکہ آپ مغلوب اور لاچار ہو گئے ہیں۔[104]

یہ باتیں جن روایتوں میں نقل ہوئی ہیں، وہ سب کی سب محمد بن عمر الواقدی کی روایت کردہ ہیں اور واقدی کی کی کذب بیانی اور جھوٹ پر محدثین کی آراء ہم نقل کر چکے ہیں۔ واقدی کا معاملہ یہ تھا کہ یہ صاحب ہر طرح کی رطب و یابس روایات اکٹھی کر کے ان سے ایک کہانی بناتے اور بیان کر دیتے تھے۔ عین ممکن ہے کہ باغی راویوں کی روایتوں کو بھی واقدی نے اسی طرح سے درج کر دیا ہو۔ واقدی اس روایت کو عبد اللہ بن محمد سے روایت کر رہے ہیں۔ غالب گمان یہی ہے کہ یہ عبد اللہ، حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں اور انہیں

---

[103] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 7910۔ 6/246

[104] طبری۔ 3/1-409, 414

ماہرین جرح و تعدیل جیسے ابن المدینی، ابو حاتم اور ابن خزیمہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ ان کا حافظہ کمزور تھا۔[105]

درایت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو حضرت علی، اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے مطمئن نہ ہوتے تو ان کی حفاظت کے لیے اس درجے میں بے چین کیسے ہوتے کہ اپنے جوان سال بیٹوں کو انتہائی خطرے کی حالت میں خلیفہ کی حفاظت پر مامور کرتے۔

کیا حضرت طلحہ، حضرت عثمان کی پالیسیوں سے مطمئن تھے؟

بعض تاریخی روایتوں میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت نہیں کی بلکہ درپردہ باغیوں کی مدد کی۔ ہمارے نزدیک یہ باتیں اس ڈس انفارمیشن کا حصہ ہیں جو باغی تحریک نے پھیلائیں اور حضرت علی اور طلحہ رضی اللہ عنہما پر الزامات عائد کیے۔ جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ باغی چاہتے تھے کہ جب وہ حضرت عثمان کو شہید کریں تو اس کا الزام حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم پر آ جائے۔ اس طرح مقصد باغیوں کا پورا ہو اور بدنامی ان حضرات کے حصے میں آئے۔

اس الزام کی تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ حضرت طلحہ نے حضرت عثمان کی حفاظت پر اپنے جوان سال بیٹے محمد بن طلحہ کو مامور کیا جو اپنے ساتھی حسن، حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے ساتھ خلیفہ کے گھر کا پہرہ دیتے رہے۔ شہادت عثمان کے بعد اس باغی تحریک کے خلاف حضرت طلحہ نے زبردست تحریک پیدا کی اور جنگ جمل میں انہی باغیوں کے خلاف لڑتے ہوئے انہوں نے اپنی اور اپنے بیٹے کی جان کا نذرانہ پیش کیا اور اپنی شہادت سے پہلے یہ تاریخی الفاظ کہے: "اے اللہ! میری جان کا بدلہ عثمان کو دے دیجیے تاکہ وہ خوش ہو جائیں۔"[106] حضرت طلحہ کے بیٹے محمد بن طلحہ بھی اسی جنگ میں اپنے والد کے ساتھ شہید ہوئے۔ جو شخص حضرت عثمان کے لیے اپنی اور اپنی اولاد کی جان پیش کر دے، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ معاذ اللہ باغیوں کے مددگار تھے، ایک نہایت ہی لایعنی بات ہے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کتب تاریخ میں جو روایات آئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ سب سے مشہور روایت وہ ہے جو بلاذری نے حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے نقل کی ہے اور اسی کو دیگر مورخین نے بھی درج کیا ہے۔ یہ ایک طویل روایت ہے جس میں انہوں نے نہایت تفصیل سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی تفصیلات بیان کی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اکابر صحابہ، جن میں حضرت علی، طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم شامل ہیں، کی ان غیر معمولی کاوشوں کا ذکر ہے جو انہوں نے خلیفہ کے دفاع میں کیں۔ اس روایت میں بعض جملے ایسے ہیں جن سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلط تاثر

[105] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی 4541۔ 4/175

[106] طبری۔ 3/2-146

دیا گیا ہے کہ وہ حضرت عثمان کے خلاف تھے اور انہوں نے اپنے بیٹے کو بھی مجبوراً ہی آپ کی حفاظت پر مامور کیا تھا۔ اس روایت کی سند کو دیکھیے تو وہ یہ ہے: هشام بن عمار الدمشقي، **محمد بن عيسى بن سميع**، محمد بن أبي ذئب، الزهري، سعيد بن المسيب۔[107] اس روایت کے بارے میں مشہور محدث ابن عدی کا تبصرہ ہم یہاں درج کر رہے ہیں:

ابن عدی کہتے ہیں: (محمد بن عیسی بن سمیع) سے روایت کرنے میں حرج نہیں ہے البتہ حضرت عثمان کی شہادت کی روایت میں ان پر تنقید کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ روایت دراصل اسماعیل بن یحیی بن عبید اللہ سے لی ہے جو کہ ضعیف راویوں میں سے ایک ہیں اور اسے ابن ابی ذئب کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے تدلیس (کمزور راوی کا نام چھپانا اور یہ امپریشن دینا کہ روایت قابل اعتماد ہے) سے کام لیتے ہوئے اسماعیل کو حذف کر کے اسے ابن ابی ذئب سے منسوب کر دیا ہے۔

صالح جزرہ کہتے ہیں: ہشام بن عمار نے ابن سمیع اور ابن ابی ذئب کے توسط سے حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ بیان کیا۔ میں نے ہر طریقے سے یہ کوشش کر لی کہ وہ "حدثنا ابن ابی ذئب" کا لفظ استعمال کریں لیکن انہوں نے انکار کیا اور محض "عن" کا لفظ ہی کہتے رہے۔ [لفظ 'عن' ایک ذو معنی لفظ ہے جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک راوی نے اپنے استاذ سے روایت بذات خود حاصل کی ہے یا کسی کے توسط سے اس تک یہ پہنچی ہے۔ اس کے برعکس لفظ 'حدثنا' ایک متعین لفظ ہے جو صرف اسی صورت میں بولا جاتا ہے جب راوی اپنے استاذ سے براہ راست اس حدیث کو سنے۔]

صالح بن محمد کہتے ہیں: مجھے محمد بن عیسی کے نواسے محمود نے بتایا کہ میرے نانا کی کتاب میں یہ روایت اسماعیل بن یحیی کی وساطت سے ابن ابی ذئب سے مروی ہے۔ صالح کہتے ہیں کہ اسماعیل روایتیں گھڑتے تھے۔ جب یہ بات میں نے محمد بن یحیی الذہلی کو بتائی تو وہ بولے: "اللہ ہی ہے جو مدد فرمائے۔"[108]

واضح رہے کہ اسماعیل بن یحیی بن عبید اللہ کے بارے میں تمام ماہرین جرح و تعدیل متفق ہیں کہ یہ صاحب جھوٹے ترین راویوں میں سے ایک تھے۔[109] اس روایت میں انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ دفاع عثمان میں حضرت طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم کے کردار کو کم سے کم سطح پر پیش کیا جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کردار کو نمایاں کیا جائے۔

2۔ بلاذری نے دوسری روایت ابو مخنف کے حوالے سے بیان کی ہے جس کے مطابق معاذ اللہ حضرت طلحہ نے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا پانی بند کر دیا تھا۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ بہت غضب ناک ہوئے اور انہوں نے خود پانی پہنچوایا۔[110] ایک اور روایت میں

[107] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 6/186
[108] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 8039۔ 6/289
[109] ایضاً۔ راوی نمبر 967۔ 1/415
[110] بلاذری۔ 6/188

حضرت طلحہ کی حضرت عثمان سے معذرت نقل کی گئی ہے اور جواب میں حضرت عثمان کی شکایت نقل کی گئی ہے کہ جناب آپ نے میرے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکائی اور اب خود ہی اس پر معذرت کر رہے ہیں۔[111] ان دونوں روایتوں کی جو سند بلاذری نے بیان کی ہے وہ یہ ہے: وقال أبو مخنف وغيره۔ ہمارے خیال میں اس سند پر تبصرے کی ضرورت نہیں ہے کہ ابومخنف کا صحابہ کرام سے بغض معروف ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ جب حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے قاتلین عثمان سے قصاص کی تحریک چلائی تو ان لوگوں نے خاص طور پر آپ کو بدنام کرنے کی کوشش کی کہ ان حضرت نے خود ہی بغاوت برپا کی اور اب خود ہی قصاص کے دعوے دار بن گئے ہیں۔

3۔ تیسری روایت ایک طویل قصہ ہے جو ابن شہاب الزہری (741-677/124-58) سے مروی ہے۔ اس میں شہادت عثمان کا پورا قصہ تفصیل سے بیان ہوا ہے اور اس میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پانی بند کر دینے کا ذکر ہے۔ اس روایت کی سند بلاذری نے یوں بیان کی ہے: حدثني أحمد بن إبراهيم الدورقي، حدثنا وهب بن جرير بن حازم، حدثنا أبي، عن **يونس بن يزيد الأيلي**، عن الزهري۔ یہ سند منقطع ہے کیونکہ زہری 58/677 میں اس وقت پیدا ہوئے جب شہادت عثمان کو 23 برس گزر چکے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے یہ روایت کس سے حاصل کی ہے اور وہ شخص کس درجے میں قابل اعتماد تھا۔ زہری سے اس روایت کو یونس بن یزید الایلی نے روایت کیا ہے جن کا حافظہ کمزور تھا اور انہیں احمد بن حنبل نے ضعیف قرار دیا ہے۔[112] زہری سے جتنی منفی روایات مروی ہیں، وہ تقریباً سب کی سب ایلی ہی نے روایت کی ہیں۔

4۔ چوتھی روایت طبری نے واقدی کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اس کے مطابق حضرت طلحہ نے معاذ اللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو محصور کرنے کا حکم جاری کیا اور اس پر حضرت عثمان نے ان کے خلاف بد دعا کی۔ روایت کی سند یہ ہے: قال **محمد (بن عمر الواقدي)**: وحدثني **إبراهيم بن سالم**، عن أبيه، عن بسر بن سعيد، قال: وحدثني عبد الله بن عياش بن أبي ربيعة۔ سند کو دیکھنے پر اس روایت کا جھوٹ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے مرکزی راوی واقدی ہیں۔ انہوں نے اس روایت کو ابراہیم بن سالم سے روایت کیا ہے جو کہ منکر (سخت ضعیف) روایتوں کے لیے مشہور ہیں۔[113]

غرض یہ کہ جتنی بھی تاریخی روایتوں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے باغیوں کا ساتھ دیا، ان سب کی سند میں کوئی نہ کوئی ایسے مشکوک راوی موجود ہیں جو جھوٹ نقل کرنے میں مشہور ہیں یا پھر ان راویوں کے نام نامعلوم ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں نے اکابر صحابہ کے خلاف ڈس انفارمیشن کی مہم چلائی تھی تاکہ خلیفہ کو شہید کرنے کا الزام ان پر آئے، یہ تاریخی روایتوں میں شامل ہو گئی۔ حضرت طلحہ، خلیفہ مظلوم کے خلاف کسی بھی اقدام سے بری تھے اور انہوں نے اپنی اور اپنے جواں سال بیٹے کی جان دے

---

[111] ایضاً۔ 6/196

[112] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 9932۔ 7/320

[113] ایضاً۔ راوی نمبر 95۔ 1/152

کر اس الزام کو اپنے خون سے دھو دیا اور انہی قاتلین عثمان کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

اگر روایتوں ہی پر اعتماد کرنا ضروری ہو تو ہم یہاں چند اور روایتیں پیش کر رہے ہیں جن میں حضرت عثمان اور حضرت طلحہ کے گہرے تعلقات نمایاں ہوتے ہیں:

وحدثني عمر، قال: حدثنا علي، عن إسحاق بن يحيى، عن موسى ابن طلحة: موسی بن طلحہ کا بیان ہے کہ حضرت طلحہ نے حضرت عثمان کے پچاس ہزار دینے تھے۔ ایک دن حضرت عثمان مسجد میں آئے تو حضرت طلحہ نے کہا: "آپ کا مال حاضر ہے، اسے لے لیجیے۔" انہوں نے جواب دیا: "ابو محمد! یہ تو آپ ہی کا مال ہے اور آپ کی مروت اور شرافت کا صلہ ہے۔[114]

وأما سيف، فإنه روى فيما كتب به إلي السري، عن شعيب، عنه، عن أبي حارثة وأبي عثمان ومحمد وطلحة: (شہادت عثمان کے بعد) جب آدھی رات ہوئی تو مروان، زید بن ثابت، طلحہ بن عبید اللہ، علی، حسن، کعب بن مالک اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے گھر پہنچے۔ جنازے کے مقام پر خواتین اور بچے بھی پہنچے۔ یہ سب حضرات، عثمان کے جنازے کو لائے اور مروان نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر وہاں سے وہ بقیع میں انہیں لے گئے اور دفن کر دیا۔[115]

کیا حضرت عبد الرحمن، حضرت عثمان کی پالیسیوں سے مطمئن تھے؟

باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جو پراپیگنڈا کیا، اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اکابر صحابہ حضرت عثمان کی پالیسیوں سے مطمئن نہ تھے۔ اس کے لیے انہوں نے ڈس انفارمیشن پھیلائی اور یہی باتیں روایتوں کا حصہ بن گئیں۔ اکابر محدثین نے تو ان روایتوں کا جھوٹ دیکھ کر ان سے اعتنا نہ کیا مگر محمد بن عمر الواقدی، جو خود بھی کذاب مشہور ہیں اور ہر طرح کی روایتیں بیان کرنے میں ید طولی رکھتے ہیں، نے انہیں اپنی کتابوں میں درج کر لیا اور انہی کی بدولت یہ بعد کی کتب تاریخ کا حصہ بن گئیں۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا تھا، کے بارے میں بلاذری نے بعض ایسی روایتیں نقل کی ہیں جن کے مطابق حضرت عبد الرحمن، حضرت عثمان سے اس وجہ سے سخت ناراض تھے کہ انہوں نے حضرت ابو ذر غفاری کو ربذہ بھیجا تھا۔ انہوں نے اپنے مرض الموت میں حضرت عثمان کا بھیجا ہوا پانی بھی نہیں پیا اور یہ قسم کھائی کہ وہ حضرت عثمان سے کبھی بات نہ کریں گے۔ بلاذری نے ایسی تین روایتیں نقل کی ہیں اور تینوں کا ماخذ یہی واقدی صاحب ہیں۔ اسناد یہ ہیں:

حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي** عن إبراهيم بن سعد عن أبيه.

---

[114] طبری۔۔35H/3/1-462

[115] طبری۔۔35H/3/1-474

حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي** عن محمد بن صالح عن عبيد بن رافع عن عثمان بن الشريد.

حدثني محمد بن سعد عن **الواقدي** عن محمد بن عبد الله عن أبيه عن عبد الله بن ثعلبة بن صعير.

حدثني مصعب بن عبد الله الزبيرى عن إبراهيم بن سعد عن أبيه.[116]

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ پہلی تین روایتوں کی سند میں واقدی صاحب موجود ہیں اور یہ انہی کا پھیلایا ہوا افسانہ ہے۔ چوتھی سند مشہور نساب مصعب زبیری کی ہے مگر اس میں صرف اتنی بات ہے کہ حضرت عبد الرحمن کی نماز جنازہ حضرت سعد یا حضرت زبیر رضی اللہ عنہم نے پڑھائی۔ اس کے علاوہ اور کوئی منفی بات اس روایت میں موجود نہیں ہے۔

عبد الرحمن کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے ناراضی ایسی بات تھی جسے پورے مدینہ میں مشہور ہو جانا چاہیے تھا اور بہت سے لوگوں کو اسے بیان کرنا چاہیے تھا۔ دوسری صدی ہجری تک پہنچتے پہنچتے یہ روایت اتنی مشہور ہو جانی چاہیے تھی کہ ہر شخص کو معلوم ہوتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے واقدی کے اور کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بلاذری اس روایت کو محمد بن سعد کے توسط سے واقدی سے روایت کرتے ہیں اور ابن سعد کی اپنی کتاب "الطبقات الکبری" میں ان روایتوں کا سراغ نہیں ملتا ہے۔

اس کے برعکس ہمیں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ حضرت عثمان، جب حج کے لیے جایا کرتے تھے تو وہ اپنے پیچھے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما ہی کو قائم مقام خلیفہ بنا کر جاتے تھے۔[117] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان اور عبد الرحمن رضی اللہ عنہما میں بہترین تعلقات قائم تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے مابین کوئی چھوٹی موٹی بات ہو گئی ہو لیکن پراپیگنڈا کے ماہرین نے ایک کو دس بنا کر پیش کیا تاکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی مہم چلائی جائے۔

کیا حضرت عمار، باغی تحریک میں شامل تھے؟

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ایک جلیل القدر صحابی ہیں اور بالکل اوائل میں اسلام لائے۔ ان کے والدین یاسر اور سمیہ رضی اللہ عنہما، اسلام کے اولین شہداء میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عمار کی پوری زندگی دین اسلام کے لیے وقف رہی اور اس میں ایک بھی منفی بات نہیں ملتی ہے۔ آپ عہد صدیقی و فاروقی میں کوفہ کے گورنر رہے۔ بعض تاریخی روایات میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما پر یہ تہمت لگائی گئی ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والی باغی تحریک کا حصہ تھے۔ اس تہمت کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ باغیوں کو اپنی تحریک کے قد و کاٹھ میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ ایسی شخصیات درکار تھیں جن پر وہ فخر کر سکیں۔ انہیں حضرت عمار رضی اللہ عنہ اس سلسلے میں موزوں شخصیت نظر آئے اور انہوں نے ان سے متعلق روایات وضع کر کے پھیلا دیں۔

[116] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 6/171-172

[117] ابن عساکر۔ تاریخ دمشق۔ 39/208

ہم نے کوشش کی ہے کہ ان تمام روایات کو جمع کیا جائے جن میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ پر یہ الزام موجود ہو اور ان روایتوں کی سند کا جائزہ لیا جائے کہ ان میں کون سے راوی موجود ہیں۔ کتب تاریخ میں ایسی کل 10 روایتیں ہمیں مل سکی ہیں۔ ان کا تجزیہ یہ ہے:

تاریخ کی کتاب	کل روایات	ناقابل اعتماد روایات کی تعداد	ناقابل اعتماد راویوں کے نام اور ان کی بیان کردہ روایات	بقیہ روایات
ابن سعد (168-230/784-845)	1	1	قنافہ عقیلی: 1	-
بلاذری (d. 279/893)	4	4	ابو مخنف و کلبی: 1۔ بہز بن اسد: 1۔ یونس بن یزید الایلی: 1۔ نامعلوم: 1	-
طبری (224-310/838-922)	3	3	واقدی: 1۔ سیف بن عمر: 2	-
ابن عساکر (499-571/1106-1175)	2	2	محمد بن شعیب: 1۔ مجالد: 1	-
ٹوٹل	**10**	**10**	**10**	**-**

ان میں سے چار بلاذری نے نقل کی ہیں، تین طبری نے، ایک ابن سعد نے اور دو ابن عساکر نے۔ ان دس کی دس روایتوں کی سند میں ایسے راوی موجود ہیں جو کہ یا تو کذاب کے درجے میں آتے ہیں، یا سخت ضعیف اور کمزور راوی ہیں اور یا پھر ان کے حالات نامعلوم ہیں۔ یہاں ہم ان تمام اسناد کو پیش کر کے ان پر اپنا تبصرہ کر رہے ہیں:

1۔حدثنا **عباس بن هشام بن محمد** عن **أبي مخنف** في إسناده۔[118] اس روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے کچھ زیورات لے لیے۔ معاذ اللہ ان کی اس کرپشن پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا تو حضرت عثمان نے انہیں اتنی مار پڑوائی کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس روایت کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی سند میں عباس بن ہشام کلبی اور ابو مخنف موجود ہیں جن کا صحابہ سے بغض معروف ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں ایک لنک غائب ہے جو کہ یقیناً عباس کے والد ہشام کلبی ہوں گے۔

2۔حدثنا روح بن عبد المؤمن المقرئ، وأحمد بن إبراهيم الدورقي، حدثنا **بهز بن أسد**، حدثنا حصين بن نمير، عن **جهيم الفهري**۔[119] اس روایت میں بھی حضرت عمار رضی اللہ عنہ پر تشدد کا ذکر ہے۔ اس کے راویوں میں سب سے پہلی کڑی جہیم الفہری ہیں جن کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب تھے اور کس درجے میں قابل اعتماد تھے؟ آیا یہ بھی باغی تحریک کا حصہ تھے یا نہیں، ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ایک اور راوی بہز بن اسد ہیں جن کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تعصب

---

[118] بلاذری۔ 6/161

[119] ایضاً۔ 6/165

رکھتے تھے۔[120]

3۔قد روي أيضا۔[121] اس روایت میں بلاذری نے سند ہی نہیں دی ہے بلکہ "روایت کیا گیا ہے" کہہ دیا ہے۔ اس کے مطابق حضرت عثمان نے حضرت عمار رضی اللہ عنہما کو جلاوطن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب سند ہی نہ ہو تو بات بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔

4۔أحمد بن إبراهيم الدورقي، وهب بن جرير بن حازم، أبي، **يونس بن يزيد الأيلي**، **الزهري**۔[122] یہ وہی روایت ہے جو اوپر عباس کلبی اور ابو مخنف کے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔ اس کی سند میں یونس بن یزید الایلی ہیں جو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کے بارے میں ماہرین جرح و تعدیل میں اختلاف ہے کہ یہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں۔ ان کے بارے میں امام احمد بن حنبل کا کہنا یہ ہے کہ یہ زہری سے منکر (انتہائی عجیب و غریب) قسم کی روایتیں کرتے ہیں۔[123] پھر ایلی اس روایت کو ابن شہاب الزہری سے منسوب کرتے ہیں جو کہ اس واقعہ کے کم از کم 24 برس بعد 58/677 میں پیدا ہوئے۔ اگر زہری نے واقعی یہ روایت بیان کی ہے تو عین ممکن ہے کہ انہوں نے یہ روایت کسی ایسے شخص سے سنی ہو جو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں تعصب رکھتا ہو۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ زہری سے صحابہ کرام سے متعلق جتنی بھی منفی روایتیں مروی ہیں، وہ سب کی سب یونس الایلی کے توسط سے مروی ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے آپ باب 2 دیکھ سکتے ہیں۔

اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاذری نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی مخالفت سے متعلق جو چار روایات نقل کی ہیں، وہ سب کی سب ضعیف یا موضوع ہیں۔ اب ہم طبری کی روایتوں کی طرف آتے ہیں۔

5۔ رجع الحديث إلى حديث **سيف**، عن شيوخه ۔[124] اس روایت کے مطابق حضرت عمار اور عباس بن عتبہ بن ابی لہب کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوئی تھی جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو سزا دی تھی۔ اس وجہ سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ حضرت عمار کا جو کردار ہمارے سامنے ہے، اس کی روشنی میں یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک معمولی واقعے کی بنیاد پر وہ اس انتہا پر چلے گئے ہوں گے کہ انہوں نے باغی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ سند میں سیف بن عمر ہیں جو کسی طرح بھی قابل اعتماد نہیں۔

---

[120] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 1326

[121] بلاذری۔ 6/169

[122] ایضاً۔ 6/208

[123] ذہبی۔ راوی 9932۔ 7/320

[124] طبری۔ 3/1-394

6۔قال **محمد بن عمر**: وحدثني عبد الله بن محمد، عن أبيه۔[125] اس روایت کے مطابق جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عمار رضی اللہ عنہما کے پاس گئے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ چل کر ان باغیوں سے مذاکرات کریں اور انہیں واپس بھیج دیں۔ حضرت عمار نے اس سے صاف انکار کر دیا۔ یہ روایت، محمد بن عمر الواقدی کی روایت کردہ ہے جن کے ناقابل اعتماد ہونے پر ہم اس کتاب میں جگہ جگہ گفتگو کرتے آ رہے ہیں۔

7۔حدثني **عبد الله بن أحمد بن شبويه**، قال: حدثني أبي، قال: حدثني **عبد الله**، عن إسحاق بن يحيى، عن موسى بن طلحة۔[126] یہ بھی وہی روایت ہے جس میں عباس بن عتبہ کے ساتھ حضرت عمار کی تلخ کلامی کا ذکر ہے۔ اس روایت کی سند کو بھی دیکھیے تو اس کا آغاز ہی عبداللہ بن احمد بن شبویہ اور ان کے والد سے ہوتا ہے۔ ان دونوں حضرات کے حالات نامعلوم ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ یہ کس درجے میں قابل اعتماد ہیں۔ پھر یہ کسی عبداللہ سے روایت کرتے ہیں اور اس نام کے سینکڑوں راوی موجود ہیں اور اس بات کا تعین ممکن نہیں ہے کہ یہاں کون سے عبداللہ مراد ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ طبری میں بھی حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں، وہ سند کے اعتبار سے انتہائی کمزور ہیں۔ اب ہم ابن سعد کی واحد روایت پر تبصرہ کرتے ہیں۔

8۔أخبرنا سليمان بن حرب قال أخبرنا حماد بن زيد عن أيوب عن **قنافة العقيلي** عن مطرف۔[127] اس روایت کے مطابق مطرف بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ جب ہم لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دل و جان سے بیعت کی تھی تو آپ نے ان کی مخالفت کیوں کی؟ اس پر حضرت عمار خاموش رہے اور انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس روایت کی سند میں قنافہ العقیلی ہیں جن کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ صاحب بھی باغی تحریک کا حصہ رہے ہوں یا پھر ان کے پراپیگنڈے سے متاثر ہوئے ہوں۔ اس طرح سے ابن سعد کی یہ روایت بھی سخت ضعیف ہے۔

اب ہم ابن عساکر (499-571/1106-1175) کی بیان کردہ دو روایتوں کی طرف آتے ہیں۔ ابن عساکر کا زمانہ چونکہ ان واقعات کے 500 سال بعد کا ہے، اس وجہ سے ان کی اسناد بہت طویل ہیں۔

9۔أخبرنا أبو محمد هبة الله بن أحمد وعبد الله بن أحمد وأبو تراب حيدرة بن أحمد — إجازة — قالوا: نا عبد العزيز بن أحمد — لفظا — أنا عبد الرحمن بن عثمان بن أبي نصرنا أبوبكر أحمد بن محمد بن سعيد، وأبو الميمون البجلي، قالا: نا أبو عبد الملك أحمد بن إبراهيم بن بسر، نا محمد بن عائذ، .... قال: وسمعت غير واحد منهم **محمد بن شعيب** يخبر

---

[125] ایضاً۔ 3/1-411

[126] ایضاً۔ 3/1-458

[127] ابن سعد 3/79

عن **سعيد بن عبد العزيز**۔[128] اس روایت کے مطابق جب حضرت عثمان نے تحقیقات کے لیے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو مصر بھیجا تو وہ وہیں رک گئے اور انہوں نے کہا: "میں عثمان کی بیعت سے اس طرح نکل آیا جیسے میں اپنا یہ عمامہ کھول رہا ہوں۔" اس پر باغی تحریک کے سرکردہ رکن محمد بن ابی حذیفہ نے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو 40,000 دینار دیے۔

یہ روایت، درایت کے ساتھ ساتھ سند کے اعتبار سے سخت ضعیف ہے۔ اس میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ 40,000 دینار کی رشوت لے کر خلیفہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ ایک ایسا شخص جس نے مکہ کے اندر تپتی ریت پر کفار کا ظلم سہا ہو، کا کردار یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ باغیوں سے مل جائے۔ سند کے اعتبار سے بھی یہ ایک منقطع روایت ہے جس کا آغاز سعید بن عبد العزیز (d. 167/784) سے ہو رہا ہے۔ سعید اگرچہ ایک قابل اعتماد راوی ہیں تاہم ان کا زمانہ شہادت عثمان کے بہت بعد کا ہے۔[129] اگر ان کی عمر کو سو سال بھی مان لیا جائے تب بھی وہ شہادت عثمان کے بہت بعد پیدا ہوئے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے یہ روایت کسی باغی راوی سے سن کر بیان کی ہو لیکن اس کے نام کا ذکر نہ کیا ہو۔ سعید سے یہ روایت محمد بن شعیب نے حاصل کی ہے جو کہ قابل اعتماد راوی نہیں ہیں۔[130]

10۔ أخبرنا أبو علي الحداد وغيره في كتبهم، قالوا: أنا أبوبكر بن ريذة، أنا سليمان بن أحمد، نا أبو خليفة، نا أبو عمر حفص بن عمر الحوضي، نا الحسن بن أبي جعفر، نا **مجالد**، عن الشعبي، قال:۔[131] اس روایت کے مطابق مشہور تابعی مسروق رحمہ اللہ نے مالک الاشتر سے فرمایا: "آپ لوگوں نے حضرت عثمان کو اس حالت میں قتل کیا جب وہ روزے کی حالت میں عبادت کر رہے تھے۔" اشتر نے یہ بات حضرت عمار رضی اللہ عنہ تک پہنچا دی تو انہوں نے آ کر کہا: "واللہ! عثمان نے عمار کو سزا دی، ابوذر کو جلاوطن کیا اور چراگاہیں محفوظ کیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ انہیں روزے کی حالت میں عبادت کرتے قتل کیا گیا۔" مسروق نے کہا: "آپ لوگوں کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا چاہیے تھا، یا تو جتنی آپ کو سزا ملی تھی، اتنا ہی بدلہ لے لیتے یا پھر صبر کرتے اور اللہ تعالی صبر کرنے والوں کے لیے بہت اچھا ہے۔" یہ سن کر حضرت عمار اس طرح خاموش ہو گئے گویا کہ ان کے منہ میں پتھر ڈال دیا گیا ہو۔

اس روایت میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ باغی تحریک کے ساتھ تھے۔ اس کی سند کو دیکھیے تو اس میں

[128] ابن عساکر۔ 39/423

[129] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 3234۔ 3/218

[130] ایضاً۔ راوی نمبر 7678۔ 6/185

[131] ابن عساکر۔ 39/494

مجالد بن سعید موجود ہیں جو قابل اعتماد نہیں ہیں۔[132]

آپ ان دس کی دس روایات کے تجزیے کو دیکھ سکتے ہیں کہ ان کی اسناد ضعیف ہیں اور ان میں وہ راوی آتے ہیں جو قابل اعتماد نہیں تھے۔ عام طور پر ایسے راویوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ جھوٹ نہ بھی گھڑتے ہوں تب بھی سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے آگے بیان کر دیتے ہیں۔ باغی تحریک کے اندر قد آور شخصیات کی کمی تھی اور یہ ان کی ضرورت تھی کہ وہ کم از کم کچھ صحابہ کو اپنا ساتھی ظاہر کریں تاکہ ان کی ساکھ (Credibility) بہتر ہو اور اس کی مدد سے وہ مزید نوجوانوں کو ورغلا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض صحابہ کے بارے میں یہ پراپیگنڈا کیا کہ وہ ان کے ساتھی تھے۔ اس پراپیگنڈا میں سب سے نمایاں نام حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا تھا۔ اس سے باغیوں کو دو فوائد حاصل ہوئے: ایک تو یہ کہ شہادت عثمان کا الزام ایک جلیل القدر صحابی پر آیا اور دوسرے یہ کہ ان کی تحریک کو تقویت ملی کہ صحابہ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ سبھی اہم کتب تاریخ میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے متعلق ایسی روایتوں کو تلاش کیا جائے اور باوجود بھرپور کوشش کے ہمیں یہی دس روایتیں مل سکی ہیں۔ ہم یہ دعوی تو نہیں کرتے کہ ان کے علاوہ حضرت عمار کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہو گی تاہم آپ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ ان روایتوں میں آ گیا ہے۔ اگر آپ کو ان کے علاوہ کوئی روایت ملے، تو اس کی سند کو ضرور دیکھ لیجیے۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسی تمام روایات کی سند میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ہو گا جو کہ قابل اعتماد نہیں ہو گا۔

کیا حضرت ابوذر غفاری کو جلاوطن کیا گیا؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت بھی عائد کی گئی ہے کہ انہوں نے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے جلاوطن کر کے ربذہ بھیج دیا تھا جہاں انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ رہائش اختیار کی اور وہیں پر ان کی وفات ہوئی۔ تاریخی روایتوں میں اس کا افسانہ کچھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مدینہ میں دولتمندوں پر کڑی تنقید کرتے تھے۔ حضرت عثمان کے مشورے سے وہ شام چلے گئے۔ جب عبداللہ بن سبا نے یہاں اپنے قدم جمانے چاہے تو حضرت ابوذر ہی کے پاس آیا اور انہیں امیر اور غریب کے فرق کی طرف توجہ دلائی۔ اس پر حضرت ابوذر اس کی باتوں سے متاثر ہوئے اور گورنر شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بحث کی کہ مال کو غرباء میں تقسیم کر دینا چاہیے اور دولت مندوں کو دولت اکٹھا کرنے سے روکا جائے۔ حضرت معاویہ نے جواب دیا کہ حکومت امراء سے زکوۃ ہی وصول کر سکتی ہے اور وہ کی جا رہی ہے۔ اس پر حضرت ابوذر ناراض ہو کر مدینہ آ گئے اور یہاں بھی امراء کے خلاف اپنی تحریک جاری رکھی۔ اس تحریک نے مدینہ میں بھی مسائل پیدا کیے جن کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں ربذہ کی جانب بھیج دیا۔ اسی افسانے کی بنیاد پر موجودہ دور کے بعض کمیونسٹ حضرات نے حضرت

---

[132] ذہبی۔ راوی نمبر 7076۔6/23

ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو بھی معاذ اللہ کمیونسٹ قرار دیا ہے۔

مناسب رہے گا کہ ان روایات کا جائزہ بھی لے لیا جائے جن میں یہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ بلاذری نے اس ضمن میں گیارہ روایتیں نقل کی ہیں جو کہ یہ ہیں:

1۔ وقالوا:۔ [133] یہ وہی روایت ہے جس میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی امراء پر تنقید اور جلاوطنی کا ذکر ہے۔ بلاذری نے اس کی سند بیان نہیں کی بلکہ محض قالوا (انہوں نے کہا) کہہ کر روایت بیان کر دی ہے۔ ان کے عام طریقے کے مطابق وہ ایسا اس وقت کہتے ہیں جب وہ سند کو پہلے بیان کر چکے ہوں۔ اس سے پچھلی روایت کی سند یہ ہے: حدثنا روح بن عبد المؤمن المقرئ، وأحمد بن إبراهيم الدورقي، حدثنا **بهز بن أسد**، حدثنا حصين بن نمير، عن **جهيم الفهري**۔ اس سند پر ہم اوپر تبصرہ کر چکے ہیں کہ جہیم الفہری کے حالات نامعلوم ہیں اور بہز بن اسد، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف متعصب تھے۔

2۔ حدثني **عباس بن هشام**، عن **أبيه**، عن **أبي مخنف**، عن فضيل بن خديج، عن **كميل بن زياد**۔ یہ روایت کمیل بن زیاد کا بیان ہے کہ میں اس وقت مدینہ میں تھا جب حضرت عثمان نے ابو ذر رضی اللہ عنہما کو پہلے شام اور پھر ربذہ بھیجا۔ اس روایت کے سبھی راوی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض کے لیے مشہور ہیں۔ خاص طور پر کمیل بن زیاد کے بارے میں تو یہ بھی بیان ہوا ہے کہ وہ قاتلین عثمان کی پارٹی میں شامل تھے اور ایک موقع پر انہوں نے حضرت عثمان پر خود قاتلانہ حملے کا منصوبہ بنایا تھا جو ناکام رہا تھا۔ باقی، عباس بن ہشام کلبی، ان کے والد اور ابو مخنف تو اس معاملے میں اتنے مشہور ہیں کہ مزید کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

3۔ حدثني **بكر بن الهيثم**، عن عبد الرزاق عن معمر عن قتادة۔ اس روایت میں بھی جلاوطنی کا ذکر ہے اور یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابو ذر کی جلاوطنی پر حضرت علی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے پاس آئے اور ان سے تلخ کلامی کی۔ اس کی سند میں موجود بکر بن الہیثم کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں اور کس درجے میں قابل اعتماد ہیں؟ ممکن ہے کہ یہ بھی باغی تحریک کا حصہ رہے ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ مشہور کذاب ہیثم بن عدی (d. 207/823) کے صاحبزادے ہوں جو کہ صحابہ کرام کے ساتھ اپنے بغض کے لیے مشہور ہے۔ [134]

4۔ قد روي أيضا۔ اس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عثمان، ابو ذر کے بعد عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو بھی جلاوطن کرنا چاہتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقید کے باعث اس سے باز رہے۔ سند کو دیکھیے تو بلاذری صاحب نے محض قد روی ایضا (یعنی روایت کیا گیا ہے) پر اکتفا کیا ہے اور کسی راوی کا نام نہیں دیا ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ راوی کون لوگ ہوں گے؟

---

[133] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 6/166

[134] ذہبی۔ سیر الاعلام النبلا۔ شخصیت نمبر 6546۔ ص 4113

5-6۔حدثني محمد عن **الواقدي** عن موسى بن عبيدة عن عبد الله بن خراش الكعبي، وحدثني محمد عن **الواقدي** عن شيبان النحوي عن الأعمش، عن **إبراهيم التيمي** عن أبيه۔ ان روایتوں کے مطابق ایک صاحب نے حضرت ابوذر سے پوچھا کہ آپ کو کس چیز نے ربذہ میں لا پھینکا؟ انہوں نے جواب دیا: "عثمان اور معاویہ کے لیے میری خیر خواہی نے۔" دوسری روایت کے مطابق انہوں نے امر بالمعروف کا ذکر کیا۔ ان روایتوں کے ناقابل اعتماد ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ سند میں محمد بن عمر الواقدی موجود ہیں۔ پھر ابراہیم التیمی بھی ناقابل اعتماد راوی ہیں۔ ابو حاتم نے انہیں "منکر الحدیث" قرار دیا ہے جبکہ امام بخاری کے نزدیک ان کی بیان کردہ روایتیں ثابت نہیں ہیں۔[135]

7۔حدثني محمد عن **الواقدي** عن طلحة بن محمد بن بشر بن حوشب الفزاري عن أبيه۔ یہ روایت بھی واقدی ہی کی ہے تاہم یہ تصویر کا مثبت رخ پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق بشر بن حوشب نے مشہور تابعی حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی جلاوطنی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: "حضرت عثمان نے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما کو اس لیے ربذہ بھیجا تھا کہ وہ خود وہاں رہنا چاہتے تھے۔" ہمارے خیال میں یہی درست بات ہو سکتی ہے کہ حضرت ابوذر، شہر کے ہنگاموں سے تنگ آ کر گاؤں کی کھلی فضا میں رہنا چاہتے ہوں گے، جس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے انہیں وہیں بھجوا دیا اور گزارے کے لیے زمین اور مویشی دے دیے۔

8-10۔قال أبو مخنف: ابو مخنف کی اس روایت میں یہ ذکر ملتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ربذہ میں اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھے اور وہاں ان کی وفات ہوئی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو وصیت کی کہ جو لوگ ان کے جنازے میں آئیں، ان کی دعوت کی جائے۔ ان کی وفات کے بعد کچھ مسافر وہاں سے گزرے جنہوں نے ان کی نماز جنازہ ادا کی اور حسب وصیت ان کی دعوت کی گئی۔ ابو مخنف کی روایت کے مطابق حضرت جریر بن عبد اللہ نے جنازہ پڑھایا جبکہ واقدی کے مطابق حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے نماز جنازہ کی امامت کی۔ ان روایتوں میں کوئی منفی بات نہیں ہے۔ بلاذری نے یہی روایت دو اور اسناد سے بھی نقل کی ہے۔

11۔حدثني عن هشام عن العوام بن حوشب عن رجل من بني ثعلبة بن سعد، قال:۔ یہ ایک مثبت روایت ہے مگر اس کی سند کمزور ہے۔ اس کے مطابق باغی تحریک کے کچھ لوگوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ربذہ میں ملاقات کی اور انہیں اس بات کی ترغیب دی کہ وہ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اس پر انہوں نے نہایت ہی خوبصورت جواب دیا: "اگر ابن عفان مجھے کھجور کے تنے پر بھی سولی پر لٹکا دیں، تو میں ان کی بات سنوں گا، ان کی اطاعت کروں گا، اپنا احتساب کروں گا اور صبر کروں گا۔ جس شخص نے بھی حکومت کو ذلیل کیا، اس کی توبہ قبول نہ ہو گی۔" یہ سن کر باغی واپس چلے گئے۔[136] روایت کی سند اگرچہ کمزور ہے کہ اس میں ایک شخص کا نام نامعلوم

---

[135] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 178۔ 1/180

[136] بلاذری۔ 5/171

ہے تاہم جو بات اس میں بیان ہوئی ہے، وہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے کردار کے عین مطابق ہے۔

طبری نے اس ضمن میں ایک ہی طویل روایت بیان کی ہے جس سے معاملہ صاف ہو جاتا ہے:

كتب إلي بها السري، يذكر أن شعيبا حدثه عن سيف، عن عطية، عن يزيد الفقعسي۔ کے مطابق عبداللہ بن سبا جب شام آیا تو اس نے حضرت ابوذر سے کہا: "ابو ذر! آپ کو معاویہ کے اس قول پر تعجب نہیں ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ سب مال اللہ کا مال ہے۔ حالانکہ ہر چیز اللہ کی ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ کہیں وہ مسلمانوں کا سارا مال اپنے قبضے میں نہ لے لیں اور مسلمانوں کا نام تک نہ مٹا ڈالیں۔" ابو ذر یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہما کے پاس گئے اور ان سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے فرمایا: "ابو ذر! کیا ہم سب اللہ کے بندے نہیں ہیں اور مال اس کا مال نہیں ہے۔ کیا یہ مخلوق اس کی مخلوق نہیں ہے؟ اصل حکم اس کا حکم نہیں ہے؟" اب حضرت ابو ذر نے شام میں وعظ شروع کر دیا جس میں آپ امراء کو اپنا مال، غرباء کو دینے کی تلقین کرتے۔ اس سے آپ کے گرد غریب اکٹھے ہو گئے اور امراء آپ سے تنگ آ گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان کو خط لکھ کر مسئلے کا حل دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں عزت و احترام کے ساتھ مدینہ واپس بھیج دیا جائے۔ اب حضرت ابو ذر مدینہ آئے تو یہاں انہوں نے مختلف نوعیت کی خفیہ مجالس دیکھیں۔ انہوں نے فرمایا: "اہل مدینہ کو سخت غارت گر اور یادگار جنگ کی پیش گوئی سنا دو۔"

جب حضرت عثمان سے ابو ذر رضی اللہ عنہما کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے ان سے معاملہ دریافت کیا۔ ابو ذر نے جواب دیا: "مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کہنا درست نہیں ہے اور دولت مندوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مال و دولت جمع کریں۔" اس پر حضرت عثمان نے جواب دیا: "ابو ذر! میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنے فرائض ادا کروں اور عوام کے ذمہ جو واجبات ہیں، ان سے وصول کروں۔ میں انہیں زاہد بننے پر مجبور نہیں کر سکتا، صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ وہ محنت کریں اور کفایت شعاری سے کام لیں۔" اس پر ابو ذر نے ان سے مدینہ سے باہر رہنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عثمان نے پوچھا: "کیا آپ مدینہ کی بجائے اس سے کمتر جگہ رہنا پسند کریں گے؟" انہوں نے جواب دیا: "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ جب مدینہ کی عمارتیں خفیہ اڈے بن جائیں تو میں وہاں سے نکل جاؤں۔" اس پر حضرت عثمان نے فرمایا: "ایسی صورت میں آپ کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کی تعمیل کیجیے۔" اس کے بعد حضرت عثمان نے انہیں اونٹوں کا ایک ریوڑ دیا اور خدمت کے لیے دو ساتھی بھی ان کے حوالے کیے اور ساتھ ہی یہ کہلا بھیجا: "مدینہ آتے رہا کیجیے، ایسا نہ ہو کہ آپ دیہاتی بن جائیں۔" چنانچہ ابو ذر اس پر عمل کرتے تھے۔ انہوں نے ربذہ میں ایک مسجد بھی بنائی۔[137]

اس روایت میں سیف بن عمر یا کسی اور راوی نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ، ابن سبا کی باتوں سے متاثر ہو کر امراء کے خلاف اور غرباء کے حق میں تقریریں کرنے لگے حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ہمیشہ سے یہ تلقین کرتے تھے کہ امراء زکوۃ سے بھی بڑھ کر اپنا مال غرباء میں تقسیم کر دیں۔ اس معاملے

[137] طبری۔ 3/1-321

میں عبداللہ بن سبا کا کوئی کردار نہ تھا۔ حضرت ابوذر ایک حساس انسان تھے اور سمجھتے تھے کہ کہیں دولت کی کثرت مسلمانوں کے کردار کو خراب نہ کر دے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فتوحات کی کثرت کی وجہ سے قیصر و کسری کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ آ گئے تھے اور انہیں بیت المال میں رکھنے کی بجائے عام آدمی میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس معاشرے میں غریب، بہت غریب ہوں اور امیر بہت امیر ہوں بلکہ ہر شخص کی بنیادی ضروریات کی ذمہ داری حکومت نے لے رکھی تھی۔ حضرت عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہما کا موقف یہ تھا کہ حکومت عوام سے صرف زکوۃ ہی جبراً وصول کر سکتی ہے۔ غرباء پر مزید خرچ کے لیے دولت مندوں کو ترغیب دلائی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر کوئی غیر معمولی صورتحال جیسے قحط پیدا ہو جائے تو پھر حکومت، زکوۃ کے علاوہ بھی امراء پر مزید ٹیکس لگا سکتی ہے۔

نقطہ نظر کے اس اختلاف کے سبب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے یہ پسند کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر کسی گاؤں میں چلے جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلے تو انہیں قائل کرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ قائل نہ ہوئے تو انہیں اونٹوں کا ریوڑ، جو کہ اس دور کی سب سے بڑی دولت تھی، دے کر رخصت کر دیا لیکن ساتھ ہی یہ تلقین بھی کی کہ مدینہ آتے جاتے رہیے گا۔ اس سے ان دونوں صحابہ کے باہمی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس قسم کا اختلاف رائے پیدا ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں اور انسانوں میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اب ہوا کہ اس معمولی بات کو باغی تحریک نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے پہلے کوشش یہ کی کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بھڑکا کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے اور اس کے لیے انہوں نے انہیں لیڈری کا لالچ بھی دیا۔ حضرت ابوذر ان کے جھانسے میں نہ آئے اور انہیں جھڑک دیا اور فرمایا: "اگر ابن عفان مجھے کھجور کے تنے پر بھی سولی پر لٹکا دیں، تو میں ان کی بات سنوں گا، ان کی اطاعت کروں گا، اپنا احتساب کروں گا اور صبر کروں گا۔ جس شخص نے بھی حکومت کو ذلیل کیا، اس کی توبہ قبول نہ ہو گی۔" اس کے بعد ان باغیوں نے صورت حال کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگایا کہ انہوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو جلاوطن کر رکھا ہے حالانکہ حضرت ابوذر اپنی مرضی سے ہی ربذہ چلے گئے تھے جو کہ ایک بڑی چراگاہ تھی۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ساری بات محض ایک افسانہ ہے جو باغیوں نے محض آپ کو اپنے ساتھ ملوث کرنے کے لیے گھڑا ہے۔

کیا حضرت عبداللہ بن مسعود پر تشدد کیا گیا؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں اور ان کا شمار بھی السابقون الاولون میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار صحابہ سے قرآن سیکھنے کا حکم دیا، ان میں ایک حضرت عبداللہ بن مسعود تھے۔ آپ حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے ادوار میں کوفہ کے بیت المال کے انچارج رہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم و تبلیغ میں اپنی زندگی بسر کی۔ آپ کو فقہ میں غیر

معمولی مقام حاصل تھا اور آپ ہی کی علمی کاوشوں کی بنیاد پر بعد کی صدیوں میں کوفہ کا فقہی مکتب فکر وجود میں آیا جس کے سرخیل امام ابو حنیفہ بنے۔

حضرت عبداللہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ جب حضرت عثمان منتخب ہوئے تو حضرت عبداللہ کوفہ آئے اور یہاں آ کر کہا: "ہم نے بقیہ لوگوں میں سے سب سے بہترین شخص کو منتخب کیا ہے اور اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔"[138] جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت حضرت عبداللہ، اگرچہ وفات پا چکے تھے لیکن انہی کے جلیل القدر شاگردوں مسروق بن اجدع، اسود بن یزید، شریح بن الحارث اور عبداللہ بن حکم رحمہم اللہ نے اہل کوفہ کو خلیفہ کی مدد کے لیے تیار کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ اور ان کے شاگرد، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے بہت محبت کرتے تھے۔[139]

باغیوں نے اپنے پراپیگنڈا کے طور پر یہ روایتیں وضع کیں کہ حضرت عبداللہ، حضرت عثمان کے خلاف ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے عبداللہ کو کوڑوں سے پٹوایا تھا۔ یہی پراپیگنڈا بعض روایتوں کا حصہ بن کر کتب تاریخ میں آ گیا ہے۔ لازم ہے کہ ہم اس کی حقیقت بھی دیکھ لیں۔ کتب تاریخ میں ہمیں اس ضمن میں دو ہی روایتیں مل سکی ہیں جو بلاذری نے نقل کی ہیں:

1۔ حدثني **عباس بن هشام** عن **أبيه** عن **أبي مخنف** وعوانة في إسنادهما:[140] اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعود نے گورنر کوفہ ولید بن عقبہ پر تنقید کی جس کی پاداش میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے انہیں مدینہ بلوا کر پٹوایا اور انہیں یہاں قید کر دیا جس کے دو سال کے اندر حضرت عبداللہ وفات پا گئے۔ روایت کی سند کو دیکھیے تو اس میں وہ تمام لوگ موجود ہیں جو کہ بعد میں باغی تحریک کا حصہ بنے اور یہ سب کے سب صحابہ کرام سے شدید بغض رکھتے تھے۔ ان میں عباس بن ہشام، ہشام کلبی اور ابو مخنف شامل ہیں۔

2۔ حدثني اسحاق الفروي أبو موسى، حدثنا عبد الله بن إدريس عن عبد الرحمن بن عبد الله **عن رجل** نسيه اسحاق:[141] اس روایت کے مطابق حضرت عثمان، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کے گھر میں اس وقت گئے جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اس موقع پر دونوں نے ایک دوسرے کے لیے دعائے مغفرت کی۔ روایت کی سند میں ایک نامعلوم شخص ہے، جس کا نام اسحاق بھول گئے تھے، اور اس کے بارے میں ہم نہیں جانتے ہیں کہ وہ کس درجے میں قابل اعتماد تھا۔ صحابہ کرام ایک دوسرے کے لیے دعا کرتے تھے لیکن اس پیرائے میں دعا کے بیان کا مقصد بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوپر ابو مخنف اور ہشام کلبی کی روایت کی

[138] ابن عساکر۔ 39/212

[139] طبری۔ 3/1-401

[140] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 6/146

[141] ایضاً۔ 6/148

تصدیق کی جاسکے۔

جب مدینہ کا محاصرہ کیا گیا تو کوفہ میں جن لوگوں نے حضرت عثمان کی حمایت کے لیے مہم چلائی، ان میں سب سے نمایاں نام حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے شاگردوں کا ہے۔ اگر خدانخواستہ حضرت عبداللہ بن مسعود پر تشدد کیا گیا ہوتا تو کیا ان کے جلیل القدر شاگرد، باغی تحریک کے خلاف مہم چلا کر کے لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کی ترغیب دیتے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بھی جھوٹے پراپیگنڈے کا حصہ ہے۔

خلاصہ باب

اس باب میں ہم نے تاریخ کے ابتدائی ماخذ کا ایک تفصیلی سروے کر کے وہ تمام روایتیں جمع کر دی ہیں، جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تہمتیں موجود ہیں اور ان کی اسناد کا جائزہ لے کر بھی یہ بیان کر دیا ہے کہ یہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کم و بیش ایسی ہر روایت کی سند میں واقدی، ابو مخنف، ہشام کلبی، سیف بن عمر یا اسی نوعیت کے ناقابل اعتماد راوی موجود ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص ان ناقابل اعتماد راویوں کی باتوں کی بنیاد پر خلیفہ مظلوم سے بدگمانی کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ ہاں، جو شخص قرآن مجید کو مانتا ہے اور اس کے حسن ظن کے حکم پر عمل پیرا ہے، وہ یہ اچھی طرح جان سکتا ہے کہ پراپیگنڈے اور حقیقت میں کیا فرق ہے؟

باغی تحریک کے پراپیگنڈا کا جھوٹ اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جس طرح پورا عالم اسلام ان باغیوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اس کی کوئی مثال ہمیں نہیں ملتی ہے۔ اگر ان کا پراپیگنڈا درست ہوتا تو عالم اسلام میں حضرت عثمان کی شہادت پر اتنی بے چینی نہ پائی جاتی بلکہ نعوذ باللہ لوگ شکر کرتے کہ ایک ظالم اور کرپٹ خلیفہ سے نجات ملی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پراپیگنڈا محض جھوٹ تھا اور اس دور کے لوگ بھی اسے جھوٹ ہی سمجھتے تھے۔ ہمارے دور میں البتہ بعض لوگ اس پراپیگنڈے کو سچ سمجھ بیٹھے اور انہوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی شروع کر دی۔ اگر یہ حضرات ان روایتوں کی سند ہی کو دیکھ لیتے تو انہیں ان کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔ افسوس کہ اگر ہمارے والدین پر کوئی الزام عائد کیا جائے تو ہم اس کی تحقیق پر زور دیتے ہیں لیکن صحابہ کرام پر الزام عائد کیے گئے تو ان کی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

ہماری اس عاجزانہ سی کوشش کے باوجود عہد عثمانی سے متعلق تاریخ کے قدیم ترین ماخذ میں اگر کوئی روایت ایسی رہ گئی ہو، جو آپ کے دور کی منفی تصویر پیش کرتی ہو، تو آپ بلا تکلف اس کی نشاندہی کیجیے، ان شاء اللہ ہم اس روایت کی تحقیق کو بھی اس کتاب میں شامل کر دیں گے۔

اگلے باب میں ان شاء اللہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کا جائزہ لیں گے۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت

کرنے والوں نے ان سے متعلق پراپیگنڈا کیا، بالکل اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین نے ان کے خلاف پراپیگنڈا کیا۔ اس کی تفصیلات کا جائزہ بھی ہم ان شاء اللہ اسی طریقے پر لیں گے۔ اس باب کا خلاصہ ہم ان نکات کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں:

- باغی تحریکوں کا ایک لائف سائیکل ہوتا ہے۔ تحریک کو اپنے عہد جوانی تک پہنچنے کے لیے کم و بیش بیس سال کا وقت درکار ہوتا ہے۔
- خلفاء راشدین کے دور میں باغی تحریک کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا کیونکہ بہت سے ایسے عناصر موجود تھے جو اسلام کی پھیلتی ہوئی سلطنت کو پسند نہ کرتے تھے۔
- باغیوں نے پراپیگنڈا کے ہتھیار سے کام لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تہمتیں تراشیں۔ یہی الزامات تاریخی روایات کا حصہ بن گئے۔ ایسی تمام روایات کی سند کا جائزہ لیا جائے تو ان میں اسی باغی تحریک کے راوی نظر آتے ہیں۔
- تمام صحابہ بشمول حضرت علی، طلحہ اور زبیر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے بہت محبت کرتے تھے اور انہوں نے خلیفہ مظلوم کے دفاع کی ہر ممکن کوشش کی اور اس ضمن میں اپنے جواں سال بیٹوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دیں۔
- باغیوں نے متعدد صحابہ جیسے حضرت علی، طلحہ، عبد الرحمن، عبداللہ بن مسعود اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم پر مختلف تہمتیں تراشیں۔ ایسی تمام کی تمام روایات جعلی ہیں۔

اسائن منٹس

۱۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں باغی تحریک کیوں اور کیسے پیدا ہوئی؟ اس کے عمرانی (Sociological) اسباب کیا تھے؟ باغی تحریکوں کے لائف سائیکل کی روشنی میں جواب دیجیے۔

۲۔ حضرت عثمان نے باغیوں کے مقابلے میں انتہا درجے کی جس نرمی کا مظاہرہ کیا، اس کے پیچھے کیا عمرانی حقیقتیں کارفرما تھیں؟ عرب کے قبائلی معاشرے کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جواب دیجیے۔

۳۔ باغیوں نے حضرت عثمان پر جو الزامات عائد کیے، ان کی ایک فہرست تیار کیجیے اور تاریخی روایات کا تجزیہ کر کے بتائیے کہ ان الزامات کی حقیقت کیا تھی؟

۴۔ قاتلین عثمان کے خلاف حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے کردار کو بیان کیجیے۔

۵۔ باغی تحریک کے پیش نظر کیا مقاصد تھے؟ کیا یہ لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکے؟ 'ہاں' یا 'نہیں' دونوں صورتوں میں اپنے دلائل بیان کیجیے۔

باب 5: عہد علوی

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کے بارے میں یہ جان سکیں کہ:

- چوتھے خلیفہ راشد کا انتخاب کیسے ہوا؟
- جنگ جمل کے اسباب کیا تھے اور اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے؟
- جنگ صفین کن حالات میں ہوئی اور اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے؟
- واقعہ تحکیم اور اس کے بعد کے واقعات کی حقیقت کیا ہے؟
- خوارج کا فرقہ کیوں پیدا ہوا اور اس کے کیا اثرات عالم اسلام پر مرتب ہوئے؟
- حضرت علی کی شہادت کیسے ہوئی اور اس کے اسباب و علل کیا تھے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ عہد علوی سے متعلق اہم تاریخی سوالات کے جواب دے سکیں۔

خلافت راشدہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دور ایسا ہے جس پر بہت سے سوالات لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس دور میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کے درمیان دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ جب تاریخ کا ایک طالب علم ان جنگوں کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدسیوں کا وہ گروہ، جسے قرآن مجید نے "رحماء بینہم" کہا ہے، وہ کیسے ایک دوسرے کے مدمقابل آ گیا۔ باغی تحریک کی سازشوں نے اس ضمن میں کیا کردار ادا کیا؟ جلیل القدر صحابہ جن میں حضرت علی، طلحہ، زبیر، سیدہ عائشہ، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم شامل ہیں، نے اس فتنے کو روکنے میں کیا کردار ادا کیا؟ پچھلے باب کا اختتام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ہوا تھا۔ اس باب کا آغاز ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت سے کرتے ہیں۔

حضرت علی کی بیعت

اس سیکشن میں ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے متعلق سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے پہلے ایک سوال ہر شخص کے ذہن میں آتا ہے کہ شہادت عثمانی کے بعد صحابہ نے باغیوں پر حملہ کیوں نہ کیا؟ چونکہ یہ سوال حضرت علی کی بیعت سے متعلق ہے، اس وجہ سے اسی سے ہم اس بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

شہادت عثمانی کے بعد صحابہ نے باغیوں پر حملہ کیوں نہ کیا؟

یہاں پر تاریخ کے طالب علموں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کو باغیوں پر حملے سے روکا ہوا تھا تو آپ کی شہادت کے بعد انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے پیش نظر سبھی صحابہ سکتے (Trauma) کی سی کیفیت میں تھے۔ ان کی طاقت بھی بکھری ہوئی تھی۔ جب تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ موجود تھے، اس وقت تک ان کی طاقت اکٹھی تھی لیکن اس طاقت کو استعمال ہونے سے خود حضرت عثمان نے روکا ہوا تھا۔ آپ کی شہادت کے بعد یہ طاقت، جتنی بھی تھی اور جیسی بھی تھی، بکھر گئی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ انہیں منظم کیا جاتا اور پھر مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کر لیا جاتا۔ اس وقت کوفہ، بصرہ اور شام سے چلی ہوئی افواج راستے میں تھیں اور صحابہ کرام کو وقت درکار تھا کہ یہ افواج مدینہ پہنچ جائیں۔

صحابہ کرام نے حضرت علی کی بیعت کیسے کی؟

اکابر صحابہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اپنے میں سے ایک شخص کو خلیفہ مقرر کر دیا جائے جو قوم کی بکھری ہوئی طاقت کو منظم کر سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ شوریٰ میں سے دو افراد یعنی حضرت عثمان اور عبد الرحمن بن عوف اس دنیا سے جا چکے تھے اور اب چار افراد یعنی علی، طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم موجود تھے اور انہی میں سے کسی ایک کو خلیفہ بننا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھی۔ آپ عرصہ دراز سے حضرت عثمان کے نائب کے طور پر کام کرتے آ رہے تھے۔ اس سے پہلے

عہد رسالت، عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں اہم عہدوں پر رہے تھے۔ چنانچہ اکابر صحابہ نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ خلیفہ بن جائیں۔

طبری اور بلاذری نے اس موقع پر دو متضاد قسم کی روایتیں نقل کی ہیں۔ روایات کے ایک گروپ کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے طالب نہیں تھے لیکن اکابر صحابہ نے انہیں مجبور کیا کہ وہ خلیفہ بنیں تا کہ امت کو متحد کیا جا سکے۔ ان سب حضرات نے بخوشی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ دوسرے گروپ کی روایتوں کے مطابق اصل میں یہ باغی تھے جنہوں نے حضرت علی کو خلیفہ بنایا تھا اور تمام صحابہ سے جبراً بیعت لی گئی تھی۔ یہاں ہم پہلے روایات کے اس گروپ کو بیان کرتے ہیں جس کے مطابق اکابر صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔

حدثني جعفر بن عبد الله ما لمحمدي، قال: حدثنا عمرو بن حماد وعلي ابن حسين، قالا: حدثنا حسين عن أبيه، عن عبد الملك بن أبي سليمان الفزاري، عن سالم بن أبي الجعد الأشجعي، عن محمد الحنفية۔ محمد بن حنفیہ (حضرت علی کے بیٹے) بیان کرتے ہیں کہ جس روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے، میں اس روز اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ جب انہیں شہادت عثمان کی خبر ملی تو وہ فوراً اپنے گھر سے نکلے اور حضرت عثمان کے گھر پہنچے۔ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: "عثمان کو تو شہید کر دیا گیا ہے اور لوگوں کے لیے ایک نہ ایک امام کی موجودگی ضروری ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ آج روئے زمین پر آپ سے زیادہ ہم کسی کو اس کا حق دار نہیں پاتے۔ نہ تو آج کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اسلام میں آپ پر سبقت رکھتا ہو اور نہ کوئی ایسا فرد موجود ہے، جسے آپ سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب اور رشتہ داری حاصل ہو۔ اس لیے یہ بوجھ آپ اپنے کندھوں پر اٹھائیے اور لوگوں کو اس بے چینی اور پریشانی سے نجات دلائیے۔

حضرت علی نے فرمایا: "بہتر ہے کہ آپ کسی اور اپنا امیر بنا لیجیے اور مجھے اس کا وزیر رہنے دیجیے۔ بہتر یہی ہے کہ کوئی دوسرا امیر ہو اور میں اس کا وزیر ہوں۔" صحابہ نے کہا: "واللہ! آپ کے علاوہ ہم کسی کی بیعت کے لیے تیار نہیں ہیں۔" حضرت علی نے فرمایا: "جب آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ بیعت مسجد میں ہونی چاہیے تا کہ لوگوں پر میری بیعت مخفی نہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر میں اس خلافت کا حق دار نہیں ہوں۔"

سالم بن ابی الجعد کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: "مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مسجد میں جانا بہتر معلوم نہیں ہوا کیونکہ مجھے یہ خوف تھا کہ (باغی) لوگ آپ کے خلاف شور نہ مچائیں۔ لیکن حضرت علی نے میری بات قبول نہیں فرمائی اور مسجد تشریف لے گئے۔ وہاں تمام مہاجرین و انصار نے جمع ہو کر آپ کی بیعت کی۔ پھر دیگر لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔ [1]

اس روایت کے ساتھ ہی ابو بشیر العابدی کی روایت بھی ہے جس کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیعت کے لیے مجبور کرنے والوں میں حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ سب سے پہلے حضرت طلحہ نے کہا: "ابو الحسن! اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ ہم

[1] طبری۔ 35H/3/2-18

آپ کی بیعت کریں۔" حضرت علی نے فرمایا: "مجھے خلافت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جسے بھی خلیفہ بنانا چاہیں، میں اس سے خوش ہوں اس معاملے میں آپ کے ساتھ ہوں۔" اس کے بعد مہاجرین وانصار آ آکر حضرت علی سے درخواست کرتے رہے کہ وہ منصب خلافت کو قبول کر لیں۔ حضرت علی نے خلیفہ بننے کے لیے ایک ہی شرط رکھی اور وہ یہ تھی کہ آپ لوگوں کی رضامندی کے بغیر ایک درہم بھی بیت المال سے نہ لیں گے۔ سب سے پہلے بیعت حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کی۔ آپ کا ہاتھ جنگ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے کٹ گیا تھا۔ آپ نے جب اس کٹے ہوئے ہاتھ سے بیعت کی تو ایک شخص حبیب بن ذوئب (جو غالباً باغی تھا) نے کہا: "جس بیعت کی ابتدا ہی کٹے ہوئے ہاتھ سے ہو، وہ مکمل نہیں ہو سکتی۔"[2] ایک نہایت ہی مبارک ہاتھ کے بارے میں اس شخص نے جلی کٹی بات کہی جو کہ اس کے بغض کا اظہار کرتی ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک جنگل میں حضرت زبیر کو علی رضی اللہ عنہما کی بیعت کرتے دیکھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات آپس میں مل کر باغیوں سے نجات کا منصوبہ بنا رہے تھے اور اس پر عہد وپیمان کر رہے تھے۔[3]

احنف بن قیس رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ باغیوں کے محاصرے کے وقت وہ حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: "مجھے لگتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا جائے گا؟ ان کے بعد آپ مجھے کس سے بیعت کا مشورہ دیتے ہیں؟" ان دونوں نے جواب دیا: "علی کی۔" میں نے پوچھا: "کیا آپ دونوں علی کی خلافت سے راضی ہیں اور کیا فی الواقع انہی کی بیعت کا مشورہ دے رہے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا: "ہاں۔" اس کے بعد احنف رضی اللہ عنہ مکہ چلے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی اور انہوں نے آپ سے بھی مشورہ کیا۔ آپ نے بھی انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا مشورہ دیا۔[4] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کی رائے بھی یہی تھی کہ حضرت علی ہی اب اگلے خلیفہ ہونے چاہییں۔ ہاں انہوں نے یہ شرط ضرور عائد کی تھی کہ قاتلین عثمان کا قلع قمع کیا جائے گا۔

یہ روایات صحابہ کرام کے کردار سے مطابقت رکھتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے بے غرض انسان نے امت کی مصلحت کے تحت ہی خلافت قبول کی ورنہ آپ کے دل میں کوئی منفی جذبہ موجود نہ تھا۔ یہی معاملہ حضرت طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم کا تھا۔ سابقہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی خدمت کے لیے حضرت علی کے دل میں خلافت کی خواہش ضرور موجود تھی مگر ایسا نہیں تھا کہ آپ اس کی خاطر فتنہ وفساد برپا رکھتے۔ جب امت نے حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے حق میں فیصلہ دیا تو حضرت علی نے اسے خوش دلی سے قبول کیا اور جب انہیں خلافت ملی تو انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر امت کے مفاد میں اسے قبول کر لیا۔

---

[2] ایضاً۔ 3/2-19

[3] ایضاً۔ 3/2-19

[4] ایضاً۔ 36H/3/2-113

باغیوں نے نئے خلیفہ کے انتخاب میں کیا کردار ادا کیا؟

ایک طرف تو مخلص صحابہ حضرت علی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور دوسری جانب باغیوں کو کسی ایسے خلیفہ کی تلاش تھی، جس کے پردے میں وہ خود حکومت کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ بار بار حضرت علی، طلحہ، زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم کے پاس آتے تھے لیکن یہ حضرات انہیں ٹال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ لوگ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بھی گئے لیکن انہوں نے بھی انکار کر دیا۔[5] بالآخر ایک دن مالک الاشتر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ بازار میں پکڑ لیا اور ان کی زبردستی بیعت کر لی۔ اس کے بعد اس کے ساتھ حضرات طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کو پکڑ کر گھسیٹ لائے اور ان کی گردن پر تلوار رکھ کر زبردستی بیعت لی۔ حضرت سعد اور ابن عمر نے اس بیعت سے انکار کر دیا۔ باغیوں نے ان کی جان لینا چاہی تو حضرت علی نے خود ان کی ضمانت دے کر ان کی جان بچائی۔[6]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر بیان کردہ روایات کے مطابق اکابر صحابہ نے حضرت علی کو خلیفہ بننے پر مجبور کیا لیکن ان روایات میں یہ ذکر ہے کہ باغیوں نے حضرت علی کو زبردستی خلیفہ بنایا اور پھر دوسروں سے زبردستی بیعت لی۔ کیا یہ دونوں باتیں متضاد نہیں ہیں؟ اگر ان میں تطبیق دینے کی کوشش کی جائے تو جو صورتحال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین و انصار بالخصوص حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم نے بخوشی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی اور یہ بیعت اس بات سے مشروط تھی کہ آپ مخلص مسلمانوں کے قائد بن کر ان باغیوں کی سرکوبی کریں گے۔ باغیوں کو ان حضرات کے اس منصوبے کی خبر ملی تو انہوں نے مدینہ کی آبادی میں غلط فہمیاں پھیلانے کے لیے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبردستی بیعت کی اور بقیہ لوگوں کو اس پر مجبور کیا۔ اکابر صحابہ کو حضرت علی کی بیعت سے کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن یہ باغیوں کے تحت ہونے والی بیعت کو قبول کرنے والے نہ تھے کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اب باغی اقتدار پر قابض ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات سے باغیوں نے جبراً بیعت کروائی۔

حضرت علی نے خلیفہ بنتے ہی باغیوں کی سرکوبی کیوں نہ کی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ناقدین، خاص کر ناصبی فرقہ نے ان پر جو الزامات عائد کیے، ان میں سب سے بڑا یہ تھا کہ انہوں نے خلیفہ بنتے ہی باغیوں کی سرکوبی کیوں نہ کی؟ باغی لیڈر، خاص کر مالک الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو انہوں نے گورنر مقرر کیا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں باغی ان کی صفوں میں سب سے آگے رہے۔ حکومت پر بھی باغیوں ہی کا عمل دخل زیادہ رہا اور انہوں نے قاتلین عثمان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔ اس سب کی وجہ کیا تھی؟ اگر وہ یہ سب نہ کر سکتے تھے تو پھر انہوں نے خلافت ہی قبول کیوں کی یا اگر قبول کر لی تھی تو استعفیٰ کیوں نہ دیا؟

---

[5] ایضاً۔ 3/2-23

[6] ایضاً۔ 3/2-24 to 26

ناقدین نے چونکہ اس وقت کی صورتحال کا صحیح تجزیہ نہیں کیا، اس وجہ سے یہ سوالات ان کے سامنے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں ہم پہلے اس صورتحال کا جائزہ لیں گے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بنتے وقت سامنے تھی۔ پھر ہم آپ کے ان اقدامات کا جائزہ لیں گے، جو آپ نے باغیوں کے خلاف کیے۔

جیسا کہ اوپر بیان کردہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین و انصار نے برضا و رغبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔ سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اپنے اس کٹے ہوئے ہاتھ سے بیعت کی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کی بیعت کر لی اور ایک موقع پر انہوں نے جنگل میں خفیہ طور پر بیعت کی تھی۔ یہ دونوں وہ حضرات تھے، جن میں خلیفہ بننے کا پورا پوٹینشل موجود تھا اور حضرت علی اگر خلافت قبول نہ کرتے تو انہی میں سے کسی ایک کو خلیفہ ہونا تھا۔ یہ حضرات اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مسلمانوں کو مجتمع کر کے باغیوں کے خلاف فیصلہ کن اقدام کرنا چاہتے تھے۔ جس وقت یہ معاملات ہو رہے تھے، باغی بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ حج کے لیے جانے والے حضرات ابھی مدینہ واپس نہ آئے تھے اور مسلمانوں کی قوت کی صورتحال وہی تھی جو شہادت عثمان سے پہلے کی تھی۔ کوفہ، بصرہ، شام اور مصر سے چلی ہوئی افواج ابھی راستے میں تھیں کہ انہیں خلیفہ مظلوم کی شہادت کی اطلاع ملی۔ اب وہ گومگو کی کیفیت میں تھے کہ کیا کریں؟

باغیوں نے جب یہ دیکھا کہ اگر مسلمان مجتمع ہو گئے تو ان کی خیر نہیں۔ چنانچہ انہوں نے اب اپنی بقا (Survival) کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اور تیزی سے آ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد گھیرا ڈال دیا اور انہیں عملاً یرغمال بنا لیا اور آپ کے نام پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد ان باغیوں نے جو اقدامات کیے، اس کے ذمہ دار وہ خود تھے لیکن چونکہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام استعمال کیا، اس وجہ سے اعتراض آپ کی ذات پر کیا گیا۔ حکومت دراصل ان باغیوں کی تھی اور حضرت علی نے ان نامساعد حالات میں ممکنہ حد تک ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔

حضرت علی جیسے عظیم بہادر پر قابو پا لینا ان باغیوں کے لیے آسان نہ تھا لیکن اس وقت آپ کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آپ کے ساتھ اتنی قوت موجود نہ تھی جو باغیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی۔ اگر صحابہ کرام منتشر ٹولیوں کی شکل میں باغیوں پر حملہ کر دیتے تو یہ سوائے خودکشی کے اور کچھ نہ ہوتا۔ آج کل کے جذباتی لوگوں کو تو شاید یہ بات قابل اعتراض لگے لیکن جو شخص بھی جذبات کی بجائے عقل سے سوچتا ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ ایسے موقع پر لڑ کر جان دے دینا، دشمن ہی کو طاقتور بنانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر حضرت علی وہاں پر لڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت جان دے دیتے تو پھر پورے اہل مدینہ، باغیوں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ باغی جس قماش کے لوگ تھے، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے پھر شاید مدینہ کی خواتین کی عصمتیں محفوظ نہ رہتیں اور ان کے بوڑھوں اور بچوں کو ذبح کر دیا جاتا۔

باغیوں کے خلاف فوری کاروائی سے رکنے کی ایک وجہ اور بھی تھی اور اس کی جڑیں دور جاہلیت کی قبائلی نفسیات میں پیوست تھیں۔ قبائلی نظاموں کا جن حضرات نے مطالعہ کیا ہے، وہ یہ بات بخوبی سمجھتے ہیں کہ قبیلہ ایک سیاسی، معاشرتی اور معاشی یونٹ ہوا کرتا ہے۔

قبائلیوں کی بچپن ہی سے تربیت یہ کی جاتی ہے کہ دنیا کی اہم ترین چیز ان کا قبیلہ ہے۔ اگر ان کے قبیلے کے کسی بھی شخص کے خلاف کوئی اقدام کیا جائے تو اسے قبیلے پر حملہ تصور کر کے پورا قبیلہ اس کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ قبائلیوں کو اس سے غرض نہیں ہوتی ہے کہ ان کے آدمی نے جو کیا تھا، وہ غلط ہے یا صحیح۔ ان کی تربیت ہی اس انداز میں کی گئی ہوتی ہے کہ ہر صورت میں اور ہر حالت میں اپنے بھائی کی حمایت کرنا ہے خواہ وہ نیکی کرے یا برائی۔ بعض لوگوں میں یہ قبائلی عصبیت اس درجے میں سرایت کر جاتی ہے کہ ان کے نزدیک حق و باطل کا معیار ہی ان کا قبائلی مفاد بن جاتا ہے۔ ان کی نظر میں حق وہ ہوتا ہے، جو ان کے قبیلے نے کیا اور باطل وہ ہوتا ہے جس سے ان کے قبائلی مفاد پر ضرب لگتی ہے۔ اس نفسیات کے لیے کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے دور کے قبائل تو کجا، سیاسی جماعتوں بلکہ دوستانہ جتھہ بندیوں میں یہ چیز دیکھ سکتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی تربیت اس انداز میں کی تھی کہ وہ ان قبائلی تعصبات کو فراموش کر کے صرف اور صرف اپنے ضمیر کی بنیاد پر حق و باطل کا فیصلہ کریں۔ فی الحقیقت ان صحابہ نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انصار نے مہاجرین کے لیے قربانی دی اور مہاجرین کے مختلف خاندانوں نے اپنے میں سے بہترین افراد کا انتخاب کیا۔ لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ جو قبائل مدینہ منورہ سے فاصلے پر آباد تھے، ان کے تمام افراد نے اس تربیت کا اثر قبول نہ کیا تھا۔ ویسے بھی صدیوں کی قائم روایت کو ختم کرنے کے لیے بھی صدیاں درکار تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں وہ قبائلی حمیت اور عصبیت پوری قوت سے موجود تھی اور اسی کی بنیاد پر وہ مسیلمہ کذاب جیسے لوگوں کا آلہ کار بنے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ اگر وہ ان باغیوں سے جنگ کر کے ان کا خاتمہ کر دیتے ہیں تو ان کے قبائل ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس طرح ان باغیوں کی قوت، جو ابھی محض چند ہزار تھی، میں دسیوں گنا اضافہ ہو جاتا اور پھر ان سے نمٹنے کے لیے دسیوں جنگیں لڑنا پڑتیں۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ آپ کا نقطہ نظر بالکل درست تھا کہ فی الوقت معاملات کو ٹھنڈا ہو لینے دیا جائے اور جب حکومت کی رٹ صحیح طور پر قائم ہو جائے تو پھر ان باغیوں کے خلاف پوری قوت سے کاروائی کی جائے۔

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابن عباس، حسن اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم نے مشورہ دیا تھا کہ آپ خلافت قبول نہ کریں اور ینبوع اپنی زمینوں پر یا کسی اور مقام پر چلے جائیں ورنہ قتل عثمان کا الزام ان پر آئے گا۔[7] انہوں نے اس مشورے کو قبول کیوں نہ کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسا کر لیتے تو پھر اہل مدینہ کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا اور باغی نجانے ان کا کیا حشر کرتے۔ یہ حضرت علی کی عظمت اور آپ ہی کا ظرف ہے کہ آپ نے اپنی جان اور شہرت کو بچانے کے لیے اہل مدینہ کے جان، مال اور آبرو کو خطرے میں ڈالنا پسند نہ فرمایا۔ آپ نے نہایت ہی حکمت، تدبر اور حلم کے ساتھ وقت حاصل کیا تاکہ

[7] ایضاً۔ 3/1-448

آپ اپنے منصوبے کی تکمیل کر سکیں۔

حضرت علی کا پلان کیا تھا؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منصوبہ ان نکات پر مبنی تھا:

1۔ باغیوں کو وقتی طور پر کسی کام میں مصروف (Engage) کر دیا جائے تا کہ اہل مدینہ کی جان، مال اور آبرو ان سے محفوظ ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ان کی کچھ باتیں اگر ماننا بھی پڑیں تو اس میں مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حکومتی امور میں شریک کر لیا تا کہ ان کی توجہ دوسری طرف نہ ہو سکے۔

2۔ باغیوں میں سے ایک طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو اپنی اصل میں مخلص تھے لیکن محض حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب جھوٹے خطوط سے متاثر ہو کر باغیوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ انہی لوگوں کی وجہ سے باغی لیڈر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حد تک دبتے تھے اور ان سے اپنی ہر بات نہ منوا سکتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ اس طبقے کو باغیوں سے الگ کر لیا جائے۔

3۔ ایک طرف باغیوں کو مصروف کر دیا جائے اور دوسری طرف حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے خاموشی سے نکل جائیں اور دیگر علاقوں بالخصوص بصرہ اور کوفہ کی چھاؤنیوں میں موجود منتشر افواج کو منظم کریں تا کہ ان باغیوں پر فیصلہ کن ضرب لگائی جا سکے۔

4۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باغیوں کو اکٹھا کر کے مخلص مسلمانوں کی افواج کے مقابلے میں لے آئیں۔

5۔ مسلمانوں کی افواج متحد ہو کر خود کو اتحاد کی اس صورت پر لے آئیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے قائم تھا اور حکومت کی رٹ کو قائم کیا جائے۔

6۔ اس کے بعد باغیوں کی بیخ کنی کی جائے۔ قاتلین کو قصاص میں قتل کیا جائے اور بقیہ لوگوں کو مناسب سزائیں دی جائیں۔

آپ نے اس معاملے میں اتنی راز داری سے کام لیا کہ اپنے قریبی مخلص ساتھیوں اور بیٹوں ابن عباس اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی ہوا نہ لگنے دی کہ کہیں ان کے اطمینان کو دیکھ کر باغی ہوشیار نہ ہو جائیں۔ ممکن ہے کہ قارئین کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پلان کا یہ جزو ماننے میں تردد ہو لیکن طبری کی روایت کے مطابق آگے چل کر جب باغیوں کو اس منصوبے کا علم ہوا تو ان کی اپنی زبان سے اس منصوبے کی تفصیلات آشکار ہو گئیں۔ یہاں ہم ان روایات کا حصے پیش کر رہے ہیں جس میں مالک الاشتر کی زبانی حضرت علی کے منصوبے کی تفصیل بیان ہوئی ہے:

> (جنگ جمل سے پہلے) مالک اشتر نخعی نے کہا: طلحہ و زبیر کے ارادوں سے تو ہم خوب واقف تھے، لیکن **<u>علی کے ارادوں سے آج تک واقف نہ ہو سکے۔</u>** واللہ! ان سب کی رائے ہمارے بارے میں ایک ہی ہے۔ اگر زبیر، طلحہ اور علی نے صلح کر لی تو وہ ہمارے خون پر ہو گی۔ آؤ! کیوں نہ ہم علی

پر حملہ کر کے اسے عثمان کے پاس پہنچا دیں۔ اس سے ایک نیا فتنہ پیدا ہو گا جو ہماری مرضی کے عین مطابق ہو گا اور ہم اس میں سکون سے ٹائم پاس کر لیں گے۔[8]

(جنگ جمل کے بعد مالک الاشتر نے کہا:) "کیا اسی لیے ہم نے اس بڈھے (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کو قتل کیا تھا کہ یمن عبید اللہ بن عباس کو ملے، حجاز قثم بن عباس کو، بصرہ عبد اللہ بن عباس کو اور کوفہ علی خود لے لیں؟"[9]

اشتر کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منصوبہ کیا تھا؟

حضرت علی کے خلیفہ بنتے ہی کیا واقعات پیش آئے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے سامعین میں باغی بھی شامل تھے۔ اس میں آپ نے خاص کر باغیوں کے اس طبقے کو اپیل کرنے کی کوشش کی، جو اپنی اصل میں مخلص تھے لیکن محض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام پر کیے گئے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر باغیوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ آپ نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے اور بغاوت کا ارتکاب کر کے کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

اللہ عزوجل نے ایسی کتاب نازل فرمائی جو لوگوں کو ہدایت دینے والی ہے۔ اس کتاب میں ہر قسم کے خیر و شر کو بیان فرمایا: اب آپ لوگوں کو چاہیے کہ آپ خیر کو قبول کریں اور برائی کو چھوڑ دیں۔ اللہ سبحانہ و تعالی کے فرائض کو ادا کیجیے، وہ آپ کو جنت میں داخل فرمائے گا۔ اللہ تعالی نے بہت سے امور حرام فرمائے ہیں جو قطعاً ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ **تمام حرام کاموں سے بڑھ کر مسلمانوں کا خون حرام فرمایا ہے** (اشارہ ہے قتل عثمانی کی طرف) اور اس نے **مسلمانوں کے ساتھ خلوص اور متحد رہنے کا حکم دیا ہے۔ مسلم وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دیگر لوگ محفوظ رہیں،** سوائے اس صورت کے کہ اللہ تعالی ہی نے اسے سزا دینے کا حکم دیا ہو۔

آپ لوگ موت آنے سے پہلے ہی عام اور خاص احکام سبھی پر عمل کر لیجیے کیونکہ لوگ تو آپ کے سامنے موجود ہیں اور موت آپ کو گھیرتی چلی آ رہی ہے۔ گناہوں سے ہلکے ہو کر موت سے ملاقات کیجیے۔ لوگ تو ایک دوسرے کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں، **آپ لوگ اللہ کے بندوں اور اس کے شہروں کی بربادی کے معاملے میں اللہ سے ڈریے** کیونکہ آپ سے اس کا ضرور سوال کیا جائے گا۔ حتی کہ چوپایوں اور گھاس پھونس کے بارے میں آپ سے پوچھا جائے گا۔ اللہ کی اطاعت کیجیے، اس کی نافرمانی سے بچیے اور جو بھی خیر آپ کو نظر آئے، اسے قبول کیجیے۔ جو برائی بھی آپ کو نظر آئے، اسے چھوڑ دیجیے اور اس وقت کو یاد کیجیے جب آپ لوگ تھوڑی تعداد میں تھے اور زمین پر کمزور تھے۔"[10]

شقی القلب باغیوں پر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس بلیغ خطبے کا کیا اثر ہونا تھا لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سادہ لوح عناصر اس

[8] ایضاً۔ 3/2-108

[9] ایضاً۔ 3/2-107

[10] ایضاً۔ 3/2-28

خطبے سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ آپ نے دیہاتی لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں میں واپس جانے کا حکم دیا جسے انہوں نے قبول کیا تاہم سرکش باغیوں نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ باغیوں میں کچھ لوگوں کے غلام بھی شریک تھے۔ حضرت علی نے اعلان فرمایا کہ جو غلام اپنے مالک کے پاس واپس نہ جائے گا، ہم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ اعلان باغی لیڈروں کو بہت برا لگا کیونکہ انہیں نظر آ رہا تھا کہ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی قوت کو پارہ پارہ کرنے لگے ہیں۔[11] اس موقع پر بعض صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

"علی! ہم نے آپ کی بیعت اسی شرط پر کی تھی کہ آپ حدود اللہ کو قائم رکھیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ باغیوں کا یہ پورا گروہ قتل عثمان میں شریک ہے اور اس طرح انہوں نے مسلمانوں کے خون کو حلال کر لیا ہے۔ اس لیے آپ پر ان سب لوگوں سے قصاص لینا فرض ہے۔" حضرت علی نے جواب دیا: "میرے بھائیو! میں آپ کی طرح ان امور سے ناواقف نہیں ہوں لیکن ہم اس قوم کا کیا کر سکتے ہیں جو ہماری مالک بنی ہوئی ہے۔ ہم ان کے مالک نہیں اور پھر اس قتل میں آپ لوگوں کے (بعض) غلام بھی شریک ہو گئے ہیں اور ان کے ساتھ کچھ دیہاتی بھی مل گئے ہیں اور وہ آپ کے دوست ہیں اور جس بات پر چاہتے ہیں، آپ کو مجبور کر دیتے ہیں۔ تو کیا ان حالات میں آپ لوگ بھی قصاص لینے کی طاقت رکھتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا: "نہیں۔"

حضرت علی نے فرمایا: "واللہ! آپ جو دیکھ رہے ہیں، میں بھی وہی دیکھ رہا ہوں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حالات بعینہ زمانہ جاہلیت کے حالات ہیں اور اس قوم (باغیوں) میں ابھی جاہلیت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کی کوئی ایک معینہ راہ اور طریقہ نہیں ہے کہ جو اس طریقہ پر چل کر ہمیشہ زمین کو خوش رکھے (یعنی شیطان ہمیشہ نئی چالیں چلتا ہے۔) لوگ خلافت کے معاملے میں کئی قسم کے ہو چکے ہیں۔ ایک طبقہ کی وہی رائے ہے جو آپ کی ہے۔ دوسرے طبقے کی رائے آپ کے خلاف ہے اور ایک طبقہ نہ اس رائے کا حامی ہے اور نہ اس رائے کا۔ جب تک لوگ ایک رائے پر جمع نہ ہو جائیں اور دل درست نہ ہو جائیں، اس وقت تک قصاص ممکن نہیں ہے۔ اب آپ میرے پاس سے جائیے اور یہ دیکھیے کہ کیا نئے حالات پیش آتے ہیں۔ ان حالات کا مطالعہ کر کے میرے پاس واپس آئیے۔"[12]

اس بات سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پلان سامنے آتا ہے کہ پہلے اپنی طاقت کو اچھی طرح اکٹھا کر لیا جائے اور پھر ایک ہی مرتبہ ان باغیوں پر فیصلہ کن ضرب لگائی جائے۔

اب صورتحال یہ ہو گئی کہ باغیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطرہ محسوس ہونے لگا چنانچہ انہوں نے آپ کے گرد گھیرا ڈال دیا اور آپ کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ آپ کھل کر اپنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ منصوبہ بندی کر سکیں۔ جب قریشی لوگوں نے یہ دیکھا کہ اب مدینہ پر عملاً باغیوں ہی کی حکومت ہے، تو انہوں نے وہاں سے نکلنا شروع کر دیا۔ بنو امیہ کے لوگ شام کی طرف چلے گئے کیونکہ یہی وہ

[11] ایضاً۔ 3/2-31

[12] ایضاً۔ 3/2-30

لوگ تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بچانے کے لیے باغیوں سے جنگ بھی کی تھی۔ اس وجہ سے انہیں یہ خطرہ تھا کہ باغی سب سے پہلے انہی کو قتل کریں گے۔ کثیر تعداد میں لوگ شام کی طرف چلے گئے اور بعض مکہ، بصرہ اور کوفہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخلص ساتھی بہت کم ہو گئے اور ان کی فوج اور سول ایڈمنسٹریشن پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ اس طرح سے باغیوں کی سرکوبی کا معاملہ موخر ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر کوئی بھی خلیفہ ہوتا، حالات یہی ہوتا تھے۔

کیا حضرت علی نے خلیفہ بنتے ہی گورنروں کو معزول کر دیا؟

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ باغیوں کے مشن کے متعدد مرحلے تھے، جن کی تفصیل ہم ایک بار پھر بیان کرتے ہیں:

- پہلا مرحلہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہٹا کر کسی کٹھ پتلی خلیفہ کو مسند اقتدار پر بٹھانا اور اس کے پردے میں خود اقتدار پر قبضہ کرنا۔
- دوسرا مرحلہ: عہد عثمانی کے طاقتور گورنروں کو ہٹا کر کمزور لوگوں کی تقرری اور ان کے پردے میں صوبوں پر خود حکومت کرنا۔
- تیسرا مرحلہ: عالم اسلام کے اقتدار اور دولت پر مکمل کنٹرول۔
- چوتھا مرحلہ: اسلام کے فروغ کے اس عمل کو ریورس کرنا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع فرمایا تھا اور جسے پہلے تین خلفاء نے اپنے عروج پر پہنچا دیا تھا۔ یہ مرحلہ باغیوں کے اس گروپ کے منصوبے کا حصہ تھا، جس کی قیادت عبداللہ بن سبا کے ہاتھ میں تھی۔

یہ درست ہے کہ باغیوں کو پہلے مرحلے میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن یہ بھی جزوی کامیابی تھی۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن ان کی جگہ کسی کٹھ پتلی خلیفہ کو مسند اقتدار پر نہ بٹھا سکے۔ ان کی بدقسمتی کہیے یا مسلمانوں کی خوش قسمتی کہ جس ہستی کا نام استعمال کر کے انہوں نے تحریک اٹھائی تھی، وہ حکمت و دانش میں ان باغیوں سے بہت بلند تھی۔ باغیوں کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے من پسند مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔ حضرت علی نے اگرچہ وقتی طور پر باغیوں کی چند باتیں مان لیں لیکن انہوں نے نہایت ہی حکمت و دانش کے ساتھ اپنا منصوبہ بنایا جسے آپ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ حضرت علی، طلحہ، زبیر، عائشہ، معاویہ، حسن اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقدامات کے باعث دوسرے ہی مرحلے پر باغیوں کو مکمل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ اگر اس مرحلے پر وہ کامیاب ہو جاتے تو پھر وہ عالم اسلام کے تمام وسائل پر قابض ہو جاتے۔ پھر وہ وسائل، جو عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ ہو رہے تھے، ان باغیوں کے قبضے میں آ جاتے جنہیں وہ اپنے مفادات میں استعمال کرتے۔ ان کے اسلام دشمن عناصر نئی نئی بدعات نکالتے اور دین کا نجانے کیا حشر کرتے۔

بہر حال باغیوں کا مرکزی اقتدار پر جب قبضہ ہو گیا تو گویا یہ ان کے مشن کے پہلے مرحلے کی کامیابی تھی۔ اب انہوں نے اپنے منصوبے کے فیز ٹو کا آغاز کیا۔ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ بصرہ، کوفہ، شام، یمن اور مصر کے مضبوط گورنر تھے جن سے وہ خائف تھے۔ ان کا منصوبہ یہی تھا کہ ان کی جگہ کمزور گورنر مقرر کیے جائیں اور بالکل مرکز کے ماڈل کی طرح باغیوں کا ایک گروہ سائے کی طرح ان کے ساتھ رہے اور ان کے پردے میں حکومت کرتا رہے۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کیا کہ وہ گورنروں کی تبدیلی کا فرمان جاری کریں۔ چنانچہ 36 ہجری کی ابتدا میں (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلافت سنبھالنے کے چند ہی دن بعد ہی کہ 18 ذوالحجہ 35 کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے) بصرہ، کوفہ، یمن، مصر اور شام کے گورنروں کی معزولی کا فرمان جاری ہوا اور ان کی جگہ عثمان بن حنیف کو بصرہ، عمارہ بن شہاب کو کوفہ، عبید اللہ بن عباس کو یمن، قیس بن سعد بن عبادہ کو مصر اور سہل بن حنیف رضی اللہ عنہم کو شام کا گورنر مقرر کیا گیا۔[13]

ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی معمولی سی کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک چیف ایگزیکٹو آفیسر (CEO) چارج لیتے ہی سب سے پہلے ڈیپارٹمنٹ ہیڈز اور منیجرز کو فارغ کر کے ان کی جگہ اور لوگوں کو متعین کرے۔ اگر کوئی CEO ایسی غلطی سے ایسا کر بھی گزرے تو اگلے دن ہی کمپنی کا بیڑا غرق ہو جائے گا اور معاملات کسی کے قابو میں بھی نہ آئیں گے۔ یہاں پر تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معمولی سی کمپنی کا یہ حال ہے تو بلوچستان سے لے کر لیبیا تک پھیلی ہوئی سلطنت کے پیچیدہ معاملات کے بارے میں کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے صاحب تدبر اور صاحب حکمت سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلے سابقہ گورنروں کی معزولی کا کام کیا ہو گا؟

جس شخص میں ذرہ برابر بھی عقل ہے، وہ جان سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو کیا، کسی معمولی سے CEO سے بھی ایسی توقع نہیں کی جاسکتی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گورنروں کو ان کے عہدے تمام صحابہ کے مشورے ہی سے دیے تھے اور ان تمام گورنروں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے تھے جس کی تفصیل ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ شہادت سے کچھ عرصہ پہلے باغیوں کی شکایات پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غیر جانبدار آدمیوں کے ذریعے ان کے خلاف انکوائری کروائی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ یہ تمام گورنر بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں اور سوائے ان چند باغیوں کے، عوام الناس ان سے پوری طرح مطمئن ہیں بلکہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان حالات میں ان گورنروں کے معزول کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ہاں باغیوں کے پاس اس بات کا زبردست جواز موجود تھا کہ ان کے عزائم کی تکمیل میں یہی گورنر سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان کی تبدیلی کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وقت حاصل کرنے کے لیے ان باغیوں کی بات مجبوراً مان لی لیکن اس میں بھی انہیں اپنی من مانی کا موقع نہیں دیا بلکہ انہی لوگوں کو گورنر مقرر کیا جن پر مسلمانوں کو مکمل اعتماد تھا۔

[13] ایضاً۔ 3/2-37

طبری اور بلاذری نے محمد بن عمر الواقدی کی بیان کردہ ایک طویل روایت نقل کی ہے، جس کے مطابق حضرت مغیرہ بن شعبہ اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے حضرت علی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان گورنروں، خاص کر حضرت معاویہ کو اپنے عہدوں پر برقرار رکھیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ تو ان گورنروں سے معاذ اللہ ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ انہیں ایک دن عہدے پر برداشت نہ کر پا رہے تھے۔ اس روایت کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اسے بیان کرنے والے یہی واقدی صاحب ہیں جن کا جھوٹ معروف ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان گورنروں کو پسند نہ کرتے ہوتے تو ان کی تقرری کے وقت حضرت عمر یا عثمان رضی اللہ عنہما کو روکتے تو سہی لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے پہلے کبھی ان حضرات سے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہو۔

گورنروں کی تبدیلی کی یہ مہم کلی طور پر کامیاب نہ ہو سکی اور سیف بن عمر کی روایت کے مطابق صورتحال کچھ یوں ہوئی:

- شام میں سہل بن حنیف اور کوفہ میں عمارہ بن شہاب رضی اللہ عنہما کو داخل ہی نہ ہونے دیا گیا البتہ کوفہ کے اس وقت کے گورنر ابو موسی اشعری نے حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔
- بصرہ میں عثمان بن حنیف اور یمن میں عبید اللہ بن عباس نے چارج سنبھال لیا۔ بصرہ کے سابق گورنر عبد اللہ بن عامر اور یمن کے گورنر یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہم اپنے اہل و عیال اور مال و متاع کو لے کر مکہ چلے آئے۔
- مصر جو کہ بغاوت کا گڑھ تھا، میں قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کسی نہ کسی طرح داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہاں انہیں تین گروہوں سے سابقہ پڑا: ایک گروہ قصاص عثمان کا مطالبہ لے کر الگ ہو گیا۔ دوسرے گروہ نے اطاعت قبول کر لی اور تیسرا گروہ انہی باغیوں کا تھا جن کا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے بھائیوں (یعنی مدینہ پر حملہ آور باغیوں) کو سزا نہ دی جائے تو ہم اطاعت بول کریں گے۔
- بقیہ مقامات پر گورنروں نے چارج سنبھال لیا۔

اب عالم اسلام میں چار گروہ ہو چکے تھے: پہلا گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلص متبعین کا تھا۔ دوسرا گروہ اس بات کا مطالبہ کر رہا تھا کہ پہلے باغیوں کو سزا دی جائے۔ تیسرا گروہ وہ تھا جسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کریں اور پہلے دو گروہوں میں سے کس کا ساتھ دیں، یہ غیر جانبدار لوگ ہوئے اور ان میں سعد بن ابی وقاص، عبد اللہ بن عمر، اسامہ بن زید اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ تھے۔ چوتھا گروہ انہی باغیوں کا تھا جو اب اپنی بقا کی جنگ لڑنے میں مشغول تھا۔

سیف بن عمر کی روایت کے مطابق اب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے گورنر ابو موسی اشعری اور شام کے گورنر معاویہ رضی اللہ عنہما کے پاس خطوط بھیجے جس میں ان سے بیعت کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابو موسی اشعری نے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا لیکن حضرت معاویہ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ بنو عبس کے ایک شخص کو بطور قاصد کو حضرت علی کے پاس بھیجا جس نے آپ کو آ کر بتایا کہ میں اپنے

پیچھے ایسی قوم کو چھوڑ کر آیا ہوں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے سوا کسی اور بات پر راضی نہیں ہے اور ساٹھ ہزار بزرگ حضرت عثمان کی خون آلود قمیص کو دیکھ کر رو رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "

آپ لوگ مجھ سے قصاص عثمان طلب کر رہے ہیں۔ اے اللہ! میں خون عثمان سے اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ واللہ! اب قاتلین عثمان بچ جائیں گے سوائے اس کے کہ جسے اللہ چاہے تو مار دے کیونکہ جب وہ کسی امر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کر گزرتا ہے۔"[14]

باغیوں کو جب اس قاصد کی اطلاع ملی تو وہ اسے مارنے دوڑے اور اسے گالیاں دیں۔ اس نے بھی جواباً ان باغیوں کو برا بھلا کہا۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ روایت میں درج نہیں ہے۔ لگتا یہی ہے کہ صحابہ کرام نے اس قاصد کو بچا لیا ہو گا ورنہ اس کے قتل کا ذکر ہوتا۔ مشہور راوی سیف بن عمر، جنہیں کذاب کہا جاتا ہے، کی روایت کے مطابق اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شام پر لشکر کشی کا اعلان کر دیا جس کا اہل مدینہ نے سرد مہری سے جواب دیا اور کوئی شخص جانے پر تیار نہ ہوا۔ روایت میں لشکر کشی والی بات درست لگتی ہے لیکن حضرت علی نے ایسا کیا ہو گا، یہ بات معقول نہیں ہے۔ یقیناً یہ سیف بن عمر یا کسی اور راوی کی کارستانی ہے کہ اس نے باغیوں کی کاروائی کو حضرت علی سے منسوب کر دیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوزیشن کو سمجھنے کے لیے ہمیں خود کو آپ کی جگہ رکھ کر سوچنا چاہیے۔ ایک جانب وہ باغی تھے جو کسی بھی طرح اسلام سے مخلص نہیں تھے، خلیفہ وقت کو شہید کر چکے تھے اور اب اقتدار پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے تھے تاکہ دولت سمیٹیں اور مسلمانوں میں فتنے پیدا کریں۔ دوسری طرف اہل شام تھے جنہوں نے اب تک مخلص مسلمان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے بھی انکار نہیں کیا تھا بلکہ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ ان باغیوں کو اقتدار سے الگ کر کے ان سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ناحق خون کا حساب لیا جائے؟ شام کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اب تک خلفائے راشدین کے مقرر کردہ گورنروں میں سب سے بہترین پرفارمنس دکھائی تھی اور رومن ایمپائر کو نکیل ڈال کر رکھی ہوئی تھی۔

آپ خود غور فرمائیے کہ اس صورتحال میں اگر آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ ہوتے تو آپ کی ہمدردی کس طرف ہوتی؟ باغیوں کی جانب یا اہل شام کی طرف؟ زیادہ اہم بات کیا تھی: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل باغیوں پر قابو پانا یا پھر شام پر لشکر کشی کرنا؟ ایک فوجی جرنیل تو کیا عام آدمی بھی اس کا جواب یہی دے گا کہ جب ایک محاذ پہلے سے کھلا ہو اور وہاں پوزیشن ابھی مستحکم نہ ہوئی ہو، اس وقت تک نیا محاذ کھولنا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر بھی یہی تھا۔ اس بات کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن کے مطابق جنگ صفین سے واپسی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغیوں کو قائل کیا کہ وہ حضرت معاویہ کی گورنری کو تسلیم کر لیں۔ آپ نے فرمایا:

معاویہ کی امارت کو ناپسند نہ کیجیے۔ اللہ کی قسم، اگر وہ نہ رہے تو آپ دیکھیں گے کہ سر، شانوں سے اس طرح جدا ہو کر گریں گے جیسا کہ حنظل کا

[14] ایضاً۔ 3/2-40

پھل گرتا ہے۔[15]

ابن عساکر نے اس روایت کی پانچ اسناد بیان کی ہیں۔ حضرت علی کا یہ فرمان اس وقت سے متعلق ہے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے جنگ ہو چکی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ جنگ سے پہلے بھی حضرت علی کے دل میں حضرت معاویہ سے متعلق کوئی بغض موجود نہ تھا اور آپ انہیں ہرگز ان کے عہدے سے ہٹانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ باغی تھے، جنہوں نے آپ کو اس عہدے سے ہٹانے کی کوشش کی کیونکہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حضرت معاویہ ہی تھے۔

اگر ہم باغیوں کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو واضح نظر آتا ہے کہ شام کی لشکر کشی بہت اہم تھی تاکہ ان کے منصوبہ کا دوسرا مرحلہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ اہل شام، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں متحد تھے اور باغیوں کے کسی بھی منصوبے کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ اس وجہ سے باغیوں نے شام کی طرف لشکر کشی کی اور اپنے پرانے طریقے کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام جی بھر کر استعمال کیا۔ اہل مدینہ نے ان باغیوں کے کسی بھی منصوبے کا سرد مہری ہی سے جواب دیا تھا چنانچہ ان کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا اور شام کی جانب کوئی لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ اسی دوران یہ اطلاعات ملیں کہ بصرہ میں حضرت طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم نے ایک لشکر اکٹھا کر لیا ہے اور انہوں نے وہاں کی باغی جماعت کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باغیوں کے لے کر مدینہ سے نکلے اور کچھ ہی عرصے میں وہ سانحہ پیش آیا جو کہ جنگ جمل کہلاتا ہے۔

جنگ جمل

طبری اور بلاذری نے جنگ جمل کے جو واقعات بیان کیے ہیں، ان کا بڑا حصہ ابو مخنف، ہشام کلبی، سیف بن عمر اور محمد بن عمر الواقدی کا بیان کردہ ہے۔ خاص کر جن روایات میں سیدہ عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم سے متعلق کوئی منفی بات پائی جاتی ہے، ان کا راوی یا تو ابو مخنف ہے یا پھر ہشام کلبی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان مشہور کذابین نے ان واقعات میں اپنی جانب سے کچھ نہ کچھ ملا دیا ہے اور ان صحابہ کی کردار کشی کی کوشش کی ہے۔ تاہم بہت سی باتیں درست بھی معلوم ہوتی ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ گھڑی ہوئی باتوں کو الگ کر کے قابل اعتماد اور معقول باتوں کو پیش کریں۔

باغیوں کے خلاف جوابی تحریک کیسے پیدا ہوئی؟

واقدی کی روایت کے مطابق جب گورنروں کی تبدیلی کی مہم جزوی طور پر ناکام رہی تو حضرت علی نے طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان سے کہا: "اے قوم! جس بات سے میں آپ کو خبردار کرتا تھا، آج وہ پیش آ چکی ہے اور حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ انہیں ختم

[15] ابن عساکر۔ 59/151-152۔ ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغۃ۔ 12/40

کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ آگ کی طرح ایک فتنہ ہے کہ جب آگ ایک بار لگ جاتی ہے تو وہ بڑھتی اور بھڑکتی چلی جاتی ہے۔" حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے جواب میں کہا: "آپ ہمیں مدینہ سے باہر جانے کی اجازت دیجیے تاکہ ہم اس کی کوئی تدبیر کریں ورنہ آپ ہمیں (یہاں سے) جانے دیجیے۔" آپ نے فرمایا: "مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا، میں ان حالات کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا، اور جب کوئی بھی تدبیر باقی نہ رہے گی تو آخری دوا داغ لگانا ہی ہوتی ہے کہ انسان تکلیف سے نجات پانے کے لیے اپنے جسم کو جلوانا بھی گوارا کر لیتا ہے۔" اس کے کچھ دن بعد حضرت علی نے طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو مدینہ سے جانے کی اجازت دے دی۔[16]

یہاں پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ان تینوں حضرات نے مل کر باغیوں سے نجات کا وہ منصوبہ تیار کیا ہو گا جس کی تفصیلات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جا کر مسلم افواج کو منظم کریں۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ باغیوں کو مصروف کر دیں تاکہ یہ اہل مدینہ کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اس کے بعد حضرت علی انہیں لے کر طلحہ و زبیر کی افواج کے مقابلے میں لے آئیں اور وہاں مخلص مسلمانوں کی افواج متحد ہو جائیں اور مل کر ان باغیوں کی سرکوبی کریں۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات ہماری اس بات پر اعتراض کریں اور یہ کہیں کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر جب حضرت علی اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے لشکر ملے تھے، تو ان میں سفارت کاری کیوں کی گئی تھی؟ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ بعض امور اس پلان سے ہٹ کر ہو گئے جیسے بصرہ میں باغیوں کے ساتھ جنگ۔ اس وجہ سے ضرورت اس امر کی تھی کہ حضرت علی، طلحہ اور زبیر ایک بار پھر نئے حالات کے تحت معاہدہ کریں۔ اس مقصد کے لیے یہ سفارت کاری کی گئی۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں صحابہ کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما وہاں سے چل کر مکہ آئے، جہاں امہات المومنین رضی اللہ عنہن موجود تھیں۔ حجاج میں سے بھی بہت سے لوگ یہیں مقیم تھے اور یمن کے سابق گورنر یعلی بن امیہ اور بصرہ کے سابق گورنر سعید بن عامر رضی اللہ عنہما بھی یہیں تھے۔ ان حضرات نے صورتحال کا تجزیہ کیا اور پھر مل کر یہ طے کیا کہ بصرہ کا رخ کیا جائے جو کہ اہم ترین چھاؤنی تھی۔ سعید بن عامر یہاں کے معاملات سے بخوبی واقف تھے کیونکہ وہ بھی چند دن پہلے ہی وہاں سے آئے تھے۔ یمن کے سابق گورنر یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ تھے اور انہوں ہی نے سواریوں وغیرہ کا انتظام کیا۔ مکہ اور اس کے گرد و نواح سے بہت سے نوجوان ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور یہ لشکر بصرہ کی جانب چل پڑا۔ دیگر امہات المومنین بھی ذات عرق کے مقام تک اس لشکر کے ساتھ گئیں اور وہاں پر لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے اتنا روئے کہ اس دن کا نام ہی "آنسوؤں کا دن" مشہور ہو گیا۔[17]

دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بصرہ کی جانب کوچ کا اعلان کیا۔ طبری نے واقدی کے حوالے سے اس موقع پر بعض

---

[16] طبری۔ 3/2-39 to 41

[17] ایضاً۔ 36H/3/2-62

ایسی روایتیں بیان کی ہیں جن میں اہل مدینہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے لشکر کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی لیکن تمام اہل مدینہ نے اس معاملے میں دلچسپی ظاہر نہ کی۔ ان روایات سے متعلق دو امکانات موجود ہیں: ایک امکان تو یہ ہے کہ یہ کسی کذاب راوی کی کارستانی ہے کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ میں اپنے الفاظ ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے ایسا کیا ہو کیونکہ آپ کا پلان یہی تھا کہ باغیوں کو مدینہ سے نکال کر مخلص مسلمانوں کے لشکروں کے سامنے لا ڈالا جائے تا کہ وہ ان کا تیا پانچہ کر سکیں۔

سیف بن عمر نے کچھ روایات نقل کی ہیں جن کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلص ساتھیوں نے آپ کو ہر ممکن قائل کرنے کی کوشش کی کہ آپ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مقابلے کے لیے نہ نکلیں۔ ان میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور کہا: "امیر المومنین! مدینہ سے باہر نہ جائیے۔ اگر آپ مدینہ چھوڑ کر چلے گئے تو کبھی یہاں واپس نہ آ سکیں گے اور نہ کبھی یہ دار الحکومت بن سکے گا۔" باغی پارٹی کے لیڈروں نے انہیں گالیاں دیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں بچایا اور فرمایا: "انہیں کچھ نہ کہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے بہترین آدمی ہیں۔"[18] اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روکنے کی ممکنہ حد تک کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ راوی چونکہ سیف بن عمر ہے، اس وجہ سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ روایتیں کس حد تک درست ہیں۔ البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ روایتیں قرین قیاس ضرور ہیں اور کوئی بھی مخلص ساتھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پلان کو نہ جانتا ہو، انہیں ضرور یہ مشورہ دے گا۔

حضرات طلحہ و زبیر کا اقتدار بصرہ پر کیسے قائم ہوا؟

سیف بن عمر کے مطابق جب حضرات طلحہ و زبیر کا لشکر بصرہ کے قریب پہنچا تو انہوں نے شہر سے باہر پڑاؤ ڈالا اور شہر کے بااثر لوگوں کے ساتھ خط و کتابت شروع کی۔ بصرہ کے گورنر اب حضرت عثمان بن حنیف تھے جو کہ ایک جلیل القدر صحابی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں یہاں مقرر کیا تھا۔ ان کے ساتھ حکیم بن جبلہ کی قیادت میں باغیوں کا ایک گروہ بھی موجود تھا اور عملاً اسی گروہ کی حکومت تھی۔ گورنر بصرہ نے مشہور صحابی عمران بن حصین اور ابو الاسود الدؤلی کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجا تا کہ ان کا مقصد معلوم کیا جا سکے۔ آپ نے ان حضرات کو اپنا مقصد اس طرح بیان فرمایا:

> مجھ جیسی عورت کسی مخفی کام کے لیے سفر نہیں کر سکتی اور نہ اولاد سے کوئی بات چھپائی جا سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ مختلف علاقوں کے شور مچانے والوں اور قبائل کے جھگڑالو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں قتل و قتال کیا اور اس میں فتنے اٹھائے اور بدعتیں ایجاد کیں اور فتنہ گروں کو حرم رسول میں پناہ دی اور اس طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت کے مستحق ہوئے۔ انہوں نے بغیر کسی جرم

---

[18] ایضاً۔ 3/2-55

کے مسلمانوں کے امام کو قتل کر دیا اور اس طرح ایک حرام خون کو حلال سمجھ کر بہایا۔ انہوں نے وہ مال لوٹ لیا جس کا لینا حرام تھا اور انہوں نے حرمت والے شہر (مدینہ) اور حرمت والے مہینے (ذوالحجہ اور محرم) کی حرمت کا بھی پاس نہ کیا۔ لوگوں کی عزتیں اچھالیں اور انہیں جسمانی تکالیف پہنچائیں اور ان لوگوں کے شہر اور گھروں میں آ کر ٹھہر گئے جنہیں ان کا ٹھہرنا پسند نہ تھا۔ ان لوگوں نے سوائے نقصان کے اور کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور نہ ہی ان کے دلوں میں خدا کا خوف تھا۔ (مدینہ کے) جن لوگوں کے پاس یہ جا کر ٹھہرے، ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ انہیں روک سکتے کیونکہ انہیں خود اپنی جان کا خوف تھا۔ میں نے یہ سفر اس لیے کیا ہے تمام مسلمانوں کو بتادوں کہ یہ پارٹی کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہے اور عوام ان کے باعث کس مصیبت میں مبتلا ہیں اور اب ان کا اصلاح پانا ممکن نہیں ہے۔

(اس کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ آیت پڑھی۔) لا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلاَّ مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلاحٍ بَيْنَ النَّاسِ "ان کے اکثر خفیہ مشوروں میں کوئی بھلائی نہیں، صرف اس شخص کے جو صدقہ اور لوگوں کی اصلاح کے لیے مشورہ کرے۔" (النساء 4:114) ہم اس اصلاح کی خاطر میدان میں نکلے ہیں جس کا اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چھوٹے بڑے اور مرد و عورت کو حکم دیا ہے۔ ہم اس لیے آئے ہیں کہ لوگوں کو نیکی کی تلقین کریں، اس کی حفاظت کریں اور برائی سے انہیں روکیں اور دنیا سے برائی کو ختم کریں۔"[19]

سیدہ سے بات کر کے یہ قاصد، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے ان کی آمد کی وجہ دریافت کی۔

انہوں نے جواب دیا: "ہم عثمان کے قصاص کے مطالبے کے لیے آئے ہیں۔" قاصدین نے پوچھا: "کیا آپ علی کی بیعت نہیں کر چکے؟" انہوں نے جواب دیا: "علی سے ہمارا کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہی میں ان کی بیعت توڑنا چاہتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے اور ان قاتلوں کے درمیان نہ آئیں۔"

قاصد حضرت عثمان بن حنیف کے پاس پہنچے جو کہ حضرت علی کی جانب سے اب بصرہ کے گورنر تھے۔ ابو الاسود (جو غالباً باغی پارٹی کا حصہ تھا) نے انہیں حضرت طلحہ و زبیر کے خلاف جنگ کرنے پر اکسایا لیکن حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہم) نے انہیں اس سے منع کر کے گھر بیٹھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عثمان بن حنیف نے لوگوں کو جامع مسجد میں اکٹھا کیا اور تمام پارٹیوں کو گفتگو کا پورا موقع دیا۔ اس موقع پر باغیوں کے ایک کوفی لیڈر قیس بن عقدیہ حمسی نے تقریر کر کے حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سے جنگ کرنے پر لوگوں کو ابھارا۔ اہل بصرہ کے ایک لیڈر اسود بن سریع السعدی نے ان حضرات کی حمایت کے لیے لوگوں کو ترغیب دی۔ اس طرح سے اہل بصرہ میں سے مخلص لوگ الگ ہو کر حضرت طلحہ وزبیر سے آ ملے اور باغی پارٹی تنہا ہو کر رہ گئی۔ اہل بصرہ کے مخلصین کے ساتھ باغی پارٹیوں کے کچھ لوگ بھی آ کر ان حضرات کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے تقریریں کیں۔ حضرت طلحہ کی تقریر کا متن یہ ہے:

[19] ایضاً۔ 3/2-65

اس قصاص میں اللہ عزوجل کے دین اور اس کے حکم کا وقار ہے۔ کیونکہ خلیفہ مظلوم کے خون کا قصاص طلب کرنا اللہ کے احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اگر آپ لوگ قصاص طلب کریں گے تو صحیح راہ پر چلیں گے اور آپ کی خلافت (جو باہمی مشورے سے چلتی ہے) آپ ہی کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ اگر آپ اس قصاص کو چھوڑ دیں گے تو نہ کوئی حکومت قائم رہ سکے گی اور نہ کوئی نظام چل سکے گا۔"[20]

سیدہ عائشہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما کی ان تقریروں سے واضح ہے کہ ان کا مقصد کیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اس موقع پر یہ صحابہ ان باغیوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار نہ بنتے تو یہ رسم چل نکلتی کہ جس کا جی چاہتا، ایک جتھہ بناتا اور خلیفہ کو قتل کر کے اقتدار اور بیت المال پر خود قابض ہو جاتا۔ اس طرح اس شورائی نظام (Participative Government) کا خاتمہ ہو جاتا جس میں ہر شخص کو رائے دینے کا حق تھا اور ہر شخص کو حکومتی فنڈ کا فائدہ پہنچتا تھا۔ اس موقع پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے وہ تقریر فرمائی جس سے شہادت عثمان اور باغیوں کے مقاصد اور لائحہ عمل (Strategy) کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسے ہم یہاں دوبارہ نقل کر رہے ہیں:

لوگ عثمان پر تہمتیں لگاتے تھے اور ان کے گورنروں کو مجرم قرار دیتے تھے۔ یہ لوگ مدینہ ہمارے پاس آتے اور عمال کے حالات بیان کر کے ہم سے مشورہ طلب کرتے۔ ان کی ظاہری گفتگو سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اصلاح کے طلب گار اور نیک لوگ ہیں۔ لیکن جب ہم حالات کی چھان بین کرتے تو ہمیں عثمان نہایت متقی اور ان الزامات سے بری نظر آتے۔ وہ لوگ، جو ان کی شکایات کرتے تھے، وہ تقویٰ کے بھیس میں فاجر اور کذاب نظر آتے۔ ان کا ظاہر کچھ ہوتا اور باطن کچھ اور۔ ان لوگوں نے جب اس دھوکہ اور فریب سے قوت مہیا کر لی تو مدینہ پہنچ کر عثمان کو ان کے گھر میں محصور کر لیا اور انہیں شہید کر کے ایک حرام خون کو حلال کر لیا۔ پھر انہوں نے اس مال کو لوٹا جس کا لینا حرام تھا اور بغیر کسی جواز کے مدینۃ الرسول کی بے حرمتی کی۔ وہ جس چیز کے طلب گار ہیں، وہ آپ لوگوں کے لیے مناسب نہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ قاتلین عثمان سے قصاص لیجیے اور اللہ عزوجل کے حکم کو قائم کیجیے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: أَلَمْ تَرَى إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيباً مِنْ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ. "کیا آپ ان لوگوں کو، جنہیں کتاب دی گئی تھی، نہیں دیکھتے کہ جب انہیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ کتاب اللہ کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جائے تو ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر کر اور اعراض کر کے چل دیتا ہے۔" (آل عمران 3:23)[21]

یہ تقریر سن کر اہل بصرہ کے دو گروہ واضح ہو گئے۔ اکثریت حضرات طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے جا ملی جبکہ باغی پارٹی نے بڑا شور مچایا۔ انہوں نے حضرت طلحہ و زبیر کے خلاف یہ پراپیگنڈا کیا کہ ان حضرات نے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور اب لشکر لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ دونوں حضرات، حضرت علی کی بیعت پر قائم تھے اور صرف باغیوں پر قابو پانا چاہتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر پردے سے نکلنے پر تنقید کی گئی حالانکہ آپ نے پردے کے حکم کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی بلکہ ایک اہم ملی ضرورت کے تحت اپنے محرم مردوں یعنی بھانجوں کے ساتھ سفر کیا تھا۔ انہوں نے قتل عثمان کا الزام الٹا انہی

[20] ایضاً۔ 3/2-67

[21] ایضاً۔ 3/2-68

حضرات پر عائد کرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کے جو خطوط ہمارے پاس آتے تھے، ان میں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پراپیگنڈا ہوتا تھا۔ ان حضرات نے ان خطوط سے اپنی براءت کا اظہار کیا جو باغیوں نے ان کے نام سے لکھے تھے۔[22]

باغیوں کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ان حضرات سے برگشتہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیں لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔ عام لوگوں نے ان کے پراپیگنڈا کو مسترد کر دیا۔ اب بصرہ کے باغیوں کے آگے آگ اور پیچھے کھائی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کٹ کر بصرہ میں موجود تھے جہاں کی آبادی کی اکثریت ان سے نفرت کرتی تھی۔ واضح رہے کہ یہ باغی تحریک کی ایک شاخ ہی تھی کیونکہ ان کی قوت کا بڑا حصہ مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ بالآخر انہوں نے do or die کا راستہ اختیار کیا اور حکیم بن جبلہ کی قیادت میں سیدہ کے لشکر پر حملہ کر دیا جو کہ جنگ نہ کرنا چاہتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ جنگ سے بچیں۔[23] حکیم اور اس کے ساتھی وہاں ان پر ٹوٹ پڑے۔ حکیم بن جبلہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخیاں کر رہا تھا۔ ایک شخص نے اسے ٹوکا تو حکیم نے اس کے سینے میں نیزہ مار کر اسے شہید کر دیا۔ اس کے قبیلے کی ایک خاتون نے ایسا کیا تو حکیم نے انہیں بھی شہید کر دیا۔ اب بصرہ کے بیت المال کے سامنے جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے منادی جنگ بندی کا اعلان کر رہے تھے لیکن کسی نے ان کا اعلان نہیں سنا اور انہوں نے متعدد باغیوں کو ڈھیر کر دیا۔ جب ان کی قوت ٹوٹ گئی تو اب وہ صلح کے لیے پکارنے لگے جسے سیدہ کے لشکر نے قبول کر لیا۔[24]

حضرات طلحہ و زبیر اور عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہم کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا کہ فریقین کے ایک متفقہ شخص کو مدینہ بھیجا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ حضرات طلحہ و زبیر کو باغیوں نے بیعت کے لیے مجبور کیا تھا یا انہوں نے خوشی سے بیعت کی تھی۔ اگر یہ بیعت باغیوں کے جبر سے ہوئی تھی تو عثمان بن حنیف بصرہ چھوڑ دیں گے اور اگر خوشی سے ہوئی تھی تو یہ حضرات بصرہ سے نکل جائیں گے۔ واضح رہے کہ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے خوشی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی اور انہیں اس شرط پر خلیفہ بنایا تھا کہ وہ باغیوں سے قصاص لیں۔ اس کے بعد باغیوں نے مجبور کر کے ان سے دوبارہ بیعت لی تھی تاکہ ان کی جانب سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ یہاں اشارہ اسی دوسری بیعت کی جانب تھا۔ ایک قاری قرآن اور نہایت ہی متقی و پرہیز گار شخص کعب بن سُوَر رحمہ اللہ، جو کہ عہد عثمانی میں بصرہ کے قاضی تھے، کو مدینہ بھیجا گیا جنہوں نے اہل مدینہ سے اس معاملے میں استفسار کیا۔ محفل میں باغی بھی موجود تھے جن کے خطرے کے سبب کوئی شخص نہ بولا۔ آخر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ یہ بیعت جبراً لی گئی تھی۔ باغی

---

[22] ایضاً۔ 3/2-75

[23] ایضاً۔ 3/2-69

[24] ایضاً۔ 3/2-71

انہیں مارنے کے لیے اٹھے لیکن حضرت ابو ایوب انصاری اور صہیب رضی اللہ عنہمانے انہیں بچا لیا۔ اس موقع پر حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہی بتایا کہ یہ بیعت جبراً لی گئی تھی۔[25]

کعب بن سور واپس بصرہ پہنچے تو باغیوں نے انہیں گھیر گھار کر حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما تک پہنچنے نہ دیا۔ دوسری طرف مدینہ کے باغیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک خط لکھ بھیجا جس میں لکھا تھا کہ "جماعت کی وحدت کو برقرار رکھنے اور ایک نیک کام کی خاطر زبردستی کی گئی تھی۔ اگر یہ دونوں بیعت توڑنا چاہتے ہیں تو ہمارے پاس ان کا کوئی علاج نہیں اور اگر وہ کسی اور چیز کے طالب ہیں تو ہم اس پر غور کریں گے۔"

ایک رات جب شدید سردی تھی اور آندھی چل رہی تھی، بصرہ کے باغیوں نے مسجد میں ان صحابہ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے جم کر مقابلہ کیا اور چالیس باغی مارے گئے۔ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے چند لوگوں کو بھیجا کہ وہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو بلا لائیں۔ وہاں کچھ لوگ ان پر تشدد کر رہے تھے اور انہیں لاتوں سے مار رہے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمان کی داڑھی اور بھنویں نوچ دیں۔ حضرات طلحہ و زبیر کے ساتھی انہیں لائے تو ان دونوں حضرات نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ پھر انہوں نے انہیں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا جنہوں نے انہیں ان کے مخلص ساتھیوں سمیت آزاد کر دینے کا حکم دیا۔[26]

مشہور غالی راوی ابو مخنف لوط بن یحیی، جن کا صحابہ کرام سے بغض مشہور ہے، نے یہاں بھی کوشش کی ہے کہ یہاں بھی ان حضرات کے خلاف پراپیگنڈا کیا جائے۔ ان کا دعوی ہے کہ سیدہ نے حضرت عثمان بن حنیف کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، پھر کسی کے توجہ دلانے پر معاف کر دیا حالانکہ یہ بات یہ بالکل غلط ہے۔ ان حضرات نے حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو اسی وجہ سے آزاد کیا کہ وہ ایک مخلص مسلمان اور صحابی تھے۔ ان کا کوئی تعلق ان باغیوں سے نہ تھا اور وہ اسی طرح ان باغیوں کے ہاتھوں گھرے ہوئے تھے جیسا کہ ان کے مرکزی لیڈر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد گھیرا تنگ کیے ہوئے تھے۔

حکیم بن جبلہ نے بصرہ کے بیت المال پر قبضے کی کوشش کی جسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ناکام بنا دیا۔ اگلے دن حکیم بن جبلہ اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کر کے ان صحابہ کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ بصرہ میں اب جتنے بھی باغی تھے، وہ اس لشکر میں موجود تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا: " آپ لوگ صرف انہی سے جنگ کیجیے جو آپ سے جنگ کریں اور یہ اعلان کر دیجیے کہ جو شخص قتل عثمان سے تعلق نہ رکھتا ہو، وہ ہمارے مقابلے سے ہٹ جائے کیونکہ ہماری جنگ صرف قاتلین عثمان سے ہے اور ہم کسی بھی جنگ میں پہل نہ کریں گے۔" حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بصرہ کے تمام قاتلین کو ہمارے سامنے جمع کر دیا ہے۔ اے اللہ! ان میں سے کسی کو زندہ باقی نہ چھوڑ۔ ان سے آج قصاص لے کر انہیں قتل فرما دے۔"

---

[25] ایضاً۔ 3/2-72 to 73

[26] ایضاً۔ 3/2-73

باغی تین سو کے قریب تھے۔ اب گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ حکیم بن جبلہ حضرت طلحہ کے، ذریح حضرت زبیر کے، ابن الحرش حضرت عبدالرحمن بن عتاب کے اور حرقوص بن زہیر حضرت عبدالرحمن بن حارث کے مقابلہ پر آیا۔ حکیم بن جبلہ بہادری سے لڑا اور اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی لیکن وہ پھر بھی حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے خلاف اپنے پراپیگنڈے سے باز نہ آیا۔ باغیوں کی اکثریت حکیم سمیت ماری گئی البتہ ان کا ایک لیڈر حرقوص بن زہیر اپنے ساتھیوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ حضرات طلحہ و زبیر نے اعلان کروا دیا کہ جس جس قبیلے نے جس بھی باغی کو پناہ دی ہو، اسے ہمارے پاس لایا جائے۔ لوگ ان قاتلین کو کتوں کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر لائے اور ان سب کو قتل کر دیا۔ اب حرقوص بن زہیر کے علاوہ باغیوں کے بصرہ چیپٹر میں سے کوئی شخص زندہ نہیں بچا۔

حرقوص کا تعلق اس علاقے کے ایک قبیلے بنو سعد سے تھا، اس لیے انہوں نے اسے بچا لیا۔ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے انہیں سخت برا بھلا کہا اور ان کے لیے ایک مدت مقرر کی کہ اس تاریخ تک حرقوص کو حاضر کرو۔ انہیں یہ بات سخت ناگوار گزری اور وہ ان سے الگ ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی بنو عبدالقیس اور بنو بکر بن وائل میں سے بھی باغی اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے بیت المال پر حملہ کر دیا۔ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر نے ان کا بھی مقابلہ کیا اور ان کے بہت سے آدمی ختم کر دیے۔ ان کے بقیہ لوگ بھاگ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں جا ملے۔[27]

حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے اس طرح باغیوں کی بصرہ شاخ کو طاقت سے کچل تو دیا لیکن اس کے کچھ ایسے نتائج نکلے جو کہ غیر متوقع تھے۔ ان کا خیال تو شاید یہ تھا کہ اس طرح باغیوں کی طاقت کمزور پڑ جائے گی لیکن الٹا ان کی طاقت بڑھ گئی اور ان کے اہل قبیلہ بھی باغی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ بغاوت کو طاقت سے کچلنے کے نتیجے میں عام طور پر یہ پہلے سے مضبوط ہو جاتی ہے۔

باغی تحریکوں کے لائف سائیکل میں ہم باغی تحریکوں کی نفسیات بیان کر چکے ہیں کہ اگر ایک باغی کو قتل کیا جائے تو اس کے انتقام میں دس لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قبائلیوں کی نفسیات بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک حق و باطل کا معیار ان کا قبیلہ ہوتا ہے اور انتقام کو ان کے ہاں ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر ان کے کسی مجرم کو بھی قتل کیا جائے تو پورا قبیلہ جنگ کرنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس جنگ میں بہت سے بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی قبائلی علاقوں میں حکومتیں کوشش کرتی ہیں کہ معاملات کو حتی الامکان صلح ہی کے ذریعے سلجھایا جائے۔ اسی وجہ سے اکثر خلفاء اور بادشاہ باغی تحریکوں پر قابو پا لینے کے بعد انہیں معاف کر دیتے ہیں تاکہ یہ تحریک مستقبل میں پیدا نہ ہو۔ اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان باغیوں کو ڈھیل کیوں دی تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے خلاف فیصلہ کن کاروائی سے اب تک پرہیز کیوں کرتے چلے آئے تھے۔

اس زمانے میں بصرہ کے باغیوں کے قتل عام کا نتیجہ یہ نکلا بنو عبدالقیس اور بنو بکر بن وائل کے یہ قبیلے ایسے بد ظن ہوئے کہ اس کے بعد

---

[27] ایضاً۔ 3/2-78

بار بار حکومت کے خلاف باغیوں کا ساتھ دیتے رہے۔ اس وقت بھی یہ سعودی عرب کے مشرقی صوبے میں قطیف اور الاحساء کے علاقوں میں آباد ہیں اور ان کے بہت سے لوگ ان صحابہ کے خلاف دل میں بہت بغض رکھتے ہیں۔

بصرہ پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما نے بیت المال سے فوج کو تنخواہیں دیں۔ اس کے بعد ان حضرات نے اہل شام اور اہل کوفہ کو خطوط لکھے جن میں بصرہ کی جنگ کی تفصیلات بیان کیں کہ کس طرح قاتلین عثمان کا یہاں خاتمہ ہو گیا ہے۔

حضرت علی اور طلحہ وزبیر میں دوبارہ اتحاد کیسے ہوا؟

بصرہ کے بعد کوفہ عراق میں سب سے بڑی چھاؤنی تھی جس پر مشہور صحابی حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عثمان کے زمانے سے گورنر چلے آ رہے تھے۔ یہ اگرچہ باغیوں کا گڑھ تھا تاہم مخلص مسلمانوں کی تعداد باغیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اہل کوفہ کے قبائلی سرداروں کے نام الگ الگ خطوط لکھے جن میں سے ایک باغی لیڈر زید بن صوحان کے نام بھی تھا۔ اس نے آپ کے خط کا سخت جواب دیا اور لکھا کہ آپ اپنے گھر واپس چلی جائیے ورنہ میں آپ سے سب سے پہلے مقابلہ کروں گا۔[28] ان باغیوں کو سیدہ سے خاص بغض تھا کیونکہ آپ ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا رہی تھیں؟

دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہی چاہتے تھے کہ اہل کوفہ کے مخلص مسلمان ان کے ساتھ آ ملیں تاکہ باغیوں کا کنٹرول کمزور (Dilute) کیا جا سکے لیکن آپ کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ آپ جس بھی مخلص قاصد کو کوفہ بھیجتے، باغیوں کا کوئی نہ کوئی لیڈر ساتھ چل پڑتا جس کی وجہ سے حضرت ابو موسی اشعری قائل نہ ہو پاتے۔ آپ نے اپنے بھتیجے محمد بن جعفر رضی اللہ عنہما کو کوفہ بھیجا، تو ساتھ محمد بن ابی بکر بھی چل پڑا جو کہ باغیوں کا ساتھی تھا۔ اہل کوفہ کو محمد بن ابی بکر نے اپنی جلیل القدر بہن سیدہ عائشہ اور طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کے خلاف جنگ پر تیار کرنے کی کوشش کی تو یہ لوگ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔

> آپ نے جواب دیا: "اگر آپ لوگ دنیا چاہتے ہیں تو جنگ میں شریک ہو جائیے اور اگر آخرت چاہتے ہیں تو اپنی جگہ بیٹھے رہیے۔" محمد بن ابی بکر نے انہیں برا بھلا کہا تو ابو موسی نے فرمایا: "واللہ! عثمان کی بیعت میری گردن میں بھی پڑی ہوئی ہے اور تمہارے ان صاحب (علی) کی گردن میں بھی، جنہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔ ہم اگر جنگ بھی کریں گے تو اس وقت جب تمام قاتلین عثمان قتل کر دیے جائیں اور ان میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ بچے۔"[29]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کوفہ بھیجا تو ان کے ساتھ مالک اشتر چل پڑا۔ حضرت ابو موسی

---

[28] ایضاً۔ 3/2-79

[29] ایضاً۔ 3/2-85

اشعری رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی ایسا ہی جواب دیا اور اہل کوفہ کو بیٹھ رہنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد حضرت علی نے حضرت حسن اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو بھیجا تو حضرت ابو موسی نے انہیں سینے سے لگا لیا۔ آپ نے ان سے نہایت نرمی سے گفتگو کی۔ اس موقع پر کوفہ کے سر کردہ لوگوں نے تقاریر کیں جن میں باغیوں کے لیڈر بھی شامل تھے۔ مالک الاشتر نے تقریر کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تو ایک سردار مقطع بن ہیثم نے اسے ٹوک کر کہا: "اللہ تیری صورت بگاڑے، او پنجوں والے اور بھونکنے والے کتے! خاموش ہو جا۔" [30] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں مخلصین اور باغیوں میں ایک دوسرے سے شدید نفرت پائی جاتی تھی۔ اشتر نے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے بہت بد تمیزی کی اور انہیں جبراً گورنر ہاؤس سے نکال دیا۔[31]

مخلص حضرات کی کاوشوں سے کچھ لوگ حضرت علی کے لشکر میں آ ملے جن میں حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ جیسے بہادر بھی شامل تھے۔ حضرت قعقاع، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کے بعد، نہایت ہی اعلی پائے جرنیل تھے اور فتح ایران میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اب حضرت علی کا لشکر آگے بڑھا۔ باغی بدستور ان کے ساتھ تھے اور زید بن صوحان اور مالک الاشتر جیسے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں نمایاں عہدے سنبھالے ہوئے تھے تاہم اب حضرت علی رضی اللہ عنہ خود کو کافی حد تک ان باغیوں سے آزاد محسوس کر رہے تھے۔

بصرہ کے پاس پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت قعقاع بن عمرو کو سیدہ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجا۔ ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی جو کہ واقدی اور سیف بن عمر نے روایت کی ہے۔ تاہم روایت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ بالکل درست ہے اور اس میں کسی راوی کو کسی گڑبڑ کا موقع نہیں ملا۔ یہاں ہم ان حضرات کے درمیان ہونے والے مکالمہ کو درج کر رہے ہیں۔ اس مکالمے سے حضرت علی، عائشہ اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے منصوبے کا اندازہ ہوتا ہے:

قعقاع: میری والدہ! آپ کے یہاں تشریف لانے اور اتنی تکالیف اٹھانے کا مقصد کیا ہے؟

عائشہ: میں اصلاح کے لیے آئی ہوں۔

قعقاع: تو پھر طلحہ اور زبیر کو بھی بلوا لیجیے تا کہ وہ میری بات سن سکیں اور میں ان کے خیالات معلوم کر سکوں۔

یہ دونوں حضرات بھی آ گئے تو بات آگے چلی۔

قعقاع: میں نے ام المومنین سے اس شہر میں تشریف آوری کا مقصد دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا: "اصلاح" تو کیا آپ دونوں حضرات کو اس بات سے اتفاق ہے یا اختلاف؟

---

[30] ایضاً۔ 3/2-97

[31] ایضاً۔ 3/2-98

طلحہ اور زبیر: ہمیں اتفاق ہے۔

قعقاع: تو پھر اصلاح کیسے ہو؟ وہ صورت بیان فرمائیے۔ واللہ! اگر ہم اسے بہتر سمجھیں گے تو اسے ضرور قبول کریں گے اور اگر غلط سمجھیں گے تو اس سے احتراز کریں گے۔

طلحہ و زبیر: جب تک عثمان کے قاتل قتل نہ کیے جائیں گے، اس وقت تک صورتحال درست نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر اس قصاص کو چھوڑ دیا گیا تو یہ قرآن کا ترک ہو گا اور قصاص لینے میں حکم قرآنی کا احیاء ہے۔

قعقاع: آپ حضرات قاتلین عثمان میں سے بصرہ کے بہت سے لوگ کو قتل کر چکے ہیں حالانکہ ان کے قتل سے پہلے معاملات زیادہ بہتر طور پر درست ہو سکتے تھے۔ آپ نے 600 قاتلوں کو قتل کیا اور صرف ایک شخص زندہ بچا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے قتل پر 6000 آدمی غضب ناک ہو کر آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اگر آپ ان لوگوں سے اور بقیہ قاتلین سے جنگ کریں گے تو مضر اور ربیعہ کے یہ تمام قبائل آپ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس خطرے سے آپ خائف ہیں اور جس کے باعث آپ نے یہ اختلاف کیا ہے، اس سے بھی زیادہ خطرناک حالات پیش آ جائیں گے۔ (باغیوں کے) اسی قتل کے باعث مضر اور ربیعہ کے بہت سے لوگوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور وہ آپ سے جنگ کر کے آپ کو رسوا کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یہ صرف ان مقتولین کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر آپ لوگ دوسرے شہروں (کوفہ اور مصر) میں بھی یہی کریں گے تو اتنی زبردست تباہی آئے گی کہ پھر اصلاح نہ ہو سکے گی۔

عائشہ: پھر آپ کی رائے کیا ہے؟

قعقاع: اس کام کے لیے اطمینان اور سکون کی ضرورت ہے۔ **جب فضا ساز گار ہو جائے گی اور اشتعال اور ہیجان ختم ہو جائے اور لوگ ایک دوسرے مطمئن ہو جائیں گے تو اس وقت اس معاملے کو نمٹا لیا جائے گا۔ اگر آپ لوگ ہماری (علی کی) بیعت کر لیں گے تو یہ بہتری کی علامت اور رحمت کا سبب ہو گی۔ اس طرح ہم عثمان کا قصاص بھی لے سکیں گے اور امت میں بھی عافیت اور سلامتی پیدا ہو جائے گی۔** اگر آپ جنگ کے علاوہ کسی اور بات کو قبول نہ کریں گے تو اس سے بڑا فساد پیدا ہو گا۔ قصاص کا معاملہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس امت پر آفتیں نازل فرما دے گا۔ آپ لوگ عافیت کے طلب گار بنیے اور پہلے کی طرح خیر کی کوشش کیجیے۔ ہمیں مصیبتوں میں مبتلا نہ کیجیے اور نہ ہی علی کے لیے پیچیدگیاں پیدا کیجیے کیونکہ اس سے آپ بھی تباہ ہوں گے اور ہم بھی۔ واللہ! میں آپ کو صرف اسی بات کی دعوت دینے آیا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں (یہ خدشات) پورے نہ ہو جائیں سوائے اس کے لیے اللہ عزوجل اس امت کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یہ حالات عام حالات نہیں ہیں، جیسے کوئی شخص کسی دوسرے کو یا ایک گروہ یا قبیلہ کسی ایک آدمی کو قتل کر دے۔

زبیر و طلحہ: آپ نے جو بات کہی ہے، وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ اب آپ جائیے اور (علی سے بات کیجیے۔) اگر آپ کے اور علی کے خیالات یہی ہیں تو ہم مصالحت کے لیے تیار ہیں۔[32] رضی اللہ عنہم۔

---

[32] ایضاً۔ 3/2-102

حضرت قعقاع بن عمرو کے اس مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی اب تک قاتلین کے خلاف کیوں سخت کاروائی نہ کر سکے تھے۔ اسی قسم کی ایک گفتگو اگر حضرت معاویہ سے بھی ہو جاتی تو وہ بھی یقیناً ان دلائل کی بنیاد پر اسی طرح قائل ہو جاتے جیسے حضرات طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم ہوئے تھے۔ جب حضرت قعقاع، حضرت علی رضی اللہ عنہما کے پاس پہنچے اور ان سے ساری بات بیان کی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپ نے ان باغیوں کے مقابلے میں اتنی ریلیف محسوس کی تھی۔ آپ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک تقریر کی۔ اس میں آپ نے دور جاہلیت کی بدبختی اور اسلام کی سعادت پر بات کی اور فرمایا:

> اس امت پر اللہ کا ایک انعام یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ اول کے ذریعے اس امت کے اتحاد کو برقرار رکھا۔ پھر خلیفہ دوم اور سوم کے زمانہ میں بھی اسی طرح رہا۔ پھر یہ واقعہ (شہادت عثمان) پیش آیا اور مختلف گروہوں نے اپنی دنیا طلبی کی خاطر امت میں پھوٹ ڈال دی۔ **ان لوگوں کو اس بات کا حسد تھا کہ اللہ تعالی نے دوسرے لوگوں کو کیوں فضیلت عطا فرمائی۔** اس لیے یہ لوگ چاہتے تھے کہ زمانے کو پھر دور جاہلیت میں بدل دیں تاکہ ایک (صحابہ) کو دوسرے پر فضیلت باقی نہ رہے حالانکہ اللہ تعالی اپنے حکم اور اپنے ارادے کو پورا کر کے رہتا ہے۔ خبردار! میں کل یہاں سے بصرہ کی جانب کوچ کروں گا۔ آپ لوگ بھی میرے ساتھ چلیے لیکن ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص ہرگز نہ جائے جس نے عثمان کی شہادت میں کسی قسم کی مدد کی ہو یا اس میں کسی قسم کا حصہ لیا ہو۔ یہ بے وقوف لوگ اب مجھ سے الگ ہو جائیں۔[33]

یہ اعلان سن کر باغیوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ اب وہ پہلا سا معاملہ نہیں تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی بات ماننے پر مجبور ہوں۔ اب آپ کے ساتھ بھی خاصی تعداد میں مخلص ساتھی تھے اور اگر اس میں حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھی مل جاتے تو باغیوں کا بڑا ہی برا حشر ہوتا۔ انہوں نے اب اپنا اجتماع منعقد کیا اور مشورے کرنے لگے۔ طبری نے ان کی جو گفتگو نقل کی ہے، وہ کچھ یوں ہے:

> (حضرت علی رضی اللہ عنہ کا) یہ اعلان سن کر وہ لوگ جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں حصہ لیا تھا یا قاتلین عثمان سے راضی تھے، اکٹھے ہوئے۔ ان میں علباء بن الہیثم، ۔۔۔، سالم بن ثعلبہ العبسی، شریح بن اوفی الضبیعہ اور (مالک) اشتر نخعی شامل تھے اور مصریوں کے ساتھ ابن السوداء اور خالد بن ملجم تھے۔ ان لوگوں میں باہم مشورہ ہوا۔ یہ لوگ کہنے لگے: "واللہ! یہ تو ایک ظاہر سی بات ہے کہ علی سب سے زیادہ کتاب اللہ سے واقف ہیں، اس وجہ سے وہ لازماً ایک نہ ایک دن قرآن پر عمل کرتے ہوئے قاتلین سے قصاص کا مطالبہ کریں گے اور جس وقت وہ مطالبہ کریں گے، اس وقت کوئی مخالف نہ ہو گا اور ہماری تعداد دوسروں کے مقابلے میں کم ہو جائے گی۔ اس وقت علی قوم پر جان دیں گے اور قوم ان پر۔ اس وقت ہماری تعداد اتنی بڑی اکثریت کے سامنے کچھ نہ ہو گی۔ واللہ! تمہیں دھتکارا جائے گا اور نجات کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔"
>
> مالک اشتر نخعی: طلحہ و زبیر کے ارادوں سے تو ہم خوب واقف تھے، لیکن **علی کے ارادوں سے آج تک واقف نہ ہو سکے۔** واللہ! ان سب کی رائے

[33] ایضاً۔ 3/2-107

ہمارے بارے میں ایک ہی ہے۔ اگر زبیر، طلحہ اور علی نے صلح کر لی تو وہ ہمارے خون پر ہو گی۔ آؤ! کیوں نہ ہم علی پر حملہ کر کے اسے عثمان کے پاس پہنچا دیں۔ اس سے ایک نئی خانہ جنگی واقع ہو جائے گی جو ہماری مرضی کے عین مطابق ہو گا اور ہم اس میں سکون سے ٹائم پاس کر لیں گے۔

عبداللہ بن سبا: تمہاری رائے بالکل غلط ہے۔ اے قاتلین عثمان! تم دیکھ نہیں رہے کہ ذی قار میں کوفہ کا ڈھائی ہزار لشکر موجود ہے اور اس کے علاوہ ابن حنظلیہ کے ساتھ پانچ ہزار کا لشکر ہے۔ یہ سب اس شوق میں مرے جا رہے ہیں کہ انہیں تم سے جنگ کی اجازت دی جائے۔ یہ لشکر تمہاری پسلیاں بھی توڑ کر رکھ دے گا۔

علباء بن الہیثم: میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ انہیں چھوڑ کر ہم الگ ہو جائیں اور انہیں آپس میں لڑنے دیں۔ اگر لڑتے لڑتے ان کی تعداد کم ہو جائے گی تب ہم ان کے دشمنوں کی کثرت کے باعث ان پر غلبہ پا لیں گے۔ اگر یہ زیادہ بھی ہوں گے تب بھی یہ تم سے ایک نہ ایک دن صلح کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اس لیے تم ان لوگوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنے اپنے شہروں کو چلو اور اس وقت تک خاموش بیٹھے رہو جب تک تمہارے شہروں میں کوئی ایسا امیر نہ آ جائے جو تمہاری پشت پناہی کر سکے اور تمہیں لوگوں سے بچا سکے۔

ابن سبا: یہ رائے بھی غلط ہے۔ تمہیں لوگوں سے محبت ظاہر کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس وقت لوگ تمہارے دشمن ہو رہے ہیں۔ تم ان سے ہٹ کر بچ نہیں سکتے۔ اگر تمہاری رائے پر عمل کیا گیا تو ہمارے منتشر ہوتے ہی لوگ ہمیں ہر طرف سے گھیر لیں گے۔

۔۔۔: خدا کی قسم! نہ تو میں کسی بات پر خوش ہوں اور نہ ناراض۔ اتنا ضرور ہے کہ عثمان کے قتل کی وجہ سے لوگ زبردست پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ جو حالات گزر چکے، سو گزر چکے لیکن اب لوگوں کی نظروں میں گر چکے ہیں۔ ہمارے پاس گھوڑے بھی ہیں اور بہترین ہتھیار بھی۔ اگر تم سب آگے بڑھو گے تو ہم بھی آگے بڑھیں گے اور اپنی جگہ رکو گے تو ہم بھی رکیں گے۔

ابن سبا: یہ تم نے بہت اچھی بات کی۔

سالم بن ثعلبہ: تم میں سے اگر کوئی شخص اس دنیاوی زندگی کا طلب گار ہے تو ہو، میں اس کی خواہش نہیں رکھتا۔ واللہ! جب تم کل دشمن سے جنگ کرو گے تو میں اپنے گھر واپس نہ جاؤں گا۔ اگر میری زندگی باقی بھی رہی تو میں جب تم سے ملوں گا تو اونٹوں کو اچھی طرح ذبح کر کے آؤں گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو تم لوگوں کے سروں پر اپنی تلواروں کو اچھی طرح استعمال کرے گا، معاملات اسی کے کنٹرول میں چلے جائیں گے۔ جس کی لاٹھی، اسی کی بھینس والا معاملہ ہو گا۔

ابن سبا: یہ کام کی بات ہے۔

شریح: تم لوگ میدان میں نکلنے سے پہلے کچھ نہ کچھ فیصلہ کر لو اور اس میں دیر مت کرو۔ جس کام کا جلدی کرنا ضروری ہے، اسے موخر نہ کرو اور جسے موخر کرنا بہتر ہے، اس میں جلدی نہ کرو۔ ہم لوگوں کے نزدیک نہایت ہی برے لوگ ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ جب کل یہ دونوں لشکر ملیں گے تو ان کی ملاقات کا کیا نتیجہ برآمد ہو گا۔

ابن سبا: لوگو! تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہو اور ان کے ساتھ مل کر کام کرو۔ جب کل دونوں فریق آپس

میں ملیں تو جنگ چھیڑ دو اور کسی کو سوچنے تک کا موقع نہ دو۔ جب تم علی کے ساتھ ہو گے تو انہیں کوئی شخص ایسا نظر نہ آئے گا، جس کے ذریعے جنگ رکوا سکیں۔ اس طرح اللہ، علی، طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہم) اور صلح کے خواہشمند دیگر لوگ، جو تمہاری منشاء کے خلاف کام کرنا چاہتے ہیں، ایک مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔

اس رائے سے سب نے اتفاق کیا اور اس فیصلہ کے بعد یہ ٹولی منتشر ہو گئی۔ دیگر لوگوں کو ان کے حالات کی خبر نہ تھی۔[34]

اس روایت کا راوی بھی سیف بن عمر ہی ہے تاہم یہ اس وجہ سے درست معلوم ہوتی ہے کہ اس میں جو منصوبہ طے پایا، وہ بعینہ حقیقت بن گیا۔ تاہم غالی راویوں کی چونکہ کوشش یہ رہی ہے کہ قاتلین عثمان میں چند ایک صحابہ کو بھی گھسیٹ لیا جائے تاکہ ان کے قد و کاٹھ (Credibility) میں کچھ اضافہ ہو۔ اس وجہ سے انہوں نے معاذ اللہ حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ کا نام بھی اپنے میں شمار کر لیا ہے حالانکہ اس سے پہلے قتل عثمان کی سازش میں کہیں دور دور تک آپ کا نام نہیں ملتا۔ اقتباس میں جہاں ہم نے ۔۔۔ لگائی ہے، وہاں حضرت عدی کا نام لکھا ہے۔ اس سے پہلے یہ اسی طرح حضرت عمار بن یاسر اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو بھی اپنے میں شمار کرنے کی جسارت کر چکے ہیں۔ حضرت عدی بن حاتم کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ان لوگوں میں شامل تھے، جو کوفہ سے محض اس وجہ سے نکل گئے تھے کہ باغی یہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیا کرتے تھے۔[35]

اگلے دن حضرت علی نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا اور بصرہ کے قریب آ پہنچے۔ آپ نے شام کو حضرت عبداللہ بن عباس کو بھیجا جنہوں نے جا کر ام المومنین عائشہ اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے ساتھ صلح کی شرائط طے کیں۔ بقیہ ساتھی ابھی پیچھے آ رہے تھے۔ اس موقع پر دونوں لشکروں میں بعض لوگوں نے جنگ کی آگ کو بھڑکانے کی کوشش کی مگر حضرت زبیر اور حضرت علی نے اسے ناکام بنا دیا۔ طبری کی روایت ہے:

اس وقت ایک شخص ابو الجرباء حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور آپ سے کہا: "زبیر! بہترین رائے یہ ہے کہ آپ اسی وقت ایک ہزار سوار روانہ کر دیجیے تاکہ علی کے بقیہ ساتھی آنے سے پہلے ہی فیصلہ ہو جائے۔ حضرت زبیر نے جواب دیا: "ابو الجرباء! ہم جنگی تدابیر سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن انہوں نے صلح کا پیغام دیا ہے اور یہ اختلاف ایک نئی بات ہے جو اس سے پہلے پیش نہ آئی تھی۔ یہ ایسا کام ہے کہ اگر کوئی شخص بلا وجہ اور بلا دلیل قیامت کے روز اللہ کے سامنے پیش ہو گا تو اس کا کوئی عذر قبول نہ ہو گا۔ جب علی ہم سے جنگ نہیں کرنا چاہتے اور صلح کا پیغام بھیج رہے ہیں تو ان سے جنگ چھیڑنا کیسے جائز ہے؟ مجھے امید ہے کہ آج صلح کا معاہدہ مکمل ہو جائے گا۔ آپ لوگ (کچھ دیر) صبر کریں اور

---

[34] ایضاً۔ 3/108, 109

[35] ابن عساکر۔ 39/510

خوشیاں منائیں۔ اس کے بعد ایک اور شخص صبرہ بن شیمان آیا اور اس نے بھی حملے کا مشورہ دیا۔ آپ نے اسے بھی ایسا ہی جواب دیا۔[36]

دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی اپنے ساتھیوں سے ایسا ہی مکالمہ چل رہا تھا۔

علی: لوگوں کی اصلاح کرنا اور دہکتی آگ کو بجھانا بہتر ہے۔ شاید اللہ تعالی اس ذریعہ سے اس امت کو متحد فرما دے اور یہ باہمی اختلافات ختم ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ لوگ میری بات قبول کر لیں گے۔

اعور: اگر انہوں نے ہماری بات قبول نہ کی تو؟

علی: تو اس وقت تک ہم ان سے جنگ نہ کریں گے جب تک یہ ہم سے جنگ نہ کریں۔

اعور: اگر ان لوگوں نے ہم سے جنگ کی تو پھر؟

علی: پھر ہم صرف اپنی جانوں کا دفاع کریں گے۔

اعور: کیا انہیں بھی اسی طرح اجر ملے گا، جس طرح ہمیں اجر ملے گا؟

علی: بالکل، ضرور ملے گا۔

ابو سلامہ الدالانی: کیا ان لوگوں کے لیے شرعی طور پر یہ دلیل کافی ہے کہ وہ خون عثمان کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ان کی نیت اس سے اللہ عزوجل کی رضامندی ہے۔

علی: جی ہاں۔

ابو سلامہ: آپ نے جو قصاص عثمان میں تاخیر فرمائی ہے، کیا اس کے لیے آپ کے پاس جواز کی کوئی دلیل ہے؟

علی: ہاں! جب تک کسی چیز کی اصل حقیقت کا علم نہ ہو جائے تو اس میں حکم یہ ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں احتیاط پائی جاتی ہو اور جس کا فائدہ عام ہو۔

ابو سلامہ: اگر کل ہماری اور ان کی جنگ ہو گئی تو اس کا آخرت میں انجام کیا ہو گا؟

علی: مجھے امید ہے کہ ہمارا یا ان کا جو شخص بھی مارا جائے گا، بشرطیکہ اس کی غرض اللہ کی رضا ہو تو اللہ تعالی اسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔

مالک بن حبیب: آپ کی جب ان لوگوں سے ملاقات ہو گی تو آپ کیا طریقہ اختیار فرمائیں گے؟

علی: ہم پر بھی اور ان پر بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اصلاح اسی میں کہ اس جنگ سے باز رہا جائے۔ اگر وہ میری بیعت کر لیتے ہیں تو بہت ہی بہتر ہے اور اگر وہ جنگ کے علاوہ کسی چیز پر تیار نہ ہوں گے تو یہ ایک ایسا زخم ہو گا جو کبھی نہ بھر سکے گا۔

---

[36] طبری۔ 3/2-109

مالک: جنگ ہوئی تو ہمارے مقتولوں کا کیا معاملہ ہو گا؟

علی: جس کا مقصد اللہ عزوجل کی رضا ہے، اسے اس کا فائدہ ضرور پہنچے گا اور یہ اس کی نجات کا سبب ہو گا۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عام خطبہ دیا اور اللہ عزوجل کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "لوگو! آپ لوگ اپنے آپ پر کنٹرول رکھیے، اپنے ہاتھوں کو روکے رکھیے اور ان لوگوں (طلحہ و زبیر اور ان کے ساتھیوں) کو کچھ کہنے سے اپنی زبانیں بند رکھیے کیونکہ وہ بھی آپ کے بھائی ہیں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ کچھ زیادتی کریں تو آپ صبر کیجیے اور ہم سے آگے بڑھنے سے پرہیز رکھیے کیونکہ آج جو دشمنی برتے گا، وہ کل بھی دشمن ہی سمجھا جائے گا۔[37]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اصل پلان کیا تھا۔ ہم اوپر وہ منصوبہ بیان کر چکے ہیں، جو حضرت علی کے ذہن میں تھا۔ وہ ان روایات سے واضح ہو جاتا ہے۔ مناسب ہے کہ اسے ایک بار پھر دوہرا لیا جائے اور اس کے مطابق اب تک پراگریس دیکھ لی جائے تاکہ آپ کی حکمت عملی (Strategy) واضح ہو سکے۔

1۔ باغیوں کو وقتی طور پر کسی کام میں مصروف (Engage) کر دیا جائے تاکہ اہل مدینہ کی جان، مال اور آبرو ان سے محفوظ ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ان کی کچھ باتیں اگر ماننا بھی پڑیں تو اس میں مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حکومتی امور میں شریک کر لیا تاکہ ان کی توجہ دوسری طرف نہ ہو سکے۔ اس معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مکمل طور پر کامیاب رہے اور اہل مدینہ کے جان، مال اور آبرو ان سے محفوظ ہو گئے۔

2۔ باغیوں میں سے ایک طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو اپنی اصل میں مخلص تھے لیکن محض حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب جھوٹے خطوط سے متاثر ہو کر باغیوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ انہی لوگوں کی وجہ سے باغی لیڈر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حد تک دبتے تھے اور ان سے اپنی ہر بات نہ منوا سکتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ اس طبقے کو باغیوں سے الگ کر لیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذاتی گفتگو اور خطبات کے ذریعے اس کام کی بھرپور کوشش کی جس کے نتیجے میں باغیوں میں شامل بہت سے مخلص لوگ، آپ کے ساتھ ہو گئے۔ اوپر بیان کردہ گفتگو ایسے ہی لوگوں کے ساتھ تھی۔ اس معاملے میں آپ کو البتہ جزوی کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ باغی لیڈر مالک اشتر وغیرہ بھی ان لوگوں پر مسلسل اپنا اثر و رسوخ استعمال کر رہے تھے۔

3۔ ایک طرف باغیوں کو مصروف کر دیا جائے اور دوسری طرف حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے خاموشی سے نکل جائیں اور دیگر علاقوں میں موجود منتشر افواج کو منظم کریں تاکہ ان باغیوں پر فیصلہ کن ضرب لگائی جا سکے۔ اس معاملے میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے نہ صرف ایک فوج فراہم کر لی بلکہ باغیوں کی بصرہ برانچ کا مکمل خاتمہ بھی کر دیا۔ تاہم اس معاملے میں ایک غیر متوقع نتیجہ یہ سامنے آیا کہ یہ باغی جن قبائل سے تعلق رکھتے تھے، وہ برگشتہ ہو

[37] ایضاً۔ 3/2-111

گئے اور باغیوں کے ساتھ مل گئے اور اس سے باغیوں کی قوت میں اضافہ ہو گیا۔ یہ چیز غالباً ان حضرات کے منصوبے میں شامل نہیں تھی۔

4۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باغیوں کو اکٹھا کر کے مخلص مسلمانوں کی افواج کے مقابلے میں لے آئیں۔ اس معاملے میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کامیاب رہے اور باغیوں کو اکٹھا کر کے بصرہ لے آئے۔

5۔ مسلمانوں کی افواج متحد ہو کر خود کو اتحاد کی اس صورت پر لے آئیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے قائم تھا۔ یہ وہ معاملہ تھا جس میں مسلمانوں کو ابتدائی کامیابی حاصل ہوئی۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی سفارت نے کام کر دکھایا اور فریقین اتحاد پر تیار ہو گئے۔ افسوس کہ یہ مرحلہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا کیونکہ اس مرحلے پر باغیوں نے رات کے اندھیرے میں جنگ چھیڑ دی، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

6۔ اس کے بعد باغیوں کی بیخ کنی کی جائے۔ قاتلین عثمان کو قصاص میں قتل کیا جائے اور بقیہ لوگوں کو مناسب سزائیں دی جائیں۔ افسوس کہ یہ اقدام بھی حضرت علی کے دور میں کامیاب نہ ہو سکا۔

جنگ جمل کیسے ہوئی؟

اوپر بیان کردہ روایت کے مطابق باغیوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ دونوں لشکروں میں مل جل کر رہا جائے اور صلح کے معاہدے کی تکمیل سے پہلے ہی دونوں طرف اچانک حملہ کر کے جنگ چھیڑ دی جائے۔ انہوں نے رات کے اندھیرے میں اسی منصوبے پر عمل کیا۔ دونوں فریقوں نے یہ سمجھا کہ فریق مخالف نے وعدے کی خلاف ورزی کر کے حملہ کر دیا ہے چنانچہ جنگ چھڑ گئی۔ باغی بھی اس جنگ میں بڑی بے جگری سے لڑے کیونکہ یہ ان کے لیے بقا کی جنگ تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تاک کر حضرت طلحہ کو نشانہ بنایا اور انہیں شہید کر دیا۔ حضرت زبیر میدان جنگ سے الگ ہو گئے تھے کیونکہ آپ اپنے ماموں زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہم سے عہد شکنی نہ کرنا چاہتے تھے۔ تین باغیوں عمیر بن جرموز، فضالہ بن حابس اور نفیع نے انہیں گھیر کر شہید کر دیا۔ اس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں قریبی ساتھی شہید ہو گئے۔ کعب بن سور قرآن ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو گئے کہ اسے دیکھ کر لوگ جنگ سے رکیں لیکن باغی پارٹی نے انہیں نیزے مار مار کر شہید کر دیا۔ حضرت طلحہ کے بیٹے محمد، مالک اشتر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے اور حضرت زبیر کے بیٹے عبداللہ بھی اسی کے مقابلے میں شدید زخمی ہوئے۔

اس موقع پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے اونٹ پر بیٹھیں تاکہ آپ اس جنگ کو رکوا سکیں۔ آپ کے ساتھی سمجھے کہ آپ کمان کرنے آئی ہیں، چنانچہ وہ اور جوش میں آ گئے اور جنگ میں شدت آ گئی۔ باغی پارٹی نے آپ کے ہودج کو تیروں کا نشانہ بنالیا اور اس میں اتنے تیر آ کر لٹک گئے کہ یہ ہودج تیروں کا تھیلا معلوم ہونے لگا۔ دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو روک رہے تھے لیکن یہاں باغی پارٹی غالب تھی جو مسلسل پراپیگنڈا کیے جا رہے تھے کہ فریق مخالف نے وعدہ خلافی کی ہے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

کمال تدبیر سے کام لیتے ہوئے سیدہ کے بھائی محمد بن ابی بکر کو بھیجا جس نے آپ کے اونٹ کو زخمی کر کے ہودج کو گرا کر آپ کو ساتھ لے لیا۔ اس طرح سے جنگ رک گئی۔

جنگ جمل کے بعد کیا ہوا اور اس کے نتائج کیا نکلے؟

جنگ کے بعد باغیوں کا مطالبہ تھا کہ فریق مخالف کی خواتین کو ان کی باندیاں بنا دیا جائے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے سختی سے انکار کر دیا اور فرمایا: "تم میں سے کون ہے جو سیدہ عائشہ کو باندی بنانا چاہے گا؟۔" آپ نے دونوں طرف کے زخمیوں کا علاج کروایا اور ان کی لاشوں کو دفن کروایا۔ آپ نے حکم جاری کر دیا تھا کہ کوئی کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرے۔ حضرت طلحہ کی لاش دیکھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہما کے تاثرات کیا تھے؟ ملاحظہ فرمائیے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مقتولین کے درمیان چکر لگایا تو آپ (حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ) کو دیکھ کر آپ کے چہرے سے مٹی ہٹانے لگے اور فرمایا: "ابو محمد! اللہ کی آپ پر رحمت ہو۔ مجھے ستاروں تلے آپ کو اس حالت میں گرا دیکھنا کس قدر شاق گزر رہا ہے۔" پھر فرمایا: "میں اپنی ظاہری اور پوشیدہ باتوں کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ واللہ! میں چاہتا ہوں کہ آج سے بیس سال پہلے مر گیا ہوتا۔" [38]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل کا نام عمرو بن جرموز بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا واقعہ کچھ یوں ہے:

عمرو بن جرموز نے آپ (حضرت زبیر رضی اللہ عنہ) سے کہا: "مجھے آپ سے ایک کام ہے۔" آپ نے فرمایا: "پاس آ جائیے۔" حضرت زبیر کے غلام عطیہ نے کہا: "اس کے پاس ہتھیار ہے۔" آپ نے فرمایا: "چاہے ہتھیار ہو۔" وہ آگے بڑھ کر آپ سے بات کرنے لگا۔ نماز کا وقت تھا، حضرت زبیر نے اسے کہا: "پہلے نماز پڑھ لیں۔" اس نے کہا: "پڑھ لیں۔" جب حضرت زبیر ان دونوں کو نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے تو عمرو نے آپ کو نیزہ مار کر قتل کر دیا۔۔۔۔ پھر یہ آپ کا سر کاٹ کر اسے حضرت علی کے پاس لے گیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کی وجہ سے اسے آپ کے ہاں کوئی عہدہ ملے گا۔ اس نے اندر آنے کی اجازت طلب کی تو حضرت علی نے فرمایا: "اسے اجازت نہ دو بلکہ جہنم کی بشارت دو۔" ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ ابن صفیہ (زبیر رضی اللہ عنہما) کے قاتل کو جہنم کی بشارت دو۔" ابن جرموز اندر داخل ہوا تو حضرت زبیر کی تلوار اس کے پاس تھی۔ حضرت علی نے فرمایا: "اس تلوار نے کئی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے غم کو دور کیا ہے۔" بیان کیا جاتا ہے کہ عمرو بن جرموز نے جب یہ بات سنی تو خودکشی کر لی اور بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ مصعب بن زبیر کے عراق کا گورنر بننے تک زندہ رہا۔ [39]

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم کوفہ کی مسجد میں حضرت علی بن ابی طالب کے پاس تھے اور آپ کے ہاتھ میں فریکچر تھا۔ عثمان، طلحہ اور زبیر کا ذکر شروع ہوا گیا۔ آپ نے پوچھا: "آپ لوگ کس بارے میں بات کر رہے ہیں؟" ہم نے کہا: "ہم عثمان، طلحہ اور زبیر کے بارے

[38] ابن کثیر۔ عربی 10/476۔ بلاذری۔ 3/63

[39] ایضاً۔ عربی 10/482۔ ابن عساکر۔ 18/417-423

میں بات کر رہے ہیں اور ہمارا خیال تھا کہ آپ آرام کر رہے ہیں۔" علی نے یہ آیت پڑھی: "یقیناً جن لوگوں کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہو گا، وہ یقیناً اس (جہنم) سے دور رکھے جائیں گے۔" فرمایا کہ یہ معاملہ میرا، عثمان، طلحہ اور زبیر کا ہے۔ پھر فرمایا: "میں بھی عثمان، طلحہ اور زبیر کے شیعوں (پارٹی) میں شامل ہوں۔" پھر یہ آیت پڑھی: "ہم ان کے دلوں میں کچھ رنجش بھی ہو گی تو ہم اسے ختم کر دیں گے اور وہ بھائی بھائی بن کر پلنگوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھیں گے۔" فرمایا: "یہ عثمان، طلحہ اور زبیر سے متعلق ہے۔ میں بھی عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کی پارٹی میں شامل ہوں۔"[40]

حضرت علی رضی اللہ عنہ ، کعب بن سور رحمہ اللہ کی لاش کے پاس سے گزرے تو ان کی تعریف کی۔ بنو امیہ کے مشہور سردار عبد الرحمن بن عتاب بن اسید، جن کے والد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کا پہلا گورنر مقرر فرمایا تھا، کی میت کے پاس سے گزرے تو فرمایا: "یہ قریش کے سردار تھے، ان کے قتل پر میں بہت افسردہ اور شرمندہ ہوں۔" ایک باغی نے بصرہ کی خواتین کو دھمکی دی تو آپ نے فرمایا:

خبردار! نہ تو کسی کی پردہ دری کرو اور نہ ہی کسی کے مکان میں داخل ہو۔ کسی خاتون کو تکلیف نہ پہنچائی جائے اگرچہ وہ تمہاری توہین بھی کرے، تمہارے امراء اور نیک لوگوں کو برا بھی کہے۔ کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے۔ ہمیں تو مشرک عورتوں پر بھی ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا تھا اور اگر کوئی شخص کسی عورت پر ہاتھ اٹھاتا یا اسے مارتا تو لوگ اس کی اولاد کو طعنہ دیتے تھے کہ تیرے باپ نے تو فلاں عورت کو مارا تھا۔ خبردار! اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم میں سے کسی نے کسی عورت کو اس لیے تکلیف پہنچائی ہے کہ اس نے تمہیں کچھ کہا تھا اور تمہاری عزت اچھالی تھی تو میں تمہیں انتہائی بدترین سزا دوں گا۔[41]

دو باغیوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں سو سو کوڑے لگوائے۔ جنگ کے بعد باغیوں کا گروہ بغیر اجازت بصرہ کی طرف گیا تا کہ وہاں جا کر لوٹ مار کر سکے تو حضرت علی نے اپنے مخلص ساتھیوں کو بھیجا تا کہ وہ انہیں اس سے باز رکھ سکیں۔ اہل بصرہ نے آپ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد حضرت علی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہایت ہی اعزاز اور تکریم کے مکہ روانہ کر دیا اور ان کی سواری اور زاد راہ کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سیدہ نے فرمایا:

میرے بیٹو! ہم جلد بازی میں ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ آئندہ ہمارے ان اختلافات کے باعث کوئی شخص دوسرے پر زیادتی نہ کرے۔ واللہ! میرا اور علی کا پہلے سے اختلاف تھا لیکن یہ اسی قسم کا معاملہ تھا جیسا کہ ساس اور داماد میں ہو ہی جاتا ہے۔ فی الحقیقت علی، میرے نزدیک نیک آدمی ہیں۔

---

[40] ابن عساکر۔ تاریخ دمشق۔18/424

[41] طبری۔159-3/2

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے لوگو! واللہ! ام المومنین نے سچ فرمایا اور احسن بات کی ہے۔ میرا اور ان کا اختلاف اسی نوعیت کا تھا۔ عائشہ، دنیا اور آخرت میں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں۔"[42]

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کئی میل تک سیدہ کو رخصت کرنے کے لیے آئے اور اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کو کم از کم ایک دن کی مسافت تک چھوڑنے جائیں۔

جنگ جمل کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گورنر مقرر کرنے شروع کیے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا تو اشتر شدید غصے ہوا اور کہنے لگا:

"کیا اسی لیے ہم نے اس بڈھے (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کو قتل کیا تھا کہ یمن عبید اللہ بن عباس کو ملے، حجاز قثم بن عباس کو، بصرہ عبداللہ بن عباس کو اور کوفہ علی خود لے لیں؟"[43]

یہ کہہ کر وہ لشکر چھوڑ کر چل پڑا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے کوچ کا حکم دیا اور اس کے سر پر پہنچ گئے اور اسے ظاہر کیا کہ جیسے آپ تک اس کی بات نہیں پہنچی۔ آپ کو خدشہ تھا کہ وہ کہیں کوئی نئی بغاوت نہ کھڑی کر دے۔ اشتر کی جھنجھلاہٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کس طریقے سے آہستہ آہستہ ان باغیوں کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ آپ کی حکمت عملی یہی تھی کہ سانپ کو اچھی طرح بل سے نکال لیا جائے اور پھر اس کا سر کچل دیا جائے۔ باغی تحریک کے پورے آئس برگ کو ظاہر کر کے ختم کرنا آپ کی حکمت تھی۔

جنگ جمل کے نتائج کیا نکلے؟

ہمارے ہاں لوگ جنگ جمل پر بڑا افسوس کرتے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایک دوسرے کا خون بہا۔ در حقیقت یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا لیکن اس کا ایک روشن پہلو بھی تھا۔ جنگ جمل میں جہاں دس ہزار کے قریب مسلمان دونوں لشکروں میں سے شہید ہوئے، وہاں باغیوں کی ایک بڑی تعداد بھی ہلاک ہوئی۔ اس طرح ان مخلص حضرات نے اپنی جان کی قربانی دے کر باغیوں کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ جنگ جمل کے بعد جب باغیوں کی طاقت کمزور پڑی تو سانپ پوری طرح بل سے نکل آیا اور اس کے پھن کو پھر مسلمانوں نے اچھی طرح جنگ صفین میں کچلا۔ اس کے بعد یہ باغی خود گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کا مشن مکمل نہ ہو سکا۔ اگر اس وقت حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اسٹینڈ نہ لیتے تو ان باغیوں کا مشن مکمل ہو جاتا۔ پھر شاید آج انہی باغیوں کے ہمنوا مسلمانوں پر حکومت کر رہے ہوتے اور اصل مخلص مسلمان شاید اقلیت میں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان باغیوں نے ان

[42] ایضاً۔ 3/2-163
[43] ایضاً۔ 3/2-107

حضرات کو تنقید کا خاص نشانہ بنایا۔ کبھی کہا کہ حضرت طلحہ اور زبیر اپنی خلافت قائم کرنا چاہتے تھے، کبھی سیدہ عائشہ پر کیچڑ اچھالا اور کبھی حضرت علی کو ہدف تنقید بنایا۔

جنگ جمل کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا کہ باغیوں کے جن لوگوں کے اعزہ و اقربا اس جنگ میں مارے گئے تھے، انہوں نے حضرت علی، طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے خلاف محاذ بنا لیا۔ واقعات اور روایتیں گھڑ گھڑ کر ان حضرات پر طعنہ زنی کی گئی۔ طبری نے بعض ایسے اشعار درج کیے ہیں جو جنگ جمل کے مقتولین کے اعزہ نے حضرت علی کی ہجو میں کہے ہیں۔[44] جنگ کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد جب واقدی، سیف بن عمر، ابو مخنف اور کلبی وغیرہ نے جھوٹی سچی روایتیں اکٹھا کیں تو اس میں یہ افسانے بھی شامل کر دیے۔ تیسری صدی میں جب طبری اور بلاذری وغیرہ نے اپنی تواریخ لکھی تو یہ افسانے انہوں نے بھی درج کر دیے اور بعد کی صدیوں کے مورخین نے طبری ہی سے نقل کر کر کے ان واقعات کو بلا تحقیق مشہور کر دیا۔ مناسب ہو گا کہ ایسی چند روایتوں کی تحقیق کر دی جائے تا کہ باغیوں کی اس سازش کا پردہ بھی چاک ہو سکے۔

کیا حوأب کی روایت قابل اعتماد ہے؟

طبری نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے لشکر کے ساتھ مکہ سے بصرہ جا رہی تھیں تو راستے میں ایک مقام حوأب آیا جہاں کتے بھونکے۔ جب سیدہ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا:

"مجھے واپس لوٹاؤ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ازواج مطہرات سے یہ فرماتے سنا ہے کہ نجانے تم میں سے وہ کون ہو گی، جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔"[45]

اس روایت کا مقصد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اقدام کو غلط ثابت کرنا تھا اور اس کے گھڑنے والے وہ لوگ ہیں جو باغیوں ہی کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس روایت کی دو اسناد طبری نے بیان کی ہیں، وہ یہ ہیں:

1۔ حدثني **إسماعيل بن موسى الفزاري**، قال: أخبرنا علي بن عابس الأزرق، قال: حدثنا أبو الخطاب الهجري، عن صفوان بن قبيضة الأحمسي، قال: حدثني **العرني صاحب الجمل**.

2۔ حدثني أحمد بن زهير، قال: حدثناأبي، قال: حدثني وهب بن جرير بن حازم، قال: سمعت **يونس بن يزيد الأيلي**، عن الزهري.

اب آیئے، ان دونوں اسناد کا تجزیہ کرتے ہیں:

---

[44] ایضاً۔3/2-164

[45] ایضاً۔3/2-74

1۔ پہلی سند میں پہلا شخص اسماعیل بن موسی الفزاری (d. 245/859) ہے جو کوفہ کا رہنے والا ایک غالی راوی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ دوسرا شخص علی بن عابس ہے جسے امام نسائی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ تیسرا اور چوتھا راوی ابو الخطاب ہجری اور صفوان بن قبیصہ کے حالات نامعلوم ہیں۔ پانچواں راوی قبیلہ بنو عرینہ کا وہ شخص ہے جس سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے اونٹ خریدا گیا تھا۔ اس شخص کا نام بھی معلوم نہیں ہے کجا اس کے حالات سے یہ علم ہو سکے کہ یہ کون تھا اور کس درجے میں قابل اعتماد تھا۔ اس تفصیل کے بعد اس سند کے بارے میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح حدیث نہیں ہے بلکہ ایک گھڑی ہوئی روایت ہے۔

2۔ دوسری سند میں آخری راوی زہری (58-124/677-741) ہیں جو جنگ جمل کے 22 سال بعد پیدا ہوئے۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ روایت کس سے سنی تھی اور وہ کس درجے میں قابل اعتماد تھا؟ ان سے اس روایت کو یونس بن یزید ایلی روایت کر رہے ہیں جو قابل اعتماد راوی نہیں ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اس سند کے بارے میں بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح حدیث نہیں ہے بلکہ ایک گھڑی ہوئی روایت ہے جو کسی ایسے راوی کی ایجاد ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بغض رکھتا تھا۔

کیا حضرت طلحہ و زبیر کا مقصد اپنی خلافت قائم کرنا تھا؟

چونکہ حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے باغیوں کی طاقت پر کاری ضرب لگائی، اس وجہ سے باغیوں کو ان سے خاص بغض تھا۔ انہوں نے ایسی روایتیں گھڑنے کر پھیلائیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنی خلافت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان روایات کا جھوٹ ان حقائق سے ظاہر ہو جاتا ہے:

1۔ اگر حضرت طلحہ و زبیر کو خلافت کا لالچ ہوتا تو وہ اس وقت خلافت سے دستبردار کیوں ہوتے جب حضرت عمر نے انہیں شوری کا ممبر بنایا تھا۔ اس وقت انہوں نے خلافت سے دستبردار ہو کر اپنا ووٹ حضرت عثمان کے حق میں دے دیا تھا۔

2۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد بھی اگر حضرت طلحہ یا زبیر میں سے کوئی خلیفہ بننا چاہتا تھا، تو اس کا بہترین موقع وہ تھا جب ابھی حضرت علی رضی اللہ عنہم کی بیعت نہیں ہوئی تھی۔ اس موقع پر خود حضرت علی خلافت قبول نہیں کر رہے تھے۔ اگر حضرت طلحہ یا زبیر کو اس کا لالچ ہوتا تو وہ خلافت کو قبول کر لیتے۔ ایک یا دو ماہ بعد ایسی کیا قیامت آ گئی تھی کہ انہوں نے حضرت علی کو معزول کر کے خود خلیفہ بننا چاہا؟

3۔ متعدد روایات میں یہ بات آئی ہے کہ جب حضرت طلحہ یا زبیر کو خلافت کی پیشکش کی گئی تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم علی کی بیعت سے نکلنا نہیں چاہتے ہیں بلکہ صرف عثمان کے قاتلوں کو سزا دلوانا چاہتے ہیں۔

3۔ حضرت معاویہ نے حضرت زبیر کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ شام آ جائیں تو وہ ان کی بیعت خلافت کے لیے تیار ہیں لیکن حضرت زبیر

نے اسے قبول نہیں کیا۔[46] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت زبیر کے دل میں کوئی لالچ نہ تھا اور وہ حضرت علی کے ساتھ مخلص تھے۔ رضی اللہ عنہم

حضرت طلحہ کا قاتل کون تھا؟

بعض تاریخی روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو مروان بن حکم نے شہید کیا۔ ان روایات کا مقصد سوائے مروان کو بدنام کرنے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مروان کی شخصیت کو خاص طور پر تعصب اور کردار کشی کا نشانہ بنایا گیا ہے کیونکہ بنو امیہ کی حکومت دراصل بنو مروان ہی کی حکومت تھی جسے عباسی اور علوی گرانا چاہتے تھے۔ کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کزن تھے اور ان کے پرجوش حامی تھے۔ ایک موقع پر حضرت عثمان کی حفاظت کرتے ہوئے باغیوں کے ہاتھوں زخمی ہو چکے تھے۔ حضرت طلحہ، انہی حضرت عثمان کے قصاص کا مطالبہ لے کر اٹھے تھے اور مروان ان کے لشکر میں شامل تھے۔ اس وجہ سے مروان کے ان کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اگر یہ کہا جائے کہ ان کے خیال میں حضرت طلحہ، حضرت عثمان کے خلاف باغیوں کو اکسانے والے تھے تو یہ بات بھی بالکل غلط تھی۔ باغیوں نے یہ کوشش البتہ ضرور کی تھی کہ اکابر صحابہ کو بدنام کرنے کے لیے قتل عثمان کی تہمت ان پر لگائی جائے لیکن مروان آخر دم تک حضرت عثمان کی حفاظت کرتے رہے تھے اور حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ معاذ اللہ حضرت طلحہ ہی کو ذمہ دار سمجھ کر انہیں مارنا چاہتے تھے تو اس وقت سے پہلے بھی بہت سے مواقع انہیں مل سکے تھے۔ وہ مکہ سے لے کر بصرہ تک آئے تھے اور درمیان میں باغیوں سے کئی جھڑپیں ہوئی تھیں۔ اگر مروان انہیں شہید کرنا چاہتے تو پہلے بھی کر سکتے تھے۔

درست بات یہی ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو باغیوں نے شہید کیا۔ گھمسان کی جنگ میں ایک تیر ان کے پاؤں پر لگا اور خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ شہید ہوئے۔ جنگ میں جب ہزاروں تیر برس رہے ہوں تو اس بات کا تعین ممکن نہیں ہوتا کہ کس کا تیر کسے لگا ہے؟ مروان سے تعصب رکھنے والے کسی راوی نے ان پر الزام عائد کر دیا ہے۔ بلاذری نے اس الزام کی جو اسناد بیان کی ہیں، وہ یہ ہیں:

1۔ حدثنا عبد الله بن محمد بن أبي شيبة، حدثنا وكيع عن إسماعيل بن أبي خالد، عن **قيس بن حازم**.

2۔ حدثني عمرو بن محمد الناقد وأحمد بن إبراهيم الدورقي، قالا: حدثنا أبو أسامة عن إسماعيل، عن **قيس**.

یہ دونوں روایتیں بنیادی طور پر ایک ہی روایت ہے جس کے راوی قیس بن حازم کوفی ہیں۔ ان صاحب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی بیان کردہ روایتیں "منکر" کے درجے پر ہوتی تھیں۔ یہ حضرت علی کے بارے میں کچھ تعصب رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوفہ

[46] بلاذری۔ 3/53

کے اہل علم ان کی روایتوں سے اجتناب کرتے تھے۔[47]

جنگ صفین

جنگ جمل کے بعد دوسری بڑی جنگ صفین کے مقام پر ہوئی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ جنگ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی افواج کے درمیان لڑی گئی لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ حضرت علی کی فوج کا بڑا حصہ اب باغی تحریک کے کارکنوں پر مشتمل تھا اور انہوں نے اپنی پوری قوت میدان میں جھونک دی تھی۔ ان کے عزائم کی راہ میں حضرت معاویہ آخری چٹان بن کر کھڑے تھے۔ باغی ان کی قوت کا خاتمہ کر کے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شام پر لشکر کشی کر دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باغیوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے ساتھ تشریف لے گئے اور انہیں جنگ سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ تاہم جنگ ہو کر رہی اور اس جنگ میں باغیوں کی قوت کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔

جنگ صفین کی روایتیں کس حد تک قابل اعتماد ہیں؟

اگر طبری اور بلاذری میں جنگ صفین سے متعلق روایتوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب ابو مخنف کی روایت کردہ ہیں جو صحابہ کرام سے خاص بغض رکھتے تھے۔ یہ وہ صاحب تھے جنہوں نے جنگ صفین پر پہلی کتاب لکھی۔ ان کے پڑدادا مخنف بن سلیم ازدی اس جنگ میں شریک تھے۔ ابو مخنف اور ان کی قبیل کے دیگر مورخین کی کوشش یہ رہی ہے کہ ان روایتوں میں صحابہ کرام کی ایسی تصویر پیش کی جائے کہ یہ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ اسی طرح حضرت علی، عمار بن یاسر اور عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم کی ایسی تصویر پیش کی جائے، جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ حضرات باغیوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور دیگر مخلص صحابہ کے لیے اپنے دل میں بغض رکھتے تھے۔ ایسے تمام جملے ابو مخنف کی ایجاد ہیں اور ان سے ہٹ کر کسی بھی قابل اعتماد راوی نے ایسی کوئی بات روایت نہیں کی ہے۔

چونکہ جنگ صفین سے متعلق تمام روایتیں ابو مخنف ہی کے توسط سے ہم تک پہنچی ہیں، اس وجہ سے صحیح صورتحال کا اندازہ لگانا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ پھر بھی ہم کوشش کرتے ہیں کہ درایت کے اصولوں کے تحت بعض سوالات کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

جنگ جمل اور صفین کے درمیانی عرصے میں کیا اہم واقعات پیش آئے؟

جنگ جمل سے فارغ ہونے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ملکی انتظام پر توجہ دی۔ اب آپ نے کوفہ میں قیام فرمایا۔ اب آپ کی

[47] ذہبی، سیر الاعلام النبلاء، شخصیت نمبر 4609

خلافت کو بالعموم تسلیم کر لیا گیا اور لوگوں نے آپ کی بیعت کرنا شروع کر دی۔ صرف ایک شام کا صوبہ ایسا تھا جس نے حضرت علی کی بیعت نہیں کی تھی۔ صحابہ کرام کا ایک گروہ، جس میں حضرت سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ، عبداللہ بن عمر اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم جیسے لوگ تھے، غیر جانبدار ہو کر مدینہ میں مقیم تھا۔ حضرت علی نے حضرت معاویہ کے ساتھ خط و کتابت شروع کی اور اتحاد کی کوششیں شروع کیں لیکن باغیوں نے ایسی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ان حضرات کے درمیان بعض سفراء کا بھی تبادلہ ہوا۔ ایسے ہر موقع پر باغیوں نے غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت علی سے جو مخلص مسلمان آ کر ملتے، یہ انہیں بھی بد ظن کر کے دور کر دیتے۔

یہ باغی جعل سازی کے فن میں ید طولی رکھتے تھے اور اس سے پہلے بھی حضرت عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے نام سے جعلی خطوط لکھ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ اس بات کا غالب امکان موجود ہے کہ انہوں نے حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے نام سے خود یہ خطوط لکھ لیے ہوں۔ ابو مخنف اور سید شریف رضی نے ان میں سے بعض خطوط اپنی کتب میں درج کیے ہیں لیکن ان میں جو زبان استعمال ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان خطوط میں بھی بہت کچھ داخل کر دیا گیا ہے۔ ان جملوں سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ دونوں جلیل القدر صحابہ ایک دوسرے سے بد ظن تھے۔ ایک طرف معاویہ، علی کو حضرت عثمان کا قاتل سمجھتے تھے اور دوسری طرف علی، ان پر بغاوت کا الزام عائد کرتے تھے۔ یہ خطوط باغیوں کی دسیسہ کاریوں کے سوا کچھ نہیں ہیں جو انہوں نے ان دونوں صحابہ کو بدنام کرنے کے لیے کی ہیں۔ چونکہ باغی پارٹی سے تعلق رکھنے والے راوی اپنی تحریک کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام سے چلا رہے تھے، اس وجہ سے انہوں نے خاص کر ایسی روایات وضع کرنے کی کوشش کی ہے جن کے مطابق وہ یہ ظاہر کریں کہ حضرت علی دل و جان سے انہی کے ساتھ تھے۔ جن صحابہ نے ان کی تحریک کی راہ میں روڑے اٹکائے، وہ ان کی دل کھول کر کردار کشی کرتے ہیں۔

ان خطوط کے جعلی پن کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ان کی سند میں ابو مخنف، ہشام کلبی، سیف بن عمر اور واقدی جیسے راوی موجود ہیں، جنہیں محدثین نے "کذاب" کے درجے میں رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان حضرات میں اس درجے کی بدگمانی موجود ہوتی تو پھر حضرت علی، مختلف شہروں کو بھیجے گئے اپنے خط میں حضرت معاویہ کی جانب سے صفائی پیش کیوں کرتے؛ حضرت معاویہ، حضرت علی کی شہادت کی خبر سن کر کیوں روتے اور ان کے لیے دعا کیوں کرتے اور حضرت حسن، معاویہ سے صلح کر کے اقتدار ان کے سپرد کیوں کرتے؟ رضی اللہ عنہم۔ یہ سب تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔

حضرت علی نے اپنا دار الحکومت کوفہ کیوں منتقل کیا؟

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدینہ سے نکلنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مجبوری تھی۔ لیکن جنگ جمل کے بعد انہوں نے واپس مدینہ کا رخ کیوں نہیں کیا اور کوفہ کو اپنا دار الحکومت کیوں بنا لیا؟ ہمیں اس سوال کے جواب میں یہ امور سمجھ میں آتے ہیں:

1۔ کوفہ چونکہ ایک بہت بڑی چھاؤنی تھا اور مشرق کے تمام ممالک کے معاملات کوفہ ہی سے کنٹرول ہوتے تھے، اس وجہ سے ضرورت اس امر کی تھی کہ اسے کنٹرول میں لایا جائے۔

2۔ باغی تحریک کا مرکز بھی اب کوفہ ہی بن چکا تھا، اس وجہ سے ان پر نظر رکھنے کے لیے کوفہ میں موجودگی ضروری تھی۔

3۔ مدینہ منورہ عالم اسلام کے وسط میں تھا اور فوجی چھاؤنیوں سے دور علاقہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تجربے سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ دار الحکومت ایسے مقام پر ہونا چاہیے جہاں فوج کی بڑی تعداد موجود ہو۔

باغیوں کے نقطہ نظر سے صوبہ شام کی اہمیت کیا تھی؟

شام کے صوبے پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں شام کا صوبہ شمال مشرق میں دریائے فرات سے لے کر مغرب میں دریائے نیل تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ شام، لبنان، فلسطین اور اردن کے پورے پورے ممالک صوبہ شام کا حصہ تھے جبکہ عراق اور ترکی کے بعض حصے بھی اسی صوبے میں شامل تھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شام ایک غیر معمولی صوبہ تھا کیونکہ اس کی سرحدیں رومن ایمپائر کے ساتھ لگتی تھیں جس کا سربراہ قیصر روم تھا۔ قیصر کی کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے مقبوضات واپس لے لے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ شام پر کسی غیر معمولی صلاحیتوں والے گورنر کو مقرر کیا جاتا۔ چنانچہ حضرت عمر نے ایسا ہی کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کو 20/642 میں یہاں کا گورنر مقرر کیا۔ آپ نے اپنے حسن انتظام سے حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کو متاثر کیا اور مزید علاقے آپ کے صوبے میں شامل کر دیے گئے۔

جب عبداللہ بن سبا نے مختلف شہروں میں اپنی باغی تحریک کو منظم کرنا شروع کیا تو وہ شام بھی آیا مگر حضرت معاویہ کی بیدار مغزی سے اسے ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ان باغیوں کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوسری مرتبہ سامنا اس وقت ہوا جب مالک الاشتر اور اس کے ساتھیوں نے کوفہ میں بلوہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے انہیں حضرت معاویہ کے پاس بھیجا گیا جہاں آپ نے نہایت نرمی سے ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ اس واقعے کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مالک الاشتر اور اس کے ساتھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طاقت سے خاصے مرعوب ہوئے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب باغی صعصعہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑ کر کھینچی تو آپ نے فرمایا: "ٹھہر جاؤ! اگر اہل شام کو علم ہو جائے کہ تم نے ان کے حاکم کے ساتھ یہ کیا ہے، تو میں انہیں تمہیں قتل کرنے سے نہیں روک سکوں گا۔"[48] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل شام حضرت معاویہ سے کتنی محبت کرتے تھے۔

عراق اور مصر کی نسبت شام میں باغیوں کو ذرا سی بھی پذیرائی نہ ملی اور یہاں وہ اپنی شاخ قائم کرنے میں بری طرح ناکام ہو گئے کیونکہ شام میں حضرت معاویہ کی حکومت مستحکم تھی۔ ان وجوہات کی بنیاد پر باغی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے منصوبے کی تکمیل میں

[48] ایضاً۔ 3/1-368

سب سے بڑی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بنتے ہی ان باغیوں نے شام پر حملے کا منصوبہ بنایا اور حضرت علی کا نام لے کر اہل مدینہ کو تیار کرنے کی کوشش کی لیکن سب مسلمانوں نے سرد مہری دکھائی اور باغیوں کا یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ جنگ جمل کے بعد انہوں نے اس رکاوٹ کو دور کرنے کا پلان بنایا۔

باغی تحریک ایک آئس برگ کی طرح تھی۔ جو لوگ اب تک سامنے آئے تھے، ان کی حیثیت آئس برگ کی اوپری سطح کی سی تھی جو نظر آتی ہے لیکن اس کا دسیوں گنا بڑا حصہ سمندر میں چھپا ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ باغی تحریک کا تھا۔ اب تک اس کے جو لوگ سامنے آئے تھے، وہ اس آئس برگ کا محض اوپری حصہ تھے۔ ان کی بڑی طاقت چونکہ پہلے بصرہ کی جنگ اور پھر جنگ جمل میں ختم ہو چکی تھی، اس وجہ سے انہوں نے اب آخری داؤ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ مالک الاشتر اور دیگر باغی لیڈروں اپنے خاموش ساتھیوں (Dormant Sections) کو حرکت میں لائے اور اب باغیوں کی پوری قوت سامنے آ گئی اور انہوں نے اہل شام پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جنگ صفین کے بارے میں یہ بات غلط مشہور ہے کہ یہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کی افواج کے درمیان لڑی گئی۔ یہ بات انہی باغیوں کے ساتھی ابو مخنف نے مشہور کی ہے اور یہ انہی کی بیان کردہ تفصیلات ہیں جن سے طبری اور بلاذری کی تواریخ بھری پڑی ہیں۔ یہ جنگ دراصل حضرت معاویہ اور باغی تحریک کے لیڈروں کے درمیان لڑی گئی۔ حضرت علی اور آپ کے مخلص ساتھیوں کی پوری کوشش تھی کہ جنگ نہ ہو اور آپ نے مسلسل سفارت کاری کے ذریعے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی۔

حضرت معاویہ نے حضرت علی کی بیعت کیوں نہ کی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ یہ بات جانتے تھے کہ قاتلین عثمان نے حضرت علی رضی اللہ عنہم کو گھیر رکھا ہے اور ان کی راہ میں آخری رکاوٹ اب حضرت معاویہ ہی ہیں۔ اگر آپ بھی بیعت کر لیتے تو اگلے دن ہی یہ باغی آپ کو معزول کروا دیتے اور پھر ان کی راہ بالکل ہی صاف ہو جاتی۔ باغیوں نے دیگر گورنروں کے ساتھ یہی کیا تھا اور ان کا مقصد یہی تھا کہ کمزور گورنر مقرر کروا کر ان کے پردے میں خود حکومت کی جائے۔ اسی خطرے کے پیش نظر حضرت معاویہ نے حضرت علی کی بیعت نہ کی۔ لیکن ان کی خلافت کا انکار بھی نہ کیا اور صرف یہی مطالبہ رکھا کہ اگر حضرت علی، ان باغیوں کو اپنے سے الگ کر دیں اور انہیں سزا دیں تو وہ ان کی بیعت کے لیے تیار ہیں۔

ابو مخنف وغیرہ نے حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین سفارت کاری کا حال لکھا ہے اور اس ضمن میں اپنی صحابہ دشمنی کے پیش نظر ایسی باتیں درج کی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے دل میں ایک دوسرے کے بارے میں بغض تھا۔ یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ اگر ان کے دلوں میں بغض اور دشمنی ہوتی تو حضرت علی و معاویہ دو ماہ تک جنگ و جدال سے کیوں پرہیز

کرتے ؟ ایسے ہی ایک واقعے کو بیان کرتے ہوئے اس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کچھ جملے لکھے ہیں، جن سے آپ کا اصل مقصد ظاہر ہوتا ہے:

> آپ کے صاحب (حضرت علی) کا یہ خیال کہ انہوں نے عثمان کو شہید نہیں کیا، ہم اس کی تردید نہیں کرتے۔ لیکن کیا آپ لوگ قاتلین عثمان سے واقف نہیں ہیں؟ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ قاتلین عثمان ہی آپ کے صاحب (علی) کے ساتھی (بنے ہوئے) ہیں؟ وہ ان قاتلین کو ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم انہیں عثمان کے قصاص میں قتل کر دیں۔ اس کے بعد ہم آپ کے امیر کی اطاعت کرنے اور اتحاد جماعت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔[49]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہما کی ذات سے کوئی مسئلہ نہ تھا بلکہ ان کا مطالبہ صرف ان باغیوں کو الگ کر کے سزا دینے کا تھا۔ دوسری طرف باغی پارٹی کا پورا آئس برگ اب ظاہر ہو چکا تھا اور یہ اب اکٹھے ہو کر کوفہ میں جمع تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ کے اس مطالبے کو کوفہ کی جامع مسجد میں پیش کیا تو کئی ہزار آدمیوں نے اٹھ کر کہا کہ ہم قاتل عثمان ہیں۔

حضرت عمرو بن عاص، حضرت معاویہ سے کیسے جا ملے؟

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مصر فتح کیا اور پھر یہاں کے گورنر رہے۔ آپ نہایت ہی اعلی پائے کے سیاستدان تھے اور دور جاہلیت میں سفارت کا منصب آپ کے سپرد تھا۔ واقدی، ہشام کلبی اور ابو مخنف وغیرہ نے اپنی روایتوں میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خاص طور پر کردار کشی کی کوشش کی ہے کیونکہ آپ نے نہایت اعلی تدابیر کے ذریعے باغیوں کی سازشوں کو ناکام بنایا اور پھر ان کی مصری شاخ کا قلع قمع کیا۔ انہوں نے آپ پر یہ بہتان لگایا ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ کو معزول کیا تھا تو آپ ان کے خلاف ہو گئے، ان کی بہن آپ کے نکاح میں تھیں، جنہیں حضرت عمرو نے طلاق دے دی اور پھر لوگوں کو خلیفہ کے خلاف بھڑکانے لگے۔ یہ بے اصل روایات ہیں اور ان کا وضع کرنے والا آپ کے خلاف دل میں بغض رکھتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہی ہوتا تو حضرت معاویہ اور حضرت عثمان کے رشتے دار انہیں کس طرح اپنا قریبی ساتھی بلکہ کمانڈر انچیف بنا لیتے؟

جب باغیوں نے مدینہ کا محاصرہ کیا تو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ مدینہ سے نکل کر فلسطین چلے گئے۔ یہاں جب آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ نے بری طرح روئے اور اسی حالت میں دمشق چلے گئے۔ انہیں اپنے تن من کا بھی ہوش نہ

[49] ایضاً۔ 3/2-198

تھا۔ اس سے حضرت عمرو اور عثمان رضی اللہ عنہما کی باہمی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔[50]

واقدی وغیرہ نے ایسی جھوٹی روایتیں نقل کر دی ہیں جن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حضرت عمرو، دولت اور مصر کی گورنری کے لالچ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے تھے۔ اس ضمن میں وہ ایک قصہ پیش کرتے ہیں جس میں آپ نے اپنے بیٹوں عبداللہ اور محمد سے مشورہ کیا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما جو قدیم الاسلام اور نہایت ہی عابد و زاہد صحابی ہیں، نے اپنے والد کو مشورہ دیا کہ آپ گھر بیٹھ رہیں۔ محمد نے مشورہ دیا کہ آپ ملکی سیاست میں حصہ لیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ عبداللہ نے جو مشورہ دیا، وہ میری آخرت کے لیے اچھا ہے جبکہ محمد نے جو مشورہ دیا، وہ میری دنیا کے لیے اچھا ہے۔ یہ محض گھڑی ہوئی بے اصل روایت ہے جسے کی سند میں واقدی جیسے راوی موجود ہیں جنہیں محدثین نے کذاب قرار دیا ہے۔[51] حقیقت یہ ہے کہ اگر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ میدان عمل میں نہ آتے تو باغیوں کا سامنا کرنے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کافی مشکلات پیش آتیں کیونکہ باغی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام استعمال کر کے لوگوں کو حضرت معاویہ کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ چونکہ باغیوں کے منصوبوں کو حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنی بے مثال تدابیر سے خاک میں ملا دیا، اس وجہ سے ان کے راویوں نے آپ کو خاص کر نشانہ بنایا ہے۔

اکابر صحابہ کا رجحان کیا تھا؟

جو اکابر صحابہ، اس وقت موجود تھے، ان کا رجحان تین قسم کا تھا:

1۔ اکابر صحابہ کا ایک مختصر گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ باغیوں کی یہ کوشش رہی تھی کہ جب کوئی مخلص ساتھی حضرت علی کے ساتھ آ ملتا تو وہ اسے ہر ممکن طریقے سے بدظن کر کے علیحدہ کرنے کی کوشش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم الاسلام صحابہ کی بہت کم تعداد تھی جو حضرت علی کے ساتھ موجود تھی۔ ان میں حضرت عمار بن یاسر، قیس بن سعد بن عبادہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ شامل تھے۔

2۔ صحابہ کا ایک گروہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا جن میں حضرت نعمان بن بشیر، عمرو بن عاص، معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہم جیسے لوگ شامل تھے۔

3۔ ایک گروہ غیر جانبدار تھا جس میں حضرت سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، محمد بن مسلمہ، عبداللہ بن عمر، ابو موسی اشعری، اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم جیسے بزرگ صحابہ تھے۔

بدری صحابہ میں سے بہت کم تھے، جو جنگ صفین میں شریک ہوئے۔ مشہور تابعی محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں:

---

[50] ایضاً۔ 3/2-179

[51] ایضاً۔ 3/2-181

عبد الرزاق عن معمر عن أيوب عن ابن سيرين: جب فتنہ کی آگ بھڑکی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تعداد 10,000 تھی۔ ان میں سے صرف 40 کے علاوہ باقی جنگ کے لیے نہ نکلے۔ معمر کہتے ہیں: یعنی حضرت علی کے ساتھ نہ نکلے۔ اس وقت اہل بدر میں سے 240 سے زائد صحابہ زندہ تھے جن میں سے صرف ابو ایوب انصاری، سہل بن حنیف اور عمار بن یاسر ہی حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ تھے۔[52]

عبد الرزاق عن معمر عن أيوب عن ابن سيرين: ابن سیرین کہتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص سے پوچھا گیا: "آپ جنگ کیوں نہیں کرتے کیونکہ آپ تو اہل شوری میں سے ہیں اور اس معاملے میں بقیہ سب کی نسبت زیادہ حق دار ہیں؟" فرمایا: "میں اس وقت تک جنگ نہیں کروں گا جب تک کہ آپ لوگ مجھے ایسی تلوار نہ لا دیں جس کی دو آنکھیں، زبان اور ہونٹ ہوں اور وہ کافر اور مومن میں فرق کر سکے۔ میں نے جہاد کیا ہے اور میں جہاد کو سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے بہتر ہو تو میں اپنی جان کو روکنے والا نہیں ہوں۔[53]

باغیوں نے اہل شام کے خلاف کیا منصوبہ بندی کی؟

اہل شام کے خلاف باغیوں کا منصوبہ اب یہ تھا:

1۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد گھیرا ڈال دیا جائے اور ان کے مخلص ساتھیوں کو ان سے دور کر دیا جائے تاکہ وہ آزادانہ اپنی پالیسیوں کو نافذ نہ کر سکیں۔

2۔ اپنی پوری قوت اکٹھی کر کے اہل شام پر فیصلہ کن ضرب لگائی جائے تاکہ ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہ رہے۔

اس کے برعکس حضرت علی یہ چاہتے تھے کہ جیسے حضرات طلحہ و زبیر کے ساتھ سفارت کاری کے ذریعے معاملہ طے ہو گیا تھا، بالکل اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی معاملہ طے کر لیا جائے چنانچہ آپ نے حضرت معاویہ کو خطوط لکھے اور انہوں نے جوابی خطوط لکھے۔ افسوس کہ ان خطوط میں غالی راویوں نے بہت کچھ ملا دیا ہے۔

جنگ جمل کے بعد باغیوں نے بھی اپنی پوری طاقت کو بل سے باہر نکال لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح بھی آپ کو آزادانہ فیصلے نہ کرنے دیے جائیں ورنہ آپ اپنی حکمت و دانش سے ان کی تحریک کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ ان باغیوں نے کوششیں شروع کیں کہ مخلص ساتھیوں کو کسی نہ کسی طریقے سے حضرت علی سے دور کیا جائے۔ ان کی اس کوشش کا اندازہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے واقعے سے ہوتا ہے۔ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہمدان کے گورنر تھے۔ جب انہیں حضرت علی کی جانب سے بیعت کی دعوت ملی تو ان کے پاس آئے اور بیعت کر لی۔ اس کے بعد ان کے درمیان یہ مکالمہ ہوا:

---

[52] عبد الرزاق۔ المصنف۔ حدیث نمبر 20735۔ ص 11/357۔ بیروت: منشورات مجلس العلمی۔ (ac. 18 Dec 2009) www.waqfeya.com

[53] ایضاً۔ حدیث 20736

جریر: آپ مجھے معاویہ کے پاس قاصد بنا کر بھیجیے کیونکہ میری ان سے دوستی ہے۔ میں انہیں آپ کی اطاعت کے لیے قائل کر لوں گا۔

مالک اشتر: آپ انہیں ہرگز معاویہ کے پاس نہ بھیجیے کیونکہ میرے خیال میں یہ دل سے معاویہ کے ساتھ ہیں۔

علی: انہیں جانے دیجیے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ یہ وہاں سے کیا خبر لاتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک خط بھی بھیجا جس میں حضرت علی نے حضرت معاویہ کو اپنی بیعت کی دعوت دی تھی اور یہ لکھا تھا کہ مہاجرین و انصار نے ان کی بیعت کر لی ہے۔ جب جریر شام پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اہل شام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر روتے ہیں اور انہوں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قاتلین عثمان کو قتل نہ کریں گے، وہ اپنی بیویوں سے تعلق نہ کریں گے۔ جریر نے واپس آکر حضرت علی کو ساری بات سنائی تو اشتر کہنے لگا:

اشتر: میں نے آپ کو پہلے ہی منع کیا تھا کہ جریر کو قاصد بنا کر نہ بھیجیں۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اس کے دل میں آپ کی جانب سے عداوت اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ اس کے بھیجنے سے بہتر تھا کہ آپ مجھے قاصد بنا کر روانہ کر دیتے۔ یہ مزے سے معاویہ کے پاس رہا اور جو دروازہ اپنے لیے کھلوانا چاہا، اسے کھلوالیا ہو گا اور جسے بند کروانا چاہا، اسے بند کروا دیا۔

جریر: اگر تم شام جاتے تو وہ تمہیں تو ضرور ہی قتل کر دیتے کیونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ تم حضرت عثمان کے قاتلوں میں سے ہو۔

اشتر: واللہ جریر! اگر میں جاتا تو ان کے جواب کا انتظار نہ کرتا اور معاویہ پر ایسا حملہ کرتا کہ انہیں ہر فکر سے نجات دلا دیتا۔ اگر امیر المومنین (علی) میری تسلیم کریں تو میں تمہیں اور تم جیسے آدمیوں کو ایسے قید خانے میں بند کروں کہ جہاں سے اس وقت تک تم نہ نکل سکو، جب تک یہ معاملات طے نہ ہو جائیں۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ اس سے ناراض ہوئے اور معاملات سے الگ ہو کر قرقیسیا چلے گئے۔[54] جریر کے ساتھ، حضرت حنظلہ اور حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم ایسے شہر میں نہیں رہیں گے جس میں حضرت عثمان کو گالیاں دی جاتی ہیں۔[55] اس سے باغیوں کی اس تہمت کی بھی نفی ہوتی ہے جس کے مطابق یہ حضرت عدی بن حاتم کو اپنا ساتھی بتاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ ابو مسلم خولانی کے ساتھ پیش آیا:

حضرت علی اور معاویہ کے اختلاف کے دوران ابو مسلم خولانی لوگوں کی ایک جماعت لے کر حضرت معاویہ کے پاس پہنچے تاکہ انہیں حضرت علی کی بیعت پر آمادہ کریں اور جا کر حضرت معاویہ سے کہا: "آپ علی سے اختلاف کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں آپ علم و فضل میں ان جیسے ہیں؟" آپ نے فرمایا: "واللہ! میرا یہ خیال نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ علی مجھ سے بہتر ہیں، افضل ہیں اور خلافت کے بھی مجھ سے زیادہ مستحق ہیں۔ لیکن کیا آپ لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ عثمان کو ظلماً شہید کیا گیا ہے۔ میں ان کا چچازاد بھائی ہوں، اس لیے مجھے ان کے خون کا قصاص

---

[54] ایضاً۔ 3/2-183

[55] ابن عساکر۔ 39/510

لینے کا حق زیادہ ہے۔ آپ جا کر علی سے کہہ دیجیے کہ قاتلین عثمان کو میرے سپرد کر دیں، میں خلافت کو ان کے سپرد کر دوں گا۔"

یہ حضرت اب حضرت علی کے پاس آئے تو ان سے اس معاملہ پر بات کی۔ لیکن انہوں نے کسی ایک قاتل کو بھی ان کے حوالے نہ کیا (کیونکہ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔) جب اس بات کا علم اہل شام کو ہوا تو وہ حضرت معاویہ کے ہمراہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔[56]

باغیوں نے اب شام پر فیصلہ کن حملے کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت معاویہ نے ہرگز حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافت کو چیلنج نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کے مقابلے میں خود کسی خلافت کے دعوے دار تھے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ ان باغیوں کو گرفتار کر کے انہیں قرار واقعی سزا دی جائے، پھر وہ بیعت کر لیں گے۔ حضرت علی کو بھی یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار نہ تھے لیکن وہ اس پوزیشن میں نہ تھے کہ باغیوں کو گرفتار کر سکتے۔ اب باغی تحریک کا پورا آئس برگ ظاہر ہو چکا تھا اور یہ لوگ مخلصین کو حضرت علی کے قریب پھٹکنے نہ دے رہے تھے۔

باغیوں نے اب شام پر حملے کا منصوبہ بنایا جس کے سبب حضرت معاویہ کو بھی اپنے دفاع پر مجبور ہونا پڑا۔ مالک الاشتر اس معاملے میں پیش پیش تھا اور ادھر ادھر سے لوگوں کو اکٹھا کر رہا تھا۔ بنو فزارہ کے ایک شخص نے اشتر سے کہا: "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے شامی بھائیوں کے قتل کے لیے جائیں جیسا کہ تم ہمیں اپنے بصری بھائیوں کے قتل کے لیے لے گئے تھے۔ واللہ! ہم یہ ہرگز نہ کریں گے۔" اشتر نے سن کر کہا کہ لو اس کی خبر۔ یہ سن کر لوگ اس پر پل پڑے اور اسے لاتوں اور گھونسوں سے مار دیا۔[57]

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شام پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں فرمایا بلکہ یہ باغی لیڈر مالک الاشتر وغیرہ تھے جنہوں نے شام پر حملے کی منصوبہ بندی کی۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو شام پر حملہ کرنا کوئی ایسا ارجنٹ کام نہ تھا جس کے لیے باغی پارٹی کی سرکوبی کو پس پشت ڈالا جاتا۔ آپ نے اسی وجہ سے باغیوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص نہیں لیا تھا کہ اگر ان سے اس وقت قصاص لیا گیا تو ان کے قبائل بغاوت کے لیے کھڑے ہو جائیں گے، جنہیں سنبھالنا بہت مشکل ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر باغی پارٹی کے بارے میں یہ خطرہ تھا تو اہل شام کے بارے میں یہی خطرہ اس سے کہیں زیادہ موجود تھا۔ اگر باغیوں پر حملہ کرنے سے ان کے حمایتیوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا تو اہل شام پر حملہ کرنے سے ان کے حمایتیوں کی بغاوت کا اندیشہ کہیں زیادہ تھا۔ باغی تو محض چند ہزار تھے جبکہ ان کے مقابلے میں اہل شام لاکھوں تو رہے ہوں گے۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ چھوٹے خطرے سے بچنے کے لیے بڑے خطرے کو دعوت دے دیں۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے دس روپے کے نقصان سے بچنے کے لیے ہزار روپے خرچ کر دیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ شام پر حملہ دراصل باغیوں کی اسکیم تھی اور وہی اس میں پیش پیش تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے یقیناً حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ضرور استعمال کیا۔

---

[56] ابن کثیر۔ 11/425۔ نصر بن مزاحم۔ وقعۃ الصفین۔ 101۔ بیروت: دار الجیل

[57] ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغۃ۔ 3/174۔ (ac 11 Aug 2012) www.shiaonlinelibrary.com

حضرت علی نے باغیوں کے خلاف اب کاروائی کیوں نہ کی؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے معاملے میں تو ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ وہ موسم حج تھا اور مسلمانوں کی اکثریت مدینے میں موجود نہیں تھی جس کی وجہ سے باغیوں کو کاروائی کا موقع مل گیا۔ لیکن اب تو حج کو بھی کافی عرصہ گذر چکا ہے اور مسلمان اکٹھے ہو چکے تھے۔ اب کون سا امر مانع ہے کہ حضرت علی نے باغیوں کے خلاف کاروائی نہ کی؟ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ وہ حضرت معاویہ اور دیگر مخلص مسلمانوں کو ساتھ ملا کر ان باغیوں کا قلع قمع کر دیتے؟

اس سوال کے جواب میں ہمیں جنگ جمل و صفین کے درمیان کے زمانے پر غور کرنا پڑے گا۔ صورتحال اب کچھ یوں تھی:

- جنگ جمل کے بعد باغی تحریک کا پورا آئس برگ میدان میں نکل آیا تھا اور انہوں نے کوفہ کو اپنا مرکز بنالیا تھا۔
- باغی لیڈر جیسے مالک الاشتر، محمد بن ابی بکر وغیرہ نے حضرت علی اور ان کے مخلص ساتھیوں کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا اور مسلسل ان کی نگرانی کیے ہوئے تھے۔
- مخلص صحابہ و تابعین کی بڑی تعداد یا تو حضرت معاویہ کے ساتھ جا ملی تھی یا پھر یہ حضرات غیر متعلق ہو کر گھروں میں بند ہو چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں حضرت علی کے گرد یہی باغی نظر آ رہے تھے۔
- اگر کوئی مخلص مسلمان قریب آنے کی کوشش کرتا تو یہ باغی اسے حیلے بہانے سے دور کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

ان حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ان باغیوں کے خلاف کاروائی کر سکتے۔

حضرت علی نے باغیوں کے حملے میں ان کا ساتھ کیوں دیا؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حملہ باغیوں نے کرنا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں چل پڑے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ان باغیوں کو بالکل ہی بے شتر و مہار نہیں چھوڑنا چاہتے تھے کیونکہ آپ کو خدشہ تھا کہ اگر ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا تو یہ راستے بھر میں مسلم آبادیوں پر ظلم و ستم ڈھاتے جائیں گے۔ اس کا اندازہ رقہ کے واقعے سے ہوتا ہے جو کہ دریائے فرات کے کنارے ایک قصبہ تھا۔ اس واقعے کو خود ان باغیوں کے حمایتی ابو مخنف اور ہشام کلبی نے روایت کیا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر رقہ کے مقام پر پہنچا تو آپ نے اہل رقہ سے درخواست کی کہ دریائے فرات پر کشتیوں کا ایک پل بنا دیں تا کہ آپ یہاں سے گزر سکیں۔ اہل رقہ نے اس سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اہل شام پر لشکر کشی کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت علی نے انہیں مجبور نہیں کیا اور اس جگہ کو چھوڑ کر ایک اور مقام منبج کی طرف چل پڑے۔ اشتر اپنے ساتھیوں سمیت پیچھے رہ گیا اور اہل رقہ سے کہنے لگا:

اے قلعے والو! میں تمہیں اللہ عزوجل کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر امیر المومنین اپنے دستے سمیت منبج کے پل سے گزر گئے اور تم نے یہاں

ہمارے لیے پل نہ بنایا تو میں تم پر حملہ کر کے تمہارے مردوں کو قتل کر دوں گا اور تمہاری اس زمین کو اجاڑ کر رکھ دوں۔ تمہارے قبضے میں جتنے مال ہیں، وہ سب چھین لوں گا۔[58]

مجبوراً اہل رقہ کو پل بنانا پڑا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لشکر کے ساتھ نہ ہوتے تو یہ لوگ راستے کی آبادیوں کا کیا حشر کرتے؟ یہی وہ وجہ تھی جس کی خاطر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باغیوں کے ساتھ چلے تھے۔

آخر کار صفین کے مقام پر عراقی اور شامی لشکر ایک دوسرے کے مدمقابل آموجود ہوئے۔ طبری میں جنگ صفین کی تمام تر روایات ابو مخنف کی روایت کردہ ہیں اور اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے واقعات کو کس طرح اپنی مرضی کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کیا ہو گا۔ اس نے یہ کوشش کی ہے کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما میں ذاتی نوعیت کی دشمنی ثابت کی جائے حالانکہ حقیقت اس سے کہیں بعید ہے۔ ان دونوں صحابہ کے دل ایک دوسرے سے صاف تھے۔ یہ باغی ہی تھے جو اہل شام پر حملہ کرنے میں پیش پیش تھے اور مالک الاشتر اس مہم کا سربراہ بنا ہوا تھا۔ یہ روایت بھی ابو مخنف ہی کی ایجاد ہے کہ شامی لشکر نے عراقیوں پر پانی بند کر دیا تھا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں لشکر ذوالحجہ 36 کے پورے مہینے تک آمنے سامنے پڑے رہے اور سوائے چھوٹی موٹی جھڑپوں کے، ان کے درمیان جنگ نہ ہوئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جانب کے مخلصین جنگ نہ کرنا چاہتے تھے۔[59] اب شہادت عثمانی کو ایک سال گزر چکا تھا۔ جب محرم کا آغاز ہوا دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کو صلح کا پیغام بھیجا تاکہ گفت و شنید سے معاملہ سلجھایا جاسکے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس دوران بھی حج کے فریضے سے غافل نہ رہے اور انہوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو امیر حج بنا کر بھیجا۔

کیا حضرت معاویہ کا قصاص عثمان کا طریقہ درست تھا؟

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کیا، وہ درست نہ تھا۔ اول تو وہ حضرت عثمان کے براہ راست وارث نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر انہوں نے قصاص کا مطالبہ ہی کرنا تھا تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ نئے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر مشروط اطاعت کرتے اور پھر ان کی عدالت میں اپنا مقدمہ لے کر آتے۔ اس کے برعکس انہوں نے فوج کشی کا راستہ اختیار کیا۔ کیا یہ عمل درست ہے؟

یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کو قتل کا ایک عام واقعہ سمجھا جاتا ہے کہ جیسے عام قتل ہو جائے تو مقتول کے وارثوں کو چاہیے کہ وہ حکومت سے رجوع کر کے قاتل کو سزا دلوائیں۔ حضرت عثمان کی شہادت کا معاملہ اس سے

---

[58] طبری۔ 3/2-186

[59] ایضاً۔ 3/2-196

بالکل مختلف تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی پارٹی نے، جو کروڑوں مسلمانوں کے مقابلے میں محض چند ہزار افراد پر مشتمل تھی، بغاوت کر کے خلیفہ وقت کو یرغمال بنایا اور پھر انہیں شہید کر دیا۔ یہ محض قتل کا کیس نہیں تھا بلکہ "فساد فی الارض" کا کیس تھا۔ سورۃ المائدہ میں اس جرم کی سزا یہ بیان ہوئی ہے کہ ایسے مجرموں کو ان کے جرم کے تناسب سے سولی، ہاتھ پاؤں کاٹنے یا جلاوطنی میں سے کوئی ایک سزا دی جاسکتی ہے۔ اس موقع پر حضرت معاویہ ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان کے قصاص کا مطالبہ لے کر کھڑا ہو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام بھی درست نہیں ہے کہ انہوں نے فوج کشی کی۔ انہوں نے کوئی فوج کشی نہیں کی بلکہ ان باغیوں سے محض اپنا دفاع کیا۔ ان کے پاس نہایت ہی اعلیٰ تربیت یافتہ فوج موجود تھی جو پوری طرح ان سے وفادار تھی اور ان سے محبت کرتی تھی۔ یہ شامی افواج، قیصر روم کی نہایت ہی منظم افواج کا مقابلہ کر کے تجربہ حاصل کر چکی تھیں۔ اگر حضرت معاویہ کو فوج کشی کرنا ہوتی تو وہ اس وقت حملہ کرتے جب بصرہ میں حضرات طلحہ، زبیر اور عائشہ رضی اللہ عنہم قوت اکٹھی کر رہے تھے۔ اس وقت اگر باغیوں پر دو جانب سے ضرب لگائی جاتی تو وہ پس کر رہ جاتے۔ اس کے برعکس حضرت معاویہ نے مسلسل خط و کتابت اور سفارت کاری کے ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بارہا مطالبہ کیا کہ وہ ان باغیوں کو سزا دیں اور اگر اس کی طاقت نہیں رکھتے تو ان سے علیحدہ ہو جائیں۔ حضرت علی یقیناً ان باغیوں کو سزا دیتے لیکن ان کا مسئلہ یہ تھا کہ باغی پوری طرح معاملات کو کنٹرول کیے ہوئے تھے۔ اگر کوئی مخلص مسلمان ان کے قریب آتا تو باغی حیلے بہانے سے اسے دور کر دیتے تھے۔ اگر حضرت علی میدان سے ہٹ جاتے تو پھر یہ باغی مسلم آبادیوں کا نجانے کیا حشر کرتے اور کیا فتنہ و فساد پھیلاتے۔

جو بھی معاملہ ہوا، اس میں حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کی نیت پاکیزہ اور درست تھی۔ دونوں کے ہاں فرق صرف حکمت عملی (Strategy) کا تھا۔ اگر حضرت علی کو ان باغیوں نے گھیرے میں نہ لے رکھا ہوتا، تو حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ جیسے شریف النفس اور جلیل القدر صحابی کی سفارت کاری سے معاملہ طے پا جاتا اور حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے مخلص ساتھی مل کر ان باغیوں کی سرکوبی کرتے۔

جنگ صفین میں کیا حالات پیش آئے؟

دو ماہ جنگ بندی کے بعد محرم 37/657 جنگ شروع ہوئی اور اس میں مالک الاشتر اور اس کے ساتھی پیش پیش تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ فریقین کا نقصان کم سے کم ہو کیونکہ دونوں جانب مخلص مسلمان موجود تھے۔ آپ نے اپنی فوج کو یہ ہدایات دیں:

> آپ لوگ اس وقت تک ہرگز جنگ نہ کیجیے جب تک فریق مخالف پہل نہ کرے۔ اللہ عزوجل کا شکر ہے کہ آپ حق پر ہیں، آپ کی جانب سے جنگ کی ابتداء نہ ہونا آپ کے حق پر ہونے کی اضافی دلیل ہے۔ جب آپ ان سے جنگ کریں تو انہیں شکست دیجیے اور پشت پھیر کر نہ بھاگیے۔ کسی زخمی پر حملہ نہ کیجیے، نہ کسی کو بے لباس کیجیے، نہ کسی مقتول کے ہاتھ پاؤں یا ناک کان کاٹیے۔ اگر آپ لوگوں کے کجاووں تک پہنچ جائیں تو ان

کے خیموں کے پردے چاک نہ کیجیے اور نہ بلا اجازت ان کے گھروں میں داخل ہوں۔ نہ ان کے اموال میں سے میدان جنگ کے مال غنیمت کے علاوہ کچھ لیجیے۔ خواتین کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچایئے خواہ وہ آپ کی بے عزتی کریں اور آپ کے سرداروں اور نیک لوگوں کو برا بھلا کہیں۔ کیونکہ عورتیں اعضاء اور جذبات کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں۔ [60]

اس ضمن میں ابو مخنف نے ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے کہ دوران جنگ عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، شامی لشکر کی طرف سے آئے۔ ان کے مقابلے کے لیے محمد بن علی رضی اللہ عنہما نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب اپنے بیٹے کو حضرت عمر کے بیٹے کے مدمقابل دیکھا تو خود نکل کر گئے اور اپنے بیٹے کو روکا۔ پھر عبید اللہ سے فرمایا: "اگر مقابلہ کرنا ہی ہے تو مجھ سے کرو۔" اس موقع پر عبید اللہ نے وہی کیا جو کوئی بھی شریف شخص اچانک اپنے والد کے قریبی دوست کو دیکھ کر کرے گا۔ وہ یہ کہہ کر لوٹ گئے کہ "مجھے آپ کے مقابلے کی ضرورت نہیں۔" [61] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات میں ایک دوسرے کا کیسا احترام موجود تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ لڑائی سے دور رہے اور مقابلے پر نہ اترے۔ [62]

حضرت عمار بن یاسر کیسے شہید ہوئے؟

ابو مخنف کی روایت کے مطابق حضرت عمار جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ باغی راویوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو اپنا ساتھی ثابت کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے آپ پر یہ جھوٹا الزام عائد کیا ہے کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش میں باغیوں کے ساتھ شریک تھے۔ کبھی یہ کہا کہ حضرت عمار ہی دراصل ابن سوداء تھے۔ اس طرح سے انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عمار گویا انہی کے ساتھی تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص بالکل ابتداء ہی میں اسلام قبول کرتا ہے اور اس کی راہ میں اپنے والدین کو اپنے سامنے شہید ہوتا دیکھتا ہے، پھر وہ اپنی پوری عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ گزارتا ہے اور دین کے لیے جہاد میں حصہ لیتا ہے۔ کیا ایسے شخص سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ عمر کے آخری حصے میں وہ ان باغیوں سے مل جائے گا جن کی اسلام دشمنی واضح تھی؟ ابو مخنف وغیرہ نے اس ضمن میں جو روایات وضع کی ہیں، ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ باغی تحریک کی ساکھ (Credibility) کو کچھ بہتر بنایا جائے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بغاوت کا مجرم ثابت کیا جائے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک مرتبہ دیکھ کر فرمایا تھا کہ "عمار! آپ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔" یہ حدیث الہیثمی نے مجمع الزوائد اور احمد بن حنبل نے مسند میں بیان کی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے راوی حضرت عمرو

---

[60] ایضاً۔ 3/2-204

[61] ایضاً۔ 3/2-205

[62] ایضاً۔ 3/2-213

بن عاص رضی اللہ عنہ ہیں جن پر باغی، حضرت عمار کی شہادت کا الزام عائد کرتے ہیں۔

ہشام کلبی اور ابو مخنف نے اپنے الفاظ حضرت عمار کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے اور دعوی کیا ہے کہ حضرت عمار، نعوذ باللہ حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو اسلام دشمن سمجھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر انہی کے ساتھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ کو اقتدار کیوں سونپا؟ ان باغی راویوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ اپنے الفاظ کو صحابہ کرام کی زبان سے کہلوائیں تاکہ ان کی تحریک کو قوت ملے۔ طبری نے ان اسناد کے ساتھ بیان کی ہے:

1۔ حدثني محمد، عن خلف، قال: حدثنا منصور بن أبي نويرة، عن **أبي مخنف**. وحدثت عن **هشام بن الكلبي**، عن أبي مخنف، قال: حدثني مالك بن أعين الجهني، عن زيد بن وهب الجهني،

2۔ حدثني موسى بن عبد الرحمن المسروقي، قال: أخبرنا عبيد بن الصباح، عن **عطاء بن مسلم**، عن **الأعمش**، عن أبي عبد الرحمن السلمي

پہلی سند تو کسی تبصرے کی محتاج نہیں ہے کہ اس میں ابو مخنف اور ہشام کلبی تشریف فرما ہیں۔ دوسری سند میں عطاء بن مسلم (d. 135/753) ہیں جو کہ تدلیس (سند میں کمزور راوی کا نام چھپالینا) کے لیے مشہور ہیں۔[63] دوسرے صاحب اعمش (d. 147/765) ہیں جن میں تشیع کا رجحان پایا جاتا تھا اور وہ تدلیس بھی کیا کرتے تھے۔[64] محدثین کا مسلمہ اصول ہے کہ تدلیس کرنے والے راوی اگر 'عن' کہہ کر روایت کریں تو یہ قابل قبول نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ ذومعنی لفظ ہے۔

جنگ صفین میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت کی داستان سے متعلق طبری نے انہی حضرات سے منسوب ایک جھوٹی روایت نقل کی ہے۔ اس کی سند میں یہی عطاء بن مسلم اور اعمش موجود ہیں۔ عطاء سے اس روایت کو ولید بن صالح بیان کرتے ہیں جن کے حالات نامعلوم ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ صاحب باغی تحریک کا حصہ رہے ہوں۔

حدثنا أحمد بن محمد، عن وليد بن صالح، عن **عطاء بن مسلم**، عن **الأعمش**، عن أبي عبد الرحمن السلمي احمد بن محمد نے ہم سے یہ روایت بیان کی، ان سے ولید بن صالح، ان سے عطاء بن مسلم، ان سے اعمش، اور ان سے ابو عبد الرحمن السلمی نے یہ روایت بیان کی۔ ابو عبد الرحمن السلمی کا کہنا ہے کہ جب رات ہوئی تو میں نے ارادہ کیا کہ میں دشمنوں میں جاؤں اور یہ معلوم کروں کہ آیا ہماری طرح انہیں عمار کے قتل کا علم ہوا یا نہیں۔ جب جنگ بند ہوتی تھی تو دونوں جانب کے لشکری آپس میں ملتے تھے اور باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ شامیوں کے لشکر کی جانب چلا۔ جب میں شامی لشکر میں داخل ہوا تو چار افراد میدان جنگ میں گھوم رہے تھے۔ یہ معاویہ، ابو الاعور اسلمی، عمرو بن عاص اور عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم تھے۔ عبد اللہ ان چاروں میں سب سے بہتر تھے۔ میں ان کے

[63] ذہبی، سیر الاعلام النبلاء۔ شخصیت نمبر 3765

[64] ایضاً۔ شخصیت نمبر 2383

بیچ میں داخل ہو گیا تاکہ وہ باتیں سنوں جو مخالفین حضرت عمار کے بارے میں کریں۔

عبداللہ نے ایک شخص کی لاش دیکھ کر اپنے والد سے کہا: "ابا جان! کیا آپ نے آج اس شخص (عمار) کو بھی قتل کر دیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے بارے میں کچھ فرمایا تھا۔" عمرو کہنے لگے: "کیا فرمایا تھا؟" عبداللہ نے جواب دیا: "کیا آپ اس وقت ہمارے ساتھ نہ تھے جب ہم مسجد نبوی بنا رہے تھے۔ لوگ ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ اٹھا کر لا رہے تھے اور عمار دو دو پتھر اور دو دو اینٹیں اٹھا کر لاتے۔ اس سے ان پر غشی طاری ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور ان کے چہرے سے مٹی صاف کی اور فرمایا: "اے سمیہ کے بیٹے! افسوس کہ لوگ تو ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ اٹھا کر لاتے ہیں جبکہ تم دو دو پتھر اور دو دو اینٹیں لے کر آتے ہو۔ یہ کام تم ثواب کے لیے کر رہے ہو۔ افسوس! تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔"

عمرو بن عاص نے یہ سن کر اپنے گھوڑے کا رخ موڑ لیا۔ معاویہ نے انہیں پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ عمرو نے کہا: "کیا آپ نے وہ حدیث نہیں سنی جو عبداللہ بیان کر رہے ہیں؟" معاویہ نے پوچھا: "وہ کیا حدیث ہے؟" عمرو نے انہیں حدیث سنائی تو معاویہ نے جواب دیا: "تمہارا تو بڑھاپے سے دماغ خراب ہو گیا۔ تم حدیثیں بیان کرتے رہتے ہو اور تمام دن اپنے پیشاب میں لتھڑے رہتے ہو۔ کیا ہم نے عمار کو قتل کیا ہے؟ عمار کو تو اس نے قتل کیا ہے جو انہیں میدان میں گھسیٹ لایا ہے۔"[65]

روایت کی سند کا تجزیہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ سند کے تجزیے کے بعد متن کے تجزیے کی طرف آیئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا میدان جنگ میں ممکن ہے کہ مخالف فوج کا ایک شخص دوسری فوج کے کیمپ میں داخل ہو اور سیدھا اس فوج کے کمانڈروں اور جرنیلوں کے پاس جا پہنچے اور ان کی گفتگو سن لے اور کسی کو کوئی خبر نہ ہو۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ روایت کے مطابق سلمی نے یہ کام اس وقت کیا جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صرف تین ساتھی تھے اور وہ بھی کسی بند جگہ پر بھی نہیں بلکہ کھلے میدان میں موجود تھے۔

کسی نے صحیح کہا ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ روایت گھڑنے والا شاید حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی سے آگاہ نہیں تھا۔ روایت کے الفاظ کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اپنے والد محترم سے کہہ رہے تھے: " کیا آپ اس وقت ہمارے ساتھ نہ تھے جب ہم مسجد نبوی بنا رہے تھے۔ لوگ ایک ایک پتھر اور ایک ایک اینٹ اٹھا کر لا رہے تھے اور عمار دو دو پتھر اور دو دو اینٹیں اٹھا کر لاتے۔" یہ بات معلوم و معروف ہے کہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سن سات ہجری میں ایمان لائے جبکہ مسجد نبوی کی تعمیر سن ایک ہجری میں ہوئی۔ کیا حضرت عمرو کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ایمان لانے سے چھ برس قبل مدینہ آ کر مسجد نبوی کی تعمیر میں شریک ہوتے؟! اگر ایسا نہیں تھا تو پھر "کیا آپ اس وقت ہمارے ساتھ نہ تھے۔۔" کہنے کا کیا مطلب ہے؟

روایت کے الفاظ سے لگتا ہے کہ باغی راویوں کے دل حضرت معاویہ اور عمرو رضی اللہ عنہما کے بغض سے لبریز ہیں چنانچہ اس نوعیت کی بدزبانی وہی کر سکتے ہیں کہ " تمہارا تو بڑھاپے سے دماغ خراب ہو گیا۔ تم حدیثیں بیان کرتے رہتے ہو اور تمام دن اپنے پیشاب میں

[65] طبری۔ 3/2-234

لتھڑے رہتے ہو۔" انہوں نے یہ الفاظ گھڑ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیے ہیں جن کا حلم اور تدبر ضرب المثل ہے اور ان کے مخالفین بھی مانتے ہیں کہ وہ انتہا درجے کے بردبار انسان تھے۔ وہ تو کبھی کسی عام آدمی سے بھی ایسی سخت کلامی نہ کرتے تھے کجا یہ کہ اپنی ہی فوج کے کمانڈر انچیف سے ایسی بات کرتے۔

رہا یہ سوال کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو قتل کس نے کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے بارے میں یہ ارشاد موجود ہے کہ انہیں ایک باغی گروپ قتل کرے گا۔ عین ممکن ہے کہ قاتلین عثمان کی باغی تحریک کے لوگوں ہی نے انہیں میدان جنگ میں شہید کر دیا ہو تاکہ اس کا الزام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لگا کر انہیں باغی ثابت کیا جا سکے۔ بعض لوگ ابو مخنف وغیرہ کے پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر حضرت معاویہ کو باغی کہتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ حضرت معاویہ نے کبھی حضرت علی کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا بلکہ انہوں نے بار بار یہ کہا کہ ہم آپ کی خلافت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ قاتلین عثمان سے قصاص لیجیے۔ اگر آپ اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو ہمیں ان سے مقابلہ کرنے دیجیے۔ انہوں نے کبھی خود حضرت علی کے خلاف تلوار نہ اٹھائی۔ ہاں جب باغیوں نے ان پر حملہ کیا تو انہوں نے اپنا دفاع ضرور کیا۔

جنگ بندی کیسے ہوئی؟

دوران جنگ اہل شام نے قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کر دیا اور دعوت دی کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ عراقی لشکر کی غالب اکثریت نے اس دعوت کو قبول کیا اور یوں جنگ رک گئی۔ یہ ایک نہایت ہی مبارک اقدام تھا جس کے باعث مسلمانوں میں خونریزی ختم ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی چونکہ باغیوں کی امیدوں پر پانی بھی پھر گیا، اس وجہ سے انہوں نے اس معاملے میں بھی اپنی روایتوں میں دل کے پھپھولے پھوڑے۔

ابو مخنف کا بیان ہے کہ جنگ میں جب عراقی لشکر غالب آنے لگا تو اہل شام نے قرآن نیزوں پر بلند کر دیے۔ اس کا خیال ہے کہ محض جنگی تدبیر کے طور پر ان حضرات نے یہ کام کیا اور اس کا مشورہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دیا۔ ہمارے مورخین نے بھی بغیر سوچے سمجھے اس روایت کو نقل کر دیا ہے اور یہ نہیں دیکھا کہ اس روایت کا صرف ایک راوی ہے اور وہ ابو مخنف ہے جو جنگ صفین کے سو سال بعد اس کے واقعات لکھ رہا ہے۔ اس نے بغیر کسی سند کے براہ راست حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی گفتگو نقل کی ہے جیسے وہ خود ان کے ساتھ خیمے میں موجود تھا اور ٹیپ ریکارڈر اس کے پاس تھا۔

درایت کے نقطہ نظر سے غور کیجیے تو اس کے بالکل الٹ بات ہونی چاہیے۔ عراقی لشکر کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ ان میں مخلص مسلمان بھی تھے اور قاتلین عثمان کی پارٹی بھی۔ ان کے دل قطعی طور پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں تھے۔ اس لشکر میں بڑی تعداد ان مخلص مسلمانوں کی تھی جو جنگ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ دوسری طرف شامی لشکر یکجان تھا۔ اس میں غالب تعداد مخلص مسلمانوں کی تھی اور وہ باغی تحریک کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک نیم دل (Half-hearted) لشکر کیسے

اس مخلص اور کمٹڈ لشکر پر غالب آ گیا؟ دنیا میں جنگوں کی تاریخ کو دیکھا جائے تو ہمیشہ وہی لشکر غالب آتا ہے جو اپنے مقصد کے ساتھ کمٹڈ ہو خواہ اس کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔ تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس میں دو لشکر تعداد اور اسلحے میں برابری کی سطح پر ہوں اور نیم دل لشکر غالب آیا ہو۔ ہاں اگر تعداد اور اسلحے میں بہت زیادہ فرق ہو تو الگ بات ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عراقی لشکر کے غالب آنے کی بات محض افسانہ ہی ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ شامی لشکر کی جانب سے صلح کے پیغام کو سازش قرار دیا جائے۔ کتب تاریخ میں ہمیں ایسی روایات بھی ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی و معاویہ دونوں ہی جنگ نہ چاہتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم نے دونوں جانب کے مقتولین کو دیکھا تو انہیں اتنا دکھ ہوا کہ وہ رو پڑے۔ پھر انہوں نے حضرت معاویہ کی اجازت سے حضرت علی رضی اللہ عنہما کو صلح کی دعوت دی۔ یہ ایک نہایت ہی پر خلوص اقدام تھا اور حضرت علی نے اس خلوص کا جواب خلوص سے دیا۔

حدثني أحمد بن إبراهيم الدورقي، حدثنا وهب بن جرير، عن جويرية، عن يحيي بن سعيد، عن عتبة. قال: عتبہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ صفین کے میدان میں اترے اور یہاں کئی دن تک ہم نے جنگ کی۔ ہمارے مابین مقتولین کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی اور گھوڑے بھی زخمی ہوئے۔ علی نے عمرو بن عاص کو پیغام بھیجا: "مقتولین بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ جنگ روک دیجیے تاکہ ہم ان تمام مقتولین کو دفن کر لیں۔" انہوں نے اس دعوت کو قبول کیا۔ اس کے بعد (دونوں جانب کے) لوگ آپس میں گھل مل گئے۔ (راوی نے یہ کہہ کر اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈال لیں۔) لشکر علی کا ایک شخص جو شدت دکھا رہا تھا، اسے اس کے کیمپ میں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش یہاں سے نکال دی گئی۔ عمرو اس خندق (جہاں مقتولین کو دفن کیا جا رہا تھا) کے دروازے پر بیٹھے تھے اور دونوں فریقوں کے مقتولین کی تعداد ان سے مخفی نہ تھی۔ علی کے ساتھیوں میں سے ایک شخص کی لاش لائی گئی جو کہ معاویہ کے کیمپ میں قتل کیا گیا تھا۔ عمرو یہ دیکھ کر رو پڑے اور بولے: "یہ شخص مجتہد تھا۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے حکم پر سختی سے کاربند تھے مگر مارے گئے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ علی اور معاویہ دونوں ہی اس کے خون سے بری ہیں۔" [66]

حدثنا عبد الله حدثني أبي حدثنا يعلى بن عبيد عن عبد العزيز بن سياه عن حبيب بن أبي ثابت عن أبي وائل: ابو وائل کہتے ہیں: ہم صفین میں تھے جب اہل شام کے ساتھ جنگ خوب زور پکڑ گئی۔ شامی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ عمرو بن عاص نے معاویہ کو کہا: "آپ علی کی طرف قرآن بھیج کر ان کو کتاب اللہ کی طرف دعوت دیجیے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔" معاویہ کی طرف سے ایک آدمی علی کے پاس آیا اور کہنے لگا: "ہمارے اور آپ کے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔" علی نے اسے قبول کر لیا اور فرمایا: "میں لوگوں کو اس کی دعوت دینے کا زیادہ حق دار ہوں۔ ٹھیک ہے، ہمارے اور آپ کے درمیان اللہ کی کتاب فیصلہ کرے گی۔" [67]

[جنگ کے بعد حضرت علی نے مختلف شہروں میں ایک سرکلر بھیجا، جس میں لکھا تھا:] سب نے دیکھا کہ جنگ نے دونوں فریقوں کو دانت سے کاٹنا

[66] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 3/104

[67] احمد بن حنبل۔ المسند۔ باب سہل بن حنیف۔ حدیث 15975

> شروع کر دیا ہے اور فریقین میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں تو وہ میری بات ماننے پر آمادہ ہو گئے اور میں نے بھی ان کی بات کو مان لیا **اور تیزی سے بڑھ کر ان کے مطالبہ صلح کو قبول کر لیا۔** یہاں تک کہ ان پر حجت واضح ہو گئی اور ہر طرح کا عذر ختم ہو گیا۔[68]

صلح کے بعد ایک معاہدہ تحریر کیا گیا، جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ جنگ کے دوران جن لوگوں کو جنگی قیدی بنایا گیا تھا، فریقین نے انہیں آزاد کر دیا۔[69]

ان روایتوں کے برعکس ابو مخنف نے ایسی روایتیں درج کی ہیں، جن کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ تو اس جنگ کو جاری رکھنا چاہتے تھے جبکہ باغیوں کے ایک گروپ نے، جو بعد میں خوارج بنے، انہیں مجبور کر کے یہ جنگ رکوائی اور پھر تحکیم کو بنیاد بنا کر یہ لوگ آپ کی فوج سے الگ ہو گئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خوارج جنگ رکوانا چاہتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی بات مان لی تو پھر ان کے پاس کیا جواز تھا کہ وہ آپ سے علیحدہ ہوتے؟ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں صلح اور جنگ بندی تو باغیوں کے تمام گروپوں کی موت تھی۔ کیا ان کا دماغ خراب ہو گیا تھا کہ وہ مسلمانوں میں صلح کروا کر اپنے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتے۔ جنگ کی جس آگ کو انہوں نے اتنی محنت سے بھڑکایا تھا، اسے خود ہی ٹھنڈا کر کے کیا وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے چلے تھے؟ کیا وہ اس درجے میں احمق ہو گئے تھے کہ اس "خود کش صلح" کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کرنے لگے۔

افسوس کہ ہمارے پاس ابو مخنف سے ہٹ کر غیر جانبدار ذرائع سے ایسی روایات موجود نہیں ہیں۔ جو جنگ بندی کی تفصیلات کو بیان کریں البتہ ابو مخنف ہی کی یہ روایت معقول نظر آتی ہے:

> اشعث بن قیس، حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے پاس آئے اور کہا: "میرا خیال ہے کہ سب لوگ اس پر راضی اور خوش ہیں کہ قرآن کے حکم پر چلنے کی جو دعوت انہیں دی گئی ہے، وہ اسے قبول کر لیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں معاویہ کے پاس جا کر ان کا ارادہ معلوم کروں تاکہ آپ ان کے سوالات پر غور فرما سکیں۔" حضرت علی نے فرمایا: "اگر آپ کا یہی خیال ہے تو پھر ان سے جا کر پوچھیے۔" اشعث، حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے پاس آئے اور پوچھا: "معاویہ! آپ نے یہ قرآن کس لیے اٹھوائے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا: "اس لیے کہ ہم اور آپ ان احکامات پر عمل کریں جو اللہ عزوجل نے اپنی کتاب میں دیے ہیں۔ **آپ اپنے میں سے ایک ایسا شخص فیصلے کے لیے متعین کیجیے جس پر ہم راضی ہوں اور ہم بھی اپنے میں سے ایک شخص کو متعین کر دیتے ہیں (جس پر آپ راضی ہوں۔)** ہم دونوں فریقوں پر یہ لازم ہو گا کہ جو کچھ اللہ عزوجل کی کتاب میں پائیں، اس پر عمل پیرا ہوں اور اس سے سر مو تجاوز نہ کریں۔ جس امر پر یہ دونوں متفق ہو جائیں، ہم اس کی پیروی کریں۔"
>
> اشعث بن قیس نے جواب دیا: "یہ حق کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ حضرت علی کے پاس لوٹ کر آئے اور جو کچھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما

---

[68] سید شریف رضی۔ نہج البلاغہ۔ خط نمبر 58

[69] طبری۔ 3/2-250

نے کہا تھا، انہیں مطلع کیا۔ علی کے ساتھیوں نے جواب دیا: "ہم نے یہ بات قبول کی اور ہم اس سے راضی ہیں۔" [70]

مسند احمد کی اوپر بیان کردہ روایت سے حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس جنگ کو رکوانے والے مخلص مسلمان تھے جو آپس میں جنگ نہ چاہتے تھے اور پہلے ہی دو ماہ تک اس جنگ کو ٹالتے چلے آئے تھے۔ جنگ بندی کی تجویز حضرت عمرو بن عاص کی طرف سے آئی اور حضرت علی نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ حضرت علی جیسے جلیل القدر صحابی سے ایسی امید نہیں کی جا سکتی ہے کہ آپ مسلمانوں کا خون بہانا چاہتے ہوں گے۔ آپ کا جو خطبہ ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ خونریزی سے کس حد تک بچنا چاہتے تھے۔ جنگ صفین کے بارے میں آپ کے جو تاثرات آگے آ رہے ہیں، ان سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔

جنگ صفین پر حضرت علی کے تاثرات کیا تھے؟

اس ضمن میں متعدد روایتیں حدیث و تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس جنگ کا شدید افسوس تھا اور آپ اپنی جان دے کر بھی جنگ کو بند کروانا چاہتے تھے۔ چند روایات یہ ہیں:

عمرو جنگ صفین میں پیچھے رہ گئے تھے۔ جب علی رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس پر مواخذہ کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ملا تو انہوں نے فرمایا: "آپ فکر مت کیجیے۔ اللہ کی قسم کہ میں نے انہیں (حضرت علی) کو صفین والے دن (یا فلاں فلاں دن) فرماتے تھے سنا تھا: 'کاش! میری والدہ نے مجھے پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔ کاش! میں آج کے دن سے پہلے ہی مر گیا ہوتا۔'" [71]

سلیمان بن مہران (الاعمش) کہتے ہیں کہ میں نے (جنگ صفین کے) ایک عینی شاہد سے سنا کہ صفین کے دن حضرت علی ہونٹ کاٹ رہے تھے اور فرما رہے تھے: "اگر میں جانتا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا تو (کوفہ سے) باہر ہی نہ نکلتا۔ ابو موسی! آپ فیصلہ کیجیے، خواہ یہ میری گردن اڑا دینے ہی کا ہو۔" [72]

اسی موقع پر آپ نے لوگوں کو حضرت معاویہ کی امارت پر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے فرمایا:

حارث کہتے ہیں: جب علی، صفین سے واپس آئے تو آپ جان چکے تھے کہ اب آپ کا اقتدار کبھی مستحکم نہ ہو گا۔ آپ ایسی چیزوں کے بارے میں بات کرنے لگے جن کے بارے میں آپ نے پہلے بات نہ کی تھی اور ایسی احادیث بیان کرنے لگے جو پہلے بیان نہ کی تھیں۔ انہی باتوں میں سے آپ کا یہ ارشاد بھی ہے: "لوگو! معاویہ کی گورنری کو ناپسند نہ کرو۔ واللہ! اگر تم نے انہیں کھو دیا تو تم ضرور دیکھو گے کہ سر، شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہوں گے جیسا کہ حنظل کا پھل اپنے پودے سے گرتا ہے۔" [73]

---

[70] طبری۔ 3/2-244

[71] بخاری۔ تاریخ الکبیر۔ باب "عمرو"۔ راوی نمبر 2717

[72] بلاذری۔ 3/107۔ ابن ابی شیبہ۔ المصنف۔ کتاب الجمل، باب صفین۔ جلد 14۔ حدیث 38848

[73] ایضاً۔ 38850۔ ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغۃ۔ 12/40

بعد کی تاریخ نے ثابت کیا کہ حضرت علی کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں رائے کس قدر درست تھی۔ جب تک حضرت معاویہ زندہ رہے، امت فتنہ وفساد سے محفوظ رہی اور جیسے ہی ان کی وفات ہوئی، خانہ جنگیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت علی نے اپنے اور اہل شام کے مقتولین کو جنتی قرار دیا۔

یزید بن اصم کہتے ہیں کہ جب علی اور معاویہ کے درمیان صلح ہو گئی تو علی اپنے مقتولین کی جانب نکلے اور فرمایا: "یہ لوگ جنت میں ہوں گے۔" پھر معاویہ کے مقتولین کی طرف چلے اور فرمایا: "یہ لوگ بھی جنت میں ہوں گے۔ (روز قیامت) یہ معاملہ میرے اور معاویہ کے درمیان ہو گا۔ فیصلہ میرے حق میں دیا جائے گا اور معاویہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ مجھے میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بتایا تھا۔"[74]

اہل تشیع کی مشہور کتاب نہج البلاغہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک مراسلہ (Circular) نقل کیا گیا ہے جو آپ نے جنگ صفین کے بارے میں شہروں میں بھیجا۔ اس میں لکھا ہے:

حضرت علی علیہ السلام کا خط، جو آپ نے شہروں کی جانب لکھا، اس میں آپ نے اپنے اور اہل صفین کے درمیان ہونے والے واقعے کو بیان فرمایا۔

ہمارے معاملہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ہم اہل شام کے ساتھ ایک میدان میں اکٹھے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ **ہمارا اور ان کا رب ایک، ہمارا اور ان کا نبی ایک، ہماری اور ان کی اسلام کے متعلق دعوت ایک۔ اللہ پر ایمان اور اس کے رسول کی تصدیق کے معاملے میں نہ ہم ان سے بڑھ کر تھے اور نہ وہ ہم سے بڑھ کر۔** صرف ایک معاملے میں ہم میں اختلاف ہوا اور وہ تھا خون عثمان کا جبکہ ہم اس سے بری تھے۔ ہم نے اس کا حل یہ پیش کیا کہ جو مقصد آج نہیں حاصل ہو سکتا ہے، اس کا وقتی علاج یہ کیا جائے کہ آتش جنگ کو خاموش کر دیا جائے اور لوگوں کو جذبات کو پر سکون ہو لینے دیا جائے۔ اس کے بعد جب حکومت کو استحکام حاصل ہو جائے گا اور حالات سازگار ہو جائیں گے تو ہم اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ حق (یعنی قصاص) کو اس کے مقام پر رکھ لیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ اس کا علاج صرف جنگ ہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ نے اپنے پاؤں پھیلا دیے اور جم کر کھڑی ہو گئی۔ شعلے بھڑک اٹھے اور مستقل ہو گئے۔ سب نے دیکھا کہ جنگ نے دونوں فریقوں کو دانت سے کاٹنا شروع کر دیا ہے اور فریقین میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں **تو وہ میری بات ماننے پر آمادہ ہو گئے اور میں نے بھی ان کی بات کو مان لیا اور تیزی سے بڑھ کر ان کے مطالبہ صلح کو قبول کر لیا۔** یہاں تک کہ ان پر حجت واضح ہو گئی اور ہر طرح کا عذر ختم ہو گیا۔ اب اس کے بعد کوئی اس حق پر قائم رہ گیا تو گویا اپنے آپ کو ہلاکت سے نکال لے گا ورنہ اسی گمراہی میں پڑا رہ گیا تو ایسا عہد شکن ہو گا جس کے دل پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ گردش ایام اسی کے سر پر منڈلا رہی ہو گی۔ [75]

یہ تحریر وہ خط ہے جو نہج البلاغہ کے مولف شریف رضی کے مطابق مختلف شہروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے بھیجا گیا تاکہ اس جنگ سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقطہ نظر کو واضح کیا جا سکے۔ انڈر لائن الفاظ سے واضح ہے کہ آپ، اہل شام کو عین مسلمان سمجھتے تھے اور ہر حال میں صلح چاہتے تھے۔ اس سے ابو مخنف کی ان روایات کی بھی تردید ہو جاتی ہے جن کے مطابق حضرت علی

---

[74] ابن عساکر۔ 59/139

[75] سید شریف رضی۔ نہج البلاغہ۔ خط نمبر 58

جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے اور اپنے ساتھیوں کے مجبور کر دینے پر وہ بادل نخواستہ جنگ بندی کے لیے تیار ہوئے تھے۔

کیا جنگ صفین سے بیرونی قوتوں نے فائدہ اٹھایا؟

یہاں پر تاریخ کے طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر مسلم دنیا میں انتشار پیدا ہوا تھا، تو کیا بیرونی قوتوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور اگر نہیں کی تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اہل سیاست کی یہ نفسیات ہے کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانے (Opportunism) کے ماہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ سوال دلچسپ ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کے دونوں بیرونی دشمنوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ ہماری مراد ایران اور روم کی طاقتوں سے ہے۔ اس کی ہم کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں۔

ایران کی ساسانی سلطنت کا خاتمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں ہو چکا تھا اور اس کا آخری بادشاہ یزدگرد ادھر ادھر چھپتا پھر رہا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یزدگرد بھی ایک پن چکی والے کے ہاتھوں مارا گیا۔ جب مسلمانوں نے ایرانیوں کو شکست دی تو ان کی ہزاروں سالہ بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ عام ایرانیوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا کیونکہ دور بادشاہت کی جو اشرافیہ (Elite Class) تھی، وہ ان کا خون چوس رہی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں انہی کی زمینوں پر بحال رکھا اور فصلوں کی نصف پیداوار ان کا حق قرار پائی۔ فصل کا بقیہ نصف حصہ بطور خراج وصول کر کے سرکاری خزانے میں داخل کیا جاتا جسے انہی عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جاتا۔ ایرانی پروفیشنلز جن میں ان کے فوجی، ڈاکٹر، انجینئر، اکاؤنٹنٹ اور دیگر شعبوں کے ماہرین تھے، اسلامی فوج اور سول سروس کا حصہ بن گئے۔

یہ تمام فوائد ایرانی عوام کو پہنچے لیکن ان کی وہ اشرافیہ جو ملکی وسائل پر قابض چلی آ رہی تھی اور ایرانی بادشاہت سے ان کے مفاد وابستہ تھے، اسے ہضم نہ کر سکی۔ اشرافیہ کی ہمیشہ سے یہ حکمت عملی رہی ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے "قوم پرستی" کا حربہ استعمال کرتی ہے۔ اس کی بہت سے مثالیں ہمارے دور میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس اشرافیہ نے ایرانی قوم پرستی کی تحریک اٹھائی اور حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں ایرانی علاقوں میں بار بار بغاوتیں پیدا کیں جو کہ ناکام رہیں۔ ان میں اصطخر اور جور کی بغاوتیں زیادہ مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ بلخ، طبرستان، کرمان، سجستان وغیرہ کے علاقوں میں بھی بغاوتیں ہوتی رہیں جنہیں ان علاقوں کے گورنر بآسانی دباتے رہے۔

جنگ صفین کے موقع پر ایرانی قوم پرست اشرافیہ نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس زمانے میں ایران میں بغاوت برپا کی۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ یزدگرد (d. 30/651) کی موت کے بعد اب ان کا کوئی مرکزی بادشاہ نہ تھا، جس کی وجہ سے قوم پرستی کی یہ تحریک زور نہ پکڑ سکی۔ عام ایرانی بھی اس بغاوت سے دور رہے کیونکہ اس میں ان کا سراسر نقصان تھا۔ حضرت علی نے جنگ صفین کے بعد اپنے قریبی ساتھی اور حضرت معاویہ کے بھائی زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم کو یہ بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا اور وہ ایرانی قوم پرستوں

کو روندتے ہوئے چلے گئے۔ اس طرح انہوں نے ایران میں دوبارہ امن وامان قائم کر دیا۔[76]

دوسری طرف مغرب میں قیصر روم نے بھی جنگ صفین کا فائدہ اٹھانے کے لیے شام پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

> قیصر روم نے حضرت معاویہ کو ساتھ ملانے کی خواہش ظاہر کی۔ چونکہ ان کا اقتدار رومی سلطنت کے لیے خطرہ بن چکا تھا، اور شامی افواج اس کی فوجوں کو مغلوب کر کے سرنگوں کر چکی تھیں، اس لیے اس نے جب یہ دیکھا معاویہ، علی (درحقیقت باغی تحریک نہ کہ حضرت علی) سے جنگ میں مشغول ہیں تو وہ بڑی فوج کے ساتھ قریبی علاقے میں چلا آیا اور حضرت معاویہ کو لالچ دیا (کہ وہ اس کے ساتھ مل جائیں۔)
>
> حضرت معاویہ نے اس کو لکھا: "واللہ! اگر تم نہ رکے اور اے لعین! اپنے ملک واپس نہ گئے تو میں اور میرا چچازاد بھائی (علی) آپس میں اتحاد کر لیں گے اور تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں گے۔ روئے زمین کو تم پر تنگ کر کے رکھ دیں گے۔ اگر تم نے اپنا ارادہ پورا کرنے کی ٹھان ہی لی ہے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی (علی) سے صلح کر لوں گا۔ پھر تمہارے خلاف ان کا جو لشکر روانہ ہو گا، اس کے ہر اول دستے میں شامل ہو کر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا دوں گا اور تمہاری حکومت کو گاجر مولی کی طرح اکھاڑ پھینکوں گا۔" یہ خط پڑھ کر قیصر روم ڈر گیا اور اس نے جنگ بندی کی اپیل کی۔[77]

اس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے امت کے لیے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ باغی راویوں نے حضرت معاویہ پر تہمت عائد کی ہے کہ انہوں نے اقتدار کے لالچ میں حضرت علی رضی اللہ عنہما سے جنگ کی تھی۔ اگر ان کا مقصد محض اقتدار پر قبضہ ہوتا تو وہ جھٹ سے قیصر روم کی پیشکش قبول کر لیتے اور اس کی فوجوں کو ساتھ ملا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرتے لیکن ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ باغی تحریک سے اپنا دفاع کیا جائے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ نہیں کیا بلکہ جب باغیوں نے ان پر حملہ کیا تو انہوں نے محض اپنا دفاع کیا۔

واقعہ تحکیم

واقعہ تحکیم تاریخ صحابہ کا نہایت ہی مبارک واقعہ ہے جس کی بدولت مسلمانوں میں خونریزی رک گئی اور وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئے لیکن اس واقعے کو باغیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں اتفاق رائے کا پیدا ہو جانا ان کی موت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان باغیوں نے واقعہ تحکیم کی ایسی مکروہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ظاہر ہو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں باہم دشمنی تھی اور ان کا کردار ہمارے دور کے دنیا دار سیاستدانوں سے مختلف نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ تاریخ طبری میں جنگ صفین کی طرح واقعہ تحکیم کی بھی کل روایات بھی ابو مخنف ہی کی روایت کردہ ہیں۔ ان صاحب کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وہ انہی

---

[76] طبری۔ 3/2-326

[77] ابن کثیر، 11/400۔ ترجمہ معاویہ بن ابی سفیان (سنہ 60ھ)

باغیوں کے ساتھی ہیں۔

فیصلہ کرنے والے کون تھے اور ان کا تعین کیسے ہوا؟

فیصلہ کرنے کے لیے جن دو حضرات کے نام پر مسلمانوں کا اتفاق ہوا، وہ حضرت ابو موسی اشعری اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما ہیں۔ ان دونوں حضرات کی جلالت شان کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان دونوں حضرات کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظامی عہدے دیے تھے۔ حضرت ابو موسی اشعری پہلے تینوں خلفائے راشدین کے دور میں مختلف علاقوں کے گورنر رہے اور حضرت عثمان کی شہادت کے وقت آپ کوفہ کے گورنر تھے۔ آپ ایسے صائب الرائے تھے کہ طویل عرصہ حکومتی امور چلاتے رہے۔ آپ کی روایت کردہ احادیث سے آپ کے فہم دین و دنیا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تحکیم کی روایات میں انہیں معاذ اللہ ایک بے وقوف شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دوسری طرف حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ایسی ہستی ہیں جن پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد فرمایا۔ آپ نے حضرت عمرو کو کئی لشکروں کا امیر بنایا اور انہیں عمان کا گورنر مقرر فرمایا۔ اسی طرح آپ نے حضرت ابو موسی کو یمن کے علاقے عدن کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے: "اے عمرو! آپ صاحب رائے ہیں اور اسلام کے معاملے میں ہدایت یافتہ ہیں۔"[78] اور فرمایا: "عمرو بن عاص قریش کے صالح لوگوں میں سے ہیں۔"[79]

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ابو مخنف اور ان کی کی قبیل کے راویوں نے دنیا پرست ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس آپ کی دنیا سے بے رغبتی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک مہم کا سربراہ بنا کر بھیجا اور فرمایا:

> "عمرو! میں آپ کو ایک سمت میں بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالی آپ کو سلامت رکھیں گے اور آپ کو مال غنیمت عطا فرمائیں گے اور اس مال سے ہم بھی آپ کو دیں گے۔" انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں نے مال کے لالچ میں اسلام قبول نہیں کیا۔ میں تو جہاد کی رغبت اور آپ کی صحبت میں رہنے کے لیے مسلمان ہوا ہوں۔" آپ نے فرمایا: "اے عمرو! صالح مال، صالح شخص کے لیے اچھا ہوتا ہے۔"[80]

عہد فاروقی میں حضرت عمرو ایک اعلی پایہ کے منتظم اور جرنیل بن کر ابھرے۔ فلسطین اور مصر آپ کے ہاتھوں فتح ہوئے۔ حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں آپ مصر کے گورنر رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ حضرت معاویہ سے جا ملے اور ان کی حکمت عملی نے باغی تحریک کو ناکوں چنے چبوائے۔

---

[78] ابن عساکر۔ 46/134۔ باب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ

[79] ایضاً۔ 46/137

[80] ایضاً۔ 46/143

حضرت علی کی جانب سے بطور حکم (جج) حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا گیا جو نہایت ہی جلیل القدر صحابی تھے اور جنگ صفین میں غیر جانبدار رہے تھے۔ ابو مخنف نے اپنی روایتوں میں یہ زور لگانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابو موسی سے خوش نہیں تھے اور مالک الاشتر کو حَکَم (فیصلہ کرنے والا) بنانا چاہتے تھے مگر آپ کے ساتھیوں نے آپ کو مجبور کر کے انہی کو مقرر کروادیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بھی حکم بننے پر خوش نہ تھے۔

سوال یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ روایت میں یہ شرط طے کی گئی تھی: "**<u>آپ اپنے میں سے ایک ایسا شخص فیصلے کے لیے متعین کیجیے جس پر ہم راضی ہوں اور ہم بھی اپنے میں سے ایک شخص کو متعین کر دیتے ہیں (جس پر آپ راضی ہوں۔)</u>**" مالک الاشتر کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کس طرح قبول کر سکتے تھے جبکہ یہی قاتلین عثمان کا سربراہ تھا۔ دوسری طرف اگر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ویسے ہی تھے، جیسا کہ روایات میں بیان کیا گیا ہے، تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں قبول کیوں کر لیا؟ حکم کے لیے یہ شرط طے کی گئی تھی کہ وہ غیر جانبدار ہوں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ غیر جانبدار نہیں تھے بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کے سربراہ تھے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی امانت و دیانت پر اعتماد نہ ہوتا، تو انہیں کیسے بطور حکم کے قبول کر لیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو ان دونوں جلیل القدر صحابہ پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر یہ باغی چاہتے تھے کہ ان کا لیڈر مالک الاشتر حکم بنے تاکہ ان کے مفادات پورے ہوں۔ جب ایسا نہ ہو سکا تو انہوں نے حضرت ابو موسی اشعری اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی کردار کشی کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے برعکس بلاذری کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی اور معاویہ دونوں ہی ان دونوں حضرات سے راضی تھے۔

> معاویہ نے کہا: "میں عمرو کو نامزد کرتا ہوں۔" علی نے کہا: "میں ابو موسی اشعری کو نامزد کرتا ہوں۔" وہ دونوں ان کے ناموں پر راضی ہو گئے۔ اس بات پر ایک معاہدہ تحریر کیا گیا جس پر دونوں لشکروں کے دس دس افراد نے بطور گواہ دستخط کیے۔"[81]

صلح کا معاہدہ کیا تھا؟

ابو مخنف نے صلح کا معاہدہ بھی نقل کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ یہ کام انہوں نے ٹھیک کیا ہے کیونکہ بلاذری نے دیگر اسناد سے اس معاہدے کا متن دیا ہے۔ معاہدے کے الفاظ یہ تھے:

> یہ وہ معاہدہ ہے جو علی بن ابی طالب اور معاویہ بن ابی سفیان نے باہم کیا ہے۔ علی کا فیصلہ اہل عراق اور ان لوگوں پر نافذ ہو گا جو لوگ ان کی جماعت میں سے ہیں یا **<u>عام مومنین میں سے ان کے ساتھ ہیں</u>**۔ معاویہ کا فیصلہ اہل شام اور **<u>ان صاحب ایمان لوگوں پر نافذ ہو گا جو معاویہ کے ساتھ ہیں</u>**۔ ہم اللہ عزوجل کے حکم اور اس کی کتاب کو قبول کرتے ہیں اور کتاب اللہ کے علاوہ ہمیں کوئی فیصلہ قبول نہ ہو گا۔ اللہ عزوجل کی کتاب میں اول تا آخر جو کچھ بھی موجود ہے، ہم اس پر عمل کریں گے۔ جس چیز کے احیاء کا یہ کتاب حکم دیتی ہے، اسے رائج کریں گے اور جس چیز کے

[81] بلاذری۔ 3/107

ختم کرنے کا حکم دیتی ہے، اسے ختم کر دیں گے۔ دونوں حکم یعنی ابو موسی اشعری یعنی عبد اللہ بن قیس اور عمرو بن عاص القرشی کتاب اللہ میں جو حکم پائیں گے، اس پر عمل پیرا ہوں گے۔ اگر اس معاملہ میں کتاب اللہ میں یہ دونوں کوئی حکم نہ پائیں تو اس سنت پر عمل پیرا ہوں گے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو گی اور جس پر سب کا اتفاق ہو گا اور کسی کو اس سے اختلاف نہ ہو گا۔

دونوں حکم، علی اور معاویہ اور ان کے لشکروں سے عہد و پیمان لیں گے، اسی طرح دیگر معتبر لوگوں سے بھی وعدہ لیں گے کہ ان دونوں کی جان و مال محفوظ رہیں گی۔ جو فیصلہ یہ دونوں کریں گے، اس پر تمام امت ان کی معاون و مددگار ہو گی۔ دونوں فریقوں کے مسلمانوں پر اللہ کے نام پر یہ عہد لازم ہو گا کہ جو کچھ اس معاہدہ میں تحریر ہے، وہ ہمیں قبول ہے اور ہم نے ان دونوں ثالثوں کا فیصلہ تمام مسلمانوں پر لازم کر دیا ہے۔ یہ سب لوگ ہتھیار اتار کر رکھ دیں گے اور سب لوگوں کو امن حاصل ہو گا۔ جہاں چاہیں، وہ چلے جائیں، ان کی جان و مال اور اہل و عیال محفوظ رہیں گے۔ وہ تمام لوگ جو یہاں موجود ہیں اور جو غائب ہیں، سب لوگوں کو یہ امن حاصل ہو گا۔ عبد اللہ بن قیس اور عمرو بن عاص پر اللہ کا یہ عہد و میثاق ہو گا کہ وہ اس امت کا فیصلہ کر دیں اور **انہیں دوبارہ جنگ اور اختلاف میں مبتلا نہ کریں**۔ یہ دوسری چیز ہے کہ کوئی ان کا فیصلہ قبول نہ کرے۔

اس معاہدے کی مدت رمضان تک ہو گی، اگر یہ دونوں حکم اس مدت کو بڑھانا چاہیں تو باہمی رضامندی سے بڑھا سکتے ہیں۔ اگر دونوں حکموں میں سے کسی ایک حکم کا انتقال ہو جائے تو اس کی پارٹی کا امیر اس کی جگہ دوسرا حکم مقرر کرے گا اور **وہ شخص اہل عدل و انصاف میں سے منتخب کیا جائے گا**۔ ان دونوں کے فیصلے کا مقام، جس میں وہ فیصلہ کریں گے، وہ جگہ ہو گی جو اہل کوفہ اور اہل شام کے درمیان واقع ہے۔ یہ دونوں حکم فیصلہ پر جن لوگوں کی گواہی لینا چاہیں، لے سکتے ہیں اور ان کی گواہی وہ اس فیصلہ پر تحریر کر دیں گے۔ یہ گواہ اس فیصلے کی ان لوگوں کے مقابلے میں حمایت کریں گے، جو اسے مٹانا چاہے یا اس کی مخالفت کرے۔ اے اللہ! ہم آپ سے اس شخص کے مقابلے میں امداد طلب کرتے ہیں، جو اس فیصلہ کو چھوڑ دے۔[82]

اہل تشیع کی کتاب اخبار الطوال کی روایت کے مطابق اس میں یہ الفاظ بھی موجود تھے:

عبد اللہ بن قیس (ابو موسی) اور عمرو بن عاص نے علی اور معاویہ سے اللہ کے نام پر میثاق لیا ہے کہ یہ دونوں ثالثوں کے فیصلے پر راضی ہوں گے جو کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت کی بنیاد پر کیا جائے۔ ان دونوں (علی اور معاویہ) کو اجازت نہ ہو گی کہ وہ ثالثوں کے فیصلے کو توڑ دیں اور اس کی خلاف ورزی کر کے کسی اور چیز کی طرف مائل ہوں۔[83]

معاہدے کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا مبارک معاہدہ تھا کہ اس کی بدولت مسلمانوں کی طاقت اکٹھی ہو رہی تھی۔ معاہدے کے الفاظ سے ہی ظاہر ہے کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ہی کے دل میں اسلام کے بارے میں کس درجے کا خلوص پایا جاتا تھا۔ معاہدے کے آغاز میں هذا ما تقاضى عليه علي بن أبي طالب ومعاوية بن أبي سفيان، قاضى علي على أهل

[82] طبری۔ 3/2-248

[83] نامعلوم مصنف (منسوب بہ ابو حنیفہ الدینوری)۔ الاخبار الطوال۔ 208۔ لندن: مطبع بریل (1888)۔ www.al-mostafa.com (ac. 6 Apr 2012)

الكوفة ومن معهم من شيعتهم **من المؤمنين والمسلمين**، وقاضى معاوية على أهل الشأم ومن كان معهم **من المؤمنين والمسلمين** کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما ایک دوسرے کے ساتھیوں کو صاحب ایمان اور مسلمان سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد صحابہ نے بطور گواہ اس پر دستخط کیے اور اس معاہدے پر عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ابو مخنف ہی کے بیان کے مطابق معاہدے کے بعد دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے جنگی قیدیوں کو آزاد کر دیا۔

باغیوں نے صلح کے اس معاہدے کے سلسلے میں کس رد عمل کا اظہار کیا؟

جہاں اہل اسلام کے لیے یہ معاہدہ نہایت مبارک ثابت ہوا وہاں باغیوں کے لیے یہ معاہدہ موت کے مترادف تھا۔ ان کے ہاں صف ماتم بچھ گئی۔ خود ابو مخنف نے باغی تحریک کے لیڈر مالک الاشتر کی حالت کچھ یوں نقل کی ہے:

> جب یہ معاہدہ تحریر کیا گیا تو اس کی گواہی کے لیے اشتر کو بھی طلب کیا گیا۔ اس نے کہا: "اللہ کرے، یہ دایاں ہاتھ میرے پاس نہ رہے اور نہ میں اس بائیں ہاتھ سے کوئی نفع حاصل کر سکوں، اگر میں اس معاہدے پر دستخط کروں جو صلح کے نام پر تحریر کیا گیا ہے۔ کیا میں اپنے رب کی جانب سے ہدایت پر نہیں ہوں اور میں اپنے دشمن کی گمراہی پر یقین رکھتا ہوں۔" اشعث بن قیس، (جنہوں نے اس معاہدے کی تکمیل میں بنیادی کردار ادا کیا) بولے: "واللہ! تم نے نہ کوئی کامیابی دیکھی اور نہ کوئی ظلم دیکھا۔ ہمارے ساتھ آؤ، ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں۔" اشتر بولا: "کیوں نہیں ہے؟ واللہ! میں تم سے دنیا میں دنیا کی خاطر اور آخرت میں آخرت کی خاطر نفرت کرتا ہوں۔ اللہ عزوجل نے میری اس تلوار کے ذریعے بہت سے افراد کا خون بہایا ہے اور تم میرے نزدیک ان سے بہتر نہیں ہو اور نہ ہی میں تمہارا خون حرام سمجھتا ہوں۔" عمارہ (راوی) کہتا ہے کہ میں نے اس شخص (اشعث) کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی ناک پر کوئلے رکھ دیے گئے ہوں، یعنی وہ (غصے سے) اتنی سیاہ تھی۔[84]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں کی اس معاہدے کے بارے میں کیا رائے تھی؟ اشعث بن قیس رحمہ اللہ نے چونکہ صلح کے اس معاہدے میں بنیادی کردار ادا کیا، اس وجہ سے وہ ان باغی راویوں کے غیض و غضب کا نشانہ بنے۔ انہی ابو مخنف نے اپنے ساتھیوں سے نقل کیا ہے انہی اشعث نے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کر کے خارجی جماعت بنائی۔ ظاہر ہے کہ ان پر یہ تہمت اسی وجہ سے لگائی گئی ہے کہ وہ صلح میں پیش پیش تھے اور اس صلح کے ذریعے انہوں نے باغیوں کی لٹیا ڈبو دی تھی۔ خود ابو مخنف ہی کی روایت میں یہ بات موجود ہے کہ اشعث بن قیس خوارج کے مقابلے میں پیش پیش تھے۔[85]

اشعث کے باغی ہونے کو طبری نے اس سند سے بیان کیا ہے۔ فحدثني عبد الله بن أحمد، قال: حدثني أبي، قال: حدثني سليمان بن يونس بن يزيد، عن الزهري. اس سند کے بارے میں ہم کئی جگہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ سند کمزور ہے۔ یونس بن یزید الایلی کے

[84] طبری۔ 3/2-249

[85] ایضاً۔ 3/2-281

بارے میں امام احمد بن حنبل کا کہنا یہ ہے کہ یہ زہری سے منکر (انتہائی عجیب و غریب) قسم کی روایتیں کرتے ہیں۔[86] پھر ایلی اس روایت کو ابن شہاب الزہری سے منسوب کرتے ہیں جو کہ اس واقعہ کے 21 برس بعد 58/677 میں پیدا ہوئے۔ اگر زہری نے واقعی یہ روایت بیان کی ہے تو عین ممکن ہے کہ انہوں نے یہ روایت کسی ایسے شخص سے سنی ہو جو کہ باغی تحریک کا حصہ ہو۔

صلح کے معاہدے کے بعد دونوں افواج واپس چلی گئیں۔ ابو مخنف کی روایت کے مطابق اس کے بعد باغیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ جو کچھ ہوا، وہ ان کے اپنے الفاظ میں پڑھیے:

> ابو مخنف نے ابو خباب الکلبی کے واسطے عمارہ بن ربیعہ کا یہ بیان نقل کیا ہے: جب شیعان علی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ میدان صفین میں گئے تھے تو باہم ایک دوسرے کے دوست تھے اور ہر ایک دوسرے سے محبت کرتا تھا۔ جب یہ میدان صفین سے واپس لوٹ کر آئے تو یہ سب ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ہر ایک، دوسرے سے کینہ رکھتا تھا۔ یہ لوگ میدان صفین میں جب تک علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں رہے، خوش رہے لیکن جب تحکیم کا واقعہ پیش آیا تو یہ سب ایک دوسرے کی راہ روکنے لگے۔ آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اور ایک دوسرے کو کوڑے مارتے۔[87]

ابو مخنف کی اس گھر کی گواہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ صفین کے بعد اللہ تعالی کے عذاب کا کوڑا حرکت میں آیا اور باغیوں کی پیٹھ پر بری طرح برسا۔ اب اس تحریک میں پھوٹ پڑ گئی اور ان میں باہمی دشمنی عروج کو پہنچ گئی۔ ابو مخنف (d. 157/774) کی ان روایات کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان صاحب کا مقصد اپنے زمانے کی باغی تحریک کو تاریخی دلائل کی بنیاد پر منظم کرنا تھا۔ انہوں نے جنگ صفین، تحکیم اور پھر کربلا کے واقعات پر کتابیں لکھیں اور ان میں اپنی تحریک کی غلطیاں بھی بیان کر دیں تاکہ اس کے ساتھی آئندہ ان غلطیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ باغی تحریک میں بہت سے عناصر شامل تھے جن کے مفادات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یقینی طور پر اب ان کے مابین مفادات کا ٹکراؤ ہوا ہو گا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو مخلص مسلمان تھے، وہ پہلے ہی ان باغیوں سے نفرت کرتے تھے۔ دوسری جانب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ نہایت ہی مخلص اور یکجان تھے اور ان کے اندر کسی قسم کا کوئی اختلاف موجود نہ تھا۔ اسی موقع پر باغی تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور ان کے الگ ہو جانے والے گروہ کو "خوارج" کا نام دیا گیا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

واقعہ تحکیم کی روایات کس حد تک درست ہیں؟

طبری میں واقعہ تحکیم کی بھی تمام تر روایات ابو مخنف ہی کی روایت کردہ ہیں اور ان صاحب نے صحابہ کرام سے متعلق اپنے بغض کو

[86] ذہبی۔ راوی 9932۔ 7/320

[87] طبری۔ 258-3/2

حسب عادت ان روایات میں داخل کر دیا ہے۔ ان صاحب نے حضرت ابو موسی اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما دونوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور حضرت ابو موسی کو معاذ اللہ بے وقوف اور حضرت عمرو کو مکار اور دھوکے باز ظاہر کیا ہے۔ اس تاثر کا جھوٹ اسی سے واضح ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حضرات کو ذمے دار اور حساس عہدوں پر فائز کیا تھا۔

ابو مخنف کے بیان کے مطابق رمضان 37/657 میں دومۃ الجندل کے مقام پر دونوں حکم اکٹھے ہوئے۔ دونوں کے ساتھ چار چار سو ساتھی تھے۔[88] راوی کا کہنا یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں زبردست پھوٹ پڑی ہوئی تھی کیونکہ ان کی بڑی تعداد آپ سے مخلص نہیں تھی۔ تفصیل ان صاحب کے اپنے الفاظ میں پڑھیے:

> ابو مخنف نے مجالد بن سعید اور شعبی کے واسطے زیاد بن النضر الحارثی کا بیان نقل کیا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چار سو افراد روانہ فرمائے اور ان کا امیر شریح بن ہانی الحارثی کو مقرر کیا۔ ان کے ساتھ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے، جو لوگوں کو نماز پڑھاتے اور ان آدمیوں کے کاموں کا انتظام کرتے۔ ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ انہی کے ساتھ تھے۔ معاویہ نے عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) کے ساتھ چار سو افراد روانہ کیے تھے۔ یہ دونوں گروہ اذرح میں دومۃ الجندل کے مقام پر جمع ہوئے۔
>
> معاویہ جب بھی کسی قاصد کو عمرو بن عاص کے پاس بھیجتے تو وہ آتا اور واپس چلا جاتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ وہ کیا پیغام لایا ہے اور کیا پیغام لے کر واپس چلا گیا ہے؟ اہل شام اس سے کوئی سوال نہ کرتے۔ اس کے برعکس جب حضرت علی کا کوئی قاصد ابن عباس کے پاس آتا تو اہل عراق فوراً ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کرتے کہ امیر المومنین نے کیا لکھا ہے؟ اگر ابن عباس کچھ چھپاتے تو یہ لوگ ان پر مختلف قسم کی بدگمانیاں کرتے اور کہتے، ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے ایسا ایسا لکھا ہو گا؟ ابن عباس نے مجبور ہو کر فرمایا: "کیا تم لوگوں میں ذرا سی بھی عقل نہیں ہے؟ کیا تم معاویہ کے قاصد کو نہیں دیکھتے کہ وہ پیغام لے کر آتا ہے اور کسی کو خبر نہیں ہوتے۔ یہاں سے پیغام لے کر جاتا ہے تو کسی کو علم نہیں ہوتا کہ کیا پیغام لے کر گیا ہے۔ نہ اس پر شامی چیختے چلاتے ہیں اور نہ زبان سے کوئی لفظ نکالتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ ہر وقت نئی نئی بدگمانیاں کرتے ہو۔[89]

ابو مخنف اور دیگر باغی راویوں نے واقعہ تحکیم سے متعلق لکھا ہے کہ اس میں حضرت ابو موسی اشعری اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کے مابین تنہائی میں گفتگو ہوئی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ پوری ہی گفتگو مکالمے کی صورت میں اس طرح نقل کرتے ہیں کہ گویا خود ان حضرات کے ساتھ موجود تھے اور یا تو ٹیپ ریکارڈر ان کے پاس تھا یا پھر شارٹ ہینڈ میں نوٹس لے رہے تھے۔ اس ضمن میں وہ ان کا پورا مکالمہ نقل کرتے ہیں جس کی دو روایتیں ہیں جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں:

پہلی روایت

روایت یہ ہے:

---

[88] ایضاً۔ 3/2-263

[89] ایضا

فحدثني عبد الله بن أحمد، قال: حدثني أبي، قال: حدثني سليمان بن **يونس بن يزيد**، عن الزهري۔ اس روایت کے مطابق حضرت عمرو نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنانے کی تجویز پیش کی تو حضرت ابو موسی نے اس کی تردید کی اور پھر یہ دونوں ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہوئے باہر آئے۔ حضرت ابو موسی نے حضرت عمرو کے متعلق یہ آیت پڑھی: وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانسَلَخَ مِنْهَا یعنی "انہیں اس شخص کا قصہ سنائیے جسے ہم نے اپنی آیات دیں تو وہ ان سے نکل گیا۔" اس پر حضرت عمرو نے ان کے بارے میں یہ آیت پڑھی: مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً یعنی "جنہیں تورات دی گئی، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس نے کتابوں کا بوجھ اٹھایا ہو۔"[90]

دوسری روایت

دوسری روایت کے مطابق حضرت عمرو اور ابو موسی رضی اللہ عنہما نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ہی کو معزول کر دیا جائے اور فیصلہ عام مسلمانوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جسے چاہیں اپنا خلیفہ بنا لیں۔ اس کے بعد یہ حضرت باہر آئے۔ حضرت عمرو نے حضرت ابو موسی کو کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور مجھ سے عمر میں بڑے ہیں، اس وجہ سے آپ اعلان پہلے کیجیے۔ ابن عباس نے حضرت ابو موسی کو کہا بھی کہ انہیں ہی پہلے اعلان کرنے دیجیے، آپ پہلے اعلان نہ کریں مگر انہوں نے بات نہ مانی۔ آگے کی روایت یہ ہے:

قال **أبو مخنف**: حدثني **أبو جناب الكلبي**: حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے پہلے اعلان کیا: لوگو! ہم نے اس امت کی خلافت کے معاملے پر غور کیا تو اس سے بہتر کوئی صورت نہیں دیکھی جس پر میرا اور عمرو کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ یہ کہ علی اور معاویہ دونوں کو ہم معزول کر دیں اور اس خلافت کو امت پر چھوڑ دیں کہ وہ جسے پسند کریں، اپنا خلیفہ منتخب کر لیں۔ اس لیے میں نے علی اور معاویہ دونوں کو معزول کیا۔ آپ لوگ اس کام میں خود غور کر لیجیے اور جسے آپ اس خلافت کا اہل سمجھیے، اسے یہ خلافت سونپ دیجیے۔" اس کے بعد آپ پیچھے ہٹ گئے اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا:

"انہوں (ابو موسی) نے جو کہا، وہ آپ نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے امیر کو معزول کر دیا ہے، میں بھی انہیں معزول کرتا ہوں جنہیں انہوں نے معزول کیا لیکن میں اپنے امیر معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں کیونکہ وہ عثمان بن عفان کے وارث اور ان کے قصاص کے طلب گار ہیں اور لوگوں میں سب سے زیادہ اس مقام کے حق دار ہیں۔"

اس پر ابو موسی نے فرمایا: "عمرو! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالی تمہیں نیک کام کی توفیق دے، تم نے وعدہ خلافی کی اور دھوکہ دیا۔ تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ "اس کی مثال اس کتے کی سی ہے اگر اسے کچھ ڈالو، تب بھی زبان نکالے رہتا ہے اور اگر چھوڑ دو، تب بھی زبان نکالے رہتا ہے۔" اس پر عمرو نے جواب دیا کہ تمہاری مثال اس گدھے کی

[90] ایضاً۔ 3/2-252

سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔

اس کے بعد شریح بن ہانی نے عمرو پر کوڑے کے ذریعے حملہ کر دیا۔ اس پر عمرو کے بیٹے نے شریح کو کوڑے مارنے شروع کر دیے اور مار کٹائی شروع ہو گئی۔ شامیوں نے ابو موسی کو تلاش کیا تو وہ مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ اس فیصلے کی اطلاع جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے نمازوں میں حضرت معاویہ، عمرو بن عاص، ابو الاعور اسلمی، حبیب بن مسلمہ، عبدالرحمن بن خالد، ضحاک بن قیس اور ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہم پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔ جب حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے نمازوں میں حضرت علی، ابن عباس، اشتر، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔[91]

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

افسوس کہ بعد کے مورخین نے اسی دوسری روایت کو سوچے سمجھے بغیر بیان کرنا شروع کر دیا، جس سے یہ مشہور ہو گئی۔ نہ تو ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایسی بدگمانی کر سکتے ہیں کہ جن صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن قرار دیا، ان کے لیے دوران نماز لعنت کا اہتمام فرمائیں اور نہ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ وہ حضرت علی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر لوگوں کے خلاف ایسی جوابی کاروائی کریں۔

اب ہم ان دونوں روایات کا موازنہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اگر آپ نے اب تک پہلے دو ابواب کا مطالعہ نہیں کیا تو روایت کے تجزیہ و تنقید کے اصولوں کا وہاں مطالعہ ضرور کر لیجیے۔ ان روایات کی سند اور متن میں غور کیا جائے تو یہ امور سامنے آتے ہیں:

1۔ پہلی روایت کی سند طبری نے یہ بیان کی ہے: فحدثني عبد الله بن أحمد، قال: حدثني أبي، قال: حدثني سليمان بن يونس بن يزيد، عن الزهري۔ باغیوں نے اس سند کو ابن شہاب الزہری (741-124/677-58) سے منسوب کیا ہے جو واقعہ تحکیم کے 21 سال بعد پیدا ہوئے۔ وہ واقعے کے عینی شاہد نہیں تھے اور معلوم نہیں کہ انہوں نے کس سے سن کر یہ روایت بیان کی ہے۔ اگر بیس برس کی عمر میں بھی انہوں نے اس روایت کو سنا ہو، تو کم از کم ایک ایسا شخص ہے جو اس سند میں نامعلوم ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نامعلوم شخص باغی تحریک کا کوئی کارکن ہو۔ پھر زہری سے اس روایت کو سلیمان بن یونس بن یزید ایلی روایت کر رہے ہیں۔ سلیمان براہ راست زہری کے شاگرد نہیں ہیں بلکہ ان کے والد یونس بن یزید الایلی زہری کے شاگرد ہیں اور ان کا ناقابل اعتماد ہونا ہم اس کتاب میں بار بار بیان کر چکے ہیں۔

2۔ دوسری روایت کی سند طبری نے یوں بیان کی ہے: قال أبو مخنف: حدثني أبو جناب الكلبي۔ اس سند میں سب سے پہلے تو یہی ابو مخنف (d. 157/774) ہیں جو صحابہ کرام سے متعلق دل میں نہایت بغض رکھتے ہیں اور ان کے جھوٹ گھڑنے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ دوسرے صاحب ابو جناب الکلبی (d. 150/766) ہے جن کا اصلی نام یحیی بن ابی الحیہ الکلبی الکوفی ہے۔ ان کے بارے میں جرح و

[91] ایضاً۔ 3/2-267

تعدیل کے مختلف ماہرین کے ارشادات یہ ہیں: یحیی القطان کہتے ہیں: میں جائز نہیں سمجھتا کہ اس کی روایتیں نقل کروں۔ نسائی اور دار قطنی کا قول ہے کہ یہ ضعیف راوی ہے۔ ابوزرعہ اور یحیی بن معین کہتے ہیں کہ یہ صدوق ہے مگر تدلیس کرتا ہے۔ ابن الدورقی عن یحیی: ابوجناب میں ویسے تو حرج نہیں مگر یہ تدلیس کرتا ہے۔ فلاس کا کہنا ہے کہ متروک راوی ہے۔[92] ابن عدی بیان کرتے ہیں کہ یہ کوفہ کے شیعہ گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔[93] ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ اس سے کوئی بات نہ لکھو، وہ قوی نہیں ہے۔[94]

اس روایت کو ابومخنف اور ابوجناب الکلبی کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا ہے اور ابوجناب سے لے کر واقعہ تحکیم کے عینی شاہدوں تک کسی کا نام بیان نہیں ہوا۔ ابوجناب الکلبی 150/766 میں فوت ہوئے اور انہوں نے یہ روایت واقعہ تحکیم کے سو برس بعد بیان کی ہو گی لیکن درمیان کے تمام راوی غائب ہیں اور ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کس قسم اور کس درجے کے لوگ ہیں؟

3۔ دونوں روایات میں شدید تضاد پایا جاتا ہے۔ پہلی روایت کے مطابق حضرت ابوموسی اور عمرو رضی اللہ عنہما میں اختلاف تنہائی ہی میں ہو گیا تھا اور وہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے باہر نکلے اور پھر باہر نکل کر ایک دوسرے کی قصیدہ گوئی فرمائی۔ دوسری روایت کے مطابق دونوں اتفاق رائے کر کے بڑے اچھے انداز میں نکلے۔ پھر اپنے اپنے اعلانات کیے اور اس کے بعد ان میں تلخ کلامی ہوئی جس میں انہوں نے آیات پڑھیں۔ اب ان دونوں متضاد روایتوں میں سے کس روایت کو مانا جائے؟

4۔ حضرت ابوموسی نے جو آیت پڑھی، اس کے بارے میں یہ روایتیں متضاد تصاویر پیش کرتی ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق آیت 7:175 کا ایک ٹکڑا آپ نے تلاوت کیا جبکہ دوسری روایت کے مطابق آیت 7:176 کا ایک حصہ پڑھا۔ اگر یہ دونوں جلیل القدر حضرات ایک دوسرے کے خلاف ایسی بدزبانی کرتے تو معاملہ پھر یہیں تک محدود نہ رہتا۔ فریقین کے چار چار سو آدمی موجود تھے، ان میں جنگ بھی چھڑ سکتی تھی۔ پھر معاملہ صرف کوڑوں سے پیٹنے تک محدود نہ رہتا بلکہ تلواریں نکل آتیں۔

5۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ واقعہ تحکیم کے وقت دونوں جانب سے چار چار سو افراد وہاں موجود تھے لیکن کسی نے یہ تفصیلات بیان نہیں کی ہیں۔ صرف زہری اور ابوجناب الکلبی اسے بیان کرتے ہیں جن میں سے ایک اس واقعے کے اکیس برس بعد پیدا ہوئے اور دوسرے کا زمانہ بھی اس واقعے کے سو برس بعد کا ہے۔

6۔ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کی حالت نماز میں ایک دوسرے پر لعنت کی بات ایسی ہے جو عقل میں نہیں آتی۔ کہاں تو یہ حضرات ایک دوسرے کی تعریفیں کرتے ہیں اور کہاں ایک دوسرے پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اوپر بیان کردہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خط ہی دیکھ لیجیے، اس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا ارشادات ہیں۔ اسی طرح حضرت معاویہ کی حضرت علی سے

---

[92] میزان الاعتدال، راوی نمبر 9499

[93] ابن عدی، الکامل فی الضعفاء۔ ص 2669

[94] ابن ابی حاتم الرازی۔ الجرح والتعدیل۔ 9/138۔ راوی نمبر 587۔ www.waqfeya.com (ac. 8 Aug 2012)

متعلق رائے ہم آگے بیان کریں گے۔ یہ محض ان راویوں کا بغض ہے جسے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے کہلوانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

7۔ اگر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے دھوکہ دہی کی ہوتی، جیسا کہ ان روایات میں بیان کیا گیا ہے، تو مخلص مسلمانوں کی کثیر تعداد، جو ابھی غیر جانبدار تھی، اس صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتی۔ اسی طرح آپ کے کیمپ میں جو لوگ ابھی تردد کا شکار تھے، ان کا تردد بھی دور ہو جاتا۔ بعد کے واقعات سے یہ بات ثابت ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

8۔ ابو جناب کلبی اور ابو مخنف نے یہ روایت گھڑتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ حضرت عمرو اور ابو موسی رضی اللہ عنہما میں سے عمر میں کون بڑا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے دھڑلے سے حضرت عمرو کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: "آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ اس لیے آپ پہلے اعلان کریں تو میں بھی اعلان کروں۔" عمرو ہر معاملہ میں اسی طرح ابو موسی کو آگے کر دیتے تھے اور اسی طرح ہر معاملہ میں انہیں کہہ دیا کرتے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ ان سے علی کی خلافت ختم کرنے کا اعلان کرا دیں۔[95]

حضرت ابو موسی اشعری نے 63 برس کی عمر میں 50/673 میں وفات پائی۔[96] اس حساب سے ان کی تاریخ پیدائش سن ہجری کی ابتدا سے تیرہ برس پہلے 609ء میں ہوئی۔ اس کے برعکس حضرت عمرو نے 43/664 میں 80 برس سے زائد عمر میں وفات پائی۔[97] اگر وفات کے وقت ان کی عمر کو بالفرض 81 سال بھی مان لیں تو اس حساب سے ان کا سن پیدائش سن ہجری کی ابتدا سے 38 سال پہلے 585ء بنتا ہے۔ اس طرح، حضرت عمرو، حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہما سے عمر میں کم از کم 25-24 سال بڑے ضرور تھے۔ پھر اس بات کا کیا مطلب ہے کہ "آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ اس لیے آپ پہلے اعلان کریں تو میں بھی اعلان کروں۔" حضرت عمرو بن عاص کی طویل العمری کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ وہ سن ہجری کی ابتدا سے آٹھ برس پہلے 614ء میں ہجرت حبشہ کے موقع پر نجاشی کے دربار میں قریش کے سفیر کے طور پر گئے تھے۔[98] اس وقت حضرت ابو موسی اشعری پانچ سال کے ہوں گے۔ اگر حضرت عمرو ان سے چھوٹے تھے تو کیا قریش نے کسی دو تین سال کے بچے کو سفیر بنا کر بھیج دیا تھا؟ سچ کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

محدثین نے اگرچہ واضح کر دیا تھا کہ ابو مخنف ایک جھوٹے آدمی ہیں اور ان کی بیان کردہ روایات کا کوئی اعتبار نہیں۔ افسوس کہ طبری اور بلاذری جیسے محقق علماء نے ابو مخنف کی ان روایات کو جوں کا توں اپنی کتاب میں درج کر لیا اور محض سند میں اس کا نام دے کر یہ

---

[95] طبری۔ 3/2-266

[96] ابن عبد البر۔ الاستیعاب۔ صحابی نمبر 1650۔ 1/588۔

[97] ایضاً۔ صحابی نمبر 1941۔ 2/100۔

[98] طبری۔ 2/1-79

فرض کر لیا کہ بعد کی نسلوں کے لوگ اس کا نام دیکھ کر ان روایات کو پرکھ لیں گے۔ یقیناً محققین تو ایسا کر سکتے تھے لیکن عام مورخین نے ایسا نہ کیا کیونکہ انہیں ابو مخنف سے ہٹ کر کسی اور کی روایات نہ ملیں۔ اس طرح سے یہ روایات ایک کتاب سے دوسری کتاب میں نقل ہوتی چلی گئیں اور کچھ ہی عرصہ میں اس جھوٹے پراپیگنڈے کو "مستند تاریخ" کی حیثیت مل گئی۔ ابن کثیر نے البتہ ان روایات کا جعلی ہونا بیان کر دیا ہے۔[99]

واقعہ تحکیم کی صحیح تفصیلات کیا ہیں؟

اوپر کی تفصیل سے واضح ہو چکا ہے کہ واقعہ تحکیم کی جو روایات طبری میں بیان ہوئی ہیں، ان کا کوئی سر پاؤں نہیں ہے اور وہ انہی باغی راویوں کا گھڑا ہوا جھوٹ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر صحیح روایات سے اس واقعے کی کیا تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب نے ہمیں اس مجبور کر دیا ہے کہ ہم احادیث و آثار اور تاریخ کے پورے ذخیرے کا جائزہ لیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ تحکیم جیسا اہم واقعہ، جس کے عینی شاہدین 800 کے قریب تھے، کے بارے میں کتب تاریخ میں بہت کم مواد موجود ہے۔ جو روایتیں ملتی ہیں، وہ یہی یونس بن یزید ایلی اور ابو مخنف کی بیان کردہ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعے کی تفصیلات کو جان بوجھ کر یا تو چھپایا گیا ہے، یا اس درجے میں مسخ کر دیا گیا ہے کہ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ البتہ بعد میں جو واقعات پیش آئے، ان سے ہم یہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں کہ حضرت ابو موسی اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے اور انہوں نے معاملے کو مہاجرین و انصار کے سپرد کر دیا تھا۔ ہاں یہ دونوں اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ جب تک اتفاق رائے نہیں ہو جاتا، اس وقت تک حضرت علی عراق پر، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما شام پر حکومت کرتے رہیں یہاں تک کہ اللہ تعالی ان میں اتفاق کی کوئی صورت پیدا کر دے۔

واقعہ تحکیم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہلے خوارج اور پھر ایرانیوں کی جانب سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے اہل شام کے ساتھ اتفاق کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ خوارج کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں حضرت علی شہید ہوئے اور پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس معاملے کو اتفاق رائے تک پہنچا دیا۔

واقعہ تحکیم کے بعد کے واقعات

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ واقعہ تحکیم کے بعد باغی تحریک میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کا ایک بڑا حصہ خوارج کی شکل میں الگ ہو گیا۔ تین برس تک صورتحال یہ رہی کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما اپنے اپنے علاقوں پر حکومت کرتے رہے۔ طبری کا بیان ہے کہ 40/660 میں حضرت علی اور معاویہ کے مابین جنگ بندی کا معاہدہ ہوا اور یہ طے پایا کہ دونوں اپنے اپنے علاقوں پر حکومت کرتے

[99] ابن کثیر۔

رہیں:

اسی سال حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جنگ بندی کا فیصلہ ہوا۔ باہمی طویل خط و کتابت رہی۔ کتاب کی طوالت کے خوف سے ہم اس خط و کتابت کو نظر انداز کرتے ہیں۔ فیصلہ یہ قرار پایا کہ باہمی جنگ بندی کر دی جائے۔ عراق علی کی حکومت میں شمار ہو گا اور شام معاویہ کی حکومت میں۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے علاقے پر نہ لشکر کشی کریں گے اور نہ کسی قسم کی غارت گری مچائیں گے۔[100]

یہ معاہدہ یقیناً ہوا ہو گا اور ان دونوں جلیل القدر صحابہ سے اسی کی امید کی جا سکتی ہے۔ تاہم طبری نے اس سال 40/660 کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیے ہیں، جن پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بسر بن ابی ارطاۃ کی سرکردگی میں ایک فوج حجاز اور یمن پر حملہ کے لیے بھیجی جس نے وہاں ان کی فوج نے ظلم ڈھائے، اس کا کیا جواز تھا؟ جواباً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود کو فوج دے کر بھیجا جنہوں نے نجران اور مکہ کے لوگوں پر ظلم و ستم کیا۔ اس کا جواز کیا تھا؟
- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا، اس کی وجہ کیا تھی؟

یہاں ہم ان دونوں سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

کیا حضرت معاویہ و علی نے حجاز و یمن میں فوج کشی کی؟

طبری کی روایت میں بیان ہوا ہے کہ 40/660 میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بسر بن ابی ارطاۃ کی قیادت میں تین ہزار جنگجوؤں کا ایک لشکر حجاز بھیجا۔ اس لشکر نے مدینہ پر قبضہ کر لیا اور شہر کا کوئی شخص بھی مقابلے پر نہ نکلا۔ اہل مدینہ نے حضرت معاویہ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد یہ لشکر مکہ کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ وہاں ابو موسی اشعری حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جانب سے گورنر تھے۔ بسر نے ان سے اچھا سلوک کیا۔ اس کے بعد یہ لشکر یمن کی طرف بڑھا جہاں عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما گورنر تھے۔ عبید اللہ خوف سے فرار ہو کر کوفہ چلے آئے مگر اپنے گھر والوں کو یمن ہی چھوڑ آئے۔ بسر نے یمن میں شیعان علی کی ایک بڑی جماعت کو قتل کیا اور اس کے ساتھ عبید اللہ کے دو بچوں عبد الرحمن اور قثم کو بھی قتل کیا۔ اس کی اطلاع ملتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود کو دو ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ جاریہ نے نجران شہر کو آگ لگا دی اور پورے شہر کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بہت سے حامیوں کو قتل کیا۔ بسر اور اس کے ساتھی شام بھاگ گئے۔[101]

اس روایت میں سند اور متن کے اعتبار بہت سے مسائل ہیں۔ پہلے ہم اس روایت کا سند کے اعتبار سے تجزیہ کرتے ہیں اور پھر متن کے۔

[100] طبری۔ 3/2-346

[101] ایضاً۔ 3/2-345

طبری میں اس روایت کی یہ سند بیان ہوئی ہے، اس کی سند یہ ہے: فذكر عن زياد بن عبد الله البكائي، عن عوانة۔ اب ان دونوں حضرات کے بارے میں ماہرین جرح و تعدیل کی آراء پڑھیے۔

زیاد بن عبد اللہ البکائی (d. 183/799) کے بارے میں ماہرین کی آراء یہ ہیں: ابو حاتم کہتے ہیں کہ بکائی سے روایت کرنا درست نہیں۔ ابن المدینی کے مطابق یہ ضعیف راوی ہیں، میں نے ان سے روایتیں لکھی بھی ہیں اور ترک بھی کی ہیں۔ ابن معین کے مطابق جنگوں کی تاریخ کے بارے میں ان کی روایتوں میں حرج نہیں لیکن دیگر امور میں ان کی روایتیں قبول نہ کی جائیں گی۔ نسائی کے نزدیک یہ صاحب ضعیف ہیں۔ ابن سعد کا کہنا ہے کہ وہ محدثین کے نزدیک ضعیف تھے لیکن ان کی روایتیں نقل کی جاتی تھیں۔ احمد بن حنبل البتہ یہ کہتے ہیں کہ ان کی حدیث، سچے لوگوں کی حدیث ہے۔[102]

ان آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ سوائے احمد بن حنبل کے، اکثر ماہرین کے نزدیک زیاد البکائی ضعیف ہے۔ دوسرے راوی عوانہ ہیں، جو غالباً عوانہ بن حکم الکلبی ہے۔ ان صاحب کی زیادہ تفصیلات ہمیں فن رجال کی کتب میں نہیں مل سکیں۔ صرف اتنا لکھا ہے:

> عوانہ بن الحکم بن عیاض بن وزر الکلبی جن کی کنیت ابو الحکم کوفی تھی، بڑے اخباری (ماہر تاریخ) تھے اور فصیح لوگوں میں سے ایک تھے۔ ان کی کتابوں میں "التاریخ" اور "سیر معاویہ و بنی امیہ" اور دیگر کتب شامل ہیں۔ ان سے **ہشام کلبی وغیرہ روایتیں کرتے تھے**۔ وہ نقل کرنے کے معاملے میں "صدوق" یعنی سچے آدمی تھے (یعنی جو سچ یا جھوٹ ان کے سامنے بیان ہوتا، اسے ٹھیک ٹھیک نقل کر دیتے تھے۔) محمد بن اسحاق الندیم کا قول ہے کہ وہ 147/764 میں فوت ہوئے۔[103]

واضح ہے کہ عوانہ جب 147/764 میں فوت ہوئے تو انہوں نے یہ روایت اس واقعے کے تقریباً سو برس بعد بیان کی ہو گی۔ عوانہ ہرگز اس واقعے کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے۔ درمیان میں نجانے کتنی کڑیاں غائب ہیں اور ہمیں معلوم نہیں کہ یہ نامعلوم راوی کس قسم کے لوگ ہیں، قابل اعتماد ہیں بھی یا نہیں۔ جتنی نامکمل سند اس روایت کی موجود ہے، وہ تو قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عوانہ کے شاگرد ہشام کلبی، جو انہی کے ہم قبیلہ ہیں، نے ان سے یہ باتیں منسوب کر دی ہوں۔

درایت کے اعتبار سے دیکھیے تو اس روایت کا سر پاؤں ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس پر یہ سوال وارد ہوتے ہیں:

1۔ کیا تین ہزار کا لشکر اتنا بڑا ہو سکتا ہے جسے دیکھ کر مدینہ، مکہ اور یمن کے لوگ ذرا سی بھی مزاحمت نہ کریں اور عبید اللہ بن عباس اس کے خوف سے فرار ہو کر کوفہ چلے آئیں؟ یمن آج بھی ہمارے سامنے ہے جہاں لڑائی جھگڑے ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ کیا اس دور کے اہل یمن نے چوڑیاں پہن رکھی تھیں کہ تین ہزار کے لشکر کو دیکھتے ہیں اپنی گردنیں جھکا دیں کہ آؤ اور ہمیں قتل کر دو۔

2۔ جب انسان کسی خطرے کے سبب اپنا وطن چھوڑتا ہے تو سب سے پہلے اپنے بیوی بچوں کو وہاں سے نکالتا ہے۔ عبید اللہ بن عباس نے

[102] ذہبی۔ میزان الاعتدال، راوی نمبر 2952
[103] http://www.islamweb.net/newlibrary/showalam.php?id=1080 (ac. 29 Mar 2012)

اپنی جان تو بچالی لیکن اپنے بچوں کو وہیں چھوڑ آئے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

3۔ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے نامعقول لوگوں کو بھیجیں گے جو پورے شہر نجران کو جلا کر راکھ کر دیں۔

4۔ عبداللہ اور عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، دونوں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کزن ہیں۔ یہ دونوں حضرات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں موجود تھے اور ان کے وفادار رہے۔ انہوں نے کبھی ان بچوں کے قتل کا گلہ تک نہ کیا۔ کیا کوئی شخص اپنے بچوں کے قاتل کے ساتھ وفادار رہ سکتا ہے؟ دلچسپ امر یہ ہے کہ عبید اللہ بن عباس کی بیٹی لبابہ کی شادی، حضرت معاویہ کے بھتیجے ولید بن عتبہ بن ابی سفیان سے ہوئی۔[104] اگر حضرت معاویہ نے ان کے بچوں کو قتل کروایا ہوتا تو یہ رشتہ کیسے طے پاتا؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کسی نامعلوم شخص نے اس لیے وضع کی ہے کہ اس کی مدد سے حضرت معاویہ اور علی رضی اللہ عنہما کو بدنام کیا جا سکے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کیا حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت علی کا ساتھ چھوڑ دیا؟

راویوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر یہ تہمت باندھی ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ روایت تاریخ طبری میں موجود ہے مگر طبری نے اس ضمن میں خود ہی بیان کر دیا ہے کہ اس معاملے میں ان تک دو مختلف روایتیں پہنچی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> عام تاریخ نگار کہتے ہیں کہ اس سال یعنی 40/660 میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ چھوڑ کر مکہ چلے گئے تھے لیکن بعض اہل تاریخ نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس برابر بصرہ کے گورنر رہے یہاں تک کہ حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت حسن نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم سے صلح کر لی۔ اس (صلح) کے بعد عبدللہ بن عباس بصرہ چھوڑ کر مکہ چلے گئے تھے۔[105]

اس کے بعد طبری نے ابو مخنف کی وہ روایت بیان کی ہے جس کے مطابق ایک باغی ابو الاسود وائلی نے حضرت علی کو ابن عباس کے بارے میں شکایتی خط لکھا جس میں ان پر مال میں کرپشن کا الزام لگایا۔ یہ باغی پارٹی کا ساتھی تھا اور اقتدار پر کنٹرول کے لیے بصرہ کا قاضی بنا ہوا تھا۔ خط کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے تعریفی سرٹیفیکیٹ جاری کیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مال کا حساب طلب کیا۔ ابن عباس اس پر غصے ہو کر بصرہ چھوڑ گئے اور یہاں کے بیت المال کا سارا مال لے گئے۔ اس موقع پر لوگوں میں ہاتھا پائی بھی

---

[104] مصعب الزبیری (156-236/773-851)۔ نسب قریش۔ 133۔ www.waqfeya.com (ac. 14 Aug 2012)

[105] طبری۔ 347-3/2

ہوئی۔[106]

واقعے کی سند طبری میں یہ بیان ہوئی ہے: حدثني عمر بن شبة، قال: حدثني **جماعة** عن **أبي مخنف**، عن سليمان ابن أبي راشد، عن عبد الرحمن بن عبيد أبي الكنود۔ اس روایت کے جھوٹ ہونے سے متعلق اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی سند میں ابو مخنف موجود ہے۔ پھر ابو مخنف سے بھی ایک جماعت نے یہ روایت سنی ہے جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ کون لوگ تھے اور کس درجے میں قابل اعتماد تھے۔

یہ بات البتہ تسلیم کی جاسکتی ہے کہ باغیوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما پر کرپشن کا الزام عائد کیا ہو کیونکہ ان کی یہ عادت رہی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلص ساتھیوں کو ان سے دور کیا جائے اور ان کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے۔ ابن عباس ان مخلصین میں تھے جو شروع سے لے کر اب تک حضرت علی کے ساتھ تھے اور باغی انہیں علیحدہ نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت علی سے البتہ یہ امید نہیں کی جاسکتی ہے کہ وہ ایسے کسی الزام کے سبب اپنے چچازاد بھائی، جسے وہ بچپن سے جانتے ہیں، پر شک کریں اور باغیوں کو تعریفی سرٹیفکیٹ جاری کریں۔ عین ممکن ہے کہ ان باغیوں نے وہ خط خود ہی آپ کی جانب سے لکھ مارا ہو۔

حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے باہمی تعلقات

باغی راویوں کی پوری کوشش رہی ہے کہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کو معاذ اللہ ایک دوسرے کا دشمن ثابت کیا جائے۔ کبھی وہ ان کی زبان سے ایک دوسرے پر لعنت کہلواتے ہیں، کبھی ایک دوسرے کو برا بھلا کہلواتے ہیں اور ان کے اسلام میں شک کرواتے ہیں۔ درحقیقت یہ ان کے اپنے جذبات ہیں جنہیں وہ زبردستی حضرت علی یا معاویہ رضی اللہ عنہما کی زبان سے کہلوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی تمام روایات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان کی سند میں کوئی نہ کوئی جھوٹا راوی جیسے ابو مخنف، ہشام کلبی، سیف بن عمر یا واقدی ضرور موجود ہو گا۔ یہاں ہم چند روایات اور کچھ نکات پیش کر رہے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کی ایک دوسرے کے بارے میں کیا رائے تھی؟

1۔ حضرت علی کے بھائی عقیل اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے قریبی ساتھی تھے اور دوسری طرف حضرت معاویہ کے بھائی زیاد بن ابی سفیان، حضرت علی کے قریبی ساتھی تھے اور آپ نے انہیں ایران و خراسان کا گورنر مقرر کر رکھا تھا۔ ایک بار عقیل، معاویہ کے پاس بیٹھے تھے تو معاویہ نے جی کھول کر علی کی تعریف کی اور انہیں بہادری اور چستی میں شیر، خوبصورتی میں موسم بہار، جود و سخا میں دریائے فرات سے تشبیہ دی اور کہا: "اے ابو یزید (عقیل)! میں علی بن ابی طالب کے بارے میں یہ کیسے نہ کہوں۔ علی قریش کے سرداروں میں سے ایک ہیں اور وہ نیزہ ہیں جس پر قریش قائم ہیں۔ علی میں بڑائی کی تمام علامات موجود ہیں۔" عقیل نے یہ سن کر

[106] ایضاً۔ 3/2-348

کہا: "امیر المومنین! آپ نے فی الواقع صلہ رحمی کی۔"[107]

2۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین کے بعد جو خط شہروں میں بھیجا، اس میں فرمایا: ہمارے معاملہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا رب ایک، ہمارا اور ان کا نبی ایک، ہماری اور ان کی اسلام کے متعلق دعوت ایک۔ اس معاملے میں نہ وہ ہم سے زیادہ تھے اور نہ ہم ان سے۔ صرف ایک معاملے میں ہم میں اختلاف ہوا اور وہ تھا خون عثمان کا جبکہ ہم اس سے بری تھے۔ [108]

3۔ ایک شخص نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کوئی دینی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: "اس بارے میں علی بن ابی طالب سے پوچھ لیجیے، وہ مجھ سے زیادہ بڑے عالم ہیں۔" اس نے کہا: "امیر المومنین! آپ کی رائے، میرے نزدیک علی کی رائے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔" آپ نے فرمایا: "آپ نے تو بہت ہی بری بات کی اور آپ کی رائے بہت ہی قابل مذمت ہے۔ کیا آپ ان صاحب (علی) کی رائے کو ناپسند کر رہے ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم سے عزت بخشی ہے؟ آپ نے انہیں فرمایا تھا: 'علی! آپ میرے لیے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو کہ موسی کے نزدیک ہارون (علیہما الصلوۃ والسلام) کی تھی۔ فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔' "[109]

4۔ خوارج نے حضرت علی، معاویہ اور عمرو رضی اللہ عنہم کو ایک ہی رات میں شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حضرت معاویہ نے اپنے حملہ آور کو پکڑ لیا تو وہ کہنے لگا: "میرے پاس ایسی خبر ہے جسے سن کر آپ خوش ہو جائیں گے۔ اگر میں آپ سے وہ بیان کر دوں تو آپ کو بہت نفع پہنچے گا۔" آپ نے فرمایا: "بیان کرو۔" کہنے لگا: "آج میرے بھائی نے علی کو قتل کر دیا ہو گا۔" آپ نے فرمایا: "کاش! تمہارا بھائی ان پر قابو نہ پا سکے۔"[110]

5۔ جنگ صفین کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لوگو! آپ لوگ معاویہ کی گورنری کو ناپسند مت کریں۔ اگر آپ نے انہیں کھو دیا تو آپ دیکھو گے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گریں گے جیسے حنظل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا ہے۔"[111]

6۔ یزید بن اصم کہتے ہیں کہ جب علی اور معاویہ کے درمیان صلح ہو گئی تو علی اپنے مقتولین کی جانب نکلے اور فرمایا: "یہ لوگ جنت میں ہوں گے۔" پھر معاویہ کے مقتولین کی طرف چلے اور فرمایا: "یہ لوگ بھی جنت میں ہوں گے۔ (روز قیامت) یہ معاملہ میرے اور

---

[107] ابن عساکر۔ 42/416

[108] سید شریف رضی۔ نہج البلاغہ۔ خط نمبر 58

[109] ابن عساکر۔ 42/170

[110] طبری۔ 3/2-357

[111] ابن ابی شیبہ۔ المصنف۔ 14/38850

معاویہ کے درمیان ہو گا۔ فیصلہ میرے حق میں دیا جائے گا اور معاویہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ مجھے میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بتایا تھا۔"[112]

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما میں ذاتی نوعیت کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ دونوں میں صرف اسٹریٹجی پر اختلاف تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ باغیوں کی قوت کو اچھی طرح کچل دیا جائے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ اگر ان باغیوں سے اس وقت انتقام لیا گیا تو ان کے قبائل اٹھ کھڑے ہوں گے جس سے بہت بڑی خانہ جنگی پیدا ہو گی۔ باغی چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکومتی معاملات پر قبضہ کیے بیٹھے تھے، اس وجہ سے انہوں نے پوری کوشش کی کہ شام پر حملہ کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ اس کی وجہ سے جنگ صفین ہوئی جسے مخلص مسلمانوں نے بند کروا دیا۔ اس طرح سے باغیوں کا یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

فتنہ خوارج

جنگ صفین کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس جنگ میں جب حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین صلح ہوئی تو باغیوں کو یہ امر سخت ناگوار گزرا۔ ان کے ایک گروہ نے حضرت علی سے علی الاعلان علیحدگی اختیار کر لی اور ان دونوں صحابہ کو معاذ اللہ کافر قرار دے کر ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے انہیں بہت سمجھایا لیکن یہ کسی طرح نہیں مانے۔ انہوں نے مسلم آبادیوں پر حملے شروع کر دیے۔ اس پر حضرت علی نے ان کے خلاف کاروائی کی جس سے ان کا زور ٹوٹ گیا۔ بعد میں اسی گروہ نے سازش کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

خوارج سے متعلق بھی بعض سوالات تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو کہ یہ ہیں:

1. خوارج کیسے پیدا ہوئے اور باغی جماعت میں گروپنگ کیسے ہوئی؟
2. خوارج کا نقطہ نظر کیا تھا؟
3. حضرت علی نے خوارج سے کیا معاملہ کیا؟
4. خوارج سے جنگ کے نتائج کیا نکلے؟

اب ہم ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

[112] ابن عساکر۔ 59/139

خوارج کیسے پیدا ہوئے اور باغی جماعت میں گروپنگ کیسے ہوئی؟

خوارج (واحد خارجی) کے بارے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ان کی اپنی کوئی کتب موجود نہیں ہیں کیونکہ باقاعدہ کتب لکھے جانے کے زمانے (150/767 کے بعد) تک وہ ختم ہو چکے تھے۔ ان کے آغاز کے بارے میں زیادہ تر تفصیلات کا ماخذ وہی ابو مخنف ہے جو تاریخ طبری میں مسلسل ہمارے ساتھ ہے۔ یہ بات بہر حال معلوم و معروف ہے کہ ان کے بہت سے گروپ ہو گئے تھے جن میں سے ایک گروپ جو "اباضیہ" کہلاتا ہے، اب تک موجود ہے۔ اباضی خود کو خوارج سے الگ قرار دیتے ہیں اور یہ عمان، لیبیا اور الجزائر میں موجود ہیں۔ ان کی کتب میں بھی ہمیں خوارج کے ارتقاء سے متعلق کچھ زیادہ تفصیلات نہیں مل سکی ہیں۔ اس وجہ سے اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔

خوارج کے بارے میں جو روایات طبری میں بیان ہوئی ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے سے باغی تحریک کا حصہ بن گیا تھا۔ یہ لوگ "قراء" کہلاتے تھے۔ قراء کا لفظ ان لوگوں کے بارے میں بولا جاتا ہے جو خاص کر قرآن مجید کی قراءت کا فن سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت عابد و زاہد قسم کے لوگ تھے اور نماز روزہ کے معاملے میں بڑے تشدد سے کام لیتے تھے۔ سجدوں کی کثرت سے ان کی پیشانیوں پر سیاہ نشان بن گئے تھے۔ عام طور پر ایسا ہو جاتا ہے کہ جو لوگ عبادت گزاری میں شدت پسند بن جائیں، وہ عام طور پر ان لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں، جو دنیاوی کاموں میں مشغول ہوں۔ یہ رویہ جب پختگی اختیار کر جائے تو ایسے لوگ بات بات پر دوسروں کو جھڑکتے ہیں، ان پر کفر، فسق اور گمراہی کے فتوے عائد کرتے ہیں اور اپنے سوا سب کو گمراہ سمجھتے ہیں۔ انگریزی میں ایسے لوگوں کے لیے self-righteous اور holier-than-thou کے محاورے موجود ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اہل مغرب کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

خوارج سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث بھی صحیح بخاری و مسلم میں نقل ہوئی ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

> ابو سلمہ اور عطاء بن یسار، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے حروریہ (حرورہ کے خوارج) کے متعلق پوچھا کہ کیا آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے متعلق کچھ سنا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: مجھے نہیں معلوم کہ یہ حروریہ کیا چیز ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: "اس امت میں کچھ لوگ پیدا ہوں گے (یہ نہیں فرمایا کہ اس امت سے پیدا ہوں گے۔) آپ اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلے میں حقیر سمجھیں گے۔ یہ لوگ قرآن پڑھیں گے مگر اس طرح کہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے آر پار ہو جاتا ہے اور شکاری اپنے تیر اور اس کے پھل کو اور اس کے پروں کو دیکھتا ہے اور شک کرتا ہے کہ اس میں کچھ خون تو لگا ہوا ہے یا نہیں۔"

> ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے کہ عبداللہ بن ذی الخویصرہ تمیمی آیا اور کہنے لگا: "اے اللہ کے رسول! عدل سے کام لیجیے۔" آپ نے فرمایا: "تمہاری خرابی! اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "مجھے اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دوں۔" آپ نے فرمایا: "اسے چھوڑ دیجیے۔ اس کے ایسے ساتھی ہیں کہ آپ میں سے کوئی شخص، ان کی نماز کے مقابلے میں اپنی نماز کو حقیر سمجھے گا اور اپنے روزے کو ان کے روزے کے مقابلے میں حقیر سمجھے گا۔ یہ لوگ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے اور اس کے پروں کو دیکھا جائے تو کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ پھر اس (تیر کے) پھل کو دیکھا جائے تو معلوم نہیں ہوتا ہے (کہ یہ شکار کے اندر سے گزرا ہے) حالانکہ وہ خون اور گوبر سے ہو کر گزرا ہے۔ ان کی نشانی یہ ہو گی کہ ان میں ایک ایسا آدمی ہو گا جس کا ایک ہاتھ یا ایک چھاتی، عورت کی چھاتی کی طرح ہو گی۔ یا فرمایا کہ گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہو گی اور ہلتی ہو گی۔ یہ لوگوں میں خانہ جنگی کے وقت نکلیں گے۔" ابو سعید کہتے ہیں: "میں گواہی دیتا ہوں کہ جب حضرت علی نے ان لوگوں کو قتل کیا تو میں ان کے پاس تھا۔ اس وقت (ان کے سامنے) ایک شخص اسی صورت کا لایا گیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا۔ انہی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: "ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو آپ پر صدقات کے بارے میں طعنہ زنی کرتے ہیں۔" [113]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوارج کا یہ سیلف رائچس (Self-Righteous) گروپ عہد رسالت میں بھی موجود تھا۔ ان لوگوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ بہت زیادہ عبادات کرتے تھے اور اس بنا پر ایک نوعیت کے تکبر کا شکار تھے۔ یہ خود کو اتنا حق پرست سمجھتے تھے کہ اپنے مقابلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی معاذ اللہ ناانصافی کرنے والا سمجھتے تھے۔ تاہم آپ نے اس وجہ سے ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی کہ اب تک انہوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان خوارج کے کچھ ساتھیوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعض جرائم کی وجہ سے سزائیں دی تھیں، جس کے سبب یہ آپ کے خلاف ہو گئے تھے۔ موجودہ دور کے لیبیا کے اباضی عالم سلیمان البارونی نے عبداللہ بن اباض (خوارج کی ایک پارٹی کے لیڈر، جن کے نام سے اباضی فرقہ موسوم ہے) کا عبدالملک بن مروان ایک خط اپنی کتاب "مختصر تاریخ الاباضیہ" میں نقل کیا ہے۔ اس خط میں ابن اباض نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق لکھا ہے:

> پھر انہوں (عثمان) نے ایسے نئے امور ایجاد کیے، جب پر ان کے پہلے دو ساتھیوں (ابو بکر و عمر) نے عمل نہ کیا تھا اور نہ ہی ان لوگوں نے، جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ دیکھا تھا۔ جب اہل ایمان (یعنی باغیوں) نے ان نئی باتوں کو دیکھا تو ان (عثمان) کے پاس آئے اور ان سے بات کی اور انہیں کتاب اللہ اور پہلے سے چلی آ رہی سنت کی طرف توجہ دلائی۔ اس پر انہوں نے ان پر سختی کی کہ وہ انہیں اللہ کی آیات کی طرف توجہ کیوں دلاتے ہیں اور انہیں قوت سے پکڑا۔ ان میں سے جسے چاہا، مارا اور جسے چاہا، جیل میں ڈال دیا یا پھر جلا وطن کر دیا۔[114]

ان باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت لگائی کہ آپ نے کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف یاد دہانی کی وجہ سے ان کے خلاف کاروائی کی تھی حالانکہ اگر آپ ایسے ہوتے تو پھر اس وقت زیادہ شدت سے کاروائی کرتے جب ان باغیوں نے مدینہ کے گرد گھیرا ڈالا تھا۔ اس کے برعکس آپ نے ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیے رکھا، یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں جان دے دی مگر ان کے

[113] بخاری۔ کتاب استتابۃ المرتدین۔ حدیث 6532 and 6534۔

[114] ابو الربیع سلیمان البارونی، مختصر تاریخ الاباضیہ، ص24۔ www.scribd.com (ac. 3 Oct 2011)

خلاف کاروائی نہ کی۔ عبداللہ بن اباض کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوارج کی بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے بعض ساتھیوں کو سزا دی تھی۔ بہر حال یہ گروہ باغیوں کا حصہ بنا رہا اور جنگ جمل اور جنگ صفین میں ان کے ساتھ شریک رہا۔ اس وقت تک ان کی کوئی علیحدہ شناخت نہیں تھی بلکہ یہ اسی باغی تحریک کا حصہ تھا۔ جنگ صفین میں جب صلح کی گفت و شنید ہونے لگی تو یہ منظر عام پر آئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی گروہ ایک دم نہیں بن جاتا۔ یہ گروہ بھی ایک دم ہی نہیں بنا ہو گا بلکہ طویل عرصے سے اس کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہو گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغی پارٹی کے اندر ایک پارٹی تھی جو الگ سے موجود تھی لیکن جنگ صفین کے خاتمے پر ظاہر ہو گئی۔ بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ باغیوں کے اندر یہ تقسیم خفیہ طور پر جنگ جمل کے بعد ہی وجود میں آ گئی تھی۔ سیف بن عمر کی روایت کے مطابق جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل کے بعد بصرہ کے خزانے سے فوجیوں کو تنخواہ دی تو انہی باغیوں کو سخت ناگوار گزرا کیونکہ وہ خود پورے مال پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ایک راوی راشد کا بیان ہے:

> حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اصول تھا کہ وہ کسی بھاگتے ہوئے اور زخمی کو قتل نہ کرتے تھے، نہ کسی کا پردہ فاش کرتے تھے اور نہ کسی کا مال لیتے تھے۔ کچھ لوگوں نے کہا: "یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ان لوگوں کا خون تو ہمارے لیے حلال ہے اور ان کا مال حرام۔" حضرت علی نے یہ سن کر فرمایا: "یہ تمہارے بھائی ہیں۔ جس نے ہم سے تعرض نہ کیا (یعنی غیر جانبدار رہا)، وہ ہمارا حصہ ہے اور ہم اس کا حصہ ہیں۔ جو شخص ہمارے مقابلے میں قتل ہوا، وہ ہماری جانب سے ابتداء کے باعث ہوا، اس لیے ان کے مال کا خمس (1/5) نہیں لیا جا سکتا۔" اسی وقت سے وہ لوگ، جو بعد میں خارجی ہو گئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔[115]

مالک الاشتر کی اس تقریر سے پارٹی کے اندر اس پارٹی کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تقریر موصوف نے انہی خارجیوں کے سامنے کی تھی:

> تم لوگوں کو دھوکہ دیا گیا اور واللہ! تم دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔ تمہیں (صفین میں) جنگ بندی کی دعوت دی گئی، تم نے فریب میں آ کر اسے قبول کر لیا۔ اے سیاہ پیشانیوں والو! ہم تو تمہاری نمازیں دیکھ کر یہ سمجھتے تھے کہ تمہیں دنیا سے کوئی غرض نہیں۔ تم جو یہ عبادات کر رہے ہو، اللہ عزوجل کی ملاقات کے شوق میں کر رہے ہو، لیکن اب تمہارے فرار سے یہ ظاہر ہوا کہ تم دنیا کی طلب میں موت سے بھاگنا چاہتے ہو۔ افسوس صد افسوس! اے بڑے بڑے جبے پہننے والو! آج کے بعد تم ہمیشہ دو راہیوں پر چلتے رہو ہو گے اور ایک رائے پر کبھی متفق نہ ہو گے۔ تم بھی ہمارے سامنے سے اسی طرح دفع ہو جاؤ جیسے ظالم قوم (یعنی اہل شام) دور ہو گئی ہے۔[116]

ابو مخنف نے بڑا زور لگایا ہے کہ جنگ صفین میں صلح کے "جرم" کا سارا ملبہ اسی خارجی پارٹی پر ڈال دیا جائے حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنی تقاریر اور خطوط سے واضح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بھی صلح چاہتے تھے اور آپ کی جنگ صفین میں شرکت کا

[115] طبری۔ 3/2-160

[116] ایضاً۔ 3/2-244

مقصد ہی یہ تھا کہ ان باغیوں کو کنٹرول کیا جائے۔ ابو مخنف کا کہنا یہ ہے کہ خارجیوں کے لیڈر مسعر بن فدکی تمیمی اور زید بن حصین الطائی نے حضرت علی سے بڑی بد تمیزی کی اور کہا:

علی! جب تمہیں کتاب اللہ کی دعوت دی جا رہی ہے، تم اسے قبول کرو ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے مخصوص ساتھیوں کو انہی لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیں گے۔ یا پھر جو سلوک ہم نے (عثمان) ابن عفان کے ساتھ کیا، وہی تمہارے ساتھ کریں گے (یعنی تمہیں قتل کر دیں گے۔)[117]

اگر یہ روایتیں درست ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ خوارج کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی حیثیت نہ تھی اور وہ اپنے زہد و تقوی کے زعم میں ان جلیل القدر صحابہ کو بھی اپنے سامنے کچھ نہ سمجھتے تھے۔ بہر حال ابو مخنف ان خوارج کے خلاف بھی متعصب ہے کیونکہ باغیوں کے ان دونوں فرقوں میں بعد میں زبردست نفرت پیدا ہوئی۔

خوارج کا نقطہ نظر کیا تھا؟

ابو مخنف کی روایت کے مطابق ان خوارج کی بغاوت کی بنیاد ان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ قرآن مجید کے مطابق باغیوں سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک کہ وہ توبہ نہ کر لیں یا پھر بالکل ہی ختم نہ ہو جائیں۔ حضرت علی نے چونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے صلح کر لی تھی، اس وجہ سے انہوں نے قرآن کی خلاف ورزی کی۔ قرآن کی خلاف ورزی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور ایسا کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما، معاذ اللہ دونوں ہی کافر ہو گئے۔ ان خوارج نے جس آیت کی بنیاد پر اپنے نقطہ نظر کی بنیاد رکھی تھی، وہ یہ ہے:

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنْ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ.

اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کروا دیا کیجیے۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے خلاف سرکشی کرے تو اس سرکشی کرنے والے سے جنگ کیجیے یہاں تک کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروا دیجیے۔ اور انصاف کیا کیجیے کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (الحجرات 49:9)

خوارج اس آیت کا مطلب یہ اخذ کرتے تھے کہ جو گروہ بغاوت کرے، اس سے جنگ کرنا قرآن کی رو سے فرض ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور کرنا جائز نہیں ہے بلکہ قرآن کی مخالفت کی وجہ سے کفر ہے۔ چونکہ معاویہ نے بغاوت کی تھی، اس وجہ سے علی پر لازم تھا کہ وہ ان سے جنگ کرتے۔ اب چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ دو فیصلہ کرنے والے حکم مقرر کر دیے ہیں، اس وجہ سے انہوں نے حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی ہے جس کے باعث وہ نعوذ باللہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت علی اور

[117] ایضاً۔ 3/2-243

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کا موقف یہ تھا کہ حکم مقرر کرنا اس آیت کریمہ میں صلح کروانے کے حکم سے متعلق ہے اور حضرت علی نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔

خوارج کا نقطہ نظر یہ تھا کہ قرآن کے ایک حکم کی خلاف ورزی بھی گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس عام مسلمانوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا گناہ گار ضرور ہوتا ہے مگر کافر نہیں ہوتا۔ خوارج اسی نقطہ نظر کی بنیاد پر کثرت سے مسلمانوں پر کفر کا فتوی عائد کیا کرتے تھے۔ بہت مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی لیڈر کو گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر کفر کا مرتکب قرار دے دیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ان کی اپنی جماعت فرقوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔[118] اسی وجہ سے آپس میں لڑنے لگے اور بالآخر روئے زمین ان کے وجود سے خالی ہو گئی۔

آیت کریمہ پر غور کیا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ٹھیک ٹھیک اس آیت پر عمل کیا تھا اور **فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا** کے تحت اصلاح کی کوشش کی تھی۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو انہیں قائل کرنے کے لیے بھیجا اور پھر خود تشریف لے گئے لیکن خوارج نے آپ کی کسی وضاحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ حضرات کسی طرح ماننا ہی نہ چاہتے تھے اور ہر صورت میں فتنہ و فساد پھیلانا چاہتے تھے۔

یہ بالکل اس کہانی کا سا معاملہ تھا جس میں ایک بھیڑیے نے پانی پیتے ہوئے ایک بھیڑ کے بچے کو دیکھا تو اسے کھانے کی ٹھانی۔ کہنے لگا: "تم پانی گندا کر کے میری طرف کیوں بھیج رہے ہو؟" اس نے جواب دیا: "جناب! پانی تو آپ کی طرف سے آ رہا ہے۔" بھیڑیا بولا: "تم نے مجھے پچھلے سال گالیاں کیوں دی تھیں؟" اس نے جواب دیا: "جناب! میری عمر تو ابھی چھ ماہ ہے۔" بھیڑیا بولا: "پھر تمہاری ماں ہو گی جس نے مجھے گالیاں دی ہوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے بھیڑ کے بچے پر حملہ کر دیا اور اسے چیر پھاڑ کر کھا گیا۔ خوارج کا معاملہ بھی یہی تھا۔ انہوں نے چونکہ فتنہ و فساد کی ٹھان رکھی تھی، اس وجہ سے وہ کسی بھی دلیل سے قائل نہیں ہونے والے تھے اور انہوں نے ہر صورت میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر جنگ کرنا تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کے مقابلے پر کوئی بھیڑ کا بچہ نہیں تھا بلکہ شیر خدا علی رضی اللہ عنہ تھے۔

خوارج دیگر باغیوں سے الگ کیوں ہوئے؟ اس پر ہمیں تاریخ کی کتب میں سے کچھ نہیں مل سکا۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ باغیوں کے مابین مفادات کی جنگ ہو گئی ہو گی، جس کی وجہ سے یہ الگ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا فلسفہ گھڑ لیا۔ مزاج کے اعتبار سے چونکہ یہ بالکل ہی اکھڑ قسم کے متکبر بدو تھے، اس وجہ سے انہوں نے کسی چالبازی کی بجائے سیدھی سیدھی خود کش جنگ چھیڑی اور اس میں

[118] Fazal ur Rahman. Revival and Reform in Islam. P 36. London: One World Publications (2006)

اجتماعی خود کشی کر لی۔

حضرت علی نے خوارج کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

ابو مخنف نے جو واقعات بیان کیے ہیں، ان کے مطابق خوارج کے کچھ سرکردہ لیڈر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ آپ نے معاویہ سے صلح کا معاہدہ کر کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اس پر توبہ کیجیے اور جنگ دوبارہ شروع کیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ حضرت علی نے اس سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم معاہدہ کر چکے ہیں، جس کی خلاف ورزی کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ اس پر ان خوارج نے کہا کہ اگر آپ اس معاہدہ کرنے کے گناہ سے توبہ نہ کریں گے تو ہم آپ سے جنگ کریں گے۔ یہ کہہ کر وہ "لا حکم الا اللہ" کا نعرہ لگاتے چلے گئے۔[119]

اس وقت تک خوارج عام مسلمانوں میں مل جل کر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو مسجد کے مختلف کونوں سے "لا حکم الا اللہ" کی صدائیں بلند ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

> اللہ اکبر! یہ ایک حق کلمہ (لا حکم الا اللہ) ہے جس کے ذریعے باطل کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔ جب تک آپ لوگ ہمارے ساتھ ہیں، میری جانب سے آپ کے لیے تین فیصلے ہیں: اول یہ کہ ہم آپ کو اس وقت تک مسجد میں آنے سے نہ روکیں گے، جب تک آپ مسجد میں اللہ کا ذکر کرتے رہیں گے۔ (دوسرے یہ کہ) جب تک آپ ہمارا ساتھ دیں گے، ہم مال غنیمت کو بھی آپ سے نہ روکیں گے۔ (تیسرے یہ کہ) جب تک آپ ہم سے جنگ کی ابتدا نہ کریں گے، ہم آپ سے جنگ نہیں کریں گے۔[120]

یہ روایت طبری نے ابو مخنف کے علاوہ اور ذرائع سے بھی بیان کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پالیسی یہی تھی۔ جب فیصلے کے لیے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے تو خوارج نے باہمی مشورے سے عبد اللہ بن وہب الراسی کو اپنا امیر بنا لیا۔ ان کے نزدیک یہ شخص پانچواں خلیفہ راشد کہلاتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی قوت کو منظم کر کے مدائن کا رخ کیا جو کوفہ کے شمال میں واقع ہے۔ یہاں ان کی مدائن کے گورنر سعد بن مسعود سے جھڑپ بھی ہوئی اور اس کے بعد یہ نہروان کے علاقے میں اکٹھے ہو گئے۔ بصرہ کی خارجی جماعت بھی ان سے آملی۔

اس دوران باغی تحریک کے بقیہ عناصر شام پر دوبارہ حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ بقول ابو مخنف کے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو خطوط بھی لکھے اور انہیں شام پر حملے کی ترغیب دی لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت علی کا جو کردار ہم اوپر

---

[119] طبری۔ 3/2-269

[120] ایضاً۔ 3/2-270

بیان کر چکے ہیں، اس سے یہ بات بہت بعید ہے کہ آپ کے نزدیک اہل شام کا مقابلہ، ان باغیوں کے مقابلے سے زیادہ اہم تھا۔ یقینی طور پر باغی عناصر ہی شام پر حملہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کے عزائم میں اب بھی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ابو مخنف ہی کا بیان ہے کہ بہت کم لوگ شام پر حملے کے لیے تیار ہوئے۔ بالآخر غلاموں، آزاد کردہ غلاموں اور بالکل ہی نوجوان لڑکوں کو ملا کر 57000 کا لشکر تیار ہوا۔ [121]

اس دوران خارجیوں نے جنگی کاروائیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن خباب رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور ان سے حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے بارے میں رائے طلب کی۔ انہوں نے ان سب حضرات کی تعریف کی تو انہیں شہید کر دیا۔ ان کے ساتھ ان کی ایک لونڈی بھی تھی جو حاملہ تھی۔ اسے شہید کر کے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ ان خوارج کے زہد و تقوی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا قتل ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا لیکن بقیہ معاملات میں یہ بڑے محتاط تھے۔ ایک جگہ ایک درخت سے کھجور گری تو ایک خارجی نے اسے منہ میں ڈال لیا۔ اس کے ساتھی نے ٹوکا کہ یہ کھجور لینا تمہارے لیے حرام ہے۔ اس نے منہ سے کھجور نکال پھینکی اور اپنا ہاتھ بھی کاٹ دیا۔ ایک جگہ ایک غیر مسلم کا خنزیر چرتا دیکھا تو اسے ایک خارجی نے مار دیا۔ دوسروں نے اسے تنبیہ کی تو اس نے جا کر اس کے مالک سے معافی مانگی۔ [122] اس کردار کے لوگ اب بھی ہمارے ہاں نظر آتے ہیں جو انسانوں کے قتل کو تو بڑا مسئلہ نہیں سمجھتے لیکن چھوٹے چھوٹے معاملات میں زہد و تقوی کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن خباب کی شہادت کا سن کر حضرت علی نے ان خوارج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم کی سرکردگی میں ایک فوج خوارج کی طرف بھیجی۔ انہوں نے بھی براہ راست حملہ کرنے کی بجائے پہلے خوارج کو دعوت دی کہ وہ قاتلین کو ان کے حوالے کریں اور توبہ کر کے مسلمانوں سے آملیں لیکن خوارج نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حضرت ابو ایوب انصاری اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بھی انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ کسی طرح نہ مانے۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک سفید جھنڈا کھڑا کر کے اعلان کیا کہ جو شخص جنگ کیے بغیر اس جھنڈے کے نیچے آجائے، اسے امان حاصل ہو گی اور جو یہاں سے نکل کر کوفہ یا مدائن چلا جائے، اسے بھی امان حاصل ہو گی۔ متعدد خوارج نے اس آفر سے فائدہ اٹھا کر امان حاصل کی۔ خوارج کی کل تعداد محض چار ہزار تھی جن میں سے اب 2800 آدمی عبداللہ بن وہب الراسبی کے ساتھ رہ گئے تھے۔ انہوں نے جان توڑ کر جنگ کی لیکن بالآخر مارے گئے۔ [123]

جنگ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے چار سو زخمیوں کی مرہم پٹی کروائی اور انہیں ان کے قبائل میں بھیج دیا۔ آپ نے

---

[121] ایضاً۔ 3/2-277

[122] ایضاً۔ 3/2-280

[123] ایضاً۔ 3/2-285

ان کا مال و اسباب بھی واپس کر دیا۔ اس سے زیادہ اچھا سلوک شاید ہی کسی نے باغیوں سے کیا ہو گا۔

اس کے بعد مین اسٹریم باغی لیڈروں نے ایک مرتبہ پھر شام پر حملے کا ارادہ کیا اور فوج کو لشکر گاہ میں مقیم رہنے کی ہدایت کی لیکن لوگ اہل شام کا مقابلہ نہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ وہ آہستہ آہستہ کھسکنا شروع ہو گئے اور چند سرداروں کے سوا لشکر گاہ خالی ہو گئی۔[124] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ اہل شام کو مسلمان سمجھتے تھے اور ان باغیوں کے لیے شامیوں سے جنگ کو درست نہ سمجھتے تھے۔ ابومخنف نے اپنے الفاظ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے کہلوا کر ان لوگوں کو بڑی لعن طعن کی ہے اور ان کا نوحہ کہا ہے کیونکہ انہی لوگوں کی وجہ سے باغی پارٹی کا مشن ناکام ہو گیا تھا۔

خوارج سے جنگ کے نتائج کیا نکلے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شروع میں خوارج سے جنگ کرنے سے پرہیز کیا تھا، اس کی وجہ وہی تھی کہ جنگ کے نتیجے میں ان کے قبائل بغاوت نہ کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے خوارج کو آخر تک ڈھیل دی اور جب کسی طرح ان کا معاملہ نہ سلجھا، تو ان سے جنگ کی۔ بہرحال جنگ کا نتیجہ وہی نکلا جس سے آپ بچنا چاہ رہے تھے۔ طبری نے شعبی کا یہ بیان نقل کیا ہے:

> جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل نہروان کو قتل کیا تو ایک بہت بڑی جماعت آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئی اور گرد و نواح میں ہر جانب بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ بنو ناجیہ بھی مخالف بن گئے، اہل اہواز نے بھی بغاوت کر دی، بصرہ میں ابن الحضرمی نے پہنچ کر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور ذمیوں نے بھی خراج دینے سے انکار کر دیا۔ ایرانیوں نے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ، جو وہاں کے گورنر تھے، نکال باہر کیا۔ حضرت علی نے ابن عباس رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ (حضرت معاویہ کے بھائی) زیاد (بن ابی سفیان) کو ایران روانہ کر دو۔ حضرت ابن عباس کوفہ سے بصرہ آئے اور زیاد کو ایک بڑا لشکر دے کر ایران روانہ کیا۔ زیاد نے اہل ایران کو خوب روندا اور انہوں نے بالآخر خراج ادا کیا۔[125]

اگر ہم اس قبائلی ماحول کا تصور کریں تو اس سے بات کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ یہ روایت دنیا بھر کے قبائلی معاشروں میں عام ہے کہ ہر قیمت پر اپنے قبیلے کے آدمی کا ساتھ دینا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ چنانچہ ہم اپنے دور میں بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ کوئی جرم جیسے قتل، اغوا وغیرہ میں ملوث ہوتے ہیں اور پھر اپنے قبیلے میں جا کر پناہ لے لیتے ہیں۔ پولیس اگر ان کے خلاف کوئی اقدام کرنا چاہے تو پورا قبیلہ ہی اس ملزم کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پولیس، عدالت اور دیگر حکومتی اداروں پر دباؤ ڈال کر تفتیش کا رخ کسی اور جانب پھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قبائل تو کیا، موجودہ دور کی سیاسی پارٹیوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ جرم کرتے ہیں اور عدالتیں انہیں سزا سناتی ہیں لیکن پارٹی کے کارکن عدالت کا گھیراؤ کر کے اس کے فیصلے پر عمل درآمد نہیں ہونے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابتدا میں باغیوں کے خلاف کارروائی نہ کی تھی کہ کہیں ان کے قبائل ان کی حمایت میں اٹھ نہ

---

[124] ایضاً۔ 3/2-290

[125] ایضاً۔ 3/811

کھڑے ہوں۔ پھر ان کے ایک گروہ "خوارج" نے حضرت علی کے خلاف بھی بغاوت کر دی اور لوگوں کی جان و مال کے لیے خطرہ بن گئے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف کاروائی کی تو ان کے قبائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد یہ خوارج ہی تھے جنہوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ اس کی تفصیل ہم بعد میں بیان کریں گے۔

خوارج کی مختلف پارٹیاں بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانوں میں مسلسل بغاوت کرتی رہیں۔ تاریخ میں خوارج کی متعدد بغاوتوں کو ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں متعدد بغاوتیں کیں جن میں 57/677 کی بغاوت کافی بڑی تھی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں ان کے ساتھ آ ملے لیکن جلد ہی انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنے بغض کا اظہار کیا تو ابن زبیر نے ان سے براءت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد ان خوارج نے مغربی ایران کے مختلف علاقوں کو اپنا مرکز بنا لیا اور پہاڑوں میں چھپ کر گوریلا جنگ جاری رکھی۔ یہاں سے یہ شہروں پر حملہ کر کے لوٹ مار کرتے۔ انہوں نے 65/684 میں انہوں نے پھر بغاوت کی جسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرو کیا۔ 68/687 میں انہوں نے ایران میں بغاوت برپا کر دی جسے مصعب بن زبیر نے فرو کیا۔ 72/691 میں انہوں نے عبدالملک بن مروان کے خلاف بغاوت کی۔[126]

خوارج کا نقطہ نظر یہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر ہے۔ جو شخص بھی ان کے خیال میں گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا، اسے یہ بلا تکلف کافر قرار دے کر اس سے جنگ شروع کر دیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سوائے ان کے گروپ کے، پورا عالم اسلام کافر تھا۔ یہ اپنے ساتھیوں کو بھی معاف نہ کرتے تھے بلکہ ذرا سی غلطی پر انہیں بھی کافر قرار دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح ان کی جماعت مختلف گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے تک ان کے بہت سے فرقے بن چکے تھے جن میں ازارقہ، صفاریہ اور اباضیہ نمایاں تھے۔ اباضیہ کے سوا یہ سب بار بار حکومت کے خلاف بغاوت کرتے رہے، جس کی وجہ سے ان کی قوت کمزور پڑ گئی اور دو صدیوں کے اندر اندر یہ فرقہ ختم ہو گیا۔ اباضیہ نسبتاً اعتدال پسند تھے اور جنگ و جدال سے پرہیز کرتے تھے، اس وجہ سے یہ باقی رہے اور آج تک یہ موجود ہیں۔

اب ہم جنگ جمل، صفین، تحکیم اور خوارج سے متعلق سوالات کے جوابات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ مناسب ہو گا کہ اب ہم مصر کی باغی پارٹی کی بقیہ تفصیلات سے متعلق سوالات کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

مصر کی باغی پارٹی

ہم جانتے ہیں کہ شہادت عثمان کے وقت مصر باغی پارٹی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس سیکشن میں ہم ان کی اس مصری شاخ کے احوال کا مطالعہ کریں گے۔

---

[126] ایضاً۔ 4/1-123, 351, 4/2-57, 94

شہادت عثمان کے بعد مصر میں کیا ہوا؟

جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ یہاں مصر سے مراد فسطاط شہر ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوفہ اور بصرہ کی طرز پر آباد کیا گیا۔ یہ اس وقت مصر کے صوبے کا دار الحکومت تھا اور اب یہ شہر، موجودہ قاہرہ کا ایک حصہ بن چکا ہے اور یہاں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی بنائی ہوئی مسجد اب تک موجود ہے۔ قدیم مصر کے اور بھی شہر تھے جن میں اسکندریہ مصر کا قدیم دار الحکومت تھا مگر مسلمانوں کے زمانے میں یہ تمام شہر فسطاط کی چھاؤنی ہی سے کنٹرول کیے جاتے تھے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ کوفہ اور بصرہ کی طرح، فسطاط کو بھی باغیوں نے اپنا مرکز بنالیا تھا اور ان کے جو گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے مدینہ آئے تھے، ان میں سب سے بڑا گروہ مصر ہی سے آیا تھا۔ مصر کے گورنر حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے لیبیا سمیت تیونس تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ جب انہیں باغیوں کے مدینہ پر حملے کی اطلاع ملی تو یہ اپنی فوج کے ساتھ مصر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے نکلے لیکن ابھی راستے ہی میں تھے کہ خلیفہ کی شہادت کی اطلاع ملی۔

اوپر ہم محمد بن ابی حذیفہ کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس شخص کی پرورش حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کی تھی اور اب یہ بڑا ہو کر بغیر کسی اہلیت کے کسی بڑے عہدے کا طالب تھا۔ حضرت عثمان نے اسے مصر بھیج دیا تا کہ یہ یہاں رہ کر ایڈمنسٹریشن میں مہارت حاصل کرے لیکن اس نے ابن ابی سرح کے ساتھ سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے اس کی شکایت حضرت عثمان کو کی لیکن اسے کوئی سزا نہ دی۔ جب ابن ابی سرح مصر سے فوج لے کر نکلے تو ابن ابی حذیفہ نے مصر کی گورنری پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایک کھلی بغاوت تھی جس کے نتیجے میں مصر پر باغیوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا۔ ابن ابی سرح نے باغیوں کے علاقے میں واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچے۔ وہاں سے حضرت معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے مصر کی جانب فوج بھیجی اور ابن ابی حذیفہ کو قتل کر دیا۔

جنگ جمل سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کو مصر کا گورنر مقرر فرمایا۔ یہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے اور اب قبیلہ خزرج کے سردار تھے۔ نہایت ہی اعلی درجے کے منتظم اور مخلص مسلمان تھے۔ انہوں نے مصر جا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت لی۔ صرف ایک علاقے "خربتا" کے دس ہزار لوگوں نے ان سے قصاص عثمان کا مطالبہ کیا اور بیعت کا فیصلہ موخر کیا۔ ان میں مسلمہ بن مخلد انصاری اور معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہما جیسے بزرگ انصاری صحابہ موجود تھے۔ قیس رضی اللہ عنہ نے ان سے نرمی کی اور حسن سلوک سے کام لیا، اس طرح سے مصر کا معاملہ بڑی حد تک سلجھ گیا۔

طبری نے یہاں ہشام کلبی اور ابو مخنف کی روایت نقل کی ہے اور ان دونوں راویوں کا صحابہ سے بغض معلوم و معروف ہے۔ اس روایت میں انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید ہے اور لکھا ہے کہ انہوں

نے بدعتیں نکالیں۔[127] اس کے بعد انہی راویوں نے حضرت معاویہ اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہم کے درمیان خط و کتابت نقل کی ہے جس میں حضرت معاویہ، قیس بن سعد اور حضرت علی پر قتل عثمان کا الزام عائد کرتے ہیں اور حضرت قیس ان کی کردار کشی کرتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک سازش حضرت معاویہ کی طرف منسوب کی ہے جس کے مطابق انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قیس سے بد ظن کرنے کے لیے ان کے جانب سے اپنے نام ایک جھوٹا خط لکھوا کر حضرت علی کو بھجوایا۔ اس خط میں حضرت قیس نے معاویہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ شمولیت کا اعلان کیا ہے۔ اس خط کی وجہ سے حضرت علی نے قیس بن سعد کو مصر کی گورنری سے معزول کر دیا۔

ان روایات کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے راوی ہشام کلبی اور ابو مخنف جیسے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اصحاب رسول کی کردار کشی کی ہے۔ اوپر جو تفصیل دی گئی ہے، اس کی روشنی میں واضح ہے کہ یہ روایت جعلی ہے اور اس کا موجد ہشام کلبی یا ابو مخنف میں سے کوئی ایک ہے کیونکہ حضرت علی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دست راست اور سب سے بڑے حمایتی تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ باغی لیڈر مصر پر خود قبضہ کرنا چاہتے تھے جو کہ ان کی تحریک کا مرکز رہا تھا مگر یہاں قیس بن سعد رضی اللہ عنہما جیسے دانش مند اور ہوشیار گورنر کی وجہ سے انہیں اپنی دال گلتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ انہوں نے خود یہ سازش کی ہو اور قیس کی جانب خط لکھ دیا ہو۔ جعلی خطوط کے اس فن میں وہ پہلے سے ید طولی رکھتے تھے۔ اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کی جگہ ان باغیوں کے ساتھی محمد بن ابی بکر کو مصر کا گورنر لگوایا جا سکے اور پھر مصر میں جی بھر کر من مانی کی جا سکے۔ اس کے لیے انہوں نے بہانہ یہ بنایا کہ اگر قیس، معاویہ کے حامی نہیں ہیں تو پھر انہیں کہیے کہ خربتا کے ان دس ہزار لوگوں سے جنگ کریں جنہوں نے بیعت نہیں کی ہے۔ واضح رہے کہ مصر میں باغیوں کے اقتدار کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی خربتا کے دس ہزار لوگ تھے۔ انہی کلبی اور ابو مخنف کی روایت کے مطابق جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیس کو ان لوگوں سے جنگ کا حکم دیا تو قیس نے جواب میں لکھا:

> امیر المومنین! مجھے آپ کے حکم سے بہت تعجب ہوا ہے۔ کیا آپ مجھے ایسے گروہ سے جنگ کا حکم دے رہے ہیں، جو آپ کی حفاظت کر رہے ہیں اور آپ کے دشمنوں کو روکے ہوئے ہیں۔ اگر آپ ان سے جنگ کریں گے تو آپ کے دشمن ان کی حمایت کریں گے اور ان پر چڑھ دوڑیں گے۔ امیر المومنین! آپ میری بات تسلیم کیجیے، ان سے جنگ نہ کیجیے کیونکہ ان سے جنگ نہ کرنا بہتر ہے۔ والسلام۔[128]

ہمیں یقین ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا صاحب حکمت اور صاحب دانش ایسا اقدام نہ کر سکتا تھا کہ جب کئی محاذ کھلے ہوں، وہاں

---

[127] ایضاً۔ 3/2-167

[128] ایضاً۔ 3/2-173

ایک اور محاذ کھول لیتا۔ خربتا کے لوگوں نے بغاوت نہ کی تھی، وہ صرف غیر جانبدار رہ کر باغیوں کو سزا دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کے خلاف لشکر کشی کا کوئی جواز نہ تھا۔ قیس بن سعد جیسے صائب الرائے شخص کی رائے بالکل درست تھی لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ موجود باغیوں کو چین کیسے آتا۔ انہیں سب سے بڑھ کر تکلیف یہ ہو گی کہ جس مصر میں انہوں نے اپنی تحریک کو پروان چڑھایا، وہ قیس کے ذریعے ان کے ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی نہ کسی مجبور کر کے قیس بن سعد کو معزول کروایا اور ان کی جگہ محمد بن ابی بکر مصر کا گورنر لگوا دیا اور قیس کو ان کا ماتحت بنا دیا۔ قیس یہ بات برداشت نہ کر سکے اور مصر چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔

طبری نے ایک اور بے سر وپا روایت یہاں نقل کی ہے کہ جب قیس مدینہ پہنچے تو مروان اور اسود بن ابی البختری نے انہیں ڈرایا دھمکایا، جس کی وجہ سے وہ مدینہ چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آ گئے۔ اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں خط لکھا جس میں بہت ڈانٹا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ اگر تم علی کی مدد ایک لاکھ سواروں سے کرتے تو مجھے اتنا ناگوار نہ گزرتا جتنا کہ قیس جیسے ہوشیار شخص کو مدینہ سے نکال کر تم نے کیا ہے۔[129] اس روایت کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ مروان تو اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے بلکہ اسی وقت مدینہ سے نکل گئے تھے جب شہادت عثمانی کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد باغیوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس روایت کی سند یہ ہے: حدثني عبد الله، عن يونس، عن الزهري۔ اس کی سند میں وہی یونس بن یزید الایلی ہیں جو کہ سخت ناقابل اعتماد ہیں اور انہوں نے زہری سے عجیب و غریب روایتیں نقل کی ہیں۔ محدثین نے ان کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں، باب 2 میں آپ ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

مصر میں باغی پارٹی کا خاتمہ کیسے ہوا؟

ہشام کلبی اور ابو مخنف کی روایت کے مطابق محمد بن ابی بکر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے خط و کتابت کی اور یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ طبری کہتے ہیں کہ چونکہ عام لوگ ان خطوط کا سننا برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔[130] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خطوط میں ان غالی راویوں نے جی کھول کر حضرت معاویہ اور علی رضی اللہ عنہما کی کردار کشی کی ہو گی، تبھی طبری جیسے انسان، جو ہر طرح کی روایت نقل کر دیتے ہیں، نے بھی ان خطوط کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے۔

ہشام اور ابو مخنف کی اپنی روایت کے مطابق محمد بن ابی بکر نے جاتے ہی خربتا کے ان غیر جانبدار لوگوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا مصر اس کے خلاف ہو گیا۔ باغیوں نے اس کی مدد کے لیے مالک الاشتر کو مصر روانہ کیا۔ اگر آپ نقشے کو دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ عراق سے مصر جانے کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاقے سے گزرنا لازم تھا۔ اشتر اسی علاقے سے گزرا اور

[129] ایضاً۔ 3/2-294

[130] ایضاً۔ 3/2-176

ایک غیر مسلم کے گھر قیام کیا۔ اس نے اشتر کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قاتل اپنے انجام کو پہنچا۔[131] اس کے سامان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک جعلی خط ملا جس میں اسے اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار قرار دیا گیا تھا۔ اس طرح باغیوں نے اپنی جعل سازی کے طفیل اس شخص کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا درجہ دے رکھا تھا۔



سامی بن عبد اللہ المغلوث: اطلس الخلیفہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حضرت معاویہ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں باغیوں کی سرکوبی کے لیے مصر ایک فوج بھیجی۔ حضرت عمرو بن عاص ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مصر فتح کیا تھا۔ اس کے بعد طویل عرصے تک یہاں کے گورنر رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسکندریہ میں دو مرتبہ بغاوت اٹھی تو آپ ہی نے اسے فرو کیا۔ اب آپ ایک مرتبہ پھر مصر فتح کرنے کے لیے نکلے لیکن اس مرتبہ آپ کے مقابلے پر وہی باغی پارٹی تھی۔ جلد ہی انہیں شکست ہوئی اور اس طرح چوتھی مرتبہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا۔ محمد بن ابی بکر چھپتا پھرا لیکن بالآخر پکڑا گیا۔ اس کی موت کے بارے میں اختلاف ہے: ابو مخنف کی روایت کے مطابق اسے مار کر گدھے کی کھال میں بھر کر جلا دیا گیا جبکہ واقدی کی روایت کے مطابق یہ آخر دم تک لڑتا ہوا مارا گیا۔[132] افسوس اس شخص پر کہ یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پیدا ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر اس نے پرورش پائی۔ اس کے بعد یہ باغیوں سے مل گیا اور اسے وہ گورنری بھی راس نہ آئی، جس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ بہرحال اب چونکہ وہ اس جہان سے جا چکا ہے، اس وجہ سے اس کا معاملہ اللہ تعالی کے سپرد کر دینا چاہیے۔ ہمارے پاس سوائے ان

[131] ایضاً۔ 3/2-296

[132] ایضاً۔ 3/2-306

روایات کے، کسی کے جرم کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور روایات کی حیثیت آپ کے سامنے ہے۔

ابو مخنف نے یہاں بھی ایک جھوٹی روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کر دی ہے کہ جب آپ کو محمد بن ابی بکر کی موت کی اطلاع ملی تو آپ حضرت عمرو بن عاص اور معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہما کے خلاف بد دعا کرتی رہیں۔ اگر آپ کو اپنے بھائی سے اتنی ہی ہمدردی ہوتی تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے آپ کیوں نکلتیں؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے البتہ یہ ضرور کیا کہ محمد بن ابی بکر کی اولاد کو اپنی کفالت میں لے لیا اور ان کے بیٹے قاسم بن محمد بن ابی بکر (d. 107/726) ایک بہت جلیل القدر عالم دین بنے۔ یہ سیدہ عائشہ، ابن عباس، ابن زبیر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے شاگردوں میں نمایاں تھے اور ان کا شمار مدینہ کے سات جلیل القدر فقہاء میں ہوتا ہے۔ یہ بہت عبادت گزار تھے اور راتوں کو رو رو کر اپنے والد کے گناہ کی معافی کی دعا کیا کرتے تھے۔

مصر کی باغی پارٹی اس جنگ میں ماری گئی اور اس طرح سے باغیوں کے مصر چیپٹر کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چونکہ ایسا کرنے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے غیر معمولی کردار ادا کیا، اس وجہ سے باغیوں کی اگلی نسلوں نے آپ کو خاص نشانہ بنایا اور آپ کی کردار کشی کے لیے روایتیں گھڑیں جو طبری میں موجود ہیں۔ ان روایات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں یہی ہشام کلبی، ابو مخنف، سیف بن عمر یا واقدی جیسے راوی نظر آتے ہیں۔ یہ روایات محض ان باغیوں کا انتقام ہے کہ انہوں نے اپنی ناکامی سے جھنجلا کر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کردار کشی کی روایتیں گھڑی ہیں۔

حضرت علی کی شہادت

حضرت علی کیسے شہید ہوئے؟

مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت خوارج کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ وہی گروہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں شامل تھا۔ بعد میں اس پارٹی میں اختلافات پیدا ہو گئے اور خوارج نے اپنی جماعت الگ بنا لی۔ باغی پارٹی کے بقیہ ارکان بدستور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد و پیش میں موجود رہے تاہم ان کی طاقت اب کمزور پڑ چکی تھی۔

تین خارجی ابن ملجم، برک بن عبد اللہ اور عمرو بن بکر تیمی اکٹھے ہوئے اور انہوں نے منصوبہ بنایا حضرت علی، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کو ایک ہی رات میں قتل کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اپنی جانوں کو اللہ تعالی کے ہاتھ فروخت کیا، خودکش حملے کا ارادہ کیا اور تلواریں زہر میں بجھا لیں۔ ابن ملجم کوفہ آ کر دیگر خوارج سے ملا جو خاموشی سے مسلمانوں کے اندر رہ رہے تھے۔ اس کی ملاقات ایک حسین عورت قطامہ سے ہوئی، جس کے باپ اور بھائی جنگ نہروان میں مارے گئے تھے۔ ابن ملجم اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا اور اسے نکاح کا پیغام بھیجا۔ قطامہ نے نکاح کی شرط یہ رکھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا جائے۔ ایک خارجی شبیب نے ابن ملجم کو روکا بھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اسلام کے لیے خدمات کا حوالہ بھی دیا لیکن ابن ملجم نے اسے قائل کر لیا۔

اس نے نہایت ہی سادہ منصوبہ بنایا اور صبح تاریکی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب فجر کی نماز کے لیے مسجد کی طرف آ رہے تھے تو اس نے آپ پر حملہ کر کے آپ کو شدید زخمی کر دیا۔ اس کے بقیہ دو ساتھی جو حضرت معاویہ اور عمرو رضی اللہ عنہما کو شہید کرنے روانہ ہوئے تھے، ناکام رہے۔ برک بن عبداللہ، جو حضرت معاویہ کو شہید کرنے گیا تھا، انہیں زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ حضرت عمرو اس دن بیمار تھے، اس وجہ سے انہوں نے فجر کی نماز پڑھانے کے لیے خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا۔ خارجی عمرو بن بکر نے عمرو بن عاص کے دھوکے میں خارجہ کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد وہ گرفتار ہوا اور مارا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وفات سے پہلے کچھ وقت مل گیا جسے آپ نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرنے میں صرف کیا۔ جانکنی کے اس عالم میں بھی آپ نے جو باتیں ارشاد فرمائیں، وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ یہاں ہم طبری سے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں:

آپ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلوایا اور ان سے فرمایا: "میں تم دونوں کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ دنیا کے پیچھے ہرگز نہ لگنا خواہ دنیا تم سے بغاوت ہی کیوں نہ کر دے۔ جو چیز تمہیں نہ ملے، اس پر رونا نہیں۔ ہمیشہ حق بات کہنا، یتیموں سے شفقت کرنا، پریشان کی مدد کرنا، آخرت کی تیاری میں مصروف رہنا، ہمیشہ ظالم کے دشمن اور مظلوم کے حامی رہنا اور کتاب اللہ کے احکامات پر عمل کرتے رہنا۔ اللہ کے دین کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے مت گھبرانا۔

(تیسرے بیٹے) محمد بن حنفیہ سے فرمایا: "میں نے تمہارے بھائیوں کو جو نصیحت کی، تم نے بھی سن کر محفوظ کر لی؟ میں تمہیں بھی وہی نصیحت کرتا ہوں جو تمہارے بھائیوں کو کی ہے۔ اس کے علاوہ یہ وصیت کرتا ہوں کہ اپنے بھائیوں (حسن و حسین) کی عزت و توقیر کرنا اور ان دونوں کے اس اہم حق کو ملحوظ رکھنا جو تمہارے ذمہ ہے۔ ان کی بات ماننا اور ان کے حکم کے بغیر کوئی کام نہ کرنا۔ "

پھر حسن و حسین سے فرمایا: "میں تم دونوں کو بھی محمد کے ساتھ اچھے سلوک کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ تمہارا بھائی اور تمہارے باپ کا بیٹا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تمہارا باپ اس سے محبت کرتا ہے۔"

پھر خاص طور پر حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "میرے بیٹے! تمہارے لیے میری وصیت یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہنا، نماز وقت پر ادا کرنا، زکوۃ کو اس کے مصرف میں خرچ کرنا، وضو کو اچھی طرح کرنا کہ بغیر وضو کے نماز نہیں ہوتی اور زکوۃ نہ دینے والے کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی۔ ہر وقت گناہوں کی مغفرت طلب کرنا، غصہ پینا، صلہ رحمی کرنا، جاہلوں سے بردباری سے کام لینا، دین میں تفقہ حاصل کرنا، ہر کام میں ثابت قدمی دکھانا، قرآن پر لازمی عمل کرتے رہنا، پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنا، نیکی کی تلقین اور برائیوں سے اجتناب کی دعوت دیتے رہنا اور خود بھی برائیوں سے بچتے رہنا۔"

جب وفات کا وقت آیا تو پھر یہ (قرآنی آیات پر مشتمل) وصیت فرمائی: "بسم اللہ الرحمن الرحیم! یہ وہ وصیت ہے جو علی بن ابی طالب نے کی ہے۔ وہ اس بات کی وصیت کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، جنہیں اللہ تعالی نے ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب فرما دیں، خواہ یہ بات مشرکین کو ناگوار گزرے۔ یقیناً میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے

اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبردار لوگوں میں سے ہوں۔

حسن بیٹا! میں تمہیں اور اپنی تمام اولاد اور اپنے تمام گھر والوں کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں جو تمہارا رب ہے۔ اس بات کی وصیت کرتا ہوں کہ صرف اسلام ہی کی حالت میں جان دینا۔ **تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ ایک دوسرے باہمی تعلق رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا نفل نمازوں اور روزوں سے بہتر ہے۔** اپنے رشتے داروں سے اچھا سلوک کرنا، اس سے اللہ تم پر حساب نرم فرما دے گا۔ یتیموں کے معاملے میں اللہ سے ڈرنا، ان پر یہ نوبت نہ آنے دینا کہ وہ اپنی زبان سے تم سے مانگیں اور نہ ہی تمہاری موجودگی میں پریشانی میں مبتلا ہوں۔ اللہ سے ڈرتے رہنا اور اللہ سے پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں بھی ڈرنا کیونکہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت ہے۔۔۔۔۔[133]

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور بھی بہت سی نصیحتیں فرمائیں جن میں خاص کر نماز، زکوۃ، جہاد، امر بالمعروف کی نصیحت تھی۔ معاشرے کے کمزور طبقات یعنی غرباء و مساکین اور غلاموں کے بارے میں خاص وصیت فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا:

تمہارے موجود ہوتے ہوئے کسی پر ظلم نہ کیا جائے۔ **اپنے نبی کے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔۔۔پشت دکھانے، رشتوں کو توڑنے اور تفرقہ سے بچتے رہنا۔** نیکی اور تقوی کے معاملے میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور نافرمانی اور سرکشی میں کسی کی مدد نہ کرنا۔ اللہ سے ڈرتے رہنا کیونکہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ اللہ تعالی تمہاری، تمہارے اہل خاندان کی حفاظت کرے جیسے اس نے تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت فرمائی تھی۔ میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور تم پر سلام اور اللہ کی رحمت بھیجتا ہوں۔[134]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وصیتیں ایسی ہیں کہ پڑھنے والے کا دل بھر آتا ہے۔ ان وصیتوں میں جو خط کشیدہ الفاظ ہیں، ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں آپ کی رائے کیا تھی؟ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خاص کر اس بات کی تلقین فرمائی کہ صحابہ کرام کو ساتھ ملایا جائے، ان سے تفرقہ نہ پیدا کیا جائے اور انہی کے ساتھ رہا جائے خواہ اس کے لیے انہیں کسی بھی قسم کی قربانی دینا پڑے۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت حسن نے یہی کیا اور قربانی کی ایک ایسی تاریخ رقم کی، جس پر ملت اسلامیہ قیامت تک فخر کرتی رہے گی۔

اپنے قاتل کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا وصیت فرمائی، اسے بھی پڑھتے چلیے:

بنو عبد المطلب! کہیں تم میری وجہ سے مسلمانوں کے خون نہ بہا دینا، اور یہ کہتے نہ پھرنا کہ امیر المومنین قتل کیے گئے ہیں (تو ہم ان کا انتقام لے رہے ہیں۔) سوائے میرے قاتل کے کسی کو قتل نہ کرنا۔ حسن! اگر میں اس کے وار سے مر جاؤں تو قاتل کو بھی ایک ہی وار میں ختم کرنا کیونکہ

[133] ایضاً۔ 3/2-355

[134] ایضاً۔ 3/2-356

ایک وار کے بدلے میں ایک وار ہی ہونا چاہیے۔ اس کی لاش کو بگاڑنا نہیں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ تم لوگ مثلہ سے بچو خواہ وہ باؤلے کتے ہی کا کیوں نہ ہو۔[135]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ابن ملجم کو طلب کیا تو اس نے آپ کو ایک آفر کی:

"کیا آپ مجھے ایک اچھا کام کرنے دیں گے؟ وہ یہ ہے کہ میں نے اللہ سے عہد کیا تھا اور میں اسے ضرور پورا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ عہد میں نے حطیم (خانہ کعبہ) کے قریب کیا تھا کہ میں علی اور معاویہ دونوں ہی کو ضرور قتل کروں گا یا خود اس کوشش میں مارا جاؤں گا۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے چھوڑ دیں تاکہ میں معاویہ کو قتل کر دوں۔ میں آپ سے اللہ کے نام پر وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں انہیں قتل نہ کر سکا یا قتل کر کے زندہ بچ گیا تو آپ کے پاس آ کر آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں گا۔" حضرت حسن نے فرمایا: "میں اس کام کے لیے تمہیں ہرگز نہ چھوڑوں گا کہ تم آگ کو اور بھڑکاؤ۔"[136]

اس کے بعد آپ نے اسے قتل کر دیا۔ پھر لوگ اس کی لاش کو چمٹ گئے اور اس کی بوٹیاں کر کے آگ میں ڈال دیں۔ افسوس کہ اس معاملے میں وہ اتنے جذباتی تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وصیت پر عمل نہ کر سکے۔

حضرت علی کی شہادت کے وقت صحابہ کرام اور باغیوں کی حالت کیا تھی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت صحابہ کرام تین حصوں میں تقسیم تھے:

1۔ ایک مختصر گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، لیکن معاملات پر بڑی حد تک باغی چھائے ہوئے تھے۔ مخلصین میں حضرت ابن عباس، حسن، حسین، ابو ایوب انصاری، زیاد بن ابی سفیان اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔

2۔ صحابہ کرام کا بڑا گروہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا جن میں حضرت علی کے بڑے بھائی عقیل رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔

3۔ تیسرا گروہ غیر جانبدار تھا۔ یہ مسلمانوں کے خلاف کسی کاروائی میں شریک نہ ہونا چاہتے تھے اور حضرت علی کے گرد موجود باغیوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم جیسے لوگ شامل تھے۔

دوسری طرف باغیوں کی قوت اب بڑی حد تک کمزور پڑ چکی تھی کیونکہ خوارج کی صورت میں ان کا ایک حصہ الگ ہو چکا تھا اور بقیہ باغیوں کے بڑے بڑے لیڈر جنگ جمل، صفین اور جنگ مصر میں مارے جا چکے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ صحابہ کرام کے تینوں گروپوں کو اکٹھا کر کے ان باغیوں پر ایک فیصلہ کن ضرب لگائی جاتی، جس سے ان کا زور ٹوٹ جاتا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ

---

[135] ایضا

[136] ایضا

عرصہ مزید رہتے تو یہ کام کر گزرتے لیکن اللہ تعالی نے یہ سعادت آپ کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے لکھ رکھی تھی جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ پیش گوئی فرما چکے تھے: "میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالی اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کروائے۔"[137] آپ نے چھ ماہ کے اندر اندر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اتحاد کر کے اپنے نانا اور والد کے مشن کو پورا کر دیا۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

حضرت علی کی شہادت پر صحابہ کے تاثرات کیا تھے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر عالم اسلام میں کہرام مچ گیا اور سب ہی صحابہ نے نہایت دکھ کا اظہار کیا۔ یہاں ہم خاص طور پر ان صحابہ کے تاثرات پیش کر رہے ہیں، جن پر باغی راویوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت کا الزام عائد کیا ہے۔

حضرت معاویہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کی خبر خود ان پر حملہ آور ہونے والے خارجی نے دی۔ کہنے لگا: "میرے پاس ایسی خبر ہے جس کے سننے سے آپ خوش ہو جائیں گے اور اگر میں آپ سے وہ خبر بیان کروں گا تو آپ کو بہت فائدہ پہنچے گا۔" آپ نے فرمایا: "بیان کرو۔" وہ بولا: "آج میرے بھائی نے علی کو قتل کر دیا ہو گا۔" آپ نے فرمایا: "کاش! تمہارے بھائی کو ان پر قدرت نہ نصیب ہو۔"[138]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مسائل پیش ہوتے تھے، وہ ان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر ان کی رائے مانگا کرتے تھے۔ جب ان کے پاس ان کی شہادت کی اطلاع پہنچی تو فرمایا: "فقہ اور علم، ابن ابی طالب کی شہادت کے ساتھ چلا گیا۔"[139]

حضرت معاویہ کو جب حضرت علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کی خبر ملی تو رونے لگے۔ ان کی اہلیہ نے ان سے کہا: "آپ اب ان کے متعلق رو رہے ہیں جبکہ زندگی میں ان سے جنگ کر چکے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "افسوس! تمہیں علم نہیں کہ آج کتنے لوگ علم و فضل اور دین کی سمجھ سے محروم ہو گئے ہیں۔"[140]

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا: "میرے سامنے علی کے اوصاف بیان کرو۔" انہوں نے نہایت بلیغ الفاظ میں حضرت علی کی غیر معمولی تعریفیں کیں۔ حضرت معاویہ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے۔ پھر فرمایا:

---

[137] بخاری۔ کتاب الفتن۔ حدیث 6692

[138] طبری۔ 357-40H/3/2

[139] ابن عبد البر۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ 2/52

[140] ابن کثیر (1373-1302/774-701)۔ البدایہ والنہایہ۔ 11/129۔ (تحقیق: الدکتور عبد اللہ بن محسن الترکی) قاہرہ: دار ہجر۔

"اللہ ابوالحسن (علی) پر رحم فرمائے، واللہ وہ ایسے ہی تھے۔"[141]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ایک لڑکے نے دی تو آپ نے ایک شعر پڑھا: "وہ دور تھے، ان کی شہادت کی خبر ایک لڑکا لے کر آیا۔ افسوس! کہ اس کے منہ میں کسی نے مٹی نہ بھر دی۔"[142] سیدہ، حضرت علی کے علم و فضل کی قائل تھیں اور متعدد موقعوں پر آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے اسے حضرت علی کی طرف ریفر کرتے ہوئے کہا کہ اس معاملے میں علی بہتر جانتے ہیں۔[143]

حضرت علی کے دور میں فرقوں کا ارتقاء کیسے ہوا؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں کے اندر بعض فرقے پیدا ہوئے۔ مناسب رہے گا کہ یہ تفصیلات اسی دور کے جلیل القدر تابعی عالم میمون بن مہران رحمہ اللہ (40-110/660-729) کی زبانی بیان کی جائیں۔ فرماتے ہیں:

> (حضرت عثمان کی) شہادت کے بعد لوگ چار فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ پھر ان میں مزید تقسیم کے نتیجے میں ایک اور فرقہ پیدا ہوا اور اس طرح کل پانچ فرقے پیدا ہوئے: (۱) شیعان عثمان۔ (۲) شیعان علی۔ (۳) مرجئہ۔ (۴) مسلمانوں کی اجتماعیت کے ساتھ رہنے والے۔ (۵) پھر جب حکمین مقرر ہوئے تو خوارج علیحدہ ہو گئے۔ اس طرح پانچ فرقے بن گئے۔
>
> جہاں تک شیعان عثمان کا تعلق ہے یہ اہل شام اور اہل بصرہ تھے۔ اہل بصرہ نے کہا: "حضرت عثمان کے خون (کے قصاص) کا مطالبہ کرنے میں طلحہ و زبیر سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ اہل شوری تھے۔" اہل شام نے کہا: "(حضرت عثمان کے خون کے قصاص) کا مطالبہ ان کے خاندان اور رشتے داروں کا حق ہے جن میں سب سے طاقتور معاویہ ہیں۔ یہ سب لوگ حضرت علی اور ان کے شیعوں سے اعلان برأت کرتے تھے۔
>
> جہاں تک شیعان علی کا تعلق ہے تو یہ اہل کوفہ تھے۔ رہے مرجئہ تو یہ وہ لوگ تھے جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔ یہ جنگوں میں شریک رہے، پھر جب شہادت عثمان کے بعد یہ مدینہ آئے اور لوگوں سے ان کی بات چیت ہوئی تو یہ ایک بات پر متفق تھے۔ یہ کہنے لگے: "ہم نے آپ لوگوں کو چھوڑ دیا اور آپ کا معاملہ ایک ہی تھا جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ہم آپ لوگوں کے پاس آئے ہیں اور آپ اختلاف کر رہے ہیں۔" ان میں سے بعض نے کہا: "عثمان کو مظلومانہ طور پر شہید کیا گیا جبکہ وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ عادل تھے۔" بعض نے کہا: "علی حق کے زیادہ قریب ہیں اور ان کے ساتھ سب ساتھی قابل اعتماد ہیں۔ ہم ان دونوں (عثمان و علی) میں سے کسی سے اعلان برأت نہیں کرتے اور نہ ہی ان دونوں پر لعنت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں گواہی دیتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے یہاں تک کہ وہ ان

---

[141] ابن عبدالبر (d. 463/1071)۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ 2/53۔ باب علی

[142] طبری۔ 258-3/2

[143] مسلم۔ کتاب الصلوۃ۔ حدیث 276

میں فیصلہ فرما دے۔

جس گروہ نے مسلمانوں کے اجتماعیت کو پکڑے رکھا، ان میں سعد بن ابی وقاص، ابو ایوب انصاری، عبد اللہ بن عمر، اسامہ بن زید، حبیب بن مسلمہ الفہری، صہیب بن سنان، محمد بن مسلمہ اور صحابہ و تابعین میں سے دس ہزار افراد تھے۔ ان سب نے کہا: "ہم عثمان اور علی دونوں کے وارث ہیں۔ ہم ان میں سے کسی سے اعلان برأت نہیں کرتے اور یہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ دونوں اور ان کے ساتھی صاحب ایمان ہیں۔ ہم ان کے بارے میں پر امید بھی ہیں اور خوف بھی رکھتے ہیں۔"

پانچواں گروپ حروریہ (خوارج) کا تھا۔ وہ بولے: "ہم نہ تو علی کے وارث ہیں اور نہ عثمان کے کیونکہ ان دونوں نے بعد میں کفر کیا اور اس سے بری نہ ہوئے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا ساتھ دینے والے بھی کافر ہیں۔"

میمون بن مہران کہتے ہیں: یہ اختلاف کا آغاز تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ ستر سے زیادہ گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں ایسی ہر ہلاکت اور گمراہی سے بچائے۔ انہی میں سے بعض لوگ حضرت سعد بن وقاص کے پاس آئے اور انہیں بغاوت کی دعوت دی۔ انہوں نے فرمایا: "میں اس وقت تک بغاوت نہ کروں گا جب تک کہ تم لوگ مجھے ایسی تلوار نہ دے دو جس کی دو آنکھیں اور زبان ہو۔ یہ تلوار بتائے کہ فلاں کافر ہے تو میں اس سے لڑوں اور یہ کہے کہ فلاں مومن ہے تو اس سے نہ لڑوں۔"

سعد نے ان لوگوں کو ایک مثال دی اور فرمایا: "ہماری اور تمہاری مثال ایسے گروپ کی ہے جو ایک ایسے ہدف کی طرف جا رہے تھے جو سفید اور واضح تھا۔ ان میں کچھ لوگوں کو تیز ہوا نے آ لیا اور وہ راستے سے بھٹک گئے اور شک میں پڑ گئے۔ ان میں سے بعض نے کہا: راستہ دائیں جانب ہے اور اس جانب چل پڑے۔ اس طرح انہوں نے راستے کا سراغ کھو دیا اور گمراہ ہوئے۔ دوسرے گروپ نے کہا: راستہ بائیں جانب ہے۔ وہ ادھر چل پڑے اور سراغ کھو کر گمراہ ہو گئے۔ تیسرے گروپ نے کہا: جب ہوا آئی تھی تو ہم راستے ہی پر تھے۔ انہوں نے اپنے اونٹوں کو بٹھا دیا اور پڑاؤ ڈال دیا۔ جب صبح ہوئی اور آندھی ختم ہو گئی تو راستہ واضح ہو گیا۔ یہی لوگ اجتماعیت کے ساتھ رہنے والے ہیں۔"

ان لوگوں نے کہا: "ہم پر لازم ہے کہ ہم اس راستے سے وابستہ رہیں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں چھوڑا تھا یہاں تک کہ ہم آپ سے جا ملیں اور اس وقت تک ہم فتنوں میں سے کسی چیز میں داخل نہ ہوں۔" یہ وہ گروہ تھا کہ جو اسلام کا گروہ تھا۔ سعد بن ابی وقاص اور ان کے ساتھی اس میں شامل تھے اور یہ لوگ فتنہ سے علیحدہ رہے یہاں تک کہ اللہ تعالی نے تفرقے کا خاتمہ کر دیا اور باہمی محبت عام ہو گئی۔ یہ سب اجتماعیت اور حکومت کی اطاعت میں داخل ہو گئے۔ جس شخص نے ایسا کیا، اس نے نجات پائی اور جس نے ایسا کیا اور شک میں پڑا تو وہ ہلاکت میں پڑ گیا۔[144]

یہاں ہم یہ واضح کرتے چلیں کہ مین اسٹریم مخلص مسلمان ہی غالب اکثریت میں تھے۔ فرقوں میں تقسیم ہو جانے والے محض چند ہزار تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے بہت سے فرقے ختم ہو گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ گروہ دب گئے

[144] ابن عساکر۔ 39/495

تھے اور صرف وہی گروہ نمایاں رہا، جو مسلمانوں کی اجتماعیت سے وابستہ رہا۔ بعد میں فتنوں کا جب دوسرا دور شروع ہوا تو یہ گروہ پھر ابھر کر سامنے آ گئے۔ اس کا مطالعہ ہم آگے چل کر کریں گے۔

حضرت علی کی خلافت کس پہلو سے کامیاب رہی؟

بعض ایسے لوگ، جو صحابہ کرام سے بغض رکھتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ کی خلافت معاذ اللہ ناکام رہی۔ وہ آپ کے دور کا موازنہ حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ادوار سے کرتے ہیں کہ ان ادوار میں مسلمانوں کو کس قدر فتوحات نصیب ہوئیں اور قیصر و کسری کی سلطنتیں سرنگوں ہوئیں۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں خانہ جنگی رہی اور مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے۔ بیرونی فتوحات رک گئیں اور عالم اسلام انتشار کا شکار ہو گیا۔ دوسری طرف باغی حکومتی معاملات پر چھائے رہے اور انہوں نے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانا شروع کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باتیں علم عمرانیات اور تاریخ سے لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔ علم عمرانیات اور تاریخ کے ماہرین یہ بات جانتے ہیں کہ فتوحات اور بحران، سلطنتوں کی تاریخ کا ہمیشہ سے حصہ رہے ہیں۔ کبھی تو حالات مثبت رخ اختیار کرتے ہیں اور ایک سلطنت فتوحات حاصل کر کے پھیلتی چلی جاتی ہے اور کبھی سلطنتوں کو بحران پیش آتے ہیں۔ حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ادوار میں پہلی کیفیت تھی جبکہ حضرت عثمان کے آخری اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے پورے دور میں بحران کی سی کیفیت تھی۔ اس وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کا موازنہ سابقہ ادوار سے درست نہیں ہے۔ یہ بات کسی حکمران کے بس میں نہیں ہوتی کہ وہ حالات کو مثبت یا منفی بنا سکے بلکہ اس کا کمال اس میں ہوتا ہے کہ وہ مثبت یا منفی حالات میں کس طرح سے پرفارم کرتا ہے اور امکانات کو کس طرح سے استعمال کرتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فی الحقیقت مرد بحران (Man of Crisis) تھے۔ آپ نے اندرونی و بیرونی خطرات سے جس طرح امت مسلمہ کی حفاظت فرمائی، اس کی تفصیل کو دیکھا جائے تو آپ ایک کامیاب حکمران تھے۔ یہاں ہم کچھ تفصیلات بیان کر رہے ہیں:

داخلی محاذ

باغی تحریک، جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے سے پروان چڑھ رہی تھی، نے پیدا ہونا ہی تھا اور اس کی پیدائش پر کسی خلیفہ کو اختیار نہ تھا۔ اگر مثلاً حضرت علی کی جگہ حضرت عمر یا کوئی اور صحابی بھی خلیفہ ہوتے، تو باغی تحریک نے پھر بھی پیدا ہونا ہی تھا اور ان باغیوں نے وہی کرنا تھا، جو انہوں نے کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس خوبی کے ساتھ باغی تحریک کو لگام دی، یہ آپ ہی کا خاصہ تھا۔ مناسب ہو گا کہ ہم اس پلان کو دوہرا دیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے بنایا تھا۔

1۔ باغیوں کو وقتی طور پر کسی کام میں مصروف (Engage) کر دیا جائے تا کہ اہل مدینہ کی جان، مال اور آبرو ان سے محفوظ ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ان کی کچھ باتیں اگر ماننا بھی پڑیں تو اس میں مضائقہ نہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں حکومتی امور میں

شریک کر لیا تا کہ ان کی توجہ دوسری طرف نہ ہو سکے۔

2۔ باغیوں میں سے ایک طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو اپنی اصل میں مخلص تھے لیکن محض حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب جھوٹے خطوط سے متاثر ہو کر باغیوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ انہی لوگوں کی وجہ سے باغی لیڈر حضرت علی سے ایک حد تک دبتے تھے اور ان سے اپنی ہر بات نہ منوا سکتے تھے۔ حضرت علی کی کوشش تھی کہ اس طبقے کو باغیوں سے الگ کر لیا جائے۔

3۔ ایک طرف باغیوں کو مصروف کر دیا جائے اور دوسری طرف حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے خاموشی سے نکل جائیں اور دیگر علاقوں میں موجود منتشر افواج کو منظم کریں تا کہ ان باغیوں پر فیصلہ کن ضرب لگائی جا سکے۔

4۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان باغیوں کو اکٹھا کر کے مخلص مسلمانوں کی افواج کے مقابلے میں لے آئیں۔

5۔ مسلمانوں کی افواج متحد ہو کر خود کو اتحاد کی اس صورت پر لے آئیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے قائم تھا۔

6۔ اس کے بعد باغیوں کی بیخ کنی کی جائے۔ قاتلین کو قصاص میں قتل کیا جائے اور بقیہ لوگوں کو مناسب سزائیں دی جائیں۔

یہ منصوبہ کامیاب رہتا اگر باغی جنگ جمل میں دونوں جانب حملہ کر کے جنگ نہ کروا دیتے۔ جنگ جمل کے بعد مخلص مسلمانوں کی قوت کسی حد تک کمزور پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد جب باغیوں نے شام پر حملہ کیا تو اس وقت بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں کنٹرول کرنے کی آخری حد تک کوشش کی۔ آپ کا ارادہ یہ تھا کہ اہل شام سے اتحاد کر لیا جائے اور پھر باغیوں کی سرکوبی کی جائے لیکن آپ کی شہادت نے آپ کو اس کا موقع نہ دیا۔ آپ نے شہید ہونے سے کچھ پہلے اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اس مشن کی تلقین فرمائی، جسے انہوں نے آپ کے بعد پورا کیا۔

خارجی محاذ

اس بڑی اندرونی بغاوت سے ہٹ کر مسلمانوں کو ایک بیرونی خطرہ اہل ایران کی طرف سے درپیش تھا۔ جب مسلمانوں نے ایرانیوں کو شکست دی تو ان کی ہزاروں سالہ بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ عام ایرانیوں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا لیکن ان کی وہ اشرافیہ جو ملکی وسائل پر قابض چلی آ رہی تھی اور ایرانی بادشاہت سے ان کے مفاد وابستہ تھے، اسے ہضم نہ کر سکی۔ انہوں نے "قوم پرستی" کے نام پر بار بار بغاوتیں پیدا کیں۔ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اہل ایران اور خراسان نے بغاوتیں اٹھائیں جنہیں آپ نے حضرت معاویہ کے بھائی زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم کے ذریعے فرو کیا۔ زیاد ایک نہایت ہی قابل سیاستدان تھے، انہوں نے آسانی سے ایرانیوں کی ان بغاوتوں کو ختم کیا۔ اس طرح سے اس بیرونی محاذ پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کامیاب رہے۔

اخلاقی محاذ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ آپ نے خلافت راشدہ کے اسی کردار کو زندہ رکھا، جس کے باعث اسے

خلافت راشدہ کہا جا سکتا ہے۔ آپ نے حکومتی معاملات مشورے سے چلائے۔ لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی دی۔ بیت المال کا پوری دیانت داری سے استعمال کیا اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی۔ اس معاملے میں آپ کا موازنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف آپ نے امت کو اس بات کی تعلیم دی کہ باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ طبری کے متعدد اقتباسات ہم پیش کر چکے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کتنا ناپسند فرماتے تھے۔ جنگ جمل کے بعد فرمایا:

> خبردار! نہ تو کسی کی پردہ دری کرو اور نہ ہی کسی کے مکان میں داخل ہو۔ کسی خاتون کو تکلیف نہ پہنچائی جائے اگرچہ وہ تمہاری توہین بھی کرے، تمہارے امراء اور نیک لوگوں کو برا بھی کہے۔ کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے۔ ہمیں تو مشرک عورتوں پر بھی ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا تھا اور اگر کوئی شخص کسی عورت پر ہاتھ اٹھاتا یا اسے مارتا تو لوگ اس کی اولاد کو طعنہ دیتے تھے کہ تیرے باپ نے تو فلاں عورت کو مارا تھا۔ خبردار! اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم میں سے کسی نے کسی عورت کو اس لیے تکلیف پہنچائی ہے کہ اس نے تمہیں کچھ کہا تھا اور تمہاری عزت اچھالی تھی تو میں تمہیں انتہائی بدترین سزا دوں گا۔[145]

جنگ صفین کے موقع پر ارشاد فرمایا:

> آپ لوگ اس وقت تک ہرگز جنگ نہ کیجیے جب تک فریق مخالف پہل نہ کرے۔ اللہ عزوجل کو شکر ہے کہ آپ حق پر ہیں، آپ کی جانب سے جنگ کی ابتداء نہ ہونا آپ کے حق پر ہونے کی اضافی دلیل ہے۔ جب آپ ان سے جنگ کریں تو انہیں شکست دیجیے اور پشت پھیر کر نہ بھاگیے۔ کسی زخمی پر حملہ نہ کیجیے، نہ کسی کو بے لباس کیجیے، نہ کسی مقتول کے ہاتھ پاؤں یا ناک کان کاٹیے۔ اگر آپ لوگوں کے کجاووں تک پہنچ جائیں تو ان کے خیموں کے پردے چاک نہ کیجیے اور نہ بلا اجازت ان کے گھروں میں داخل ہوں۔ نہ ان کے اموال میں سے میدان جنگ کے مال غنیمت کے علاوہ کچھ لیجیے۔ خواتین کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچایئے خواہ وہ آپ کی بے عزتی کریں اور آپ کے سرداروں اور نیک لوگوں کو برا بھلا کہیں۔ کیونکہ عورتیں اعضاء اور جذبات کے اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں۔[146]

حضرت علی نے اور تو اور باغی خوارج کے زخمیوں کا علاج کروایا اور ان کا مال و دولت، سوائے اسلحہ کے ان کے خاندانوں کو واپس کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اتنے بحرانوں کی موجودگی میں اخلاقی محاذ پر کس طرح کامیابی حاصل فرمائی۔

حضرت علی کے دور میں بحران کیوں نمایاں ہوئے؟

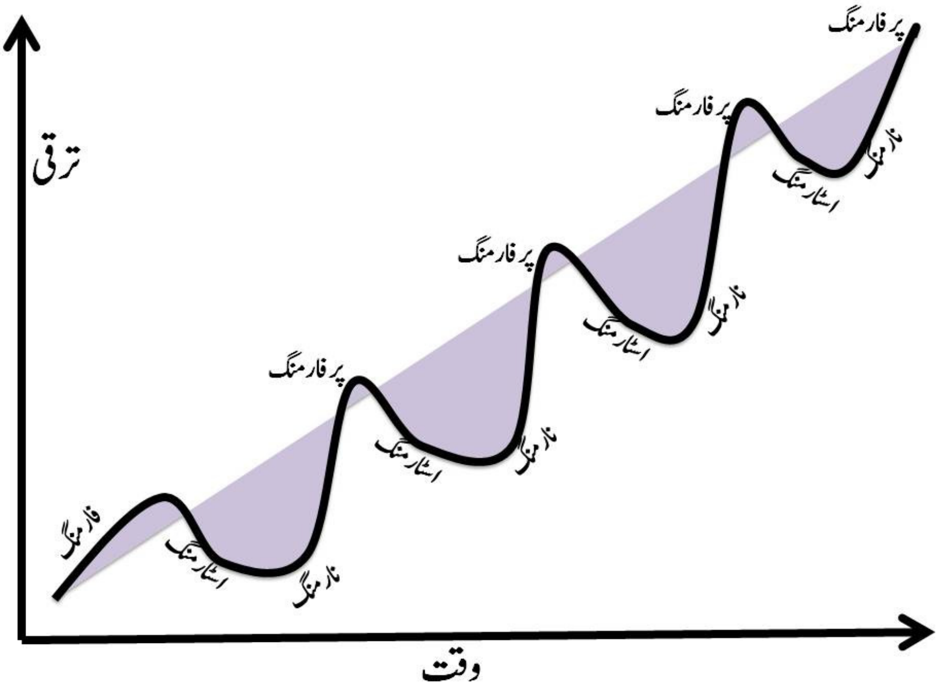
بحران کوئی انہونی چیز نہیں ہے بلکہ ایک فطری مظہر (Natural Phenomenon) ہے۔ جن لوگوں نے قوموں کے عروج و زوال کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قوموں کی تشکیل کے مختلف مراحل ہوتے ہیں۔ مینجمنٹ سائنسز کے ماہرین نے کسی بھی ٹیم کی تشکیل کے چار مرحلے بیان کیے ہیں جو کہ ڈایاگرام میں دکھائے گئے ہیں:

---

[145] طبری۔ 3/2-159

[146] ایضاً۔ 3/2-204

1. فارمنگ (Forming)
2. اسٹارمنگ (Storming)
3. نارمنگ (Norming)
4. پرفارمنگ (Performing)



قوم بھی ایک بڑی سی ٹیم ہوتی ہے، اس وجہ سے ان چاروں مراحل کا تعلق قومی تعمیر سے بھی ہے۔ تعمیر کا پہلا مرحلہ "فارمنگ" کہلاتا ہے۔ اس میں قوم یا ٹیم کی بنیادی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے بعد اسٹارمنگ کا مرحلہ آتا ہے جس میں کوئی خارجی یا داخلی بحران اس ٹیم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر قوم، اس چیلنج کے مقابلے میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی قوت کا باعث بنتا ہے۔ اس کے بعد نارمنگ کا مرحلہ آتا ہے جس میں حالات بتدریج نارمل ہونا شروع ہوتے ہیں۔ پھر پرفارمنگ کا مرحلہ آتا ہے جس میں وہ قوم یا ٹیم بہترین پرفارمنس دے کر کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتی ہے۔ یہ آخری تین مراحل بار بار پیش آتے رہتے ہیں۔ بار بار طوفان اٹھتے ہیں، خارجی اور داخلی بحران اس قوم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر یہ قوم ان سے نبرد آزما ہوتی رہے تو اس کی قوت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بحران کے بعد پھر حالات نارمل ہوتے ہیں، پھر قوم پرفارم کرتی ہے اور اس کے بعد پھر کوئی نیا بحران سر اٹھا لیتا ہے۔ اس طرح پے در پے بحرانوں سے نمٹنے کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور قوم آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو پھر یہی بحران اسے کمزور کرتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر یہ قصہ ماضی بن کر رہ جاتی ہے۔

امت مسلمہ کی تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کو ہم فارمنگ کا مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد غزوہ خندق تک آپ کی مدنی زندگی دراصل اسٹارمنگ کا مرحلہ ہے جس میں مشرکین عرب، یہود اور روم و ایران کی بیرونی قوتوں نے اس امت کے لیے بحران پیدا کیے۔ غزوہ خندق کے بعد نارمنگ کا مرحلہ آیا جس میں حالات بتدریج مسلمانوں کے حق میں ہوتے چلے گئے اور یہ عمل فتح مکہ کے موقع پر اپنے عروج کو پہنچا۔ اس کے بعد پرفارمنگ کا مرحلہ آیا جس میں صحابہ کرام نے پورے جزیرہ نما عرب کو ایک امت مسلمہ میں تبدیل کر دیا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دو سالہ دور کا پہلا سال اسٹارمنگ کا دور ہے جب عرب قبائل نے بغاوت کر دی اور روم و ایران نے بھی اس نئی قوت پر حملے کا آغاز کر دیا۔ دوسرا سال نارمنگ کا دور ہے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پورا دور پرفارمنگ کا زمانہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ابتدائی آٹھ نو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد فطری طور پر پھر اسٹارمنگ کا دور واپس آنا تھا، جو کہ حضرت عثمان ہی کے آخری زمانے میں آیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جاری رہا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مرتبہ یہ بحران خارج کی بجائے مسلم دنیا کے اندر سے اٹھا۔ یہ ایک فطری عمل تھا اور سوشل سائنسز کی رو سے ایسا ہی ہونا تھا۔ اس میں نہ تو کوئی انہونی بات ہے اور نہ ہی اس معاملے میں کسی خلیفہ راشد کا کوئی قصور ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ابتدائی دور نارمنگ اور بقیہ دور پرفارمنگ کا ہے۔ اس کے بعد یزید اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ادوار ایک بار پھر اسٹارمنگ کے دور ہیں۔ عبد الملک بن مروان کا ابتدائی دور نارمنگ اور اس کے بعد بنو امیہ کا باقی دور پرفارمنگ کا دور ہے۔ تاریخ میں یہی سائیکل بار بار دوہرایا جاتا رہا ہے اور آئندہ بھی قیامت تک یہی ہوتا رہے گا۔

خلاصہ باب

- مہاجرین و انصار نے متفقہ طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا لیا تھا لیکن بعد میں اس خلافت کو باغی تحریک نے ہائی جیک کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے جمل اور صفین کی جنگیں وقوع پذیر ہوئیں۔
- حضرت علی نے نہایت ہی حکمت و دانش سے باغی تحریک کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور انہیں لے کر بصرہ آئے۔ یہاں ان باغیوں نے رات کے اندھیرے میں جنگ چھیڑ دی۔ جنگ جمل کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فریقین کے لوگوں سے بہت اچھا سلوک کیا۔
- حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان سفارت جاری رہی جسے باغیوں نے ناکام بنا دیا۔ انہی باغیوں نے جنگ صفین چھیڑی جو حضرت علی، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کے خلوص نیت سے ختم ہوئی۔
- جنگ صفین کے بعد خوارج پیدا ہوئے، جنہوں نے حضرت علی کے خلاف بغاوت کر دی جسے آپ نے فرو کیا۔

- روم و ایران نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن مشرقی محاذ پر حضرت علی اور مغربی محاذ پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔
- جنگ صفین کے بعد واقعہ تحکیم پیش آیا جس میں فریقین نے عارضی طور پر حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کو اپنے اپنے علاقوں کا حکمران تسلیم کر لیا اور آئندہ کی صورتحال کو مہاجرین و انصار صحابہ پر چھوڑ دیا۔
- باغیوں نے مصر میں ایک زبردست بغاوت برپا کی جسے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ناکام بنا دیا۔
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی قاتلین عثمان ہی کے ایک گروہ کے ہاتھوں ہوئی۔

اگلے باب میں ان شاء اللہ ہم، حضرت حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کی خلافت سے متعلق سوالات کے جواب تلاش کریں گے۔

اسائن منٹس

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کن حالات میں ہوئی؟ آپ نے باغی تحریک کے مقابلے میں کیا حکمت عملی اختیار کی؟

۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد عالم اسلام میں کون کون سے نقطہ ہائے نظر وجود میں آئے؟

۳۔ جنگ جمل اور صفین میں حضرت علی کے کردار پر ایک نوٹ لکھیے۔ ان کی ان جنگوں کے بارے میں رائے کیا تھی؟

۴۔ باغی تحریک کا منصوبہ کیا تھا؟ اس کے جواب میں حضرت علی نے کیا رسپانس پلان تیار کیا؟ حضرت طلحہ، زبیر اور معاویہ رضی اللہ عنہم کا رسپانس پلان کیا تھا؟ ان تمام منصوبوں کا آپس میں موازنہ کیجیے۔

۵۔ جنگ صفین کے کیا اثرات باغی تحریک پر مرتب ہوئے؟

۶۔ تاریخی تحقیق کے اصولوں کے مطابق واقعہ تحکیم کی روایات میں کیا مسائل ہیں؟

۷۔ خوارج کی تحریک کی نفسیات بیان کیجیے۔ کیا آپ کے خیال میں اس نفسیات کی تحریکیں آج کے زمانے میں بھی پائی جاتی ہیں؟

۸۔ جنگ صفین کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقطہ نظر میں کیا تبدیلی واقع ہوئی؟

باب 6: عہد حسن و معاویہ

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ ہم حضرت حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے ادوار کے بارے میں یہ جان سکیں کہ:

- حضرت حسن اور معاویہ کا اتحاد کن حالات میں ہوا؟ اس کے کیا اسباب تھے اور اس کے نتائج کیا نکلے؟
- حضرت معاویہ کی کردار کشی کیوں کی گئی؟
- حضرت معاویہ پر کیا الزامات عائد کیے گئے اور ان کا جواب کیا ہے؟
- حضرت معاویہ نے قاتلین عثمان کی باغی پارٹی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟
- حضرت معاویہ نے یزید کو نامزد کیوں کیا؟
- حضرت معاویہ کے دور کا مثبت پہلو کیا ہے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ عہد حسن اور عہد معاویہ سے متعلق اہم تاریخی سوالات کے جواب دے سکیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں نے باہمی مشورے سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ حضرت علی سے ان کی شہادت سے پہلے پوچھا گیا: "کیا آپ کے بعد ہم حسن کی بیعت کر لیں؟" آپ نے فرمایا: "میں نہ تو اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ ہی اس سے منع کرتا ہوں۔"[1] حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے چھ ماہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اتحاد کر لیا اور خلافت کو ان کے سپرد کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جو وصیت ہم نے پچھلے باب میں بیان کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا حکم انہیں حضرت علی ہی نے دیا تھا۔

اس طرح سے امت مسلمہ پھر اکٹھی ہو گئی اور باغی تحریک کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ حضرت حسن کو دبا کر ان سے اپنی باتیں منوا لیں گے لیکن آپ نے اس کے بالکل برعکس معاملہ کیا۔ باغی راویوں نے اس کا انتقام حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بھی لیا اور آپ کے متعلق کچھ ایسی روایات وضع کیں جن میں آپ کی کردار کشی کی گئی۔ اس باب میں ہم انہی روایات کا جائزہ لیں گے۔

حضرت حسن اور معاویہ کا اتحاد

حضرت حسن کی خصوصی حیثیت کیا تھی؟

حضرت حسن رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین نواسے ہیں۔ جب آپ خلیفہ بنے تو آپ کی عمر محض 38 برس تھی۔ باغیوں نے بھی اس امید پر آپ کی بیعت کر لی تھی کہ آپ ناتجربہ کار ہیں، اس طرح وہ آپ سے وہ اپنی بات آسانی سے منوا لیں گے۔ دوسری جانب اہل شام بھی آپ کا احترام کرتے تھے کیونکہ آپ آخری دم تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کرتے رہے تھے اور جنگ صفین میں بھی آپ جنگ سے دور رہے تھے۔ اس وجہ سے آپ کی شخصیت اتحاد کے اس مشن کے لیے انتہائی موزوں تھی۔ آپ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک پیش گوئی فرمائی تھی جو کہ صحیح بخاری میں بیان ہوئی ہے۔

حضرت حسن نے اتحاد کیوں کیا؟

یہ بات واضح ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی حکومت کی قیمت پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اتحاد اس لیے کیا تاکہ مخلص مسلمان متحد ہوں اور منافق باغیوں کی سرکوبی کی جا سکے۔ یہ حضرت حسن کے انتہا درجے کے خلوص کی نشانی تھی کہ آپ نے اپنے ذاتی مفاد پر امت مسلمہ کے مفاد کو ترجیح دی۔ باغی راویوں کو آپ کا یہ اتحاد ہضم نہیں ہو سکا اور انہوں نے تاریخی روایتوں میں اپنے جملے داخل کر کے اس اتحاد کو معاذ اللہ آپ کے لالچ، مفاد پرستی، بزدلی اور کمزوری سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بات حقیقت سے بالکل ہی دور ہے۔ طبری ہی نے بعض ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے واقعے کی اصل صورت سامنے آ جاتی ہے۔

---

[1] طبری۔ 40H/3/2-354

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل عراق کا لشکر تیار کیا تھا جو آذر بائیجان اور اصفہان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک خاص لشکر عربوں کا تھا جس میں چالیس ہزار جنگجو تھے اور انہوں نے حضرت علی سے مرنے پر بیعت کی تھی۔ آپ نے ان پر قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کو مقرر کیا تھا اور قیس مہم میں کچھ تاخیر کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں حضرت علی شہید ہوئے اور اہل عراق نے حسن بن علی کو خلیفہ مقرر کیا۔۔۔

اہل عراق نے جب حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے خلافت کی بیعت کی تو حسن نے ان سے یہ شرط طے کی کہ آپ لوگ میری بات کو سنیں گے اور میری اطاعت کریں گے۔ **<u>میں جس سے صلح کروں، آپ اس سے صلح کریں گے</u>** اور میں جس سے جنگ کروں، اس سے جنگ کریں گے۔ اس شرط سے اہل عراق (یعنی باغی پارٹی) کے دلوں میں شک آ گیا۔ انہوں نے کہا: "یہ شخص ہمارے کام کا نہیں، اس کا تو جنگ کا ارادہ لگتا نہیں ہے۔" حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ ان پر برچھی کا وار کیا گیا جو اوچھا پڑا۔ اب ان لوگوں کے لیے حسن کے دل میں بغض بڑھ گیا اور وہ ان سے محتاط ہو گئے۔ انہوں نے معاویہ سے خط و کتابت کی اور اپنی شرائط لکھ بھیجیں کہ اگر آپ انہیں منظور کر لیں تو میں اطاعت کروں گا اور آپ پر اس وعدے کا پورا کرنا لازم ہو گا۔[2]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ذاتی نہیں بلکہ امت مسلمہ کے مفاد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اتحاد کیا تھا۔ ایک شخص جس کے ساتھ چالیس ہزار جنگجو ہوں اور وہ بھی ایسے کہ جنہوں نے موت پر بیعت کی ہو، اسے کیا خوف لاحق ہو سکتا تھا۔ واضح ہے کہ حضرت حسن باغی پارٹی سے نفرت کرتے تھے اور انہیں اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف باغی پارٹی نے بھی بھانپ لیا تھا کہ آپ ان کے کام کے آدمی نہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے آپ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا اور آپ کے خیمے کو لوٹ لیا اور جس قالین پر آپ بیٹھے تھے، اسے بھی کھینچ لیا۔

اس حملے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کوفہ سے نکلے اور مدائن کے قریب مقصورۃ البیضاء کے مقام پر جا کر ٹھہرے۔ یہاں بھی آپ پر حملہ کیا گیا۔ یہ حملہ کرنے والا مختار ثقفی تھا جس نے پچیس برس بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے انتقام کے نام پر اپنی تحریک شروع کی اور پھر نبوت کا دعوی بھی کیا۔ روایت یہ ہے:

سعد بن مسعود، جو مختار کے چچا تھے اور یہ ابھی نوجوان لڑکا تھا، (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے) مدائن کے گورنر تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے کے بعد مدائن تشریف لائے تو اس نے اپنے چچا کو تجویز پیش کی کہ آپ کو باندھ کر حضرت معاویہ کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے صلے میں امان مانگ لی جائے۔ چچا نے اسے جھڑک دیا اور کہا: "اللہ تجھ پر لعنت کرے۔ کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے پر حملہ کر کے انہیں باندھ لوں۔ کیا برے آدمی ہو تم؟" حسن رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ ان کے معاملات میں تفرقہ پڑ گیا ہے تو انہوں نے حضرت معاویہ کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ معاویہ نے عبداللہ بن عامر اور عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہم کو ان کے پاس روانہ کیا۔ دونوں شخص

[2] ایضاً۔ 41H/4/1-26

مدائن میں حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور جو مطالبہ حسن نے کیا، اسے منظور کر لیا۔[3]

صلح کے معاملے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کردار بھی غیر معمولی ہے۔ روایت کے مطابق آپ ہی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر جنگ و جدال کا یہ سلسلہ جاری رہا تو مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچے گا۔ اس وجہ سے آپ نے صلح کی تحریک شروع کی اور ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے اس پر مہر لگائی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے:

ابو موسی اسرائیل بیان کرتے ہیں کہ ان سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خود بیان کیا کہ جب حسن بن علی، معاویہ کے مقابلے کے لیے لشکر لے کر چلے تو عمرو بن عاص نے معاویہ سے کہا: "میں نے حسن کے پاس جو لشکر دیکھا ہے، وہ اس وقت تک واپس جانے والا نہیں ہے جب تک کہ مقابل کی فوج کو بھگا نہ لے۔" معاویہ نے کہا: "(اگر یہ جنگ ہو گئی اور فریقین کے بہت سے لوگ مارے گئے تو) مسلمانوں کی اولاد کی پرورش کون کرے گا؟" عمرو نے کہا: "ہم ان سے مل کر صلح کے لیے بات چیت کریں گے۔"

حسن بصری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کو کہتے سنا کہ ایک بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "میرا یہ بیٹا سردار ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالی اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کروائے گا۔[4]

اس سے حضرت حسن، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم کے امت کے لیے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی انا اور وقار کے لیے جان دینے والے تو بہت ملتے ہیں لیکن اپنے دین اور امت کی بہتری کے لیے اپنی انا کو قربان کرنے والے کم ہی ملتے ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عظیم قربانی ایسی ہے کہ مسلمانوں کو تا قیامت اس پر خوشی محسوس کرنی چاہیے اور آپ کے اسوہ حسنہ سے سبق سیکھنا چاہیے لیکن چونکہ یہ باغی تحریک کے مفاد کے خلاف تھی، اس وجہ سے انہوں نے اس قسم کی روایتیں مشہور کیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، معاذ اللہ کمزور آدمی تھے اور انہوں نے دب کر صلح کی تھی۔ اوپر صحیح بخاری کی روایت سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت حسن کس درجے میں طاقتور تھے۔

اس روایت میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جیسے انتہائی تجربہ کار سپہ سالار کی رائے نقل ہوئی ہے کہ حضرت حسن کے ساتھ بڑی فوج موجود تھی اور اس کے مورال کا عالم یہ تھا کہ وہ فتح کے بغیر پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔ فوج کے سالار قیس بن سعد رضی اللہ عنہما جیسے ماہر سیاست اور جنگجو کر رہے تھے۔ طبری کی روایت میں اس فوج کے لیے "پہاڑ جیسی افواج" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد بھی کہا جائے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دب کر صلح کی تو اسے تعصب کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

حضرت معاویہ نے اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس، قیس بن سعد اور زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم سے بھی صلح کر لی۔ آپ جنگ سے اس درجے میں بچنا چاہتے تھے کہ کسی طور پر بھی اسے پسند نہ فرماتے تھے۔ طبری کی روایت ہے:

---

[3] ایضاً۔ 4/1-24

[4] بخاری۔ کتاب الفتن۔ حدیث 6692

معاویہ نے قیس بن سعد کے پاس قاصد روانہ کیا کہ ان کو خوف خدا دلائے اور پوچھے کہ کس کے حکم سے آپ لوگ لڑنے کو تیار ہیں۔ جن کے تابع حکم تو آپ لوگ تھے، انہوں نے تو میری بیعت کر لی ہے۔ قیس نے معاویہ سے دب جانا گوارا نہ کیا۔ معاویہ نے ایک کاغذ پر مہر لگا کر انہیں بھیج دیا کہ جو آپ کا جی چاہے، اس کاغذ پر لکھ لیجیے، مجھے سب منظور ہے۔ عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: "قیس کے ساتھ رعایت نہیں کرنا چاہیے۔" معاویہ نے کہا: "ہوش کیجیے! اتنے لوگوں کو ہم اس وقت تک قتل نہیں کر سکتے جب تک کہ اہل شام میں سے بھی اتنے ہی لوگ نہ مارے جائیں اور جن کے بعد زندگی بے لطف ہے۔ واللہ! جب تک کچھ بھی چارہ کار ممکن ہے، میں قیس سے نہ لڑوں گا۔"

جب حضرت معاویہ نے وہ مہر شدہ کاغذ بھیجا تو قیس نے اپنے لیے اور حضرت علی کے گروہ کے لیے، امان طلب کی۔ یہ امان اس معاملے میں تھی جو قتل ان کے ہاتھوں ہوئے یا جو مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا (اس کا ان سے انتقام نہ لیا جائے گا۔) اس عہد نامہ میں انہوں نے حضرت معاویہ سے مال کی مطلق خواہش نہ کی اور حضرت معاویہ نے ان کی ہر شرط کو منظور کر لیا۔ ان کے سب ساتھی حضرت معاویہ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہو گئے۔

اس فتنہ کے زمانے میں پانچ افراد بڑے صائب الرائے اور اہل سیاست میں شمار ہوتے تھے۔ یہ معاویہ بن ابی سفیان، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، قیس بن سعد اور مہاجرین میں عبداللہ بن بدیل خزاعی رضی اللہ عنہم تھے۔ ان میں قیس اور ابن بدیل، علی کے ساتھ تھے اور مغیرہ و عمرو، معاویہ کے ساتھ تھے۔[5]

کیا حضرت حسین نے اتحاد کی مخالفت کی؟

باغی راویوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس اتحاد کا مخالف ثابت کیا جائے تا کہ ان کی باغیانہ سرگرمیوں کو جواز مل سکے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ حضرت حسین جیسی ہستی کے بارے میں یہ بات انتہائی بدگمانی پر مبنی ہے کہ آپ مسلمانوں میں نہایت ہی مبارک اتحاد ہوتا دیکھ کر دوبارہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں۔ حضرت حسین نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے پورے دور میں جو طرز عمل رکھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ حضرت معاویہ کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔ اس کا اندازہ الاخبار الطوال کی اس روایت سے ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ ''الاخبار الطوال''کسی نامعلوم شیعہ مصنف کی کتاب ہے اور غلط طور پر ابوحنیفہ الدینوری سے منسوب ہے:

(صلح کے بعد) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی ملاقات سب سے پہلے حجر بن عدی سے ہوئی۔ اس نے حضرت حسن کو ان کے اس فعل (صلح) پر شرم دلائی اور دعوت دی کہ وہ (حضرت معاویہ سے) دوبارہ جنگ شروع کریں اور کہا: "اے رسول اللہ کے بیٹے! کاش کہ میں یہ واقعہ دیکھنے سے پہلے مر جاتا۔ آپ نے ہمیں انصاف سے نکال کر ظلم میں مبتلا کر دیا۔ ہم جس حق پر قائم تھے، ہم نے وہ چھوڑ دیا اور جس باطل سے بھاگ رہے تھے، اس میں جا گھسے۔ ہم نے خود ذلت اختیار کر لی اور اس پستی کو قبول کر لیا جو ہمارے لائق نہ تھی۔"

---

[5] طبری۔ 4/1-27

حضرت حسن کو حجر بن عدی کی یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے فرمایا: "میں دیکھتا ہوں کہ لوگ صلح کی طرف مائل ہیں اور جنگ سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ کیوں اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ میں لوگوں پر وہ چیز مسلط کروں جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔ میں نے خاص طور پر اپنے شیعوں کی بقا کے لیے یہ صلح کی ہے۔ میری رائے کہ جنگوں کے اس معاملے کو مرتے دم تک ملتوی کر دیا جائے۔ یقیناً اللہ ہر روز نئی شان میں ہوتا ہے۔"

اب حجر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، ان کے ساتھ عبیدہ بن عمرو بھی تھے۔ یہ دونوں کہنے لگے: "ابو عبداللہ! آپ نے عزت کے بدلے ذلت خرید لی۔ زیادہ کو چھوڑ کر کم کو قبول کر لیا۔ آج ہماری بات مان لیجیے، پھر عمر بھر نہ مانیے گا۔ حسن کو ان کی صلح پر چھوڑ دیجیے اور کوفہ وغیرہ کے باشندوں میں سے اپنے شیعہ کو جمع کر لیجیے۔ یہ معاملہ میرے اور میرے ساتھیوں کے سپرد کر دیجیے۔ ہند کے بیٹے (معاویہ) کو ہمارا علم اس وقت ہو گا جب ہم تلواروں کے ذریعے اس کے خلاف جنگ کر رہے ہوں گے۔"

حضرت حسین نے جواب دیا: "ہم بیعت کر چکے اور معاہدہ کر چکے۔ اب اسے توڑنے کا کوئی راستہ نہیں۔" [6]

اسی روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی صلح چاہتے تھے۔ بعد میں بھی پورے بیس برس ان کے تعلقات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بہت اچھے رہے۔

1۔ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہو گئی تو حضرت حسین، اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت معاویہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کی بہت زیادہ تکریم کرتے، انہیں خوش آمدید کہتے اور عطیات دیتے۔ ایک ہی دن میں حضرت معاویہ نے انہیں بیس لاکھ درہم دیے۔ [7]

2۔ حضرت حسن بن علی ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا: میں آپ کو ایسا عطیہ دوں گا جو مجھ سے پہلے کسی نے نہ دیا ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت حسن کو چالیس لاکھ درہم دیے۔ ایک مرتبہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما دونوں ان کے پاس آئے تو انہیں بیس بیس لاکھ درہم دیے۔ [8]

3۔ اہل تشیع کے بڑے عالم اور نہج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید لکھتے ہیں: معاویہ دنیا میں پہلے شخص تھے جنہوں نے دس دس لاکھ درہم بطور عطیہ دیے۔ ان کا بیٹا یزید پہلا آدمی تھا جس نے ان عطیات کو دوگنا کیا۔ حضرت علی کے دونوں بیٹوں حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو ہر سال دس دس لاکھ درہم دیے جاتے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم کو بھی دیے جاتے۔ [9]

---

[6] الاخبار الطوال۔ ص 233-234

[7] ابن عساکر۔ 59/193

[8] ایضا

[9] ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغۃ۔ 11/265۔(ac 11 Aug 2012) http://www.shiaonlinelibrary.com

4۔ جب حضرت حسن کا انتقال ہوا تو حضرت حسین برابر ہر سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے پاس جاتے رہے۔ وہ انہیں عطیہ دیتے اور ان کی بھرپور عزت کرتے۔[10]

5۔ حضرت معاویہ کا حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو تحفے بھیجنا اتنی معروف بات ہے کہ ابومخنف کو بھی اس سے انکار نہیں ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: معاویہ ہر سال حسین رضی اللہ عنہما کو ہر قسم کے تحفوں کے علاوہ دس لاکھ دینار بھیجا کرتے تھے۔[11]

6۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ وہ قیصر روم کو خوفزدہ رکھنے کے لیے ہر سال دو مہمات ترکی کی جانب روانہ کرتے تھے۔ یہ سردی اور گرمی کی مہمات کہلاتی تھیں اور طبری نے ہر سال کے باب میں ان کی تفصیل بیان کی ہے۔ آپ نے ایک مہم اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں قیصر کے دار الحکومت قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی جانب روانہ کی۔ اس لشکر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔[12] بزرگ صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی اسی لشکر کا حصہ تھے اور ان کی وفات قسطنطنیہ ہی میں ہوئی جہاں ان کی قبر آج تک موجود ہے۔

اگر حضرت حسین، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کو دل و جان سے جائز حکمران تصور نہ کرتے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ ہر سال ان کے مہمان بنتے اور ان کے دیے گئے تحفوں کو قبول کرتے۔

یہاں ہم اس روایت کا جائزہ پیش کریں گے جو طبری نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے متعلق نقل کی ہے:

> قال **زياد بن عبد الله**، عن **عوانة**؛ وذكر نحو حديث المسروقي، عن **عثمان بن عبد الرحمن** هذا، وزاد فيه: حسن نے حسین اور عبداللہ بن جعفر (رضی اللہ عنہم) سے ذکر کیا کہ میں معاویہ کے ساتھ صلح کا معاہدہ لکھ چکا ہوں اور ان کی دی گئی امان کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سن کر حسین کہنے لگے: "میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ معاویہ کی بات کی تصدیق اور علی کی بات کی تکذیب نہ کیجیے۔" حسن نے جواب دیا: "خاموش رہیے، میں آپ سے بہتر اس بات کا جانتا ہوں۔"[13]

سند کو دیکھیے تو اس میں عوانہ کلبی (d. 147/765)موجود ہیں جو ہشام کلبی کے استاذ ہیں۔ دوسرے صاحب زیاد بن عبداللہ (d. 183/799)ہیں جو کہ ضعیف تھے۔ تیسرے صاحب عثمان بن عبد الرحمن الحرانی ہیں(d. 203/819) جو کہ خود تو اگرچہ سچے آدمی ہیں مگر ضعیف لوگوں سے بکثرت روایتیں قبول کر لیتے ہیں۔[14] ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا راوی نہیں ہے جو حضرت حسن و معاویہ رضی

---

[10] ابن کثیر۔ 11/477

[11] ابومخنف۔ مقتل الحسین علیہ السلام۔ قم: مطبعہ امیر۔(ac. 16 Feb 2012) www.al-mostafa.com

[12] ابن کثیر۔ 11/477

[13] طبری۔ 4/1-25

[14] ذہبی۔ سیر الاعلام النبلا۔ شخصیت نمبر 2143, 3714, 4372

اللہ عنہما کے اتحاد (41/662) کا عینی شاہد ہو بلکہ یہ سب سو سال بعد کے لوگ ہیں۔ اس وجہ سے غالب امکان یہی ہے کہ سند کے نامعلوم راویوں میں سے کوئی باغی راوی موجود ہے جس نے اپنی بغاوت کو جسٹی فائی کرنے کے لیے اپنے الفاظ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

کیا حضرت معاویہ نے معاہدے کی شرائط پوری نہ کیں؟

حضرت حسن و معاویہ رضی اللہ عنہما کے صلح کے معاہدے کو بیان کرتے ہوئے طبری نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق حضرت معاویہ نے حضرت حسن کے ساتھ معاہدے کی شرائط کو پورا نہ کیا۔ روایت کے مطابق حضرت معاویہ نے حضرت حسن کو ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے بھجوا دیا اور کہا کہ آپ جو جی چاہے، لکھ لیجیے۔ دوسری طرف حضرت حسن اپنی شرائط پہلے ہی لکھ کر انہیں بھجوا چکے تھے۔ جب انہیں سادہ کاغذ ملا، تو انہوں نے اس پر مزید شرائط لکھ کر اپنے پاس رکھ لیں اور بعد میں ان کا مطالبہ کیا لیکن حضرت معاویہ نے ان بعد میں لکھی گئی شرائط کو پورا نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوا بھی ہو تو حضرت معاویہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ انہی شرائط کو پورا کرنے کے پابند تھے جو حضرت حسن نے انہیں بھجوا دی تھیں اور جن پر فریقین کا معاہدہ ہوا تھا۔ تاہم حضرت معاویہ کے حلم، تدبر، مروت اور کشادہ دلی کو مد نظر رکھا جائے تو یہ واقعہ بھی بے سروپا نظر آتا ہے۔

یہ واقعہ جس سند سے روایت ہوا ہے، اس پر ہم پہلے بھی کئی مرتبہ تبصرہ کر چکے ہیں۔ سند یہ ہے: حدثني عبد الله بن أحمد المروزي، قال: أخبرني أبي، قال: حدثنا سليمان، قال: حدثني عبد الله، عن **يونس**، عن الزهري۔ یہ سند **ابن شہاب الزہری** (58-124/58-124) سے شروع ہوتی ہے جو اس واقعہ کے سترہ برس بعد پیدا ہوئے۔ معلوم نہیں کہ انہوں نے کس شخص سے یہ بات سنی۔ عین ممکن ہے کہ وہ نامعلوم شخص باغی تحریک کا رکن رہا ہو۔ پھر زہری سے اس روایت کو یونس بن یزید ایلی بیان کرتے ہیں جو کہ ناقابل اعتماد ہیں اور زہری سے ایسی باتیں روایت کرتے ہیں جو اور کوئی نہیں کرتا ہے۔

باغیوں نے حضرت حسن سے انتقام کیسے لیا؟

حضرت حسن نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے اتحاد کر کے چونکہ باغی تحریک کی لٹیا ہی ڈبو دی تھی، اس وجہ سے ان کے دل میں حضرت حسن کے لیے بہت بغض تھا۔ اس موقع پر انہوں نے آپ کو "یا مذل المومنین" یعنی اے مومنین کو ذلیل کرنے والے کہہ کر پکارا۔ بعد میں ان کی طرح طرح سے کردار کشی کی گئی اور انہیں معاذ اللہ راسپوٹین جیسا کردار ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کہا گیا کہ حضرت حسن نے سو سے زائد شادیاں کیں۔ کسی خاتون سے شادی کرتے اور چند دن بعد اسے طلاق دے دیتے اور پھر کسی اور سے نکاح کر لیتے۔ یہ ایسی گھناؤنی تہمت ہے جسے قرآن مجید کے حکم کے مطابق سنتے ہی مسترد کر دیا جانا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَوْلا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْراً وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُبِينٌ.

ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب انہوں نے یہ بات سنی تھی، تو مومن مرد و عورت اپنے دل میں اچھا گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو کھلی تہمت ہے۔

(النور 24:12)

افسوس کہ روایت پرستی کے سبب بعض لوگ اس تہمت پر یقین کرتے ہیں، اس وجہ سے مناسب ہو گا کہ ان روایات کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے کثیر النکاح ہونے سے متعلق جتنی بھی روایات ہیں، وہ سب انہی واقدی، ہشام کلبی اور ابن جعدبہ سے مروی ہیں۔[15] یہ روایات بھی حدیث یا تاریخ کی کسی مستند کتاب میں نہیں بلکہ ابن ابی الحدید، ابو طالب مکی وغیرہ نے نقل کی ہیں۔ عرب عالم ڈاکٹر صلابی نے نہایت تفصیل کے ساتھ ان روایات کا تجزیہ کر کے ان کا ضعف بیان کیا ہے۔ یہاں ہم یہ اسناد درج کر رہے ہیں:

- روى المدائني عن **أبن جعدبة** عن ابن أبي مليكة
- عن **محمد بن عمر (الواقدي)** أنبأنا عبد الرحمن بن أبي الموال
- عن **محمد بن عمر** حدثنا عبد الله بن جعفر، عن عبد الله بن حسن قال
- حدثني **عباس بن هشام الكلبي** عن أبيه عن جده عن أبي صالح

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ یہ روایتیں بیان کرنے والے کون لوگ ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے حضرت معاویہ کی کردار کشی کی، ویسے ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہما کی کردار کشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اگر حضرت حسن نے سو سے زائد شادیاں کی ہوتیں تو ان کی اولاد کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہونی چاہیے تھی جبکہ ایسا نہیں ہے۔ چند دن کے تعلق میں بھی حمل ٹھہر ہی جاتا ہے۔

حضرت معاویہ کی کردار کشی کے اسباب

حضرت معاویہ کی کردار کشی کیوں کی گئی؟

باغی تحریک کے تمام کارکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شدید بغض رکھتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ ان کے عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے اور باغی تحریک کی ابتدا ہی سے آپ نے ایسے اقدامات کیے جن کی بدولت یہ تحریک پنپ نہ سکی۔ اگر حضرت معاویہ اس تحریک کے خلاف بند نہ باندھتے تو عین ممکن ہے کہ بعد کی صدیوں میں مسلمان بے شمار فرقوں میں تقسیم ہو جاتے۔ حضرت عثمان، علی اور خود اپنے زمانے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے باغیوں کی بھرپور سرکوبی کی اور ان کے عزائم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باغیوں نے آپ کے خلاف جی بھر کر جھوٹی روایتوں کا طومار باندھ دیا اور آپ کو نعوذ باللہ ایک مکار سیاستدان کے روپ میں پیش کیا۔

---

[15] مزید تحقیق کے لیے دیکھیے: علی محمد محمد الصلابی۔ امیر المومنین الحسن بن علی بن ابی طالب: شخصیتہ و عصرہ۔ ص28-27۔ قاہرہ: دار التوزیع۔ www.waqfeya.com (ac. 7 Jan 2012)

طبری نے انہی باغیوں کے ساتھی ابو مخنف کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں جس میں اس نے اپنی بات کو کسی "حسن" کی طرف منسوب کیا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ حسن کون ہیں۔

معاویہ کی چار خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی ہوتی تو مہلک تھی: (1) اس امت پر جاہلوں کو مسلط کر دینا اور امت سے مشورہ کیے بغیر خلافت پر قبضہ کر لینا حالانکہ اس وقت صحابہ میں سے کچھ لوگ بھی باقی تھے اور صاحبان فضل بھی موجود تھے۔ (2) اپنے بیٹے کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کر دینا جو کہ شراب خور، سیاہ مست تھا اور ریشم پہنتا اور طنبورہ بجاتا تھا۔ (3) زیاد (بن ابی سفیان) سے رشتہ جوڑ لینا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں کہ لڑکا اسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا ہو اور بدکار کے لیے پتھر ہیں۔ (4) حجر بن عدی کو قتل کرنا۔ لعنت ہو ان پر حجر اور اصحاب حجر کی طرف سے۔ لعنت ہو ان پر حجر اور اصحاب حجر کی طرف سے۔[16]

ابو مخنف کی اس روایت کے ایک ایک لفظ میں اس کا وہ بغض ٹپک رہا ہے جو وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اور کاتب وحی کے لیے دل میں رکھتا ہے جن کی خلافت کو حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما نے دل و جان سے قبول کیا تھا۔ اب ہم اس روایت میں بیان کردہ ایک ایک الزام کو لیتے ہیں اور اس کی تحقیق کرتے ہیں۔

کیا حضرت معاویہ نے خلافت پر جبراً قبضہ کیا؟

بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت جائز اور آئینی تھی؟ وہ کہتے ہیں کہ تمام خلفاء راشدین کی خلافت مسلمانوں کے باہمی مشورے سے قائم ہوئی جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ معاملہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے ان کی خلافت کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت بالکل جائز اور آئینی خلافت تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمان تین گروہوں میں منقسم تھے:

1۔ ایک گروہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جائز حکمران تسلیم کر لیا تھا۔ یہ اہل شام تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ کو "امیر المومنین" کہنے لگے تھے۔

2۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس نے باہمی مشورے سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اس بات پر بیعت کر لی تھی کہ آپ جس سے جنگ کریں گے، وہ بھی اس سے جنگ کریں گے اور آپ جس سے صلح کریں گے، وہ بھی اس سے صلح کریں گے۔ اس معاہدے کے بعد جب حضرت حسن نے معاویہ رضی اللہ عنہما سے صلح کر لی تو اس پورے گروہ نے بھی حضرت معاویہ کی بیعت کر لی۔

3۔ تیسرا گروہ اس اختلاف میں غیر جانبدار رہا تھا۔ جب حضرت حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کا اتحاد ہوا تو یہ سب بہت خوش ہوئے اور

[16] طبری۔ 4/1-102

انہوں نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔

اس طرح سے مسلمانوں کے تینوں گروہوں کے اتفاق رائے (اجماع) سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ اس کے بعد آپ کی خلافت کے جائز اور آئینی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس زمانے کے مسلمانوں نے بھی اسے اسی حیثیت سے دیکھا اور اس سال 41/660 کو "عام الجماعۃ" کا نام دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سال تھا جس میں تمام مسلمان ایک بات پر متفق ہو گئے اور انہوں نے مل کر ایک "جماعت" کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت سے اگر کسی کو انکار تھا تو وہ یہی باغی پارٹی تھی جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا لیکن انہوں نے بھی کم از کم ظاہری طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح سے آپ کی خلافت ایسے اجماع کی شکل اختیار کر گئی جو کہ اس سے پہلے صرف حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو نصیب ہوا تھا۔

اگر بالفرض اس سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کوئی غلطی بھی سرزد ہوئی تھی لیکن جب حضرات حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ تمام صحابہ نے آپ کی خلافت پر اتفاق رائے کر لیا تو پھر اس معاملے میں آپ پر زبان طعن وہی دراز کر سکتا ہے جس کے نزدیک حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی کوئی وقعت نہ ہو۔

حضرت معاویہ اور باغی پارٹیاں

خلیفہ بننے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے دو باغی پارٹیاں موجود تھیں: خوارج اور بقیہ قاتلین عثمان۔ ان میں سے خوارج زیادہ منظم اور پر تشدد تھے۔ بقیہ باغیوں کے اہم لیڈر مارے جا چکے تھے اور ان سب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اس وجہ سے حضرت معاویہ نے سب سے پہلے خوارج کی بیخ کنی کی۔ اس جنگ کا آغاز بھی خوارج ہی کی طرف سے ہوا اور انہوں نے کوفہ پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے اہل کوفہ کو بھی ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس کے بعد ان سے جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس میں خوارج کو پے در پے شکستیں دے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عراق میں امن قائم کیا۔

باغیوں کے دوسرے گروپ کی بصرہ شاخ کا تو اسی وقت خاتمہ ہو چکا تھا جب حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے ان کی سرکوبی کی تھی۔ مصر میں ان کی پارٹی کا حضرت عمرو بن عاص اور معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہما نے خاتمہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اب یہ ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر کوفہ میں آ گئے اور اسے اپنا مرکز بنا لیا۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں خفیہ رکھیں اور اندر ہی اندر اپنی پارٹی کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے حضرات حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہے۔ اس ضمن میں ہم اخبار الطوال کی ایک روایت اوپر پیش کر چکے ہیں جس کے مطابق باغی پارٹی کے حجر بن عدی نے ان دونوں حضرات کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ان حضرات نے ان کی بات نہ مانتے ہوئے مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کو فوقیت دی۔

اب باغی پارٹی کو ان کے قائدین نے از سر نو منظم کرنا شروع کر دیا اور کم و بیش دس بارہ سال تک خفیہ کام کرتے رہے۔ اس کی تفصیلات خود ہشام کلبی اور ابو مخنف نے بیان کی ہیں اور چونکہ یہ گھر کی گواہی ہے، اس وجہ سے قابل اعتماد سمجھی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابو مخنف نے اپنے زمانے کی باغی پارٹی کے خون کو گرمانے کے لیے یہ تفصیلات بیان کی ہوں اور طبری نے انہیں نقل کر دیا ہو۔ 41/660 میں حضرت معاویہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور آپ دس برس اس عہدے پر قائم رہے تھے۔ آپ نے باغی پارٹی کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا اور ان پر زیادہ سختی نہ کی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو نرمی سے ڈیل کیا جائے تاکہ یہ کوئی بغاوت برپا نہ کریں۔ حضرت مغیرہ کا طریقہ یہ تھا کہ انہوں نے باغی پارٹی کے معروف لیڈروں کو اس بات کا پابند کر رکھا تھا کہ وہ ہر نماز مسجد میں ان کے ساتھ ادا کریں۔ اس طرح آپ ان پر نظر رکھتے تھے۔ اپنی گورنری کے آخری زمانے میں ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضرت مغیرہ نے فرمایا:

> اے اللہ! عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر رحم فرما۔ ان سے درگزر کر اور ان کی نیکیوں کی انہیں جزا دے۔ انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کیا۔ انہوں نے ہم لوگوں میں اتفاق قائم رکھا، ہم میں خونریزی نہ ہونے دی اور ناحق شہید کیے گئے۔ اے اللہ! ان کے انصار، ان کے دوستوں، ان سے محبت کرنے والوں اور ان کے خون کا قصاص لینے والوں پر رحم فرما۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عثمان کے قاتلوں کے لیے بد دعا فرمائی۔

> یہ سن کر حجر بن عدی کھڑے ہو گئے اور مغیرہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر ایک نعرہ بلند کیا کہ مسجد میں جتنے لوگ بیٹھے تھے اور جو باہر تھے، انہوں نے سنا۔ حجر نے کہا: "کس شخص کے دھوکے میں تم آ گئے ہو۔ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ بڑھاپے کے سبب اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ اے شخص! ہماری تنخواہوں اور عطیوں کو جاری کرنے کا اب حکم دو۔ تم نے ہمارا رزق بند کر رکھا ہے، اس کا تمہیں کیا اختیار ہے؟ تم سے پہلے جو حکام گزرے، انہوں نے تو کبھی اس کی طمع نہیں کی۔ تم نے امیر المومنین (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی مذمت اور مجرمین کی ستائش کا شیوہ اختیار کیا ہے۔" یہ سن کر مسجد میں دو تہائی سے زیادہ آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: "واللہ! حجر نے سچ کہا اور نیکی کی۔ ہماری تنخواہوں اور عطیات کے جاری کر دینے کا حکم دو۔"[17]

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ان سے زیادہ تعرض نہ کیا اور منبر سے اتر گئے۔ 51/670 میں ان کی وفات ہوئی تو کوفہ زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے ماتحت آ گیا۔ زیاد نے بھی کوفہ آ کر جو پہلا خطبہ دیا، اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں پر لعنت بھیجی۔ حجر بن عدی نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ اس سے پہلے حضرت مغیرہ کے ساتھ کر چکا تھا۔ زیاد نے عمرو بن حریث کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور بصرہ چلے گئے۔ بعد میں پتا چلا کہ حجر بن عدی کے پاس باغی پارٹی کا مجمع لگا رہتا ہے اور یہ لوگ اعلانیہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجتے ہیں۔ انہوں نے عمرو بن حریث پر بھی مسجد میں کنکریاں اور سنگریزے برسائے ہیں۔ زیاد اب خود کوفہ گئے

[17] طبری۔ 4/1-83

اور انہوں نے پہلے جلیل القدر صحابہ حضرت عدی بن حاتم، جریر بن عبداللہ بجلی اور خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہم کے ذریعے حجر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن حجر نے ان سے نہایت بدتمیزی کی۔

طبری ہی کی دیگر روایت کے مطابق حجر بن عدی نے باقاعدہ بغاوت کر دی اور پولیس سے مقابلہ کیا۔ ان کے اکثر ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور وہ فرار ہو کر مالک الاشتر کے بھائی عبداللہ بن حارث کے گھر جا چھپے۔ یہاں ایک لونڈی کی مخبری کی۔ حجر نے گرفتاری کے لیے شرط یہ عائد کی کہ مجھے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جائے۔ زیاد نے اس شرط کو منظور کیا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ دو باغی عمرو بن حمق اور رفاعہ بن شداد کوفہ سے فرار ہو کر شمالی عراق میں موصل کے پاس پہنچے اور ایک پہاڑی غار میں چھپ گئے۔ یہاں قریبی گاؤں کے لوگوں کو علم ہوا تو انہیں گرفتار کر کے موصل کے گورنر کے پاس پیش کیا۔ ان دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ دیگر بہت سے باغی بھی فرار ہو کر ادھر ادھر بھاگے۔ زیاد نے ان کا تعاقب کروا کر انہیں گرفتار کیا۔ انہوں نے پھر پورے واقعے کی تحقیقات کروائیں اور لوگوں کی گواہیاں اکٹھی کیں۔ ابو مخنف نے ان تمام گواہوں کے نام بھی درج کیے ہیں اور ان میں حضرت وائل بن حجر، خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ اور موسی بن طلحہ اور ابوبردہ رحمہما اللہ جیسے جلیل القدر تابعین بھی شامل ہیں۔

زیاد نے ان باغیوں کو گرفتار کر کے شام بھجوایا اور ساتھ ہی تمام تفصیلات بشمول گواہیوں کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجیں۔ اب ان کے پاس سفارشیوں نے سفارشیں کرنا شروع کر دیں اور حجر اور ان کے ساتھیوں کو معاف کر دینے کا مطالبہ کیا۔ حضرت معاویہ نے تمام تحقیقات کا جائزہ لیا اور پھر حجر کو سات ساتھیوں سمیت موت کی سزا دی اور ان کے سات ساتھیوں کو معاف کر دیا۔ اس طرح سے اس بغاوت کے سرکردہ لوگ اپنے انجام کو پہنچے اور یہ پھول بن کھلے ہی مرجھا گیا۔

باغیوں کے ساتھیوں نے اس واقعے کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کیا اور حجر بن عدی اور اس کے ساتھیوں کے قتل کو ظلم قرار دیا۔ انہوں نے مرثیے کہے اور باغیوں کی اگلی نسلوں کو بھڑکایا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آج کے دور کے کسی بھی ملک میں کوئی باغی تحریک منظم کرے اور حکومت کے خلاف تحریک چلائے اور فتنہ و فساد پھیلانے کی کوشش کرے تو حکومت کیا اسے پھولوں کے ہار پہنائے گی؟ ظاہر ہے کہ اسے سزا ہی دی جائے گی اور یہ جرم کی مناسبت سے ہو گا۔ عام طور پر حکومتیں باغیوں کے بڑے لیڈروں کو موت کی سزا دیتی ہیں اور چھوٹے موٹے ورکروں کو کم سزا دیتی ہیں یا پھر معاف کر دیتی ہیں تاکہ باغی تحریک زیادہ پھلے پھولے نہیں۔ اس وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر نہ تو شرعاً کوئی اعتراض کیا جا سکتا ہے اور نہ عقلاً۔

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ طبری کی روایت کے مطابق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس قتل پر تنقید کی اور فرمایا: "اے معاویہ! آپ کو حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا خوف نہ ہوا؟" یہ روایت ابو مخنف کی ہے اور انہوں نے حسب عادت اپنے الفاظ سیدہ کی طرف منسوب کیے ہیں۔[18] ظاہر ہے کہ سیدہ کو حکومت کی بجائے ان باغیوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی جن میں سے بعض حضرت

[18] ایضاً۔ 4/1-101

عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بلاواسطہ یا بالواسطہ شریک تھے اور انہی باغیوں کے خلاف سیدہ خود بھی جنگ جمل میں اقدام کر چکی تھیں۔

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ سیدہ نے عبدالرحمن بن حارث کو پیغام دے کر حضرت معاویہ کے پاس بھیجا تھا لیکن جب وہ پہنچے تو حجر اور اس کے ساتھی قتل ہو چکے تھے۔ عبدالرحمن نے کہا: "ابوسفیان کا سا حلم جو آپ میں تھا، وہ آپ نے کب چھوڑ دیا۔" حضرت معاویہ نے جواب دیا: "جب سے آپ جیسے اہل حلم نے مجھے چھوڑ دیا۔" ممکن ہے کہ یہ بات درست ہو۔ شاید سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال رہا ہو کہ حجر بن عدی کو سزا دینا سیاسی حکمت کے خلاف ہے کہ اس کے قتل سے بغاوت اور بھڑک اٹھے گی چنانچہ انہوں نے حضرت معاویہ کو حلم اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ ابن عبد البر نے سیدہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: "حجر اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں آپ میں ابوسفیان والا حلم کہاں چلا گیا؟ آپ نے ایسا کیوں نہ کیا کہ انہیں قید خانوں میں بند رکھتے اور طاعون کا شکار ہونے دیتے۔"[19] ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ سیدہ یہ چاہتی تھیں کہ حجر کے قتل کا الزام حضرت معاویہ پر نہ آئے تاکہ ان کے خلاف بغاوت نہ بھڑکے۔ یہ ایک سیاسی مشورہ ہو سکتا ہے، لیکن شرعی اعتبار سے حجر کا قتل ایک بالکل درست معاملہ تھا۔ جس شخص نے بغاوتی تحریک منظم کی ہو اور فتنہ وفساد پھیلایا ہو، اسے قانون کے مطابق سزا دینے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے؟

بعض باغیوں نے حجر بن عدی کے مرتبے کو بڑھانے کے لیے انہیں مرتبہ صحابیت پر فائز کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ ابن حجر عسقلانی (773-852/1371-1448) نے صحابہ کرام سے متعلق اپنے مشہور انسائیکلوپیڈیا "الاصابہ من تمییز الصحابہ" میں حجر کو صحابہ میں شمار نہیں کیا۔ ابن الاثیر الجزری (555-630/1160-1233) نے اپنی کتاب "اسد الغابہ" میں ایسا کیا ہے لیکن انہوں نے اس بات کی کوئی سند پیش نہیں کی کہ حجر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں یا نہیں۔

بیت المال میں کرپشن کی تہمت

یہ ایک ایسی تہمت ہے جو باغی راویوں نے چند روایتیں گھڑ کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر عائد کی ہے۔ تاریخ کی کتب میں ایسی روایات کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جن میں ایسی کوئی بات ہے جس کی بنیاد پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت عائد کی گئی ہے اور جب ہم ان روایتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان سب کی سند میں کوئی نہ کوئی ایسا راوی نکلتا ہے جس کا تعلق اسی باغی تحریک سے ہو۔ حضرت معاویہ کے زمانے میں بہت سے جلیل القدر صحابہ ابھی زندہ تھے۔ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما بھی آپ کے دور میں موجود تھے۔ اگر حضرت معاویہ، نعوذ باللہ کوئی بد عنوانی کرتے تو یہ حضرات ان کا ہاتھ پکڑتے یا انہیں کم از کم تنبیہ تو کرتے۔ لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ اب ہم ان تمام روایات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔

---

[19] ابن عبد البر۔ 1/198۔ باب حجر بن عدی۔

تاریخ طبری میں اس ضمن میں صرف ایک واقعہ ہمیں مل سکا ہے، جو ہم یہاں بیان کر رہے ہیں:

(جنگ اشل جو شمال مغربی ایران کے علاقے میں ہوئی تھی، کے بعد) حکم اپنی راہ سے الگ ہو کر ہرات (موجودہ افغانستان) کی طرف چلے آئے تھے۔ پھر یہاں سے مرو (موجودہ ایران) کی طرف پلٹ گئے۔ زیاد (بن ابی سفیان گورنر ایران) کو مال غنیمت کی خبر پہنچی تو حکم کو لکھا: "امیر المومنین نے مجھے لکھ بھیجا ہے کہ سونا چاندی اور تمام نادر اشیاء ان کے لیے نکال لی جائیں۔ جب تک یہ چیزیں نکالی نہ جائیں، ہر گز ہر گز مال غنیمت میں تصرف نہ کرنا۔" حکم نے اس کے جواب میں لکھا: "آپ کا خط ملا، آپ نے کہا ہے کہ امیر المومنین نے آپ کو لکھ بھیجا ہے کہ سونا چاندی اور تمام نادر اشیاء ان کے لیے نکال لی جائیں۔ جب تک یہ چیزیں نکالی نہ جائیں، ہر گز ہر گز مال غنیمت میں تصرف نہ کرنا۔ اللہ عزوجل کا حکم امیر المومنین کے حکم سے پہلے آ چکا ہے۔ واللہ! خدا سے ڈرنے والے کے لیے زمین و آسمان کی راہیں بند بھی ہو جائیں، جب بھی حق سبحانہ وتعالی اس کے لیے کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔" پھر لوگوں سے کہا کہ اپنا اپنا مال غنیمت لے لو۔ سب لوگ آئے۔ حکم نے 1/5 حصہ الگ کر کے تمام مال غنیمت لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ اس پر زیاد نے ان کو لکھا: "اگر میں زندہ رہا تو تمہارے ٹکڑے اڑا دوں گا۔" حکم نے دعا کی: "یارب! تیرے پاس آنے میں میرے لیے بہتری ہو تو مجھے بلا لے۔" اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔[20]

اس واقعے کو بیان کر کے بعض لوگ یہ تاثر دیتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مال غنیمت میں سے سونا چاندی اور نوادرات اپنے لیے الگ کر والیتے تھے حالانکہ یہ تاثر سرے سے غلط ہے۔ اس سلسلے میں چند نکات قابل غور ہیں:

1۔ واقعے کی سند طبری میں یہ بیان ہوئی ہے: حدثني عمر، قال: حدثني حاتم بن قبيصة، قال: حدثنا غالب ابن سليمان، عن عبد الرحمن بن صبح۔ تینوں راوی حاتم بن قبیصہ، غالب بن سلیمان اور عبد الرحمن بن صبح کے حالات نامعلوم ہیں۔ ان کے بارے میں فن رجال کے انسائیکلوپیڈیاز میں کوئی معلومات موجود نہیں ہیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ یہ کون لوگ تھے، کس درجے میں قابل اعتماد تھے اور کیا ان کا کوئی تعلق باغی تحریک سے تھا؟

2۔ کتب تواریخ میں یہ ایک ہی واقعہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا ہے جس میں ایسا حکم دیا گیا ہو۔

3۔ ابن کثیر نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس سونا چاندی وغیرہ کو حضرت معاویہ کی ذات کے لیے نہیں بلکہ بیت المال کے لیے الگ کرنے کا حکم تھا تاکہ اسے عام لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے۔[21] اس کی وجہ یہ تھی کہ جبل اشل کی جس قوم کے ساتھ جہاد کیا گیا تھا، ان کے ہاں سونا اتنی کثرت سے موجود تھا کہ ان کے برتن بھی سونے کے تھے۔ شرعی قاعدہ ہے کہ جنگ کے دوران دشمن سے جو مال غنیمت حاصل ہو، اس کا 1/5 بیت المال میں جمع کر دیا جائے اور 4/5 فوج میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اندازہ ہو گا کہ یہ سونا چاندی مل کر 1/5 کے برابر ہو گا۔ عین ممکن ہے کہ اس موقع پر بیت المال میں سونے چاندی کی کمی واقع ہو گئی ہو، جس کی

---

[20] طبری۔ 4/1-82

[21] ابن کثیر۔ 11/169

وجہ سے یہ حکم دیا گیا ہو۔

4۔ طبری کی روایت کے مطابق یہ حکم حضرت معاویہ نے نہیں بلکہ ایران کے گورنر زیاد بن ابی سفیان نے دیا تھا۔ روایت میں ان کے خط کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راوی نے اپنے الفاظ میں بات کی ہے اور بات کو بالکل مجمل انداز میں بیان کرتے ہوئے کوئی اضافی تفصیلات فراہم نہیں کی ہیں۔

اس تجزیے کے بعد صرف وہی شخص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدگمانی کر سکتا ہے جسے ایسا کرنے کی عادت ہو۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے نزدیک بدگمانی ایک جائز فعل ہو، وہ تو معمولی سے نکتے سے رائی کا پہاڑ کھڑا کر دے گا لیکن جس شخص کے دل میں ذرا سا بھی خوف خدا ہو، وہ محض اس ایک روایت کی بنیاد پر بدگمانی کو جگہ نہ دے گا۔ اس کے برعکس طبری ہی میں ہمیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وہ نصیحت ملتی ہے جو آپ اپنے گورنروں کو فرماتے تھے۔ اس سے آپ کی پالیسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

عبید اللہ کی بات سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے والی خراسان مقرر کیا اور پھر یہ فرمایا: "آپ کے لیے بھی میرے وہی احکام ہیں جو دوسرے عہدے داروں کے لیے ہیں۔ اس کے علاوہ قرابت کے لحاظ سے آپ کو میں وصیت کرتا ہوں کہ آپ کا میرے ساتھ خاص رشتہ ہے۔

- کم کے لیے زیادہ کو ہرگز نہ چھوڑیے۔
- اپنے نفس کا محاسبہ اپنے ہی نفس سے کیجیے۔
- آپ کے اور آپ کے دشمن کے درمیان جو معاملہ ہو، اس میں وعدے کی پابندی کیجیے کیونکہ اس سے آپ پر اور آپ کے ذریعے ہم پر بوجھ کم پڑے گا۔
- لوگوں کے لیے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیے کہ آپ کو ان کے حالات معلوم ہوتے رہیں گے۔ وہ اور آپ برابر ہیں۔
- جب کسی مہم کا قصد کیجیے تو لوگوں پر اسے ظاہر کر دیجیے لیکن کسی مفاد پرست کا اس میں دخل نہ ہونے پائے۔ جب اس مہم کو انجام دینا آپ کے لیے ممکن ہو تو ہرگز کوئی (مفاد پرست) آپ کی بات کو مسترد نہ کر پائے۔
- جنگ میں اگر دشمن زمین کے اوپر آپ پر غالب بھی ہو جائیں تو یہ سمجھ رکھیے کہ زمین کے اندر وہ آپ پر غالب نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کے رفقاء پر ایسا وقت پڑے جائے کہ اپنی جان سے آپ کو ان کی مدد کرنا پڑے تو ایسا ہی کیجیے۔ کند تلوار بھی اگر کاٹ نہ سکتی ہو، تو اسے قبضے سے الگ نہ کیجیے (یعنی ہر صورت مقابلہ جاری رکھیے۔)
- اللہ سے ڈرتے رہیے اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کو نہ سمجھیے کہ خوف خدا میں بے شک ثواب ہے۔
- اپنی آبرو کو داغ سے بچائے رکھیے اور کسی سے جب وعدہ کریں تو اسے پورا کیجیے۔
- اپنے کسی ارادے کو پختگی سے پہلے ظاہر نہ کیجیے لیکن جب ظاہر ہو جائے تو پھر کسی کو اس کی مخالفت نہ کرنے دیجیے۔
- جب دشمن سے لڑائی چھڑ جائے تو جتنی فوج آپ کے پاس ہے، اس سے زیادہ کا انتظام کیجیے (یعنی ریزرو افواج رکھیے۔)

- **مال غنیمت کی تقسیم قرآن کے مطابق کیجیے** اور کسی کو ایسی چیز کا لالچ نہ دیجیے جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ اور نہ ہی کسی کو اس کے حق سے مایوس کیجیے۔[22]

روایت کے الفاظ سے واضح ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پالیسی، اپنے سے پہلے خلفاء راشدین سے مختلف نہ تھی۔ اسی کی روشنی میں دیگر روایات کو دیکھنا چاہیے اور جس روایت میں باغی راویوں نے آپ کے خلاف بغض کا اظہار کیا ہو، اسے مسترد کر دینا چاہیے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تہمت لگاتے ہوئے ایک اور روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ حضرت معاویہ بے تحاشا مال صرف کر کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں، آپ بھی ایسا ہی کیجیے۔ انہوں نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ایسے ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں۔ اس روایت کا جھوٹ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے نہج البلاغہ میں یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں:

> کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ معاویہ تو تند مزاج جفاکاروں کو دعوت دیتے ہیں اور وہ **بغیر کسی بخشش اور عطیہ کے ان کی پیروی** کرتے ہیں۔ میں تمہیں **تمہارے مقرر کردہ عطیات کے علاوہ مزید رقم بھی دیتا ہوں**، پھر بھی تم مجھ سے الگ ہوئے جاتے ہو۔[23]

طبری میں ہے:

> حضرت علی جب اہل بصرہ کی بیعت سے فارغ ہوئے تو انہوں نے بیت المال کا جائزہ لیا۔ اس میں ساٹھ لاکھ درہم سے زائد رقم موجود تھی جو انہوں نے ان لوگوں میں تقسیم کر دی جو آپ کے ساتھ جنگ میں شریک تھے۔ ہر شخص کے حصے میں پانچ پانچ سو کی رقم آئی۔ پھر ان سے فرمایا: "اللہ تعالیٰ شام میں آپ لوگوں کو فتح یاب کرے تو اتنی ہی رقم عطیات کے علاوہ تمہیں ملے گی۔"[24]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کے خلاف لوگوں کے جذبات اس قدر شدید تھے کہ وہ بغیر کسی معاوضے کے لالچ کے، حضرت معاویہ کے پاس آ کر ان کی فوج میں دھڑا دھڑ شامل ہو رہے تھے۔ دوسری جانب باغی تحریک کے لوگوں کا مقصد چونکہ محض مال و دولت اکٹھا کرنا تھا، اس وجہ سے وہ حضرت علی سے عطیات تو وصول کرتے تھے مگر آپ کے ساتھ شریک نہ ہوتے تھے۔ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ہی نے بیت المال میں خیانت نہیں فرمائی۔ ان دونوں حضرات نے جس کسی کو جو بھی عطیات دیے، وہ عین اسی اصول کے مطابق تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے جاری تھا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کے نظام معیشت کا مقصد ہی دولت کی تقسیم تھا تاکہ ہر ہر شخص کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ تمام خلفاء راشدین کا یہ دستور تھا کہ وہ بیت المال کی رقم کو زیادہ سے زیادہ تقسیم کرتے تھے تاکہ ہر ہر شخص تک مال پہنچ سکے۔ قبائلی سرداروں کے

---

[22] طبری۔ 41-/112

[23] سید شریف رضی۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ 180۔

[24] طبری۔ 3/2-160

بارے میں جو تواریخ میں ذکر ملتا ہے کہ انہیں اتنے لاکھ یا اتنے ہزار درہم ملے تو یہ رقم ان کی ذات کے لیے نہیں بلکہ اپنے قبیلے کے لوگوں میں تقسیم کے لیے دی جاتی تھی۔ اس کے لیے وہ باقاعدہ رجسٹروں میں اندراج کرتے تھے اور حکومت کی جانب سے اس کا آڈٹ کیا جاتا تھا۔ حضرت عثمان، علی اور معاویہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے زمانوں میں اسی دستور کو جاری رکھا۔ ریگولر آرمی اور سول سروس کے ساتھ ساتھ ریزرو افواج موجود رہتیں اور انہی کے لیے قبائلی سرداروں اور خاندانوں کے سربراہوں کو لاکھوں کی مقدار میں عطیات دیے جاتے۔

حضرت علی پر سب و شتم

سب و شتم کا مطلب ہے برا بھلا کہنا۔ عربی میں ان الفاظ کا مفہوم وسیع ہے اور اس میں تنقید بھی شامل ہے۔ یہ تنقید سخت الفاظ میں بھی ممکن ہے اور نرم الفاظ میں بھی۔ اس میں گالی دینے کا مفہوم بھی شامل ہے اور نرم انداز میں ناقدانہ تبصرے کا بھی۔

باغی راویوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت عائد کی ہے کہ ان کے زمانے میں وہ اور ان کے مقرر کردہ گورنر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جمعہ کے خطبہ کے دوران معاذ اللہ گالیاں دیا کرتے تھے۔ اس تہمت کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بنو امیہ کے خلاف نفرت پیدا کر کے اپنی پارٹی کے نوجوانوں کو مشتعل کیا جائے۔ اس تہمت کا جھوٹ صرف اتنی سی بات سے واضح ہو سکتا ہے کہ اگر آج کے دور میں کوئی خطیب کسی بھی صحابی کے بارے میں یہ حرکت کرے تو کیا سننے والے اسے چھوڑ دیں گے؟ ہمارے ہاں تو اس مسئلے پر بار ہا کشت و خون کی نوبت آ جاتی ہے۔ اس دور میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنی اولاد موجود تھی اور ان کے زمانے میں یہ حرکت کی گئی تو کیا یہ حضرات معاذ اللہ ایسے غیرت مند تھے کہ انہوں نے اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اس وقت ان کی غیرت کہاں چلی گئی تھی؟

کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ آزادی اظہار کے اس دور میں اگر کوئی حکمران یہ رسم جاری کرے کہ جمعہ کے خطبوں میں منبر پر کھڑے ہو کر اپوزیشن کے فوت شدہ راہنماؤں کو گالیاں دی جائیں؟ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کا رد عمل کیا ہو گا؟ کیا اس طرح وہ حکمران بغیر کسی مقصد کے اپنے خلاف مزاحمتی تحریک پیدا نہ کرے گا؟ ہم کسی بھی ایسے حکمران کے بارے میں یہ تصور نہیں کر سکتے جس میں عقل کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے غیر معمولی تدبر، حلم اور سیاست کو ان کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کیا ان سے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ جنگ کی جس آگ کو انہوں نے اپنے حلم اور تدبر سے ٹھنڈا کیا تھا، وہ اسے ایک لایعنی اور فضول حرکت سے دوبارہ بھڑکا دیں۔ پھر یہ حرکت پورے عالم اسلام کی مساجد میں عین جمعہ کے خطبے میں انجام دی جائے اور اس کے رد عمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی کی غیرت جوش نہ مارے اور کوئی مزاحمتی تحریک تو کجا یا کم از کم تنقید ہی ان حضرات کی جانب سے سامنے نہ آئے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب و شتم محض باغی راویوں کے ذہنوں میں تھا، جسے انہوں نے اپنے زمانے کے باغیوں کو بھڑکانے کے لیے روایات کی شکل میں بیان کیا۔

ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے۔ عربی میں لفظ "سبّ" کا مطلب صرف گالی دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص، دوسرے کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس پر تنقید کرے اور اپنے دلائل پیش کرے، تو اسے بھی 'سبّ' کہہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح کا 'سبّ' ہمارے ہاں بہت سے لوگ ایک دوسرے کے لیے کرتے ہیں اور کوئی برا نہیں مانتا۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کے دوران لوگوں کو ایک تالاب کا پانی پینے سے منع فرمایا۔ دو افراد نے اس حکم کی نافرمانی کی تو آپ نے ان پر 'سبّ' فرمایا۔[25] ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی شخص یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ آپ نے انہیں معاذ اللہ گالیاں دی ہوں گی۔ اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ آپ نے ان پر تنقید فرمائی ہو گی اور انہیں اپنی اصلاح کا کہا ہو گا۔

ممکن ہے کہ کسی شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پالیسی پر تنقید کی ہو، تو ان راویوں نے اس پر یہ بہتان گھڑ لیا کہ وہ معاذ اللہ حضرت علی کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا ہم حضرت حسن، حسین اور حضرت علی کے دیگر بیٹوں سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ خاموشی سے سنتے رہتے۔ یہاں ہم وہ روایات بیان کر رہے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان راویوں نے بات کا بتنگڑ بنا کر اسے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کے دو گورنر ہیں، جن کے بارے میں یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف منبر پر سب وشتم کرتے تھے۔ ایک مروان بن حکم اور دوسرے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔ ان دونوں سے متعلق روایات کا ہم جائزہ لیتے ہیں۔

کیا مروان بن حکم نے سب وشتم کیا؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر مروان بن حکم نے اپنے خطبے میں "ابوتراب" کہہ کر کیا تو اسے ان باغیوں نے "سب وشتم" قرار دے دیا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے:

عبداللہ بن مسلمہ نے ہم سے روایت بیان کی، ان سے عبدالعزیز بن ابی حازم نے اور ان سے ان کے والد نے کہ: ایک شخص حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور بولا: " امیر مدینہ (مروان بن حکم کے خاندان کا کوئی شخص) منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سبّ کر رہے ہیں۔" انہوں نے پوچھا: "وہ کیا کہتے ہیں؟" بولا: "وہ انہیں ابو تراب کہہ رہے ہیں۔" سہل یہ سن کر ہنس پڑے اور بولے: "واللہ! یہ نام تو انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اور انہیں اس نام سے زیادہ کوئی اور نام پسند نہ تھا۔" میں (ابوحازم) نے ان سے پوچھا: "ابو عباس، یہ کیا معاملہ ہے؟" وہ بولے: علی، فاطمہ کے گھر میں داخل ہوئے، پھر باہر نکلے اور مسجد میں سو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (سیدہ فاطمہ) سے پوچھا: "آپ کے چچازاد کہاں گئے؟" وہ بولیں: "مسجد میں۔" آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ ان (حضرت علی) کی چادر ان کی پیٹھ سے الگ ہوئی ہے اور مٹی سے ان کی کمر بھری ہوئی ہے۔ آپ نے ان کی کمر سے مٹی جھاڑ کر دو مرتبہ فرمایا: "ابوتراب (مٹی والے!) اب اٹھ

[25] مسلم، کتاب الفضائل، حدیث 706

بھی جاؤ۔"[26]

صحیح مسلم میں اس روایت کا ایک مختلف ورژن بیان ہوا ہے:

قتیبہ بن سعید، عبد العزیز بن ابی حازم سے، وہ اپنے والد سے اور وہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ مروان کے خاندان کا ایک آدمی مدینہ منورہ میں کسی سرکاری عہدے پر مقرر کیا گیا۔ اس نے حضرت سہل بن سعد کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا کہیں۔ حضرت سہل نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس عہدے دار نے حضرت سہل سے کہا: "اگر آپ انکار کر رہے ہیں تو یہی کہہ دیجیے کہ ابوتراب پر اللہ کی لعنت ہو۔" حضرت سہل فرمانے لگے: "علی کو تو ابوتراب سے زیادہ کوئی نام محبوب نہ تھا۔ جب انہیں اس نام سے پکارا جاتا تو وہ خوش ہوتے تھے۔" وہ عہدے دار حضرت سہل سے کہنے لگا: "یہ بتائیے کہ ان کا نام ابوتراب کیوں رکھا گیا۔"[27]۔۔۔(اس کے بعد حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے وہی بات سنائی جو اوپر بیان ہوئی ہے۔)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مروان کے خاندان کا ایک شخص، جس کا نام معلوم نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا۔ روایت میں نہ تو اس کا نام مذکور ہے اور نہ ہی اس کا عہدہ۔ یہ وہ واضح ہے کہ وہ گورنر نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنے بغض کا اظہار برسر منبر نہیں بلکہ نجی محفل میں کیا۔ اس دور میں چونکہ ناصبی فرقے کا ارتقاء ہو رہا تھا، اس وجہ سے ایسے لوگوں کی موجودگی کا امکان موجود ہے۔ تاہم یہ نہ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقرر کردہ گورنر تھا اور نہ ہی کوئی اور اہم عہدے دار۔ کسی چھوٹے موٹے عہدے پر فائز رہا ہو گا اور اس کے زعم میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کروانے چلا تھا لیکن حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے اسے منہ توڑ جواب دے کر خاموش کر دیا۔ مروان بن حکم سے متعلق طبری کی یہ روایت بھی قابل غور ہے:

علی بن حسین رضی اللہ عنہما نے مروان کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ جس زمانے میں بنو امیہ مدینہ سے نکالے گئے تھے، انہوں نے مروان کے مال و متاع کو اور ان کی بیوی ام ابان بنت عثمان رضی اللہ عنہ کو لٹنے سے بچا لیا تھا اور اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ پھر جب ام ابان طائف کی طرف روانہ ہوئیں تو علی بن حسین نے ان کی حفاظت کے لیے اپنے بیٹے عبداللہ کو ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ مروان نے اس احسان کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔[28]

اس روایت میں 63/683 میں ہونے والی اہل مدینہ کی بغاوت کا ذکر ہے۔ جب اہل مدینہ نے یزید کے خلاف بغاوت کی تو انہوں نے مدینہ میں مقیم بنو امیہ پر حملے کیے۔ اس موقع پر حضرت علی بن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہما سامنے آئے اور انہوں نے مروان اور ان کی اہلیہ کو گھر میں پناہ دی۔ اگر مروان بن حکم، برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیتے، تو کیا انہی حضرت علی کے پوتے زین العابدین انہیں اپنے گھر میں پناہ دیتے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دو بیٹیوں کی شادیاں مروان کے دو بیٹوں معاویہ اور عبد الملک سے

---

[26] بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 3500
[27] مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 2409
[28] طبری۔ 4/1-263

ہوئیں۔ اس کے علاوہ آپ کی متعدد پوتیوں کی شادیاں مروان کے گھرانے میں ہوئی۔[29] اگر مروان بن حکم نے ایسی حرکت کی ہوتی تو پھر کم از کم یہ رشتے داریاں ہمیں نظر نہ آتیں۔

کیا حضرت مغیرہ بن شعبہ نے سب و شتم کیا؟

غالی راوی ابو مخنف نے تاریخ طبری میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں دعوی کیا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں سب و شتم کرتے تھے لیکن ساتھ خود ہی ان کے الفاظ نقل کر کے اپنا بھانڈہ خود ہی پھوڑ دیا ہے روایت یہ ہے:

> ابو مخنف نے صقعب بن زہیر سے روایت کی اور انہوں نے شعبی کو کہتے ہوئے سنا: مغیرہ کے بعد ایسا کوئی حاکم ہمارا نہیں ہوا، اگرچہ ان حکام کی نسبت جو پہلے گزرے تھے، یہ نیک شخص تھے۔ مغیرہ نے سات برس چند ماہ معاویہ کے گورنر کے طور پر کوفہ میں حکومت کی ہے اور بڑے نیک سیرت، امن و عافیت کے خواہش مند تھے۔ مگر علی کو برا کہنا اور ان کی مذمت کرنا، قاتلان عثمان پر لعنت اور ان کی عیب جوئی کرنا، اور عثمان کے لیے دعائے رحمت و مغفرت اور ان کے ساتھیوں کی تعریف کو انہوں نے کبھی ترک نہیں کیا۔

اس کی چند سطروں بعد ابو مخنف ہی نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کا وہ خطبہ بیان کر دیا ہے، جس کے بارے میں اس کا دعوی ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے پر مشتمل تھا۔ خطبے کے الفاظ خود ابو مخنف کے الفاظ میں ہم یہاں درج کر رہے ہیں، اسے دیکھ کر عربی جاننے والے تمام حضرات خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیا سب و شتم کیا گیا ہے:

> كان في آخر إمارته قام المغيرة فقال في علي وعثمان كما كان يقول، وكانت مقالته: اللهم ارحم عثمان بن عفان وتجاوز عنه، وأجزه بأحسن عمله، فإنه عمل بكتابك، واتبع سنة نبيك صلى الله عليه وسلم، وجمع كلمتنا، وحقن دماءنا، وقتل مظلوما؛ اللهم فارحم أنصاره وأولياءه ومحبيه والطالبين بدمه! ويدعو على قتلته. فقام حجر بن عدي فنعر نعرة بالمغيرة سمعها كل من كان في المسجد وخارجا منه.

> مغیرہ نے اپنی امارت کے آخری زمانے میں خطبہ پڑھا اور علی و عثمان کے بارے میں وہ جو بات ہمیشہ کہتے تھے، وہ اس انداز میں کہی: "اے اللہ! عثمان بن عفان پر رحمت فرمائیے۔ ان سے در گزر فرمائیے اور نیک اعمال کی انہیں جزا دیجیے۔ انہوں نے آپ کی کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی کی سنت کا اتباع کیا۔ انہوں نے ہم لوگوں میں اتفاق رکھا اور خونریزی نہ ہونے دی اور وہ ناحق شہید کیے گئے۔ اے اللہ! ان کے مددگاروں، دوستوں، محبوں اور ان کے خون کا قصاص لینے والوں پر رحم فرمائیے۔" اس کے بعد **<u>آپ نے قاتلین عثمان کے لیے بددعا کی</u>**۔ یہ سن کر حجر بن عدی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مغیرہ کی جانب دیکھ کر ایک نعرہ لگایا۔ جو لوگ بھی مسجد میں اور اس کے باہر تھے، انہوں نے اس نعرے کو سنا۔[30]

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو ان باغی راویوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم قرار دیا ہے، وہ دراصل قاتلین

---

[29] ابن حزم، جمہرۃ الانساب العرب۔ 87 ,38۔

[30] طبری۔ 4/1-83

عثمان کے لیے بد دعا تھی۔ ان باغیوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ کھینچ تان کر حضرت علی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی شہادت میں ملوث کر دیا جائے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے پر ہونے والی لعنت و ملامت کا رخ معاذ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف پھیرنے کی کوشش کی ہے اور یہ مشہور کر دیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان کے گورنر معاذ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کیا کرتے تھے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تاریخی کتب میں جہاں جہاں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کا ذکر ہے، وہ سب کی سب ابو مخنف یا ان کی پارٹی کے لوگوں کی روایت کردہ ہیں۔ ایسی ہر روایت کی سند کو دیکھ کر اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان کے گورنر، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منبروں پر برا بھلا کہتے تو یہ ایسی بات تھی کہ جسے ہزاروں آدمی سنتے۔ ان ہزاروں میں سے کم از کم پچاس سو آدمی تو اسے آگے بیان کرتے۔ پھر ان پچاس سو افراد سے سن کر آگے بیان کرنے والے بھی سینکڑوں ہوتے جو کہ سو سال بعد ہزاروں ہو جاتے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سوائے اس ایک ابو مخنف اور ان کی پارٹی کے چند لوگوں کے، کوئی بھی شخص یہ روایات بیان نہیں کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب انہی لوگوں کی گھڑی ہوئی داستان ہے۔

ہاں یہ بات قرین قیاس ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان کے گورنر خطبات میں قاتلین عثمان کی باغی پارٹی کے مکر و فریب اور برائی کو بیان کرتے ہوں گے تاکہ لوگ ان سے محتاط رہیں اور ان کے پراپیگنڈا کا شکار نہ ہوں۔ اس گروہ کی مذمت میں وہ سخت باتیں بھی کہتے ہوں گے، انہیں لعنت ملامت بھی کرتے ہوں گے اور ان کے لیے بد دعا بھی کرتے ہوں گے۔ اس سب کا مقصد یہی رہا ہو گا کہ باغی پارٹی کے پراپیگنڈا کا توڑ کیا جائے۔ ابو مخنف کی اوپر بیان کردہ روایت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے خود پر کی گئی تنقید کا ملبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ڈال دیا تاکہ خلفاء اور ان کے گورنروں سے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جائیں اور ان کے خلاف مزید باغی تحریکیں منظم کی جائیں۔

صحیح مسلم کی روایت کا مفہوم کیا ہے؟

باغیوں کے پراپیگنڈا سے متاثر بعض لوگ اس ضمن میں صحیح مسلم کی یہ روایت پیش کرتے ہیں:

> حضرت معاویہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو امیر بنایا تو ان سے پوچھا: "آپ کو کس چیز نے منع کیا کہ آپ ابو تراب پر تنقید نہ کریں؟" انہوں نے کہا: "تین ایسی باتیں ہیں کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھیں، ان کے سبب میں انہیں برا نہیں کہتا۔ میرے نزدیک ان میں سے ایک بات بھی سرخ اونٹوں سے زیادہ پیاری ہے۔
>
> 1۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت فرماتے سنا جب آپ نے کسی غزوے پر جاتے ہوئے علی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ علی نے کہا: 'یا رسول اللہ! کیا آپ مجھے بچوں اور خواتین کے پاس چھوڑے جا رہے ہیں؟' آپ نے فرمایا: 'کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ آپ کی مجھ سے وہی

نسبت ہو جو ہارون کی موسی سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد نبوت ختم ہو گئی؟'

2۔ میں نے یوم خیبر، آپ کو یہ فرماتے سنا: 'کل میں ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس شخص سے محبت کرتے ہیں۔' ہم لوگ یہ سن کر انتظار میں رہے (کہ وہ کون ہو گا۔) پھر آپ نے فرمایا: 'علی کو بلاؤ۔' انہیں بلایا گیا تو ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ آپ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں پر لگایا اور جھنڈا انہیں عطا فرما دیا۔ اللہ تعالی نے علی کے ہاتھوں فتح عطا فرمائی۔

3۔ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: "(اے پیغمبر!) آپ فرمائیے کہ آؤ، ہم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو بلا لائیں اور تم اپنوں کو۔۔۔" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلایا اور فرمایا: "اے اللہ! یہ میرے اہل و عیال ہیں۔"[31]

اس روایت سے باغیوں کے پراپیگنڈا سے متاثر بعض لوگ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ حضرت معاویہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہما کو ترغیب دلا رہے تھے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تنقید کریں۔ یہ مطلب وہی نکال سکتا ہے جو ان حضرات کے کردار سے واقف نہ ہو۔ روایت کے ایک ایک لفظ سے حضرت سعد کی حضرت علی رضی اللہ عنہما کے لیے محبت ٹپک رہی ہے۔ اگر حضرت معاویہ کا مقصد انہیں ترغیب دلانا ہوتا تو وہ انہیں کوئی سخت جواب دیتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ کا مقصد حضرت علی پر تنقید کی ترغیب نہ تھا بلکہ آپ یہ استفسار فرما رہے تھے کہ جب حضرت سعد نے جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علی کا ساتھ نہیں دیا، تو پھر آپ کی حضرت علی کی پالیسی کے بارے میں رائے کیا تھی، کیا آپ اس پر تنقید کرتے ہیں؟ اس پر انہوں نے وضاحت کی کہ میری رائے ان کے بارے میں بہت اچھی تھی تاہم ساتھ نہ دینے کی وجوہات کچھ اور تھیں۔

ابو مخنف نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ لعنت بھیجنے کے اس سلسلے کا آغاز معاذ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے ہوا تھا۔ واقعہ تحکیم کی اطلاع جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے نمازوں میں حضرت معاویہ، عمرو بن عاص، ابو الاعور اسلمی، حبیب بن مسلمہ، عبد الرحمن بن خالد، ضحاک بن قیس اور ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہم پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔ جب حضرت معاویہ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے نمازوں میں حضرت علی، ابن عباس، اشتر، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم پر لعنت بھیجنا شروع کر دی۔[32]

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ابو مخنف کا جھوٹ ہے اور اس نے ایسا کر کے ان تمام حضرات کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے بارے میں اپنے بغض کا اظہار کیا ہے۔ نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بدگمانی کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے حالت نماز میں لعنت بھیجنے کے عمل کا آغاز فرمایا ہو گا اور نہ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جوابی کاروائی کے طور پر ایسا کیا ہو گا۔ یہ سب ابو مخنف جیسے باغی راویوں کی اپنی ایجاد ہے اور اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ رہا ہو گا کہ ان بزرگوں سے

[31] مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 2404

[32] طبری۔ 3/2-267

اپنی نسل کے لوگوں کو بد ظن کر کے اپنی باغی تحریک کو تقویت دی جائے۔

استلحاق زیاد

استلحاق کا مطلب ہے کسی کو اپنے خاندان میں شامل کرنا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو اپنا بھائی قرار دے دیا تھا اور یہ عمل شریعت کے منافی ہے۔ انہوں نے نے محض سیاسی اغراض کے لیے یہ خلاف شریعت کام کیا۔ یہ اعتراض بقیہ اعتراضات کی نسبت بہت ہی ہلکا ہے لیکن چونکہ باغی راویوں اور ان سے متاثر ہونے والے لوگوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بغض ہے، اس وجہ سے انہوں نے اس بات کو بھی نمک مرچ لگا کر پیش کیا اور اسے ایک اسکینڈل کی شکل دے دی۔ پہلے ہم صورتحال کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے اور پھر یہ دیکھیں گے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی غرض کیا تھی اور ان پر باغیوں نے کیا اعتراضات کیے۔

زیاد بن ابی سفیان کا مسئلہ کیا تھا؟

دور جاہلیت میں نکاح کی متعدد اقسام رائج تھیں جن میں سے ایک متعہ بھی تھا۔ بعض لوگ جب سفر وغیرہ پر جاتے تو متعہ بھی کر لیتے جو کہ عارضی نکاح کی ایک شکل تھی۔ چونکہ یہ دور جاہلیت میں ایک "جائز نکاح" تصور کیا جاتا تھا، اس وجہ سے اس سے ہونے والی اولاد بھی جائز ہی سمجھی جاتی۔ چونکہ اس وقت تک اسلام کی روشنی نہ پھیلی تھی، اس وجہ سے اس دور کے لوگوں کو قصور وار بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ حضرت معاویہ کے والد ابو سفیان رضی اللہ عنہما دور جاہلیت ہی میں طائف گئے تو وہاں ایک کی لونڈی سمیہ سے ایسا ہی ایک میعادی نکاح کر لیا، جس سے زیاد کی ولادت ہوئی۔ اپنی کسی ذاتی وجہ سے ابو سفیان نے کھلے عام اس کا اقرار نہ کیا مگر نجی طور پر بعض لوگوں کو بتا دیا کہ سمیہ سے میں نے عارضی شادی کی تھی اور زیاد میرا ہی بیٹا ہے۔

اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریش مکہ کی کشمکش چل رہی تھی، جس میں ابو سفیان کفار مکہ کے لیڈر تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ تمام حضرات اسلام لے آئے اور نہایت ہی مخلص مسلمان ثابت ہوئے۔ زیاد کی والدہ سمیہ بھی ایمان لے آئیں اور ان کے اخیافی (ماں کی طرف سے) بھائی ابو بکرہ (رضی اللہ عنہم) ایک مشہور صحابی ہیں۔ زیاد کی پیدائش کے بارے میں چار اقوال موجود ہیں جن کے مطابق زیاد کی پیدائش ہجرت سے پہلے، ہجرت کے سال، غزوہ بدر کے دن اور فتح مکہ کے دن کی روایات موجود ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ زیاد کی پیدائش ہجرت نبوی اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے میں ہوئی ہو گی۔ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں یہ بات نہ کھلی کہ زیاد، ابو سفیان ہی کے بیٹے ہیں۔ تاہم ابو سفیان نے ذاتی طور پر بعض لوگوں کو یہ بات بتا دی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں زیاد ایک نہایت ہی ٹیلنٹڈ نوجوان کے طور پر سامنے آئے۔ خلافت راشدہ کا طریقہ یہ تھا کہ جو لوگ سول سروس میں آتے، انہیں پہلے کسی چھوٹے علاقے کی حکومت دی جاتی اور پھر پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے انہیں پروموشن

دے کر بڑے علاقوں کا گورنر بنایا جاتا۔ زیاد کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضر موت کا گورنر بنایا جو کہ یمن کا مشہور شہر ہے۔ انہوں نے جلد ہی بہت ترقی کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بصرہ جیسے اہم شہر کے نائب گورنر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ تھے اور ان کے خلاف بعض لوگوں نے حضرت عمر کو شکایت کی کہ انہوں نے تمام معاملات حکومت زیاد ہی کے سپرد کر دیے ہیں۔ حضرت عمر نے ابو موسی رضی اللہ عنہما سے اس معاملے میں وضاحت طلب کی تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے ان کے اندر شرافت اور عقل مندی دیکھی ہے، اس لیے میں نے اپنے کام ان کے سپرد کیے ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیاد کو بلوایا تو دیکھا کہ وہ سفید لباس پہنے ہیں۔ آپ نے اس کی قیمت دریافت کی تو انہوں نے جو قیمت بتائی، وہ بہت ہی غیر معمولی تھی۔ حضرت عمر نے پوچھا: "آپ کی تنخواہ کیا ہے؟" انہوں نے کہا: "دو ہزار۔" پوچھا: "آپ کو پہلے جو وظیفہ (بونس) دیا گیا تھا، اسے آپ نے کہاں خرچ کیا تھا؟" وہ بولے: "میں نے پہلے وظیفہ پر اپنی والدہ کو خرید کر آزاد کیا اور جب دوسرا وظیفہ ملا تو اپنے پرورش یافتہ لڑکے عبید کو خرید کر آزاد کیا۔" فرمایا: "آپ نے بہت اچھا کام کیا۔" اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیاد سے فرائض، سنن اور قرآن مجید کے احکام دریافت کیے تو ان کا دینی علم بھی ایک فقیہ کے درجے کا تھا۔ چنانچہ آپ، زیاد سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں بصرہ واپس بھجوایا اور وہاں کے عہدے داروں کو ہدایت دی کہ وہ زیاد کی رائے پر عمل کیا کریں۔[33]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی زیاد متعدد عہدوں پر فائز رہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی صلاحیتوں کو محسوس کرتے ہوئے انہیں اس وقت ایران کا گورنر مقرر کیا جب اہل ایران بغاوت کر چکے تھے اور زیاد نے اسے کامیابی سے فرو کر لیا تھا۔[34] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت زیاد ایران کے گورنر تھے۔ اس زمانے میں جو چار لوگ سیاسی معاملات کے زبردست ماہر سمجھے جاتے تھے، ان میں سے ایک زیاد بھی تھے۔

زیاد بن ابی سفیان کو بدنام کیوں کیا گیا؟

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیاد بن ابی سفیان، جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، کو اس قدر بدنام کیوں گیا ہے۔ دراصل استلحاق کے ایک سال بعد جو واقعات پیش آئے، انہوں نے باغیوں کو اس بات پر ابھارا کہ وہ زیاد اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں زبان طعن دراز کریں۔ ہوا یوں کہ سن 45/662 میں حضرت معاویہ نے زیاد کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا اور خراسان اور سیستان (موجودہ ایران اور افغانستان)، بلوچستان اور بحرین کے علاقے بھی ان کے ماتحت کر دیے۔ اس طرح زیاد، اب افغانستان سے عراق تک کے گورنر بن گئے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اس علاقے میں باغی تحریک پھر اپنے قدم جما رہی تھی اور ان باغیوں کے خاندان اور قبیلے والے محض اپنی رشتے داری کے سبب ان کی سرگرمیوں پر پردہ ڈال رہے تھے اور انہیں پناہ دیے ہوئے

---

[33] ایضاً۔ 3/1-208

[34] ایضاً۔ 3/2-326

تھے۔

طبری کا بیان ہے کہ جب زیاد بصرہ پہنچے تو وہاں اعلانیہ فسق و فجور پھیلا ہوا تھا۔ واضح رہے کہ ایسا نہیں ہو گا کہ بصرہ کا ہر شخص ہی فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا ہو گا بلکہ جب کسی جگہ معمول سے کچھ زیادہ لوگ برائی میں مبتلا ہو جائیں تو محاورتاً یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہاں فسق و فجور پھیل گیا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی ملک میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہوں اور وہاں اچانک ایک ہفتے میں چار پانچ وارداتیں ہو جائیں تو محاورتاً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ملک تو جرائم کا گڑھ بن گیا ہے۔ زیاد نے وہاں پہنچ کر جو خطبہ دیا، اس سے اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس خطبے کی بلاغت کی بہت سے لوگوں نے تعریف کی ہے، ہم کوشش کرتے ہیں کہ اس بلاغت کو اردو میں منتقل کریں:

اللہ کے فضل اور احسان کا شکر ہے اور ہم اس سے مزید رحمت کے طلب گار ہیں۔ اے اللہ! جس طرح تو نے نعمتیں ہمیں عطا فرمائی ہیں، اسی طرح ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بھی ہمیں توفیق دے۔

سنیے! سخت جہالت، اندھا دھند گمراہی اور بدکاری، جہنم کی آگ کو بھڑکاتی ہے۔ ان کاموں میں آپ کے بعض نالائق لوگ مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے عقل مندوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ بڑے بھی ان کاموں سے اجتناب نہیں کرتے اور بچے وہی باتیں سیکھتے جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ لوگوں نے اللہ کی آیات کو نہیں سنا اور اللہ کی کتاب کو نہیں پڑھا اور اطاعت گزاروں کے لیے ثواب اور گناہ گاروں کے لیے عذاب سے آپ لوگ ناواقف محسوس ہوتے ہیں۔ دنیا کے لالچ نے ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دی ہے۔ ہوس و خواہش نے ان کے کانوں میں آواز دی ہے اور جنہوں نے باقی رہنے والی (آخرت) کو چھوڑ کر فنا ہونے والی (دنیا) کو پسند کر لیا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آپ نے اسلام میں وہ بدعت پیدا کر دی ہے جو پہلے کسی نے نہ کی۔ خرابی کے راستے کھلے رہنے دیے، کثیر تعداد میں کمزور اور لاچار لوگوں کو دن دہاڑے لٹنے دیا۔ باغیوں کو دن کی لوٹ مار اور رات کی سرگرمیوں سے آپ لوگوں نے نہ روکا۔ دین سے دوری اختیار کر کے آپ لوگوں نے محض رشتے داری کا خیال کیا۔ بغیر کسی عذر کے آپ لوگ معذور بنتے ہیں اور ان چور اچکوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

آپ لوگوں میں ہر شخص کسی نہ کسی نااہل کی سرپرستی کرتا ہے جیسے کسی کو نہ عذاب کا ڈر ہو نہ قیامت کا اندیشہ۔ اگر آپ ان نالائقوں کے نقش قدم پر چلیں گے تو پھر خود کہاں کے لائق رہیں گے۔ آپ نے انہیں اس طرح پناہ دیے رکھی کہ انہوں نے اسلام کو کمزور کیا اور پھر آپ کے پاس آ کر گوشہ رسوائی میں آ کر چھپ رہے۔ جب تک میں ان (باغیوں) کی جائے پناہ کو ڈھا نہ لوں اور جلا کر خاک نہ کر دوں، مجھ پر (اچھا) کھانا پینا حرام ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس معاملے کا انجام وہی ہو گا جیسا اس کا آغاز ہوا تھا(یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے آغاز ہوا تو انجام اب ان باغیوں کے قتل پر ہو گا۔) ہم نرمی کریں گے لیکن ایسی جس میں کمزوری نہ ہو۔ ہم سختی کریں گے مگر ایسی کہ اس میں ظلم نہ ہو۔ واللہ! اب میں غلام کے کرتوتوں کی پوچھ گچھ اس کے آقا، مسافر کے اعمال کی پوچھ گچھ (اسے پناہ دینے والے) میزبان سے، آگے بڑھ کر کاروائی کرنے والے کا مواخذہ پیچھے رہ کر اسے سپورٹ کرنے والے سے اور صحت مند کا مواخذہ بیماری کا بہانہ بنا کر خاموش حمایت کرنے والے سے لوں گا۔ آپ میں سے کوئی شخص دوست سے ملے گا تو یہ مثل اس کی زبان پر ہو گی: "سعد! ٹھیک ہو جاؤ، سعید مارا گیا ہے۔" یا پھر یہ ہو گا کہ آپ کی برچھیاں میرے

لیے سیدھی ہو جائیں گی (یعنی آپ میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔)

منبر پر جھوٹ بولنا دائمی رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔ آپ پر میرا کوئی جھوٹ ثابت ہو جائے تو میری نافرمانی آپ کے لیے جائز ہے۔ آپ میں سے کسی کے گھر ڈاکہ پڑے پڑے تو اس کے نقصان کا ذمہ دار میں ہوں۔ دیکھیے! رات کو خفیہ سرگرمیوں کی شکایت میرے پاس نہ آنے پائے۔ جو رات کی سرگرمیوں کے جرم میں گرفتار ہو کر میرے پاس آئے گا، اسے میں قتل کر دوں گا۔ آپ لوگوں کو اتنی مہلت دیتا ہوں کہ جتنے عرصے میں کوفہ تک خبر پہنچ کر واپس آسکتی ہے۔ دیکھیے! مجھ تک کسی کی جاہلیت کی آواز نہ پہنچے (یعنی قبیلہ اور خاندان کی بنیاد پر مجرموں کی پشت پناہی نہ کی جائے۔) جس کے بارے میں میں نے ایسی بات سنی تو اس کی زبان ہی کاٹ دوں گا۔ آپ لوگوں نے نئے نئے حیلے ایجاد کیے ہیں تو ہم نے بھی ایسے ہر گناہ کے لیے سزا ایجاد کی ہے۔ اگر کسی نے دوسرے کو ڈبو کر ہلاک کیا تو میں بھی اسے ڈبو کر ہلاک کروں گا۔ کوئی آگ لگائے گا تو میں اسے جلا دوں گا۔ کوئی کسی کے گھر میں نقب لگائے گا تو میں اس کے سینے میں سوراخ کروں گا۔ کوئی کسی کے لیے قبر کھودے گا تو میں اسی کو اس میں زندہ دفن کروا دوں گا۔ اگر آپ اپنے ہاتھ اور اپنی زبان کو مجھ پر دراز نہ کریں تو میں بھی اپنا ہاتھ آپ کو تکلیف دینے سے باز رکھوں گا۔ خلاف قانون حرکت اگر کسی سے سرزد ہوئی تو میں اس کی گردن پر ضرب لگاؤں گا۔ میرے اور کچھ لوگوں کے درمیان پہلے دشمنی چلی آرہی ہے۔ اب میں ان باتوں کو پس پشت اور پاؤں تلے ڈال دیا (یعنی نظر انداز کر کے معاف کر دیا ہے۔) آپ میں سے جو نیک لوگ ہیں، انہیں چاہیے کہ نیکی میں اضافہ کریں اور جو برے ہیں، وہ اپنی برائی سے باز رہیں۔ اگر مجھے یہ علم ہو کہ محض میری ذاتی دشمنی میں کسی سے قتل بھی ہو گیا ہے تو میں اس کا بھی پردہ فاش نہ کروں گا جب تک کہ وہ اعلانیہ سرکشی کا رویہ اختیار نہ کرے۔ پھر اس صورت میں میں اسے دم نہ لینے دوں گا۔

اب آپ لوگ اپنے اپنے کام کیجیے، اپنے خیالات درست رکھیے۔ کتنے ہی لوگ میرے آنے سے افسردہ ہوئے ہوں گے، وہ خوش ہو جائیں گے۔ اور کتنے ہی لوگ میرے آنے سے خوش ہوئے ہوں گے، وہ اب افسردہ ہوں گے۔ اے لوگو! ہم لوگ آپ ہی کے حکمران ہیں۔ اللہ نے جو حکومت ہمیں عطا کی ہے، اس میں ہم آپ کی حمایت کرنے والے ہیں۔ آپ کے ذمے ہمارا حق یہ ہے کہ آپ ہماری اطاعت کریں اور آپ کا حق ہمارے ذمے یہ ہے کہ ہم عدل و انصاف کو فروغ دیں۔ ہماری خیر خواہی کیجیے، آپ خود کو ہمارے عدل اور مال کا حق دار بنا لیں گے۔ یہ بات یاد رکھیے کہ مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہو بھی تو تین معاملے ایسے ہیں جن میں میں ہرگز کوتاہی نہ کروں گا:

1۔ اگر کوئی ضرورت مند آدھی رات کو بھی میرے پاس آئے گا تو میں اس سے ملنے سے انکار نہ کروں گا۔

2۔ کسی کی تنخواہ یا بونس کو عین وقت پر ادا ہونے سے نہیں روکوں گا۔

3۔ آپ کے خلاف فوج کشی نہ کروں گا۔

آپ کو چاہیے کہ اپنے حکمرانوں کی اصلاح کے لیے اللہ سے دعا کریں۔ یہ سب آپ کے اپنے حکمران ہیں۔ یہ آپ کو مہذب بنانے والے ہیں اور آپ کی جائے پناہ ہیں۔ انہی کے سہارا (باغیوں اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف) آپ کو حاصل ہے۔ سنیے، آپ اچھے ہوں گے تو یہ حکمران بھی اچھے ہوں گے۔ ان کی طرف سے دل میں بغض نہ رکھیے ورنہ آپ ہمیشہ غم و غصہ ہی میں جلتے بھنتے رہیں گے۔ ایسی ضروریات کے درپے نہ ہو جایئے جو اگر پوری کی جائے تو خود آپ کو نقصان پہنچے۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہر ایک کی مدد، ہر ایک (باغی) کے مقابلے میں کرے۔

جب آپ دیکھیں کہ میں آپ لوگوں میں کوئی نیا حکم جاری کرنا چاہتا ہوں، تو اسے آسانی سے جاری ہونے دیجیے۔ واللہ! آپ میں سے بہت سے (باغی) لوگ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ میرے ہاتھوں مقتول ہونے سے بچے۔[35]

زیاد رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ٹیلنٹڈ لوگوں کو اپنے ٹیم کا حصہ بنایا۔ حضرت عمران بن حصین کو بصرہ کا چیف جسٹس مقرر کیا، حضرت حکم بن عمرو غفاری کو خراسان کا گورنر بنایا اور سمرہ بن جندب، انس بن مالک اور عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہم کو مختلف عہدے دیے۔ انہوں نے عبداللہ بن حصن کو محکمہ پولیس کا سربراہ بنایا اور شاہراہوں کی نگرانی سخت کر دی۔ انہوں نے باغیوں پر بہت سختی کی اور رات کو خفیہ سرگرمیوں میں شریک ہونے والوں کو قتل کرنا شروع کیا۔

اس موقع پر باغی راویوں نے بڑا واویلا بنایا ہے کہ انہوں نے بعض بے گناہوں کو بھی مار دیا اور محض الزام لگنے پر بغیر تحقیق کے سزا دی لیکن یہ سب ان کی اپنی من گھڑت روایات ہیں۔ کسی بے گناہ کا قتل اسلام میں جائز نہیں ہے بلکہ یہ باغی اور چور ڈاکو ہی تھے جنہیں قتل کیا گیا۔ طبری کی روایت کے مطابق اب عراق میں امن وامان کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کسی کی کوئی چیز راستے میں گر جاتی تو کوئی نہ اٹھاتا۔ پھر جب اس شخص کو یاد آتا تو وہ واپس آ کر اسے اٹھا لیتا۔ خواتین اپنے گھروں کے دروازے کھلے رکھ کر سو جاتیں اور انہیں کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ مال و دولت کی تقسیم کے لیے زیاد نے جو ویئر ہاؤس تعمیر کروایا، وہ اتنا بڑا تھا کہ اسے "مدینۃ الرزق" یعنی رزق کے شہر کا نام دیا گیا۔ اس کے ذریعے دولت کو عام آدمی میں تقسیم کیا گیا اور لوگ خوشحال ہونے لگے۔ انٹیلی جنس کا ایسا نظام زیاد نے قائم کیا کہ افغانستان میں کسی کی رسی بھی چوری ہو جاتی تو زیاد کو بصرہ میں اس کی خبر معلوم ہو جاتی۔ اس سے زیاد کی اہلیت اور دیانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تمام اقدامات کا بھرپور فائدہ ایک عام آدمی کو پہنچا لیکن باغی تحریک کی لٹیا ڈوب گئی۔ انہیں اب کوئی راستہ نہ مل رہا تھا کہ وہ کسی طرح اپنی کاروائیاں جاری رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ باغی راویوں نے زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے خاص بغض کا اظہار کیا اور ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں روایتوں میں داخل کر دیں۔

عالم اسلام کے مشرقی حصے میں ان گورنروں کے غیر معمولی اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ پندرہ بیس برس تک عراق میں امن قائم رہا اور باغی تحریک کو یہاں پنپنے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم انہوں نے گھروں کے اندر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور بغاوت کے جراثیم کو اگلی نسلوں تک منتقل کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پورے زمانے میں وہ اٹھ نہ سکے لیکن آپ کی وفات کے فوراً بعد انہوں نے اپنی شورش کا آغاز کر دیا، جس کی تفصیل کا مطالعہ ہم آگے کریں گے۔

[35] ایضاً۔ 4/1-66

استلحاق زیاد کیسے ہوا؟

جب حضرت حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اتحاد ہوا تو زیاد نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور آپ کی اجازت سے کوفہ میں آکر مقیم ہو گئے۔ اس بات کو تین سال گزر گئے اور سن 44/664 میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو زیاد کے والد کی تحقیق کروانا پڑی۔ طبری نے واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

اسی سال حضرت معاویہ نے زیاد بن سمیہ کو اپنے والد ابو سفیان کے نسب میں شریک کیا۔ زیاد جب حضرت معاویہ کے پاس حاضر ہوئے تو ایک شخص بنو عبد قیس کا بھی ان کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے زیاد سے کہا: "ابن عامر میرے محسنوں میں سے ہے، آپ اجازت دیں تو ان سے مل لوں۔" (ابن عامر اور زیاد میں کچھ رنجش تھی۔) زیاد نے کہا: "اس شرط پر آپ مل لیجیے کہ آپ کے اور ان کے درمیان جو باتیں ہوں، وہ مجھے ضرور بتائیے گا۔" اس نے کہا: "بہت اچھا۔" اب یہ ابن عامر سے ملا تو ابن عامر نے کہا: "ابن سمیہ (زیاد) میرے معاملات میں اعتراض کرتا ہے اور میرے مقرر کردہ عہدے داروں پر تنقید کرتا ہے، میں نے ارادہ کیا ہے کہ قریش میں سے کچھ افراد سے حلف اٹھواؤں گا کہ ابو سفیان نے تو کبھی سمیہ کی صورت بھی نہیں دیکھی۔" جب وہ شخص واپس آیا تو زیاد نے تفصیل پوچھی۔ پہلے تو اس نے بتانے سے انکار کیا لیکن جب زیاد نے کسی طرح نہ چھوڑا تو اس نے تفصیل بتادی۔ (ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس بات سے زیاد کو کس قدر تکلیف پہنچی ہو گی۔) زیاد سے یہ ساری تفصیل جاکر حضرت معاویہ کو سنادی (اور انہیں بھی اس بات کا شدید صدمہ ہوا۔)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے گارڈ کو حکم دیا کہ اگر ابن عامر ان کے پاس آئیں تو وہ پھاٹک کو (محاورتاً) ان کے منہ پر مار کر واپس بھیج دے۔ گارڈ نے ایسا ہی کیا تو ابن عامر نے یزید (حضرت معاویہ کا بیٹا) کے پاس آکر شکایت کی۔ یزید نے پوچھا: "آپ نے کہیں زیاد کے بارے میں کوئی بات تو نہیں کی تھی؟" ابن عامر نے کہا: "ہاں، کچھ کہا تو تھا۔" یہ سن کر یزید انہیں لے کر حضرت معاویہ کے پاس آیا۔ انہوں نے ابن عامر کو دیکھتے ہی مجلس برخاست کی اور اندر چلے گئے (یعنی ناراضی کا اظہار کیا۔) یزید نے دیکھا تو ابن عامر سے کہا: "آپ بیٹھیں، وہ کب تک گھر کے اندر بیٹھے رہیں گے (یعنی کچھ دیر بعد تو نکلیں گے۔)

کافی دیر بعد حضرت معاویہ باہر آئے، آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس سے آپ دروازوں کو بجا رہے تھے اور یہ شعر پڑھ رہے تھے: "ہماری راہ اور ہے اور تمہاری اور۔ اس بات کو لوگ جان چکے ہیں۔" پھر بیٹھ گئے اور ابن عامر سے فرمایا: "کیا آپ نے زیاد کے بارے میں کوئی بات کہی ہے؟ سنیے! واللہ! پورا عرب اس بات سے آگاہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں میں سب سے معزز تھا (کہ سردار قریش کا بیٹا تھا) اور اسلام نے میری عزت اور بڑھا دی ہے۔ <u>میرے ساتھیوں میں کوئی ایسی کمی نہ تھی، جو زیاد نے پوری کر دی ہو یا میری ذلت کو عزت میں بدل دیا ہو۔</u> یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ ہاں! میں نے انہیں جس چیز کا حق دار پایا ہے، وہ سلوک ان کے ساتھ میں نے کیا ہے۔" ابن عامر نے کہا: "امیر المومنین! میں اپنی بات سے رجوع کرتا ہوں، زیاد کی جس میں خوشی ہو گی، وہی بات زبان سے نکالوں گا۔" معاویہ نے کہا: "اب ہم بھی پھر وہی بات کریں گے، جو آپ چاہتے ہیں۔" ابن عامر اٹھ کر زیاد کے پاس گئے اور انہیں راضی کر لیا۔

اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوئی فیصلہ یا اعلان نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کی تلاش کروائی جن کے سامنے حضرت ابو سفیان

رضی اللہ عنہ نے زیاد کی والدہ سمیہ سے اپنے نکاح کا اعتراف کیا تھا اور زیاد کو اپنا بیٹا تسلیم کیا تھا۔[36] دس صحابہ ایسے ملے جنہوں نے یہ گواہی دی جن میں حضرت معاویہ اور زیاد رضی اللہ عنہما کی بہن جویریہ بنت ابی سفیان بھی شامل تھیں۔ گواہوں نے یہ گواہی دی کہ انہوں نے خود حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے منہ سے یہ سنا ہے کہ زیاد ان کا بیٹا ہے۔ ایک گواہ منذر بن زبیر رضی اللہ عنہما نے یہ گواہی دی کہ میں نے خود تو نہیں سنا البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ انہوں نے ابوسفیان سے یہ بات سنی تھی۔ گواہوں نے علی الاعلان یہ گواہی مسجد میں دی اور اس کی بنیاد پر حضرت معاویہ نے زیاد کو اپنا بھائی تسلیم کر لیا اور انہیں اپنے خاندان کا حصہ بنا لیا۔[37]

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کی نفسیاتی حالت کیا ہو گی، جس کے والد کا لوگوں کو علانیہ علم نہ ہو۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ قانونی کاروائی کر کے اور ثبوت اکٹھے کر کے اپنے بھائی کو ان کا حق دیا تو اس میں کیا برائی تھی؟ ان کے اس فعل پر نہ تو شرعاً کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے اور نہ ہی عقلاً۔ اس واقعے سے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص، جس کا نام و نسب مشکوک ہو، کو اپنے خاندان کا حصہ بنا لینا دل گردے کا کام ہے۔ ہم میں سے کون اتنا حوصلہ رکھتا ہے کہ کسی ایسے شخص کو، جسے ماں باپ کے طعنے دیے جاتے ہوں، کو اپنا بھائی قرار دے کر اسے اپنے والد کی جائیداد میں حصہ بنا لے۔ اس کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر ایک بے خانماں شخص کو اس کا حق دلوایا۔ رہا یہ سوال کہ انہوں نے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا تو اس کی وجہ دراصل ابن عامر کی تحریک تھی۔ کسی ذاتی رنجش کی وجہ سے انہوں نے زیاد کو بدنام کرنے کی مہم چلانے کا ارادہ کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے پوری کاروائی کر کے یہ اعلان کیا۔ اس واقعے پر تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت کو سلام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن باغیوں کو چونکہ حضرت معاویہ سے خاص دشمنی تھی کیونکہ انہوں نے ان کے عزائم کو ناکام بنایا تھا، اس وجہ سے انہوں نے اس بات کا بتنگڑ بنا کر حضرت معاویہ پر اعتراضات شروع کر دیے۔ وہ اعتراضات یہ تھے:

1۔ معاویہ نے زیاد کو محض سیاسی فوائد کے لیے اپنا بھائی قرار دیا۔ یہ محض ایک سیاسی چال تھی۔

2۔ معاویہ کا یہ عمل شرعاً حرام تھا کیونکہ نسب میں تبدیلی گناہ ہے۔

3۔ دیگر صحابہ نے بھی حضرت معاویہ کے اس فیصلے پر تنقید کی۔

اب ہم ایک ایک کر کے ان اعتراضات اور باغیوں اور ان سے متاثر ہونے والے مورخین کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

---

[36] ایضاً۔ 4/1-63

[37] ابن حجر عسقلانی۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ باب زیاد بن ابی سفیان۔ شخصیت نمبر 3001۔ 4/141۔ قاہرہ: مرکز البحوث والدراسات العربیہ و الاسلامیہ۔

کیا استلحاق زیاد ایک سیاسی چال تھی؟

باغیوں اور ان کے متاثرین کا کہنا ہے کہ زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاسی چال تھی۔ انہیں خطرہ تھا کہ زیاد کہیں بغاوت نہ کر دیں اور دوسرے وہ ایک نہایت ہی قابل شخص کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس بات کی کمزوری اسی سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہ کو زیاد رضی اللہ عنہما سے اگر کوئی خطرہ تھا تو اس وقت تھا، جب زیاد نے ان کی بیعت نہ کی تھی۔ زیاد، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لائق ترین گورنروں میں سے تھے اور انہوں نے ایران و خراسان کے وسیع علاقے کو نہایت خوبی سے سنبھال رکھا تھا۔ ان کے ساتھ فوج بھی موجود تھی۔ اگر انہوں نے بغاوت کرنا ہوتی تو 41/661 میں کرتے لیکن جیسے ہی حضرت حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کا اتحاد ہوا، زیاد نے بھی دمشق آ کر حضرت معاویہ کی بیعت کر لی۔ اگر حضرت معاویہ کا مقصد محض سیاسی چال چلنا ہوتا، تو یہ چال وہ اس وقت 41/661 میں چلتے، نہ کہ تین سال بعد جا کر 44/664 میں زیاد کے اپنا بھائی ہونے کا اعلان کرتے جب زیاد کے پاس نہ تو کوئی عہدہ تھا اور نہ فوج، نہ ان کے باغی تحریک سے تعلقات تھے اور نہ ہی کوئی خاندانی یا قبائلی حیثیت۔

رہی بات زیاد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی، تو یہ کام تو استلحاق کے بغیر بھی ہو سکتا تھا۔ زیاد فوجی اور سول ایڈمنسٹریشن کا زبردست ٹیلنٹ رکھتے تھے اور اسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور سے اب تک ثابت کرتے چلے آ رہے تھے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ جو شخص جس ٹیلنٹ کا مالک ہو، اسے جب اپنے مطلب کا کام مل جائے، تو اس کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ جب زیاد، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی بیعت کر چکے تھے تو پھر اس میں کیا مانع تھا کہ انہیں جو عہدہ دیا جاتا، اسے قبول کر لیتے۔

کیا استلحاق زیاد خلاف شریعت تھا؟

باغی راویوں اور ان سے متاثر ہونے والے بعض مورخین نے بڑا زور لگایا ہے کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیاد سے متعلق اعلان کو خلاف شریعت ثابت کر دیں۔ ان کی بنیادی دلیل یہ حدیث ہے:

> سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عتبہ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو وصیت کی کہ زمعہ کی لونڈی کا بیٹا میرا ہے، اسے اپنی پرورش میں لے لینا۔ جس سال مکہ فتح ہوا، اس بچے کو سعد بن ابی وقاص نے اپنی تحویل میں لے لیا اور کہا کہ یہ میرا بھتیجا ہے، میرے بھائی نے اس کے متعلق وصیت کی تھی۔ عبد بن زمعہ کھڑے ہوئے ہوئے اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اور میرے باپ کی کنیز کا بیٹا ہے اور میرے باپ ہی کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ دونوں اپنا مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور (اپنا دعوی پیش کیا۔۔۔) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عبد بن زمعہ! اس بچے کی پرورش آپ کے ذمہ ہے۔" پھر فرمایا: "بچہ اسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو اور بدکاری کرنے والے کے لیے پتھر ہیں۔" پھر (ام المومنین) سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "اس بچے سے پردہ کرنا کیونکہ اس میں عتبہ کی

مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس بچے نے سیدہ سودہ کو ان کی وفات تک نہ دیکھا۔[38]

اس حدیث کی بنیاد پر یہ قانون بنایا گیا کہ اگر کسی شخص نے کسی شادی شدہ خاتون سے بدکاری کی اور اس سے بچہ ہو گیا تو اس بچے کی پرورش کا حق اس خاتون کے خاوند کو ہو گا، اگر وہ اسے قبول کر لے۔ باغی راویوں نے یہ پراپیگنڈا کیا کہ حضرت معاویہ نے زیاد رضی اللہ عنہما کو اپنا بھائی قرار دے کر ان کا نسب اپنے والد ابو سفیان سے جوڑ لیا اور ایک گناہ کا کام کیا حالانکہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ حدیث میں بیان ہونے والے واقعے کی صورتحال، زیاد سے بالکل مختلف تھی۔

1۔ حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے، وہ بدکاری کا کیس تھا جبکہ ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے زیاد کی والدہ سے بدکاری نہیں کی تھی بلکہ میعادی نکاح کیا تھا، جو دور جاہلیت کے رواج کے تحت ایک جائز عمل تھا۔ دور جاہلیت میں یہ عام رواج تھا کہ لونڈیوں کے آقا پیسے لے کر انہیں مخصوص مدت کے لیے دوسرے لوگوں سے بیاہ دیتے تھے۔ اسلام نے اس ظالمانہ رسم کا خاتمہ کیا۔ اس کی تفصیل آپ راقم الحروف کی کتاب "اسلام میں ذہنی وجسمانی غلامی کے انسداد کی تاریخ" میں دیکھ سکتے ہیں۔

2۔ حدیث میں جو واقعہ ہے، وہ ایک کم عمر بچے کا تھا جس کی پرورش کے سلسلے میں دو افراد میں جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا۔ زیاد ایک جوان شخص تھے اور ان کے والد کے بارے میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔ لوگوں کو بالعموم یہ معلوم تھا کہ ان کے والد ابو سفیان ہی ہیں لیکن اس بات کو سرکاری ریکارڈ میں تسلیم نہ کیا گیا تھا۔ ابو سفیان کے علاوہ کوئی اور شخص ان کا باپ ہونے کا دعوے دار نہ تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ زیاد کا باپ کسی اور شخص کو سمجھا جاتا تھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کی بجائے ابو سفیان کو ان کا والد قرار دیا۔ انہوں نے صرف اتنا کیا کہ پوری قانونی کاروائی کر کے زیاد کی ولدیت کو تسلیم کر لیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث مذکور میں بیان کردہ ارشاد نبوی کا کوئی اطلاق حضرت زیاد رضی اللہ عنہ کے معاملے پر نہیں ہوتا ہے۔ باغی تحریک کو پہنچنے سے روکنے کے لیے چونکہ زیاد نے غیر معمولی کاروائی کی تھی، اس وجہ سے انہیں بدنام کرنے کے لیے ان باغیوں نے حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ اور زیاد کی والدہ سمیہ کے متعلق طرح طرح کے اسکینڈل تراشے، انہیں بدکاری کا مجرم قرار دے کر زیاد کو ولد الحرام کا خطاب دیا اور انہیں روایات کا حصہ بنا کر زیاد پر طعنہ جوئی کی جس کا سبب سوائے ان کے بغض اور تعصب کے اور کچھ نہ تھا۔

ان باغیوں کا یہ عمل مسلمہ انسانی اخلاقیات کی خلاف ورزی تھا۔ اسے ہم ایک مثال کی مدد سے واضح کرتے ہیں۔ ہم اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں کہ یورپ کے ملحدین کے ہاں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کے تعلق کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ قانونی کاروائیوں سے بچنے کے لیے جوڑے اکٹھے رہتے ہیں اور اس میں ان کے بچے بھی ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ایسا ہی کوئی جوڑا اور اس کی اولاد اسلام قبول کر لے اور اپنے کردار سے نہایت ہی اعلی درجے کا مسلمان ثابت ہو تو کیا یہ بات جائز ہو گی کہ ان کی ما قبل اسلام سرگرمیوں کا طعنہ دے کر انہیں بدکار

[38] بخاری، کتاب البیوع، حدیث 1948

اور ان کے بچوں پر "ولد الحرام" ہونے کی پھبتی کسی جائے جبکہ اسلام سے پہلے انہوں نے اپنے غیر مسلم معاشرے کے قانون اور رسم کے لحاظ سے ایک جائز کام کیا۔ اسلام کے اصولوں کی پابندی کا اطلاق تو ان پر تب ہو گا جب وہ اسلام کے دائرے میں آ جائیں گے۔ سابقہ افعال کا طعنہ وہی دے سکتا ہے جس کا مقصد ہی سیاسی وجوہات کی بنیاد پر کسی کی کردار کشی ہو۔

کیا اکابر صحابہ نے حضرت معاویہ کے فیصلے پر تنقید کی؟

بعض مورخین نے دعوی کیا ہے کہ اکابر صحابہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا، جس سے اس کی غلطی واضح ہے۔ حضرت معاویہ کی بہن ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہمانے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا اور زیاد سے مسلسل پردہ کرتی رہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہانے بھی اس فیصلے کو شروع میں تسلیم نہیں کیا تاہم بعد میں اسے مان لیا۔ یہ ساری باتیں ابن عبد البر (368-463/979-1071) نے اپنی مشہور کتاب "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" میں نقل کی ہیں جو انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پر لکھی ہے۔

الاستیعاب میں "زیاد بن ابی سفیان" کے عنوان سے ایک طویل روایت نقل ہوئی ہے جس میں جی بھر کر اس پورے واقعے کو ایک اسکینڈل کی شکل میں لکھا گیا ہے، حضرت زیاد اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے سارے معاملے کو نہایت ہی مشکوک انداز میں بیان کیا گیا ہے اور گویا کہ ان حضرات کے بارے میں ایک چارج شیٹ تیار کی گئی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اگر اس روایت کی سند ہی کو دیکھ لیا جائے تو سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ سند یہ ہے: حدثنا الحسن بن منصور قال حدثنا عبيد بن ابي السري البغدادي قال **حدثنا هشام بن محمد بن السائب عن أبيه** عن أبي صالح عن ابن عباس۔[39] سند کے خط کشیدہ الفاظ کو دیکھیے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قصہ کس کا گھڑا ہوا ہے۔ یہ وہی مشہور ہشام کلبی ہے جو اپنے باپ محمد بن سائب الکلبی سے روایت کر رہا ہے۔ کتاب کے شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ شخص جھوٹ گھڑنے کے لیے مشہور ہے اور صحابہ کرام کے بارے میں اتنا متعصب ہے کہ انہیں بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اس واقعے پر اعتراضات کی جو کہانی ہے، وہ اسی کی تیار کردہ ہے۔

گورنروں پر ظلم کی تہمت

باغی راویوں اور ان سے متاثرہ مورخین نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جو چارج شیٹ تیار کی ہے، اس میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے گورنروں کو کھلی چھوٹ دے دی تھی اور وہ لوگوں پر ظلم و ستم کیا کرتے تھے۔ حضرت معاویہ ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان گورنروں کا ظلم و ستم بہت بڑھ گیا۔ یہ دعوی جتنے شد و مد سے کیا گیا ہے، اسے ثابت کرنے

[39] ابن عبد البر۔ الاستیعاب۔ 1/312۔ باب زیاد بن ابی سفیان

کے لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ واقعات کا ایک انبار لگا دیا جائے جس میں گورنر ظلم کرتے دکھائی دیں لیکن بمشکل چند ایک ایسے واقعات ملتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ دعوی کیا گیا ہے۔ یہاں ہم انہی کا جائزہ پیش کریں گے۔

1۔ سن 40/660 میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھیجے ہوئے لشکر کے کمانڈر بسر بن ابی ارطاۃ نے یمن میں قتل عام کیا اور حضرت عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دو کمسن بچوں کو مار دیا۔

2۔ بسر بن ابی ارطاۃ نے پہلے ہمدان اور پھر یمن پر حملہ کیا اور وہاں کی مسلمان خواتین کو لونڈیاں بنا کر بازاروں میں بیچ دیا۔ یہ پہلی مسلم خواتین تھیں، جنہیں لونڈیاں بنایا گیا۔

3۔ بصرہ کے گورنر ابن غیلان کو خطبہ دیتے ہوئے ایک شخص نے پتھر مار دیا تو اس نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا۔ اسی طرح زیاد بن ابی سفیان پر بھی کوفہ میں دوران خطبہ کنکروں کی بارش ہوئی تو انہوں نے بھی ان لوگوں کے ہاتھ کٹوا دیے۔

5۔ مخالفین کا سر کاٹ کر پیش کرنے کے عمل کا آغاز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیا اور تاریخ اسلام میں جو پہلا سر کاٹ کر پیش کیا گیا، وہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا تھا۔ دوسرا سر عمرو بن حمق کا تھا جو قاتلین عثمان میں شامل تھا۔

6۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خفیہ طور پر زہر دلوا کر سیاسی مخالفین کو قتل کروایا۔

اب ہم ان میں سے ایک ایک واقعے کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

کیا یمن میں قتل عام کیا گیا؟

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور سے متعلق ایک جھوٹی روایت ہے جس پر ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اس میں صرف حضرت معاویہ ہی نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہما کی بھیجی ہوئی فوج پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ ان افواج نے قتل عام کیا تھا۔ اس کا آپ وہاں جائزہ لے سکتے ہیں۔

کیا ہمدان اور یمن کی خواتین کو لونڈیاں بنایا گیا؟

یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جو ایک ایسی مردود روایت میں بیان ہوا ہے جسے سوائے ابن عبد البر کے، کسی مورخ نے اپنی کتاب میں درج نہیں کیا حتی کہ ابو مخنف اور ہشام کلبی جیسے لوگوں کی نظر بھی اس پر نہ پڑی، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف رائی کا پہاڑ اور بے پر کی اڑانے کے لیے مشہور ہیں۔ روایت کی سند یہ ہے: حدثنا أحمد بن عبدالله بن محمد بن علي قال حدثنا ابي قال حدثنا عبدالله ابن يونس قال حدثنا بقي بن مخلد قال حدثنا ابو بكر بن أبي شيبة قال حدثنا زيد بن الحباب قال حدثنا موسى بن عبيدة قال حدثنا **زيد بن عبدالرحمن بن أبي سلامة** عن **أبي أرباب**۔ سند کا آغاز ہی دو **نامعلوم افراد** سے ہو رہا ہے۔ ایک کی کنیت ابو ارباب بیان ہوئی ہے اور دوسرے کا نام زید بن عبد الرحمن۔ رجال کی کتب میں ان کے کوئی حالات ہمیں نہیں مل سکے ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ حضرات بھی باغی تحریک کے رکن رہے ہوں جس کا مقصد ہی ڈس انفارمیشن پھیلانا تھا۔

درایت کے اصولوں کے اعتبار سے دیکھیے کہ تو مسلم خواتین کا مسلمانوں کے ہاتھوں بازاروں میں بیچنا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس پر عالم اسلام کا دل دہل جائے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو سینکڑوں لوگ اس واقعے کو دیکھتے اور پھر بے شمار لوگ اس واقعے کو بیان کر رہے ہوتے لیکن سوائے اس ایک مردود روایت کے، کسی اور روایت میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ابو مخنف اور ہشام کلبی جیسے لوگ بھی اس بات سے بے خبر ہیں جن کی زندگیوں کا مقصد ہی بغض معاویہ کو فروغ دینا ہے۔

کیا گورنر کنکر مارنے والوں کے ہاتھ کٹوا دیتے تھے؟

تاریخ کی کتب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور سے متعلق ایسے دو واقعے بیان ہوئے ہیں۔ ایک واقعہ 50/671 کا ہے اور دوسرا 55/675 کا۔ ہم ان کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں:

زیاد بن ابی سفیان کا واقعہ

پہلا واقعہ حضرت زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ زیاد مشرقی صوبوں کے گورنر تھے اور بصرہ میں رہ کر افغانستان تک کے علاقے پر حکومت کرتے تھے۔ کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ تھے جن کی وفات 50/671 میں ہوئی۔ آپ کے بارے میں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ آپ نہایت حلم اور تدبر سے کام لیتے تھے۔ آپ کی نرمی کو کوفی باغیوں نے کمزوری سمجھا اور اپنے بغض کا اظہار اس طرح کیا کہ آپ پر دوران خطبہ کنکر برسائے لیکن آپ نے پھر بھی نرمی اختیار کی۔

زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے اس درجے میں مشرقی صوبوں میں نظم قائم کر دیا تھا کہ افغانستان میں اگر کسی کی رسی بھی چوری ہوتی تو انہیں بصرہ میں اس کی اطلاع مل جاتی۔ اس کارکردگی کو دیکھتے ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ بھی انہی کے سپرد کر دیا جو عالم اسلام کا سب سے زیادہ خطرناک اور مشکل علاقہ بن چکا تھا۔ یہیں سے شمالی صوبے بھی کنٹرول کیے جاتے تھے۔ جب زیاد یہاں آئے تو اہل کوفہ نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کرتے تھے یعنی وہ جب خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو کوفی باغیوں نے ان پر بھی کنکر برسائے۔ اس واقعے کی جو تفصیلات طبری نے بیان کی ہیں، ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

> حدثني عمر، قال: حدثني علي، عن مسلمة بن محارب: زیاد جب کوفہ آئے تو منبر پر جا کر حمد و ثنا کی اور پھر کہا: "میں بصرہ میں تھا کہ مجھے یہ خدمت تفویض کی گئی۔ میں نے ارادہ کیا کہ بصرہ کی پولیس میں سے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ یہاں آؤں لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ آپ لوگ اہل حق ہیں اور آپ کے حق نے بہت مرتبہ باطل کو دفع کیا ہے۔ اس لیے فقط اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔ الحمد للہ! لوگوں نے مجھے جتنا پست کیا تھا، اتنا ہی اللہ تعالی نے بلند کر دیا۔ لوگوں نے جس بات کو ضائع کر دیا تو اللہ نے اس کی حفاظت کی۔ "

جب زیاد خطبہ سے فارغ ہوئے اور ابھی منبر ہی پر تھے کہ لوگوں نے ان پر سنگریزے مارنا شروع کر دیے۔ جب تک سنگریزوں کی بارش ہوتی رہی، زیاد وہیں بیٹھے رہے۔ پھر اپنے خاص لوگوں کو بلا کر حکم دیا کہ مسجد کے تمام دروازے بند کر دیں۔ پھر کہا: "ہر شخص اپنے پاس والے آدمی کو پکڑ لے۔ ہر گز ہر گز کوئی نہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرے پاس کون بیٹھا تھا؟" اس کے بعد زیاد نے اپنے لیے ایک کرسی مسجد کے دروازے پر رکھوائی اور چار چار افراد کو بلا کر قسم لی کہ ہم میں سے کسی نے پتھر نہیں مارا۔ جس نے قسم کھالی، اسے چھوڑ دیا اور جس نے قسم نہ کھائی، اسے علیحدہ روک رکھا۔ یہ سب تیس آدمی تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی افراد تھے۔ اسی جگہ ان سب کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے۔[40]

روایت کی سند پر غور فرمائیے۔ پہلے راوی کا نام عمر ہے لیکن اس نام کے تو ہزاروں آدمی ہوں گے۔ طبری کی دیگر روایات کا جائزہ لیا جائے تو ان کا نام عمر بن شبہ (173-262/789-875) معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑے مورخ اور اخباری تھے۔ تیسرے صاحب مسلمہ بن محارب ہیں اور ان کے حالات نامعلوم ہیں۔ کتب رجال میں ان کا ذکر نہیں ملتا کہ یہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں۔

سند سے قطع نظر اگر واقعے کو درست بھی مان لیا جائے تو اس میں چند نکات قابل غور ہیں۔ کسی عام آدمی کو کیا غرض ہے کہ وہ گورنر پر دوران خطبہ پتھر برسائے۔ یہ وہی قاتلین عثمان اور ان کے حامیوں کا گروپ تھا جنہوں نے اب کوفہ کو اپنا بیس کیمپ بنا رکھا تھا اور یہاں اپنی تحریک کو منظم کر رہے تھے۔ زیاد بن ابی سفیان کے سامنے چیلنج یہ تھا کہ اس گروپ کی بیخ کنی کی جائے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ان سے نرمی کا رویہ اختیار کیا تھا اور خود کو نگرانی تک محدود رکھا تھا۔ اس سے یہ شیر ہو گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ گورنر پر بھی سنگ باری کرنے لگے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان لوگوں کو پکڑ کر ان کی گردنیں اڑا دی جاتیں لیکن یہ زیاد کی نرمی تھی کہ انہوں نے اس گروپ کے لوگوں کے ہاتھ کٹوانے پر اکتفا کیا۔ اس میں بھی انہوں نے باقاعدہ تفتیش کی اور صرف انہی لوگوں کے ہاتھ کٹوائے جنہوں نے قسم کھانے سے انکار کیا تھا۔ ایک آدمی اگر باغی تحریک میں شامل نہیں ہے، تو اسے قسم کھانے میں کیا چیز مانع تھی؟ باغی بھی جھوٹی قسم کھا کر جان چھڑا سکتے تھے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ کٹوائے گئے، وہ سرکشی کی اس انتہا پر پہنچ چکے تھے کہ انہوں نے سر عام تسلیم کر لیا کہ وہ باغی تحریک کا حصہ ہیں۔

اگر زیاد کے اس عمل کو بھی کوئی شخص ظلم کہتا ہے تو اس کے بارے میں پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے امن و امان کو قائم رکھنا اور باغی تحریکوں کی سرکوبی کوئی اہم کام نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جو شخص بھی حکومت کے خلاف بغاوت کی تیاری کرے، حکومت کو چاہیے کہ وہ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے، اس کا منہ چومے اور اقتدار کو طشتری میں رکھ کر اسے پیش کر دے۔ اگر اسی اصول کو درست قرار دے دیا جائے تو پھر اس شخص کو آج کے دور کی تمام حکومتوں کو مشورہ دینا چاہیے کہ جہاں ان کے خلاف کوئی تحریک اٹھنا شروع ہو، وہ ایسا ہی کریں۔ اس شخص کو خود بھی جتنا اقتدار حاصل ہے، اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ کر اپنے مخالفین کے حوالے کر دے۔

[40] طبری۔ 4/1-73

ہاں زیاد پر یہ اعتراض ضرور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان باغیوں کو ذرا نرم سزا بھی دے سکتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ نرم سزا کا ان کی ڈھیٹ ہڈیوں پر اثر نہیں ہو رہا تھا۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اس سے پہلے انہیں قید بھی کر کے دیکھ چکے تھے اور زبانی سرزنش بھی کر چکے تھے۔ لیکن یہ لوگ کسی طرح اپنی سرکشی سے باز نہیں آ رہے تھے بلکہ یہ سزائیں ان کی طاقت میں اضافہ کر رہی تھیں جیسے اینٹی بایوٹک ادویات سے بسا اوقات جراثیم مزید طاقتور ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کے خلاف سخت کاروائی کی جاتی تاکہ لوگ ان کی حمایت سے باز آتے۔ زیاد نے ایسا ہی کیا اور انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔

اس واقعے کے بعد زیاد نے کوفہ کی باغی تحریک کے بارے میں تفصیلی تحقیقات کروائیں اور اس کے سرغنوں کو پکڑ کر شام بھجوا دیا۔ ان لوگوں پر مقدمہ چلا اور بہت سے لوگوں نے ان کی سرگرمیوں کے بارے میں گواہیاں دیں۔ اس جرم کی پاداش میں ان سب کو قتل کر دیا گیا اور ان میں حُجر بن عدی بھی شامل تھے۔ اس کی تفصیل آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

ابن غیلان کا واقعہ

سب سے پہلے ہم اس واقعے کی روایت کو طبری سے بیان کرتے ہیں اور پھر اس پر اپنا تبصرہ پیش کریں گے:

> حدثنا الوليد بن هشام وعلي بن محمد: اسی سال (55/675) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عمرو بن غیلان کو بصرہ سے معزول کر کے عبید اللہ بن زیاد کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ عبداللہ بن عمرو بصرہ کے منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص خیبر بن ضحاک نے بنو ضبہ میں سے (یا بنو ضرار میں سے) انہیں ایک سنگریزہ کھینچ مارا۔ عبداللہ نے اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ بنو ضبہ نے آ کر کہا کہ ہماری برادری کے ایک شخص سے جو غلطی ہونی تھی، ہو گئی اور گورنر نے بھی سزا بھی اسے مناسب ہی دی ہے لیکن اب ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ **یہ خبر امیر المومنین کو پہنچ جائے گی اور وہاں سے بھی کوئی عذاب کسی خاص شخص یا برادری پر نازل ہو جائے گا۔** اس لیے آپ مناسب سمجھیں تو خود ہی امیر المومنین کے نام ایک خط لکھ کر ہمیں دے دیجیے، ہم اپنے لوگوں میں سے کسی کے ہاتھ بھجوا دیں گے۔ اس میں یہ لکھ دیجیے کہ ہاتھ (چوری کے) شبہ میں کاٹا گیا ہے، جرم واضح نہیں ہے۔
>
> عبداللہ بن عمرو نے حضرت معاویہ کے نام خط لکھ کر انہیں دے دیا۔ سال بھر یا چھ مہینے یہ خط پڑا رہا۔ اس کے بعد عبداللہ خود معاویہ کے پاس گئے یا یہ واقعہ لکھ کر روانہ کر دیا۔ بنو ضبہ بھی حضرت معاویہ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے: "امیر المومنین! عبداللہ نے ہمارے ایک بھائی کا ہاتھ ناحق کٹوا دیا۔" اور یہ خط ان کا آپ کے نام موجود ہے۔ حضرت معاویہ نے خط پڑھ کر فرمایا: "میرے مقرر کردہ گورنروں سے قصاص لینا تو درست نہیں ہے۔ اس کا تو کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہاں اگر تم کہو تو دیت دلوا سکتا ہوں۔" یہ لوگ دیت پر راضی ہو گئے۔ حضرت معاویہ نے بیت المال سے انہیں دیت دلوا دی اور عبداللہ بن غیلان کو معزول کر دیا۔[41]

اس واقعے میں خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیے کہ متعلقہ شخص کا ہاتھ کٹوانے کی وجہ سے اس کی برادری کو کیا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ البدایہ و

[41] طبری۔ 4/1-113

النہایہ میں یہ واقعہ جہاں بیان ہوا ہے، وہاں ان لوگوں کا خدشہ یہ بیان کیا گیا ہے جو انہوں نے ابن غیلان سے کیا: "اگر امیر المومنین کو یہ علم ہو گیا کہ آپ نے اس کا ہاتھ اصل میں کس وجہ سے کاٹا ہے تو وہ اس کے اور اس کی قوم کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو حجر بن عدی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے آپ ہمیں تحریر لکھ دیجیے آپ نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ کی بنیاد پر کاٹا ہے۔" اس سے اصل کہانی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ شخص دراصل باغی تحریک کا رکن تھا۔ اسے سزا محض کنکری مارنے پر نہیں دی گئی تھی بلکہ اس کی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے دی گئی تھی اور وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔ اس کے قبیلے کے لوگوں نے رونا پیٹنا مچا کر گورنر سے خط لکھوا لیا اور گورنر نے بھی محض سادگی میں خط لکھ دیا اور پھر اس کی پاداش میں معزول بھی ہوئے۔ اگر وہ پوری صورتحال اسی وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجتے تو اس پورے گروپ کا وہی حشر ہوتا، جو حجر بن عدی کا ہوا تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ان کے اس جملے کی وجہ سے اعتراض یہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے گورنروں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی: " میرے مقرر کردہ گورنروں سے قصاص لینا تو درست نہیں ہے۔ اس کا تو کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہاں اگر تم کہو تو دیت دلوا سکتا ہوں۔" یہ اسلام ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا عام قانون ہے کہ اگر جج سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جائے اور وہ مجرم کو مثلاً پھانسی کی سزا دے بیٹھے تو پھر اس جج سے قصاص نہیں لیا جاتا ہے۔ غلطی کا امکان ہر شخص سے ہوتا ہے اور جج بھی بہر حال انسان ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ قانون بنا دیا جائے کہ جج کے غلط فیصلے کی وجہ سے اگر کسی ملزم کو نقصان پہنچے تو جج سے بدلہ لیا جائے تو پھر کوئی شخص بھی عدلیہ میں عہدہ قبول نہ کرے گا۔ ہاں جج کے فیصلے میں غلطی پائی جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے سوچ سمجھ کر فیصلہ نہیں کیا تو اس کے خلاف محکمانہ کاروائی کی جا سکتی ہے اور اسے معزول کیا جا سکتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور اپنے گورنر کو معزول کر دیا۔ ان تک جو بات پہنچی، وہ یہی تھی کہ گورنر نے شبہ میں ایک شخص کا ہاتھ کٹوا دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ملزم کو شک کا فائدہ (Benefit of Doubt) دینا چاہیے تھا، نہیں دیا۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو کسی بھی جج سے ہو سکتی ہے۔

واضح رہے کہ اس دور میں تقسیم عمل (Segregation of Duties) کا اصول دریافت نہیں ہوا تھا اور فوج، انتظامیہ اور عدلیہ ایک ہی گورنر کے ماتحت ہوتی تھی۔ صوبے کی ہائی کورٹ کا سربراہ بھی گورنر ہی ہوتا تھا اور مرکزی سپریم کورٹ کی ذمہ داری خلیفہ کے سپرد ہوتی تھی۔

اس واقعے کی سند پر بھی غور فرمائیے۔ طبری نے صرف دو راویوں کا ذکر کیا ہے، ایک ولید بن ہشام اور دوسرے علی بن محمد المدائنی (135-225/752-840)۔ مدائنی اس واقعہ کے اسی نوے برس بعد پیدا ہوئے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ واقعہ کن کن لوگوں سے گزر کر ان تک پہنچا ہے۔ پھر مدائنی بھی اخباری ہیں جن کے بارے میں محدثین کی آراء ملی جلی ہیں کہ یہ قابل اعتماد ہیں یا نہیں۔ ولید بن ہشام کا کوئی تذکرہ ہمیں نہیں مل سکا ہے۔ تہذیب الکمال جیسے بڑے انسائیکلوپیڈیا میں بھی ولید بن ہشام نام کے تین راوی ہمیشہ مل سکے ہیں اور تینوں کا تعلق پہلی صدی ہجری سے ہے اور ظاہر ہے کہ طبری اپنی پیدائش سے ڈیڑھ سو برس پہلے کے لوگوں سے روایت نہیں سن سکتے ہیں۔ درمیان کے راویوں نے بات میں کیا کچھ ملاوٹ کر دی ہو، ہم نہیں جانتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سند کے اعتبار سے یہ

واقعہ نہایت ہی کمزور طریقے سے طبری تک پہنچا ہے۔

کیا حضرت معاویہ کے سامنے سر کٹوا کر پیش کیے گئے؟

اس ضمن میں تواریخ میں دو واقعات ملتے ہیں۔ ایک حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا اور دوسرا عمرو بن حمق کا، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا براہ راست قاتل تھا۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے مسند احمد میں یہ روایت موجود ہے:

حنظلہ بن خویلد العنبری کا بیان ہے کہ میں حضرت معاویہ کے پاس تھا کہ دو آدمی حضرت عمار کے سر کے بارے میں بحث کرتے ہوئے آئے اور ان میں سے ہر ایک کہہ رہا تھا کہ میں نے انہیں قتل کیا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: "تم دونوں میں سے ہر ایک اپنے صاحب (یعنی حضرت عمار) کے بارے میں دل خوش کرنے کے لیے کہہ رہا ہے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "اے عمار! تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔" حضرت معاویہ نے پوچھا: "تو پھر آپ ہمارے ساتھ کیوں ہیں؟" وہ بولے: میرے والد نے میری شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی تو آپ نے فرمایا تھا: "جب تک زندہ رہو، اپنے والد کی اطاعت کرو اور ان کی نافرمانی نہ کرو۔" میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں لیکن میں نے جنگ نہیں کی ہے۔" [42]

اس روایت میں کہیں یہ بیان نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر لانے کا حکم دیا تھا بلکہ صرف یہ بیان ہوا ہے کہ دو آدمیوں میں آپ کے سر کے بارے میں بحث ہوئی کہ آپ کو قتل کرنے والا کون بدبخت ہے۔ یہ دعوی کرنا کہ اسلام کے دور میں جو پہلا سر کاٹا گیا، وہ حضرت عمار کا تھا، درست نہیں ہے بلکہ ہم جنگ جمل کے سلسلے میں یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ اس واقعے سے پہلے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے قاتل عمرو بن جرموز نے بھی ان کا سر کاٹ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا تھا تو انہوں نے اسے جہنم کی وعید سنائی تھی۔

عمرو بن حمق کے قتل کا جو واقعہ طبری ہشام کلبی اور ابو مخنف کی سند سے بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے:

قال هشام بن محمد؛ عن أبي مخنف، وحدثني المجالد بن سعيد، عن الشعبي وزكرياء بن أبي زائدة، عن أبي إسحاق۔ (جب کوفہ کی باغی تحریک کے بارے میں زیاد نے گرفتاریاں شروع کیں، تو) عمرو بن حمق اور رفاعہ بن شداد کوفہ سے نکل کر مدائن جا پہنچے اور پھر وہاں سے موصل چلے آئے۔ یہاں یہ ایک پہاڑ میں چھپے رہے۔ اس گاؤں کے سربراہ، جس کا نام عبداللہ بن ابی بلتعہ تھا، کو خبر ہوئی کہ دو شخص اس پہاڑ کے دامن میں چھپے ہوئے ہیں، اسے ان دونوں پر شک گزرا۔۔۔ عمرو گرفتار ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا: "تم کون ہو؟" وہ بولا: "میں وہ شخص ہوں کہ جسے چھوڑ دو گے تو تمہارے لیے اچھا ہو گا اور اگر قتل کرو گے تو تمہارے لیے برا ہو گا۔" ان لوگوں نے بہت پوچھا مگر اس نے نہ بتایا۔

ابن ابی بلتعہ نے عمرو کو موصل کے گورنر عبدالرحمن ثقفی کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور حضرت معاویہ کو اس کا حال لکھ بھیجا۔ حضرت معاویہ نے جواب میں لکھا: "عمرو نے حضرت عثمان پر اپنے بھالے سے نو وار کیے تھے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس پر زیادتی کی جائے۔

[42] احمد بن حنبل۔ المسند۔ باب عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما۔ حدیث 6538, 6929

اس نے حضرت عثمان پر نو وار کیے تھے، تم بھی اس پر نو مرتبہ ہی وار کرنا۔" اس حکم پر عمرو کو نکال کر باہر لائے اور نو وار شروع کیے لیکن وہ پہلے یا دوسرے وار ہی پر مر گیا۔[43]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو کے ساتھ وہی سلوک ہوا، جس کا وہ حق دار تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا، وہ عین انصاف تھا۔ ہشام کلبی اور ابو مخنف، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے لیے خود روایتیں گھڑتے ہیں، انہوں نے بھی ایسا کوئی ذکر نہیں کیا کہ عمرو کے سر کو کاٹ کر پیش کیا گیا ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ جھوٹا الزام عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے سر کٹوا کر پیش کرنے کی رسم جاری کی۔ یہ بھی اسی پراپیگنڈا مہم کا حصہ ہے جو باغی تحریک کے راویوں نے اختیار کی۔

کیا سیاسی مخالفین کو زہر دلوایا گیا؟

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تین افراد کو زہر دلوا کر قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے: مالک اشتر، عبدالرحمن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ۔ اب ہم ان تینوں سے متعلق روایات کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

مالک بن حارث الاشتر

مالک اشتر کے بارے میں معلوم و معروف ہے کہ وہ باغی تحریک کا نمایاں لیڈر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جس پارٹی نے حملہ کر کے انہیں شہید کیا، اس کا یہ سرغنہ تھا۔ اس کے بعد جس گروپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد گھیرا ڈال کر ان کے نام پر خود حکومت کرنے کی مذموم کوشش کی، اس گروپ کا سربراہ بھی یہی تھا۔ یہی وہ گروپ تھا جس نے جنگ جمل اور جنگ صفین کروائی۔ ان وجوہات کی بنیاد پر اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے قتل بھی کروا دیا ہو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا کہ وہ اسی کا مستحق تھا۔ جب دو فریق برسر جنگ ہوں، تو وہ ایک دوسرے کی بلائیں نہیں لیتے اور نہ ہی ایک دوسرے سے پیار محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ مخالف فوج کے ماسٹر مائنڈ جرنیلوں کو اگر ایجنٹ بھیج کر قتل کروا دیا جائے تو جنگی اخلاقیات کے تحت اسے کوئی غلط نہیں سمجھتا ہے۔

طبری میں اس کے قتل کے تفصیلات ابو مخنف نے بغیر کسی سند کے بیان کی ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک غیر مسلم کسان، جس کا نام جایستار تھا، کو اس کام پر مقرر کیا۔ اشتر مصر کا گورنر بننے جا رہا تھا کہ راستے میں اسی جایستار کے پاس ٹھہرا اور اس کسان نے شہد میں اسے زہر دے دیا جسے پیتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔ اگر ابو مخنف کی روایت کو درست بھی مان لیا جائے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ کارنامہ قابل داد ہے کہ انہوں نے ایک نازک موقع پر باغی تحریک کے اس ماسٹر مائنڈ کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم اس واقعے کی تصدیق ناممکن ہے کیونکہ سوائے ابو مخنف کے، کسی اور نے اسے بیان نہیں کیا ہے۔

---

[43] طبری۔ 4/1-92

بعض حضرات طبری کی ان روایتوں پر تنقید کرتے ہیں جن میں مالک الاشتر کو باغی تحریک کا سرغنہ بتایا گیا ہے اور اس کے بعد بڑے طمطراق سے دعوی کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک معصوم انسان کو زہر دلوا دیا۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ مالک الاشتر کا باغی تحریک کا سرغنہ ہونا تو اتنی زیادہ روایات سے ثابت ہے کہ یہ حد تواتر تک پہنچ جاتی ہیں۔ اگر ان سینکڑوں روایات کو غلط مان لیا جائے جن میں مالک الاشتر کا باغی تحریک میں شامل ہونا بیان ہوا ہے، تو پھر اس ایک روایت کو بھی نہیں ماننا چاہیے جن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر زہر دلوانے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔

عبدالرحمن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہما

یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھی تھے اور ان کے بارے میں بھی طبری میں حدثني عمر، قال: حدثني علي، عن مسلمة ابن محارب کی سند سے ایک ایسی روایت نقل ہوئی ہے جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تہمت لگائی گئی ہے کہ انہوں نے انہیں زہر دلوا کر قتل کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ بہت اپنے جلیل القدر والد کی طرح بہت جفاکش تھے اور سرزمین شام میں ان کی شان بہت بڑھ گئی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ان سے سیاسی خطرہ ہوا تو ایک عیسائی ابن اثال کے ہاتھوں انہیں زہر دلوا دیا۔ جب اس کا علم خالد بن عبدالرحمن کو ہوا تو انہوں نے ابن اثال کو قتل کر دیا۔[44]

اس روایت کی سند پر غور کیجیے تو اس میں ایک علی بن محمد ہیں اور دوسرے مسلمہ بن محارب۔ علی بن محمد کے قابل اعتماد ہونے کے بارے میں محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہے جبکہ مسلمہ بن محارب کے حالات ہی سرے سے نامعلوم ہیں۔ اس وجہ سے یہ روایت سرے سے قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ واقعہ طبری نے 46/666 کے باب میں بیان کیا ہے۔ اسی روایت کے بعد 47/667 کا باب ہے جو کہ نہایت ہی مختصر ہے اور اس کے فوراً بعد 48/668 کا باب شروع ہوتا ہے۔ اس کے بالکل آغاز میں طبری نے اس سال کے عہدے داروں کے نام نقل کیے ہیں، جس نے اس روایت کے جھوٹ کا بھانڈہ پھوڑ دیا ہے۔ طبری لکھتے ہیں:

> پھر سن 48 ہجری شروع ہوا۔ اس کے واقعات کا ذکر یہ ہے۔ اس سال ابو عبدالرحمن قینی نے انطاکیہ میں سردی کا موسم بسر کیا اور عبداللہ بن قیس فزاری نے گرمیوں کا جہاد کیا۔ مالک بن ہبیرہ سکونی نے سمندر میں جنگ کی اور عقبہ بن عامر جہنی نے اہل مصر کو ساتھ لے کر سمندر میں جنگ کی اور اہل مدینہ بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ اہل مدینہ کے کمانڈر منذر بن زہیر تھے اور ان سب کے کمانڈر انچیف **خالد بن عبدالرحمن بن خالد بن ولید** تھے۔[45]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت معاویہ نے عبدالرحمن کو زہر دلوایا ہوتا تو ان کے بیٹے خالد کو کس طرح اتنی اہم کاروائیوں کا کمانڈر انچیف بنا دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خالد کو اس سازش کا علم نہیں تھا تو یہ درست نہیں ہے کیونکہ زہر والی روایت میں یہ بیان ہوا ہے

[44] ایضاً۔ 4/1-72

[45] ایضا

کہ خالد کو علم ہوا تھا اور انہوں نے ابن اثال کو قتل کر دیا تھا۔ اگر انہیں سازش کا علم نہیں ہوا تو پھر راویوں کو اس کا علم کیسے ہو گیا۔ روایت کا مرکزی راوی مسلمہ بن محارب ہے جس کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ وہ کون ہے اور اسے۔ عین ممکن ہے کہ یہ بھی اسی باغی تحریک کا رکن رہا ہو اور محض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے لیے اس نے روایت گھڑی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابن اثال عیسائی نے عبد الرحمن کو زہر دیا ہو لیکن اس کا محرک دراصل قیصر روم ہو، جس کا ناطقہ عبد الرحمن نے خشکی اور سمندر دونوں میں بند کر رکھا تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات سے متعلق طبری میں کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ آپ کی وفات کے متعلق یہ کہانی مشہور کی گئی ہے کہ آپ کی اہلیہ جعدہ بنت الاشعث بن قیس نے آپ کو زہر دیا تھا کیونکہ یزید بن معاویہ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ آپ کو زہر دے دیں تو وہ ان سے شادی کر لے گا۔ یہ کہانی طبری، بلاذری، ابن اثیر وغیرہ کسی مورخ نے بیان نہیں کی ہے۔ یہ محض ایک جھوٹ ہے جو باغی تحریک کے راویوں نے گھڑا ہے لیکن اتنی نامعقولیت سے گھڑا ہے کہ تاریخ کی کسی کتاب میں اس کا سراغ نہیں ملتا ہے۔

ابن الاثیر (555-630/1160-1233) نے "اسد الغابہ" میں بغیر کسی سند کے یہ کہانی نقل کی ہے۔

> آپ کی وفات کا سبب یہ ہوا کہ آپ کی بیوی جعدہ بنت الاشعث بن قیس نے آپ کو زہر دیا۔ چالیس دن تک آپ کے نیچے طشت رکھا جاتا جس میں آپ فارغ ہوتے۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ فوت ہو گئے۔ جب آپ کے مرض نے شدت اختیار کر لی تو آپ نے اپنے بھائی حسین رضی اللہ عنہما سے فرمایا: "میرے بھائی! میں نے تین مرتبہ زہر پیا ہے لیکن اس جیسا نہیں پیا۔ اس نے میرا کلیجہ چھلنی کر دیا ہے۔" حسین نے عرض کی: "بھائی جان! آپ کو کس نے زہر دیا؟" فرمایا: "آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اسے قتل کرنا چاہتے ہیں؟ میں اس کے بارے میں اللہ عزوجل سے بات کروں گا۔" [46]

نہ تو ابن اثیر نے اس بات کی سند بیان کی ہے کہ یہ زہر جعدہ ہی نے دیا تھا اور نہ ہی کسی اور نے۔ تاریخ کی کسی کتاب میں یہ ذکر نہیں ملتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جعدہ کو قتل کا ملزم قرار دیا ہو یا پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر الزام دھرا ہو۔ واقعہ کربلا کے موقع پر بھی آپ نے یزید پر کم از کم یہ الزام عائد نہیں کیا کہ اس نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ زہر دلوایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کہانی کا کوئی سر پاؤں نہیں ہے اور جس نے بھی یہ کہانی گھڑی ہے، محض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بغض میں گھڑی ہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اہلیہ پر بھی یہ الزام سراسر جھوٹ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت حسن کے سسر اشعث بن قیس نے جنگ صفین کو ختم کروانے میں بھرپور کردار ادا کیا تھا جس کی پاداش میں باغیوں نے ان کی کردار کشی کی تھی۔ یہی سلسلہ بعد میں ان کی بیٹی اور سیدنا حسن کی اہلیہ کے سلسلے میں بھی جاری رکھی گئی۔

---

[46] ابن اثیر۔ اسد الغابہ۔ باب حسن بن علی رضی اللہ عنہما۔ 6/112۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ (ac. 1 Feb 2012) www.almeshkat.net

خود ابو مخنف کی روایات کے مطابق حضرت حسین اس سانحے کے بعد بھی ہر سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے پاس جاتے رہے اور وہ انہیں عطیات دیتے رہے۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ آپ حضرت معاویہ ہی کو حضرت حسن رضی اللہ عنہما کا قاتل سمجھتے اور پھر بھی ہر سال انہی کے مہمان بنتے؟

حضرات حسنین اور حضرت معاویہ

الحمد للہ، اس معاملے میں باغی راویوں نے کوئی ایسی روایت وضع نہیں کی، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کبھی برا سلوک کیا ہو۔ اس کے برعکس تاریخی روایات حضرت حسن، حسین اور معاویہ رضی اللہ عنہم کے باہمی تعلقات کے روشن رخ سے پر ہیں۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہو گئی تو حضرت حسین، اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے ساتھ ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کی بہت زیادہ تکریم کرتے، انہیں خوش آمدید کہتے اور عطیات دیتے۔ ایک ہی دن میں حضرت معاویہ نے انہیں بیس لاکھ درہم دیے۔[47] ابو مخنف لکھتے ہیں: معاویہ ہر سال حسین رضی اللہ عنہما کو ہر قسم کے تحفوں کے علاوہ دس لاکھ دینار بھیجا کرتے تھے۔[48]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی رقم بطور عطیہ کیوں دی جاتی تھی؟ بعض ناقدین اسے "سیاسی رشوت" قرار دیتے ہیں۔ ہم اللہ تعالی سے اس بات کی پناہ مانگتے ہیں کہ حضرت معاویہ پر سیاسی رشوت دینے اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم پر سیاسی رشوت لینے کی تہمت لگائی جائے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عرب معاشرے میں خاندان کے سائز کی اہمیت غیر معمولی تھی اور اسی سے سماجی رتبے کا تعین ہوتا تھا۔ بچوں کی شادیاں جلد ہو جاتیں جس کی وجہ سے ایک ایک شخص کے پندرہ بیس بچے ہونا معمولی بات ہوتی تھی۔ 35-30 برس کی عمر میں انسان دادا اور نانا بن جاتا تھا۔ عربوں کی جوانی کی عمر بھی طویل ہوتی تھی۔ یہ صورتحال عام تھی کہ 75-70 برس کی عمر کے لوگ جسمانی اعتبار سے اتنے فٹ ہوتے تھے کہ وہ گھوڑوں اور اونٹوں پر دور دراز سفر کر کے جنگوں میں قیادت کرتے۔ ان کے بیٹے پچاس کے پیٹے میں ہوتے، پوتے تیس کے اور پڑپوتے ٹین ایجر ہونے کے دوران ہی صاحب اولاد ہوتے تھے۔ اس طرح سے ایک شخص ہی کی فیملی میں دو اڑھائی سو افراد معمول کی بات تھی۔ خاندان صرف انہی افراد تک محدود نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ ڈھیروں کی تعداد میں غلام اور لونڈیاں بھی ہوتے جن کے ساتھ غلاموں والا نہیں بلکہ فیملی ممبر کا سا سلوک ہوتا۔ انہی غلاموں کو جب آزاد کر دیا جاتا تو ان کا سماجی رتبہ بلند کرنے کے لیے انہیں خاندان کا باقاعدہ حصہ قرار دے دیا جاتا۔ یہ لوگ "موالی (واحد مولی)" کہلاتے تھے۔ اس خاندان کے علاوہ

---

[47] ابن عساکر۔ 59/193

[48] ابو مخنف۔ مقتل الحسین علیہ السلام۔ قم: مطبعہ امیر۔ (www.al-mostafa.com (ac. 16 Feb 2012

معاشرے کے غرباء کی کفالت بھی انہی خاندانی سربراہوں کے ذمہ ہوتی تھی۔ طبقات ابن سعد میں ہر ہر خاندان کے مشہور لوگوں اور ان کے موالی کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

اتنے بڑے خاندان اور دیگر غرباء کی کفالت کے لیے ظاہر ہے کہ بہت بڑی رقم کی ضرورت پڑتی ہو گی۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ سب لوگ فارغ بیٹھ کر اپنے خاندان کے سربراہ پر بوجھ بنتے تھے بلکہ یہ سب اپنی خاندانی جائیداد پر کام کرنے کے علاوہ تجارت کیا کرتے تھے۔ قومی ضروریات جیسے جنگ وغیرہ کی صورت میں خاندان کے سربراہ کا فرض تھا کہ وہ اپنے خاندان کے تندرست لوگوں کو لے کر سرکاری فوج کا حصہ بنے۔ خلفاء راشدین نے دولت کی تقسیم کا طریقہ یہ نکالا تھا کہ سرکاری آمدنی کو خاندان کے سربراہ کو دے دیا جاتا اور وہ پھر اسے اپنے خاندان کے لوگوں میں تقسیم کرتا۔ اس تقسیم میں اگر کسی کو شکایت ہوتی تو وہ براہ راست گورنر یا خلیفہ کو شکایت کر سکتا تھا۔ اس کے لیے ہر خاندان کے سربراہ کے پاس رجسٹر ہوتے تھے جن میں اہل خاندان کا اندراج ہوتا تھا۔ انہی رجسٹروں کی مدد سے "علم الانساب" کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی تقسیم دولت کے اس نظام کو جاری رکھا۔ آپ کے دور میں چونکہ مسلمانوں کی حکومت اس وقت کی معلوم دنیا کے ساٹھ فیصد رقبے پر پھیل گئی تھی، اس وجہ سے یہ دولت بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس دولت کو اکٹھا کرنے میں کسی پر ظلم کیا جاتا تھا۔ اس آمدنی کے بڑے ذرائع دو تھے: جب مسلم افواج نے قیصر و کسری اور دیگر بادشاہوں کے علاقے فتح کیے تو ان لوگوں نے جو دولت کے انبار لگا رکھے تھے، وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ یہ ان ممالک کے سرکاری خزانے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان ممالک کی سرکاری زمینیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ مسلمانوں نے ان ممالک کے باشندوں سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ زمینوں پر کام کریں اور پیداوار کا نصف یا تہائی حصہ بطور خراج سرکاری خزانے میں داخل کریں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ افغانستان سے لے کر مراکش تک کی زمینوں کی آمدنی کتنی ہو گی۔ ہر علاقے کی آمدنی کو اسی علاقے کے لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور اس کا ایک حصہ مرکز کو بھیجا جاتا۔ پھر یہی آمدنی مرکز کے مسلمانوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے بارے میں تو یہ بات معلوم و معروف ہے کہ انہیں جو عطیات ملتے، اس میں سے بہت کم وہ اپنی ذات پر خرچ کرتے اور زیادہ تر رقم عام لوگوں کی ضروریات پر خرچ کرتے تھے۔ ان حضرات نے سیاسی معاملات سے کنارہ کشی کر کے خود کو لوگوں کی دینی تربیت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان علمی خدمات کے انجام دینے کے ساتھ ساتھ جب ضرورت پڑتی تو یہ سیاسی میدان میں بھی اتر آتے۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک بڑی مہم تیار کی جس کا مقصد قیصر روم کے دار الحکومت "قسطنطنیہ" کو فتح کرنا تھا۔ اس مہم کے سربراہ یزید بن معاویہ تھے اور اس لشکر میں حضرت حسین، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر کے ساتھ ساتھ بزرگ صحابی ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ اگرچہ قسطنطنیہ فتح نہ ہو سکا لیکن اس مہم سے قیصر روم پر مسلمانوں کا زبردست رعب بیٹھ گیا۔ دوران محاصرہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور یزید نے ان کا جنازہ پڑھا کر انہیں ان کی وصیت کے مطابق قسطنطنیہ کی فصیل کے باہر دفن کر دیا۔ بعد میں عیسائیوں نے آپ کا مزار تعمیر کر لیا

اور اس پر مرادیں مانگنے لگے۔ یہ مزار آج تک استنبول میں موجود ہے۔

اس تفصیل کو مد نظر رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ تمام صحابہ یک جان کئی قالب تھے۔ ان میں کوئی بغض نہیں پایا جاتا تھا اور سب أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل) کی تصویر تھے۔ غالی راویوں نے بعد میں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے داستانیں گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دیں جس سے یہ لگتا ہے کہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے بس مجبوراً حضرت معاویہ کی بیعت کر لی ورنہ معاذ اللہ ان کے دل ایک دوسرے کے لیے بغض اور کینہ سے بھرے پڑے تھے۔ یہ تصویر ہر گز حسنین کریمین کے شایان شان نہیں ہے۔

یزید کی نامزدگی

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو آخری بڑا اعتراض کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کر کے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا۔ ان پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت حسین، ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کے لائق بیٹوں کے ہوتے ہوئے اپنے نالائق بیٹے کو خلافت کے لیے نامزد کیا۔ اس کے نتیجے میں ایک بار پھر خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت ایسا واقعہ ہے جس کے بارے میں ایک خاص انداز میں سوگ کو رواج دے دیا گیا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی فضا بنا دی گئی ہے کہ جو شخص بھی عقل سے تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسے "دشمن اہل بیت" کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ ایک اور فریق ایسا موجود ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے دفاع میں اس حد تک چلا جاتا ہے کہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مطعون کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ دونوں رویے درست نہیں ہیں۔ جب تک واقعات کو جذباتی رنگ سے دیکھا جائے، ان کی حقیقت درست معلوم نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے جذبات کو ایک طرف رکھ کر ٹھنڈے دل سے تجزیہ کریں اور اچھی طرح تجزیہ کر کے ہی کوئی رائے قائم کریں۔

کیا سانحہ کربلا کی ذمہ داری حضرت معاویہ پر ہے؟

اس بات میں شک نہیں ہے کہ یزید کے دور میں سانحہ کربلا ہوا اور اس کے بعد پہلے مدینہ اور پھر مکہ میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور ان واقعات میں یزید سے فاش غلطیاں سرزد ہوئیں۔ لیکن یہ سب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوا۔ جب کوئی خلیفہ دوسرے کو نامزد کرتا ہے، تو اس وقت وہ اپنے دور کے حالات کے لحاظ سے تجزیہ کرتا ہے اور مستقبل کی صورتحال کا اندازہ کرتے ہوئے فیصلہ کرتا ہے۔ ہم اپنی زندگی میں عام طور پر دیکھتے ہیں کہ ہم پوری نیک نیتی سے کوئی فیصلہ کرتے ہیں مگر بعد کے حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ وہ فیصلہ غلط ثابت ہوتا ہے اور ہمیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ بعد کے کسی غلط واقعے کی بنیاد پر ماضی کے کسی فیصلے کے بارے

میں سبق تو سیکھا جا سکتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ فیصلہ کرتے وقت نیت میں کوئی کھوٹ تھا۔

اس وجہ سے بعد کے واقعات کی بنیاد پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو طعنہ دینا یا آپ پر تہمت لگانا جائز نہیں ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے 56/676 میں جب یہ نامزدگی فرمائی تو اس وقت واقعہ کربلا کو ہونے میں ابھی پانچ برس باقی تھے۔ آپ کو قطعاً یہ امید نہ تھی کہ اس نوعیت کا واقعہ پیش آ جائے گا۔

کیا یزید کی نامزدگی کی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہ نے شروع کی؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یزید کی نامزدگی کی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے شروع کی اور انہوں نے خالصتاً اپنے ذاتی مفاد میں یہ کام کیا تاکہ خلیفہ ان سے خوش ہو جائیں۔ واضح رہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ ان جلیل القدر صحابہ میں ہیں جو بیعت رضوان میں شامل تھے اور ان کے بارے میں اللہ تعالی نے یہ فرما دیا ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنْ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيباً.

"یقیناً اللہ ان اہل ایمان سے راضی ہو چکا ہے جنہوں نے درخت کے نیچے آپ کی بیعت کی تھی۔ وہ اس بات کو جانتا تھا کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ اس نے ان کے دلوں میں سکون نازل کر دیا اور انہیں قریبی فتح (مکہ) تک پہنچا دیا۔" (الفتح 48:18)

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ چونکہ طویل عرصہ تک کوفہ کے گورنر رہے جو کہ باغی تحریک کا مرکز تھا اور آپ نے نہایت حکمت و دانش سے باغی تحریک کو بغیر کسی خون خرابہ کے پنپنے نہ دیا۔ آپ نے باغی تحریک کے خلاف کوئی فوجی کاروائی نہ کی بلکہ نہایت ہی پیار اور محبت سے باغیوں کا ذہن تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ ان کاوشوں کے خاطر خواہ نتائج نکلے اور کثیر تعداد میں باغیوں نے اپنے تحریک کو چھوڑ کر مسلمانوں کے نظم اجتماعی کو قبول کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ باغیوں کو حضرت مغیرہ سے خاص طور پر بغض ہے اور ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ آپ کو نہایت ہی گیا گزرا مفاد پرست سیاستدان ثابت کریں۔ اس بیک گراؤنڈ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ہم اس روایت کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے مطابق آپ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے یزید کی ولی عہدی کی تجویز پیش کی۔ طبری بیان کرتے ہیں:

حدثني الحارث، قال: حدثا علي بن محمد، قال: حدثنا أبو إسماعيل الهمداني وعلي بن مجاهد، قالا: قال الشعبي: اس سال (56/676) میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ولی عہد کیا اور لوگوں سے اس کے لیے بیعت لی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ مغیرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ کے پاس آ کر بڑھاپے کی شکایت کی اور (کوفہ کی گورنری سے) استعفی دے دیا۔ حضرت معاویہ نے استعفی منظور کر لیا اور سعید بن عاص رحمہ اللہ کو اس خدمت پر مقرر کرنا چاہا۔ یہ خبر ابن خنیس کو ملی جو کہ مغیرہ کے سیکرٹری تھے، تو یہ سعید بن عاص کے پاس پہنچے اور انہیں بات بتا دی۔ سعید کے پاس ربیع یا ربیعہ خزاعی بیٹھے تھے، انہوں نے مغیرہ رضی اللہ عنہ سے کہا: "مغیرہ! میں سمجھا ہوں کہ امیر المومنین آپ سے ناراض ہیں۔ میں نے آپ کے سیکرٹری ابن خنیس کو سعید بن عاص کے پاس دیکھا ہے اور وہ کہہ رہے تھے کہ امیر المومنین انہیں کوفہ کا

گورنر مقرر کرنے والے ہیں۔"

مغیرہ نے کہا: "اسے تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ مغیرہ پھر اپنے عہدے پر بڑی قوت سے واپس آنے والے ہیں۔ ٹھہرو! میں یزید کے پاس جاتا ہوں۔" پھر مغیرہ نے یزید کے پاس جا کر بیعت لینے کا ذکر کیا اور یزید نے اپنے والد سے یہ بات کی۔ حضرت معاویہ نے پھر مغیرہ رضی اللہ عنہما ہی کو امارت کوفہ پر واپس بھیجا اور حکم دیا کہ وہ یزید کی بیعت کی کوشش کریں۔[49]

طبری نے اس واقعے کو 56/676 کے باب میں نقل کیا ہے۔ یہی طبری اس سے پہلے 51/671 کے باب میں نقل کرتے ہیں:

41/661 میں مغیرہ (بن شعبہ) کوفہ کے گورنر بنے اور 51/671 میں انہوں نے وفات پائی۔[50]

اس سال 51/671 میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد زیاد بن ابی سفیان کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا جن کے گورنری سنبھالتے ہی حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں نے بغاوت کی اور اس کی پاداش میں قتل کیے گئے۔ اس کی تفصیل کا مطالعہ ہم پہلے کر چکے ہیں اور اس واقعے کے حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اگر 51/671 میں وفات پا چکے تھے تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ 56/676 میں آپ نے استعفی دیا اور پھر استعفی کو واپس کروانے کے لیے یزید کی ولی عہدی کی تحریک شروع کر دی؟ کیا یہ سب کام آپ نے اپنی وفات کے پانچ سال بعد دنیا میں دوبارہ آ کر کیے؟

معترضین کہہ سکتے ہیں کہ طبری نے غلطی سے اس واقعے کو 56/676 کے باب میں نقل کر دیا ہے، دراصل یہ واقعہ آپ کی وفات سے پہلے کہیں 50-51/670-671 میں پیش آیا ہو گا۔ اس بات کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس روایت میں داخلی اور خارجی تضادات موجود ہیں۔ روایت کے مطابق حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے استعفی میڈیکل گراؤنڈز پر دیا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول نہ کیا تھا۔ اگر حضرت معاویہ انہیں معزول کرتے، پھر تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ دوبارہ بحالی کے لیے ایسی کوشش کی جا سکتی ہے۔ خود استعفی دے کر پھر بحالی کی کوشش ایک نامعقول بات ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ کی صحت دوبارہ بہتر ہو گئی تھی، اس وجہ سے انہوں نے اپنی بحالی کی تحریک شروع کی تو یہ بات بھی نامعقول ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ براہ راست حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے درخواست کر لیتے اور ان کی طویل سابقہ خدمات کی وجہ سے حضرت معاویہ بھی انہیں مقرر کر دیتے۔ اس کے لیے یزید کی نامزدگی کی تحریک پیدا کرنے کی حضرت مغیرہ کو کوئی ضرورت نہ تھی۔

نامزدگی کی ضرورت کیا تھی؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو نامزدگی کی ضرورت کیا پیش آئی؟ وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ معاملے کو

[49] طبری۔ 4/1-115

[50] ایضاً۔ 4/1-84

مسلمانوں کے مشورے پر چھوڑ دیں۔ یقیناً آپ ایسا کر سکتے تھے لیکن مسئلہ یہ درپیش تھا کہ کوفہ میں باغی تحریک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی۔ اگرچہ حضرت معاویہ اور زیاد رضی اللہ عنہما نے حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کاروائی کی تھی، جس سے یہ تحریک وقتی طور پر دب گئی تھی، لیکن راکھ میں چنگاریاں موجود تھیں اور آپ کو یہ نظر آ رہا تھا کہ آپ کی وفات کے بعد یہ چنگاریاں دوبارہ آگ کو بھڑکا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو باہمی جنگ و جدال سے بچانے کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام کیا۔ یہ بات درست ہے کہ آپ کا اندازہ صحیح ثابت نہ ہوا اور یہ خانہ جنگی ہو کر رہی لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے امت کی خیر خواہی کے لیے یہ نامزدگی فرمائی۔

نامزدگی کے لیے یزید ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا؟

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نامزدگی ہی کرنا تھی اور اس کا مقصد امت کو جنگ و جدال سے بچانا تھا تو پھر اس کے لیے یزید ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے جن میں جلیل القدر صحابہ بھی تھے، ان لوگوں میں سے کسی کو نامزد کیوں نہ کر دیا گیا؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اس زمانے یعنی 56/676 کی صورتحال کو دیکھنا پڑے گا۔ جیسا کہ سن سے ہی ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو اب 45 برس گزر چکے تھے۔ سب کے سب اکابر صحابہ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی ساتھی تھے، وفات پا چکے تھے۔ صرف ایک حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ زندہ تھے جو کہ نہایت ہی ضعیف العمر ہو چکے تھے۔ حضور کی وفات کے وقت جو صحابہ نوجوان تھے، وہ بھی اب ستر کے پیٹے میں تھے۔ ہاں آپ کی وفات کے موقع پر جو صحابہ بچے تھے، وہ اب پچاس ساٹھ سال کی عمر میں تھے اور ان لوگوں میں ابن عمر، ابن عباس، حسین بن علی اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ اب ہم ان تمام بزرگوں کے حالات کو تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

1۔ سب سے پہلے بزرگ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تھے جو فاروق اعظم کے بیٹے تھے اور ان کی پرورش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوئی تھی۔ آپ کو سیاسی سرگرمیوں سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کی بجائے آپ اپنا زیادہ وقت عبادت اور تعلیم کے میدان میں گزارتے تھے۔ کئی مرتبہ آپ کو خلیفہ بنانے کی تجویز پیش ہوئی تو آپ نے اسے مسترد کر دیا تھا۔

2۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی پبلک ایڈمنسٹریشن کے میدان کے آدمی نہ تھے بلکہ ان کی سرگرمیوں کا میدان علمی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ بصرہ کے گورنر رہ چکے تھے لیکن اب طویل عرصہ سے ایڈمنسٹریٹو معاملات سے دور تھے۔ آپ نے مکہ میں ایک بہترین تعلیمی اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کر رکھا تھا اور یہی پراجیکٹ آپ کی زندگی کا اب مشن بن چکا تھا۔ اس ادارے میں آپ نہایت ذہین و فطین طلباء کو مستقبل میں امت کی فکری قیادت کے لیے تیار کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی ادارے نے وہ جلیل القدر عالم پیدا کیے جو اگلی نسل میں مسلمانوں کے چوٹی کے فکری و مذہبی راہنما بنے۔

3۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ایک نہایت جلیل القدر بزرگ اور عالم تھے۔ آپ ہجرت نبوی کے بعد پیدا ہونے والے پہلے بچے تھے اور خلفاء راشدین اور خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اہم خدمات انجام دے چکے تھے۔ آپ کا معاملہ یہ تھا کہ آپ کا اثر و رسوخ صرف مکہ اور مدینہ تک محدود تھا اور آپ کو پورے عالم اسلام میں وہ اثر و رسوخ حاصل نہ تھا جو کہ خلیفہ کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب آپ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا تو عراق اور شام کے لوگوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی۔

4۔ چوتھے شخص حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما تھے جو کہ منصب خلافت کے لیے نہایت اہل تھے اور عالم اسلام میں آپ کی شخصیت کو مقبولیت حاصل تھی۔ افسوس کہ آپ کے معاملے میں عراق کے باغیوں نے ایک ایسا منصوبہ بنا رکھا تھا کہ جس کے باعث یہ شدید خطرہ لاحق تھا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے جو اس سے پہلے آپ کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر چکے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عراق ایک مشکل صوبہ تھا۔ یہاں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی باغی تحریک کے خلاف کاروائی کی گئی تھی اور اس کے زخم ابھی تازہ تھے۔ باغی زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے اور ان کے سینے حکومت کے خلاف بغض و عناد سے بھرے ہوئے تھے۔ ان باغیوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہمدردی نہیں تھی مگر اپنے اقتدار کے لیے یہ ان حضرات کو بطور سیڑھی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے اپنے پیشرووں کا وہی ماڈل تھا کہ خلیفہ کو کٹھ پتلی بنا کر اس کے پردے میں اپنا اقتدار قائم کیا جائے۔ اس کے لیے ان باغیوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو نظر میں رکھا ہوا تھا اور اس سے پہلے آپ کو کئی مرتبہ ترغیب دلا چکے تھے کہ آپ بغاوت کے لیے اٹھیں تو یہ ان کا ساتھ دیں گے لیکن حضرت حسین نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔ حجر بن عدی کی جو روایت ہم نے اوپر درج کی ہے، اسے یہاں دوبارہ تازہ کر لیجیے:

> (صلح کے بعد) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی ملاقات سب سے پہلے حجر بن عدی سے ہوئی۔ اس نے حضرت حسن کو ان کے اس فعل (صلح) پر شرم دلائی اور دعوت دی کہ وہ (حضرت معاویہ سے) دوبارہ جنگ شروع کریں اور کہا: "اے رسول اللہ کے بیٹے! کاش کہ میں یہ واقعہ دیکھنے سے پہلے مر جاتا۔ آپ نے ہمیں انصاف سے نکال کر ظلم میں مبتلا کر دیا۔ ہم جس حق پر قائم تھے، ہم نے وہ چھوڑ دیا اور جس باطل سے بھاگ رہے تھے، اس میں جا گھسے۔ ہم نے خود ذلت اختیار کر لی اور اس پستی کو قبول کر لیا جو ہمارے لائق نہ تھی۔"
>
> حضرت حسن کو حجر بن عدی کی یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے فرمایا: "میں دیکھتا ہوں کہ لوگ صلح کی طرف مائل ہیں اور جنگ سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ کیوں اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ میں لوگوں پر وہ چیز مسلط کروں جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔ میں نے خاص طور پر اپنے شیعوں کی بقا کے لیے یہ صلح کی ہے۔ میری رائے کہ جنگوں کے اس معاملے کو مرتے دم تک ملتوی کر دیا جائے۔ یقیناً اللہ ہر روز نئی شان میں ہوتا ہے۔"
>
> اب حجر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، اس کے ساتھ عبیدہ بن عمرو بھی تھا۔ یہ دونوں کہنے لگے: "ابو عبد اللہ! آپ نے عزت کے بدلے ذلت خرید لی۔ زیادہ کو چھوڑ کر کم کو قبول کر لیا۔ آج ہماری بات مان لیجیے، پھر عمر بھر نہ مانیے گا۔ حسن کو ان کی صلح پر چھوڑ دیجیے اور کوفہ

وغیرہ کے باشندوں میں سے اپنے شیعہ کو جمع کر لیجیے۔ یہ معاملہ میرے اور میرے ساتھیوں کے سپرد کر دیجیے۔ ہند کے بیٹے (معاویہ) کو ہمارا علم اس وقت ہو گا جب ہم تلواروں کے ذریعے اس کے خلاف جنگ کر رہے ہوں گے۔" حضرت حسین نے جواب دیا: "ہم بیعت کر چکے اور معاہدہ کر چکے۔ اب اسے توڑنے کا کوئی راستہ نہیں۔" [51]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی انٹیلی جنس کا نظام بہت مضبوط تھا اور وہ یقینی طور پر ان باغیوں کے عزائم سے باخبر تھے۔ اگر وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو نامزد کر دیتے تو اس بات کا پورا خطرہ موجود تھا کہ یہ باغی اقتدار پر قابض ہو جائیں گے۔ اہل شام ان کی مخالفت کریں گے اور خانہ جنگی دوبارہ شروع ہو جائے گی۔

اس زمانے کے سیاسی حالات میں ایک اور بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اہل شام اور بنو امیہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی خاندان کی حکومت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ کسی بھی اور خاندان سے اگر خلیفہ بنتا تو اس بات کا غالب امکان موجود تھا کہ شام میں بغاوت ہو جائے گی۔ شام چونکہ قیصر روم کی سرحد پر واقع تھا، اس وجہ سے وہاں کسی بھی خانہ جنگی کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ قیصر ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا اور اس سے پہلے بھی بار بار حملے کر چکا تھا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ سن 64/684 میں یزید کی وفات کے فوراً بعد اہل شام میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ ایک سال تک کسی خلیفہ پر متفق نہ ہو سکے تھے۔ علم عمرانیات کے بانی علامہ ابن خلدون (732-808/1332-1405) جیسے مورخ نے بھی یہی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں:

> حضرت معاویہ نے یزید کو ولی عہد بنایا کیونکہ اگر یزید ولی عہد نہ ہوتا تو مسلمانوں میں پھوٹ پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ کیونکہ بنو امیہ اپنے سوا کسی دوسرے کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی غیر کو ولی عہد بنا دیا جاتا تو وہ اسے مانتے نہیں اور اس طرح اتحاد میں خلل آتا، اگرچہ مقرر شدہ ولی عہد کے بارے میں ولی عہدی سے قبل اچھا ہی گمان ہوتا۔ [52]

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ حضرات حسین، ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم پبلک ایڈمنسٹریشن سے کافی عرصہ سے دور تھے اور انہوں نے اپنی پوری توجہ امت کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ نفس کی طرف وقف کر دی تھی۔ اس وجہ سے انہیں امور حکومت کا تجربہ نہ تھا۔ اس کے برعکس یزید امور حکومت کو انجام دینے میں مسلسل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا تھا اور اس نے تجربہ حاصل کر رکھا تھا۔ موجودہ دور میں بھی اصول یہی ہے کہ تجربہ کار افراد ہی کو ذمہ داری دی جاتی ہے۔ اگر ہمیں مثلاً اپنا مکان ہی بنوانا ہو تو ہم کس سے بنوائیں گے: ایک انتہائی نیک اور افضل بزرگ سے جنہیں مکان بنوانے کا تجربہ نہ ہو یا پھر ایک ایسا انجینئر جو کہ تعمیرات کا ماہر ہو، اگرچہ وہ فضیلت اور بزرگی میں ان بزرگ کے مقام پر نہ ہو۔

یہی وہ فیکٹرز تھے جن کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو نامزد کیا۔ ہم ایک بار پھر واضح کر دیں کہ اس وقت نہ تو سانحہ

[51] الاخبار الطوال۔ ص 233-234

[52] ابن خلدون (732-808/1332-1406)، مقدمہ (اردو ترجمہ: راغب رحمانی)۔ 338۔ کراچی: نفیس اکیڈمی۔

کربلا ہوا تھا اور نہ ہی بعد کی خانہ جنگیاں سامنے آئی تھیں۔ ہمارے ہاں لوگ صورتحال کا تجزیہ کرتے وقت سانحہ کربلا کی وجہ سے جذباتی ہو جاتے ہیں لیکن 56/676 میں سانحہ کربلا کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ آیا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پورے خلوص نیت کے ساتھ اپنے زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے بہترین فیصلہ کیا اور سوائے دو حضرات کے امت مسلمہ کی غالب اکثریت، جس میں صحابہ کرام بھی تھے، نے آپ کے اس فیصلے کو قبول کیا۔ بعد میں حالات بدل گئے اور یہ فیصلہ درست ثابت نہ ہوا لیکن اس معاملے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعنہ زنی ایک نہایت ہی غلط حرکت ہے۔

واضح رہے کہ اس تفصیل کے بیان کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم یزید کے غلط اقدامات کی حمایت کرنا چاہتے ہیں۔ یزید نے اپنے دور میں جو کچھ کیا، اس کا وہ ذمہ دار ہے۔ یہاں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شوری کے اصول کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ امت کے اتفاق واتحاد کے لیے یہ اقدام کیا اور اس اقدام کی امت کی غالب اکثریت نے تائید کی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جن حضرات نے اختلاف رائے کیا، انہوں نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نیت پر کسی شک کا اظہار نہیں کیا بلکہ محض اپنا اختلاف بیان کیا۔ چودہ سو سال بعد اب اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ حضرت معاویہ اور ان تمام بزرگوں کے دل میں جھانک کر دیکھ سکتا ہے اور آپ کی نیت سے آگاہ ہو سکتا ہے، تو پھر یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ جو چاہے رائے قائم کرے لیکن اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اپنی اس رائے کے لیے اسے روز قیامت اللہ تعالی کے ہاں جواب دہ ہونا پڑے گا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی نامزدگی کے بعد جمعہ کے خطبے میں منبر پر جو دعا کی، اس سے ان کے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے:

> اے اللہ! اگر آپ کے علم میں ہے کہ میں نے اسے (یزید) کو اس لیے نامزد کیا ہے کہ وہ میری رائے میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو اس کے لیے پورا فرما دیجیے۔ اور اگر میں نے اس لیے اس کو محض اس لیے ولی عہد بنایا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرمایے۔[53]

> اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس کی اہلیت دیکھ کر ولی عہد بنایا ہے تو اسے اس مقام تک پہنچا دیجیے جس کی میں نے اس کے لیے امید کی ہے اور اس کی مدد فرما۔ اگر مجھے اس کام پر صرف اس کی محبت نے آمادہ کیا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے تو اس کے مقام خلافت تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی روح قبض فرما لیجیے۔[54]

غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ جس باپ کے دل میں چور ہو، کیا وہ عین نماز جمعہ میں اپنے بیٹے کے لیے یہ دعا کر سکتا ہے؟

کیا یزید کے انتخاب کے لیے مشورہ کیا گیا؟

باغی راویوں نے یزید کی نامزدگی کی تصویر کچھ یوں پیش کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یزید کو نامزد کرنے کا خیال

---

[53] ابن کثیر۔ 11/308

[54] جلال الدین سیوطی۔ تاریخ الخلفاء۔ 164۔ باب یزید بن معاویہ۔ بیروت: دار ابن حزم۔

آیا اور انہوں نے آمرانہ انداز میں اسے نافذ کر دیا حالانکہ حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی۔ عربوں کے ہاں دور جاہلیت میں بھی اس طرح کی آمریت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ ان کے ہاں قبائلی سرداروں کا انتخاب بھی باہمی مشورے سے ہوتا تھا۔ اسلام نے اس معاملے کو مزید موکد کیا اور قرآن مجید میں یہ حکم دیا کہ مسلمانوں کے اجتماعی امور باہمی مشورے سے چلائے جائیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے صورتحال یہ تھی کہ تمام عرب قبائل نے متفقہ طور پر قریش کو خلافت کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ قریش میں ان مہاجرین وانصار کو الیکٹورل کالج کی حیثیت حاصل تھی جو غزوہ بدر سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ یہی حضرات باہمی مشورے سے خلیفہ کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ ان صحابہ کو یہ خاص حیثیت دینے کی وجہ یہ تھی کہ یہ اس وقت اسلام میں داخل ہوئے تھے جب مسلمانوں کو عرب میں کوئی خاص سیاسی مقام حاصل نہ تھا اور یہ مشرکین کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ اس وجہ سے ان حضرات کے خلوص نیت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کوئی شخص بھی ایسے نظریے کے لیے عذاب نہیں جھیل سکتا ہے جس پر وہ یقین نہ رکھتا ہو۔ ان حضرات کو قرآن مجید میں "السابقون الاولون" کا نام دیا گیا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی انہی مہاجرین وانصار نے متفقہ طور پر کیا۔ انہی کے مشورے سے حضرت ابو بکر نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو خلیفہ نامزد کیا۔ پھر یہی السابقون الاولون اس بات پر متفق ہوئے کہ چھ افراد میں سے ایک کو خلیفہ بنایا جائے اور ان حضرات نے اپنے اندر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا۔ اس کے بعد انہی السابقون الاولون نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا اور آپ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ اس کے بعد انہی مسلمانوں نے باہمی اتفاق رائے سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ اس طرح سے خلیفہ کے انتخاب کے لیے اگرچہ مختلف طریقے اختیار کیے گئے لیکن بنیادی اصول یہی رہا کہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان پر کسی کو مسلط نہ کیا جائے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں 56/676 تک کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ السابقون الاولون کی بڑی تعداد وفات پا چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ جنگ بدر 2/624 میں ہوئی تھی اور اب اسے گزرے 54 برس ہو چکے تھے۔ اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ بدلے ہوئے حالات میں اب مناسب یہ رہے گا کہ مشورے کے اس عمل کو بڑے پیمانے پر کیا جائے۔ اس میں یہ وجہ بھی رہی ہو گی کہ اب معاملہ چونکہ آپ کے اپنے بیٹے کا تھا، اس وجہ سے آپ محض چند لوگوں کی رائے پر یہ فیصلہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ معروف شیعہ مورخ مسعودی کے بیان کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک بڑا جرگہ منعقد کیا، جس میں پوری امت کے نمائندے شریک ہوئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی تجویز پیش کی اور سب لوگوں کو آزادانہ رائے دینے کا حق دیا۔ اس اجتماع میں اہل عراق بھی آئے اور ان میں سے بعض لوگوں نے حضرت معاویہ کی تجویز کی مخالفت بھی کی تاہم غالب اکثریت نے یزید کے انتخاب کے حق میں فیصلہ دے دیا۔[55]

[55] علی بن حسین بن علی المسعودی (d. 346/958)۔ مروج الذہب ومعادن الجوہر۔ 2/27۔ بیروت: الشرکۃ العالمیہ للکتاب۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے امت کو افتراق و انتشار سے بچانے کے لیے مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔ اس سفر میں آپ نے اہل مدینہ اور پھر اہل مکہ سے بھرپور مشورہ لیا اور ان کی رائے معلوم کی۔ سوائے چند ایک حضرات کے پوری امت نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور پھر آپ نے مکہ مکرمہ میں یزید کی نامزدگی کا اعلان کیا۔ اس کے بعد پورے عالم اسلام سے وفود آئے اور انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی تائید کی۔ اس پورے عمل میں صرف چار حضرات نے اختلاف رائے کیا اور وہ حضرت حسین، ابن عباس، ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔ ان میں سے بھی دو حضرات ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے یزید کی بیعت کر لی تھی اور آخر تک اس پر قائم رہے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی بعد میں بیعت کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ صرف ایک ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے بیعت نہیں کی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوائے چند ایک افراد کے، اس دور کی پارلیمنٹ کی غالب ترین اکثریت نے یزید کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا جن میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (d. 58/678) جیسے جلیل القدر بزرگ شامل تھے جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے آخری شخص تھے۔[56]

اس واقعے کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں خود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس طرح روایت کیا ہے:

ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: میں (اپنی بہن ام المومنین سیدہ) حفصہ کے گھر گیا تو ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا: "کیا آپ ان لوگوں کی باتیں دیکھ رہی ہیں کہ (مشورے کے) اس معاملے میں میری کوئی حیثیت نہیں سمجھی گئی۔" انہوں نے فرمایا: "آپ وہاں (مسجد میں) جا کر بیٹھیں۔ یہ لوگ آپ کے انتظار ہی میں ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ آپ کے رک جانے سے کہیں کوئی اختلاف نہ پیدا ہو جائے۔" وہ انہیں اس وقت تک بار بار کہتی رہیں جب تک وہ چلے نہ گئے۔

(مشورے کے بعد) جب عام لوگ چلے گئے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا: "اب کوئی صاحب اس معاملے میں بولنا چاہیں تو سر اٹھا کر بات کریں۔ (عام لوگوں کی رائے سے ظاہر ہو گیا ہے کہ) ہم ان سے اور ان کے والد دونوں سے اس امر (خلافت) کے زیادہ حق دار ہیں۔" حبیب بن مسلمہ نے (ابن عمر سے) پوچھا: "پھر آپ نے ان کی اس بات کا جواب بھی دیا؟" انہوں نے کہا: "میں چاہتا تھا کہ انہیں جواب میں کہوں کہ اس معاملے میں میں آپ اور آپ کے والد سے زیادہ مستحق ہوں جو اسلام کی خاطر آپ لوگوں سے جنگ کر چکا ہے۔ لیکن میں اس وجہ سے رک گیا کہ کہیں اجتماعیت میں اختلاف نہ پڑ جائے اور خانہ جنگی نہ ہو جائے۔ میں جنت کے ثواب پر قناعت کر گیا۔" حبیب نے کہا: "آپ نے خود کو فساد سے بچا لیا۔"[57]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ بات معلوم و معروف ہے کہ آپ نے کبھی خلافت کی تمنا نہ کی تھی۔ مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آپ کے دل میں کچھ تردد پیدا ہوا تھا لیکن آپ نے امت مسلمہ کی مصلحت کی خاطر اپنی

[56] ابن عبد البر۔ الاستیعاب۔ 1/367۔ صحابی نمبر 962۔

[57] بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3882

خواہش کو دبا دیا۔ اس سے آپ کے کردار کی عظمت کا علم ہوتا ہے۔ آپ کے دل میں جو یہ خیال پیدا ہوا کہ " میں آپ اور آپ کے والد سے زیادہ مستحق ہوں جو اسلام کی خاطر آپ لوگوں سے جنگ کر چکا ہے" تو یہ محض جذبات میں سوچی گئی ایک بات ہی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو کبھی مسلمانوں کے خلاف کفار کی جانب سے کسی ایک بھی جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے البتہ ان کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ ضرور شریک ہوئے تھے لیکن انہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا تھا۔

کیا یزید کی بیعت کے لیے ناجائز ہتھکنڈے اختیار کیے گئے؟

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے مورخین کو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی نامزدگی کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر مشورے کا اہتمام کیا لیکن انہوں نے اس مشورے کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے ایسی روایات وضع کی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو آمادہ کرنے کے لیے انہیں لالچ دیا گیا تھا اور بعض حضرات بالخصوص حضرات ابن زبیر اور حسین رضی اللہ عنہم پر جبر کیا گیا تھا۔ مناسب ہو گا کہ ہم ان میں سے ایک ایک روایت کو لے کر اس کا تجزیہ کریں اور یہ دیکھیں کہ ان کی سند میں کون کون سے لوگ موجود ہیں۔ پہلے دو ابواب میں روایات کے تجزیہ کے جو اصول بیان ہوئے ہیں، مناسب رہے گا کہ ان کے خلاصے پر آپ دوبارہ ایک نظر ڈال لیجیے۔ طبری نے اس سلسلے میں دو روایتیں بیان کی ہیں:

1- فحدثني يعقوب بن إبراهيم، قال: حدثنا إسماعيل بن إبراهيم، قال: حدثنا ابن عون، قال: حدثني **رجل بنخلة:** حضرت معاویہ مدینہ آئے اور آکر حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم کو بلا بھیجا اور ان سے فرمایا: "میرے بھائی کے بیٹے! قریش میں سے پانچ افراد کے علاوہ سب لوگ بیعت پر آمادہ ہیں اور آپ ان پانچ میں مرکزی شخص آپ ہیں۔ اس اختلاف رائے کا سبب کیا ہے؟ حسین نے فرمایا: "کیا میں ان میں سے مرکزی شخص ہوں۔" معاویہ نے فرمایا: "جی ہاں! آپ ان کے قائد ہیں۔" حسین نے فرمایا: "ان لوگوں کو بلا لیجیے۔ اگر وہ بیعت کر لیں گے تو میں بھی ان کے ساتھ ہوں ورنہ میرے معاملے میں جلدی نہ کیجیے۔" معاویہ نے پوچھا: "کیا آپ ایسا کرنے کو تیار ہیں؟" انہوں نے کہا: "جی ہاں۔" یہ سن کر حضرت معاویہ نے ان سے وعدہ لیا کہ کسی سے ان باتوں کا ذکر نہ کریں۔ حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے پہلے تو انکار کیا لیکن پھر قبول کر لیا اور باہر نکل آئے۔

ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے انتظار میں بٹھا رکھا تھا۔ اس نے پوچھنا شروع کیا کہ آپ کے بھائی ابن زبیر پوچھ رہے ہیں کہ کیا معاملہ ہے۔ (آپ نے حسب وعدہ بات نہ کی لیکن) آخر وہ کچھ مطلب سمجھ گیا۔ اب حضرت معاویہ نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو بلا بھیجا اور ان سے فرمایا: "پانچ افراد کے علاوہ جن میں آپ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، سب لوگ اس معاملے میں آمادہ ہیں۔ اختلاف رائے کا سبب کیا ہے؟" ابن زبیر نے فرمایا: "کیا میں ان میں سے مرکزی شخص ہوں؟" معاویہ نے فرمایا: "جی ہاں! آپ ان کے قائد ہیں۔" ابن زبیر نے فرمایا: "ان لوگوں کو بلا لیجیے۔ اگر وہ بیعت کر لیں گے تو میں بھی ان کے ساتھ ہوں ورنہ میرے معاملے میں جلدی نہ کیجیے۔" معاویہ نے پوچھا: "کیا آپ ایسا کرنے کو تیار ہیں؟" انہوں نے کہا: "جی ہاں۔" یہ سن کر حضرت معاویہ نے ان سے وعدہ لیا کہ کسی سے ان باتوں کا ذکر نہ کریں۔ ابن زبیر نے کہا: "امیر المومنین! ہم لوگ اللہ عزوجل کے حرم میں ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالی کے نام پر وعدہ کرنا بڑا معاملہ ہے۔

انہوں نے وعدہ کرنے سے انکار کیا اور باہر چلے گئے۔

اب حضرت معاویہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہم کو بلا بھیجا اور ان کے ساتھ نرمی سے بات کی اور فرمایا: "میں نہیں چاہتا کہ امت محمدیہ کو اپنے بعد ایسے چھوڑ جاؤں کہ جیسے بغیر چرواہے کے بھیڑوں کا گلہ۔ قریش میں پانچ افراد کے سوا، جن میں آپ نمایاں ہیں، سب لوگ اس امر (یزید کی بیعت) پر آمادہ ہیں۔ اختلاف رائے کا سبب کیا ہے؟" ابن عمر نے فرمایا: "میں ایسی بات کیوں نہ کروں جس میں نہ تو کوئی برائی ہے اور نہ خونریزی اور آپ کا کام بھی ہو جائے گا۔" حضرت معاویہ نے فرمایا: "میں یہی چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہا: "آپ اپنی کرسی باہر نکال کر بیٹھیے۔ میں یہ کہہ کر آپ سے بیعت کر لوں گا کہ آپ کے بعد جس بات پر مسلمان متفق ہوں گے، میں بھی اسی اتفاق میں داخل ہو جاؤں گا۔ واللہ! آپ کے بعد اگر کسی حبشی غلام پر بھی قوم متفق ہو تو میں بھی اس اتفاق رائے میں داخل ہوں گا۔" انہوں نے پوچھا: "کیا آپ ایسا ہی کریں گے؟" جواب دیا: "جی ہاں۔" ابن عمر یہ کہہ کر باہر نکل آئے اور گھر پر آکر دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ لوگ ملنے آئے تو انہیں اجازت نہ دی۔

اب حضرت معاویہ نے عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور پوچھا: "ابو بکر کے بیٹے! کس ہاتھ اور کس پاؤں سے آپ مجھ سے اختلاف کر رہے ہیں؟" انہوں نے کہا: "میں سمجھتا ہوں کہ میرے حق میں یہی بہتر ہے۔" فرمایا: "میں ارادہ کر چکا ہوں کہ آپ کو قتل کروں گا۔" فرمایا: "آپ ایسا کریں گے تو اللہ دنیا میں بھی آپ پر لعنت بھیجے گا اور آخرت میں بھی آپ کو جہنم میں ڈالے گا۔"

طبری کہتے ہیں کہ اس روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر نہیں ہے۔[58]

اس روایت کی سند میں غور کیجیے تو اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے: یعقوب بن ابراہیم نے ہم سے روایت بیان کی، ان سے اسماعیل بن ابراہیم نے، ان سے ابن عون نے اور ان سے "نخلہ" کے مقام پر ایک شخص نے۔ اب یہ نخلہ کا ایک شخص کون تھا، ہم نہیں جانتے۔ کیا وہ باغی پارٹی کا رکن تھا جسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے خاص بغض تھا یا کوئی بڑا ہی دیانتدار مومن تھا؟ ہم نہیں جانتے۔

روایت کو وضع کرنے والے نے ایک بڑی فاش غلطی کی ہے جس کا اسے خود اندازہ نہیں ہے۔ اس نے اس روایت میں حضرت معاویہ اور عبدالرحمن ابن ابی بکر رضی اللہ عنہم کا مکالمہ بھی نقل کر دیا ہے جو کہ 56/676 میں ہو رہا ہے حالانکہ حضرت عبدالرحمن اس واقعے سے تین برس پہلے 53/673 میں وفات پا چکے تھے۔ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ ان کی وفات 53/673 میں ہوئی اور ایک قول یہ ہے کہ 55/675 میں ہوئی تاہم اکثریت پہلی رائے پر متفق ہے۔[59]

اس سلسلے کی دوسری روایت یہ ہے:

ذکر **هشام بن محمد**، عن **أبي مخنف**، قال: حدثني عبد الملك بن نوفل بن مساحق بن عبد الله بن مخرمة: پھر سن 60/680 شروع ہوا۔۔۔اس سال عبیداللہ بن زیاد چند سفیروں کو ساتھ لیے حضرت معاویہ کے پاس آیا اور حضرت معاویہ نے ان لوگوں سے اپنے بیٹے یزید

[58] طبری۔ 4/1-116 to 118

[59] ابن عبدالبر۔ الاستیعاب۔ 1/497۔ صحابی نمبر 1393

کے لیے بیعت لی۔ اسی سال انہیں مرض الموت لاحق ہوا تو یزید کو بلا بھیجا اور فرمایا: "بیٹا! میں نے تمہیں زحمت اور مشقت سے بچا لیا ہے اور تمہارے لیے ہر معاملے کو آسان کر دیا ہے۔ تمہارے لیے عرب کی گردنوں کو میں نے جھکا دیا ہے اور تمہارے لیے جو کچھ جمع کیا ہے، وہ کسی نے نہ کیا ہو گا۔ مجھے اس بات کا اندیشہ نہیں ہے کہ امر خلافت جو تمہارے لیے مستحکم ہو چکا ہے، قریش میں سے چار افراد کے سوا کوئی اور تم سے اس بارے میں اختلاف کرے گا: حسین بن علی، عبد اللہ بن عمرو، عبد اللہ بن زبیر اور عبد الرحمن بن ابی بکر۔

1۔ ان میں سے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا تو عبادت نے ستیاناس کر دیا ہے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا تو وہ بھی تمہاری بیعت کر لیں گے۔

2۔ حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو عراق کے لوگ جب تک بغاوت پر آمادہ نہ کر لیں، نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ تمہارے خلاف بغاوت کریں اور تم ان پر قابو پا لو، **تو ان سے درگزر کرنا۔ انہیں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہماری) قریبی رشتہ داری حاصل ہے اور وہ بڑا حق رکھتے ہیں۔**

3۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے وہ ہیں جو اپنے ساتھیوں کو جو کام کرتا دیکھیں، ویسا ہی خود کرتے ہیں۔ انہیں خواتین اور کھیل تماشوں کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔

4۔ جو شخص شیر کی طرح تمہاری گھات میں بیٹھے گا اور لومڑی کی طرح تمہیں دھوکہ دے گا اور جب موقع ملے حملہ کرے گا، وہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما۔ اگر ایسی حرکتیں وہ تمہارے ساتھ کریں اور تم ان پر قابو پا لو تو ان کے ٹکڑے کر دینا۔[60]

اس روایت کی سند دیکھیے تو اس میں وہی ہشام کلبی اور ابو مخنف موجود ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کے متعلق دل میں ایسا بغض رکھتے ہیں کہ جس کی مثالیں اس پوری کتاب میں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ حضرات ابو بکر، عمر اور زبیر رضی اللہ عنہم کے بیٹوں کے لیے الفاظ کا جو انتخاب کیا گیا ہے، وہ راویوں کی ان سے نفرت کو ظاہر کر رہا ہے جسے انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے کہلوانے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ہشام کلبی اور ابو مخنف بھی حضرت حسین کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی محبت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ وہ اس بیعت کے واقعے سے تین برس پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔

ابن اثیر (555-630/1160-1233) نے "الکامل" میں ایک جھوٹا قصہ نقل کیا ہے جس کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یزید کی خلافت کا اعلان کیا تو ان چاروں حضرات کے پیچھے ایک ایک تلوار بردار کو کھڑا کر دیا تھا اور اسے حکم تھا کہ اگر یہ حضرات چون وچرا کریں تو ان کی گردن اڑا دی جائے۔[61] انہوں نے اس بے سروپا قصے کی کوئی سند بیان نہیں کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ من گھڑت ہے۔ دوسری طرف اس قصے میں صرف حضرت معاویہ ہی کی نہیں بلکہ حضرات حسین، ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ

[60] طبری۔ 4/1-129

[61] ابن اثیر۔ الکامل فی التاریخ۔ 3/354۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ (16 Jan 2012) www.waqfeya.com

عنہم کی کردار کشی بھی ہے کہ یہ حضرات نعوذ باللہ اتنی ہمت نہ کر سکے کہ اپنی جان کا خطرہ مول لے کر امت کو غاصبوں سے بچا سکیں۔

اسی طرح ابن اثیر نے چند اور جھوٹے قصے نقل کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے معاذ اللہ لوگوں کو رشوت دے کر یزید کی بیعت پر تیار کیا تھا۔[62] انہوں نے رشوت کی جو رقم بیان کی ہے، وہ بھی مضحکہ خیز ہے۔ کسی کو تیس ہزار درہم، کسی کو چار سو دینار، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ایک لاکھ درہم اور اسی نوعیت کی دیگر رقموں کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ان قصوں کی بھی کوئی سند بھی ابن اثیر بیان نہیں کی جس سے ظاہر ہو کہ انہوں نے یہ بات کس سے سن کر اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ ابن اثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں بیان کیا ہے انہوں نے تاریخ طبری کو اپنی کتاب کی بنیاد بنایا ہے لیکن خود طبری نے ان قصوں کو درج نہیں کیا ہے۔

ابن اثیر کا زمانہ ان تمام واقعات کے چھ سو سال بعد کا ہے۔ ان سے پہلے کے مورخین ان واقعات کا کہیں ذکر نہیں کرتے ہیں اور وہ نجانے کہاں سے یہ واقعات اپنی کتاب میں درج کر دیتے ہیں۔ اگر ان واقعات کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نہ تو اس دور کے اہل سیاست، ہمارے دور کے سیاستدانوں سے کچھ مختلف تھے اور نہ ہی اس دور کے عام لوگ، جن میں صحابہ و تابعین شامل تھے، کردار کے اعتبار سے ہمارے ووٹروں سے کچھ بڑھ کر تھے کہ جنہیں محض دس دس ہزار درہم (جو اس دور میں کوئی خاص وقت نہ رکھتے تھے) رشوت دے کر خریدا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسلام اپنی پہلی صدی ہی میں ناکام ہو گیا کہ اس کے ماننے والوں کی اکثریت کا کردار یہ تھا۔

یزید کا کردار کیسا تھا؟

غالی راویوں بالخصوص ابو مخنف اور ہشام کلبی نے بھی یزید کے خلاف زبردست پراپیگنڈا کیا اور اسے شرابی، بدکار اور ہم جنس پرست ظاہر کیا۔[63] سانحہ کربلا کی وجہ سے چونکہ لوگوں میں یزید کے خلاف شدید نفرت پھیل گئی، اس وجہ سے ان کے پراپیگنڈے کو قبول عام حاصل ہوا اور لوگوں نے بالعموم ان روایات کو اس طرح تسلیم کر لیا کہ گویا یہ سچ ہے۔ حالانکہ اگر نامزدگی کے وقت یزید کا کردار ویسا ہی ہوتا جیسا کہ ان روایات میں بیان کیا گیا ہے تو پھر اس کی مخالفت کرنے والے صرف دو افراد نہ ہوتے بلکہ صحابہ کرام اور تابعین کی کثیر تعداد اس کی بیعت سے انکار کر دیتی۔ پھر تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کو نامزد کرنے کے ارادے کا اظہار ہی کرتے اور مشرق و مغرب میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی۔ جو صحابہ کرام، حضرت معاویہ کی پبلک ایڈمنسٹریشن کا حصہ تھے، وہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ دیگر شہروں سے بھی نیک لوگ دمشق آ پہنچتے اور حضرت معاویہ کو مجبور کرتے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا بلکہ دو افراد کے سوا سبھی نے اس فیصلے کو تسلیم کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یزید کے کردار میں کچھ ایسا مسئلہ نہ تھا۔ اگر بالفرض بعد

---

[62] ایضاً 3/350۔

[63] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 5/299۔ باب امر یزید بن معاویہ۔

میں اس کے کردار میں کچھ مسئلہ پیدا ہوا ہو تو اس کی ذمہ داری حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر عائد نہیں ہوتی ہے۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے بھی جب یزید کی بیعت سے انکار کیا تو انہوں نے اس کے کردار کی کسی خامی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ حضرت حسین تو ہر سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے مہمان بنتے تھے اور وہ انہیں بہت سے تحائف اور عطیات دے کر رخصت کرتے تھے۔ حضرت حسین کے فرسٹ کزن عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیٹی کی شادی یزید سے کر رکھی تھی جو کہ نہایت ہی متقی و پرہیز گار خاتون تھیں۔ اس اعتبار سے یزید حضرت حسین کی بھتیجی کا شوہر تھا۔[64] حضرت حسین اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آپ یزید کے کردار سے ناواقف رہے ہوں گے۔ آگے چل کر ہم بیان کریں گے کہ سانحہ کربلا سے کچھ دیر پہلے آپ اس بات پر تیار بھی ہو گئے تھے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیں۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خیال میں یزید کا کردار ایسا ہی گیا گزرا ہوتا تو کیا آپ اس کی بیعت کے لیے تیار ہو جاتے؟

یہاں ہم ایک مرتبہ پھر واضح کرتے چلیں کہ یزید نے اپنے دور حکومت میں جو غلط کام کیے یا اس سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں، ہم ہرگز ان کی حمایت نہیں کرتے۔ اس موقع پر ہم یزید کے کردار سے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ اس فیصلے کی وضاحت کی جائے جو اس زمانے کے تمام جلیل القدر صحابہ و تابعین نے یزید کی بیعت کر کے کیا۔ اگر ولی عہدی کی بیعت کے وقت یزید کا کردار ویسا ہی ہوتا، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو پھر نہ صرف حضرت حسین و ابن زبیر، بلکہ تمام کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اس کی مخالفت کرتے۔ اس کے برعکس کتب تاریخ میں ایسی متعدد روایات ملتی ہیں، جن میں جلیل القدر صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کی جانب سے یزید کا ذکر مثبت انداز میں ملتا ہے۔ یہاں ہم چند روایتیں پیش کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جن کے بارے میں باغی راویوں وغیرہ نے یہ افسانہ مشہور کر دیا ہے کہ انہوں نے یزید کی نامزدگی پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا، کی رائے اس کے بارے میں کیا تھی؟

> المدائني عن عبد الرحمن بن معاوية قال، قال عامر بن مسعود الجمحي: عامر بن مسعود جمحی کہتے ہیں کہ ہم لوگ مکہ میں تھے جب ڈاک کے ذریعے معاویہ کی وفات کی اطلاع ہمیں ملی۔ ہم اٹھ کر ابن عباس کے پاس چلے گئے اور وہ بھی مکہ ہی میں تھے۔ ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اور دستر خوان بچھ چکا تھا مگر ابھی کھانا نہیں آیا تھا۔ ہم نے ان سے کہا: "ابو عباس! ڈاک کے ذریعے معاویہ کی وفات کی اطلاع آئی ہے۔" ابن عباس کافی دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا: "یا اللہ! معاویہ کے لیے اپنی رحمت وسیع فرما دیجیے۔ واللہ! وہ اپنے سے پہلے (خلفاء) کی طرح تو نہیں تھے لیکن ان کے بعد ان جیسا بھی نہیں آئے گا۔ بلاشبہ ان کا بیٹا یزید ان کے صالح اہل خانہ میں سے ہے۔ لہٰذا آپ لوگ اپنی اپنی جگہ اطمینان رکھیے اور اس کی اطاعت اور بیعت کر لیجیے۔ اے بیٹے! کھانا لے آؤ۔" راوی کہتے ہیں کہ ہم وہیں پر تھے کہ خالد بن عاص، جو اس وقت مکہ کے گورنر تھے، کا قاصد آیا اور انہیں بیعت کی دعوت دی۔ ابن عباس نے کہا: "آپ جا کر ان سے کہیے: "جو لوگ اس وقت آپ کے پاس ہیں، ان

[64] ابن حزم۔ جمہرۃ الانساب۔ 69۔ قاہرہ: دار المعارف

سے اپنا معاملہ نمٹا لیجیے۔ شام کو میں آپ کے ہاں آؤں گا۔" قاصد (چلا گیا) اور پھر پلٹ کر آیا اور کہنے لگا: "آپ کا وہاں پر موجود ہونا بہت ضروری ہے۔" پھر آپ چلے گئے اور بیعت کر لی۔[65]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، جن کے بارے میں بھی باغی راویوں وغیرہ نے یہ بات مشہور کر دی ہے کہ انہوں نے یزید کی نامزدگی پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا، کی رائے اس کے بارے میں کیا تھی؟

نافع بیان کرتے ہیں کہ جب اہل مدینہ (کے بعض لوگوں نے) یزید بن معاویہ کے خلاف بغاوت کی تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے ساتھیوں اور اولاد کو جمع کر کے فرمایا: "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ 'قیامت کے دن ہر معاہدہ توڑنے والے کے لیے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔' ہم لوگ اللہ اور رسول کے نام پر اس شخص (یزید) کی بیعت کر چکے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اللہ اور رسول کے نام پر کی گئی بیعت کو توڑنے اور بغاوت کرنے سے بڑھ کر کوئی معاہدے کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے۔ ہر ایسا شخص جو اس بیعت سے الگ ہو جائے اور اس معاملے (بغاوت) کا تابع ہو جائے، تو اس کے اور میرے درمیان علیحدگی ہے۔[66]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یزید کے کردار میں پھر کیا ایسی خامی تھی، جس کے باعث بعض حضرات نے اس کے بارے میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں طبری نے یہ روایت نقل کی ہے:

حدثني الحارث، قال: حدثنا علي، عن مسلمة: معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد بن ابی سفیان کو خط لکھ کر اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ زیاد نے عبید بن کعب نمیری کو بلا کر کہا: "مشورہ امانت دار سے لینا چاہیے۔ لوگوں کو دو عادتوں نے خراب کر رکھا ہے۔ راز فاش کرنا اور نااہلوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا۔ وہی شخص راز کو راز رکھ سکتا ہے جو یا تو دین دار ہو اور آخرت اس کی ترجیح ہو یا پھر ایسا شریف النفس دنیادار ہو جسے اپنی عزت بچانے کی عقل ہو۔ میں نے یہ دونوں وصف آپ میں دیکھے ہیں اور مجھے پسند آئے ہیں۔ اس وقت میں نے آپ کو ایسی بات کے لیے لکھا ہے کہ یزید کے لیے بیعت لینے کا جو ارادہ امیر المومنین نے کیا ہے، اس میں وہ مجھ سے مشورہ طلب کر رہے ہیں۔ اسلام کا تعلق اور ذمہ داری بہت بڑی چیز ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ **یزید کی طبیعت میں کاہلی اور سہل پسندی بہت ہے۔ پھر وہ سیر اور شکار کا شوقین ہے۔** میں چاہتا ہوں کہ آپ میری طرف سے امیر المومنین کے پاس جائیں اور یزید کے جو مسائل میں نے بیان کیے ہیں، ان سے بیان کر دیجیے اور کہیے کہ ابھی تامل کیجیے۔ آپ جو چاہتے ہیں، یہ بات ہو کر رہے گی۔ جلدی نہ کیجیے۔ جس تاخیر میں بہتری ہو، وہ اس جلدی سے بہتر ہے جس میں ہدف کے حاصل نہ ہونے کا اندیشہ ہو۔"

عبید نے کہا: "آپ کے خیال میں کیا اور کوئی طریقہ نہیں ہے؟" زیاد نے کہا: "اور کیا طریقہ سے کیا مراد ہے؟" عبید نے کہا: "حضرت معاویہ کی رائے پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے بیٹے کی طرف سے انہیں نفرت دلانا مناسب نہیں ہے۔ میں انہیں بتائے بغیر یزید سے ملاقات

[65] بلاذری۔ 5/302

[66] بخاری، کتاب الفتن، حدیث 6694

کروں گا اور آپ کا پیغام دوں گا کہ امیر المومنین نے تمہاری بیعت کے لیے مجھ سے مشورہ کیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری بعض عادات سے لوگ بیزار ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری بیعت میں وہ مخالفت کریں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ جن باتوں کو لوگ پسند نہیں کرتے، وہ سب باتیں ترک کر دو۔ اس سے امیر المومنین کی بات بھی پوری ہو جائے گی اور آپ بھی جو چاہتے ہیں (کہ یزید کی اصلاح ہو،) وہ کام بھی آسانی سے ہو جائے گا۔ اس طرح آپ یزید سے بھی خیر خواہی کریں گے اور امیر المومنین بھی راضی رہیں گے۔ امت اسلام کی ذمہ داری کے بارے میں بھی آپ کو جو خدشہ ہے، اسے سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔"

زیاد نے کہا: "یہ تو بڑا تیر بہدف نسخہ ہے۔ اب خیر وبرکت کے ساتھ آپ روانہ ہو جایئے۔ اگر (یزید کی) اصلاح ہو جائے تو اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے۔ اگر کچھ غلط بھی ہو گیا تو اس فعل میں کوئی خطرہ نہیں۔ اللہ نے چاہا تو وہ ہمیں غلطی سے بھی محفوظ رکھے گا۔" عبید نے کہا: "آپ اپنی رائے سے جو یہ بات کہتے ہیں، باقی اللہ کو جو منظور، وہ تو غیب میں ہے۔"

عبید یزید کے پاس پہنچے اور اس سے بات کی۔ زیاد نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو انتظار کے لیے لکھا اور جلدی سے منع کیا۔ حضرت معاویہ نے ان کی بات مان لی۔ **یزید نے بھی اکثر افعال کو ترک کر دیا۔**

زیاد جب فوت ہو گئے تو حضرت معاویہ نے ایک تحریر نکالی اور لوگوں کے سامنے پڑھی۔ اس میں یزید کو جانشین کرنے کا مضمون تھا کہ اگر معاویہ فوت ہو گئے تو یزید ولی عہد ہو گا۔ **یہ سن کر پانچ افراد کے سوا سب لوگ یزید کی بیعت پر تیار ہو گئے۔** پانچ افراد حسین بن علی، ابن عمر، ابن زبیر، عبد الرحمن بن ابی بکر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے بیعت نہیں کی۔[67]

سند کے اعتبار سے یہ روایت بھی کمزور ہے کیونکہ یہ مسلمہ بن محارب کا بیان ہے اور ان کے حالات کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ہیں کہ وہ کس درجے میں قابل اعتماد تھے۔ البتہ اس روایت سے یہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یزید کی طبیعت میں کچھ کاہلی اور تن آسانی پائی جاتی تھی۔ وہ سیر و تفریح اور شکار کا شوقین تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ چیزیں اخلاقی برائی کے زمرے میں نہیں آتیں تاہم خلیفہ وقت کا جو منصب تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان خامیوں پر قابو پایا جائے۔ روایت کے مطابق یزید نے ان خامیوں پر قابو پا لیا۔

دوسری طرف روایات کا ایک ایسا گروپ ہے، جس کے مطابق یزید شراب، بدکاری اور ہم جنس پرستی کا شوقین تھا اور نمازیں ترک کر دیتا تھا۔ ان روایات کی یا تو سند ہی نہیں ملتی یا پھر اگر ملتی ہے تو اس میں بھی وہی ہشام کلبی اور ابو مخنف نظر آتے ہیں۔ تاریخی تجزیہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کے معاملے میں متعصب ہو، اس کی اس شخص کے بارے میں بات کو قبول نہ کیا جائے۔

شراب اور بدکاری جیسے جرائم دو طرح ہی انجام دیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو کھلے عام اور دوسرے چھپ کر۔ اگر یزید یہ افعال کھلے عام انجام دیتا تو صحابہ کرام بشمول سعد بن ابی وقاص، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کبھی اس کی بیعت نہ کرتے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ چھپ کر یہ افعال کرتا تھا۔ ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان راویوں کو کیسے علم ہوا کہ وہ چھپ کر یہ کام

---

[67] طبری۔ 4/1-116

کرتا تھا؟ کیا یہ راوی خود بھی اس کے شریک مجلس رہے تھے یا یزید نے خود آکر ان کے سامنے اپنی بدکاریوں کا اعتراف کیا تھا؟ یہی وہ جواب ہے جو حضرت علی کے تیسرے بیٹے اور حسین رضی اللہ عنہما کے چھوٹے بھائی محمد بن علی رحمہ اللہ، جو کہ اپنی والدہ کی نسبت سے ابن حنفیہ کے نام سے مشہور ہیں، نے ان معترضین کو دیا تھا جب وہ یزید کے خلاف بغاوت کے لیے انہیں تیار کرنے گئے تھے۔ انہوں نے کہا:

"ہمارے ساتھ نکلیے کہ ہم یزید سے جنگ کریں۔" محمد بن علی نے ان سے کہا: "کس بات پر میں اس سے جنگ کروں اور اسے منصب خلافت سے ہٹاؤں؟" وہ بولے: "وہ کفر اور فسق و فجور میں مبتلا ہے، شراب پیتا ہے اور دین کے معاملے میں سرکشی کرتا ہے۔"

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "کیا آپ لوگ اللہ سے نہیں ڈرتے۔ کیا آپ میں سے کسی نے اسے ایسا کرتے دیکھا ہے جو آپ ذکر کر رہے ہیں۔ میں اس کے پاس رہا ہوں اور میں نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔" وہ کہنے لگے: "اس نے آپ کو اپنے اعمال کی خبر نہ ہونے دی ہو گی۔" محمد بن علی نے فرمایا: "تو کیا اس نے آپ لوگوں کو خبر کر کے یہ برائیاں کی ہیں؟ اس صورت میں تو آپ بھی اس کے ساتھی رہے ہوں گے۔ اگر اس نے آپ کو نہیں بتایا تو پھر تو آپ لوگ بغیر علم کے گواہی دینے چل پڑے ہیں۔"[68]

ہمارے ہاں جب یزید کی مذمت کی جاتی ہے تو لوگوں کے سامنے سانحہ کربلا، سانحہ حرہ اور مکہ مکرمہ پر حملے کے واقعات ہوتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ تقریباً پچھلے چودہ سو برس سے یزید کے خلاف جو کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے، وہ ہوتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یزید کو نامزد کیا تو اس وقت نہ تو سانحہ کربلا ہوا تھا اور نہ ہی اور سانحات وجود میں آئے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سانحات وجود میں آ جائیں گے۔ اس وجہ سے حضرت معاویہ پر الزام تراشی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

حضرت حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے اختلاف کیوں کیا؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یزید کا کردار اگر برا نہ تھا، تو پھر حضرت حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے اس کی نامزدگی میں اختلاف کیوں کیا اور اس کے حکومت سنبھالنے کے بعد اس کی بیعت میں پس و پیش کیوں کیا؟ اس سوال کے جواب میں بعض حضرات ان دونوں بزرگوں سے بدگمانی کرتے ہیں اور نعوذ باللہ انہیں بغاوت کا مجرم سمجھتے ہیں۔ ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ حضرت حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم کے بارے میں بدگمانی کریں۔

ان دونوں کے معاملے کی تفصیل انشاء اللہ ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔ یہاں مختصراً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ ان دونوں حضرات نے اگر یزید کی نامزدگی کے سلسلے میں اختلاف رائے کیا تو انہیں اس کا حق حاصل تھا۔ ہر انسان کو اپنی رائے کا حق حاصل ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں کہ انسان کوئی بھی رائے رکھے۔ برائی اس وقت ہوتی ہے جب انسان محض اپنی انا اور اقتدار کے لیے فتنہ و

[68] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 3/471۔ باب محمد بن حنفیہ

فساد برپا کرے۔ ان دونوں حضرات نے ایسا کوئی فتنہ و فساد برپا نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ ان دونوں حضرات نے دیانتداری سے یہ رائے قائم کی ہو کہ باپ کے بعد بیٹے کا خلیفہ بننا مناسب عمل نہیں ہے اور انہیں یہ خطرہ محسوس ہوا ہو کہ ان حضرات کے اس عمل کے نتیجے میں مستقبل میں کہیں ملوکیت کی راہیں ہموار نہ ہو جائیں۔ اس وجہ سے انہوں نے اس باب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کے اقتدار سنبھالتے ہی عراق، بالخصوص کوفہ میں انارکی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اہل کوفہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یزید کی نامزدگی کے معاملے میں اتفاق کر لیا تھا۔ اب انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھ کر اپنے پاس بلانا شروع کیا اور آپ وہاں تشریف لے گئے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی ایسے عزم کا اظہار نہیں فرمایا کہ آپ حکومت کے خلاف بغاوت کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس آپ کو جب اطلاع ملی کہ اہل کوفہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹ گئے ہیں تو آپ نے یزید کی بیعت کر لینے کا ارادہ فرمایا۔ اس کے بعد وہ سانحہ پیش آیا جس میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے یزید کی بیعت نہیں کی لیکن انہوں نے اس کی زندگی کے دوران اپنی خلافت کا دعوی بھی نہیں کیا۔ جب انہیں یزید کی وفات کی اطلاع ملی تو اس وقت سرکاری فوج کے کمانڈر حصین بن نمیر نے انہیں خلافت کی پیشکش کی اور انہوں نے اس کے بعد اسے قبول کر لیا۔ یہ تفصیلات ہم انشاء اللہ اگلے باب میں بیان کریں گے۔

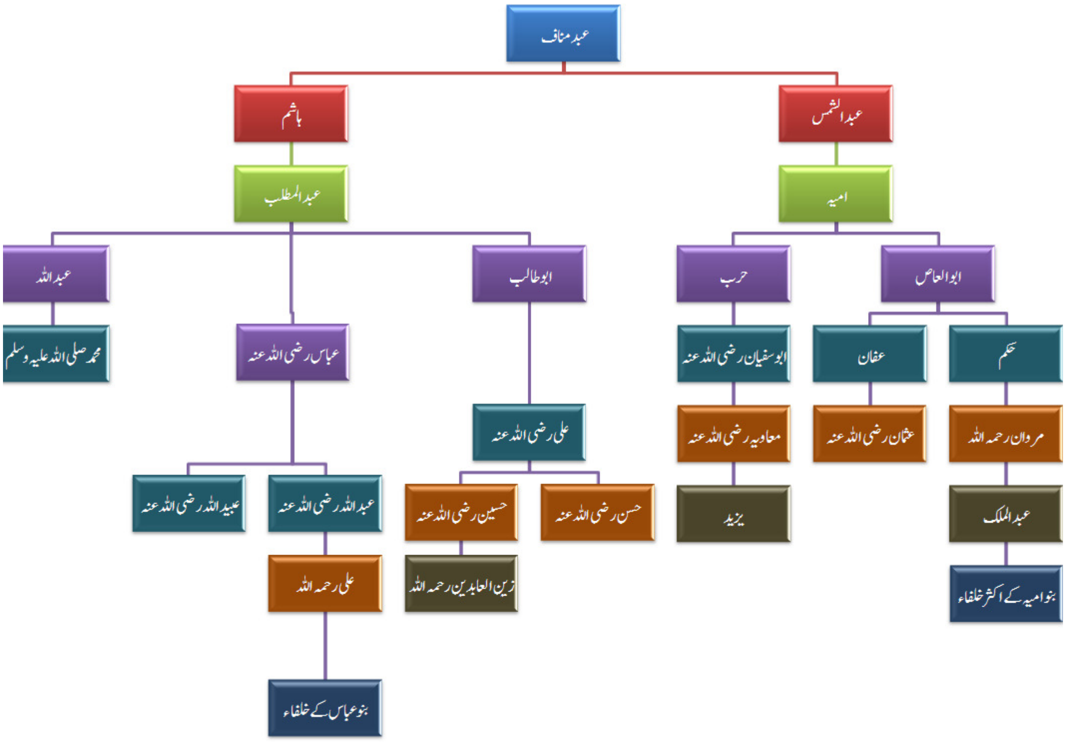
حضرت معاویہ، بنو امیہ اور خلافت و ملوکیت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے دل میں بنو ہاشم کے خلاف بغض موجود تھا، اس وجہ سے انہوں نے بنو ہاشم کو دبا کر ان کی جگہ بنو امیہ کے اقتدار کو مضبوط کیا۔ اس طرح سے خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ اس سیکشن میں ہم انہی اعتراضات کا جائزہ لیں گے۔

کیا بنو امیہ اور بنو ہاشم میں دشمنی تھی؟

اس الزام کا جواب دینے سے پہلے مناسب ہو گا کہ ہم بنو امیہ اور بنو ہاشم کے باہمی تعلقات کا جائزہ پیش کر دیں۔ امیہ اور ہاشم دونوں کوئی غیر نہیں بلکہ چچا بھتیجے تھے اور ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے باہمی رشتوں کا چارٹ ڈایاگرام میں دیا گیا ہے۔ اس چارٹ سے ظاہر ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے سبھی لوگ ایک دوسرے کے کزن تھے۔ اس چارٹ میں جو لوگ ایک ہی کزن گروپ سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں ایک ہی رنگ کے باکس میں دکھایا گیا ہے۔ عربوں میں جلد شادیوں کی وجہ سے یہ کیفیت ہو جاتی تھی کہ کبھی چچا بھتیجا ہم عمر ہوتے تھے اور کبھی بھتیجا چچا سے زیادہ عمر کا ہوا کرتا تھا۔ اس وجہ سے ہم نے ایک ایج گروپ کے لوگوں کو ایک ہی لائن میں

دکھایا ہے۔ چارٹ سے واضح ہے کہ حضرات عثمان، علی اور معاویہ رضی اللہ عنہم سبھی ایک دوسرے کے کزن تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ کسی کا رشتہ قریب کا تھا اور کسی کا دور کا لیکن ان رشتوں کو مزید قربت اس طرح ملی کہ ان حضرات نے آپس میں ایک دوسرے کی اولادوں سے اپنی بیٹیوں کے رشتے کیے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔



دور جاہلیت کی یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ہاشم اور امیہ میں سرداری کے مسئلے پر کچھ چپقلش تھی جو ان کی اولادوں کو منتقل ہوئی۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ سب حضرات جاہلیت میں بھی خود کو ایک خاندان سمجھتے تھے اور اس کے لیے "بنو عبد مناف" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی جو کہ ہاشم کے والد اور امیہ کے دادا تھے۔ بعد میں اسلام نے تو ان سب کو یک جان کئی قالب بنا دیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو سفیان اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما قبول اسلام سے پہلے اور بعد میں ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے اور حضرت عباس ہی کی تلقین پر اسلام لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت دی تو بالکل شروع کے سالوں میں اس دعوت پر بنو ہاشم کے ساتھ ساتھ بنو امیہ کے سعید الفطرت لوگ بھی ایمان لائے۔ بنو امیہ کے السابقون الاولون صحابہ میں حضرت عثمان، ام حبیبہ، خالد بن سعید، عمرو بن سعید رضی اللہ عنہم کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بہت سے حضرات نے حبشہ ہجرت کی۔ اگر بنو امیہ اور بنو ہاشم میں دشمنی ہوتی تو بنو امیہ کے اتنے لوگ ایک ہاشمی پیغمبر پر ایمان نہ لاتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مکی زندگی میں قریش کی لیڈر شپ کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں بنو مخزوم کے ابو جہل اور ولید بن مغیرہ نمایاں تھے۔ بنو ہاشم میں ابو لہب، جو رسول اللہ کا سگا چچا تھا، آپ کی دعوت کا شدید مخالف تھا۔ اس کے برعکس

ہمیں بنو امیہ میں ایسا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ ابو سفیان، جنہیں اسلام مخالف ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے، نے مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کوئی اذیت نہ پہنچائی۔ اس زمانے میں ان کے گھر میں اسلام داخل ہو چکا تھا اور ان کی جلیل القدر بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اسلام لا چکی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات راستے میں ہوئی۔ اس وقت آپ پیدل تھے جبکہ ابوسفیان، ان کی اہلیہ ہندہ اور بیٹے معاویہ سوار تھے۔ ابوسفیان نے معاویہ کو حکم دیا کہ وہ اتر کر پیدل چلیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ سوار ہو کر چلیں۔ اس دوران حضور نے اپنی دعوت ان کے سامنے پیش کی جسے انہوں نے سنجیدگی سے سنا۔

ابوسفیان کی جانب سے اسلام کی مخالفت پہلی بار ہجرت کے تین سال بعد غزوہ احد کے موقع پر سامنے آتی ہے۔ اس میں وہ قریش کے لشکر کے سردار تھے۔ پھر غزوہ خندق میں انہوں نے اس متحدہ لشکر کی قیادت کی جو مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو ابوسفیان کے دل کی دنیا بدل گئی اور ان کی جانب سے مخالفت ختم ہو گئی۔ فتح مکہ کے موقع پر انہوں نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد مخلص مسلمان رہے۔

اس کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو عہدے دیے، وہ زیادہ تر بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کا گورنر بھی ایک اموی نوجوان حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو نجران اور ان کے بیٹے یزید کو تیماء کا گورنر مقرر فرمایا۔ حضرات ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما، جو ان دونوں خانوادوں سے ہٹ کر بالترتیب بنو تیم اور بنو عدی (قریش کے دیگر خاندان) سے تعلق رکھتے تھے، نے بھی بنو امیہ کے لوگوں کو زیادہ عہدے دیے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ان اموی صحابہ پر کامل اعتماد موجود تھا۔ بنو امیہ کو زیادہ عہدے دینے کی وجہ یہی تھی کہ ان کے خاندان میں ایڈمنسٹریشن کا ٹیلنٹ پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 130 برس تک عالم اسلام پر بہترین انداز میں حکومت کی اور کوئی فتنہ و فساد نہ پھیلنے دیا۔ پھر جب بنو عباس نے ان کی حکومت کا خاتمہ کیا تو اسپین میں یہی بنو امیہ مزید 300 سال تک حکومت کرتے رہے۔

بنو امیہ اور بنو ہاشم میں باہمی محبت کا سب سے بڑا ثبوت بنو امیہ کے دور کے اوائل میں بنو ہاشم کا طرز عمل ہے:

- حضرت علی (ہاشمی) حضرت عثمان (اموی) کے دست راست رہے اور باغیوں کے خلاف ان کا بھرپور ساتھ دیا۔
- حضرت حسن (ہاشمی) حضرت معاویہ (اموی) کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ تمام بنو ہاشم نے ان کی بیعت کی۔
- حضرت عبداللہ بن عباس (ہاشمی) نے عبدالملک بن مروان (اموی) کی بیعت کی اور اس پر اپنے آخری دم تک قائم رہے۔
- حضرت زین العابدین (ہاشمی) نے پانچ اموی خلفاء یزید، مروان، عبدالملک، ولید اور سلیمان کا زمانہ پایا اور ان سب کے ساتھ ان کے بہترین تعلقات رہے۔ یہی طرز عمل ان کے بیٹوں اور پوتوں میں منتقل ہوا جن میں حضرت محمد باقر اور جعفر صادق

رحمہم اللہ نمایاں ہیں۔

- بنو امیہ اور بنو ہاشم کے درمیان شادی بیاہ بھی ہوتے رہے۔ حضرت معاویہ کی دو بہنوں کا نکاح بنو ہاشم میں ہوا جبکہ حضرت علی کی دو بیٹیاں بنو امیہ میں بیاہی گئیں۔

اس طرح سے پہلی صدی ہجری میں ہمیں بنو امیہ اور بنو ہاشم میں کسی چپقلش کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ ان دونوں خاندانوں کے بعض افراد (سب نہیں) میں دشمنی کا آغاز درحقیقت دوسری صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے کچھ پڑپوتوں بلکہ لکڑ پوتوں نے بنو امیہ کو ہٹا کر ان کی جگہ برسر اقتدار آنا چاہا۔ یہ لوگ حضرت عباس اور علی رضی اللہ عنہما کی نسل میں پانچ چھ پشتوں کے بعد آتے ہیں۔ ان میں سے عباسی، علویوں کی نسبت زیادہ کامیاب رہے اور انہوں نے امویوں کا تختہ الٹ دیا۔ عباسیوں نے پہلے علویوں کو ساتھ ملایا اور بغاوت کر دی۔ اس کے بعد علویوں کو حکومت میں حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس زمانے میں بھی حضرت عباس اور علی رضی اللہ عنہما کی اولاد کا ایک بڑا حصہ باہمی تنازعوں سے دور رہا۔ ان میں حضرت محمد باقر اور جعفر الصادق رحمہا اللہ نمایاں تھے۔ ظاہر ہے کہ اس پوری سیاست کی کوئی ذمہ داری حضرت عباس، علی اور معاویہ رضی اللہ عنہم پر عائد نہیں ہوتی ہے کہ یہ حضرات تو ان واقعات سے ستر اسی برس پہلے انتقال فرما چکے تھے۔

غالی مورخین ابو مخنف اور ہشام کلبی نے بنو امیہ اور بنو ہاشم کے اختلافات کو بھی بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے حالانکہ خود انہی کی روایتیں اس کی تردید کرتی ہیں۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

1۔ غالی راویوں کے مطابق حضرت ابو بکر کی بیعت کے موقع پر حضرت ابو سفیان (بنو امیہ) نے حضرت علی (بنو ہاشم) کو خلافت کا دعوی کرنے کی ترغیب دی تھی تو حضرت علی نے انہیں اس سے سختی سے منع کر دیا تھا۔

2۔ حضرت عثمان (بنو امیہ) سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کو خلیفہ نہ بنایا جائے تو آپ کی رائے کس کے حق میں ہو گی؟ انہوں نے جواب دیا: علی (بنو ہاشم) کے حق میں۔ اسی طرح حضرت علی (بنو ہاشم) سے یہی سوال کیا گیا کہ اگر آپ کو خلیفہ نہ بنایا جائے تو آپ کی رائے کس کے حق میں ہو گی؟ انہوں نے جواب دیا: عثمان (بنو امیہ) کے حق میں۔

4۔ حضرت حسن (بنو ہاشم) حضرت معاویہ (بنو امیہ) کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے۔ حضرت معاویہ اپنے پورے دور خلافت میں حضرات حسن و حسین کے ساتھ بہترین سلوک کرتے رہے۔

5۔ اموی افواج جب حضرت زین العابدین کی جاگیر کے پاس سے گزریں تو انہوں نے انہیں چارہ پانی فراہم کیا۔[69] رضی اللہ عنہم۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بنو امیہ کے بارے میں کیا رائے تھی، ملاحظہ فرمایئے:

---

[69] طبری۔ 4/1-268

أخبرنا عبد الرزاق، قال أخبرنا معمر بن أيوب عن ابن سيرين: ابن سیرین کہتے ہیں کہ ایک شخص نے علی سے پوچھا: "مجھے قریش کے بارے میں بتائیے؟" فرمایا: "ہم میں سب سے زیادہ صاحب عقل اور صاحب تحمل، ہمارے بھائی بنو امیہ ہیں اور بنو ہاشم جنگ کے وقت سب سے بہادر ہیں اور جو ان کی ملکیت ہو، اس میں سب سے زیادہ سخی ہیں۔ قریش کا پھول بنو مغیرہ ہیں جس سے ہم خوشبو حاصل کرتے ہیں۔[70]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ اور بنو ہاشم کے مابین عہد صحابہ میں کوئی اختلافات نہ تھے۔ ممکن ہے کہ ان خاندانوں کے بعض لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف مسابقت کا جذبہ پایا جاتا ہو لیکن صحابہ کے جلیل القدر بزرگوں کے اندر ایسی کوئی بات نہ تھی۔ ہاں بنو امیہ کے دور کے آخر میں (دوسری صدی ہجری کا آغاز) بنو ہاشم میں ان کے خلاف رد عمل ضرور پیدا ہوا۔ اس کے اسباب بھی مذہبی سے زیادہ سیاسی تھے۔ لیکن یہ سب بھی بہت بعد میں ہوا۔ عہد صحابہ میں تو بنو امیہ اور بنو ہاشم، یک جان دو قالب تھے۔ دونوں خاندانوں کے سعید الفطرت لوگوں نے بالکل اوائل میں اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلام کی خاطر مصیبتیں جھیلی تھیں۔

کیا حضرت معاویہ نے غزوہ بدر کا انتقام جنگ صفین کی صورت میں لیا؟

بعض لوگوں نے حضرت معاویہ پر یہ عجیب بے بنیاد تہمت عائد کی ہے کہ غزوہ بدر میں حضرت حمزہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے نانا عتبہ بن ربیعہ، کو قتل کیا تھا جبکہ ان کے ماموں ولید کو حضرت علی رضی اللہ عنہ قتل کیا تھا۔ ان کی والدہ ہندہ رضی اللہ عنہا نے جنگ احد کے موقع پر اپنے والد کا انتقام حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کروا کر لیا اور ان کا کلیجہ چبایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے انتقام کو انہوں نے دل میں چھپائے رکھا اور اپنے بیٹے معاویہ میں منتقل کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہ نے ان سے جنگ کی اور ان کے بعد ان کے بیٹے یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کروا کر کے اس انتقام کی تکمیل کر دی۔

اس الزام کی کمزوری اسی بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں کبھی بھی یہ الزام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر عائد نہیں کیا۔ اگر ان حضرات میں ایسی کوئی دشمنی ہوتی تو یہ خود تو ظاہر کرتے۔ اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چشم دید گواہ حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے کبھی اس رنگ میں نہ لیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جنگ صفین اور سانحہ کربلا کے بعد بھی حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے خاندانوں میں آپس میں شادی بیاہ ہوتے رہے۔ اگر ان حضرات میں ایسی کوئی دشمنی ہوتی تو پھر یہ خاندان آپس میں رشتے داریاں کیسے کرتے؟ کیا آج کے دور میں بھی کوئی اپنے مستقل دشمنوں کے گھروں میں شادی بیاہ کر سکتا ہے؟

یہ روایت ابن کثیر نے نقل کی ہے جس کے مطابق جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک یزید کے سامنے لایا گیا تو اس نے ایسے اشعار پڑھے جن کے مطابق سانحہ کربلا کو غزوہ بدر کا بدلہ قرار دیا۔ ابن کثیر نے اسی مقام پر اس روایت کی سند بھی دی ہے اور یہ بھی بتا

[70] عبد الرزاق۔ المصنف۔ روایت نمبر 9768، 5/451۔ بیروت: مکتب اسلامی

دیا ہے کہ اس روایت کا ماخذ کیا ہے۔ انہوں نے یہ سند بیان کی ہے: قال **محمد بن حميد الرازي، وهو شيعي**، ثنا محمد بن يحيي الأحمري، ثنا ليث، عن مجاهد۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ روایت محمد حمید الرازی کی ایجاد کردہ ہے جنہیں بنو امیہ سے خاص بغض تھا۔[71]

کیا حضرت معاویہ نے بنو امیہ کا اقتدار مضبوط کیا؟

بہت سے مورخین بنو امیہ کے اقتدار کا زمانہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے شروع کر کے آخری اموی بادشاہ مروان الحمار پر ختم کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر بنو امیہ کی حکومت محض اس کا نام ہے کہ کوئی اموی خلیفہ تھا، تو یہ سلسلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت معاویہ پر بعض لوگوں نے یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ انہوں نے بنو امیہ کی حکومت کو مضبوط کیا۔ اس کا جواب دینے کے لیے مناسب ہو گا کہ ہم حضرت معاویہ کے دور کے اہم عہدے داروں کی ایک فہرست تیار کر کے دیکھ لیں کہ ان میں سے کتنے لوگ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے:

نمبر شمار	عہدے دار[72]	علاقہ	قبیلہ[73]
1.	مغیرہ بن شعبہ	گورنر کوفہ	بنو ثقیف
2.	زیاد بن ابی سفیان	گورنر بصرہ اور پھر گورنر کوفہ، ایران و خراسان	بنو امیہ
3.	ضحاک بن قیس فہری	مرکزی پولیس چیف	بنو فہر
4.	عبد الرحمن بن خالد بن ولید	گورنر شمالی شام	بنو مخزوم
5.	بسر بن ابی ارطاۃ	کمانڈر فوج	بنو عامر
6.	عبد اللہ بن عامر	گورنر بصرہ	بنو امیہ
7.	حکم بن عمرو	گورنر خراسان	بنو غفار
8.	عمرو بن عاص	کمانڈر انچیف اور گورنر مصر	بنو مخزوم
9.	عبد اللہ بن عمرو بن عاص	گورنر مصر	بنو مخزوم
10.	مروان بن حکم	گورنر مدینہ	بنو امیہ

[71] ابن کثیر 11/558

[72] طبری۔ 4/1-28 to 129۔

[73] قبیلے کی تفصیلات زیادہ تر ذہبی کی سیر الاعلام النبلاء سے لی گئی ہیں۔

نمبر شمار	عہدے دار[72]	علاقہ	قبیلہ[73]
.11	سعید بن عثمان بن عفان	گورنر خراسان	بنو امیہ
.12	عمرو بن سعید بن عاص	گورنر مکہ	بنو امیہ
.13	ولید بن عتبہ بن ابی سفیان	گورنر مدینہ	بنو امیہ
.14	نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم	گورنر کوفہ	خزرج، انصار
.15	عبید اللہ بن زیاد	گورنر کوفہ	بنو امیہ
.16	فضالہ بن عبید	چیف جسٹس	اوس، انصار
.17	ابو ادریس الخولانی	چیف جسٹس	خولان
.18	قیس بن حمزہ	مرکزی پولیس چیف	نامعلوم قبیلہ
.19	زمل بن عمرو العذری	مرکزی پولیس چیف	العذرۃ
.20	سرجون بن منصور الرومی	سیکرٹری	غیر عرب، رومی

ان کلیدی عہدے داروں میں آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ کتنے لوگ بنو امیہ کے ہیں۔ ان میں سے بھی جو لوگ بنو امیہ کے ہیں، ان میں سے اکثر پہلے خلفاء کے دور میں گورنر رہ چکے تھے اور انہوں نے ٹھیک میرٹ پر یہ مقام حاصل کیا تھا۔ ان میں سب سے نمایاں زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما ہیں جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی گورنر رہ چکے تھے۔

کیا حضرت معاویہ کے زمانے میں خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی؟

یہ جملہ زبان زد عام ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں میں پہلے "سلطان" تھے اور آپ سے پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر خلافت راشدہ ختم ہو گئی تھی۔ مناسب رہے گا کہ اس موقع پر پہلے ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور اقتدار کا موازنہ آپ سے پہلے کے خلفائے راشدین اور بعد کے غیر معیاری سلاطین کے طرز عمل سے کر لیں۔ واضح رہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد بھی بہت سے اچھے سلاطین گزرے ہیں، جن کا دور خلافت راشدہ کے آئیڈیل کے بہت قریب ہے۔ ان کی بجائے ہم موازنہ ان سلاطین سے کر رہے ہیں، جن کے طرز عمل کو بہت معیاری نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی کی بدولت ہمیں حضرت معاویہ کے دور اقتدار کے صحیح مقام کا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ تفصیل ہم ذیل کے چارٹ میں بیان کر رہے ہیں۔ اس چارٹ کی تیاری میں ہم نے ابو مخنف وغیرہ کی روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے دیگر غیر جانبدار تاریخی روایات اور احادیث کو معیار بنایا ہے۔ ورنہ ابو مخنف، ہشام کلبی، واقدی اور سیف بن عمر کی روایات کو لیا جائے

تو پھر حضرت معاویہ تو کیا، حضرات ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کو بھی خلیفہ راشد کہنا مشکل ہے۔ یہاں ہم نے جن خصوصیات کو اس تقابل کی بنیاد بنایا ہے، مسلمانوں ان پر سوائے ایک آدھ کے بالعموم متفق ہیں۔

نمبر	خصوصیت	خلفائے اربعہ	حضرت معاویہ	بعد کے غیر معیاری سلاطین
1	قانون کی بنیاد	قرآن و سنت	قرآن و سنت	قرآن و سنت
2	حکومتی فیصلوں کی بنیاد	باہمی مشورہ	باہمی مشورہ	حکمران طبقے کا مفاد
3	دولت کی تقسیم	پورے معاشرے میں دولت تقسیم کی گئی	پورے معاشرے میں دولت تقسیم کی گئی	چند ہاتھوں میں ارتکاز مگر غرباء کو پھر بھی بہت کچھ مل جاتا تھا
4	آزادی اظہار	مکمل اجازت	مکمل اجازت	حکومت پر تنقید پر پابندیاں
5	نماز کا نظام	خلیفہ اور گورنر خود امامت کرتے تھے	خلیفہ اور گورنر خود امامت کرتے تھے	حکومت کے مقرر کردہ ائمہ امامت کرتے تھے
6	زکوۃ کا نظام	امراء سے لے کر غرباء میں تقسیم	امراء سے لے کر غرباء میں تقسیم	امراء سے لے کر غرباء میں تقسیم
7	انسانی جان، مال اور آبرو کا تحفظ	مکمل تحفظ	مکمل تحفظ	عام لوگوں کو مکمل تحفظ مگر حکمران کبھی معمولی باتوں پر قتل کر دیتے
8	معاہدوں کا احترام	مکمل احترام	مکمل احترام	اکثر احترام اور کبھی خلاف ورزی
9	اخلاقیات کی حیثیت	سیاست، اخلاقیات کے تابع تھی	سیاست، اخلاقیات کے تابع تھی	اخلاقیات، سیاست کے تابع تھی
10	امر بالمعروف و نہی عن المنکر	حکومتی سطح پر اہتمام	حکومتی سطح پر اہتمام	حکومتی سطح پر اہتمام مگر کبھی خلاف ورزی ہو جاتی تھی
11	تقرری کی بنیاد	میرٹ	میرٹ	اقرباء پروری
12	حکمران طبقے کا اخلاقی کردار	نہایت بلند	نہایت بلند	پست

نمبر	خصوصیت	خلفائے اربعہ	حضرت معاویہ	بعد کے غیر معیاری سلاطین
13	عدل و انصاف اور ظلم سے پرہیز	اولین ترجیح	اولین ترجیح	سیاست کے تابع
14	مساوات	ہر شہری برابر ہے	ہر شہری برابر ہے	حکمران طبقہ عوام سے افضل ہے
15	جواب دہی (Accountability)	حکومت جوابدہ ہے	حکومت جوابدہ ہے	حکومت جوابدہ نہیں ہے
16	بیت المال کا تصور	اللہ اور پھر عوام کی امانت ہے	اللہ اور پھر عوام کی امانت ہے	حکمران کا ذاتی خزانہ ہے
17	صحابہ کرام کی حکومت میں شمولیت	بہت زیادہ	نسبتاً کم	----
18	خلیفہ کا ذاتی لائف اسٹائل	نہایت سادہ	کسی قدر بلند معیار زندگی	اسراف کی حد تک شاہانہ

اس چارٹ کے بارے میں ہم پھر بتاتے چلیں کہ اس کی تیاری میں ہم نے ناقابل اعتماد راویوں کی روایات کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی بجائے صرف صحیح احادیث اور غیر جانبدار تاریخی روایات کو معیار بنایا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور اقتدار پر جو اعتراض کیے جاتے ہیں، ان پر ہم تفصیل سے اس باب میں گفتگو کر کے بتا چکے ہیں کہ ان اعتراضات کی بنیاد ان راویوں کے بیانات پر ہے جو حضرت معاویہ کے بارے میں نہایت ہی متعصبانہ رویہ رکھتے ہیں۔

اس چارٹ کو دیکھ کر اگر خلفائے اربعہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے دور اقتدار کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ کے دور میں بعینہ وہی معیار برقرار تھا جو کہ پہلے چاروں خلفاء راشدین کا تھا۔ صرف چند امور ایسے ہیں، جن میں کچھ فرق پڑ گیا تھا اور وہ یہ تھے:

1۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں جو حضرات اعلی عہدوں پر تعینات تھے، وہ بالعموم اکابر صحابہ نہ تھے۔ آپ کے مقرر کردہ گورنروں میں صرف حضرت عمرو بن عاص، ان کے بیٹے عبداللہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم ایسے صحابی ہیں جنہوں نے عہد رسالت میں خاصا وقت پایا تھا۔ ان کے علاوہ جتنے اکابر صحابہ تھے، وہ حضرت معاویہ کے زمانے تک یا تو فوت ہو چکے تھے یا پھر بہت ضعیف العمر تھے۔ وہ صحابہ، جو عہد رسالت میں ابھی بچے یا نوجوان تھے، حضرت معاویہ کے عہد میں زندہ تھے لیکن ان میں سے بھی اکثر افراد ایسے تھے جنہیں حکومتی معاملات کی بجائے عوام کی تعلیم و تربیت میں زیادہ دلچسپی تھی۔

2۔ حضرت ابو بکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم کا لائف اسٹائل بہت سادہ تھا اور یہ اکثر پیوند لگے کپڑے پہن لیتے تھے۔ اس کے برعکس حضرت عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہما دنیاوی دولت سے فائدہ اٹھانے میں حرج محسوس نہ کرتے تھے لیکن یہ دونوں حضرات بھی ایسا

اپنی ذاتی دولت پر کرتے تھے نہ کہ سرکاری خزانے پر۔ یہ دونوں حضرات بیت المال سے تنخواہ نہ لیتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اپنی وفات کے وقت انہوں نے اپنا آدھا مال بیت المال میں جمع کروادیا تھا۔

اس زمانے میں امیر اور غریب کے لائف اسٹائل میں آج کل کی طرح بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ صرف اتنا فرق تھا کہ امیر لوگ ذرا بڑے گھروں میں رہ لیتے تھے، اچھا لباس پہن لیتے تھے اور ان کا دستر خوان زیادہ وسیع ہوتا تھا۔ حضرت عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے زمانے میں مال و دولت کی کثرت تھی اور یہ اس طرح تقسیم کیا جاتا تھا کہ ہر ہر شخص کی ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں۔ پورے عالم اسلام میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جسے روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج کی سہولت میسر نہ ہو۔ اس صورتحال میں ان خلفاء نے ضرورت محسوس نہ کی کہ خلیفہ بھی اپنا معیار زندگی پست کرے۔

ان دو امور سے صرف نظر کر کے دیکھیے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور بھی عین خلافت راشدہ ہی کا تسلسل تھا۔ یہ سلسلہ بعد کے بہت سے خلفاء میں بھی جاری رہا۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے اکثر خلفاء شریعت کو نافذ کرتے تھے اور دولت کو معاشرے میں تقسیم کرتے تھے۔ ایسا ضرور تھا کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے بعض سلاطین کے ہاں کرپشن اور عیاشی پیدا ہوئی لیکن بحیثیت مجموعی ان کی پوری تاریخ خلافت راشدہ ہی کا تسلسل تھا۔

عام طور پر ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، جس میں خلافت راشدہ کے تیس برس تک ہونے کا ذکر ہے۔ حدیث یہ ہے:

> حدثنا سوار بن عبد الله، ثنا عبد الوارث بن سعيد، عن سعيد بن جُمْهان، عن سَفِينَة قال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نبوت کی خلافت تیس برس تک رہے گی۔ پھر اللہ تعالی اس حکومت کو جسے چاہیں گے، عطا فرمادیں گے۔" سعید کہتے ہیں کہ سفینہ نے مجھ سے کہا: "اسی پر قائم رہیے۔ ابو بکر کی خلافت دو سال تھی، عمر کی دس سال، عثمان کی بارہ سال اور اسی طرح علی کی (ساڑھے چار سال۔)" سعید کہتے ہیں کہ میں نے سفینہ سے کہا: "یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ علی خلیفہ نہیں تھے۔" انہوں نے فرمایا: "یہ ایسا جھوٹ ہے جسے ان بنی زرقاء نے اپنی سرین سے گھڑ کر نکالا ہے۔" (راوی کہتے ہیں بنی زرقاء سے مراد بنو مروان ہیں۔) [74]

یہ حدیث ترمذی، ابو داؤد اور حدیث کی بے شمار کتب میں آئی ہے۔ ہمیں بھرپور تلاش کے بعد اس حدیث کے 75 طرق (Versions) ملے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان 75 کے 75 ورژنز میں اس حدیث کی سند کی ابتدا میں یہی دو حضرات ہیں: ایک حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے سعید بن جُمْہان۔ اگر ایک حدیث کے اتنے ورژن دستیاب ہوں تو انہیں بہت سے لوگوں کو روایت کرنا چاہیے اور اس کی سند کو متنوع (diversified) ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں مسلم تاریخ کی ایک نہایت ہی اہم حقیقت کو بیان فرمایا ہے اور بعض طرق کے مطابق تیس سال والی یہ بات آپ نے خطبہ دیتے وقت ارشاد فرمائی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی اہم بات کو صرف ایک صحابی حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ ہی کیوں بیان کرتے ہیں؟ ان کے علاوہ کوئی

---

[74] ابو داؤد، کتاب السنۃ۔ حدیث 4647

اور صحابی اس حدیث کو بیان نہیں کرتا ہے۔ پھر حضرت سفینہ سے جن لوگوں نے یہ روایت سنی، ان میں صرف ایک سعید بن جُمْہان (d. 136/754) ہیں جو اسے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ سعید سے سن کر بیسیوں افراد اسے روایت کرتے ہیں اور اس کے طرق کی تعداد 75 تک پہنچ جاتی ہے۔

سعید بن جُمْہان کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہے کہ یہ کس درجے میں قابل اعتماد ہیں۔ ان کی وجہ شہرت یہی ایک حدیث ہے۔ ماہرین جرح و تعدیل میں ابن معین اور ابو داؤد انہیں قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ ابن عدی کا کہنا ہے کہ "مجھے امید ہے کہ ان میں کوئی حرج نہیں ہے۔" اس کے برعکس ابو حاتم انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتے ہیں۔[75] ابو داؤد کا کہنا ہے کہ "محدثین کی ایک جماعت انہیں ضعیف سمجھتی ہے تاہم مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ قابل اعتماد ہوں گے۔" یہ سعید، حضرت سفینہ کے باقاعدہ شاگرد نہیں ہیں بلکہ حج کے دنوں میں ان کے پاس آٹھ دن تک رکے تھے اور ان سے احادیث حاصل کی تھیں۔[76]

اگرچہ دور جدید کے بعض محدثین نے اس حدیث کو "حسن" کے درجے میں رکھا ہے تاہم سعید بن جُمْہان کے بارے میں بیان کردہ اس تفصیل سے علم ہوتا ہے کہ اس حدیث کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت مشکوک ہے کیونکہ سعید کے قابل اعتماد ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ماہرین جرح و تعدیل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر حضرت سفینہ نے اس حدیث کو بیان کیا ہوتا تو پھر ان کے اور بھی بہت سے شاگرد اس حدیث کو بیان کر رہے ہوتے۔ نہ صرف حضرت سفینہ بلکہ دیگر صحابہ بھی اسے بیان کرتے۔ روایت کے آخری حصے میں جس نوعیت کی بد کلامی اور فحش گوئی حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان جملوں کا تخلیق کار، بنو امیہ اور آل مروان کی حکومت سے شدید بغض رکھتا ہے ورنہ ہم حضرت سفینہ سے ایسی فحش کلامی کی بدگمانی نہیں کر سکتے ہیں۔

روایت کے ضعف کے متعلق ہم نے جو لکھا ہے، یہ تنہا ہماری رائے نہیں بلکہ قدیم اہل علم کی بھی یہی رائے ہے۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:

> مناسب تو یہی تھا کہ حضرت معاویہ کے حالات بھی سابق خلفاء کے حالات کے ساتھ ہی بیان کر دیے جاتے کیونکہ فضیلت، امانت و دیانت اور صحابیت میں یہ انہی کے تابع تھے۔ حدیث "میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی" کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے کیونکہ اس کی صحت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی۔ حق یہی ہے کہ حضرت معاویہ کا شمار خلفاء ہی میں ہے۔[77]

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام قائم کیا، کیا وہ معاذ اللہ اتنا کمزور تھا کہ محض تیس برس ہی میں جواب دے گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ جب ہم لفظ ملک، سلطان یا بادشاہ سنتے ہیں تو ہمارا ذہن فوری

---

[75] ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ راوی نمبر 3152

[76] مزی۔ تہذیب الکمال۔ راوی نمبر 2246

[77] ابن خلدون۔ دیوان المبتدا و الخبر۔ باب خلافت حسن۔ 2/650۔

طور پر بیسویں صدی کے ایک ایسے عیاش آمر اور ڈکٹیٹر کی طرف چلا جاتا ہے جو مطلق العنان ہو اور کسی قانون کا پابند نہ ہو۔ مسلم سلاطین کے لیے یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ سلاطین خواہ اچھے ہوتے یا برے، بہر حال ایک قانون اور ضابطے کے پابند رہے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جب خلافت راشدہ، ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو ایک حد تک یہ اپنے آئیڈیل سے ہٹ گئی لیکن ایسا نہیں ہوا کہ آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہو۔ مسلمانوں کے دور عروج میں بنو امیہ، بنو عباس اور عثمانی سلاطین اپنے ساتھ اہل علم کو رکھتے جو انہیں ان کی غلطیوں پر ٹوکتے اور ان کی اصلاح کرتے رہتے۔ عبد الملک بن مروان اور ان کے بعد کے تمام سلاطین کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح نظر آتا ہے کہ ہر خلیفہ اور سلطان اس بات کی کوشش کرتا رہا ہے کہ وہ خلفائے راشدین کے معیار کے قریب سے قریب ہو۔ بعض سلاطین اس میں زیادہ کامیاب رہے ہیں اور بعض کم۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو خلافت راشدہ ہی کا تسلسل کہنا چاہیے۔

حضرت معاویہ کے اہم کارنامے

اب تک ہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر کی گئی تنقید کا جائزہ لیا ہے۔ اب ہم آپ کی شخصیت کے ان مثبت پہلوؤں کا ذکر کریں گے جنہیں لوگوں نے آپ کے بغض میں دبا دیا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اہم کارنامے کیا ہیں؟

اس باب میں ہم نے نہایت تفصیل سے ان اعتراضات کا جائزہ لیا ہے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھائے گئے ہیں۔ روایات کے تجزیے میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ آپ کے خلاف یہ روایتیں کس نے ایجاد کیں اور کس مقصد کے لیے کیں؟ افسوس کہ ان روایتوں کی وجہ سے آپ کی سیرت کا مثبت پہلو پس منظر میں چلا گیا ہے اور گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی پوری عمر سیاسی جوڑ توڑ، خانہ جنگیوں اور سازشوں ہی میں گزری۔ مناسب ہو گا کہ اگر ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت سے متعلق روایات بھی پیش کر دیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ان جلیل القدر صحابی کی اصل شخصیت کیسی تھی اور کیا ان جعلی روایتوں میں بیان کردہ کردار آپ سے منسوب کرنے کا ذرہ برابر بھی امکان باقی رہ جاتا ہے؟

حضرت معاویہ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلوم و معروف ہے کہ آپ قریش کے سردار حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہما کے بیٹے تھے۔ آپ کی پیدائش بعثت نبوی سے پانچ برس پہلے ہوئی۔ ہجرت نبوی کے وقت آپ اٹھارہ برس کے نوجوان تھے۔ آپ کے والد ابو سفیان کے اپنے گھر میں بالکل ابتدائی سالوں ہی میں داخل ہو گیا۔ حضرت معاویہ کی بڑی بہن سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہما بالکل ابتدا ہی میں اسلام قبول کرنے والے صحابہ میں شامل ہیں۔ آپ کو دو مرتبہ ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہے، ایک بار حبشہ اور دوسری مرتبہ مدینہ۔ یقینی طور پر سیدہ کے ایمان، دعوت اور قربانی کا اثر ان کے دیگر بہن بھائیوں پر بھی پڑا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں جنگ احد اور جنگ خندق میں کفار کی قیادت اگرچہ حضرت ابو سفیان نے کی لیکن حضرت معاویہ اور ان کے بڑے بھائی یزید رضی اللہ

عنہما کا اس موقع پر کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی اسلام سے مخالفت کے بارے میں بھی واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ابو جہل اور ابو لہب جیسا کمینہ پن نہیں تھا اور انہوں نے کبھی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی سطح پر تکلیف نہیں پہنچائی۔ مکی زندگی کے 13 سالوں میں بھی ان کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ پہنچی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بظاہر فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا لیکن آپ صلح حدیبیہ کے وقت ایمان لا چکے تھے۔ اس بات کی تائید ابن عساکر کی بیان کردہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن عصر کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گیا۔ آپ اس وقت سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تھے۔ آپ نے فرمایا: "انس! فاطمہ کے گھر جایئے۔" آپ نے مجھے چار کیلے عطا فرمائے اور فرمایا: "ایک حسن کے لیے ہے، ایک حسین کے لیے اور دو فاطمہ کے لیے۔ پھر واپس میرے پاس آیئے۔"

جب میں واپس آیا تو ام حبیبہ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! آپ عام قریش میں سے اپنے ان صحابہ کو فضیلت دیتے ہیں جنہوں نے درخت کے نیچے (حدیبیہ کے مقام پر) آپ کی بیعت کی اور میرے بھائی (معاویہ) پر بھی فخر کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "کسی کو بھی ہرگز ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر جتلانا نہیں چاہیے۔ معاویہ نے بھی اسی طرح بیعت کی تھی جیسا کہ دوسروں نے کی۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور میں آپ کے ساتھ تھا۔ آپ مسجد کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ ابو بکر، عمر، عثمان، علی اور بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ رسول اللہ نے فرمایا: "ابو بکر!" انہوں نے عرض کیا: "میں حاضر ہوں، یا رسول اللہ۔" فرمایا: "کیا آپ کو یاد ہے کہ درخت کے نیچے کس شخص نے سب سے پہلے میری بیعت کی تھی؟" انہوں نے عرض کیا: "میں نے، یا رسول اللہ! اور پھر عمر اور علی بن ابی طالب نے۔" عثمان نے اپنا سر اٹھایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابو بکر! عثمان جب غائب تھے، تو میں ہی عثمان (کا قائم مقام) تھا۔ عثمان جب غائب تھے، تو میں ہی عثمان (کا قائم مقام) تھا۔" ابو بکر ہنس پڑے تو عثمان نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمن بن عوف اور ابو عبیدہ بن جراح بھی تو تھے۔"

حضور نے فرمایا: "اور کون تھا؟" انہوں نے عرض کیا: "یہی سب لوگ تھے اور ہم تھے۔" آپ نے فرمایا: "معاویہ کہاں گئے؟" انہوں نے عرض کیا: "وہ تو ہمارے ساتھ موجود نہیں تھے۔" رسول اللہ نے فرمایا: "اس ذات کی قسم جس نے مجھے برحق نبی بنایا، معاویہ بن ابی سفیان نے بھی یقیناً اسی طرح بیعت کی تھی جیسے آپ لوگوں نے کی تھی۔" ابو بکر نے عرض کیا: "اس بات کا ہمیں تو علم نہیں ہے، یا رسول اللہ۔" فرمایا: "اس وقت وہ اللہ کے قبضے میں تھے۔ ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمن بن عوف، ابو عبیدہ بن جراح اور معاویہ بن ابی سفیان اسی قبضے میں تھے۔ انہوں نے اسی طرح بیعت کی، جیسا کہ آپ لوگوں نے کی اور اسی طرح خیر خواہی کی جیسا کہ آپ لوگوں نے کی۔ اللہ نے انہیں بھی اسی طرح بخش دیا ہے جیسا کہ آپ لوگوں کی مغفرت فرمائی ہے اور آپ ہی کی طرح انہیں بھی جنت کا حق دار بنایا ہے۔[78]

[78] ابن عساکر۔ 59/105

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت رضوان کے موقع پر حضرت معاویہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی طریقے سے بیعت کی تھی۔ یا تو آپ خفیہ طور پر حاضر ہوئے ہوں گے یا پھر کسی کے ہاتھ پیغام بھیجا ہو گا کہ ان کا دل آپ کے ساتھ ہے یا پھر اللہ تعالی ہی نے بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان اہل مکہ کے بارے میں بتا دیا ہو گا جو دل سے اسلام کے ساتھ تھے۔

جب سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا شوہر حبشہ میں عیسائی ہو گیا تھا اور وہ کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے انہیں نکاح کا پیغام بھیجا اور بادشاہ حبشہ نجاشی رضی اللہ عنہ نے ان کا نکاح کر کے انہیں مدینہ روانہ کیا۔ یہ وہی وقت ہے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں ایمان نے گھر کر لیا۔ اس واقعے سے حضرت ابو سفیان اور ان کی اہلیہ ہندہ رضی اللہ عنہما بھی بہت متاثر ہوئے اور اس شادی کے بعد انہوں نے کبھی اسلام کی مخالفت نہیں کی۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ پورا گھرانہ ایمان لایا۔ اس کے بعد حضرت ابوسفیان اور ان کے بیٹے جنگ حنین میں مسلمانوں کی طرف سے شریک رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نجران کا گورنر مقرر کیا۔ دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مستقل طور پر مدینہ آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا کاتب (سیکرٹری) مقرر کیا۔ آپ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرح مستقلاً حضور کی خدمت میں رہتے تھے اور قرآن مجید کی کتابت کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا:

> عبد الرحمن بن ابی عمیرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کو فرمایا: "اے اللہ! انہیں ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والا بنا اور انہیں ہدایت عطا فرما۔[79]

اس حدیث کے تمام راوی وہ ہیں، جن سے امام مسلم روایتیں قبول کرتے ہیں۔ ترمذی کی اگلی روایت میں ہے کہ یہ عبد الرحمن بن ابی عمیرہ رضی اللہ عنہ حمص کے گورنر تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں معزول کر کے اس علاقے کو حضرت معاویہ کے تحت کر دیا تھا۔ کسی خوشامدی نے عبد الرحمن کے سامنے حضرت معاویہ کی برائی کی تو انہوں نے اسے منع کرتے ہوئے اسے یہ حدیث سنائی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب شام پر لشکر کشی ہوئی تو حضرت ابو سفیان کے دونوں بیٹے یزید اور معاویہ رضی اللہ عنہم اس فوج کے آفیسر تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے وہاں غیر معمولی کارنامے سر انجام دیے۔ حضرت ابو بکر نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو شام کا گورنر مقرر کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کو ان کا نائب بنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ان عہدوں پر بحال رکھا۔ 19/640 میں حضرت معاویہ نے رومیوں کی مشہور فوجی چھاؤنی "قیساریہ" کو فتح کر لیا۔ اگلے برس ان کے بھائی یزید نے طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ حضرت معاویہ کو مقرر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روم، قیصر کے قبضے سے نکل رہا تھا۔ حضرت معاویہ نے رومن ایمپائر کی افواج کو پے در پے شکستیں دے کر پورے شام کو فتح کر لیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں سے کم ہی مطمئن ہوتے تھے اور ان کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ یہ

[79] ترمذی، کتاب المناقب، حدیث 3842۔ ابن عساکر۔ 59/106

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی پرفارمنس تھی، جس کی وجہ سے حضرت عمر نے اتنے غیر معمولی اور حساس صوبے پر آپ کو گورنر مقرر کیے رکھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے عہدے پر بحال رکھا اور ان کے حسن انتظام کی وجہ سے دیگر علاقے بھی انہی کی گورنری میں دے دیے۔ حضرت معاویہ نے حضرت عثمان کے زمانے میں موجودہ ترکی کا تیس فیصد حصہ فتح کر لیا اور ماضی کی عظیم ایسٹرن رومن ایمپائر جو کئی صدیوں سے ایشیا اور افریقہ پر اپنا قبضہ برقرار رکھے ہوئے تھی، کے خاتمے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ آپ کے پے در پے حملوں کے نتیجے میں قیصر روم، جو کبھی تین براعظموں پر حکومت کرتا تھا، اب محض موجودہ ترکی کے تھوڑے سے حصے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور مغربی مصنف مائیکل ہارٹ نے جب تاریخ انسانی کی موثر ترین شخصیات کی فہرست تیار کی، تو مسلمانوں میں سے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر کے بعد تیسرے نمبر پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کو رکھا۔[80]

حضرت معاویہ نے تاریخ اسلامی کی پہلی بحری فوج تیار کی جس نے بحیرہ روم پر قیصر کے قبضے کو ختم کر دیا۔ آپ نے بحیرہ روم کے ساحلوں پر جہاز سازی کی عظیم صنعت قائم کی جس نے ابتدائی سالوں ہی میں عالم اسلام کو 1700 جنگی جہازوں سے مسلح کر دیا۔ اس سے دنیا کے اہم ترین سمندروں پر مسلمانوں کے غلبے کا جو آغاز ہوا، وہ گیارہ سو برس تک قائم رہا۔ آپ نے جزیرہ قبرص (Cyprus)، روڈس (Rhodes) بعد میں سسلی کو بھی فتح کر لیا جو موجودہ اٹلی کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس طرح یورپ میں مسلمانوں کے قدم پہلی مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کے ذریعے پہنچے۔ ان تمام علاقوں کا حسن انتظام ایسا تھا کہ جس کی مثال عالم اسلام کے دیگر مفتوحہ علاقوں میں نہیں ملتی ہے۔ آپ کے علاقوں میں بغاوتیں نہ ہونے کے برابر رہی ہیں جبکہ اس کے برعکس عراق، ایران، خراسان، مصر وغیرہ میں آئے دن بغاوتیں ہوتی رہی ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ وہ خوبیاں ہیں، جن کا اعتراف مخالف و موافق سبھی کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی کے زمانے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما ایک خود مختار حکمران کے طور پر رہے لیکن آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضل اور کمالات کے معترف تھے۔ آپ کا اختلاف صرف یہ تھا کہ باغی تحریک کو قرار واقعی سزا دی جائے یا پھر حضرت علی، ان کے خلاف کاروائی میں حضرت معاویہ کے راستے میں حائل نہ ہوں۔ یہ سب تفصیلات آپ متعلقہ باب میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ حضرت علی کے بیٹے حسن رضی اللہ عنہما ہی تھے جنہوں نے حضرت معاویہ کی بیعت کر کے امت مسلمہ کو متحد کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وصیت کے سلسلے میں ہم وہ روایات بیان کر آئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس کی تلقین خود حضرت علی نے کی تھی۔

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے رومن ایمپائر سے جہاد کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اس وقت صورتحال یہ تھی

[80] Hart, Micheal H. ***The 100. A Ranking of the Most Influential Persons in History.*** P. 510. New York: Carol Publishing Group Edition (1993).

کہ قیصر روم اپنی ترکی کی چھوٹی سی حکومت پر قانع نہ تھا اور ایشیا اور افریقہ میں اپنا اقتدار دوبارہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ شام پر لشکر کشی کر چکا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کے مقابلے کے لیے دو افواج تیار کیں جو سردی اور گرمی کی افواج کہلائیں۔ اگر آپ تاریخ طبری میں حضرت معاویہ کے دور کا مطالعہ کریں تو ہر سال کے آغاز میں طبری لکھتے ہیں کہ اس سال فلاں نے سردیوں کا جہاد کیا اور فلاں نے گرمیوں کا۔ حضرت معاویہ کی یلغاریں نہ صرف مغرب بلکہ مشرق میں بھی جاری رہیں۔ یہاں ہم ٹائم لائن کی صورت میں آپ کی جنگی مہمات کو بیان کر رہے ہیں:

27-28/648-649	فتح قبرص (Cyprus)
32/653	قسطنطنیہ (استنبول)
33/653	افطرنطیہ، ملطیہ اور روم کے بعض علاقوں کی فتح
35/655	ذی خشب کی مہم
42/662	سجستان (موجودہ افغانستان اور پاکستان میں مشترک علاقہ) کی مہم
43/663	فتح سوڈان
44/664	فتح کابل
45/665	لیبیا اور الجزائر کے بعض علاقوں کی فتح
46/666	صقلیہ یا سسلی پر پہلا حملہ
50-51/670-671	قسطنطنیہ کی پہلی مہم
54/674	فتح بخارا
54/674	قسطنطنیہ کی دوسری مہم
56/676	فتح سمرقند

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صرف جنگی پلاننگ اور کاروائیوں ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ آپ انتظامی اور علمی امور میں ایک غیر معمولی دماغ رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ڈاک کا نظام قائم کیا تھا، اسے غیر معمولی ترقی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ اس دور کا ایک مواصلاتی انقلاب (Communication Revolution) تھا۔ اس نظام کی تفصیل یہ ہے کہ مختلف شہروں کے مابین ڈاک کی چوکیوں کا نیٹ ورک بنا دیا گیا۔ ایک پوسٹ مین تیز رفتار گھوڑے پر ڈاک لے کر دوڑتا۔ گھوڑے پر ایک گھنٹی لگی ہوتی تھی جو اس کے دوڑنے سے بجتی تھی۔ اس کی آواز سن کر لوگ گھوڑے کو راستہ دے دیتے اور اسی آواز کو

سن کر اگلی چوکی کا پوسٹ مین تیار رہتا۔ جیسے ہی پہلا پوسٹ مین وہاں پہنچتا، تو اگلا پوسٹ مین اس سے ڈاک لے کر گھوڑے کو دوڑا دیتا۔ یہی سلسلہ تیسری، چوتھی اور اگلی چوکیوں پر جاری رہتا۔ اس طرح بہت کم وقت میں ایک شہر سے ڈاک دوسرے شہر پہنچ جاتی۔ ڈاک ہی سے متعلق ایک اور محکمہ کی ایجاد حضرت معاویہ کا کارنامہ ہے اور وہ تھا خطوط کے لیے مہریں تیار کرنے اور ان پر لگانے کا محکمہ۔ آج کے دور میں یہ بڑا غیر اہم لگتا ہے لیکن اسی کی بدولت نہایت اہم سرکاری خطوط اور دستاویزات میں جعل سازی کا خاتمہ ہوا۔ [81] اس سے یقینی طور پر باغی تحریک کو بڑا نقصان ہوا ہو گا کیونکہ وہ جعل سازی کے فن میں ید طولی رکھتے تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سلطنت کے استحکام میں اس کمیونی کیشن کے نظام سے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ گورنر زیاد بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے انٹیلی جنس نظام کا یہ عالم تھا کہ افغانستان میں کسی کی رسی بھی چوری ہوتی تو انہیں بصرہ میں اس کا علم ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان پورے بیس برس میں باغی تحریک کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا اور جب انہوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کچھ سر اٹھایا تو اسے بڑی آسانی سے کچل دیا گیا۔ اس کسمپرسی کے سبب باغیوں میں جو فرسٹریشن پیدا ہوئی، اسے انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف پراپیگنڈا کی شکل دے دی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نہ صرف سیاسی بلکہ علمی میدان میں بھی غیر معمولی پراجیکٹ شروع کیے۔ آپ کو سائنس سے خاص دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اہل یونان کی سائنس کی کتب کا خاص طور پر ترجمہ کروایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کے اپنے خاندان میں ایک اتنا بڑا سائنسدان پیدا ہوا جس کی صلاحیت کا لوہا اہل مغرب نے بھی مانا۔ آپ کے پوتے خالد بن یزید بن معاویہ کو کیمسٹری اور میڈیسن (گویا بائیو کیمسٹری) سے غیر معمولی شغف حاصل تھا اور انہیں مسلم دنیا کا پہلا کیمیائی سائنسدان قرار دیا گیا ہے۔ ان کے متعلق چند اہل علم کی آراء ہم یہاں درج کر رہے ہیں۔ ابن خلکان لکھتے ہیں:

> ابو ہاشم خالد بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان اموی۔ قریش میں فنی علوم میں سب سے مشہور تھے اور کیمسٹری اور طب کی صنعتوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ وہ ان علوم میں بہت بڑے ماہر تھے اور ان کے علم اور ذہانت کا ثبوت ان کے رسائل ہیں۔ انہوں نے یہ علوم ایک راہب، مریانس راہب رومی سے حاصل کیے۔ ان کے تین رسائل ہیں جن میں سے ایک میں مریانس راہب کے ساتھ ان کا معاملہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے اس سے یہ علوم کیسے سیکھے۔ [82]

خالد کا یہ علمی پراجیکٹ محض ان کا ذاتی رجحان ہی نہ تھا بلکہ یہ اجتماعی نوعیت کی کاوش تھی۔ مشہور برطانوی ماہر طب ایڈورڈ براؤن لکھتے ہیں:

---

[81] طبری۔ 4/1-133

[82] ابن خلکان (608-681/1212-1282)۔ وفیات الاعیان۔ شخصیت نمبر 212۔ 2/224۔ بیروت: دار الصادر۔ http://majles.alukah.net (ac. 22 Aug 2012)

دمشق کا جان (John of Damascus)، جن کا لقب کرسوروس اور عربی نام منصور ہے، پر پہلے اموی خلیفہ معاویہ نے بہت سے احسانات کیے۔ عربوں میں یونانی دانش کے علم کی خواہش سب سے پہلے اموی شہزادے، خالد بن یزید بن معاویہ کے ہاں پیدا ہوئی جنہیں کیمسٹری (Alchemy) کا جنون تھا۔ فہرست (ابن الندیم کی مشہور کتاب جس میں اس دور تک کی ہزاروں کتب کا تعارف موجود ہے) کے مطابق، جو اس بارے میں ہماری معلومات کا سب سے قدیم اور سب سے بہتر ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، خالد نے یونانی فلسفیوں کو ملک مصر میں اکٹھا کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ اس مضمون کی یونانی اور مصری تصانیف کو عربی زبان میں ترجمہ کریں۔ فہرست کے مصنف کا کہنا ہے کہ اسلامی (تاریخ) میں یہ وہ پہلی کتابیں تھیں جو ایک زبان سے دوسری میں ترجمہ ہو کر آئیں۔ اسی شہزادے کے ساتھ مشہور کیمیا دان جابر بن حیان بھی کام کرتے تھے جو کہ قرون وسطی کے یورپ میں Geber کے نام سے مشہور ہیں۔[83]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ اقوام کے علوم کو سیکھنے کی تحریک نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تیزی اختیار کی۔ پھر انہی علوم کی بدولت اس دور کے مسلمانوں نے وہ بنیاد رکھی، جس پر بنو امیہ، بنو عباس اور پھر سلطنت عثمانیہ کی عالیشان عمارت 1200 سال تک کھڑی رہی۔

حضرت معاویہ کی رسول اللہ سے محبت کا کیا عالم تھا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو محبت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو دردا رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں نے نماز پڑھنے کے انداز میں کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنا مشابہ نہیں دیکھا، جتنا کہ معاویہ تھے۔"[84]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ ایک قمیص پہننے کے لیے دی تھی۔ یہ قمیص آپ کے پاس محفوظ تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تراشے ہوئے ناخن ایک شیشی میں محفوظ کر لیے تھے۔ جب حضرت معاویہ کی جب وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے وصیت کی کہ اسی قمیص میں مجھے کفن دیا جائے اور مبارک ناخنوں کو رگڑ کر میری آنکھوں اور منہ پر چھڑک دیا جائے۔ اپنے ذاتی مال کے بارے میں انہوں نے وصیت کی کہ اس کا آدھا حصہ بیت المال میں جمع کروا دیا جائے۔[85]

حضرت معاویہ کے بارے میں ان کے ہم عصروں کی رائے کیا تھی؟

یہاں ہم وہ چند آراء درج کر رہے ہیں جن کا اظہار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاصرین یا ان کے قریبی لوگوں نے ان کے بارے

[83] Browne, Edward G. MB, FRCP. ***Arabian Medicine.*** P. 15. London: Cambride University Press (1921) http://archive.org/details/arabianmedicineb00browiala (ac. 12 Aug 2012)

[84] ہیثمی۔ مجمع الزوائد۔ کتاب المناقب، ماجاء فی معاویہ بن ابی سفیان۔ حدیث 19520

[85] طبری۔ 4/1-131

میں کیا ہے:

1۔ ایک بار حضرت عمر کے سامنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی برائی کی گئی تو آپ نے فرمایا: "قریش کے اس جوان کی برائی مت کیا کریں جس کے سامنے غصہ کیا جائے تو وہ ہنس پڑتا ہے (یعنی انتہا درجے کا حلیم اور بردبار ہے۔) جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ اس سے اس کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کے سر کی چیز حاصل کرنا ہو تو اس سے اس کے قدموں کے نیچے سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

2۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے فرمایا: "آپ لوگ قیصر و کسری اور ان کی سیاست اور حسن انتظام کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ خود آپ میں معاویہ موجود ہیں۔"[86]

3۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لوگو! معاویہ کی گورنری کو ناپسند مت کرو۔ اگر تم نے انہیں کھو دیا تو تم دیکھو گے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گریں گے جیسے حنظل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا ہے۔"[87]

4۔ ایک فقہی مسئلے میں حضرت معاویہ کا عمل ابن عباس رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان ہوا تو آپ نے فرمایا: "بیٹے! جو کچھ معاویہ نے کیا، صحیح کیا کیونکہ ہم میں معاویہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔"[88]

5۔ ابن عباس ہی کا قول ہے: "میں نے معاویہ سے بڑھ کر حکومت کا لائق کسی کو نہ پایا۔"[89]

6۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: " میں نے معاویہ سے بڑھ کر کسی شخص کو متحمل مزاج نہیں پایا۔[90]

7۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں نے عثمان کے بعد کسی کو معاویہ سے بڑھ کر حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں پایا۔"[91]

8۔ حضرت قبیصہ بن جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "میں کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جو معاویہ سے بڑھ کر حلیم، ان سے بڑھ کر سیادت کا

[86] ایضاً۔133-4/1
[87] ابن ابی شیبہ۔ المصنف۔14/38850۔ ابن ابی الحدید۔ شرح نہج البلاغۃ۔12/40
[88] ابن عساکر 59/161
[89] ایضاً۔59/165
[90] ایضاً۔59/177
[91] ایضاً۔59/161۔ ابن کثیر۔11/435

لائق، ان سے زیادہ باوقار، ان سے زیادہ نرم دل اور نیکی کے معاملے میں ان سے زیادہ کشادہ دل ہو۔"[92]

حلم و بردباری (سیلف کنٹرول) میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات ضرب المثل بن گئی ہے۔ آپ خود اپنا اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے، وہاں میں تلوار کو کام میں نہیں لاتا۔ جہاں زبان کام دیتی ہے، وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا۔ اگر میرے اور لوگوں کے درمیان کچے دھاگے جیسا تعلق بھی ہو، تو اسے ٹوٹنے نہیں دیتا۔ جب لوگ کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں۔[93]

خلاصہ باب

- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور خلافت راشدہ ہی کا تسلسل تھا جس میں آپ نے بہت سے عظیم کارنامے سر انجام دیتے ہوئے عالم اسلام کو متحد رکھا۔
- باغیوں نے حضرت معاویہ پر جو الزامات عائد کیے، ان کی کوئی حقیقت نہیں تھی اور آپ ان تمام تہمتوں سے بری تھے۔
- حضرت معاویہ نے باغی تحریک کو دبائے رکھا اور آپ کے دور میں کوئی بڑا فتنہ و فساد پیدا نہ ہو سکا۔
- حضرت معاویہ نے لائق ترین لوگوں کو سرکاری عہدے دیے جنہوں نے افغانستان سے لے کر لیبیا تک کے علاقوں پر امن قائم رکھا۔ آپ نے رومن ایمپائر کو دوبارہ اٹھنے نہ دیا اور اس کے زوال میں اہم ترین کردار ادا کیا۔
- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہم عصر صحابہ کی رائے ان کے بارے میں نہایت ہی مثبت تھی۔

اسائن منٹس

۱۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے مختصر دور خلافت میں کیا اہم ترین کارنامہ انجام دیا؟ کیا مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی اور مثال بھی ملتی ہے؟

۲۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں کیا اہم ترین کارنامے انجام دیے؟

۳۔ حضرت معاویہ کے زمانے میں باغی تحریک کے مختلف گروپوں کی سرگرمیوں اور ان کے مقابلے میں حکومت کے اقدامات پر ایک نوٹ لکھیے۔

---

[92] ابن عساکر۔ 59/178, 191

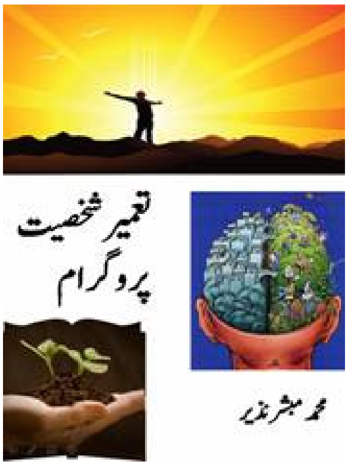
[93] ایضاً۔ 59/173

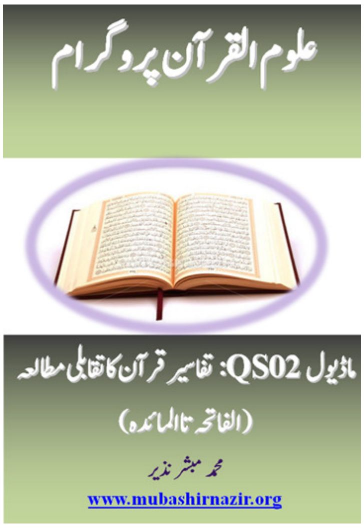
۴۔ حضرت حسن، معاویہ، زیاد بن ابی سفیان اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کی کردار کشی کے اسباب کیا تھے؟

۵۔ تاریخی تنقید کے جو اصول آپ نے پہلے دو ابواب میں پڑھے ہیں، ان کے تحت حضرت معاویہ پر لگائے گئے الزامات کا تجزیہ کیجیے۔

۶۔ حضرت معاویہ کی ذات میں ایسی کیا خصوصیات تھیں، جن کی بدولت آپ ایک کامیاب حکمران بنے؟

۷۔ مائیکل ہارٹ نے تاریخی انسانی کی 200 موثر ترین شخصیات (Most Effective Personalities) میں مسلم تاریخ کی صرف تین شخصیات کا ذکر کیا ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عمر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما شامل ہیں۔ اس کتاب کو انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کیجیے اور اس کا جائزہ لے کر بتائیے کہ حضرت معاویہ کو اس فہرست میں شامل کرنے کے اسباب کیا تھے؟





باب 7: دوسری خانہ جنگی

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ ہم سن ساٹھ کے عشرے کے بارے میں یہ جان سکیں کہ:

- سانحہ کربلا کیونکر پیش آیا؟ اس کے کیا نتائج تھے؟
- سانحہ کربلا کے بعد باغی تحریک پر کیا گزری؟
- سانحہ حرہ کے اسباب اور نتائج کیا تھے؟
- حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے اہم واقعات کیا تھے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ دوسری خانہ جنگی سے متعلق اہم تاریخی سوالات کے جواب دے سکیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک بار پھر باغی تحریک نے سر اٹھایا۔ جب تک آپ برسر اقتدار رہے، قاتلین عثمان کی باغی تحریک کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ جو لوگ خاص کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے، ان سب کو تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن ان کے بقیہ ساتھی ابھی زندہ تھے اور اندر ہی اندر اب باغی تحریک کی اگلی نسل تیار ہو چکی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت 35/655 میں ہوئی تھی اور حضرت معاویہ کی وفات 60/680 میں۔ اب پچیس برس گزر چکے تھے اور پلوں کے نیچے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ جو لوگ شہادت عثمانی کے وقت بوڑھے تھے، وہ اب دنیا سے گزر چکے تھے، اس وقت کے جوان اب بوڑھے ہو چکے تھے اور جو لوگ اس وقت بچے تھے، اب وہ جوان ہو چکے تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں باغی تحریک کھل کر سامنے نہ آسکی تھی اور ان کی سرگرمیاں انڈر گراؤنڈ تھیں۔ انہوں نے اس زمانے میں اپنی خفیہ سرگرمیوں کے نتیجے میں بعض ساتھی اکٹھے کر لیے تھے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ 51/671 میں حجر بن عدی اور ان کے بعض ساتھیوں کے جوش نے باغی تحریک کو سخت نقصان پہنچایا اور ان کی لیڈر شپ کا صفایا ہو گیا تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صف دوم کی قیادت محفوظ رہی اور ان لوگوں نے اندر ہی اندر اپنی تحریک کو دوبارہ کھڑا کر لیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے فوراً بعد یہ باغی تحریک یک دم ایکٹو ہو گئی اور اس نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ان کا بیٹا یزید حکمران بنا اور اس کے چار سالہ دور (61-64/681-684) میں تین بڑے سانحے پیش آئے: شہادت حسین رضی اللہ عنہ، واقعہ حرہ اور مکہ مکرمہ پر فوج کشی۔ ان تینوں واقعات کی وجہ سے یزید کو اس درجے میں بدنام کر دیا گیا کہ کم از کم ایران اور جنوبی ایشیا میں تو اس کا نام ہی گالی بن گیا۔ اس باب میں ہم افراط اور تفریط سے بچ کر یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ ان واقعات و حوادث کی اصل صورت کیا تھی؟

یزید کے بعد دو افراد نے خلافت کا دعوی کیا۔ ان میں ایک حواری رسول حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبداللہ تھے اور دوسرے مروان بن حکم۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت حجاز پر قائم ہوئی اور انہوں نے بالآخر عراق اور ایران کو بھی اپنی حکومت کا حصہ بنا لیا۔ مروان کی حکومت شام اور مصر پر قائم ہوئی۔ مروان کے بعد ان کے بیٹے عبدالملک کے دور میں بنو مروان کی حکومت پھیلتی گئی اور ابن زبیر کی حکومت سکڑتی چلی گئی۔ بالآخر 73/693 میں وہ سانحہ ہوا جس کے نتیجے میں ابن زبیر شہید ہوئے اور ایک بار پھر عالم اسلام عبدالملک بن مروان کی قیادت میں متحد ہو گیا۔

اس باب میں ان شاء اللہ ہم ان بارہ سالوں کا مطالعہ کریں گے جو کہ 61-73/681-693 پر محیط ہیں۔ چونکہ اس کے بعد عہد صحابہ کی سیاسی تاریخ کا تذکرہ مکمل ہو جائے گا، اس وجہ سے یہ باب، عہد صحابہ کی سیاسی تاریخ کا آخری باب ہو گا۔ اس کے بعد آخری باب میں ہم عہد صحابہ کی سیاسی تاریخ سے متعلق عمومی نوعیت کے سوالات کا جائزہ لیں گے۔

سانحہ کربلا

سانحہ کربلا، مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نہایت ہی سنگین واقعہ ہے۔ اس واقعے میں نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو مظلومانہ انداز میں شہید کیا گیا اور اس کے بعد امت مسلمہ میں افتراق و انتشار پیدا ہوا۔ اس واقعے سے متعلق بہت سے سوالات ہیں جو تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سیکشن میں ہم مختلف سوالات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کی اصل نوعیت کیا تھی؟ سانحہ کربلا کیسے وقوع پذیر ہوا؟ سانحہ کربلا کا ذمہ دار کون تھا؟ سانحہ کربلا کے کیا نتائج امت مسلمہ کی تاریخ پر مرتب ہوئے؟ دیگر صحابہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شمولیت اختیار کیوں نہ کی؟ یزید نے قاتلین حسین کو سزا کیوں نہ دی؟ شہادت عثمان کی نسبت شہادت حسین پر زور کیوں دیا گیا؟ وغیرہ وغیرہ۔

حضرت حسین کے اقدام کی اصل نوعیت کیا تھی؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کے بارے میں مسلمانوں کے اندر تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

1۔ ایک اقلیت کا نظریہ یہ ہے کہ خلافت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کا حق تھا۔ چونکہ یزید نے اس پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا، اس وجہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے حق کے حصول کے لیے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس راہ میں جام شہادت نوش کیا۔

2۔ دوسری اقلیت کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حیثیت معاذ اللہ ایک باغی کی سی تھی۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں حکم ہے کہ جب ایک خلیفہ کی بیعت ہو جائے تو پھر اس کے خلاف دعوی کرنے والے کو قتل کر دو۔ اس وجہ سے یزیدی افواج نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے ایک جائز اقدام کیا۔

3۔ امت کی اکثریت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوئی بغاوت نہیں کی تھی اور آپ کی شہادت ایک مظلومانہ شہادت ہے۔

پہلا نقطہ نظر کچھ مذہبی دلائل کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کتاب کا اسکوپ چونکہ صرف تاریخ ہے، اس وجہ سے اس نقطہ نظر پر تبصرہ کی گنجائش اس کتاب میں نہیں ہے۔ ہم نے تقابلی مطالعہ پروگرام کے ماڈیول CS01 میں تفصیل سے اس ضمن میں فریقین کے نقطہ نظر کو ان کے دلائل کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔ جو حضرات مطالعہ کرنا چاہیں، وہ وہاں کر سکتے ہیں۔

دوسرے نقطہ نظر پر ہم یہاں گفتگو کرنا چاہیں گے کیونکہ احادیث کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن تاریخی اعتبار سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا۔ پہلے ہم احادیث نقل کرتے ہیں:

عرفجہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب آپ لوگ ایک شخص (کی حکومت) پر متفق ہوں اور کوئی

آکر آپ کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرے یا آپ کی اجتماعیت میں تفرقہ پیدا کرے تو اسے قتل کر دیجیے۔"

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر (بیک وقت) دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو بعد والے کو قتل کر دو۔"

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آپ پر ایسے امراء مسلط ہوں گے جن کی برائی کو آپ لوگ پہچان بھی لیں گے اور بعض اعمال کی برائی کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ جس نے ان کے اعمال بد کو پہچان لیا، وہ بری الذمہ ہو گیا۔ جو نہ پہچان سکا، وہ بھی محفوظ رہا لیکن جو ان امور پر خوش ہوا اور اس نے تابعداری کی (وہ دنیا و آخرت میں ناکام ہوا۔) صحابہ نے عرض کیا: "کیا ہم ایسے حکمرانوں سے جنگ نہ کریں؟" فرمایا: "نہیں۔ جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں۔"[1]

ان احادیث سے واضح ہے کہ اگر مسلمانوں پر ایسے لوگ مسلط ہو جائیں، جن کا کردار قابل تعریف نہ ہو تو ان کے خلاف اس وقت تک بغاوت نہ کریں جب تک کہ وہ اسلام پر قائم رہیں اور اس کی علامت کے طور پر نماز ادا کرنے سے انکار نہ کریں۔ بغاوت کرنے سے منع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ بغاوت کی صورت میں ان حکمرانوں کا ظلم بہت پھیل جائے گا۔

ہمارے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر ان احادیث کا اطلاق ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ اسی باب میں آگے چل کر ہم اس کی وضاحت کریں گے کہ حضرت حسین نے نہ تو بغاوت کی، نہ ہی مسلمانوں کی اجتماعیت کو توڑنے کی کوشش کی اور نہ ہی ایک خلیفہ کی موجودگی میں اپنی خلافت کا دعوی کیا۔ اس وجہ سے آپ کو باغی قرار دے کر آپ کی مظلومانہ شہادت کو ناجائز قرار دینا، ایک بہت بڑا الزام ہے۔ اس کی تفصیل ہم اگلے سیکشنز میں بیان کریں گے۔

سانحہ کربلا کی روایات کس حد تک مستند ہیں؟

سانحہ کربلا کے موضوع پر بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں۔ محرم الحرام میں بہت سے واعظ اور ذاکرین رو رو کر سانحہ کربلا کی داستان کچھ اس طریقے سے سناتے ہیں جیسے وہ اس واقعے کے چشم دید گواہ ہوں اور انہوں نے اس سانحے کو باقاعدہ ریکارڈ کیا ہو۔ تاریخ میں اس واقعے سے متعلق جیسا جھوٹ گھڑا گیا ہے، شاید ہی کسی اور واقعے سے متعلق گھڑا گیا ہو۔

عجیب بات یہ ہے کہ اولین کتب تاریخ میں اس واقعے کو صرف ایک شخص نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کا نام ہے ابو مخنف لوط بن یحیی۔ ان سے بالعموم جو صاحب روایت کرتے ہیں، ان کا نام ہشام کلبی ہے۔ ان دونوں راویوں سے ہمارا اس کتاب میں پرانا تعلق ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں نہایت ہی متعصب مورخ ہیں اور مخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سخت بغض رکھتے ہیں۔ تاریخ طبری میں سوائے چند ایک کے، سانحہ کربلا کی تقریباً سبھی روایات انہی دونوں سے مروی ہیں۔ ان دونوں

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارہ۔ حدیث 1852-1854

راویوں کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے بغض اتنا نمایاں ہے کہ انہوں نے ان روایات میں بھی جگہ جگہ اس بغض کو داخل کر دیا ہے۔

تاریخ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی شخص یا واقعے کے بارے میں اس سے متعصب راوی کی روایت کو قبول نہ کیا جائے۔ اس وجہ سے مناسب یہی رہے گا کہ ہم ابو مخنف اور ہشام کلبی کی روایات سے اجتناب کریں۔ ان دونوں کے علاوہ ایک اور ناقابل اعتماد مورخ محمد بن عمر الواقدی کی بعض روایتیں سانحہ کربلا سے متعلق ہیں، جن کے بارے میں بھی ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہر جھوٹی سچی بات کو ملا کر ایک کہانی بناتے ہیں اور پھر بغیر کسی سند کے بیان کر دیتے ہیں۔ کبھی وہ سند بھی بیان کر دیتے ہیں جو بالعموم مکمل نہیں ہوتی ہے۔ یہاں ہم تاریخ کی اولین کتب تاریخ میں سانحہ کربلا کی روایات سے متعلق کچھ اعداد و شمار پیش کر رہے ہیں۔

تاریخ کی کتاب	کربلا سے متعلق کل روایات	ناقابل اعتماد روایات کی تعداد	ناقابل اعتماد راویوں کے نام اور ان کی بیان کردہ روایات	بقیہ روایات
ابن سعد (168-230/784-845)	1	1	واقدی، ابو مخنف اور کلبی: 1	-
بلاذری (d. 279/893)	39	14	واقدی، ابو مخنف، عباد بن عوام، حصین بن عبد الرحمن اور ہیثم بن عدی	25
طبری (224-310/838-922)	129	120	ابو مخنف اور ہشام کلبی: 113۔ واقدی: 7	9
مجموعہ	**32**	**25**	**25**	**7**

تاریخ طبری کے بارے میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ 129 روایات کا بڑا حصہ ابو مخنف، ہشام کلبی اور واقدی سے مروی ہے۔ طبری سے پہلے کے مورخین میں ابن سعد (d. 230/845) ہیں جو کہ ہیں تو واقدی کے شاگرد، لیکن بذات خود ایک قابل اعتماد مورخ ہیں۔ ان کے بارے میں محدثین کا یہ اصول ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان کی وہ روایات، جو وہ واقدی کے علاوہ کسی اور سے روایت کرتے ہیں، پر اعتماد کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان کے راوی قابل اعتماد ہوں۔ ابن سعد نے سانحہ کربلا کے واقعات سے متعلق 23 روایات اپنی کتاب میں درج کی ہیں، لیکن ان میں سے ایک روایت وہ ہے جو انہوں نے مختلف اسناد کو ملا کر پورے واقعہ کو ایک طویل کہانی کی صورت میں بیان کی ہے۔ بقیہ 22 چھوٹی چھوٹی روایتیں ہیں جن میں ابن سعد نے واقعے کی کچھ جزوی تفصیلات کو نقل کیا ہے اور ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان میں سے ہر روایت کو نقل کرنے کے بعد وہ رجع الحديث إلى الأول (اب ہم پہلے بیان کی طرف واپس پلٹتے ہیں) کے الفاظ لکھ کر اسی طویل روایت کو بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ روایت 26-25 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جبکہ بقیہ 6-5 صفحات پر بقیہ 22 روایتیں ہیں۔ طویل روایت کی اسناد کو انہوں نے کچھ اس طرح نقل کیا ہے:

أخبرنا محمد بن عمر (الواقدي)، قال: حدثنا ابن أبي ذئب، قال: حدثني عبدالله بن عمير مولى أم الفضل

أخبرنا عبدالله بن محمد بن عمر بن علي، عن أبيه

أخبرنا يحيي بن سعيد بن دينار السعدي، عن أبيه

وحدثني عبدالرحمن بن أبي الزناد، عن أبي وجزة السعدي، عن علي بن حسين.

قال: وغير هؤلاء أيضا قد حدثني. قال محمد بن سعد: وأخبرنا علي بن محمد، عن يحيي بن إسماعيل بن أبي مهاجر، عن أبيه.

وعن (أبو مخنف) لوط بن يحيي الغامدي، عن محمد بن نشر الهمداني، وغيره.

وعن محمد بن الحجاج، عن عبدالملك بن عمير.

وعن هارون بن عيسى، عن يونس بن أبي إسحاق، عن أبيه.

وعن يحيي بن زكريا بن أبي زائدة، عن مجالد، عن الشعبي.

قال ابن سعد: وغير هؤلاء أيضا قد حدثني في هذا الحديث بطائفة فكتبف جوامع حديثهم في مقتم الحسين رحمة الله عليه ورضوانه وصلوته وبركاته. قالوا:

ابن سعد نے کہا: ان اسناد کے علاوہ بھی اس روایت کو (راویوں کے) ایک گروہ نے مجھ سے بیان کیا۔ میں نے حضرت حسین رحمۃ اللہ علیہ ورضوانہ وصلوتہ وبرکاتہ کی شہادت سے متعلق ان سب کی روایتوں کو اکٹھا کر کے لکھ لیا ہے۔ ان لوگوں نے بیان کیا:۔۔۔[2]

ابن سعد نے اس طویل روایت میں یہ نہیں بتایا کہ روایت کا کون سا حصہ کس راوی نے بیان کیا ہے بلکہ انہوں نے اسے ایک مسلسل قصے کی صورت میں بیان کر دیا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا ہے کہ تقریباً 26-25 صفحات پر پھیلی ہوئی اس روایت کا کون سا حصہ قابل اعتماد راویوں نے بیان کیا ہے اور کون سا حصہ نا قابل اعتماد راویوں نے۔ اس وجہ سے ان کی پوری روایت کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ ابن سعد کی بیان کردہ تفصیلات کا موازنہ اگر طبری میں بیان کردہ ابو مخنف، ہشام کلبی اور واقدی کی روایتوں سے کیا جائے تو ان میں مماثلت پائی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن سعد نے بھی زیادہ تر تفصیلات انہی تین راویوں سے اخذ کی ہیں۔

اب آیئے تیسرے مورخ احمد بن یحیی بلاذری (d. 279/893) کی طرف۔ انہوں نے سانحہ کربلا کے ضمن میں 39 روایتیں بیان کی ہیں جو کہ مکتبہ دار الفکر والے ورژن کی جلد 3 میں صفحہ 426-363 پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے 14 ایسی روایتیں ہیں جو نہایت ہی نا قابل اعتماد راویوں سے مروی ہیں۔ ان میں ابو مخنف لوط بن یحیی (4654)، عباد بن عوام (2651)، عوانہ بن حکم (4372)، حصین بن عبد الرحمن (1795) اور ہیثم بن عدی (6546) شامل ہیں۔ یہ سب کے سب راوی ضعیف اور نا قابل اعتماد ہیں۔[3] ان میں لوط بن یحیی اور عباد بن عوام اسی باغی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جو مسلسل بغاوتیں اٹھاتی رہی۔ عوانہ بن حکم، ہشام کلبی کے استاذ تھے۔ ہیثم بن عدی کو محدثین نے کذاب قرار دیا ہے۔ حصین بن عبد الرحمن اگرچہ قابل اعتماد تھے مگر ان کا حافظہ کمزور تھا اور وہ روایات کو خلط ملط کر دیا کرتے تھے۔

---

[2] ابن سعد۔ طبقات الکبری۔ 6/421-422

[3] ذہبی۔ سیر الاعلام النبلاء۔ راویوں کے نمبر کے مطابق دیکھا جا سکتا ہے۔

آپ ذہبی کے مشہور انسائیکلوپیڈیا "سیر الاعلام النبلاء" میں متعلقہ نمبر پر ان سب کے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اگر ان راویوں کی بیان کردہ روایتوں کو چھوڑ دیا جائے تو اس طرح سے بقیہ 25 روایتیں بچتی ہیں جن سے ہم واقعے کی حقیقت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آٹھویں صدی کے مشہور مورخ ابن کثیر نے بھی ابو مخنف وغیرہ کی ان روایتوں کو اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں درج کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:

> اہل تشیع اور روافض نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں بہت سا جھوٹ اور جھوٹی خبریں گھڑی ہیں۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے، اس کا بعض حصہ محل نظر ہے۔ اگر ابن جریر (طبری) وغیرہ حفاظ اور ائمہ نے اس کا ذکر نہ کیا ہوتا تو میں اسے بیان نہ کرتا۔ اس کا اکثر حصہ ابو مخنف لوط بن یحیی کی روایت سے ہے جو کہ شیعہ تھا اور ائمہ کے نزدیک واقعات بیان کرنے میں ضعیف (ناقابل اعتماد) ہے۔ لیکن چونکہ وہ اخباری اور (خبروں کا) محفوظ کرنے والا ہے اور اس کے پاس ایسی چیزیں ہیں جو اس کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہیں، اس وجہ سے اس کے بعد کے کثیر مصنفین نے اس پر کڑی تنقید کی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔[4]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان ناقابل اعتماد مورخین کی روایتوں کو چھوڑ دیا جائے تو سانحہ کربلا سے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکے گا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا کوئی حل نہیں ہے تاہم دو صورتیں ایسی ہیں جن پر احتیاط سے عمل کیا جائے تو ہم کسی حد تک درست معلومات تک پہنچ سکتے ہیں۔

- ایک صورت تو یہ ہے کہ ان دونوں کی روایتوں کو چھوڑ کر دیگر روایات پر غور کیا جائے۔ اس سے جتنی معلومات حاصل ہوں، ان پر اکتفا کر کے بقیہ معاملات کو حسن ظن پر چھوڑ دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہی صحیح طرز عمل ہے۔
- دوسری صورت یہ ہے کہ ان ناقابل اعتماد مورخین کی روایات میں جہاں جہاں صحابہ کرام سے بغض ظاہر ہوتا ہو، اسے چھوڑ کر بقیہ معاملات میں ان کی باتوں کو پوری احتیاط سے قبول کیا جائے اور ان کی کسی ایسی بات کو قبول نہ کیا جائے جس میں ان کا تعصب جھلکتا ہو اور انہوں نے واقعات کو جذباتی انداز میں ایسے بیان کیا ہو کہ اس دور کے مسلمانوں کی نہایت ہی بھیانک تصویر سامنے آئے۔

حضرت حسین نے کوفہ کا سفر کیوں کیا؟

طبری، بلاذری اور ابن سعد کی روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوفہ کی باغی تحریک زیر زمین چلی گئی تھی۔ انہوں نے حضرت حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے اتحاد کو دل سے قبول نہ کیا تھا چنانچہ یہ لوگ حضرت حسن کو ترغیب دلاتے رہتے تھے کہ وہ صلح کے معاہدے کو توڑ کر حضرت معاویہ سے دوبارہ جنگ شروع کریں۔ حضرت حسن انہیں جھڑک

[4] ابن کثیر 11/577، اردو ترجمہ: 8/259

دیتے تو یہ آکر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے نقطہ نظر پر قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ آپ نے بھی حضرت معاویہ کے زمانے میں ان کی کوئی بات قبول نہ کی اور اپنی بیعت پر قائم رہے۔

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور یزید نے اقتدار سنبھالا تو گورنر مدینہ ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا کر انہیں یہ خبر سنائی اور ان سے بیعت طلب کی۔ حضرت حسین نے فرمایا: "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالی معاویہ پر رحمت فرمائے اور آپ کے اجر میں اضافہ کرے۔ بیعت کا جو سوال آپ نے کیا ہے تو میں پوشیدہ طور پر بیعت کرنے والا نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو بھی مجھ سے پوشیدہ بیعت نہیں لینی چاہیے بلکہ اعلانیہ لوگوں کے سامنے بیعت لینی چاہیے۔" ولید نے اس بات کو قبول کیا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب آپ سب لوگوں سے بیعت لیں گے تو ان کے ساتھ مجھ سے بھی لے لیجیے گا۔" ولید ایک عافیت پسند آدمی تھے اور جھگڑے جدال کو پسند نہ کرتے تھے، اس وجہ سے انہوں نے آپ کو جانے کی اجازت دے دی۔[5]

ابو مخنف نے حضرت حسین کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے متعلق دو متضاد الفاظ نقل کیے ہیں۔ ایک میں انہیں اس امت کا فرعون قرار دیا گیا ہے اور دوسرے میں آپ کے لیے رحمت کی دعا کی گئی ہے۔ اس کا اندازہ ہم خود لگا سکتے ہیں کہ کون سی بات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے شایان شان ہے۔

اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ مدینہ سے مکہ کا سفر کیا۔ آپ کے بھائیوں میں سے حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے اس موقع پر آپ کو جو رائے دی، وہ ابو مخنف نے یوں نقل کی ہے:

> بھائی جان! تمام مخلوق میں آپ سے بڑھ کر مجھے کوئی محبوب نہیں ہے اور آپ سے بڑھ کر دنیا میں کسی کے لیے بھی خیر خواہی کا کلمہ میرے منہ سے نہ نکلے گا۔ آپ اپنے لوگوں کے ساتھ یزید بن معاویہ سے اور سب شہروں سے جہاں تک ہو سکے، الگ رہیے۔ اپنے قاصدوں کو لوگوں کے پاس بھیجیے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کیجیے۔ اگر وہ آپ کی بیعت کر لیں تو اس پر اللہ کا شکر کیجیے اور اگر لوگ آپ کے علاوہ کسی اور پر متفق ہو جائیں تو اس سے آپ کے دین اور عقل میں اللہ کوئی کمی نہ فرمائے گا اور آپ کے احترام اور فضل میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ مجھے خطرہ ہے کہ آپ (بالخصوص عراق کے) ان شہروں میں سے کسی شہر میں داخل ہوں۔ لوگوں کا ایک گروہ آپ کے پاس آ جائے، پھر ان میں اختلاف پڑ جائے اور دوسرا گروہ آپ کے مخالف آ کھڑا ہو۔ کشت و خون کی نوبت آ جائے تو سب سے پہلے آپ کی طرف برچھیوں کا رخ ہو جائے اور آپ جیسے شخص کا، جو ذاتی اور خاندانی اعتبار سے بہترین ہے، آسانی سے خون بہا دیا جائے اور آپ کے سب اہل و عیال تباہی میں مبتلا ہوں۔
>
> حضرت حسین نے پوچھا: "بھائی! پھر میں کہاں جاؤں؟" محمد نے عرض کیا: "آپ مکہ چلے جایئے۔ وہاں اطمینان حاصل ہو جائے تو ٹھیک ورنہ پھر ریگستانوں اور پہاڑوں میں چلے جایئے۔ ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے پر منتقل ہو جایئے۔ دیکھتے رہیے کہ اونٹ کس طرف بیٹھتا ہے۔ اس وقت

[5] طبری۔ 4/1-140۔ بلاذری۔ 5/316۔

آپ رائے قائم کرتے ہوئے تمام امور کو براہ راست دیکھیے اور جو بات عقل کے تقاضوں پر پورا اترے، اسے اختیار کر لیجیے۔ اس سے بڑھ کر مشکل کا سامنا کسی صورت میں نہ ہو گا کہ معاملات کو ٹیڑھے رخ سے آپ کو دکھایا جائے۔" آپ نے فرمایا: "میرے بھائی! آپ نے خیر خواہی اور محبت کی بات کہی ہے۔ امید یہی ہے کہ آپ کی رائے درست اور موافق ہو گی۔[6]

واقدی کی روایت کے مطابق حضرت حسین کے علاوہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم بھی مدینہ سے نکل آئے تھے۔ راستے میں ان کی ملاقات ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ہوئی۔ یہ پوچھنے لگے: "کیا خبر ہے۔" انہوں نے جواب دیا: "معاویہ فوت ہو گئے اور یزید کی بیعت لی جا رہی ہے۔" ابن عمر نے ان دونوں سے کہا: "آپ دونوں اللہ سے ڈریے اور مسلمانوں کی اجتماعیت سے علیحدہ نہ ہوں۔" پھر ابن عمر مدینہ چلے آئے اور وہیں ٹھہرے رہے۔ کچھ دن انتظار کیا اور جب تمام شہروں کی بیعت کا حال انہیں معلوم ہوا تو ولید بن عتبہ کے پاس آ کر انہوں نے بھی بیعت کر لی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی۔[7]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کوئی ارادہ بغاوت کا نہ تھا۔ آپ کو یزید کی ولی عہدی پر اس وجہ سے شرح صدر نہیں تھا کہ اس سے کہیں ملوکیت کی راہ ہموار نہ ہو جائے اور باپ کے بعد بیٹے کی ولی عہدی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے چل نہ نکلے۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ یزید کے ساتھ مذاکرات کر کے یہ دروازہ بند کر دیا جائے۔ جب کوفیوں نے آپ کو خطوط لکھے تو آپ کو یہ راہ نظر آئی کہ کوفہ جا کر ان لوگوں کی مدد سے ایک پریشر گروپ بنائیں تا کہ یزید کے ساتھ مذاکرات میں آسانی ہو۔ یہ معاملہ پورا نہ ہو سکا اور راستے ہی میں سانحہ کربلا پیش آ گیا۔ اس بات کی تائید خود ابو مخنف کی اس روایت سے ہوتی ہے جو انہوں نے سانحہ کربلا کے بعد یزید سے متعلق نقل کی ہے:

> قال أبو مخنف، عن الحارث بن كعب، عن فاطمة بنت علي: (سانحہ کربلا کے بعد) یزید صبح و شام کھانے کے وقت علی بن حسین کو بھی بلا لیا کرتا تھا۔۔۔ جب ان لوگوں نے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو یزید نے علی بن حسین کو بلا بھیجا اور ان سے کہا: "اللہ مرجانہ کے بیٹے (ابن زیاد) پر لعنت کرے۔ واللہ اگر حسین میرے پاس آتے، تو مجھ سے **جو مطالبہ کرتے، میں وہی کرتا۔** ان کو ہلاک ہونے سے جس طرح ممکن ہوتا بچا لیتا خواہ اس کے لیے میری اولاد میں سے کوئی مارا جاتا۔ لیکن اللہ کو یہی منظور تھا، جو آپ نے دیکھا۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو، مجھے بتائیے اور میرے پاس لکھ کر بھیج دیجیے۔ پھر یزید نے سب کو کپڑے دیے اور اس قافلے (کے لیڈروں) کو ان لوگوں کے بارے میں خاص تاکید کی۔[8]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ارادہ کچھ مطالبات یزید کے سامنے پیش کرنے کا تھا، نہ کہ بغاوت کرنے کا۔ تاریخ طبری میں ایک ایسی روایت ملتی ہے جو ہشام کلبی، ابو مخنف اور واقدی تینوں کی سند سے خالی ہے۔ ہم یہی روایت یہاں درج کر

---

[6] ایضاً۔ 4/1-142۔ بلاذری 5/317۔

[7] ایضاً۔ 4/1-144

[8] ایضاً۔ 4/1-237

رہے ہیں۔ اس کے راوی عمار بن معاویہ الدہنی (d. 133/750) ہیں جو کہ اہل تشیع میں سے اعتدال پسند گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔[9] انہوں نے یہ روایت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد باقر رحمہ اللہ سے نقل کی ہے۔

حدثني زكرياء بن يحيى الضرير، قال: حدثنا أحمد بن جناب المصيصي – ويكنى أبا الوليد – قال: حدثنا خالد بن يزيد بن أسد بن عبد الله القسري، قال: حدثنا عمار الدهني: عمار الدہنی کہتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر (محمد باقر) سے عرض کیا: "مجھے حسین کی شہادت کا واقعہ اس طرح تفصیل سے سنائیے کہ مجھے محسوس ہو کہ گویا کہ میں وہاں خود موجود ہوں۔" انہوں نے فرمایا۔

جب معاویہ فوت ہوئے تو ولید بن عتبہ بن ابی سفیان مدینہ کے گورنر تھے۔ انہوں نے حسین کو بیعت لینے کے لیے پیغام بھیجا۔ انہوں نے فرمایا: "مجھے کچھ مہلت دیجیے۔" ولید نے ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا اور انہیں مہلت دی۔ اب آپ نکل کر مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں اہل کوفہ (کے کچھ لوگ) اور ان کے قاصد یہ پیغام لے کر آئے کہ ہم لوگ آپ پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں اور نماز جمعہ میں کوفہ کے گورنر کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔ آپ ہمارے پاس آ جائیے۔ اس زمانہ میں نعمان بن بشیر کوفہ کے گورنر تھے۔ حسین نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو بلوایا اور ان سے کہا: "آپ کوفہ روانہ ہو جائیے اور یہ دیکھیے کہ یہ لوگ مجھے کیا لکھ رہے ہیں۔ اگر وہ سچ لکھ رہے ہیں تو پھر میں ان کی طرف چلا جاؤں؟"

مسلم وہاں سے روانہ ہو کر مدینہ میں آئے اور یہاں سے دو راہبروں کو ساتھ لے کر کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ دونوں راہبر صحرا کی طرف سے چلے۔ راستے میں ان میں سے ایک پیاس کے مارے فوت ہو گیا۔ مسلم نے حسین کو لکھا: "اس سفر سے مجھے معاف رکھیے۔" حسین نے یہی لکھا کہ آپ کوفہ جائیے۔ مسلم آگے بڑھے اور آخر کار کوفہ پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے ایک شخص، جس کا نام ابن عوسجہ تھا، کے گھر قیام کیا۔ ان کے آنے کی شہرت اہل کوفہ میں پھیل گئی اور لوگ آ آ کر بیعت کرنے لگے۔ بارہ ہزار آدمیوں نے ان کی بیعت کی۔

یزید کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر (گورنر کوفہ) نعمان بن بشیر سے کہا: "یا تو آپ کمزور ہیں یا پھر کمزور بنتے ہیں۔ شہر میں فساد پھیل رہا ہے (اور آپ کچھ نہیں کرتے۔) نعمان نے فرمایا: "اگر اللہ کی اطاعت میں میں کمزور سمجھا جاؤں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اللہ کی نافرمانی میں صاحب قوت کہلاؤں۔ میں ایسا شخص نہیں ہوں کہ جس بات پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے، اس کا پردہ فاش کروں۔" اس شخص نے ان کی یہ بات یزید کو لکھ بھیجی۔

یزید نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام کو بلایا، جس کا نام سرجون تھا اور وہ اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ اس نے سرجون کو ساری بات بتلائی۔ اس نے کہا: "اگر معاویہ زندہ ہوتے تو کیا آپ ان کی بات مان لیتے؟" یزید نے کہا: "ہاں۔" اس نے کہا: "پھر میری بات مانیے۔ کوفہ کے لیے (موجودہ گورنر بصرہ) عبید اللہ بن زیاد سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے۔ اسی کو وہاں کی حکومت دے دیجیے۔" اس سے پہلے یزید، ابن زیاد سے ناراض تھا اور اسے بصرہ کی گورنری سے بھی معزول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے لکھ بھیجا: "میں آپ سے خوش ہوں۔ میں نے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری بھی آپ کے سپرد کی۔" ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ مسلم بن عقیل کا پتہ چلایے اور وہ ہاتھ آ جائیں تو انہیں بھی قتل کر دیجیے۔

[9] ذہبی۔ میزان الاعتدال 5/206۔ راوی نمبر 6011

عبید اللہ بصرہ کے سر کردہ لوگوں کو لے کر سر اور منہ کو لپیٹے کوفہ میں آ پہنچا۔ وہ جس مجمع سے گزرتا تھا، انہیں "السلام علیکم" کہتا تھا۔ جواب میں لوگ اسے "وعلیک السلام اے رسول اللہ کے نواسے" کہتے تھے۔ ان لوگوں کو شبہ تھا کہ تھا کہ یہ حسین بن علی ہیں۔ عبید اللہ گورنر کے محل میں آ پہنچا اور اپنے ایک آزاد کردہ غلام کو بلا کر تین ہزار درہم دیے اور کہا: "جاؤ، اس شخص کا پتہ چلاؤ جس سے اہل کوفہ بیعت کر رہے ہیں۔ اس سے یہی کہنا کہ میں حمص (شام) سے اسی بیعت کے لیے آیا ہوں اور یہ مال اسے دے دینا کہ اس سے اپنی طاقت میں اضافہ کیجیے۔" وہ شخص اسی طرح (مختلف لوگوں کے ذریعے) نرمی سے بات کر کے (باغی تحریک) کا سراغ چلانے کی کوشش کی۔ آخر کار اہل کوفہ میں سے ایک ایسے بوڑھے شخص کے پاس اسے کسی نے پہنچا دیا، جو بیعت لیا کرتا تھا۔ یہ غلام اب اس شخص سے ملا اور ساری بات کہہ دی۔ وہ بوڑھا کہنے لگا: "تمہارے ملنے سے میں خوش بھی ہوا ہوں اور مجھے تکلیف بھی ہوئی ہے۔ میں خوش اس بات سے ہوا ہوں کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی مگر غمگین اس لیے ہوا ہوں کہ ہماری تحریک ابھی مستحکم نہیں ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ بوڑھا اس غلام کو اندر لے گیا اور اس سے مال لے لیا اور اس سے بیعت لے لی۔ غلام نے آکر عبید اللہ کو ساری تفصیل بیان کر دی۔

عبید اللہ جب کوفہ میں آیا تو مسلم (بن عقیل) ابھی جس گھر میں تھے، اسے چھوڑ کر ہانی بن عروہ مرادی کے گھر میں چلے آئے۔ انہوں نے حسین بن علی کو لکھ بھیجا کہ بارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کر لی ہے، آپ ضرور تشریف لے آئیے۔ ادھر عبید اللہ نے کوفہ کے سر کردہ لوگوں سے پوچھا: "سب لوگوں کے ساتھ ہانی بن عروہ میرے پاس کیوں نہیں آئے ہیں۔" یہ سن کر محمد بن اشعث اپنی برادری کے لوگوں کے ساتھ ہانی کے پاس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ دروازے کے باہر ہی کھڑے ہیں۔ انہوں نے ان سے کہا: "گورنر نے ابھی آپ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے آنے میں بہت دیر کر دی ہے۔ آپ کو ان کے پاس جانا چاہیے۔" یہ لوگ اسی طرح اصرار کرتے رہے، آخر ہانی سوار ہو کر ان لوگوں کے ساتھ عبید اللہ کے پاس چلے آئے۔ اس وقت قاضی شریح بھی وہیں موجود تھے۔ ہانی کو دیکھ کر عبید اللہ نے شریح سے کہا: "لیجیے! آنے والا اپنے پاؤں پر چل کر ہمارے پاس آ گیا ہے۔" ہانی نے جب سلام کیا تو عبید اللہ کہنے لگا: "یہ بتائیں کہ مسلم کہاں ہیں؟" ہانی نے کہا: "مجھے کیا معلوم؟"

عبید اللہ نے اپنے غلام کو، جو درہم لے کر گیا تھا، بلایا۔ جب وہ ہانی کے سامنے آیا تو یہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہنے لگے: "گورنر کا اللہ بھلا کرے۔ واللہ! مسلم کو میں نے اپنے گھر میں نہیں بلایا، وہ خود سے آئے اور میری ذمہ داری بن گئے۔" عبید اللہ نے کہا: "انہیں میرے پاس لاؤ۔" وہ بولے: "واللہ! اگر وہ میرے پاؤں کے نیچے بھی چھپے ہوتے تو میں وہاں سے قدم نہ سرکاتا۔" عبید اللہ نے حکم دیا کہ اسے میرے قریب لاؤ۔ جب وہ لوگ ہانی کو اس کے قریب لے گئے تو اس نے ان پر ایسی ضرب لگائی کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہانی نے ایک سپاہی کی تلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اسے میان سے نکالیں لیکن لوگوں نے انہیں روک دیا۔ عبید اللہ نے کہا: "تمہارا قتل اب اللہ نے حلال کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر قید کا حکم دیا اور محل ہی کی ایک طرف انہیں قید کر دیا گیا۔۔۔۔۔ (اس کے بعد طبری نے بیچ میں بطور جملہ معترضہ ایک اور روایت بیان کی ہے۔ پھر دوبارہ عمار الدہنی کے بیان کی طرف واپس آئے ہیں۔)

ہانی اسی حالت میں تھے کہ یہ خبر (ان کے) قبیلہ مذحج کو پہنچ گئی۔ ابن زیاد کے محل کے دروازے پر ایک شور سا بلند ہوا۔ وہ سن کر پوچھنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ مذحج کے لوگ ہیں۔ ابن زیاد نے شریح سے کہا: "آپ ان لوگوں کے پاس جائیے اور انہیں بتائیے کہ میں کچھ بات چیت کے لیے ہانی کو صرف قید کیا ہے۔" اس نے اپنے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک کو جاسوسی کے لیے بھیجا کہ دیکھ کر آؤ کہ شریح کیا

بات کرتے ہیں؟ شریح کا گزر ہانی کی طرف سے ہوا تو ہانی نے کہا: "شریح! اللہ سے ڈریے۔ یہ شخص مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔" شریح نے محل کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا: "انہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ گورنر نے بس کچھ بات چیت کے لیے انہیں روک رکھا ہے۔" سب لوگ کہنے لگے: "شریح صحیح کہہ رہے ہیں۔ تمہارے سردار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔" یہ سن کر سبھی لوگ بکھر گئے۔

دوسری طرف مسلم (بن عقیل) کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنے شعار (خاص کوڈ ورڈز) کا اعلان کروا دیا اور اہل کوفہ میں سے چار ہزار آدمی ان کے پاس جمع ہو گئے۔ اب مسلم نے فوج کے مقدمہ (اگلے حصے) کو آگے بڑھایا، میمنہ و میسرہ (دایاں اور بایاں بازو) کو درست کیا اور خود قلب (درمیانہ حصہ) میں آ کر عبید اللہ کا رخ کیا۔ ادھر عبید اللہ نے اہل کوفہ کے سرکردہ لوگوں کو بلا کر اپنے خاص محل میں جمع کیا۔ مسلم جب محل کے دروازے پر پہنچے تو تمام سردار محل پر چڑھ کر اپنے اپنے برادری والوں کے سامنے آئے اور انہیں سمجھا بجھا کر واپس کرنے لگے۔ اب لوگ مسلم کے پاس سے سرکنے لگے۔ شام ہونے تک پانچ سو آدمی رہ گئے۔ جب رات کا اندھیرا پھیلا تو وہ بھی ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ مسلم اکیلے گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک مکان کے دروازہ پر بیٹھ گئے۔ ایک عورت نکلی تو اس سے پانی مانگا۔ اس نے پانی لا کر پلایا اور پھر اندر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر نکلی تو دیکھا کہ وہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہنے لگی: "اللہ کے بندے! آپ کا بیٹھنا تو مجھے مشکوک لگتا ہے، آپ یہاں سے اٹھ جائیے۔" انہوں نے کہا: "میں مسلم بن عقیل ہوں۔ کیا مجھے پناہ مل سکتی ہے؟" عورت نے کہا: "اندر آ جائیے۔ جگہ ہے۔"

اس عورت کا بیٹا محمد بن اشعث کے ساتھیوں میں سے تھا۔ اسے جب علم ہوا تو اس نے ابن اشعث کو حال سنایا اور اس نے جا کر عبید اللہ کو خبر کی۔ عبید اللہ نے اپنے پولیس چیف عمرو بن حریث مخزومی کو روانہ کیا اور ابن اشعث کے بیٹے عبد الرحمن کو ساتھ کر دیا۔ مسلم کو خبر ہوئی کہ گھر کو سپاہیوں نے گھیر لیا ہے۔ انہوں نے تلوار اٹھالی اور باہر آ کر لڑنا شروع کر دیا۔ عبد الرحمن نے کہا: "آپ کے لیے امان ہے۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور وہ انہیں لے کر عبید اللہ کے پاس آیا۔ عبید اللہ کے حکم سے محل کی چھت پر انہیں لے گئے اور انہیں قتل کر کے ان کی لاش لوگوں کے سامنے پھینک دی۔ پھر اس کے حکم سے لوگ ہانی کو گھسیٹ کر لے گئے اور سولی پر لٹکا دیا۔[10]

(اس کے بعد طبری نے ابو مخنف کی طویل روایتیں بیان کی ہیں اور پھر عمار الدہنی کی روایت کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا ہے۔)

اس بیان سے واقعے کی صورت یہ نکلتی ہے:

1۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے جب گورنر مدینہ نے یزید کی بیعت کا مطالبہ کیا تو انہوں نے مہلت طلب کی اور اس مہلت میں وہ مدینہ سے نکل کر مکہ آ پہنچے۔

2۔ جیسے ہی آپ مکہ پہنچے تو اہل کوفہ کا وفد آپ کے پاس آیا اور انہوں نے بہت سے خطوط لکھ کر آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ کوفہ میں اس وقت انارکی کی سی صورت پیدا ہو گئی تھی اور وہ باغی تحریک، جسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دبا دیا تھا، دوبارہ کھڑی ہو رہی تھی۔

[10] طبری۔ 4/1-147 to 150

3۔ آپ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو بھیجا کہ وہ کوفہ جا کر حالات کا جائزہ لیں۔ انہوں نے وہاں جا کر بیعت لینا شروع کر دی۔ اس دوران کوفہ پر عبید اللہ بن زیاد نے اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔ مسلم بن عقیل نے ایک فوج تیار کی اور گورنر کے محل کا محاصرہ کر لیا لیکن چند ہی گھنٹوں میں یہ فوج تتر بتر ہو گئی اور مسلم بن عقیل کو چھوڑ گئی۔ ابن زیاد نے انہیں گرفتار کروا کے قتل کر دیا۔

اس روایت کی تفصیلات کو درست مان لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی راوی نے حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کے بیان میں اپنی جانب سے کچھ نہیں ملایا ہو گا تو معلوم ہوتا ہے کہ اقدامات کی ابتدا باغی تحریک کی جانب سے ہوئی تھی جنہوں نے گورنر کے محل پر حملہ کا اقدام کیا۔ حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ ان باغیوں کی باتوں میں آ گئے اور انہوں نے قبل از وقت اقدام کر ڈالا۔ باغی تو چاہتے ہی یہ تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان سے کوئی "شہید" انہیں ملے جس کے نام کو لے کر وہ اپنی تحریک میں زور پیدا کریں۔ اس وجہ سے وہ عین موقع پر حضرت مسلم کا ساتھ چھوڑ گئے۔

دوسری طرف ابن زیاد نے ضرورت سے زیادہ سخت ری ایکشن ظاہر کیا اور انہیں قتل کروا دیا۔ پھر اس نے ہانی بن عروہ کو بھی نہایت اذیت ناک طریقے سے سولی دی۔ اس کا یہ عمل ایک طرف ظلم تھا اور دوسری طرف اس کے جذباتی پن کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر وہ اس موقع پر اپنے والد زیاد بن ابی سفیان رحمہ اللہ کی حکمت و دانش سے کام لیتا اور معاملات کو نرمی سے سلجھاتا تو بعد کے سانحات پیش نہ آتے۔

مسلم بن عقیل رحمہ اللہ نے اس موقع پر ابن اشعث، جو کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے برادر نسبتی تھے، کے ہاتھ ایک پیغام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام بھیجا جو طبری نے ابو مخنف کے حوالے سے نقل کیا ہے:

> اے اللہ کے بندے! میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھے امان تو نہیں دلا سکو گے۔ اتنا سلوک کیا میرے ساتھ کرو گے کہ اپنے کسی آدمی کو میری طرف سے حسین کے پاس بھیج دو۔ وہ آج کل ہی میں تم لوگوں کے پاس آنے کو روانہ ہو چکے ہوں گے اور ان کے اہل بیت بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ تم جو میری بے تابی دیکھ رہے ہو، محض اسی سبب سے ہے۔ میری طرف سے یہ پیغام ان تک پہنچا دینا کہ: مسلم نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ گرفتار ہو چکے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ آپ یہاں آئیں اور قتل کیے جائیں۔ آپ اہل بیت کو لے کر پلٹ جایئے، کوفیوں کے دھوکے میں نہ آیئے۔ یہ وہی لوگ ہیں، **جن سے چھٹکارا پانے کے لیے آپ کے والد فوت ہو جانے اور قتل ہو جانے کی تمنا رکھتے تھے۔** اہل کوفہ نے آپ سے بھی جھوٹ بولے اور مجھ سے بھی جھوٹ بولے۔ میری رائے کو جھٹلایئے گا نہیں۔[11]

ابو مخنف کی اس گھر کی گواہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کی باغی تحریک کے مقاصد کیا تھے۔

[11] ایضاً۔ 4/1-168

حضرت حسین عراق روانہ کیونکر ہوئے؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جب مکہ میں قیام کیا تو یہاں کے گورنر عمرو بن سعید تھے جو حضرت سعید بن عاص رحمہ اللہ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے حضرت حسین سے کوئی بد سلوکی نہ کی بلکہ نرمی کا برتاؤ کیے رکھا۔ اس دوران اہل کوفہ کی باغی تحریک نے آپ کی جانب خطوط کی بھرمار کر دی اور اپنے وفود ان کی جانب بھیجے اور کہا کہ ہم لوگوں نے گورنر حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے اور آپ بس جلد از جلد یہاں تشریف لے آیئے۔ حضرت حسین کا جو خط ابو مخنف نے نقل کیا ہے، اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ آپ کوفہ بغاوت کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

> بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حسین بن علی کی طرف سے اہل ایمان اور مسلمانوں کی جماعت کے نام۔ ہانی اور سعید آپ لوگوں کے خطوط لے کر میرے پاس آئے۔ آپ کے قاصدوں میں سے یہ دونوں افراد سب سے آخر میں آئے۔ جو کچھ آپ لوگوں نے لکھا ہے کہ کہا ہے کہ "ہماری راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے، آپ آیئے۔ شاید اللہ آپ کے سبب ہمیں حق و ہدایت پر اکٹھا کر دے۔" میں نے اپنے چچازاد بھائی، جن پر مجھے اعتماد ہے اور وہ میرے اہل خانہ میں سے ہیں، کو آپ کے پاس روانہ کیا ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ لوگوں کا حال اور سب کی رائے وہ مجھے لکھ بھیجیں۔ اگر ان کی تحریر سے بھی یہی بات ثابت ہو گئی کہ آپ کی جماعت کے لوگ اور صاحبان عقل و فضل آپ میں سے اس بات پر متفق الرائے ہیں، جس امر کے لیے آپ کے قاصد میرے پاس آئے ہیں، اور جو مضامین آپ کے خطوط میں میں نے پڑھے ہیں تو میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کے پاس چلا آؤں گا۔ اپنی جان کی قسم، قوم کا لیڈر تو وہی ہو سکتا ہے جو قرآن پر عمل کرے، عدل کو قائم کرے، حق کا طرفدار ہو اور اللہ کی ذات پر توکل رکھے۔ والسلام۔[12]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کوئی ارادہ بغاوت کا نہ تھا بلکہ آپ صرف اصلاح احوال چاہتے تھے۔ آپ سے متعلق یہ بدگمانی کرنا کہ آپ کوفہ جا کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، بالکل غلط ہے۔

حضرت حسین کی روانگی کے بارے میں مخلصین کا موقف کیا تھا؟

اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق روانگی کا ارادہ کیا تو آپ کے مخلص دوستوں اور رشتے داروں نے آپ کو نہایت ہی اچھے اور مخلصانہ مشورے دیے۔ یہ مشورے ابو مخنف کے حوالے سے طبری نے بھی درج کیے ہیں اور بلاذری نے دیگر راویوں کے حوالے سے انہیں درج کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو رشتے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے چچا تھے، مگر عمر میں ان سے کچھ ہی بڑے تھے کے بارے میں طبری نے بیان کیا ہے:

> عبداللہ بن عباس نے حسین کی روانگی کا سنا تو ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: "بھائی! لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ آپ عراق کی طرف روانہ ہونے لگے ہیں۔ مجھے تو بتا دیجیے کہ آپ کا ارادہ کیا ہے؟" انہوں نے کہا: "انشاء اللہ انہی دو دن میں روانگی کا ارادہ ہے۔" انہوں نے کہا:

---

[12] طبری۔ 4/1-151

"میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، ایسا نہ کیجیے۔ اللہ آپ پر رحمت فرمائے، مجھے یہ تو بتائیے کہ کیا آپ ان لوگوں میں جا رہے ہیں جنہوں نے اپنے حاکم کو قتل کر کے اپنے شہروں کی ایڈمنسٹریشن سنبھال لی ہے اور اپنے دشمن کو نکال باہر کیا ہے؟ اگر وہ ایسا کر چکے ہیں تو پھر چلے جائیے۔ اگر ان پر حاکم مسلط ہیں اور اسی کے عہدہ دار شہروں سے خراج وصول کر رہے ہیں اور پھر بھی یہ آپ کو بلا رہے ہیں تو یہ محض آپ کو جنگ چھیڑنے کے لیے بلا رہے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ یہ لوگ آپ کو دھوکہ دیں گے، آپ کو جھٹلائیں گے، آپ کی مخالفت کریں گے، آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور اگر آپ سے پیچھے ہٹ گئے تو پھر **یہی لوگ آپ کے خلاف انتہائی سخت حملہ کر دیں گے۔**" حسین نے جواب دیا: "میں اللہ سے خیر کا طالب ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے؟"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب بصرہ کے گورنر تھے تو باغی تحریک کے سرکردہ لوگوں کو نہایت قریب سے دیکھ چکے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ یہ باغی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو محض اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اس وجہ سے انہوں نے نہایت ہی شد و مد سے آپ کو عراق جانے سے روکا۔ اس کے برعکس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ آپ وہاں جا کر حالات کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اسی دن شام یا اگلے دن صبح ابن عباس پھر آئے اور کہنے لگے:

"بھائی! میں برداشت کرنا چاہتا ہوں مگر مجھے صبر نہیں آتا۔ مجھے اس راستے میں آپ کی ہلاکت اور تباہی کا اندیشہ ہے۔ اہل عراق (کی باغی تحریک) دراصل دغاباز لوگ ہیں۔ ان کے پاس ہرگز نہ جائیے۔ اسی شہر میں ٹھہرے رہیے کہ آپ اہل حجاز کے سردار ہیں۔ اگر اہل عراق آپ کو بلاتے ہیں تو انہیں لکھیے کہ اپنے دشمن سے پہلے اپنا پیچھا چھڑائیں۔ اس کے بعد آپ ان کے پاس چلے آئیں گے۔ اگر آپ کو یہ بات منظور نہیں ہے تو یمن کی طرف چلے جائیے۔ وہاں قلعے ہیں، پہاڑ ہیں اور ایک وسیع ملک ہے۔ آپ کے والد کے ساتھی وہاں موجود ہیں۔ آپ سب سے الگ تھلگ رہ کر ان سے خط و کتاب کیجیے اور قاصد بھیجیے۔ اس طریقہ سے مجھے امید ہے کہ جو بات آپ چاہتے ہیں، امن و عافیت کے ساتھ آپ کو حاصل ہو جائے گی۔" حضرت حسین نے جواب دیا: "بھائی! واللہ میں جانتا ہوں کہ آپ خیر خواہ اور شفیق ہیں۔ لیکن میں تو اب روانگی کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔"

ابن عباس بولے: "اگر جانا ہی ٹھہرا تو خواتین اور بچوں کو ساتھ نہ لے جائیے۔ واللہ! مجھے ڈر ہے کہ کہیں حضرت عثمان کی طرح آپ بھی اپنی خواتین اور بچوں کے سامنے قتل نہ کر دیے جائیں۔" [13]

ابو مخنف کو چونکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے خاص بغض ہے، اس وجہ سے اس نے ان کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جلد از جلد مکہ سے چلے جائیں۔ لیکن ان کی اپنی ایک روایت میں اس کے خلاف بات نظر آتی ہے جو اس نے عبداللہ بن سلیم اور مذری بن مشمعل سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہم لوگ کوفہ سے حج کے لیے نکلے اور مکہ پہنچے۔ آٹھ ذی الحجہ کو ہم حرم شریف میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر دن چڑھنے کے وقت حجر اسود اور خانہ کعبہ کے دروازے کے پاس کھڑے ہیں۔ ہم ان کے قریب ہو گئے۔ ہم نے ابن زبیر کو حسین سے کہتے

---

[13] ایضاً۔ 4/1-176

سنا: "اگر آپ چاہیں تو یہاں مقیم رہیں اور اس معاملے کی قیادت سنبھال لیجیے۔ ہم آپ کے مدد گار اور خیر خواہ ہوں گے اور آپ کی بیعت کر لیں گے۔" حسین نے جواب دیا: "میں نے اپنے والد سے یہ بات سنی ہے کہ ایک دنبہ مکہ کی حرمت کو حلال کر دے گا۔ میں وہ دنبہ نہیں بننا چاہتا ہوں۔" اس پر ابن زبیر نے کہا: "اچھا آپ یہاں رہیے اور حکومت میرے حوالے کر دیجیے۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گا اور کوئی بات آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو گی۔" حسین نے کہا: "مجھے یہ بھی منظور نہیں۔" پھر یہ دونوں حضرات چپکے چپکے باتیں کرتے رہے کہ ظہر کا وقت ہو گیا اور لوگ منی کی طرف چلے۔ حسین نے کعبہ کا طواف کیا، صفا و مروہ کی سعی کی، بال کتروائے اور عمرہ کا احرام کھول دیا۔ پھر آپ کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔[14]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن زبیر، حضرت حسین رضی اللہ عنہم سے کتنے مخلص تھے۔ حضرت حسین ابھی مقام تنعیم تک پہنچے تھے کہ ان کی ملاقات فرزدق شاعر سے ہوئی جو کہ عراق سے آ رہے تھے۔ انہوں نے بھی آپ کو جانے سے روکا اور کہا: "لوگوں کے دل آپ کے ساتھ اور تلواریں بنو امیہ کے ساتھ ہیں۔" اس کے بعد حضرت حسین کے کزن عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم نے انہیں ایک خط لکھا اور اسے اپنے بیٹوں عون اور محمد کے ہاتھ بھیجا۔ اس خط میں لکھا تھا:

"میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میرا خط دیکھتے ہی واپس چلے آیئے۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ جہاں جا رہے ہیں، وہاں آپ ہلاک نہ ہو جائیں اور اہل بیت کو تباہ نہ کر دیا جائے۔ اگر آپ کو قتل کر دیا گیا تو دنیا میں اندھیرا ہو جائے گا۔ اہل ہدایت کے راہنما اور اہل ایمان کا سہارا آپ ہی کی ذات ہے۔ روانگی میں جلدی نہ کیجیے، اس خط کے پیچھے میں بھی آ رہا ہوں۔ والسلام۔"

عبداللہ بن جعفر، (گورنر مکہ) عمرو بن سعید کے پاس گئے اور ان سے کہا: "حسین کے لیے ایک خط لکھیے، اس میں انہیں امان دینے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک اور احسان کرنے کا وعدہ ہو۔ انہیں لکھیے کہ وہ واپس چلے آئیں۔ شاید انہیں آپ کے خط سے اطمینان ہو جائے اور وہ راستے سے واپس آ جائیں۔" عمرو بن سعید نے کہا: "جو آپ کا جی چاہیے، لکھ کر میرے پاس لے آیئے، میں اس پر مہر لگا دوں گا۔" عبداللہ بن جعفر خط لکھ کر عمرو کے پاس لے آئے اور کہا: "اس پر مہر لگا کر اپنے بھائی یحیی بن سعید کے ہاتھ روانہ کیجیے۔ یحیی کے جانے سے انہیں اطمینان ہو جائے اور وہ سمجھ لیں گے کہ جو آپ نے لکھا ہے، دل سے لکھا ہے۔" عمرو نے ایسا ہی کیا۔ یہ خط لے کر یحیی اور ابن جعفر دونوں حضرت حسین کے پاس پہنچے۔ یحیی نے انہیں خط دیا اور دونوں نے واپسی پر بھرپور اصرار کیا۔[15]

خود ابو مخنف کی روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے گورنر مدینہ اور پھر گورنر مکہ، جو دونوں بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے، نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کوئی بد سلوکی نہ کی تھی اور یہ لوگ آپ کا بہت احترام کرتے تھے۔ عمرو بن سعید سے جیسے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے خط لکھوا لیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ حضرت حسین کی کتنی قدر کرتے تھے۔ مروان بن

---

[14] ایضاً۔ 4/1-177

[15] ایضاً۔ 4/1-179

حکم، جن کے بارے میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے اور ان کے خلاف سب و شتم کرتے تھے، نے گورنر عراق ابن زیاد کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

مروان نے ابن زیاد کو یہ خط بھیجا۔ اما بعد: آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حسین بن علی آپ کی طرف آ رہے ہیں۔ وہ سیدہ فاطمہ کے بیٹے ہیں جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں۔ خدا کی قسم! حسین سے زیادہ کوئی شخص بھی ہمیں محبوب نہیں ہے۔ خبردار! غیض وغضب میں آ کر کوئی ایسا فعل نہ کر بیٹھنا کہ اس کا مداوانہ ہو سکے اور عام لوگ اسے رہتی دنیا تک بھلا نہ سکیں۔ والسلام۔[16]

عمرو بن سعید بن عاص اور مروان بن حکم کے ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ اور آل علی میں دشمنی کی داستانیں، محض داستانیں ہی ہیں اور بنو امیہ کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ویسی ہی محبت تھی جیسی ہمیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے ان مخلص رشتے داروں کی بات کیوں نہ مانی اور اہل کوفہ کے باغیوں پر اعتبار کر کے وہاں کیوں چلے گئے؟ اوپر بیان کردہ خط کو پڑھنے سے اس کی جو وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا کوئی ارادہ بغاوت برپا کرنے کا نہ تھا بلکہ آپ ان باغیوں کو کنٹرول کر کے حکومت وقت کے معاملات کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ حکومت کے رویے سے بھی ظاہر یہی تھا کہ یہ لوگ حضرت حسین کا احترام کر رہے تھے۔ اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی یہی امید ہو گی کہ آپ کے خلاف کوئی سخت اقدام نہ کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہی ہوتا مگر باغیوں نے یہ نوبت آنے سے پہلے ہی کوفہ میں اقدام بغاوت کر دیا اور پھر مسلم بن عقیل کو چھوڑ کر خود غائب ہو گئے۔ گورنر کوفہ ابن زیاد نے بھی اپنی عجلت پسندی میں نہایت ہی ظالمانہ انداز میں انہیں شہید کر دیا جس سے حالات بگڑتے چلے گئے۔

سانحہ کربلا میں کیا واقعات پیش آئے؟

اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ کی جانب چلے۔ اس کے بعد کے واقعات طبری نے عمار الدہنی کے حوالے سے کچھ یوں نقل کیے ہیں:

حسین بن علی کو مسلم بن عقیل کا خط پہنچا تو آپ وہاں سے روانہ ہو کر ابھی اس مقام تک پہنچے تھے جہاں سے قادسیہ تین میل کے فاصلے پر تھا (یعنی ابھی کوفہ سے اسی نوے کلومیٹر دور تھے) کہ حر بن یزید تمیمی سے ملاقات ہوئی۔ حر نے پوچھا: "آپ کہاں جا رہے ہیں؟ فرمایا: " اسی شہر (کوفہ) جانے کا ارادہ ہے۔" حر نے عرض کیا: "واپس چلے جائیے۔ وہاں آپ کے لیے خیر کی کوئی امید نہیں ہے۔" یہ سن کر حسین نے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ مسلم کے سبھی بھائی آپ کے ساتھ تھے، انہوں نے کہا: "واللہ! جب تک ہم مسلم کا انتقام نہ لے لیں گے یا سب کے سب قتل نہ ہو جائیں گے، واپس نہیں جائیں گے۔" آپ نے کہا: "پھر تمہارے بغیر زندگی کا کیا مزا؟" یہ کہا اور آگے بڑھے۔ جب ابن زیاد کے لشکر کے ہراول دستے کے کچھ سوار آپ کو نظر آئے تو آپ کربلا کی طرف مڑے۔ ایک آبادی جو نشیب میں واقع تھی، اسے آپ نے اپنے لشکر کی پشت پر رکھا

[16] ابن کثیر۔ 11/507

تاکہ اگر جنگ ہو تو ایک ہی جانب سے ہو۔ آپ وہیں اترے اور اپنے خیمے نصب کر دیے۔ آپ کے ساتھیوں میں پینتالیس سوار اور سو پیادے تھے۔

عمر بن سعد بن ابی وقاص کو عبید اللہ بن زیاد نے رے (موجودہ تہران) کی گورنری دی اور یہ فرمان بھی لکھ دیا اور کہا: "میری جانب سے آپ ان صاحب (حسین) سے جا کر نمٹ لیجیے۔" ابن سعد نے کہا: "مجھے اس کام سے معاف رکھیے۔" ابن زیاد کسی طرح نہ مانا، تو اس نے کہا: "آج رات کی مہلت دیجیے۔" اس نے مہلت دی تو یہ اپنے معاملے میں سوچتے رہے۔ صبح ہوئی تو ابن زیاد کے پاس آئے اور اس کا حکم ماننے پر راضی ہو گئے اور حسین بن علی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب یہ ان کے پاس پہنچے تو حسین نے فرمایا: **"تین آپشنز میں سے ایک اختیار کر لیجیے۔ (1) یا تو مجھے چھوڑ دیجیے کہ میں جہاں سے آیا ہوں، وہیں چلا جاؤں۔ (2) یا مجھے یزید کے پاس جانے دیجیے۔ (3) یا کسی سرحد کی طرف چلا جانے دیجیے۔"** عمر بن سعد نے اس بات کو قبول کر لیا۔

(عمر نے ابن زیاد کو یہ بات لکھ بھیجی تو) اس نے جواباً لکھا: "وہ جب تک اپنا ہاتھ، ہمارے ہاتھ میں نہ پکڑا دیں، ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔" حسین نے فرمایا: "یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔" اس بات پر لڑائی چھڑ گئی اور حسین کے تمام ساتھی قتل ہو گئے۔ ان میں سترہ اٹھارہ نوجوان ان کے گھر والوں میں سے تھے۔ ایک تیر آ کر ایک بچے کو لگا جو ان کی گود میں تھے۔ حسین ان کا خون پونچھتے جاتے اور کہتے جاتے تھے: "اے اللہ! ہمارا اور ان لوگوں کا تو انصاف فرما۔ **انہوں نے ہمیں اس لیے بلایا کہ ہماری مدد کریں گے اور اب ہم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔"** اس کے بعد آپ نے ایک چادر منگوائی، اسے پھاڑا اور گلے میں پہن لیا۔ پھر تلوار لے کر نکلے، لڑے اور شہید ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ۔ آپ کو بنی مذحج کے ایک شخص نے قتل کیا اور آپ کا سر کاٹ کر ابن زیاد کے پاس لے گیا اور کہا: "میرے اونٹوں کو مال وزر سے بھر دیجیے۔ میں نے جلیل القدر بادشاہ کو قتل کیا ہے، میں نے اسے قتل کیا ہے جس کے ماں باپ بہترین مخلوق تھے اور جو نسب کے اعتبار سے خود بھی بہترین خلق ہے۔"

ابن زیاد نے اس شخص کو حسین کے سر کے ساتھ یزید کے پاس بھیج دیا۔ اس نے حسین کا سر مبارک یزید کے سامنے رکھ دیا۔ اس وقت اس کے پاس ابو برزہ اسلمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ چھڑی سے آپ کے لبوں کو کھٹکھٹا رہا تھا اور یہ شعر پڑھ رہا تھا: "ہم نے اپنے پیاروں کو خود قتل کر دیا، انہوں نے بھی ہمارے خلاف سرکشی اور نافرمانی کی تھی۔" ابو برزہ کہنے لگے: "اپنی چھڑی کو ہٹاؤ۔ واللہ! میں نے بار بار دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دہن یہاں رکھ کر بوسہ لیتے تھے۔"

ابن سعد نے حسین کے اہل وعیال کو ابن زیاد کے پاس روانہ کر دیا۔ آپ کے اہل بیت میں خواتین کے ساتھ ایک بیمار لڑکے کے سوا کوئی باقی نہ رہا تھا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ اسے بھی قتل کر دو۔ زینب یہ سن کر بیمار سے لپٹ گئیں اور کہنے لگیں: "جب تک مجھے بھی قتل نہیں کرو گے، تو اس وقت تک اسے بھی قتل نہ کر سکو گے۔" ابن زیاد کو ترس آ گیا اور وہ اس ارادے سے باز رہا۔ اس نے ان سب کا سامان تیار کروایا اور انہیں سوار کروا کے یزید کے پاس بھیج دیا۔ یہ لوگ جب یزید کے پاس پہنچے تو اس نے اہل شام میں اپنے درباریوں کو جمع کیا۔ اس کے بعد اہل بیت کو دربار میں لایا گیا۔ اہل دربار نے اسے مبارک دی۔ انہی لوگوں میں سے ایک نیلی آنکھوں اور سرخ رنگت والے نے اہل بیت میں سے ایک لڑکی کو دیکھ کر کہا: "امیر المومنین! یہ مجھے دے دیجیے۔" سیدہ زینب نے کہا: "واللہ! نہ یزید کو یہ اختیار حاصل ہے اور نہ تمہیں اور تم اس وقت تک یہ نہیں کر

سکتے جب تک کہ جب تک تم دین اسلام سے خارج نہ ہو جاؤ۔" یزید نے اس شخص کو روک دیا۔ پھر اس نے ان اہل بیت کو اپنے گھر والوں میں بھیج دیا۔ اس کے بعد ان کی روانگی کا سامان تیار کر کے ان سب کو مدینہ کی طرف روانہ کر دیا۔

جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو بنو عبد المطلب کی ایک خاتون بکھرے بالوں کے ساتھ سر پر چادر رکھے ان کے استقبال کو نکلیں۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھیں: "لوگو! تم کیا جواب دو گے جب پیغمبر تم سے پوچھیں گے کہ تم نے آخری امت ہو کر میرے بعد میری اولاد اور اہل بیت سے کیا سلوک کیا؟ کچھ لوگ ان میں سے قیدی ہوئے اور کچھ قتل کر کے خاک و خون میں لتھڑا دیے گئے۔ میں نے تمہیں جو ہدایت دی، اس کا بدلہ یہ نہ تھا کہ میرے خاندان کے ساتھ میرے بعد برائی کرو۔"[17]

سانحہ کربلا کا یہ واقعہ جو عمار الدہنی نے حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے، ان تفصیلات سے خالی ہے جو ابو مخنف نے روایت کی ہیں۔ ابو مخنف کی روایتیں تاریخ طبری کے مکتبہ مشکاۃ ورژن میں میں 90 صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں اور انہوں نے خوب نمک مرچ لگا کر واقعے کو بیان کیا ہے اور اس میں حسب عادت مختلف صحابہ پر چوٹیں بھی کی ہیں جن میں خاص کر حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نمایاں ہیں۔ ابو مخنف کی روایات میں بالکل اسی قسم کی جذباتیت پائی جاتی ہے جیسی ہم اپنے زمانے کے واعظوں اور ذاکروں کے بیانات میں دیکھتے ہیں۔ وہ صورتحال کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ گویا اس دور میں خیر بالکل رخصت ہو گئی تھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سوا تمام صحابہ و تابعین معاذ اللہ دین کی حمیت و غیرت سے خالی ہو گئے تھے اور انہوں نے غاصب اور ظالم حکمرانوں کو قبول کر لیا تھا۔

ابو مخنف کے مقابلے میں عمار الدہنی کی روایت ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ حضرت محمد باقر بن زین العابدین رحمہما اللہ ایک نہایت ہی قابل اعتماد راوی ہیں۔ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں اور آپ کے والد ماجد حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سانحہ کربلا کے چشم دید گواہ ہیں۔ عمار الدہنی نے آپ سے سن کر یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ کسی راوی نے اس واقعے میں اپنی جانب سے کچھ ملاوٹ نہیں کی ہے تو اس بیان سے ہم یہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

1۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر کوفہ کی جانب چلے۔ جب آپ اس کے قریب پہنچے تو آپ کی ملاقات حر بن یزید سے ہوئی اور حر نے آپ کو کوفہ جانے سے منع کیا۔ اس موقع پر حضرت حسین نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور واپسی کا ارادہ کیا لیکن مسلم بن عقیل کے بیٹوں نے آگے بڑھنے پر اصرار کیا جس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انہیں چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ابو مخنف کی روایت میں ہے:

عبد اللہ اور مذری نامی دو شخص، جن کا تعلق بنو اسد سے تھا، حج کو گئے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حج سے فارغ ہوئے تو ہمیں اس کے سوا اور کوئی فکر نہ تھی کہ راستہ ہی میں حسین تک پہنچ جائیں اور دیکھیں کہ ان کے ساتھ معاملہ پیش آیا ہے۔ ہم اپنی اونٹنیوں کو دوڑاتے ہوئے چلے (اور بالآخر

[17] طبری۔ 4/1-180-182

حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئے۔۔۔) ہم نے کہا: "ہمیں سچی خبر مل گئی ہے اور ہمارے بنو اسد ہی کے ایک ایسے شخص نے دی ہے جو صائب الرائے ہے اور فضل اور عقل رکھتا ہے۔ اس نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ ابھی کوفہ ہی میں تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی قتل ہو چکے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ان دونوں کے پاؤں پکڑ کر بازار میں گھسیٹتے ہوئی لایا گیا ہے۔" یہ سن کر آپ نے کہا: "انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان دونوں پر اللہ کی رحمت ہو۔" آپ بار بار یہی کہتے رہے۔

ہم نے عرض کیا: "ہم آپ کو اللہ کی قسم دیتے ہیں کہ اپنی جان اور اپنے اہل بیت کا خیال کیجیے اور اسی جگہ سے واپس چلے جائیے۔ کوفہ میں نہ کوئی آپ کا یار و مددگار ہے اور نہ آپ کے حمایتی ہیں بلکہ ہمیں تو خوف اس بات کا ہے کہ وہ لوگ آپ کی مخالفت کریں گے۔" یہ سن کر عقیل بن ابی طالب کے فرزند (مسلم کے بھائی) اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: "واللہ! جب تک ہم بدلہ نہ لیں گے، اس جگہ سے نہ ہلیں گے یا پھر ہمارا حال بھی وہی ہو جو ہمارے بھائی کا ہوا ہے۔" یہ سن کر آپ نے دونوں افراد کی طرف دیکھا اور فرمایا: "ان لوگوں کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔" ہم سمجھ گئے کہ آپ نے کوفہ کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ہم نے کہا: "اللہ آپ کے لیے بہتری کرے۔" آپ نے جواب دیا: "اللہ آپ دونوں پر بھی رحمت فرمائے۔" آپ کے بعض ساتھیوں نے کہا: "کہاں مسلم بن عقیل اور کہاں آپ۔ کوفہ میں آپ جائیں گے تو سب آپ کی طرف دوڑیں گے۔"[18]

2۔ ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مذاکرات کے لیے بھیجا جو کہ حضرت حسین کے قریبی رشتہ دار تھے اور طبری کی روایت کے مطابق مسلم بن عقیل نے انہی کو یہ وصیت کی تھی کہ وہ حضرت حسین تک ان کا پیغام پہنچا دیں کہ اہل کوفہ نے دھوکہ دیا ہے۔ آپ نے عمر سے فرمایا: "تین آپشنز میں سے ایک اختیار کر لیجیے۔(1) یا تو مجھے چھوڑ دیجیے کہ میں جہاں سے آیا ہوں، وہیں چلا جاؤں۔(2) یا مجھے یزید کے پاس جانے دیجیے۔(3) یا کسی سرحد کی طرف چلا جانے دیجیے۔" عمر نے اس بات کو قبول کر لیا مگر ابن زیاد نہ مانا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اسی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا بغاوت کا کوئی ارادہ نہ تھا اور اگر کہیں ذہن میں یہ خیال آیا بھی تھا تو اس وقت دور ہو گیا تھا۔ اگر ابن زیاد انہیں یزید کے پاس جانے دیتا تو آپ اپنے تحفظات یزید کے سامنے پیش کر دیتے۔

3۔ ابن زیاد نے اصرار کیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پہلے اس کے پاس آ کر اس کے ہاتھ پر یزید کی بیعت کریں۔ حضرت حسین نے اس کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ پہلے مسلم بن عقیل کو قتل کر چکا تھا۔ بات بڑھ گئی اور جنگ شروع ہو گئی۔ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ آپ کی شہادت کے بعد آپ کے اہل و عیال کو ابن زیاد کے پاس لایا گیا جس نے آپ کے سر مبارک سے گستاخی کی۔ پھر ان سب کو یزید کے پاس بھیج دیا گیا۔ یزید کے دربار میں موجود ایک شخص نے اہل بیت کی ایک خاتون پر بری نظر ڈالی تو یزید نے اسے منع کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ان سب کو اعزاز و اکرام کے ساتھ مدینہ بھیج دیا۔

[18] ایضاً۔ 4/1-187

حضرت حسین کا منصوبہ کیا تھا؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اگر کوفہ کی طرف جا رہے تھے تو آپ کا پلان کیا تھا؟ بالفرض اگر اہل کوفہ آپ کے ساتھ عہد شکنی نہ کرتے تو کیا واقعات پیش آتے؟ تاریخ کی کتب میں ہمیں آپ کے اپنے الفاظ میں آپ کے ارادے کی تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ یہ بعض تجزیہ نگاروں کی محض قیاس آرائی ہی ہے کہ آپ کوفہ کی حکومت سنبھال کر اہل شام کے ساتھ جنگ کرتے۔ طبری میں ہشام کلبی کی ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حر بن یزید کی سرکردگی میں سرکاری فوج نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ جانے سے روکا تو آپ نے اس موقع پر آپ نے اہل کوفہ پر مشتمل اس سرکاری فوج سے ایک خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

قال هشام: حدثني لقيط، عن علي بن الطعان المحاربي:۔۔ آپ نے حجاج بن مسروق جعفی کو حکم دیا کہ وہ اذان کہیں۔ انہوں نے اذان دی اور اقامت کی باری آئی تو آپ (حضرت حسین) تہبند، چادر اور جوتے پہنے نکلے۔ اللہ تعالی کی حمد و ثنا کی اور فرمایا: "اے لوگو! میں اللہ عزوجل سے اور آپ سب لوگوں کے سامنے (اپنے آنے کا) سبب بیان کرتا ہوں۔ اس وقت تک میں آپ لوگوں کے پاس نہیں آیا، جب تک آپ لوگوں کے خطوط اور آپ کے قاصد یہ پیغام لے کر میرے پاس نہیں آئے کہ آپ آیئے، **ہمارا کوئی حکمران نہیں ہے، شاید آپ کے سبب اللہ تعالی ہم سب لوگوں کو ہدایت پر متفق فرما دے۔** اب اگر آپ اسی بات پر قائم ہیں تو میں آپ کے پاس آ چکا ہوں۔ اگر آپ لوگ مجھ سے ایسا معاہدہ کر لیں جس سے مجھے اطمینان ہو جائے تو میں آپ کے شہر جانے کو تیار ہوں۔ اگر آپ لوگ ایسا نہیں کرتے اور میرا آنا آپ کو ناگوار گزرا ہے تو جہاں سے میں آیا ہوں، وہیں واپس چلا جاتا ہوں۔" یہ سن کر سب خاموش رہے۔ آپ نے موذن سے کہا: "اقامت کہیے۔" انہوں نے اقامت کہی تو حسین نے حر سے پوچھا: "آپ لوگ کیا الگ نماز پڑھیں گے؟" انہوں نے کہا: "جی نہیں۔ ہم سب آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔" آپ نے سب کو نماز پڑھائی اور اپنے خیمہ میں چلے گئے۔۔۔۔

(پھر عصر کے بعد آپ نے ایک خطبہ دیا۔) حر نے آپ سے کہا: "واللہ! مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ کیسے خطوط تھے، جن کا آپ ذکر فرما رہے تھے۔" یہ سن کر آپ نے عقبہ بن سمعان سے کہا: **"وہ دونوں تھیلے جن میں لوگوں کے خطوط ہیں، لے آیئے۔" عقبہ دونوں تھیلے لائے جن میں خطوط بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے سب کے سامنے لا کر ان خطوط کو بکھیر دیا۔** [19]

اس روایت کے الفاظ " آپ آیئے، ہمارا کوئی حکمران نہیں ہے" سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا سفر اسی وجہ سے اختیار کیا کہ وہاں انارکی (عدم حکومت) کی سی کیفیت تھی۔ آپ اس انارکی کو ختم کرنے کے لیے کوفہ تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے ہی میں جب آپ پر یہ واضح ہو گیا کہ انارکی کی کیفیت ختم ہو گئی ہے اور وہاں حکومت قائم ہو گئی ہے تو پھر آپ نے اپنی رائے تبدیل کر لی اور واپسی کا عزم کیا۔

---

[19] ایضاً۔ 4/1-191

ہماری رائے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہستی سے یہ بات بہت بعید از قیاس ہے کہ آپ محض اپنے اقتدار کے لیے مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا کرتے۔ باغی تحریکوں نے اپنے قتل و غارت کو جسٹی فائی کرنے کے لیے یہ خیال آپ کی جانب منسوب کیا ہے۔ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں شدید بدگمانی ہے کہ آپ کے بارے میں ایسا خیال کیا جائے کہ آپ اپنے اقتدار کے لیے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانا چاہتے تھے۔ آپ کے بارے میں ہم حسن ظن رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا مقصد ایک پریشر گروپ بنا کر حکومت پر دباؤ ڈالنا تھا تاکہ اصلاح طلب امور کی اصلاح ہو سکے۔

کیا حضرت حسین کی رائے تبدیل ہوئی؟

تاریخی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سامنے اہل کوفہ کی اصل صورتحال آئی تو ان کی رائے تبدیل ہو گئی۔ یہ بات درست اور قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ طبری میں ابو مخنف ہی کی روایت میں بنو اسد کے دو افراد کا بیان اس طرح نقل ہوا ہے:

> قال أبو مخنف: وأما ما حدثنا به المجالد بن سعيد والصقعب بن زهير الأزدي وغيرهما من المحدثين، فهو ما عليه جماعة المحدثين، قالوا: حضرت حسین نے فرمایا: تین باتوں میں سے ایک بات میرے لیے اختیار کر لیجیے: جہاں سے میں آیا ہوں، وہیں چلا جاؤں۔ یا یہ کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دوں اور وہ اپنے اور میرے درمیان جو فیصلہ کرنا چاہے، کر لے یا پھر یہ کیجیے کہ مملکت اسلام کی سرحدوں میں سے کسی سرحد پر مجھے جانے دیجیے۔ میں ان لوگوں جیسا ایک شخص بن کر رہوں گا اور میرا نفع و نقصان ان کے نفع و نقصان کے تابع ہو گا۔[20]

بعینہ یہی بات اوپر عمار الدہنی کی روایت میں گزر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کس درجے میں امن پسند تھے اور آپ کسی صورت میں خونریزی نہ چاہتے تھے۔ "سر داد نہ داد دست در دست یزید" قسم کی باتیں محض باغی تحریکوں کے لٹریچر سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں۔ ان باغی تحریکوں نے اپنی تقویت کے لیے حضرت حسین کی شخصیت کو ایک کٹر اور بے لچک (Adamant) شخص کے طور پر پیش کیا ہے ورنہ آپ حالات کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ جب آپ کو مسلم بن عقیل کی خبر ملی تو آپ نے تمام لوگوں کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ان سے الگ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ طبری میں ہشام کلبی کی یہ روایت بیان ہوئی ہے:

> قال هشام: حدثنا أبو بكر بن عياش عمن أخبره: (حضرت حسین نے فرمایا:) ایک بہت ہی سخت واقعہ کی خبر مجھے پہنچی ہے۔ مسلم بن عقیل، ہانی بن عروہ اور عبد اللہ بن بقطر قتل کر دیے گئے ہیں۔ ہمارے شیعوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ آپ لوگوں میں سے جو کوئی جانا چاہے، چلا جائے۔ میں نے اپنی ذمہ داری آپ سے ختم کر دی ہے۔" یہ سنتے ہی وہ سب لوگ چلے گئے۔ کوئی دائیں طرف چلا گیا اور کوئی بائیں جانب۔

---

[20] ایضاً۔ 4/1-200

نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو لوگ مدینہ سے آپ کے ساتھ چلے تھے، وہی باقی رہ گئے۔[21]

عمار الدھنی اور ابو مخنف کی روایات میں موجود ہے کہ آپ نے سرکاری افواج کے سامنے تین آپشنز پیش کی تھیں: (1) یا تو مجھے چھوڑ دیجیے کہ میں جہاں سے آیا ہوں، وہیں چلا جاؤں۔(2) یا مجھے یزید کے پاس جانے دیجیے۔(3) یا کسی سرحد کی طرف چلا جانے دیجیے۔ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا کوئی ارادہ بغاوت یا جنگ کا نہ تھا۔

سانحہ کربلا کے ذمہ دار کون لوگ تھے؟

عمار الدہنی کی اوپر بیان کردہ روایت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عمر بن سعد کے ساتھ مذاکرات جاری تھے اور آپ یزید کے پاس جانے کے لیے تیار بھی ہو گئے تھے کہ بیچ میں لڑائی چھڑ گئی۔ یہ لڑائی کیسے چھڑی اور اس کا سبب کیا بنا، اس معاملے میں یہ روایت خاموش ہے۔ البتہ اس روایت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعض الفاظ ایسے بیان ہوئے ہیں جن سے کچھ اشارہ ملتا ہے کہ اس جنگ کے چھڑنے کے ذمہ دار کون لوگ تھے۔ دوران جنگ آپ نے اللہ تعالی سے فریاد کی: "اے اللہ! ہمارا اور ان لوگوں کا تو انصاف فرما۔ انہوں نے ہمیں اس لیے بلایا کہ ہماری مدد کریں گے اور اب ہم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔"

یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے مصداق نہ تو عمر بن سعد ہو سکتے ہیں اور نہ ابن زیاد اور اس کے ساتھی کیونکہ ان لوگوں نے تو آپ کو کوئی خط نہ لکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرکاری فوج میں وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھ کر کوفہ بلایا تھا۔ اب انہی لوگوں نے آپ پر حملہ کر کے آپ اور آپ کے ساتھیوں کو شہید کرنا شروع کر دیا تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے براہ راست قاتلوں میں جن لوگوں کے نام آئے ہیں، ان کے بیک گراؤنڈ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ باغی تحریک ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ ابو مخنف نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے براہ راست قاتلوں میں عبد الرحمن جعفی، قثم بن عمرو بن یزید الجعفی، صالح بن وہب الیزنی، سنان بن انس نخعی، خولی بن یزید الاصبحی اور ان کے لیڈر شمر بن ذی الجوشن کے نام لکھے ہیں۔ دیگر ذرائع سے ہمیں معلوم نہیں کہ یہی لوگ آپ کے قاتل تھے یا نہیں۔ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ شمر، جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل تھا اور خود ابو مخنف کی روایت کے مطابق یہ جنگ صفین میں زخمی ہوا تھا۔[22] سنان بن انس قبیلہ نخع سے تعلق رکھتا تھا اور مالک الاشتر نخعی کا رشتے دار تھا۔ تاہم پھر بھی ہمیں متعین طور پر کسی شخص کا نام نہیں لینا چاہیے کیونکہ ان روایتوں کے سوا ہمارے پاس کوئی اور ثبوت نہیں ہے اور روایات قابل اعتماد نہیں ہیں۔

---

[21] ایضاً۔ 4/1-188

[22] ایضاً۔ 3/2-221

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باغی تحریک ان لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں پر حملہ کیوں کیا۔ اگر یہ لوگ باغی تحریک سے تعلق رکھتے تھے تو انہیں اس کا فائدہ کیا ہوا؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں ان کا پول نہ کھل جائے۔ ان کے لکھے ہوئے خطوط حضرت حسین رضی اللہ عنہ اگر دکھا دیتے تو پھر حکومت کی جانب سے بھی انہیں غداری کی سزا ملتی۔ سانحہ کے بعد ان خطوط کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے جن کی دو بوریاں بھر کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ ساتھ لائے تھے۔ عین ممکن ہے کہ دوران جنگ ہی ان خطوط کو تلف کر دیا گیا ہو تا کہ ثبوت کو مٹا دیا جائے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ باغی تحریک کو ایک تازہ ترین "ہائی پروفائل شہید" کی تلاش تھی، جس کے نام پر اپنی تحریک کے لوگوں کو مشتعل کیا جا سکے۔ عین ممکن ہے کہ بعض باغیوں کے ذہن میں یہ محرک رہا ہو کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صورت میں انہیں ایسا شہید مل سکتا ہے۔ لاشوں کی سیاست ہمارے دور ہی کا خاصہ نہیں ہے بلکہ ہر دور میں باغی تحریکیں ایسا کرتی رہی ہیں۔ تاہم یہ بھی ایک ممکنہ تھیوری ہے۔ حقیقت کا علم صرف اللہ تعالی کو ہے اور وہی روز قیامت اسے واضح فرمائے گا۔ روایات کی بنیاد پر متعین طور پر کوئی بات کہنا مشکل ہے۔

سانحہ کربلا میں عمر بن سعد کا کردار کیا تھا؟

عمر بن سعد کے بارے میں طبری وغیرہ میں جتنی روایات بیان ہوئی ہیں، وہ ابو مخنف کے توسط سے ہوئی ہیں، اس وجہ سے ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان روایات سے عمر بن سعد کی دو متضاد تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ایک تصویر یہ ہے کہ انہوں نے "رے" کی گورنری کے لالچ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف کاروائی کی اور دوسری تصویر یہ نظر آتی ہے کہ وہ حضرت حسین کے ساتھ مخلص تھے۔ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مطالبات کو بھی مان لیا تھا اور جب آپ شہید ہوئے تو اتنا روئے تھے کہ ان کی داڑھی تر ہو گئی تھی۔ اب ان کے دل میں کیا تھا، ہمیں اس معاملے کو اللہ تعالی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جو شخص بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذمہ دار ہو گا، وہ اللہ تعالی کے ہاں سزا پائے گا۔ روایات کی بنیاد پر ہمیں کسی کے بارے میں رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔

سانحہ کربلا میں ابن زیاد کا کردار کیا تھا؟

ابن زیاد کے بارے میں روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسی نے اپنی افواج کو سختی سے نمٹنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جب تین آپشنز پیش کیں تو یہ اس پر اڑ گیا تھا کہ آپ پہلے اس کے پاس آ کر اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ سانحہ کے بعد جب حضرت حسین کے اہل و عیال کو اس کے پاس لے جایا گیا تو اس نے کسی افسوس کا اظہار بھی نہیں کیا اور نہ ہی اپنی افواج سے اس پر پوچھ گچھ کی تھی کہ واقعہ کیوں اور کیسے ہوا؟ نہ ہی اس نے ذمہ داروں کا تعین کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی کاروائی کی۔ اس کے بارے میں اس سے کوئی مختلف بات روایات میں درج نہیں ہے۔ طبری کی بعض روایات میں یہ ہے کہ ابن زیاد کی والدہ مرجانہ ایک نیک خاتون تھیں اور انہوں نے اپنے بیٹے کو بہت لعن طعن کی تھی۔ باقی حقیقت کا علم اللہ تعالی کو ہے کیونکہ ہمارے پاس سوائے ان روایات کے اور کچھ نہیں ہے۔

سانحہ کربلا میں یزید کا کردار کیا تھا؟

سانحہ کربلا میں یزید کے کردار کے بارے میں دو متضاد تھیوریز پیش کی جاتی ہیں اور دونوں کی بنیاد یہی تاریخی روایتیں ہیں: ایک تھیوری تو یہ ہے کہ ابن زیاد نے یزید کے حکم سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر فوج کشی کی اور یزید نے آپ کی شہادت پر خوشی کا اظہار کیا۔ یہ تمام کی تمام روایات ابو مخنف نے بیان کی ہیں۔ دوسری تھیوری یہ ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ ابن زیاد نے اپنی طرف سے سختی کی۔ پھر باغی تحریک کے جو لوگ فوج میں شامل تھے، ان کے اقدام کے نتیجے میں یہ حادثہ رونما ہوا۔ یزید کو اس کی جب اطلاع ملی تو اس نے افسوس کا اظہار کیا تاہم اس نے ان قاتلین کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی۔

تاریخ طبری میں ابو مخنف ہی کی بیان کردہ بعض روایات موجود ہیں، جن سے اس دوسری تھیوری کی تائید ہوتی ہے۔ ابو مخنف کے بیان کے مطابق ابن زیاد نے جب مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے قتل کی خبر یزید کو بھیجی تو یزید نے کوفہ کی بغاوت پر قابو پا لینے پر ابن زیاد کی تعریف کی لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے متعلق لکھا:

> قال أبو مخنف: عن أبي جناب يحيى بن أبي حية الكلبي: ۔۔۔۔مجھے اطلاع ملی ہے کہ حسین بن علی عراق کی جانب روانہ ہوئے ہیں۔ سرحدی چوکیوں پر نگران مقرر کر دیجیے۔ جن کے بارے میں شک ہو، انہیں حراست میں لے لیجیے اور جس پر کوئی الزام ہو، اسے گرفتار کر لیجیے۔ لیکن جو خود آپ لوگوں سے جنگ نہ کرے، اس سے آپ بھی جنگ نہ کیجیے۔ جو بھی واقعہ پیش آئے، اس کی مجھے اطلاع دیجیے۔ والسلام۔[23]

سانحہ کربلا کے بعد یزید اور اس کے اہل خاندان کا طرز عمل ابو مخنف نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پوتی سیدہ فاطمہ رحمہا اللہ کے حوالے سے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

> قال أبو مخنف، عن الحارث بن كعب، عن فاطمة بنت علي: یزید نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے کہا: "نعمان! ان لوگوں کی روانگی کا سامان، جیسا مناسب ہو، کر دیجیے۔ اور ان کے ساتھ اہل شام میں سے کسی ایسے شخص کو بھیجیے جو امانت دار اور نیک کردار ہو۔ اس کے ساتھ کچھ سوار اور خدمت گار بھیج دیجیے کہ ان سب کو مدینہ پہنچا دے۔ اس کے بعد اس نے خواتین کے لیے حکم دیا کہ انہیں علیحدہ مکان میں ٹھہرایا جائے اور اس میں ضرورت کی سب چیزیں موجود ہوں۔ ان کے بھائی علی بن حسین (رحمہ اللہ) اسی مکان میں رہیں جس میں وہ سب لوگ ابھی تک رہ رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ سب لوگ (خواتین) اس گھر سے یزید کے گھر میں گئیں تو آل معاویہ میں سے کوئی خاتون ایسی نہ تھی جو حسین (رضی اللہ عنہ) کے لیے روتی اور نوحہ کرتی ہوئی ان کے پاس نہ آئی ہو۔ غرض سب نے وہاں پر سوگ منایا۔
>
> یزید صبح و شام کھانے کے وقت علی بن حسین کو بھی بلا لیا کرتا تھا۔۔۔۔جب ان لوگوں نے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو یزید نے علی بن حسین کو بلا بھیجا اور ان سے کہا: "اللہ مرجانہ کے بیٹے (ابن زیاد) پر لعنت کرے۔ واللہ اگر حسین میرے پاس آتے، تو مجھ سے جو مطالبہ کرتے، میں وہی کرتا۔ ان کو ہلاک ہونے سے جس طرح ممکن ہوتا بچا لیتا خواہ اس کے لیے میری اولاد میں سے کوئی مارا جاتا۔ لیکن اللہ کو یہی منظور تھا، جو آپ نے

---

[23] ایضاً۔ 4/1-173

دیکھا۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو، مجھے بتائیے اور میرے پاس لکھ کر بھیج دیجیے۔ پھر یزید نے سب کو کپڑے دیے اور اس قافلے (کے لیڈروں) کو ان لوگوں کے بارے میں خاص تاکید کی۔[24]

بلاذری نے اس ضمن میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی محمد بن علی رحمہ اللہ کا یہ واقعہ بیان کیا ہے:

حدثني أبو مسعود الكوفي عن عوانة قال: یزید نے ابن حنفیہ کو ملاقات کے لیے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر ان سے کہا: "حسین کی شہادت پر اللہ مجھے اور آپ کو بدلہ دے۔ واللہ! حسین کا نقصان جتنا بھاری آپ کے لیے ہے، اتنا ہی میرے لیے بھی ہے۔ ان کی شہادت سے جتنی اذیت آپ کو ہوئی ہے، اتنی ہی کو بھی ہوئی ہے۔ اگر ان کا معاملہ میرے سپرد ہوتا اور میں دیکھتا کہ ان کی موت کو اپنی انگلیاں کاٹ کر اور اپنی آنکھیں دے کر بھی ٹال سکتا ہوں تو بلا مبالغہ دونوں ہی ان کے لیے قربان کر دیتا، اگرچہ انہوں نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی اور خونی رشتہ کو ٹھکرایا تھا(یعنی اہل عراق کی دعوت پر وہاں چلے گئے تھے۔)

آپ کو معلوم ہو گا کہ ہم عوام کے سامنے حسین (کے اقدام) پر تنقید کرتے ہیں لیکن واللہ یہ اس لیے نہیں کہ عوام میں حضرت علی کے خاندان کو عزت و حرمت حاصل نہ ہو بلکہ ہم لوگوں کو اس سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومت و خلافت میں ہم کسی حریف کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔"

یہ سن کر ابن حنفیہ نے کہا: "اللہ آپ کا بھلا کرے اور حسین پر رحم فرمائے اور ان کی خطاؤں کو معاف کرے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے نقصان کو اپنا نقصان اور ہماری محرومی کو اپنی محرومی سمجھتے ہیں۔ حسین اس بات کے ہرگز مستحق نہیں ہیں کہ آپ ان پر تنقید کریں یا ان کی مذمت کریں۔ امیر المومنین! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ حسین کے بارے میں ایسی بات نہ کہیے جو مجھے ناگوار گزرے۔" یزید نے جواب دیا: "میرے چچازاد بھائی! میں حسین کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہوں گا جس سے آپ کا دل دکھے۔"

اس کے بعد یزید نے ان سے ان کے قرض کے بارے میں پوچھا۔ محمد بن علی نے فرمایا: "مجھ پر کوئی قرض نہیں ہے۔" یزید نے اپنے بیٹے خالد بن یزید سے کہا: "میرے بیٹے! آپ کے چچا کم ظرفی، ملامت اور جھوٹ سے بہت دور ہیں۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کہہ دیتا کہ مجھ پر فلاں فلاں کا قرض ہے۔" پھر یزید نے حکم جاری کیا کہ انہیں تین لاکھ درہم دیے جائیں جو انہوں نے قبول کر لیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں پانچ لاکھ درہم کیش اور ایک لاکھ کا سامان دیا۔

یزید ابن حنفیہ کے ساتھ بیٹھتا تھا اور ان سے فقہ اور قرآن سے متعلق سوالات کرتا تھا۔ جب انہیں الوداع کرنے کا وقت آیا تو اس نے ان سے کہا: "ابو القاسم! اگر آپ نے میرے اخلاق میں کوئی برائی دیکھی ہو تو بتائیے، میں اسے دور کر دوں گا۔ اور آپ جس چیز کی طرف اشارہ کریں گے، اسے درست کر دوں گا۔" ابن حنفیہ نے فرمایا: "واللہ! میں نے اپنی وسعت کے مطابق کوئی ایسی برائی نہیں دیکھی جس سے آپ نے لوگوں کو روکا نہ ہو اور اس معاملے میں اللہ کے حق کے بارے میں بتایا نہ ہو۔ یہ اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے لیے حق بات کو واضح کریں اور

[24] ایضاً۔ 4/1-237

اسے نہ چھپائیں۔ میں نے آپ میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا ہے۔"[25]

ابو مخنف سے روایات کا جو دوسرا گروپ مروی ہے، ان کے مطابق شہادت حسین پر یزید خوش ہوا اور اس میں اس کی رضا شامل تھی۔ اس کے برعکس انہی ابو مخنف کی اوپر بیان کردہ روایات سے اس کے برعکس تصویر سامنے آتی ہے کہ یزید کو سانحہ کربلا کا شدید افسوس ہوا اور وہ اس نے اس سانحے پر غم کا ظہار کیا۔ اب یہ شخص کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ ابو مخنف کی روایات میں سے کن روایات کو قبول کرتا ہے۔ اتنی صدیوں بعد کسی کا دل چیر کر نہیں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یزید اس سانحہ میں ملوث نہیں تھا تو اس نے ابن زیاد اور سانحہ کربلا کے دیگر ذمہ داروں کو سزا کیوں نہیں دی؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ایک تحقیقاتی ٹیم بناتا جس میں ایسے دیانت دار لوگ ہوتے جن پر امت کو کامل اعتماد ہوتا۔ یہ لوگ سانحہ کربلا کی تحقیقات کرتے اور جو لوگ اس میں ملوث تھے، انہیں قرار واقعی سزا دی جاتی۔ یہ ایسا سوال ہے جس کا کتب تاریخ کے صفحات میں کوئی جواب نہیں ہے۔ نرم سے نرم الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ یزید کی ایسی بھیانک غلطی تھی جس کے نتیجے میں اس کا نہ تو اقتدار قائم رہ سکا اور اس کے مخالفین نے اس کے اس اقدام کو بنیاد بنا کر اس پر لعن طعن کا وہ سلسلہ شروع کیا جو اب تک جاری ہے۔ خود یزید کو سانحہ کربلا کی وجہ سے سخت نقصان ہوا۔ اس کی اب تک جو رہی سہی ساکھ تھی، وہ بالکل ہی ختم ہو گئی اور لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ طبری ہی کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یزید کو اس نقصان کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ ابن زیاد سے سخت نفرت کرنے لگا تھا۔

قال أبو جعفر: وحدثني أبو عبيدة معمر بن المثنى أن يونس بن حبيب الجرمي حدثه، قال: تھوڑے ہی دن بعد وہ (یزید) پشیمان ہوا اور اکثر کہا کرتا تھا: "اگر میں ذرا تکلیف گوارا کرتا اور حسین کو اپنے ہی گھر میں رکھتا، جو وہ چاہتے، انہیں اس کا اختیار دے دیتا۔ اس لیے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی تھی اور ان کے حق اور قرابت کی رعایت تھی۔ اگر میری حکومت کی اس میں سبکی بھی ہو جاتی تو اس میں کیا حرج تھا۔ اللہ ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر لعنت کرے کہ اس نے انہیں لڑنے پر مجبور کیا۔ وہ تو یہ کہتے تھے کہ مجھے واپس چلا جانے دو یا (مجھے یزید کے پاس بھیج دو) تا کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دوں یا مسلمانوں کی سرحدوں میں سے کسی سرحد کی طرف مجھے نکل جانے دو۔ وہاں اللہ عزوجل میری حفاظت کرے گا۔ یہ بات بھی اس نے نہ مانی اور اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کو کوفہ کی طرف واپس لایا اور قتل کر دیا۔ اس واقعہ سے اس نے مسلمانوں کے دلوں میں میرا بغض بھر دیا اور میری عداوت کا بیج بویا۔ اب نیک ہوں یا بد، سب مجھ سے اس بات پر بغض رکھتے ہیں کہ میں نے حسین کو قتل کیا۔ لوگ اسے بہت بڑا واقعہ سمجھتے ہیں۔ مجھے ابن مرجانہ سے کیا غرض ہے؟ اللہ اس پر لعنت کرے اور اس پر اپنا غضب نازل کرے۔[26]

---

[25] بلاذری۔ انساب الاشراف۔3/470۔ باب: محمد بن حنفیہ

[26] طبری۔4/1-270

اسی روایت کے کچھ بعد بیان ہے کہ یزید کے مرنے کے بعد ابن زیاد نے ایک خطبہ دیا اور اس کی مذمت بھی کی۔ وہ جانتا تھا کہ یزید اس کے ساتھ بہت برا پیش آنے والا ہے اور اس وجہ سے اس سے خائف تھا۔ ممکن ہے کہ یزید اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتا تو ابن زیاد کے خلاف کاروائی بھی کر ڈالتا لیکن بہر حال اب بہت دیر ہو چکی تھی اور شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا جو نقصان اسے پہنچنا تھا، وہ پہنچ چکا تھا۔

سانحہ کربلا میں باغی تحریک کا کردار کیا تھا؟

سانحہ کربلا میں کوفہ کی باغی تحریک کا کردار نمایاں ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ آنے کی دعوت دی اور خطوط کا تانتا باندھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو بغاوت پر اکسایا اور پھر عین محاصرے کی حالت میں ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اس بات کا غالب امکان ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو براہ راست شہید کرنے والوں میں وہ لوگ شامل تھے جو باغی تحریک سے متعلق تھے۔ ان میں شمر بن ذی الجوشن کا نام نمایاں ہے جو جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل تھا۔ حضرت حسین نے اپنی شہادت سے کچھ دیر پہلے جو دعا فرمائی، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو شہید کرنے والے یہی لوگ تھے۔ "اے اللہ! ہمارا اور ان لوگوں کا تو انصاف فرما۔ انہوں نے ہمیں اس لیے بلایا کہ ہماری مدد کریں گے اور اب ہم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔"

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے نتائج پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہادت سے یزید کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا البتہ باغی تحریک کی پانچوں انگلیاں گھی میں آ گئیں۔ انہوں نے حضرت حسین کے نام کو خوب کیش کروایا اور چار سال کی تیاری کر کے آپ کے نام پر ایک زبردست بغاوت اٹھائی۔ جیسا کہ ہم باغی تحریکوں کے لائف سائیکل میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ لوگ "شہیدوں" کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ ان کا نام استعمال کر کر کے لوگوں کے جذبات بھڑکا سکیں۔ اور پھر اگر شہید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے درجے کا شخص ہو تو کیا کہنے۔ یہی وجہ ہے کہ باغیوں نے پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس آنے کی ترغیب دی، پھر جب آپ کوفہ کی طرف تشریف لے گئے تو انہوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد جب آپ شہید ہو گئے تو آپ کے نام کو خوب استعمال کر کے اگلی نسلوں کے جذبات بھڑکائے اور پے در پے بغاوتیں اٹھائیں۔ تاہم اللہ تعالی نے ان کے تمام منصوبوں کو ناکام کر دیا اور ان کی کوئی بغاوت بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد یہی معاملہ اس باغی تحریک نے آپ کے پوتے جناب زید بن علی رحمہما اللہ اور ان کے کزن نفس الزکیہ علیہ الرحمۃ کے ساتھ کیا۔

حضرت عثمان اور حضرت حسین کی شہادتوں میں کیا مناسبت تھی؟

حضرت عثمان اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی شہادتوں میں بہت سے پہلو مشترک ہیں۔ سب سے پہلے یہ تقابل حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کیا تھا جس وقت انہوں نے حضرت حسین کو عراق جانے سے روکا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا: "اگر جانا ہی ٹھہرا تو خواتین اور بچوں کو ساتھ نہ لے جایئے۔ واللہ! مجھے ڈر ہے کہ کہیں حضرت عثمان کی طرح آپ بھی اپنی خواتین اور بچوں کے سامنے قتل

نہ کر دیے جائیں۔" حضرت ابن عباس کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور حضرت حسین کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی طرح ان کے اہل و عیال کے سامنے شہید کیا گیا۔ حضرت عثمان کی شہادت سے کچھ ہی دیر پہلے جس آخری شخص نے آپ سے ملاقات کی تھی، وہ حضرت حسین ہی تھے۔

ان دونوں بزرگوں کی شہادتوں میں یہ پہلو بھی مشترک ہے کہ دونوں ہی کو نہایت مظلومیت کے ساتھ شہید کیا گیا۔ جیسے حضرت عثمان کے ساتھ حسن و حسین سمیت چند ہی ساتھی تھے جبکہ ان کے مخالفین ہزاروں کی تعداد میں تھے، ویسے ہی حضرت حسین کے ساتھ بھی چند ہی ساتھی تھے اور ان کے مخالفین بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

حضرت عثمان اور حسین رضی اللہ عنہما کی شہادتوں میں دوسری مناسبت یہ ہے کہ دونوں ہی باغی تحریک کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ تیسری مناسبت یہ ہے کہ جیسے قاتلین عثمان اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکے، ویسے ہی قاتلین حسین بھی خائب و خاسر رہے۔ حضرت عثمان کے قاتلوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ اقتدار پر قابض ہو جائیں اور کسی کٹھ پتلی خلیفہ کے پردے میں اپنا اقتدار قائم کر سکیں۔ حضرت علی، حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہم نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ بالکل اسی طرح قاتلین حسین کا مقصد یہ تھا کہ آپ کو شہید کر کے وہ یزید سے کچھ انعام و اکرام حاصل کریں۔ یزید نے ان کی یہ خواہش پوری نہ کی۔ جیسے قاتلین عثمان کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما نے چن چن کر گرفتار کیا اور پھر مقدمہ چلا کر انہیں موت کی سزا دی، بالکل اسی طرح قاتلین حسین کو بھی مختار ثقفی کے دور میں چن چن کر قتل کیا گیا۔

حضرت عثمان اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی شہادتوں میں ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ دونوں کے نام کو جنگ و جدال کے لیے استعمال کیا گیا۔ ناصبی فرقے نے حضرت عثمان کا نام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہما کے خلاف پراپیگنڈا کیا، بالکل ویسے ہی باغی تحریک نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام لے کر بنو امیہ کی حکومتوں کے خلاف پراپیگنڈا کیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے ادوار میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر کیا جانے والا پراپیگنڈا ختم ہو گیا جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام پر کیا جانے والا پراپیگنڈا اب بھی جاری ہے۔ اس معاملے میں کسی مخصوص فرقے کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ جب بھی جس باغی تحریک کو ضرورت پڑتی ہے، تو وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام استعمال کرتی ہے۔

یہاں پر تاریخ کے طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ حضرت حسین کے نام کے ساتھ ہی کیوں کیا جاتا ہے اور حضرت عثمان کو بالکل ہی نظر انداز کیوں کر دیا گیا ہے؟ اس کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے اور آپ کے خلاف اٹھنے والے باغی تھے۔ اس وجہ سے باغی تحریکوں کو آپ کا نام لینے میں کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ ایک ایسے باغی سے تشبیہ دی جاتی ہے جو ظالم حکمران کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد خون کو گرمانے والے اشعار پڑھے جاتے ہیں اور تحریکی کارکنوں کو بغاوت کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

یہ تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے دور کے سیاسی لیڈروں کے ہتھکنڈوں کو سمجھیں جو ان بزرگوں کے مقدس نام استعمال کر کے سادہ لوح نوجوانوں کو اپنے اقتدار کی راہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ لیڈر خود کم ہی جان دیتے ہیں اور اپنے سادہ لوح کارکنوں کو جان دینے کی زیادہ ترغیب دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوئی بغاوت نہیں کی اور نہ ہی فتنہ وفساد برپا کیا۔ آپ عراق میں انارکی کو ختم کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور جب آپ کو یہ علم ہوا کہ وہاں حکومت قائم ہو چکی ہے تو مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے آپ یزید کے پاس جا کر براہ راست معاملہ طے کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کے باوجود بھی آپ کو شہید کیا گیا تو پورے عالم اسلام میں آپ کے قتل کو مظلومانہ قتل ہی قرار دیا گیا۔

سانحہ کربلا کی داستانیں کس حد تک قابل اعتماد ہیں؟

سانحہ کربلا چونکہ ایک بڑا سانحہ تھا اور اس نے عالم اسلام پر بڑے نفسیاتی اثرات مرتب کیے، اس وجہ سے یہ مورخین کے زمرے سے نکل کر عام قصہ گو حضرات، شاعروں اور خطیبوں کی محفلوں کا موضوع بن گیا۔ ان کے ساتھ ساتھ باغی تحریک سے تعلق رکھنے والے قصہ گو خطیبوں اور شاعروں نے جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ ایک عام خطیب یا شاعر کو اس بات سے دلچسپی نہیں ہوتی ہے کہ واقعے کو ٹھیک ٹھیک بیان کیا جائے بلکہ اس کی دلچسپی اس بات سے ہوتی ہے کہ ایسی کیا بات کی جائے جس سے سامعین کے جذبات بھڑکیں، وہ روئیں اور چلائیں، اپنے گریبان چاک کر دیں اور خطیب یا شاعر کو اٹھ کر داد دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات نے سانحہ کربلا کی ایسی ایسی مبالغہ آمیز داستانیں وضع کیں جن کا تصور بھی شاید ابو مخنف نے بھی نہ کیا ہو گا۔ ان داستانوں کی کوئی سند نہیں ہے اور نہ یہ تاریخ کی کسی کتاب میں موجود ہیں۔ بس جاہل قسم کے واعظ اور شاعر انہیں بیان کر دیتے ہیں۔ یہاں ہم ان مبالغہ آمیز داستانوں کی چند مثالیں پیش کر رہے ہیں جو عام مشہور ہیں۔

1۔ یہ بات عام طور پر مشہور کر دی گئی ہے کہ کربلا میں تین دن تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت کا پانی بند کر دیا گیا تھا اور وہ پیاسے شہید ہوئے تھے۔ خود ابو مخنف کی روایت سے اس کی تردید ہوتی ہے جو کہ طبری میں موجود ہے:

قال أبو مخنف: حدثنا عبد الله بن عاصم الفائشي – بطن من همدان – عن الضحاك بن عبد الله المشرقي:۔۔۔ (سانحہ کربلا کی رات سیدہ زینب رضی اللہ عنہا شدت غم سے بے ہوش ہو گئیں۔) بہن کا حال دیکھ کر حضرت حسین کھڑے ہو گئے۔ **ان کے پاس آکر چہرہ پر پانی چھڑکا** اور فرمایا: "پیاری بہن! اللہ کا خوف کرو اور اللہ کے لیے صبر کرو۔ اس بات کو سمجھو کہ روئے زمین پر سب مرنے والے ہیں۔ اہل آسمان بھی باقی نہ رہیں گے۔ بس اللہ کی ذات کے سوا جس نے اپنی قدرت سے اس زمین کو پیدا کیا ہے اور جو مخلوق کو زندہ کر کے واپس لائے گا، وہی اکیلا اور تنہا ہے۔ سب چیزیں مٹ جانے والی ہیں۔ میرے والد مجھ سے بہتر تھے، میری والدہ تم سے بہتر تھیں، میرے بھائی مجھ سے بہتر تھے۔ مجھے اور ان سب کو اور ہر مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو دیکھ کر اطمینان ہو جانا چاہیے۔" اسی طرح کی باتیں کر کے آپ نے انہیں سمجھایا اور پھر فرمایا: "پیاری بہن! میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور میری اس قسم کو پورا کرنا۔ میں مر جاؤں تو میرے غم میں گریبان چاک مت کرنا،

منہ کو نہ پیٹنا، ہلاکت و موت کو نہ پکارنا۔"[27]



اس روایت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی ہمشیرہ کو جو نصیحت فرمائی، اسے ہماری خواتین کو بھی پلے باندھ لینا چاہیے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سانحہ کی آخری رات بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس پانی موجود تھا جو آپ نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے چہرے پر چھڑکا۔ ویسے بھی کربلا دریائے فرات کے کنارے پر واقع ہے۔ دریا کے پانی کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ اس کی وجہ سے اس علاقے میں ایک بڑی جھیل موجود ہے جو کہ "بحیرہ رزازہ" کہلاتی ہے اور کربلا شہر سے محض 18 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ آج بھی گوگل ارتھ کی مدد سے اس پورے علاقے کو دیکھا جا سکتا ہے اور یہاں اس کی فضائی تصویر دی جا رہی ہے۔ فرات ایک دریا ہے، کوئی چھوٹا موٹا چشمہ نہیں ہے جس کا پانی روک لیا جائے۔ اگر ایک جگہ دشمن نے پہرہ لگا دیا تھا تو دوسری جگہ سے پانی حاصل کیا جا سکتا تھا۔

اس روایت کے کچھ بعد طبری نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ایک بڑے ٹب میں مشک کو پانی میں حل کرنے کا حکم دیا تا کہ اسے جسم پر ملا جا سکے۔ اگر پینے کے لیے پانی نہ تھا تو پھر پہلوانوں کی طرح نورہ لگانے کے لیے ٹب جتنا پانی کہاں سے آ گیا؟

> قال أبو مخنف: حدثني فضيل بن خديج الكندي، عن محمد بن بشر، عن عمرو الحضرمي، قال: جب یہ لوگ (سرکاری فوج) آپ (حضرت حسین) سے جنگ کے لیے آگے بڑھے، تو آپ نے حکم دیا کہ بڑا خیمہ نصب کیا جائے۔ چنانچہ اسے نصب کر دیا گیا۔ آپ نے حکم دیا کہ ایک بڑے برتن میں مشک کو پانی میں حل کیا جائے۔ جب اسے حل کر لیا گیا تو اب آپ خیمہ کے اندر نورہ لگانے کے لیے گئے۔[28]

2۔ ایک اور مبالغہ آمیز بیان یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دشمن فوج کے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا

[27] ایضاً۔ 4/1-206

[28] ایضاً۔ 4/1-208

اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ بعض روایتوں میں یہ تعداد دو ہزار اور بعض میں تین لاکھ تک آئی ہے۔ اس روایت کے مبالغے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ہر آدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اسے پچھاڑ کر قتل کرنے کے لیے ایک منٹ بھی درکار ہو تو 2000 افراد کو قتل کرنے کے لیے 2000 منٹ تو چاہیے ہوں گے، یہ تقریباً 33 گھنٹے بنتے ہیں۔ ابو مخنف کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانحہ ایک آدھ گھنٹے میں ہو کر ختم ہو گیا تھا۔

3۔ ایک اور مبالغہ آمیز بیان یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر شہداء کے سروں کو نیزوں پر لگا کر انہیں آپ کے اہل خانہ کے ساتھ شہر بہ شہر جلوس کی صورت میں پھرایا گیا اور اس حالت میں بھی حضرت حسین کے مبارک لبوں سے تلاوت قرآن مجید کی آواز سنی گئی۔ اگر کوئی آج بھی یہ کام کرے تو اسے سیاسی خود کشی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو جہاں جہاں سے یہ جلوس گزرتا جاتا، بغاوت کھڑی ہوتی چلی جاتی۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسی کوئی حرکت کی جاتی تو اسے دیکھنے والے ہزاروں ہوتے۔ کیا ان میں سے کسی کی غیرت نے جوش نہیں مارا؟ اس وقت موجود درجنوں صحابہ اور ہزاروں تابعین میں سے کیا دو چار سو لوگ بھی ایسے نہ تھے جنہوں نے اس جلوس کو دیکھ کر یزید کے سامنے کلمہ حق ہی کہا ہو؟

اس قسم کی درجنوں مبالغہ آمیز داستانیں ہمارے ہاں خطیب اور شاعر عام بیان کرتے نظر آتے ہیں لیکن ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

سانحہ کربلا کے بارے میں بعد کی صدیوں میں کیا رواج پیدا ہوئے؟

سانحہ کربلا کے بارے میں چوتھی صدی ہجری کے بعد تین موقف رواج پا گئے ہیں۔ ایک گروہ نے اس سانحہ کے دن یوم عاشورہ 10 محرم کو ماتم اور غم کا دن بنا لیا۔ دوسرے گروہ نے اسے عید اور خوشی کا دن بنایا اور امت کی اکثریت نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو ایک سانحہ کے طور پر دیکھا۔ انہوں نے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو دیگر انبیاء و صلحاء کی شہادت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ابن کثیر (701-774/1301-1372) نے انہیں اس طرح بیان کیا ہے:

> روافض نے سن 400 ہجری کے آس پاس بنو بویہ کی حکومت میں حد سے تجاوز کیا۔ یوم عاشورہ کو بغداد وغیرہ شہروں میں ڈھول بجائے جاتے، راستوں اور بازاروں میں راکھ اور بھوسہ بکھیرا جاتا، دکانوں پر ٹاٹ لٹکائے جاتے اور لوگ غم اور گریہ کا اظہار کرتے۔ اس رات بہت سے لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی موافقت میں پانی نہ پیتے کیونکہ آپ کو پیاسا ہونے کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔ خواتین ننگے منہ نوحہ کرتیں اور اپنے سینوں اور چہروں پر طمانچے مارتے ہوئے برہنہ پا بازاروں میں نکلتیں۔ اس قسم کی دیگر بدعات شنیعہ اور قبیح خواہشات اور رسوائی کے من گھڑت کام کیے جاتے۔ اس قسم کے کاموں سے ان کا مقصد بنو امیہ کی حکومت کو ذلیل کرنا تھا کیونکہ حضرت حسین ان کے دور حکومت میں قتل ہوئے تھے۔

شام کے ناصبین نے یوم عاشورہ کو اس کے برعکس منانا شروع کیا۔ یہ لوگ یوم عاشورہ کو کھانے پکاتے، غسل کرتے، خوشبو لگاتے اور قیمتی لباس پہنتے اور اس دن کو عید کے طور پر مناتے۔ اس میں وہ طرح طرح کے کھانے پکاتے اور خوشی و مسرت کا اظہار کرتے اور ان کا مقصد روافض کی مخالفت

کرنا تھا۔ انہوں نے حضرت حسین کے قتل کی تاویل یہ کی کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور جس شخص کی بیعت پر لوگوں نے اتفاق کیا تھا، اسے معزول کرنے آئے تھے۔ (باغیوں کو سزا دینے کے ضمن میں) صحیح مسلم میں اس بارے میں جو وعیدیں اور انتباہ آیا ہے، یہ ان احادیث کی تاویل کر کے ان کا اطلاق حضرت حسین پر کرتے ہیں۔ یہ جاہلوں کی تاویل تھی جنہوں نے آپ کو شہید کیا۔ ان پر لازم تھا کہ وہ آپ کو شہید نہ کرتے بلکہ آپ نے جب تین آپشنز دی تھیں، تو ان میں سے کسی ایک کو قبول کر لیتے۔۔۔۔

ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ آپ کی شہادت پر غمگین ہو۔ بلاشبہ آپ سادات مسلمین اور علماء و صحابہ میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان بیٹی کے بیٹے تھے جو آپ کی بیٹیوں میں سب سے افضل تھیں۔ آپ عبادت گزار، دلیر اور سخی تھے لیکن شیعہ جس طریق پر بے صبری سے غم کا اظہار کرتے ہیں، وہ مناسب نہیں ہے۔ شاید اس کا اکثر حصہ تصنع اور دکھاوے پر مشتمل ہے۔ آپ کے والد (حضرت علی رضی اللہ عنہ) آپ سے افضل تھے۔ وہ بھی شہید ہی ہوئے تھے لیکن ان کے قتل کا ماتم حضرت حسین کے قتل کی طرح نہیں کرتے۔ بلاشبہ آپ کے والد 17 رمضان 40 ہجری کو جمعہ کے روز فجر کی نماز کو جاتے ہوئے قتل ہوئے تھے۔

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی قتل ہوئے تھے جو اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ آپ ماہ ذو الحجہ 36 ہجری کے ایام تشریق میں اپنے گھر میں محصور ہو کر قتل ہوئے تھے۔ آپ کی شاہ رگ کو کاٹ دیا گیا مگر لوگوں نے آپ کے قتل کے دن کو ماتم کا دن نہیں بنایا۔ اسی طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی قتل ہوئے جو حضرت عثمان اور حضرت علی سے افضل تھے۔ آپ محراب میں کھڑے ہو کر فجر کی نماز پڑھاتے اور قرآن پڑھتے ہوئے قتل ہوئے مگر لوگوں نے آپ کے یوم شہادت کو بھی ماتم کا دن نہیں بنایا۔ اسی طرح حضرت صدیق رضی اللہ عنہ آپ سے بھی افضل تھے اور لوگوں نے آپ کے یوم وفات کو بھی ماتم کا دن نہیں بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا اور آخرت میں اولاد آدم کے سردار ہیں، آپ کو اللہ تعالی نے اسی طرح وفات دی، جیسے آپ سے پہلے انبیاء نے وفات پائی تھی۔ کسی نے آپ کی وفات کے دن کو بھی ماتم کا دن نہیں بنایا اور نہ وہ کام کیے ہیں جو ان روافض کے جاہل لوگ حضرت حسین کی شہادت کے روز کرتے ہیں۔ نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن اور نہ آپ سے پہلے کسی شخص کی وفات کے دن کے بارے میں کسی شخص نے کسی ایسے مذکورہ معاملے کو بیان کیا ہے جس کا یہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کے دن کے بارے میں دعوی کرتے ہیں۔ جیسے سورج گرہن اور وہ سرخی جو آسمان پر نمودار ہوتی ہے۔[29]

ابن کثیر نے مسلمانوں کی اکثریت کا جو موقف بیان کیا ہے، وہی ان کا اپنا نقطہ نظر بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا ذکر کرنے سے ان کا مقصد یہی ہے کہ وہ اہل سنت کو اس جانب توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ پر ان کا موقف کیا ہونا چاہیے۔

[29] ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ۔ 11/577 (اردو 8/259)

باغی تحریک۔۔۔سانحہ کربلا کے بعد

سانحہ کربلا کے بعد باغی تحریک نے کیا حکمت عملی اختیار کی؟

سانحہ کربلا کے بعد باغی تحریک بالکل دب کر رہ گئی تاہم انہوں نے اندر ہی اندر اپنے پراپیگنڈے کا جال پھیلا دیا۔ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام کو خوب کیش کروایا لیکن یزید کے بقیہ دور میں کوئی بغاوت برپا نہ کی۔ یہ سلسلہ تین برس تک جاری رہا۔ طبری، ہشام کلبی اور ابومخنف کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

> قال أبو مخنف لوط بن يحيى، عن الحارث بن حصيرة، عن عبد الله بن سعد بن نفيل، قال: حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہی 61ھ میں ان لوگوں (باغی تحریک) نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ آلات حرب و سامان جنگ کے جمع کرنے میں یہ لوگ مشغول تھے اور پوشیدہ طور پر شیعہ اور غیر شیعہ کو انتقام لینے پر آمادہ کرتے رہتے تھے۔ لوگ ان سے ملتے جاتے تھے۔ ایک گروپ کے بعد دوسرا گروپ ان کے ساتھ شریک ہو جاتا تھا۔ یہ لوگ اسی کام میں منہمک تھے کہ یزید 14 ربیع الاول 64ھ کو فوت ہو گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اور یزید کے فوت ہونے میں تین سال، دو ماہ اور چار دن کا فرق تھا۔ اس وقت ابن زیاد عراق کا گورنر تھا جو کہ بصرہ میں تھا۔ کوفہ میں اس کی طرف سے عمرو بن حریث مخزومی تھا۔
>
> سلیمان بن صرد (باغی تحریک کے اس وقت کے لیڈر) کے پاس شیعوں نے آ کر کہا: "وہ فرعون تو مر گیا ہے اور اس وقت حکومت کمزور ہو رہی ہے۔ آپ کی رائے ہو تو ابن حریث پر حملہ کر کے گورنریٹ سے ہم لوگ اسے نکال دیں۔ اس کے بعد خون حسین کو بدلہ لینا شروع کر دیں اور ان کے قاتلوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ لوگوں کو اہل بیت کی طرف آنے کی دعوت دیں جو کہ مظلوم اور اپنے حق سے محروم ہیں۔" اس سلسلے میں لوگوں نے بہت اصرار کیا۔[30]

سلیمان بن صرد نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ خفیہ طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور تیاری کرتے رہیں۔ ان سلیمان بن صرد کے بارے میں تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ یہ صحابی ہیں حالانکہ ان کے صحابی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ عہد رسالت کی کسی جنگ یا اہم واقعے میں ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ ابن عبد البر (368-463/979-1071) نے الاستیعاب میں انہیں ایک جگہ صحابی اور ایک جگہ تابعی قرار دیا ہے اور ان کی یہ کتاب قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ وہ سند درج نہیں کرتے ہیں۔ مشہور محدث اور مورخ ابن حجر عسقلانی (773-852/1371-1448) نے الاصابہ میں انہیں صحابی قرار دینے کو غلط کہا ہے۔[31] ویسے بھی ہم کسی صحابی کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کر سکتے کہ وہ باغی تحریک کا حصہ رہے ہوں گے۔

---

[30] طبری۔ 4/1-309

[31] ابن حجر۔ الاصابہ 5/42۔ شخصیت نمبر 3812

کچھ عرصے بعد ان لوگوں نے کوفہ کے گورنر عمرو بن حریث کو مار کر نکال دیا۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے اور انہوں نے عبداللہ بن یزید الانصاری کو گورنر بنا کر کوفہ میں بھیج دیا۔ اسی زمانے میں مختار ثقفی کوفہ میں وارد ہوا۔

مختار کے بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت یہ نوجوان تھا اور اس کے چچا مدائن کے گورنر تھے۔ اس وقت اس نے اپنے چچا کو مشورہ دیا تھا کہ ہم حضرت حسن کو گرفتار کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے سامنے پیش کر دیتے ہیں تو چچا نے اسے جھڑک دیا تھا۔ اسی نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر برچھی سے وار کیا تھا۔ اسے سانحہ کربلا کے بعد یزید نے گرفتار کر لیا تھا لیکن پھر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی سفارش سے اس کی جان بخشی کر دی تھی کیونکہ یہ ان کا برادر نسبتی تھا۔ یزید کے مرنے کے بعد یہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے اسے کوئی عہدہ نہ دیا۔ اس نے ان کے ساتھ اپنی من مانی کرنا چاہی تو انہوں نے اسے بھگا دیا۔[32] اب یہی مختار ثقفی اہل بیت کا ہمدرد بن کر کوفہ میں آیا۔ اس نے جو سرگرمیاں شروع کیں، انہیں طبری نے ابو مخنف کے حوالے سے کچھ یوں بیان کیا ہے:

> قال هشام: قال أبو مخنف: وحدثنا الحصين بن يزيد، عن رجل من مزينة قال: عبداللہ بن یزید سے آٹھ دن پہلے مختار کوفہ میں آ گیا تھا مگر تمام رؤسائے شیعہ سلیمان بن صرد کے پاس جمع تھے۔ کوئی مختار کو ان کے برابر نہ سمجھتا تھا۔ مختار شیعوں کو دعوت دیتا تھا کہ میرے پاس خون حسین کا انتقام لینے کے لیے آؤ۔ وہ جواب دیتے تھے کہ شیخ الشیعہ تو سلیمان بن صرد ہیں۔ سب نے انہی کی اطاعت کر لی ہے اور انہی کے پاس اکٹھے ہیں۔ اس کے جواب میں وہ کہتا تھا: "میں مہدی وقت محمد بن علی (حضرت حسین کے بھائی) کے پاس سے آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنا وزیر، امین اور قابل اعتماد ساتھی بنا کر بھیجا ہے۔" شیعوں سے اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے آخر اس نے کچھ لوگوں سلیمان بن صرد کے گروپ سے علیحدہ کر لیا۔ اب یہ لوگ اس کی تعظیم کرنے لگے، اس کی بات سننے لگے اور اس کے حکم کے منتظر رہنے لگے۔ مگر اب بھی شیعوں کی بڑی جماعت ابن صرد کے ساتھ تھی۔ اس وجہ سے مختار اپنے کام میں ابن صرد کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا اور اپنے ساتھیوں سے کہتا تھا: "تمہیں معلوم بھی ہے کہ ان صاحب یعنی سلیمان بن صرد کا کیا ارادہ ہے؟ ان کا ارادہ یہ ہے کہ لڑنے کو نکلیں، اپنے آپ کو بھی قتل کروائیں اور ساتھ تمہیں بھی۔ نہ انہیں جنگ کا تجربہ ہے اور نہ اس فن کا علم ہے۔[33]

ابو مخنف کے بیان کے مطابق اب کوفہ کی باغی تحریک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: ایک سلیمان گروپ اور دوسرا مختار گروپ۔ چونکہ ابو مخنف خود اس تحریک کا حصہ رہے ہیں، اس وجہ سے اس تحریک کے اندرونی اختلافات کے بارے میں ان کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ سلیمان بن صرد نے 65/685 میں اعلان بغاوت کیا اور یہ لوگ "توابین" کہلائے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ انہوں نے اس بات پر

---

[32] طبری۔ 4/1-323

[33] ایضاً۔ 4/1-311

توبہ کا اعلان کیا کہ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا کر ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔ ان کی پارٹی کے 16000 لوگوں نے ان کی بیعت کر رکھی تھی لیکن بغاوت کے وقت صرف 4000 افراد اکٹھے ہوئے۔ مدائن اور بصرہ کی باغی تحریک کے لوگ بھی شریک نہ ہوئے۔ یہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبر پر اکٹھے ہوئے اور وہاں گریہ وزاری کی۔ ابن زیاد نے ان کے مقابلے پر 12000 کا لشکر بھیجا۔ شدید جنگ ہوئی جس میں توابین کو شکست ہوئی اور ان کی پارٹی کا بڑا حصہ اس جنگ میں کام آیا۔[34]

مختار ثقفی کی تحریک کی نوعیت کیا تھی؟

مختار گروپ نسبتاً زیادہ کامیاب رہا۔ شروع میں ابن زبیر کے گورنر کوفہ، عبداللہ بن یزید انصاری نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ سلیمان گروپ کی شکست کے بعد ان کے باقی ماندہ لوگ مختار گروپ میں شامل ہو گئے۔ مختار چونکہ یہ دعوی کرتا تھا کہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کا نائب ہے، اس وجہ سے جو لوگ اس کے دعوے پر یقین کرتے تھے، وہ اس سے آن ملتے تھے۔ باغی پارٹی کے بعض لوگوں نے ایک وفد محمد بن حنفیہ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں مختار کو اپنا نمائندہ نہ کہا البتہ یہ فرمایا: "میں چاہتا ہوں کہ اللہ اپنی مخلوق میں سے جس سے بھی چاہے، ہمارے دشمنوں سے بدلہ لے لے۔ اس کے بعد میں اپنے اور آپ کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔" اس وفد کا سن کر مختار بہت پریشان ہوا تاہم جب یہ وفد واپس آیا تو اس کی حمایت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ اب مختار نے حضرت محمد بن حنفیہ کی جانب سے متعدد جعلی خطوط لکھ کر لوگوں کو اپنی جانب مائل کیا جن میں مالک الاشتر کے بیٹے ابراہیم بن اشتر بھی شامل تھے۔[35]

مختار نے مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ یہ نکالا کہ اس نے ایک کرسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرسی قرار دے کر اسے مقدس حیثیت دے دی۔ اس کے بعد اس نے اس کرسی پر ریشم و دیباج لپیٹ کر اس کا جلوس نکالا۔ یہ واقعہ کیسے ہوا، اس کی تفصیل ہم یہاں اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ موجودہ دور میں بھی بعض حضرات اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ اسے طبری نے کچھ یوں نقل کیا ہے:

حدثني به عبد الله بن أحمد بن شبويه، قال:حدثني أبي، قال: حدثني سليمان، قال: حدثني عبد الله ابن المبارك، عن إسحاق بن طلحة، قال: حدثني معبد بن خالد، قال: حدثني طفيل بن جعدة بن هبيرة، قال: طفیل بن جعدہ بن ہبیرہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھانجے کے بیٹے) کا کہنا ہے کہ میں ایک مرتبہ بالکل ہی غریب ہو گیا تھا اور بہت تنگ دست تھا کہ ایک دن میں نے تیل کا کاروبار کرنے والے اپنے ایک پڑوسی کے پاس ایک کرسی دیکھی جس پر اتنا تیل جما ہوا تھا کہ لکڑی نظر نہ آتی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ چلو اس کے متعلق چل کر مختار سے بات کروں۔ میں وہ کرسی تیلی کے گھر سے اپنے یہاں منگوائی اور مختار سے آ کر کہا: "میں ایک بات آپ سے کہنا تو نہیں چاہتا تھا مگر پھر

[34] ایضاً۔ 4/1-311 to 344

[35] ایضاً۔ 4/1-367 to 370

مناسب سمجھا کہ کہوں۔" مختار نے پوچھا: "کیا بات ہے؟" میں نے کہا: "جس کرسی پر (میرے والد) جعدہ بن ہبیرہ بیٹھتے تھے، وہ موجود ہے۔ اس کے متعلق خیال ہے کہ اس میں ایک خاص اثر ہے۔" مختار نے کہا: "سبحان اللہ! تم نے آج تک یہ بات کیوں نہیں بتائی۔ اسے ابھی یہاں منگواؤ۔ اسے جب دھویا گیا تو بہت عمدہ لکڑی نمایاں ہوئی اور چونکہ اس نے خوب زیتون کا تیل پیا تھا، اس لیے وہ چمک رہی تھی۔ یہ کپڑے سے ڈھانپ کر مختار کے پاس لائی گئی۔ مختار نے مجھے 12000 درہم دلائے اور پھر سب لوگوں سے کہا کہ نماز میں شرکت کریں۔

معبد بن خالد کا بیان ہے مختار میرے، اسماعیل بن طلحہ اور شبث بن ربعی کے ساتھ مسجد آیا۔ تمام لوگ جوق در جوق مسجد میں جمع ہو رہے تھے۔ مختار نے تقریر کی اور کہا: "سابقہ اقوام میں کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی جو ہمارے ہاں موجود نہ ہو۔ بنی اسرائیل کے پاس ایک تابوت تھا، جس میں آل موسی اور آل ہارون علیہما الصلوۃ والسلام کے تبرکات موجود تھے۔ اسی طرح ہمارے پاس بھی ایک چیز موجود ہے۔ مختار نے کرسی برداروں کو حکم دیا کہ اسے کھولا جائے۔ کپڑے کا غلاف ہٹایا گیا تو اس پر سبائیہ فرقے کے لوگ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہاتھ اٹھا کر تین تکبیریں کہیں۔ شبث بن ربعی نے کھڑے ہو کر کہا: "اے قبیلہ مضر کے لوگو! کافر نہ ہو جاؤ۔" لوگوں نے اسے دھکے دے دے کر مسجد سے نکال دیا۔۔۔ اس کے کچھ زمانہ بعد یہ خبر مشہور ہوئی کہ عبید اللہ بن زیاد شامیوں کے ساتھ باجمیرہ کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔

شیعوں نے ایک خچر پر اسی کرسی کا جلوس نکالا اور اس پر غلاف پڑا ہوا تھا۔ سات آدمی دائیں طرف اور سات بائیں طرف اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ چونکہ اس جنگ میں اہل شام اس بری طرح قتل کیے گئے تھے کہ اس سے پہلے انہیں کبھی ایسا دن دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اس کرسی پر ان (مختار کے ساتھیوں) کا اعتقاد اور بھی جم گیا تھا اور اس میں ان کی انتہا پسندی کفر صریح تک پہنچ گئی تھی۔ (طفیل کہتے ہیں کہ) میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوا کہ میں نے یہ کیا فتنہ پیدا کر دیا۔ اس کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کی باتیں شروع ہو گئیں جس کی وجہ سے کرسی کو کہیں چھپا دیا گیا اور اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔

ہشام کلبی کا بیان یہ ہے:

عن هشام بن محمد. عنه، قال: حدثنا هشام بن عبد الرحمن وابنه الحكم بن هشام: مختار نے جعدہ بن ہبیرہ، جن کی والدہ ام ہانی بنت ابی طالب، حضرت علی رضی اللہ عنہما کی حقیقی بہن تھیں، کی اولاد سے کہا: "مجھے علی بن ابی طالب کی کرسی لا دو۔" انہوں نے کہا: "نہ وہ ہمارے پاس ہے اور نہ ہم جانتے ہیں کہ کہاں سے لائیں۔" مختار نے کہا: "احمق نہ بنو اور مجھے لا کر دو۔" اس جواب سے انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ جو کرسی بھی لا دیں گے، مختار اسے قبول کر لے گا۔ چنانچہ یہ لوگ ایک کرسی مختار کے پاس لے آئے اور کہا کہ یہ حضرت علی کی کرسی ہے۔ مختار نے اسے قبول کر لیا۔ اس کے بعد بنی شبام، بنی شاکر اور مختار کے اور سرداروں اس کرسی پر ریشم اور دیباج کا کپڑا لپیٹ کر اس کا جلوس نکالا۔[36]

اس کے بعد انہوں نے بغاوت کر دی جو کہ کامیاب رہی۔ ایک شدید جنگ میں اس نے ابن زیاد کی فوج کو شکست دی اور اس کے بعد ابن زیاد، شمر، خولی بن یزید اور ان تمام لوگوں کو قتل کر دیا گیا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں شریک تھے یا ان پر شہادت

[36] ایضاً۔ 4/1-423 to 424

حسین میں شریک ہونے کا الزام موجود تھا۔ اس نے عمر بن سعد سے البتہ امان دینے کا معاہدہ کر لیا تاہم کچھ عرصے بعد اس معاہدے کو توڑ کر انہیں ان کے بیٹوں سمیت قتل کروا دیا۔[37] اس نے ایک پارٹی کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے قتل کے لیے مکہ بھیجا اور دوسری طرف انہیں ایک خط بھی لکھا جس میں خود کو ان کا فرمانبردار ظاہر کیا۔[38]

مختار ثقفی کی تحریک کو کافی کامیابی ملی۔ اس نے ابن زیاد اور قاتلین حسین کو قتل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تو اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا اور عراق کے کچھ حصے پر اس کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اب مختار نے اپنی تحریک کے اگلے مرحلے کا آغاز کیا اور طرح طرح کی پیش گوئیاں کرنا شروع کر دیں۔ اس کے معتقدین نے اسے غیب دان ماننا شروع کر دیا۔ طبری نے اس سلسلے میں ابو مخنف کی ایک روایت نقل کی ہے۔

قال هشام: قال أبو مخنف: حدثني فضيل بن خديج، قال: قتل شرحبيل بن ذي الكلاع، فادعى قتله ثلاثة: سفيان بن يزيد بن قال أبو مخنف: حدثني المشرقي، عن الشعبي:۔۔۔۔ شعبی کہتے ہیں کہ (جب مختار کوفہ سے نکلا تو) میں اور میرے والد بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے کہا: "آج یا کل ہمیں ابراہیم (بن اشتر) کی جانب سے فتح کی خوشخبری ملنے والی ہے۔ اس کی فوج نے ابن زیاد کی فوج کو شکست فاش دے دی ہے۔" مختار سائب بن مالک الاشعری کو کوفہ پر اپنا جانشین مقرر کر کے خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا اور ساباط میں قیام کیا۔ ۔۔۔جب ہم لوگ مدائن پہنچے تو لوگ مختار کے گرد جمع ہو گئے۔ مختار اب منبر پر خطبہ پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا اور ہمیں سوچ سمجھ کر کام کرنے، جدوجہد کرنے، اطاعت امیر میں ثابت قدم رہنے اور اہل بیت رسول کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اتنے میں متواتر کئی قاصد ابن زیاد کے قتل، اس کی فوج کے شکست کھانے، گرفتار کیے جانے اور اہل شام کے بڑے سرداروں کے قتل کی خوشخبری لائے۔ اس پر مختار نے کہا: "اے اللہ کے گروہ! کیا میں نے اس واقعے سے پہلے اس فتح کی تمہیں خوش خبری نہ دی تھی؟" سب نے کہا: "بے شک آپ نے یہی کہا تھا۔"

شعبی کا بیان ہے کہ اس وقت ان کے ایک پڑوسی، جس کا تعلق ہمدان سے تھا، نے ان سے کہا: "شعبی! کیا اب تم ایمان لے آؤ گے؟" میں کہا: "کس چیز پر ایمان لاؤں؟ کیا اس بات پر ایمان لاؤں کہ مختار کو غیب کا علم ہے؟ اس پر تو میں ہرگز ایمان نہ لاؤں گا۔" اس پر اس نے کہا: "کیا مختار نے ہم سے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ہمارے دشمنوں کو شکست فاش ہوئی؟" میں نے جواب دیا: "اس نے یہ کہا تھا کہ مقام نصیبین پر انہیں شکست ہوئی حالانکہ یہ واقعہ تو موصل کے علاقے خاذر میں پیش آیا ہے۔" اس نے کہا: "شعبی! واللہ! جب تک تم دردناک عذاب نہ دیکھو گے تو ایمان نہ لاؤ گے۔"[39]

اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت حجاز اور عراق پر قائم ہو چکی تھی۔ انہیں یہ خطرہ تھا کہ کہیں مختار پورے عراق پر قبضہ نہ کر لے۔ انہوں نے اپنے بھائی مصعب بن زبیر، جو کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے داماد تھے، کو بصرہ کا گورنر بنا کر

---

[37] ایضاً۔ 4/1-408

[38] ایضاً۔ 4/1-413

[39] ایضاً۔ 4/1-457

بھیجا۔ انہوں نے مختار سے شدید جنگ کر کے رمضان 67/687 میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ مختار نہایت بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی دو سالہ حکومت اور غیب دانی کا خاتمہ بھی ہو گیا۔

توابین اور مختار کی بغاوتوں کے بعد اہل کوفہ کی باغی تحریک بالکل کمزور پڑ گئی اور اس کے بعد 55 برس تک سر نہ اٹھا سکی۔

سانحہ حرہ

اب ہم واپس یزید کے دور کی طرف آتے ہیں۔ یزید کے دور میں تین افسوسناک سانحے ہوئے: سانحہ کربلا، سانحہ حرہ اور مکہ مکرمہ پر حملہ۔ اب ہم سانحہ حرہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا۔ ہمارے ہاں اردو کتب تاریخ میں اس معاملے میں بڑا مبالغہ کیا گیا ہے کہ سرکاری فوج نے مدینہ منورہ پر حملہ کیا، ہزاروں لوگوں کو قتل کیا اور خواتین کی عصمت دری کی جبکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔

تاریخ طبری میں اس سانحے کی تقریباً تمام تفصیلات ابو مخنف ہی کی بیان کردہ ہیں۔ ابو مخنف کی روایت کے مطابق ہوا یوں کہ یزید نے ایک اموی نوجوان عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو مدینہ منورہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ یہ ناتجربہ کار تھے اور حکومتی معاملات کو صحیح طرح سنبھال نہ پائے۔ اس پر اہل مدینہ کا ایک وفد یزید کے پاس روانہ ہوا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ ابو مخنف کی زبانی سنیے:

> ذكر **لوط بن يحيى**، عن عبد الملك بن نوفل ابن مساحق، عن عبد الله بن عروة: ۔۔۔ اہل مدینہ نے ایک وفد یزید کے پاس روانہ کیا۔ اس میں عبداللہ بن حنظلہ انصاری غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمرو مخزومی، منذر بن زبیر اور بہت سے لوگ اشراف مدینہ سے ان کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ یزید کے پاس آئے تو وہ اکرام و احسان سے پیش آیا۔ سب کو انعام و اکرام دیا۔ وہاں سے سوائے منذر بن زبیر کے، یہ سب لوگ مدینہ چلے گئے جبکہ منذر بصرہ میں ابن زیاد کے پاس چلے گئے۔ انہیں بھی یزید نے ایک لاکھ درہم انعام دیا تھا۔
>
> (جو لوگ مدینہ آئے) انہوں نے اہل مدینہ کے سامنے یزید کو سب و شتم شروع کر دیا اور کہا: "ہم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں، جو کوئی دین نہیں رکھتا، شراب پیتا ہے، ساز بجاتا ہے اور اس کی صحبت میں گلوکارائیں گاتی ہیں۔ کتوں سے کھیلتا ہے، لفنگوں اور لونڈیوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ آپ لوگ گواہ رہیں کہ ہم نے اسے خلافت سے معزول کیا۔ یہ سن کر کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ مل گئے۔۔۔
>
> یزید کو خبر ہوئی کہ وہ اس کے بارے میں یہ پراپیگنڈا کر رہے ہیں تو وہ کہنے لگا: "یا اللہ! میں نے تو ان کے ساتھ احسان کیا اور ان لوگوں نے جو کچھ کیا، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔" پھر اس نے ان لوگوں کے جھوٹ اور قطع رحمی کا ذکر کیا۔[40]

ابو مخنف کے بیان کے مطابق اب یزید نے حضرت نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہما کو مدینہ بھیجا جنہوں نے اہل مدینہ کو سمجھایا کہ وہ

---

[40] ایضاً۔ 4/252 to 253

بغاوت نہ کریں تاہم انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سن 63/683 میں ایک ہزار کے قریب آدمیوں نے بغاوت کر دی اور مدینہ میں موجود بنو امیہ پر حملہ کر دیا۔ یہ اموی مروان بن حکم کے گھر میں اکٹھے ہوئے تو ان لوگوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ بنو امیہ نے یزید کو خط لکھ کر آگاہ کیا۔[41] اس کے بعد یزید نے مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں ایک فوج مدینہ کی طرف بھیجی جس نے ایک مختصر سی لڑائی کے بعد اس بغاوت پر قابو پالیا۔

سانحہ حرہ کے موقع پر اکابر صحابہ کا کردار کیا تھا؟

اس بغاوت کے موقع پر اکابر صحابہ نے اس سے علیحدگی اختیار کی اور اسے اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل ہوا ہے:

نافع بیان کرتے ہیں کہ جب اہل مدینہ (کے بعض لوگوں نے) یزید بن معاویہ کے خلاف بغاوت کی تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے ساتھیوں اور اولاد کو جمع کر کے فرمایا: "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ 'قیامت کے دن ہر معاہدہ توڑنے والے کے لیے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔' ہم لوگ اللہ اور رسول کے نام پر اس شخص (یزید) کی بیعت کر چکے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اللہ اور رسول کے نام پر کی گئی بیعت کو توڑنے اور بغاوت کرنے سے بڑھ کر کوئی معاہدے کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے۔ ہر ایسا شخص جو اس بیعت سے الگ ہو جائے اور اس معاملے (بغاوت) کا تابع ہو جائے، تو اس کے اور میرے درمیان علیحدگی ہے۔[42]

حضرت محمد بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہے کہ واقعہ حرہ کے موقع پر عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی حضرت محمد بن علی رحمہ اللہ کے پاس گئے اور ان سے کہا:

"ہمارے ساتھ نکلیے کہ ہم یزید سے جنگ کریں۔" محمد بن علی نے ان سے کہا: "کس بات پر میں اس سے جنگ کروں اور اسے منصب خلافت سے ہٹاؤں؟" وہ بولے: "وہ کفر اور فسق و فجور میں مبتلا ہے، شراب پیتا ہے اور دین کے معاملے میں سرکشی کرتا ہے۔"

اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: "کیا آپ لوگ اللہ سے نہیں ڈرتے۔ کیا آپ میں سے کسی نے اسے ایسا کرتے دیکھا ہے جو آپ ذکر کر رہے ہیں۔ میں اس کے پاس رہا ہوں اور میں نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔" وہ کہنے لگے: "اس نے آپ کو اپنے اعمال کی خبر نہ ہونے دی ہو گی۔" محمد بن علی نے فرمایا: "تو کیا اس نے آپ لوگوں کو خبر کر کے یہ برائیاں کی ہیں؟ اس صورت میں تو آپ بھی اس کے ساتھی رہے ہوں گے۔ اگر اس نے آپ کو نہیں بتایا تو پھر تو آپ لوگ بغیر علم کے گواہی دینے چل پڑے ہیں۔"

ان لوگوں کو یہ خوف ہوا کہ محمد بن علی کے بیٹھ رہنے سے لوگ (بغاوت کے لیے اٹھنے پر) آمادہ نہ ہوں گے۔ انہوں نے ان کو پیشکش کی کہ اگر آپ ابن زبیر کی بیعت نہیں کرنا چاہتے تو ہم آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہیں۔" انہوں نے فرمایا: "میں نہ تو لیڈر بن کر جنگ کرنا چاہتا ہوں اور نہ

---

[41] ایضاً۔ 4/1-254

[42] بخاری، کتاب الفتن، حدیث 6694

ہی پیروکار بن کر۔" وہ بولے: "آپ نے اپنے والد (علی) کے ساتھ مل کر بھی تو جنگ کی تھی؟" انہوں نے فرمایا: "آج کل کون میرے والد جیسا ہے؟"

ان لوگوں نے جبر کر کے محمد بن علی کو نکالا اور ان کے مسلح بیٹے ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے گلابی رنگ کی جوتی پہن رکھی تھی اور کہہ رہے تھے: "اے قوم! اللہ سے ڈرو اور خون مت بہاؤ۔" جب ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ کسی لیڈری پر تیار نہیں ہیں تو انہیں چھوڑ دیا۔[43]

حضرت زین العابدین بن حسین رضی اللہ عنہما نے نہ صرف بغاوت سے علیحدگی اختیار کی بلکہ بنو امیہ کی مدد بھی کی۔ طبری کی روایت یہ ہے:

قال عبد الملك بن نوفل: حدثني حبيب: بنو امیہ جب شام کی طرف روانہ ہوئے تو مروان بن حکم کی اہلیہ عائشہ بنت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما نے مروان کے تمام ساز و سامان کے ساتھ علی بن حسین رضی اللہ عنہما کے یہاں آ کر پناہ لی تھی۔

وقد حدثت عن محمد بن سعد، عن محمد بن عمر، قال: بنو امیہ مدینہ سے نکالے گئے تو مروان نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: "میرے اہل و عیال کو آپ اپنے پاس چھپا لیجیے۔" انہوں نے (کسی وجہ سے) منع کر دیا۔ علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے مروان نے کہا: "میں آپ کا رشتے دار ہوں۔ میرے اہل بیت کو اپنے اہل بیت کے ساتھ رکھ لیجیے۔" تو انہوں نے اسے منظور کر لیا۔ مروان نے اپنے اہل و عیال کو علی بن حسین کے گھر بھیج دیا۔ یہ ان لوگوں کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ لے کر ینبوع چلے آئے اور وہیں سب کو رکھا۔ مروان ان کا شکر گزار تھا **اور ان دونوں میں بہت پرانی محبت تھی۔**

علی بن حسین کی کچھ زمین مدینہ کے قریب تھی اور (بغاوت کے وقت) وہ شہر سے نکل کر یہیں گوشہ نشین ہو گئے تھے تاکہ وہاں کے کسی معاملے میں شریک نہ ہوں۔ عائشہ (مروان کی اہلیہ جو ان کے گھر پناہ گزین تھیں) جب طائف جانے لگیں تو آپ نے کہا: "میرے بیٹے عبد اللہ کو اپنے ساتھ طائف لیتی جایئے۔" عائشہ اپنے ساتھ عبد اللہ کو طائف لے آئیں اور اپنے ہی پاس اس وقت تک رکھا جب تک کہ اہل مدینہ کا معاملہ ٹھنڈا نہ پڑ گیا۔[44]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مروان کی جانب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی روایات بھی جعلی ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مروان تو حضرت علی کو معاذ اللہ گالیاں دیتے ہوں اور ان کے پوتے حضرت زین العابدین رحمہ اللہ، کی مروان سے پرانی محبت چلی آ رہی ہو اور وہ بنو امیہ کی اس درجے میں مدد کریں؟

[43] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 3/471۔ باب محمد بن حنفیہ

[44] طبری۔ 4/1-256

کیا مدینہ منورہ کو تین دن کے لیے مباح کیا گیا؟

طبری میں واقعہ حرہ کی تمام تر روایات ابو مخنف اور ہشام کلبی کی روایت کردہ ہیں جن کا بنو امیہ سے بغض اور تعصب مشہور ہے۔ اس وجہ سے ان کی بیان کردہ ان تفصیلات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جن میں انہوں نے ظلم کو بنو امیہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ بغاوت پر قابو پالینے کے بعد مدینہ منورہ کو تین دن تک کے لیے مباح کر دیا گیا، شہریوں کا مال لوٹا گیا اور لوگوں کو بے جا قتل کیا گیا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ پھر اس کا بیان کرنے والا اکیلا ابو مخنف نہ ہوتا بلکہ اور بھی بہت سے لوگ اسے بیان کر رہے ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفصیلات بھی بنو امیہ کے خلاف اس پراپیگنڈے کا حصہ تھیں جو ان کی حکومت کو گرانے کے لیے کیا گیا۔ ممکن ہے کہ سرکاری فوجوں نے کچھ زیادتیاں کی ہوں لیکن اس بارے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی ہے کیونکہ ان روایات کا راوی صرف ایک ہی شخص ہے اور وہ ناقابل اعتماد ہے۔

رہی یہ بات کہ تین دن کے لیے مدینہ شہر میں فوجیوں نے ہزاروں خواتین کو ریپ کیا اور اس کے نتیجے میں ایک ہزار خواتین حاملہ ہوئیں، ایسی بے بنیاد بات ہے کہ ابو مخنف کو بھی اس کا خیال نہیں آیا۔ اگر اس میں کچھ بھی حقیقت ہوتی، تو جہاں ابو مخنف نے ڈھیروں دوسری روایتیں وضع کی ہیں، وہاں اس کو وہ کیسے چھوڑ دیتا؟ پھر اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو ہر ہر شہر میں یزید کے خلاف بغاوت اٹھتی جاتی۔ عربوں کے بارے میں تو دور جاہلیت میں بھی یہ گمان مشکل ہے کہ ان کی خواتین پر کوئی ہاتھ ڈالے تو وہ خاموشی سے دیکھتے رہیں کجا یہ کہ دور اسلام میں ایسا ہو اور سب لوگ تماشا دیکھتے رہیں۔ کیا ان سب نے چوڑیاں پہن رکھی تھیں یا ان کی غیرت گھاس چرنے چلی گئی تھی؟

ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور ابو مخنف نے بھی انہیں بیان نہیں کیا ہے۔ یہ روایت ابن کثیر (701-774/1301-1372) نے مدائنی (135-225/752-840) کے حوالے سے البدایہ والنہایہ میں درج کی ہے اور ساتھ واللہ اعلم لکھ کر اس واقعے سے متعلق شک کا اظہار کیا ہے۔ مدائنی نے بھی اس کی سند یہ بیان کی ہے: قال المدائني عن أبي قرة قال۔ اب معلوم نہیں کہ یہ ابو قرۃ کون صاحب ہیں اور کس درجے میں قابل اعتماد ہیں۔ اور وہ خود واقعہ حرہ کے ساٹھ سال بعد پیدا ہوئے۔ وہ واقعے کے عینی شاہد نہیں تھے۔ اگر یہ خواتین اس طرح ریپ ہوئی ہوتیں اور اس کے نتیجے میں ایک ہزار ولد الحرام پیدا ہوئے ہوتے تو انساب کی کتابوں میں تو اس کا ذکر ملتا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے باپ کا نام معلوم نہیں ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ ابن کثیر نے بھی اس روایت کو محض نقل کیا ہے اور اس پر اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔

مکہ مکرمہ پر حملہ

مکہ مکرمہ پر حملہ کیسے ہوا؟

مکہ مکرمہ میں اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما موجود تھے جنہوں نے یزید کی بیعت نہ کی تھی مگر انہوں نے اپنی خلافت

کا اعلان بھی نہ کیا تھا۔ مدینہ منورہ سے فارغ ہو کر مسلم بن عقبہ کا یہ لشکر مکہ مکرمہ کی طرف بڑھا۔ اس وقت تک 64/684 کا آغاز ہو چکا تھا۔ راستے میں مسلم کے مرنے کے بعد حصین بن نمیر اس لشکر کا سربراہ بنا۔ اس لشکر نے آکر مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر لیا جو کہ 40 یا بروایت دیگر 64 دن جاری رہا۔ فریقین کے درمیان کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں۔ اس زمانے میں خانہ کعبہ کا غلاف جل گیا۔ اس معاملے میں طبری نے دو متضاد روایتیں نقل کی ہیں:

- ایک روایت کے مطابق سرکاری فوج نے منجنیق سے خانہ کعبہ پر پتھر پھینکے جس سے اس کا غلاف جل گیا۔ یہ ہشام کلبی کی روایت ہے۔
- دوسری روایت کے مطابق لوگ آگ رات کو آگ جلاتے تھے۔ اس کی کچھ چنگاریاں ہوا سے اڑ کر خانہ کعبہ پر پڑیں جس سے اس کا غلاف جل گیا۔ یہ روایت محمد بن عمر الواقدی نے بیان کی ہے۔

ان دونوں مورخین کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ دونوں جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالی ہی بہتر جانتا ہے کہ حقیقت کیا تھی؟

ربیع الاول 64/684 میں محاصرہ ابھی جاری تھا کہ یزید کے مرنے کی اطلاع مکہ پہنچی۔ یہ سن کر جنگ بندی ہو گئی اور سرکاری فوج کے کمانڈر حصین بن نمیر نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی۔ ہشام کلبی نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے:

> وأما عوانة بن الحكم فإنه قال – فيما ذكر هشام، عنه: ابن نمیر نے یہ سن کر ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو کہلا بھیجا کہ آج رات مجھ سے مقام ابطح میں ملیے۔ دونوں اکٹھے ہوئے تو حصین بن نمیر نے کہا: "اگر یزید فوت ہو گیا ہے تو آپ سے زیادہ کوئی خلافت کا حق دار نہیں ہے۔ آئیے! ہم آپ کی بیعت کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ میرے ساتھ چلیے۔ یہ لشکر جو میرے ساتھ ہے، اس میں شام کے تمام رؤساء اور سردار شامل ہیں۔ واللہ! دو افراد بھی آپ کی بیعت سے انکار نہیں کریں گے۔ شرط یہ ہے کہ آپ سب کو امان دے کر مطمئن کر دیجیے۔ ہمارے اور آپ کے درمیان اور ہمارے اور اہل حرہ کے درمیان جو خونریزی ہوئی ہے، اس سے چشم پوشی کیجیے۔

ہشام کلبی کے بیان کے مطابق حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس آفر کو ٹھکرا دیا اور کہا: "اگر میں ایک ایک شخص کے بدلے دس دس آدمیوں کو قتل کروں، تب بھی مجھے چین نہ آئے گا۔"[45] چونکہ ہشام کلبی صحابہ کرام بالخصوص حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی اولاد کے بارے میں متعصب مورخ ہیں، اس وجہ سے ان کی اس بات کو قبول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں یہ جملہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ آپ ایک آدمی کے عوض دس افراد کے قتل کو جائز سمجھتے ہوں گے۔

ہشام کلبی کے بیان کے مطابق حصین بن نمیر نے مکہ کا محاصرہ اٹھا دیا اور فوج شام کی طرف واپس چلی گئی۔ جب یہ مدینہ پہنچی تو اس کی

---

[45] ایضاً۔ 4/1-267

ملاقات حضرت زین العابدین رحمہ اللہ سے ہوئی۔ ابن نمیر کے گھوڑے بھوکے تھے اور اس کے پاس چارہ ختم ہو گیا تھا۔ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ نے اس کے گھوڑوں کو چارہ فراہم کیا۔[46] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے جلیل القدر والد کی شہادت کا ذمہ دار حکومت اور بنو امیہ کو نہ سمجھتے تھے بلکہ کربلا کو محض ایک سانحہ اور حادثہ سمجھتے تھے۔ اگر آپ کی رائے مختلف ہوتی تو کم از کم آپ سرکاری افواج سے اتنا تعاون نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں میں جو بھی اختلافات تھے، وہ محض سیاسی تھے اور دینی اعتبار سے ان میں کوئی ایسا اختلاف نہ تھا، جس کی بنیاد پر ایک فریق کو کافر قرار دیا جائے۔

یزید کے دور میں یہ تین سانحات کیونکر پیش آئے؟

یزید کے دور کے ان تینوں سانحات کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے پیش آئے۔ اسے چاہیے تھا کہ مذاکرات کے ذریعے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ حکومت سنبھالنے کے بعد مدینہ اور مکہ کا سفر کرتا اور یہاں خود حضرت حسین، عبداللہ بن زبیر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مل کر ان سے براہ راست معاملات طے کر لیتا تو شاید یہ تینوں سانحے وقوع پذیر نہ ہوتے۔ ان حضرات کے بارے میں یہ بدگمانی درست نہیں ہے کہ یہ حکومت کے طالب تھے اور اس کے لیے مسلمانوں میں افتراق و انتشار کو جائز سمجھتے تھے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو براہ راست شام جا کر یزید سے بیعت کے لیے تیار تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بھی اس کی بات چیت ہو جاتی، یزید ان کے مطالبات مان لیتا اور جن امور کی وہ اصلاح چاہتے تھے، ان پر عمل کر لیتا تو معاملہ اتنا نہ بڑھتا۔

افسوس کہ یزید نے اپنے جلیل القدر والد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے حلم اور تدبر کا مظاہرہ نہ کیا اور ضرورت سے زیادہ طاقت کا استعمال کر دیا۔ پہلے ابن زیاد کی افواج نے طاقت کا بے جا استعمال کر کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور یزید نے اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔ اس کے بعد مدینہ کے کچھ لوگوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے سرکاری فوج نے ضرورت سے زیادہ طاقت استعمال کی اور پھر مکہ مکرمہ پر حملہ کر کے حکومت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔ 64/684 یزید کے مرتے ہی خانہ جنگیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو کہ اگلے نو برس جاری رہا۔

یزید کے بارے میں کیا رائے رکھنی چاہیے؟

اس معاملے میں مسلمانوں کے ہاں تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

1۔ عام طور پر یزید کو سانحہ کربلا، سانحہ حرہ اور مکہ مکرمہ پر حملے کا مجرم قرار دے کر اس پر لعن طعن کی جاتی ہے۔ بعض لوگ اسے اسلام دشمن، کافر، منافق، فاسق و فاجر کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارے دور میں بہت سے لوگوں کا یہی موقف ہے۔ یہ حضرات بالعموم

[46] ایضاً۔ 4/1-268

تمام تاریخی روایتوں کو من و عن قبول کر کے یزید پر لعنت کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہی تھا تو پھر یزید کے دور میں موجود جلیل القدر صحابہ خاص کر ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم نے اس کے خلاف کوئی تحریک پیدا کیوں نہیں کی اور ان حضرات نے حضرات حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟

2۔ ایک اقلیتی گروہ کا موقف یہ ہے کہ یزید ایک جلیل القدر تابعی تھا۔ وہ اس کے نام کے ساتھ "رحمۃ اللہ علیہ" بلکہ بعض اوقات "رضی اللہ عنہ" بھی لگا دیتے ہیں۔ یہ حضرات سانحہ کربلا، حرہ اور مکہ کی ایسی توجیہ کرتے ہیں جس سے قصور سراسر حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا نکلتا ہے۔ اگر اس نقطہ نظر کو درست مان لیا جائے تو پھر حضرت حسین اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر بزرگوں پر تہمت کا دروازہ کھلتا ہے۔

3۔ ایک تیسرا موقف یہ ہے کہ یزید کے بارے میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ اس نقطہ نظر کے حاملین کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا پیمانہ موجود نہیں ہے جس سے اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا جا سکے کہ ان تینوں سانحات میں یزید یا کسی اور شخص کا قصور کتنا تھا؟ تینوں سانحات سے متعلق جو تاریخی روایتیں ہمیں ملتی ہیں، وہ ابو مخنف، ہشام کلبی اور واقدی کی روایت کردہ ہیں۔ ابو مخنف اور کلبی کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ لوگ بنو امیہ کے دشمن تھے اور ان سے شدید تعصب رکھتے تھے۔ دوسری طرف واقدی پر بھی کذاب ہونے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے ہم قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ان واقعات کی اصل شکل کیا تھی اور اس میں کس شخص کا قصور کتنا تھا؟ ہونا یہ چاہیے کہ ہم اس معاملے میں خاموشی اختیار کریں اور اس معاملے کو اللہ تعالی پر چھوڑ دیں۔

اس تیسرے نقطہ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے امام غزالی (d. 505/1111) کہتے ہیں:

> جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ یزید نے قتل حسین کا حکم دیا تھا یا اس پر رضامندی کا اظہار کیا تھا، تو جاننا چاہیے کہ وہ شخص پرلے درجے کا احمق ہے۔ اکابر و وزراء اور سلاطین میں سے جو جو اپنے اپنے زمانہ میں قتل ہوئے، اگر کوئی شخص ان کی یہ حقیقت معلوم کرنا چاہے کہ قتل کا حکم کس نے دیا تھا، کون اس پر راضی تھا اور کس نے اسے ناپسند کیا، تو اس پر قادر نہ ہو گا کہ اس کی تہہ تک پہنچ سکے خواہ یہ قتل اس کے پڑوس میں اور اس کے زمانے اور موجودگی میں ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ پھر تو اس واقعہ تک کیسے رسائی ہو سکتی ہے جو دور دراز شہروں اور قدیم زمانہ میں گزرا ہو۔ پس کیسے اس واقعے کی حقیقت کا پتہ چل سکتا ہے جس میں چار سو برس (اب ساڑھے تیرہ سو برس) کی طویل مدت حائل ہو اور مقام بھی بعید ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں شدید تعصب کی راہ اختیار کی گئی ہے، اسی وجہ سے اس واقعہ کے بارے میں مختلف گروہوں کی طرف سے بکثرت روایتیں مروی ہیں۔ پس یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی حقیقت کا ہرگز پتہ نہیں چل سکتا اور جب حقیقت تعصب کے پردوں میں روپوش ہے تو پھر ہر مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھنا واجب ہے، جہاں حسن ظن کے قرائن ممکن ہوں۔[47]

---

[47] شمس الدین ابن طولون (880-953/1475-1546)۔ قید الشرید من اخبار الیزید۔ 47۔ www.archive.org/details/qsmay (ac. 13 Aug 2012)۔ مزید دیکھیے: غزالی، احیاء العلوم الدین (اردو ترجمہ: ندیم الواجدی)۔ 3/199۔ کراچی: دار الاشاعت۔

امام غزالی کے یہ دلائل اس درجے میں مضبوط ہیں کہ ہمیں ہر تاریخی شخصیت کے بارے میں یہی رویہ رکھنا چاہیے۔ تاریخ کی کتب میں جو کچھ لکھا ہو، وہ ہم پڑھیں اور بیان کریں تو ساتھ ہی یہ وضاحت بھی ضرور کر دیں کہ حقیقت کا علم اللہ تعالی ہی کو ہے اور ہم تمام سابقہ لوگوں کے بارے میں حسن ظن کا رویہ رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں بھی ہم نے یہی کوشش کی ہے۔ جن لوگوں کے نام قاتلین عثمان میں آتے ہیں یا قاتلین حسین، ان کا تذکرہ کرتے وقت ہم نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ باتیں تاریخی روایات ہی سے ملتی ہیں جن کی صحت مشکوک ہے۔ ہاں نام لیے بغیر اجمالی طور پر قاتلین عثمان اور قاتلین حسین کی مذمت کی جا سکتی ہے۔

جب یکساں درجے کی منفی اور مثبت تاریخی روایات موجود ہوں تو پھر ایک مثبت ذہنیت کے حامل شخص سے یہی توقع ہونی چاہیے کہ وہ مثبت پہلوؤں ہی پر توجہ دے۔ منفی پہلوؤں پر سوچنے سے دنیا میں سوائے فرسٹریشن اور آخرت میں سوائے مواخذہ کے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اللہ تعالی ہم سے آخرت میں ہمارے ہی اعمال سے متعلق سوال کریں گے اور کسی بھی تاریخی شخصیت کے اعمال کا حساب ہم سے نہ لیا جائے گا۔ حسن ظن اور بدگمانی، مثبت ذہنیت یا منفی رویہ ہمارا اپنا عمل ہے، جس کے لیے ہم اللہ تعالی کے حضور جواب دہ ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کی خلافت

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت سے متعلق زیادہ سوالات نہیں ہیں۔ آپ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، آپ کے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے "حواری" اور والدہ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کو "ذات النطاقین" کا خطاب دیا۔ انہی سیدہ اسماء نے ہجرت نبوی کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے کھانے کا انتظام کیا۔ ابن زبیر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نواسے تھے اور ان کے علاوہ اپنی خالہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے تربیت یافتہ تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو کچھ ماہ تک مسلمانوں کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ اسلام دشمنوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور ان کی تعداد میں اب اضافہ نہ ہو سکے گا۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما 1/622 میں پیدا ہوئے اور تمام صحابہ نے اس پر خوشی منائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گود میں لے کر کھجور چبا کر ان کے منہ میں ڈالی۔ خلفائے راشدین کے دور میں آپ نے ایک نوجوان کی حیثیت سے نمایاں علمی اور عسکری کارنامے انجام دیے۔ عہد صدیقی میں جنگ یرموک میں اہم کارنامے انجام دیے۔ عہد عثمانی میں قرآن مجید کی کاپیاں بنانے کے کام میں شریک رہے اور افریقہ کی مہم میں شریک ہوئے۔ خلیفہ مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے موقع پر ان کی حفاظت کی اور جنگ جمل میں مالک الاشتر سے براہ راست مقابلہ کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ افریقہ اور قسطنطنیہ کی مہمات میں شریک تھے۔

اصاغر صحابہ میں چار افراد ایسے تھے جو عبادت، زہد و تقوی اور علم دین میں غیر معمولی مقام رکھتے تھے اور اتفاق سے ان چاروں کا نام عبداللہ تھا۔ اس وجہ سے یہ عبادلہ (عبداللہ کی جمع) کہلاتے تھے۔ یہ ابن عمر، ابن عباس، ابن عمرو بن عاص اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت ابن زبیر اب ساٹھ سال کے ہو چکے تھے۔ انہوں نے یزید کی حکومت کو پسند نہیں کیا اور اس کی بیعت نہیں کی۔ آپ مکہ مکرمہ میں مقیم رہے تاہم آپ نے حکومت کے خلاف بغاوت بھی نہیں کی۔ جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ سرکاری افواج نے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر لیا جو کہ کئی دن جاری رہا مگر ابن زبیر نے صرف اپنا دفاع ہی کیا۔ یزید کی وفات کے بعد ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خلافت کا اعلان کیا اور سوائے شام کے، تقریباً سبھی علاقوں پر ان کی خلافت قائم ہو گئی جو کہ 73/693 تک قائم رہی۔ ان کے دور کے بارے میں بہت زیادہ سوالات نہیں ہیں، بس چند امور وضاحت طلب ہیں۔

ابن زبیر اور دیگر صحابہ کا موقف کیا تھا؟

ہماری رائے میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما پوری دیانتداری سے یہ سمجھتے تھے کہ بنو امیہ میں باپ کے بعد بیٹے کی ولی عہدی کا جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے، وہ درست نہیں ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد یزید کو تو انہوں نے برداشت کر لیا اور اعلان خلافت نہ کیا لیکن پھر یزید کے بعد اس کے بیٹے معاویہ ثانی کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ دوسری جانب اہل شام میں اختلافات پیدا ہو گئے اور شامی فوج کے کمانڈر حصین بن نمیر نے خود ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو خلافت قبول کرنے کی دعوت دی۔

اس کے برعکس دیگر اکابر صحابہ جیسے حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا موقف یہ تھا کہ دو خلیفوں کے اعلان سے امت میں انتشار پیدا ہو گا اور خانہ جنگی ہو گی۔ اس وجہ سے حکومت کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق جس رائے کو درست سمجھا، اس پر عمل کیا۔ یہ سب حضرات ہمارے لیے محترم ہیں۔ ہمیں ان سب کا احترام کرنا چاہیے۔ بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا کہ ابن عمر اور ابن عباس کی رائے درست تھی۔

65/685 میں عالم اسلام کی صورتحال کیا تھی؟

یزید کے دور کے بارے میں ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ یہ سیاسی بے چینی کا دور تھا۔ ایک طرف اس میں سانحہ کربلا ہوا تو دوسری طرف اہل مدینہ کی بغاوت کو اس نے سختی سے کچل دیا۔ تاہم یزید کے دور تک عالم اسلام متحد تھا اور 64/684 میں اس کے مرتے ہی مختلف سیاسی تحریکوں نے سر اٹھا لیا۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

1۔ پہلا گروہ بنو امیہ کا تھا جنہوں نے یزید کے بعد اس کے بیٹے معاویہ بن یزید کو خلیفہ بنا لیا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی عابد و زاہد شخص تھے اور ان کی تعریف بعض شیعہ مورخین نے بھی کی ہے۔[48] یہ محض چالیس دن کے بعد وفات پا گئے۔ ان کے بعد بنو امیہ اور اہل شام میں

[48] Ameer Ali, Syed. ***Short History of the Saracens.*** P. 89. www.aboutquran.com (ac. 6 May 2008)

اختلافات پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے ایک خلیفہ کے نام پر اتفاق نہ ہو سکا۔ بنو امیہ کا یہ اختلاف ایک سال تک جاری رہا جس کے اختتام پر انہوں نے متفقہ طور پر مروان بن حکم کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا۔ مروان صرف ایک سال ہی زندہ رہے اور 65/686 ہی میں فوت ہوئے البتہ ان کے بعد بنو امیہ کے سبھی خلفاء ان کی اولاد سے ہوئے۔

2۔ دوسرا گروہ اہل حجاز کا تھا جنہوں نے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ تاہم اہل حجاز ہی میں سے بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے بعد کی جنگوں میں غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا۔

3۔ تیسرا گروہ عراق میں بنو امیہ کے وفاداروں کا تھا۔ اس کی سربراہی گورنر عراق ابن زیاد کر رہا تھا۔ انہوں نے بنو امیہ کے اختلاف کے سیٹل ہونے تک ابن زیاد کی بیعت کر لی۔

4۔ چوتھا گروہ عراق کی باغی تحریک کا تھا۔ انہوں نے پہلے سلیمان بن صرد کی قیادت میں منظم ہو کر ابن زیاد کے خلاف بغاوت کی جس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے مختار ثقفی کی قیادت میں اکٹھے ہو کر ایک بار پھر بغاوت کی جو کہ کامیاب رہی۔ اس بغاوت میں انہوں نے عراق میں بنو امیہ کے حامیوں پر قابو پا لیا اور ابن زیاد اور دیگر لوگوں کا قتل عام کر دیا۔

5۔ پانچواں گروہ خوارج کا تھا۔ یہ وہی گروپ تھا جس نے حضرت علی کو شہید کیا تھا لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی حکمت عملی کے سبب انہیں زیادہ سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اب یہ لوگ بھی کسی حد تک منظم ہو گئے تھے تاہم اب ان کے متعدد گروپ ہو چکے تھے۔ اب یہ نہ صرف عام مسلمانوں کو، بلکہ ایک دوسرے کو بھی کافر قرار دے کر واجب القتل سمجھنے لگے تھے۔

6۔ چھٹا گروہ غیر جانبدار مسلمانوں کا تھا جو کہ اکثریت پر مشتمل تھا۔ یہ کوئی منظم سیاسی گروپ نہ تھا بلکہ عام مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ ان میں حضرت عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہر حالت میں جماعت یعنی حکومت وقت کے ساتھ رہنا چاہیے، پارٹی بازی میں نہیں پڑنا چاہیے اور جب ایک حکومت قائم ہو جائے تو اس کی اطاعت سے نہیں نکلنا چاہیے تاکہ ان کی توانائیاں باہمی جنگوں میں صرف نہ ہو سکیں۔

ان چھ گروہوں کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟

64-73/684-693 کے نو برس ان میں سے پہلے پانچ گروہوں کی باہمی کشاکش میں گزرے۔ چھٹے گروپ نے سیاست سے لاتعلقی رکھی اور جس بھی گروہ کو اقتدار ملا، اس کی بیعت کر لی۔ ان حضرات نے اپنی پوری توجہ دین کی تعلیم اور تربیت کی طرف لگا دی اور اس میدان میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ یہ حضرات دوسری خانہ جنگی کے زمانے میں بالعموم محفوظ رہے۔ جو بھی معاملات ہوئے، وہ پہلے پانچ گروہوں کے درمیان طے پائے۔ چونکہ یہ اتنے سارے گروپ ہیں، اس وجہ سے ان کے حالات بیان کرتے ہوئے مورخین نے واقعات کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اس صورتحال کا تجزیہ کرنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ ہم اس دور کے واقعات کی ٹائم لائن پیش کر دیں۔

رجب60/680	حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات اور یزید کی حکومت کا آغاز
محرم61/680	سانحہ کربلا
ذوالحجہ63/683	سانحہ حرہ
محرم64/683	مکہ کا محاصرہ
ربیع الاول64/683	یزید کی موت اور شام میں معاویہ بن یزید کی بیعت
ربیع الاول64/684	حجاز میں ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی بیعت
جمادی الاخری64/684	معاویہ بن یزید کی وفات اور اہل مصر کی ابن زبیر سے بیعت
64/684	ابن زبیر کا عراق پر کنٹرول
ذوالقعدہ64/684	شام میں مروان بن حکم کی بیعت اور شام، فلسطین اور مصر پر بنو امیہ کی حکومت کا کنٹرول
جمادی الاولی65/685	سلیمان بن صرد اور بنو امیہ کی جنگ جس میں بنو امیہ کو فتح حاصل ہوئی
جمادی الاخری65/685	بصرہ میں خوارج کی ابن زبیر کے خلاف بغاوت جس میں خوارج کو فتح حاصل ہوئی
رمضان65/685	مروان بن حکم کی وفات اور عبد الملک بن مروان کی بیعت
ذوالحجہ66/686	جنگ بابل: مختار ثقفی اور بنو امیہ کی جنگ جس میں مختار ثقفی کو فتح حاصل ہوئی
ذوالحجہ66/686	جنگ موصل: مختار ثقفی کے ساتھی ابراہیم بن اشتر اور بنو امیہ کی جنگ جس میں ابراہیم کو فتح حاصل ہوئی اور ابن زیاد اور حصین بن نمیر مارے گئے۔ شمالی عراق پر مختار کی حکومت قائم ہو گئی۔
66/686	یمامہ (موجودہ وسطی سعودی عرب) میں نجدہ بن عامر کی بغاوت اور یمامہ کی ابن زبیر کی حکومت سے علیحدگی
رمضان67/687	جنگ کوفہ: مصعب بن زبیر اور مختار کے درمیان ہونے والی اس جنگ میں ابن زبیر کو فتح حاصل ہوئی اور مختار ثقفی مارا گیا۔
68/688	ایران میں خوارج کی بغاوت اور ابن زبیر کی فتح
69/689	نجدہ بن عامر کی شکست اور یمامہ پر ابن زبیر کا کنٹرول
69/689	عمرو بن سعید اموی کی عبد الملک بن مروان کے خلاف بغاوت اور عبد الملک کی فتح
71/691	عبد الملک بن مروان کا عراق پر حملہ اور مصعب بن زبیر سے جنگ۔ عبد الملک کو فتح نصیب ہوئی اور عراق بنو امیہ کے کنٹرول میں چلا گیا۔
رمضان72/692	عبد الملک کی جانب سے حجاج بن یوسف کا مکہ کا محاصرہ اور حجاز پر عبد الملک کا کنٹرول
جمادی الاخری73/692	حجاج بن یوسف کی فتح اور ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت
73/692	عبد الملک بن مروان کے اقتدار کی تکمیل
76-77/696-697	خوارج کی بغاوت اور ان کا مکمل استیصال
86/705	عبد الملک بن مروان کی وفات

اس ٹائم لائن کو دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ اس زمانے کی بڑی سیاسی قوتیں دو تھیں: ایک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور دوسرے بنو امیہ۔ عراق کی باغی تحریک اور خوارج چھوٹے گروپ تھے۔ اس پورے دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ ابتدائی دور (64-67/684-687): یہ سیاسی بے چینی اور خانہ جنگی کا دور تھا۔ اس دور میں عراق میں خوارج اور عراق کی باغی تحریکیں پیدا ہوئیں تاہم ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے ان پر قابو پا لیا۔ مختار ثقفی کے بعد عراق کی باغی تحریک کی قوت کا زور ٹوٹ گیا۔ اسی طرح خوارج بھی شکست کھا کر ایران کے علاقوں میں بکھر گئے اور خاموشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس دوران بنو امیہ اندرونی اختلافات کا شکار رہے تاہم انہوں نے جلد ہی کم بیک کیا اور ایک دو سال کے عرصے میں شام اور مصر پر اپنا کنٹرول بحال کر لیا۔

2۔ متوسط دور (67-71/687-691): یہ نسبتاً استحکام اور سکون کا دور تھا۔ اس زمانے میں باہمی خانہ جنگیاں نہیں ہوئیں۔ صرف ایران میں خوارج اور یمامہ میں نجدہ بن عامر نے چھوٹی موٹی بغاوتیں کیں جنہیں ابن زبیر نے فرو کر دیا۔ اس زمانے میں عبد الملک نے بھی شام، فلسطین اور مصر میں اپنی حکومت کو مستحکم کیا۔

3۔ آخری دور (71-73/691-692): یہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت کے زوال اور بنو امیہ کی حکومت کے عروج کا دور ہے۔ اس میں پہلے عراق اور پھر حجاز ابن زبیر کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے اور بالآخر ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

4۔ عبد الملک بن مروان کا دور (73-86/692-705): یہ استحکام کا دور تھا اور اس میں سوائے چھوٹی موٹی بغاوتوں کے اور کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہ ہوا۔

5۔ اس کے بعد بنو امیہ کے تقریباً پورے دور میں حکومت مستحکم رہی، مسلمانوں میں اتحاد برقرار رہا اور سوائے چھوٹی موٹی بغاوتوں کے اور کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ یہ صورتحال 130/747 تک برقرار رہی۔ اس کے بعد بنو عباس کی بنو امیہ کے خلاف تحریک منظر عام پر آئی اور بالآخر بنو امیہ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ تاہم امویوں نے اس کے بعد اسپین میں اپنا اقتدار قائم کر لیا جو کہ 422/1031 تک جاری رہا۔

ابن زبیر اور بنو امیہ کے اختلاف کی حیثیت کیا تھی؟

بعض لوگ ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور بنو امیہ کے اختلاف کو مذہبی رنگ دیتے ہیں۔ وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ بنو امیہ بڑے ظالم و جابر اور بد معاش قسم کے لوگ تھے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس وجہ سے ان کے مقابلے میں اپنی خلافت کا اعلان کیا تاہم اموی غالب آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کو بھی اکابر صحابہ جیسے ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے قبول کیا۔ اگر یہ اختلاف مذہبی ہوتا تو یہ حضرات اسے قبول نہ کرتے۔ صحیح بخاری میں ہے:

عبد اللہ بن دینار کہتے ہیں کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھا جب لوگ عبد الملک (کی حکومت) پر متفق ہوئے۔ اس وقت ابن عمر نے (عبد الملک کو) لکھا: " میں اپنی استطاعت کی حد تک اللہ کے بندے عبد الملک امیر المومنین کی سمع اور طاعت کا، اللہ کی سنت اور اس کے رسول کی

سنت کے دائرے میں اقرار کرتا ہوں۔ میری اولاد بھی اسی کی طرح اس بات کا اقرار کرتی ہے۔[49]

ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ملا تو کہنے لگے: "کیا آپ لوگوں نے نہیں دیکھا ہے کہ ابن زبیر خلافت کے لیے کھڑے ہوئے ہیں؟ میں نے دل میں سوچا ہے کہ میں غور کروں گا کہ آیا وہ اس کے مستحق ہیں یا نہیں۔ میں نے ابو بکر و عمر کی خلافت کے معاملے میں کبھی غور نہیں کیا کیونکہ وہ ہر طرح سے اس کے لائق تھے۔ پھر میں نے دل میں سوچا کہ وہ (ابن زبیر) تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے (پوتے) اور زبیر بن عوام کے صاحبزادے ہیں جو کہ عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یار غار (ابو بکر) کے نواسے ہیں اور سیدہ خدیجہ کے بھائی کے بیٹے ہیں اور سیدہ اسماء کے بیٹے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ میں ان کا مقرب بن جاؤں۔ میں اپنے دل میں ان سے نہ کھنچوں گا لیکن ابن زبیر میری طرف توجہ نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس میں کچھ بھلائی محسوس کرتے ہوں لیکن اب میں اپنے چچا کے بیٹے (عبد الملک) کی بیعت کر لوں گا کہ کیونکہ کسی غیر کے حاکم ہونے سے بہتر ہے کہ ہمارے عزیز حاکم ہوں۔[50]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اختلاف کی حیثیت مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بنو امیہ کے اندر باپ کے بعد بیٹے کی خلافت کا جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے، وہ درست نہیں ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے اسے ختم کرنے کے لیے کوشش کی۔ اس کے برعکس ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس سلسلے کو بزور ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو امت میں افتراق و انتشار پیدا ہو گا۔ امت کو افتراق و انتشار اور خانہ جنگیوں سے بچانا، اسے موروثی بادشاہت سے بچانے کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ ان تمام بزرگوں کی اپنی اپنی اجتہادی رائے تھی اور ہر ایک نے اپنی رائے کے مطابق عمل کیا اور سبھی کو ان کی حسن نیت کا اجر ملے گا۔ ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے سیاسی میدان سے الگ ہو کر علم اور دعوت کے میدان میں جو غیر معمولی کارنامے انجام دیے، ان کا مطالعہ انشاء اللہ ہم مسلمانوں کی علمی و دعوتی تحریک میں کریں گے۔

چھٹے عشرے میں عالم اسلام کی سیاسی حالت تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک طرف بنو امیہ اور ان کے حامی تھے اور دوسری جانب ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے حامی۔ عبد الملک بن مروان بھی ایک بڑے عالم اور فقیہ تھے اور ان کا شمار متوسط تابعین کے فقہاء میں ہوتا ہے۔ حضرت ابن زبیر اور بنو امیہ میں رشتے داری تھی۔ ان کی بہن رملہ بنت زبیر کی شادی اموی سائنسدان خالد بن یزید بن معاویہ سے ہوئی تھی۔[51] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات بھی اسے محض ایک سیاسی اختلاف ہی سمجھتے تھے، مذہبی اختلاف نہیں سمجھتے تھے۔

---

[49] بخاری۔ کتاب الاحکام۔ حدیث 6777

[50] ایضاً۔ کتاب التفسیر۔ حدیث 4389

[51] بلاذری۔ انساب الاشراف۔ 5/386۔ باب خالد بن یزید بن معاویہ۔

دونوں گروہوں کو عالم اسلام کے ایک بڑے حصے کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان باہمی جنگوں کا افسوس ناک سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں عبد الملک کا اقتدار عالم اسلام پر قائم ہو گیا اور تمام مسلمانوں نے ان کی بیعت کر لی۔ کاش کہ یہ اختلاف مذاکرات کے ذریعے طے کر لیا جاتا اور "کچھ دو اور کچھ لو" کے اصول کے تحت ویسا ہی اتحاد وجود میں آتا جیسا کہ 33 برس پہلے حضرت حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کی صلح کے نتیجے میں ہوا تھا۔ بہر حال یہ سب لوگ اب گزر چکے ہیں اور ان کے آپس کے اختلافات کا معاملہ اللہ تعالی کے سپرد ہے۔ ہمیں اس معاملے میں کسی پر زبان طعن دراز نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ان واقعات کی تفصیلات ہمیں محض تاریخی روایتوں ہی سے ملتی ہیں۔

حجاج بن یوسف کے بارے میں کیا رائے رکھنی چاہیے؟

مشرقی ممالک میں انارکی کو ختم کرنے اور حکومت کو مستحکم کرنے میں حجاج بن یوسف نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اس شخص کے بارے میں تاریخی روایتوں میں آتا ہے کہ اس نے عراق اور حجاز میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا اور بے شمار لوگ قتل کروائے۔ اگر یہ مظالم فی الواقع ہوئے ہیں تو یقیناً حجاج اور عبد الملک بن مروان ان کے لیے اللہ تعالی کے حضور جواب دہ ہوں گے۔ دوسری طرف ہمیں یہ روایات بھی ملتی ہیں کہ مسلم خواتین کی پکار پر حجاج ہی نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کو راجہ داہر سے جنگ کرنے بھیجا جنہوں نے موجودہ کراچی سے لے کر ملتان تک کا علاقہ فتح کر لیا۔

تاریخ طبری میں ہے کہ حجاج بن یوسف نے بعض صحابہ جیسے حضرت جابر بن عبد اللہ، انس بن مالک اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم پر بھی تشدد کیا اور ان کے داغ لگوائے۔ طبری میں یہ روایت 74/694 کے باب کے شروع میں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے اس روایت کی منقطع اسناد (Broken chain of narrators) یوں بیان کی ہے: عن ابن أبي ذئب عن إسحاق بن يزيد، اور حدثني شرحبيل بن أبي عون عن أبيه۔ طبری اور ان واقعات کے درمیان دو سو برس کا طویل زمانہ ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ محض دو واسطوں سے یہ روایت ان تک پہنچی ہو۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ نامعلوم لوگ کس درجے میں قابل اعتماد تھے۔ درایت کے اعتبار سے بھی یہ روایت قرین قیاس نہیں ہے کیونکہ جیسے جیسے اصحاب رسول دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، باقی ماندہ صحابہ کی قدر و منزلت لوگوں کی نظر میں بہت زیادہ بڑھ رہی تھی۔ اس دور میں جب قلیل تعداد میں ضعیف العمر صحابہ باقی رہ گئے تھے، ان کے ساتھ اتنی گستاخی کی جاتی تو لوگ کوئی احتجاج نہ کرتے۔ یہ کام حجاج جیسے شخص کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ عین ممکن ہے کہ حجاج کے مظالم کی داستانیں اس پراپیگنڈا کا حصہ ہوں جو بنو عباس نے بنو امیہ کی حکومت گرانے کے لیے کیا۔

خلاصہ باب

- حضرت حسین رضی اللہ عنہ اصلاح احوال اور انارکی کو ختم کرنے کے لیے کوفہ تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ کو علم ہوا کہ

عراق میں حکومت قائم ہو چکی ہے تو آپ نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا۔ یہاں اہل کوفہ کی باغی تحریک کے افراد، جو کہ سرکاری افواج میں شامل تھے، نے آپ کو شہید کر دیا تھا۔

- سانحہ کربلا کے نام پر باغی تحریک پھلی پھولی اور انہوں نے دو بڑی بغاوتیں پیدا کیں جن میں سے ایک کا خاتمہ بنو امیہ اور دوسری کا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں ہوا۔
- سانحہ حرہ ایک حادثہ تھا جس میں اہل مدینہ کے بعض لوگوں نے حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور حکومتی کاروائی کے نتیجے میں یہ بغاوت ختم ہوئی۔
- ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے چونکہ یزید کی بیعت نہیں کی تھی، اس وجہ سے سرکاری افواج نے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا لیکن اس دوران یزید کی موت کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔
- ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خلافت کے دوران جو سب سے اہم کارنامہ انجام دیا، وہ عراق میں باغی تحریک اور ایران میں خوارج کی بیخ کنی تھی۔
- ابن زبیر اور بنو امیہ کا اختلاف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھا۔ اس کے نتیجے میں فریقین کے درمیان افسوس ناک جنگوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جو ابن زبیر کی شہادت پر ختم ہوا۔ اس کے بعد 55-50 برس کے لیے امن قائم ہو گیا۔

اسائن منٹس

۱۔ سانحہ کربلا کے اسباب کیا تھے؟ باغی تحریک کی پچیس سالہ تاریخ کی روشنی میں جواب دیجیے۔

۲۔ تاریخ اسلامی میں بہت سے سانحات رونما ہوئے ہیں جن میں جنگ احد، حضرت عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم کی شہادت، سانحہ کربلا، شہادت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام سانحات میں سے صرف سانحہ کربلا کو غیر معمولی اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اس کے سیاسی اور عمرانی اسباب پر ایک نوٹ لکھیے۔

۳۔ سانحہ کربلا کے بعد حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے خاندان کے مختلف افراد کے کردار پر ایک نوٹ لکھیے۔

۴۔ مختار ثقفی کون تھا؟ اس کے عزائم اور مقاصد کیا تھے؟ اسے کس طرح عروج حاصل ہوا اور کیا اسباب اس کے زوال کا سبب بنے؟

۵۔ عبد الملک بن مروان کے بعد 60-50 برس کے لیے امن قائم ہو گیا۔ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس پورے عرصے میں چھوٹی موٹی بغاوتوں کے سوا کوئی اور بڑا فتنہ کیوں پیدا نہ ہوا؟

۶۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور عبد الملک بن مروان کی جنگوں میں دیگر صحابہ کا موقف کیا تھا؟

باب 8: عہد صحابہ و تابعین سے متعلق عمومی سوالات

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ عہد صحابہ کے بارے میں عمومی طور پر یہ جان سکیں کہ:

- عہد صحابہ میں اتنی جنگیں کیوں ہوئیں؟
- خلافت، ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہوئی؟
- بنو امیہ کا باقی دور کیسا تھا؟
- بعد میں باغی تحریک پر کیا گزری؟
- ناصبی کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؟

اس باب کے اختتام پر ہم اس قابل ہوں گے کہ عہد صحابہ سے متعلق عمومی تاریخی سوالات کے جواب دے سکیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سیاسی دور 73/692 میں ختم ہوتا ہے۔ اس دور سے متعلق کچھ عمومی نوعیت کے سوالات ہیں جو تاریخ کے طلباء کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس باب میں ہم ان کا جائزہ لیں گے۔

عہد صحابہ میں اتنی جنگیں کیوں ہوئیں؟

عہد صحابہ میں اتنی جنگیں نہیں تھیں جتنا کہ تاریخ کو پڑھنے سے تاثر ملتا ہے۔ اصل میں صحافی اور مورخین حضرات کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ وہ چن چن کر منفی واقعات کو رپورٹ کرتے ہیں اور مثبت واقعات ان کے نزدیک اتنے اہم نہیں ہوتے کہ ان کا اندراج تاریخ کی کتب میں کیا جائے۔ مثل مشہور ہے کہ کتا انسان کو کاٹ لے تو خبر نہیں بنتی بلکہ اس وقت بنتی ہے جب انسان کتے کو کاٹ لے۔ صحافت کی ایک اصطلاح ہے جسے "نیوز ویلیو" کہا جاتا ہے۔ جرنلزم کے ماہرین کے نزدیک نیوز ویلیو کا انحصار متعدد عوامل پر ہوتا ہے:

1۔ منفی پن: منفی خبروں کو مثبت خبروں کی نسبت زیادہ کوریج ملتی ہے۔ ہمارے ملک میں روزانہ کروڑوں لوگ اللہ تعالی کے حضور حاضر ہوتے ہیں، لاکھوں لوگ غرباء اور مساکین کی مدد کرتے ہیں، کروڑوں لوگ ایک دوسرے سے محبت سے ملتے ہیں لیکن ان سب کی کوئی نیوز ویلیو نہیں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس کروڑوں میں سے چند لوگ اگر قتل، بدکاری، ریپ، لڑائی جھگڑا یا اسی نوعیت کا کوئی کام کر بیٹھیں تو تمام اخبارات اسے رپورٹ کرتے ہیں۔ ہزاروں جہاز، ٹرینیں، بسیں اور کاریں صحیح وسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچتی ہیں لیکن اخبار میں اس کی خبر نہیں آتی اور نہ ہی کوئی نیوز چینل اسے رپورٹ کرتا ہے لیکن اگر ایک آدھ جہاز، ٹرین، بس یا کار کو حادثہ پیش آ جائے تو یہ خبر بن جاتی ہے۔

2۔ تصادم: تصادم اور لڑائی جھگڑے پر مبنی خبروں کو زیادہ کوریج دی جاتی ہے۔

3۔ نمایاں شخصیات سے تعلق: نمایاں شخصیات جیسے حکمران طبقے سے متعلق خبریں زیادہ نشر کی جاتی ہیں جبکہ عام آدمی سے متعلق خبریں کم۔

4۔ توقع: ایسی خبریں جن کی لوگوں کو توقع نہ ہو، کو زیادہ کوریج ملتی ہے کیونکہ اس سے لوگوں کو چونکایا جا سکتا ہے اور سنسنی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہاں کتے اور انسان والی مثال فٹ بیٹھتی ہے۔

5۔ تحقیقات: اگر کسی خبر کے لیے بہت زیادہ تحقیق کی ضرورت ہو تو اس کی نسبت اس خبر کو زیادہ کوریج دی جاتی ہے جس کے لیے تحقیق کی ضرورت نہ ہو اور وہ آسانی سے دستیاب ہو سکے۔[1]

ان کے علاوہ دیگر عوامل جیسے خبر کی دستیابی، میڈیا میں پیش کیے جانے والے دیگر واقعات، میڈیا کا اپنا شیڈول وغیرہ بھی خبر کی کوریج کا تعین کرتے ہیں۔ چونکہ مورخین کے کام کا انحصار صحافیوں کے کام پر ہوتا ہے، اس وجہ سے یہی عوامل وہاں بھی اپنا اثر دکھا دیتے ہیں۔

[1] http://en.wikipedia.org/wiki/News_values (ac. 4 May 2012)

صحافی، اخباری اور مورخ انہی باتوں کو اپنی کتب میں درج کرتے ہیں جن کی ان کے نزدیک کچھ نیوز ویلیو ہو تا کہ ان کا اخبار یا کتاب بک سکے۔ جو چیزیں نارمل اور روٹین ہوتی ہیں، انہیں وہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان دنوں میں مسلمانوں کی مذہبی، علمی، فکری، تہذیبی اور دعوتی تاریخ پر کام کر رہا ہوں لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اس تاریخ کے بارے میں کتب تاریخ میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں جس کی وجہ سے مجھے کتب تاریخ سے ہٹ کر دیگر وسائل پر انحصار زیادہ کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ مورخین اور اخباریوں کے نزدیک علمی، فکری اور دعوتی تاریخ کی اتنی نیوز ویلیو نہیں تھی کہ وہ اس سے متعلق زیادہ تفصیلات اپنی کتب میں درج کرتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پورے سیاسی دور کا جائزہ لیا جائے تو اس میں امن کے وقفے، جنگ کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ اس کے لیے آپ اس ٹائم لائن کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس ٹائم لائن میں چھوٹے موٹے اور مقامی نوعیت کے واقعات کو ہم نے نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ ان کا عام زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

1-2/622-623	امن کا دور۔۔۔ تقریباً ایک سال
2/624	غزوہ بدر۔۔۔ ایک دن کی جنگ اور کاروائی میں چند دن لگے۔
2-3/624-625	امن کا وقفہ۔۔۔ تقریباً ایک سال
3/625	غزوہ احد۔۔۔ ایک دن کی جنگ اور کاروائی میں چند دن لگے۔
3-5/625-627	امن کا وقفہ۔۔۔ تقریباً دو سال
5/627	غزوہ خندق۔۔۔ چند دن کا محاصرہ اور مکمل کاروائی میں بیس پچیس دن لگے۔
5-7/627-629	امن کا وقفہ۔۔۔ دو سال
7/629	غزوہ خیبر۔۔۔ چند دن کی جنگ اور مکمل کاروائی میں بیس پچیس دن لگے۔ جنگ موتہ۔۔۔ چند دن کی جنگ اور مکمل کاروائی میں بیس پچیس دن لگے۔
7-8/629-630	امن کا وقفہ۔۔۔ ایک سال
8/630	فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ ہوازن اور چند چھوٹے موٹے غزوات۔ سب کو ملا کر چند ماہ کا وقت لگا۔
8-11/630-632	امن کا وقفہ۔۔۔ تین سال۔ اس میں صرف ایک تبوک کی مہم ہے جس میں جنگ نہیں ہوئی۔
11/632	بعض عرب قبائل کا ارتداد اور ان سے جنگیں
12-35/632-655	مسلم دنیا میں امن کا وقفہ۔۔۔23 برس۔ سرحدوں پر روم اور ایران سے جنگیں چلتی رہیں۔
35-40/655-660	شہادت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا دور۔۔۔ اس میں بھی محض تین جنگیں ہوئیں اور ان کے درمیان امن رہا۔
41-60/660-680	مسلم دنیا میں امن کا وقفہ۔۔۔20 برس۔ سرحدوں پر اہل روم اور خراسان سے جنگ چلتی رہی۔
61-64/680-684	سیاسی بے چینی کا دور۔۔۔ تین سال۔ اس میں بھی سوائے تین سانحوں کے بالعموم امن قائم رہا۔
64-67/684-687	خانہ جنگی کا دور
67-70/687-690	چھوٹی موٹی بغاوتوں کے علاوہ عمومی امن کا وقفہ۔۔۔ چار سال

71-73/690-692	خانہ جنگی کا دور۔۔۔دو سال
73-132/692-750	چھوٹی موٹی بغاوتوں کے علاوہ بحیثیت مجموعی امن کا دور۔۔۔58 سال

ان تمام ادوار کو دیکھا جائے تو مسلم دنیا کی حد تک سوائے دس بارہ سالوں کے تقریباً سو برس کی بقیہ پوری تاریخ امن کے ادوار پر مشتمل ہے۔ صحیح معنوں میں سن 67-61 اور 73-71 کو خانہ جنگی کا دور کہا جا سکتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ تمام ہی قبائل نے بغاوت کر دی ہو۔ پورے عرب کے صرف چند قبائل نے بغاوت کی جسے متحد مسلمانوں نے چند ہی ماہ میں ختم کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کو خانہ جنگی کا دور اس وجہ سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک باغی تحریک موجود تھی اور جو بھی جنگیں ہوئیں، ان میں یہی باغی تحریک شامل تھی۔ اس طرح سے اندرونی انتشار کا دور صرف آٹھ دس سالوں پر محیط ہے۔

امن کا زمانہ تقریباً سو برس پر محیط ہے جس میں ہر قسم کی معاشی، معاشرتی، دعوتی، تعلیمی، اخلاقی اور ثقافتی ترقی ہمیں نظر آتی ہے۔ جنگ کا تناسب محض 25% جبکہ امن کا تناسب 75% ہے۔ یہ 25% بھی محض سالوں کا تناسب ہے۔ ان سالوں کے اندر بھی یہ کیفیت نہیں رہی ہو گی کہ ہر مہینے اور ہر دن جنگ ہو رہی ہو گی بلکہ محض چند ماہ ایسے ہوں گے جن میں جنگ ہوئی ہو گی۔ اخباری اور مورخین کے نزدیک چونکہ امن کے ان طویل وقفوں کی کوئی نیوز ویلیو نہیں ہوتی ہے، اس وجہ سے وہ انہیں ایسے نظر انداز کرتے ہیں جیسے ان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے برعکس وہ جنگ کی استثنائی صورت پر بہت زیادہ فوکس کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس دور میں جنگ ایک نارمل کیفیت تھی اور امن کے وقفے محض استثنائی تھے۔

جہاں تک بیرونی خطرات کا تعلق ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفار مکہ اور یہود سے جو جنگیں ہوئیں، ان کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے اسلام کی دعوت کو مٹانے کے لیے اس پر حملوں کا آغاز کیا۔ اس کے بعد روم اور ایران کی سپر پاورز سے جنگوں کا آغاز بھی اسی وجہ سے ہوا کہ یہ قوتیں اپنے قریب ایک تیسری سیاسی طاقت کو برداشت نہ کر رہی تھیں۔ اس دور میں ابھی اقوام متحدہ وجود میں نہ آئی تھی اور ہر ریاست خود کو دوسری کے ساتھ جنگ پر مجبور پاتی تھی۔ اگر ایک ریاست دوسری پر حملہ نہ کرتی تو دوسری پہلی پر حملہ کر دیتی۔ یہ کیفیت 1945 تک رہی ہے جب اقوام عالم نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک معاہدہ کیا کہ کوئی ریاست دوسری پر حملہ نہ کرے گی اور جارحیت کی صورت میں مسئلے کا حل اقوام متحدہ کے ادارے کے ذریعے تلاش کیا جائے گا۔ اس معاہدے کے باوجود بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ جنگیں اب بھی چلتی رہتی ہیں۔

خلافت، ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہوئی؟

یہ حقیقت ہے کہ عبد الملک بن مروان سے صحیح معنوں میں بادشاہت کا آغاز ہوا۔ عبد الملک کے بعد ان کے چار بیٹے ولید، سلیمان، یزید اور ہشام خلیفہ یکے بعد دیگرے بنے۔ صرف درمیان میں دو سال کے لیے ان کے بھتیجے عمر بن عبد العزیز بن مروان رحمہ اللہ کو خلافت ملی اور انہوں نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ بنو امیہ کے بعد یہ بادشاہت بنو عباس اور پھر عثمانی ترکوں کے ہاتھ میں رہی اور یہ

ملوکیت ہی تھی۔ یہاں پر تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ سن 1/622 میں قائم ہونے والی وہ حکومت الٰہیہ، جس کے بانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، کیا یہ حکومت الٰہیہ اتنی کمزور تھی کہ محض 73 برس میں اس کا خاتمہ ہو گیا اور یہ ملوکیت میں تبدیل ہو گئی؟ پھر ان 73 برس میں بھی کم از کم یزید کا چار سالہ دور سانحات سے پر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اسلام، کم از کم سیاسی میدان میں بالکل ہی ناکام رہا۔

یہ سوال اصل میں اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں لوگ اس ملوکیت کو آج کل کے زمانے کی فوجی آمریتوں پر قیاس کر لیتے ہیں جو عالم اسلام میں جا بجا مسلط ہیں۔ اس وجہ سے لازم ہے کہ قدیم دور کی ملوکیت کا موازنہ ہم اپنے دور کی آمریتوں سے کر لیں تاکہ دونوں کا فرق واضح ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملوکیت کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں اچھے اور برے ہر طرح کے بادشاہ گزرے ہیں تاہم مجموعی غلبہ خیر ہی کا رہا ہے۔

خصوصیت	خلافت راشدہ	اموی، عباسی اور عثمانی سلاطین	جدید آمریتیں
1۔ مملکت کا قانون	قرآن و سنت	قرآن و سنت	حکمران طبقے کی منشا
2۔ حکمران کا انتخاب	مسلمانوں کا باہمی مشورہ	موروثی اقتدار یا فوجی طاقت	موروثی اقتدار یا فوجی طاقت
3۔ علماء و صلحاء کا حکومت میں کردار	حکومت میں شریک تھے	کافی حد تک شریک حکومت تھے اور اصلاح کرتے رہے	حکومت میں کم ہی شریک ہوئے
4۔ بیت المال پر حکمران کا ذاتی کنٹرول	کوئی کنٹرول نہیں بلکہ خلیفہ سے مکمل حساب لیا جاتا تھا	ایک حد تک کنٹرول مگر زیادہ فنڈ عوام کی فلاح پر خرچ ہوتے تھے	مکمل کنٹرول
5۔ حکمرانوں کی اخلاقی حالت	آئیڈیل	زیادہ تر اچھے اور کبھی برے حکمران	زیادہ تر برے حکمران
6۔ حکمرانوں کا ظلم و ستم	بالکل نہیں	زیادہ تر صرف اپنے سیاسی مخالفین کے لیے	زیادہ تر صرف اپنے سیاسی مخالفین کے لیے
7۔ قانون سازی کی ذمہ داری	قرآن و سنت کی بنیاد پر اہل شوریٰ کا اجتماعی اجتہاد	قرآن و سنت کی بنیاد پر اہل علم کا اجتماعی اجتہاد	حکمران کی ذات یا اس کی ربڑ اسٹیمپ پارلیمنٹ
8۔ عوام کی فلاح و بہبود	تمام تر فنڈز عوام کی فلاح اور قومی ضروریات پر خرچ ہوتا تھا	فنڈز کا اکثر حصہ عوام کی فلاح اور قومی ضروریات پر خرچ ہوتا تھا جبکہ کچھ حصہ حکمران طبقہ استعمال کرتا تھا	فنڈز کا اکثر حصہ حکمران طبقے کی ذات پر خرچ ہوتا ہے جبکہ کچھ حصہ قومی ضروریات کے لیے باقی بچتا ہے

اس جدول کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت کے اس دور میں ایسا نہیں تھا کہ آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہو اور پوری کی پوری امت مسلمہ گمراہی کا شکار ہو گئی ہو۔ اس کے برعکس ہمیں نظر آتا ہے کہ حکمران طبقے میں کچھ خرابیاں تو پیدا ہوئیں مگر بڑی حد تک یہ امت صراط مستقیم پر قائم رہی۔ یہ درست ہے کہ مسلمانوں میں موروثی بادشاہت قائم ہو گئی جس کے نتیجے میں آپس میں خانہ جنگیاں اور اقتدار کی کشمکش ہوتی رہی تاہم مملکت کا قانون قرآن و سنت ہی رہا۔ مسلمانوں کی ان تمام مملکتوں میں عوام کی فلاح و بہبود کو بنیادی حیثیت حاصل رہی اور برے حکمرانوں کے دور میں بھی عام آدمی کو اس کا حق ملتا رہا۔ اس کے برعکس غیر مسلم دنیا میں بالعموم یہ کیفیت نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے غیر مسلم اپنے اپنے ملکوں کو چھوڑ کر مسلم علاقوں میں آ کر آباد ہوتے تھے اور یہاں کے فوائد سے اسی طرح انجوائے کرتے تھے جیسے اب مسلمان مغربی دنیا میں جا کر کرتے ہیں۔ اگر پوری مسلم تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں تین طرح کے حکمران نظر آتے ہیں:

- نہایت ہی اعلی کردار کے حکمران۔ ان میں مثلاً عمر بن عبد العزیز، متوکل علی اللہ عباسی اور صلاح الدین ایوبی رحمہم اللہ نمایاں ہیں۔ ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔
- نہایت ہی برے کردار کے حکمران۔ ان کی تعداد بھی بہت کم ہے۔
- درمیانی قسم کے حکمران جن میں اچھائیاں اور برائیاں پائی جاتی تھیں۔ زیادہ تر سلاطین اسی نوعیت کے ہیں۔

دنیا کی دیگر اقوام کی تاریخ سے اگر ہم اپنی تاریخ کا موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلم تاریخ میں اگرچہ برائیاں موجود رہی ہیں تاہم خیر کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ اس وجہ سے اس تاریخ پر ہمیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

بنو امیہ کا بقیہ دور کیسا تھا؟

بنو امیہ کا بقیہ دور ملا جلا ہے۔ اس میں اچھے اور برے دونوں طرح کے حکمران گزرے ہیں۔ زیادہ تر حکمران وہ ہیں جو حکومت کی اہلیت رکھتے تھے تاہم ان میں کچھ خرابیاں بھی موجود تھیں۔ ولید بن عبد الملک بن مروان کا زمانہ فتوحات کا زمانہ ہے۔ اس میں سندھ، اسپین اور وسطی ایشیا کے علاقے فتح ہوئے۔ سلیمان بن عبد الملک کے زمانے میں کچھ کمزوریاں موجود ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز بن مروان رحمہ اللہ کا مختصر دور ہے جس میں انہوں نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ ان کے بعد یزید اور ہشام بن عبد الملک کے ادوار ہیں جن میں اچھی بری دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے ادوار میں حکومتی سطح پر کچھ خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں تاہم ایسا نہیں تھا کہ آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہو۔ ہشام کے بعد بنو عباس کی تحریک اٹھی جس نے بنو امیہ کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ عباسی خلفاء بھی امویوں کی طرح ہی تھے۔ ان میں بھی اچھے برے ہر طرح کے ادوار گزرے ہیں۔ ایک طرف ہمیں ہادی، ہارون الرشید اور متوکل جیسے دیندار خلفاء نظر آتے ہیں اور دوسری طرف برے حکمران بھی انہی کا حصہ ہیں۔

بعد میں باغی تحریک پر کیا گزری؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو باغی تحریک اٹھی تھی اور زیر زمین موجود رہی تھی، اس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اس کے دو حصے ہو گئے تھے: ایک حصہ خوارج تھے اور دوسرے عراق کے باغی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس تحریک کی ان دونوں شاخوں کو اچھی طرح کچل دیا تھا۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان کے زمانے میں خوارج نے پھر سر اٹھایا لیکن اموی گورنر مہلب بن ابی صفرہ نے ان کی قوت کو ایک بار پھر توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد بھی انہوں نے پھر کئی مرتبہ سر اٹھانے کی کوشش کی لیکن مسلسل بغاوتوں کے نتیجے میں یہ کمزور ہو کر ختم ہو گئے۔

ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں خوارج مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے جن میں ازارقہ، صفاریہ اور اباضیہ کو شہرت ملی۔ ان کے یہ نام اپنے اپنے لیڈروں کے ناموں پر تھے۔ ان میں سے اباضیہ نسبتاً اعتدال پسند تھے۔ یہ عام مسلمانوں کو کافر قرار نہیں دیتے تھے اور نہ ہی بغاوت کو فرض سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس خوارج کی دیگر پارٹیوں کا موقف یہ تھا کہ ان کے علاوہ تمام مسلمان کافر ہیں اور ظالم حکمران کے خلاف بغاوت فرض ہے۔ یہ تمام گروہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں بار بار "خود کش بغاوتیں" کرتے رہے اور اس کے نتیجے میں مکمل طور پر ختم ہو گئے۔ اباضیہ اپنے اعتدال پسند موقف کے باعث باقی رہے اور اب تک موجود ہیں۔ دوسری صدی کے نصف آخر میں انہیں شمالی افریقہ میں اقتدار بھی مل گیا جو کہ آل رستم (160-296/776-909) کی حکومت کہلاتی ہے۔ اس کے بعد اگرچہ انہیں زوال آیا لیکن اب بھی یہ لیبیا اور الجیریا میں اقلیت اور عمان میں اکثریت میں موجود ہیں۔

باغی پارٹی کے کوفی گروپ کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اس کی بھی دو شاخیں ہو گئی تھیں۔ سلیمان بن صرد کی قیادت میں ایک شاخ نے "توابین" کے نام سے بغاوت کی جس میں ان کے اکثر لوگ مارے گئے۔ اس کے بعد یہ مختار ثقفی کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے اور پھر ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی افواج نے ان کا قلع قمع کر دیا۔ اس کے بعد یہ نہایت سکون سے رہے تاہم انہوں نے اپنی کاوشوں کا رخ پراپیگنڈا کی طرف موڑ دیا۔ انہوں نے جنگ صفین، سانحہ کربلا اور دیگر واقعات سے متعلق تاریخی روایات وضع کر کے مسلمانوں میں پھیلانا شروع کر دیں تاکہ عام مسلمانوں کو باغی تحریک کا حصہ بنایا جا سکے۔ انہیں بہت زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی اور مین اسٹریم مسلمان حکومت وقت کے ساتھ وابستہ رہے۔ چونکہ یہ لوگ حضرت علی اور حسین رضی اللہ عنہما کا نام استعمال کرتے تھے، اس وجہ سے بعض لوگ ان سے متاثر ہو جاتے تھے۔ تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان کی قیادت اب حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے پاس تھی جنہوں نے پانچ یا چھ خلفاء کا زمانہ پایا مگر کبھی علم بغاوت بلند نہ کیا بلکہ 95/714 میں اپنی وفات تک امت کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔

دوسری صدی ہجری کے دوسرے عشرے میں باغی تحریک کچھ تقویت اس وقت ملی جب حضرت زین العابدین کے بیٹے زید رحمہا اللہ کو انہوں نے بغاوت پر آمادہ کر لیا لیکن عین موقع پر انہیں دھوکہ دے کر ان سے الگ ہو گئے۔ یہ بالکل وہی معاملہ تھا جو اس سے پہلے وہ

حضرت زید کے پڑدادا، حضرت علی اور دادا حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ کر چکے تھے۔ طبری نے 122/740 کے باب ہشام کلبی اور ابو مخنف کے حوالے سے اس واقعے کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

ذکر هشام عن أبي مخنف: جب زید کے ان طرف داروں کو، جنہوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، معلوم ہوا کہ زید کے ارادہ کا علم یوسف بن عمر (اس زمانے کے گورنر عراق) کو ہو گیا ہے اور اس نے زید کے پاس اپنے جاسوس لگا دیے ہیں اور وہ ان کے حال کی تفتیش کر رہا ہے تو ان کے لیڈروں کی ایک جماعت زید کے پاس آئی اور ان سے پوچھا: "ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟"

زید نے جواب دیا: "اللہ ان پر اپنا رحم کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ میں نے اپنے کسی خاندان والے ان سے برأت کا اعلان کرتے نہیں سنا ہے اور نہ ہی کوئی شخص ان کے متعلق کبھی برے الفاظ استعمال کرتا ہے۔"

ان لوگوں نے کہا: "آپ اہل بیت کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اسی لیے اٹھے ہیں کہ یہ دونوں (ابو بکر و عمر) آپ کی حکومت کے درمیان میں حائل ہو گئے تھے اور اسے آپ لوگوں (اہل بیت) کے ہاتھوں سے نکال دیا۔"

زید نے کہا: "اس معاملے میں سخت سے سخت بات جو میں کہہ سکتا ہوں، وہ صرف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کے زیادہ مستحق ہم تھے مگر قوم (مسلمانوں) نے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی اور ہمیں اس سے ہٹا دیا۔ مگر اس بنیاد پر وہ ہمارے نزدیک کفر کے درجہ تک نہیں پہنچے۔ یہ دونوں حضرات امیر المومنین ہوئے تو انہوں نے لوگوں میں انصاف کیا، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل پیرا رہے۔"

ان لوگوں نے کہا: "جب ان دونوں حضرات نے آپ کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا تو پھر ان لوگوں (بنو امیہ) نے بھی نہیں کیا۔ پھر آپ ہمیں کیوں ان لوگوں سے لڑنے کا کہہ رہے ہیں جنہوں نے آپ پر ظلم نہیں کیا۔"

زید نے کہا: "یہ بات نہیں ہے۔ یہ لوگ ان جیسے نہیں ہیں۔ یہ نہ صرف مجھ پر بلکہ آپ لوگوں بلکہ خود اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ میں آپ کو کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف بلاتا ہوں تاکہ احیاء سنت ہو اور بدعات مٹائی جائیں۔ اگر آپ لوگ میری دعوت کو قبول کر لیں تو خود آپ کو اس کا فائدہ پہنچے گا اور اگر انکار کر دیں تو میں آپ پر حکمران تو ہوں نہیں کہ آپ میری بات لازم طور پر مان لیں۔"

یہ سن کر یہ لوگ انہیں چھوڑ کر چلے آئے اور اپنی بیعت توڑ دی۔ کہنے لگے: "یہ امام سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔" یہ لوگ اس بات کے مدعی تھے کہ زید کے بھائی محمد بن علی (الباقر) اصل میں امام تھے۔ ان کے بیٹے جعفر بن محمد (الصادق) ابھی زندہ تھے۔ ان لوگوں نے کہا: "جعفر اپنے والد کے بعد ہمارے امام ہیں اور وہی امامت کے مستحق ہیں۔ ہم زید بن علی کا ساتھ نہیں دیتے ہیں کیونکہ وہ امام نہیں ہیں۔" اس بنا پر زید نے ان کا نام رافضہ (انکار کرنے والے) رکھا مگر اب (طبری کے زمانے میں) یہ لوگ مدعی ہیں کہ جب ہم نے مغیرہ کا ساتھ چھوڑا تو انہوں نے ہمارا یہ نام رکھا۔[2]

اس کے بعد زید بن علی رحمہا اللہ نے بغاوت کر دی۔ ان کے ہاتھ پر ہزاروں لوگوں نے بیعت کی تھی لیکن محض 218 آدمی اکٹھے ہوئے

[2] طبری۔ 5/231

اور اس جھڑپ میں زید شہید ہو گئے۔ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی اولاد کے بزرگوں کو امام قرار دے کر ان کے نام سے اپنی تحریک چلارہے تھے۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد کے کچھ لوگوں نے بنو امیہ کے خلاف تحریک اٹھائی۔ اس تحریک میں اس باغی تحریک نے بنو عباس کا ساتھ دیا اور یہ کامیاب رہی۔ بنو امیہ کا تختہ الٹ کر بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے اس باغی تحریک کے لیڈروں کو حکومت میں شریک نہ کیا۔ اس پر یہ بہت تلملائے اور انہوں نے تاریخی روایتوں میں بنو عباس کے خلاف بھی جی کھول کر پراپیگنڈا کیا۔ یہ مشہور کر دیا کہ بنو عباس اتنے سفاک تھے کہ انہوں نے بنو امیہ کے باقی ماندہ لوگوں کو کھانے کے لیے بلایا اور پھر انہیں قتل کروا کر ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر دستر خوان بچھا کر اس پر کھانا تناول کیا۔ یہ روایت نہ تو طبری میں موجود ہے اور نہ کسی اور معتبر کتاب میں۔ اگر اس روایت میں ذرا سی بھی حقیقت ہوتی تو بنو امیہ کے زمانے میں اسپین میں لکھی جانے والی کتابوں میں اس واقعے کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ بنو امیہ نے تو خود پر ہونے والے اس ظلم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ بہرحال باغی تحریک کو بنو عباس کے دور عروج میں بھی کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی اور جس اقتدار کے لیے وہ کھڑے ہوئے تھے، وہ انہیں کم از کم تین سو برس تک نصیب نہ ہوا۔

ناصبی کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؟

یہ کہا جاتا ہے کہ پہلی صدی میں ایک اور فرقہ بھی پیدا ہوا جنہیں "نواصب" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ خود کو "شیعان عثمان" یا "العثمانیون" کہا کرتے تھے اور بنو امیہ کے شدید حمایتی تھے۔ مشہور ادیب جاحظ (150-255/767-869) نے ان پر ایک کتاب "العثمانیہ" کے نام سے لکھی ہے۔ ابن عساکر اور ابن کثیر نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ اپنی ابتدا میں ان کا موقف صرف یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا قصاص لیا جائے اور باغی تحریک کے سرغنوں کو کڑی سزا دی جائے۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا احترام کرتے تھے۔ ابن عساکر لکھتے ہیں:

> یزید بن ہارون سے کہا گیا: "آپ حضرت عثمان کے فضائل تو بیان کرتے ہیں لیکن حضرت علی کے فضائل کیوں بیان نہیں کرتے؟" انہوں نے جواب دیا: "حضرت عثمان کے ساتھی تو حضرت علی کے بارے میں کوئی منفی بات نہیں کرتے لیکن جو لوگ خود کو اصحاب علی کہتے ہیں، وہ حضرت عثمان کے خلاف زبان درازی کرتے ہیں۔[3]

بعد کے دور میں ایسا لگتا ہے کہ یہ گروہ حضرت علی، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے خلاف زبان درازی کرنے لگا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مروان بن حکم کی اولاد میں سے جو لوگ خلفاء ہوئے، انہوں نے جمعہ کے خطبوں میں حضرت علی کے خلاف سب و شتم کا آغاز کیا اور اس رسم بد کو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ختم کیا۔ لیکن ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ایسا کرنا، خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا۔

[3] ابن عساکر۔ 39/503

حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے سبھی خلفاء کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات رہے کیونکہ انہوں نے واقعہ حرہ کے موقع پر مروان کے پورے خاندان کو بچایا تھا۔ کیا اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے والد اور دادا کو گالیاں دینے والوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھیں گے؟ یہ بات البتہ ممکن ہے کہ بنو امیہ کے بعض حاشیہ برداروں، خوشامد پسندوں اور شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفاداروں نے ایسی حرکت کی ہو۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ناصبی فرقہ کی تاریخ سے متعلق کچھ تفصیلات مل جائیں لیکن یہ نہیں مل سکی ہیں۔ شہرستانی (d. 578/1182)، جنہوں نے اپنے زمانے کے فرقوں کے تعارف اور تاریخ پر ایک عظیم کتاب "الملل والنحل" لکھی تھی، نے بھی اس کتاب میں ناصبیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصبی کوئی منظم فرقہ نہیں رہا بلکہ یہ محض ایک رجحان تھا جو بعض لوگوں میں جاری رہا۔ جب بنو عباس نے بنو امیہ کے اقتدار کا خاتمہ کیا تو ان کے حامیوں کو بھی قتل کیا۔ اس میں ناصبی فرقہ بھی مٹ کر رہ گیا۔ بعد کی صدیوں میں ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے تاہم یہ منظم نہیں ہو سکے۔ ابن کثیر نے اپنے زمانے (آٹھویں صدی ہجری) کے بعض لوگوں کا ذکر کیا ہے جو سانحہ کربلا کی یاد میں دس محرم کو جشن منایا کرتے تھے۔ بہر حال امت میں ان لوگوں کو کبھی قبول عام حاصل نہیں ہوا اور انہیں نفرت کی نگاہ ہی سے دیکھا گیا ہے۔ اس وجہ سے یہ گروہ کبھی کھل کر سامنے نہیں آ سکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بعض لوگوں کا انفرادی رجحان ہے۔ موجودہ دور میں بھی بعض ایسے لوگ پائے جاتے ہیں مگر ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک "ناصبیت" کی تعریف کچھ مختلف ہے۔ اگر مثلاً انٹرنیٹ پر ناصبی، نواصب، ناصبیت قسم کے الفاظ عربی اور اردو میں سرچ کیے جائیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تمام اہل سنت ناصبی ہیں۔ ہر وہ شخص جو حضرت عثمان اور معاویہ رضی اللہ عنہما سے عقیدت رکھتا ہو، ان کے نزدیک ناصبی میں شمار ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اہل تشیع کے معتدل لوگوں کا موقف اس سلسلے میں مختلف ہو تاہم ان کے متشدد لوگوں کا موقف یہی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ باب

- امت مسلمہ کی پہلی صدی کا زیادہ حصہ جنگوں میں نہیں، بلکہ حالت امن میں گزرا ہے۔ یہ محض اخباریوں کا رجحان ہے کہ وہ جنگ کی خبروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔
- خلافت اگرچہ ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تاہم یہ ملوکیت، مطلق آمریت (Absolute Dictatorship) نہیں تھی۔ بنو امیہ، بنو عباس اور بنو عثمان کے اکثر حکمرانوں نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑی حد تک خلافت راشدہ کے کردار کو زندہ رکھا۔
- باغی تحریک کا خارجی گروپ جلد ہی ختم ہو گیا تاہم دوسرا گروپ باقی رہا اور بغاوتیں برپا کرتا رہا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان کے نام کو دل کھول کر استعمال کیا۔

- ناصبی فرقہ، ایک رجحان کا نام ہے جو بعض لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بغض میں اختیار کر لیا تھا۔

اسائن منٹس

۱۔ ناصبی کن لوگوں کو کہا جاتا ہے؟ کیا یہ کوئی منظم فرقہ تھا اور ہے؟ اگر ہاں تو یہ کہاں پایا جاتا ہے؟

۲۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے خلفاء کے کردار اور موجودہ دور کے آمروں کے کردار میں کیا فرق پائے جاتے ہیں؟

۳۔ اخباری اور صحافی، منفی خبروں کو زیادہ کو ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ علم صحافت (Journalism) کی روشنی میں جواب دیجیے۔

۴۔ مختار ثقفی کے بعد باغی تحریک کی دونوں شاخیں بے شمار چھوٹے چھوٹے گروپس میں تقسیم ہو گئیں۔ اس کے اسباب تلاش کیجیے۔

۵۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہم کیا نتائج اخذ کر سکتے ہیں؟

خاتمہ کتاب

کتاب کے اس آخری حصے میں ہم پوری کتاب کی بحثوں کا خلاصہ بیان کریں گے اور اس کے بعد اس کتاب پر ہونے والے اعتراضات کا جائزہ پیش کریں گے۔

تحقیق کے نتائج

اس کتاب میں ہم نے جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان کو مد نظر رکھا جائے تو ہم ان نتائج پر پہنچ سکتے ہیں:

- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سبھی یک جان اور کئی قالب تھے۔ یہ رحماء بینہم کی چلتی پھرتی تصویر تھے اور ان کے درمیان اختلاف رائے سے زیادہ کوئی اختلاف موجود نہیں تھا۔
- حضرت علی نے حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کو پورے دل و جان سے تسلیم کیا اور ان کی حکومت کا حصہ رہے۔ انہوں نے خلفاء کے جانثار ساتھی کا کردار ادا کیا اور اپنی جان پر کھیل کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کی۔
- مشاجرات صحابہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جنگ جمل و صفین محض باغی تحریک کی کاوشوں سے پیدا ہوئیں۔ ان میں نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی قصور تھا اور نہ ہی حضرات طلحہ، زبیر، عائشہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم کا۔ یہ تمام حضرات باغی تحریک کو ختم کرنا چاہتے تھے اور ان میں زیادہ سے زیادہ جو اختلاف تھا، وہ حکمت عملی اور طریق کار کا تھا۔
- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور خلافت راشدہ ہی کا تسلسل تھا۔
- صحابہ و تابعین کے 130 سالہ دور کا زیادہ تر حصہ امن اور ترقی کا دور ہے۔ ایک مختصر دور فتنہ و فساد کا ہے جس کے ذمہ دار جلیل القدر صحابہ و تابعین نہیں بلکہ کچھ اور قوتیں تھیں۔

۔۔۔خاتمہ کتاب۔۔۔۔

ببلیو گرافی

1. قرآن مجید
2. ابن ابی الحدید۔ **شرح نہج البلاغۃ**۔(ac 11 Aug 2012) www.shiaonlinelibrary.com
3. ابن ابی حاتم الرازی۔ **الجرح والتعدیل**۔(ac. 8 Aug 2012) www.waqfeya.com
4. ابن ابی شیبہ(159-235/776-850)۔ **المصنف**۔ ریاض: مکتبۃ الرشد۔(ac. 17 June 2006) www.waqfeya.com
5. ابن الاثیر(d. 630/1233)۔ **الکامل فی التاریخ**۔ **بیروت**: دار الکتب العلمیہ۔ (ac. 11 Dec 2009) www.waqfeya.com
6. ابن تیمیہ(661-728/1263-1328)۔ **منہاج السنۃ**۔(ترجمہ: غلام احمد حریری) (ac.18 Apr 2012) www.kitabosunnat.com
7. ابن جریر طبری(224-310/838-922)۔(اردو ترجمہ)۔ تاریخ الامم والملوک۔ کراچی: نفیس اکیڈمی۔
8. ابن جریر طبری۔ **تفسیر الجامع البیان فی تاویل القرآن**۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔(ac. 19 Feb 2008) www.almeshkat.net/
9. ابن حجر عسقلانی۔ **فتح الباری شرح بخاری**۔۔ ریاض: مکتبہ سلفیہ۔(ac. 22 Jan 2010) www.waqfeya.com
10. ابن حجر عسقلانی(773-852/1372-1448)۔ **لسان المیزان**۔ **بیروت**: مکتبہ **مطبوعات** الاسلامیہ۔
11. ابن حجر عسقلانی، **الاصابہ فی تمیز الصحابہ**۔ قاہرہ: مرکز ہجر للبحوث والدراسات العربیہ واسلامیہ۔ (ac. 7 Jan 2012) www.waqfeya.com
12. ابن حزم(384-456/994-1064)۔ **جمہرۃ الانساب العرب**۔ قاہرہ: دار المعارف۔
13. ابن حزم۔ **الفصل فی الملل والنحل**۔ موقع ام الکتاب۔ ac. 9 Aug 2012
14. ابن خلدون(732-808/1332-1406)۔ **دیوان المبتدا والخبر فی تاریخ العرب والبربر**۔ **بیروت**: دار الفکر 2000۔ www.waqfeya.com (ac. 29 June 2009)
15. ابن خلدون، مقدمہ۔ **بیروت**: دار الفکر۔(ac. 30 Sep 2006) www.waqfeya.net
16. ابن خلکان(608-681/1212-1282)۔ **وفیات الاعیان**۔ **بیروت**: دار الصادر۔(ac. 22 Aug 2012) http://majles.alukah.net
17. ابن سعد(d. 230/844)۔ **الطبقات الکبیر**۔ قاہرہ: مکتبہ الخانجی(ac. 6 May 2011) www.waqfeya.com
18. ابن صلاح(577-643/1182-1246)۔ **مقدمہ**۔ قاہرہ: دار المعارف۔(ac. 10 Aug 2012) www.waqfeya.com
19. ابن عبد البر(368-463/979-1071)۔ **الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب**۔ **بیروت**: دار الفکر۔(ac. 11 Aug 2012) www.waqfeya.com
20. ابن عساکر۔ تاریخ مدینہ دمشق۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ **بیروت**: دار الفکر
21. www.almeshkat.net/books/open.php?cat=13&book=513 (ac. 10 May 2012)
22. ابن قتیبہ الدینوری۔ **الامامۃ والسیاسۃ**۔ (ac. 20 Jan 2012) www.al-mostafa.net
23. ابن کثیر(701-774/1302-1373)۔ **البدایہ والنہایہ**۔(تحقیق: الدکتور عبد اللہ بن محسن الترکی) قاہرہ: دار ہجر۔
24. ابو الربیع سلیمان البارونی۔ **مختصر تاریخ الاباضیہ**۔(ac. 3 Oct 2011) www.scribd.com

25. ابوالکلام آزاد(1888-1957)۔**انسانیت موت کے دروازے پر**۔لاہور: ادارہ اسلامیات۔ islamicbookslibrary.wordpress.com (ac. 31 May 2012)

26. ابوبکر بن العربی مالکی(468-573/1076-1178)۔**العواصم من القواصم فی تحقیق مواقف الصحابہ بعد وفاۃ النبی**۔ قاہرہ: مکتبۃ السنۃ۔ www.waqfeya.com (ac. 7 Jan 2012)

27. ابوحامد غزالی(450-505/1058-1111)۔**احیاء العلوم الدین**۔(ترجمہ: ندیم الواجدی۔) کراچی: دار الاشاعت۔ www.ahlehaq.org (ac. 12 Apr 2012)

28. ابوداؤد۔**السنن**۔مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ www.almeshkat.net (ac. 24 Apr 2010)

29. ابومخنف لوط بن یحیی (d. 170/787)۔ **مقتل الحسین**، قم: منشورات الرضی۔

30. www.al-mostafa.info/data/arabic/depot2/gap.php?file=016992.pdf (ac. 16 Feb 2012)

31. احمد بن حسین بیہقی(d. 458/1066)۔**سنن الکبری**۔بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ www.waqfeya.com (ac. 17 May 2007)

32. احمد بن حنبل(164-241/780-855)۔**المسند**۔بیروت: دار الفکر۔ www.waqfeya.com (ac. 16 Dec 2009)

33. احمد بن علی الداؤدی(d. 828/1425)۔**عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب**۔لکھنو: مکتبہ جعفری

34. احمد بن یحیی البلاذری(d. 279/893)۔**انساب الاشراف**۔بیروت: دار الفکر۔ www.waqfeya.com (ac. 27 Oct 2007)

35. ارشاد الحق اثری۔**مشاجرات صحابہ اور سلف کا موقف**۔فیصل آباد: دار العلوم اثریہ۔ www.kitabosunnat.com (ac.20 Feb 2012)

36. ارشاد الحق اثری۔**مقام صحابہ**۔فیصل آباد۔ادارۃ العلوم الاثریہ۔ www.kitabosunnat.com (ac. 13 Aug 2011)

37. اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔**تاریخ اسلام**۔لاہور: دار الاندلس۔ www.esnips.com (ac. 29 Jan 2010)

38. اکرم بن محمد زیادہ الفالوجی الاثری۔ **معجم الشیوخ الطبری**۔عمان: دار الاثریہ۔

39. اکرم ضیاء العمری۔**عصر الخلافۃ الراشدہ**۔ریاض: مکتبہ العبیکان۔ www.waqfeya.com (ac. 11 May 2007)

40. بخاری، محمد بن اسماعیل(194-256/810-870) ۔**الجامع الصحیح**۔ www.almeshkat.net/books/ (accessed 3 Oct 2011)

41. بخاری، محمد بن اسماعیل۔**التاریخ الکبیر**۔ www.almeshkat.net (ac. 28 Apr 2007)

42. بخاری، محمد بن اسماعیل۔**التاریخ الصغیر**۔ www.almeshkat.net (ac. 28 Apr 2007)

43. بیہقی، احمد بن حسین(d. 458/1066)۔**الاعتقاد الی سبیل الرشاد**۔

44. www.islamweb.net/hadith/display_hbook.php?bk_no=663&pid=141193&hid=325 (ac. 11 May 2012)

45. تفضیل احمد ضیغم۔**ہمیں حسین سے محبت کیوں ہے؟**لاہور: دار الخلد۔ www.kitabosunnat.com (ac. 15 Jan 2012)

46. الجاحظ(150-255/767-869)۔ **العثمانیہ**۔بیروت: دار الجیل۔

47. جلال الدین سیوطی(d. 911/1505)۔**تاریخ الخلفاء**۔بیروت: دار ابن حزم۔ www.waqfeya.com (ac. 8 Aug 2012)

48. جمال الدین المزی(654-742/1256-1342)۔ **تہذیب الکمال فی اسماء الرجال**۔بغداد: موسسہ دار الرسالہ۔

49. جمیل عبداللہ المصری۔**اثر اہل الکتاب فی الفتن والحروب الاہلیہ فی قرن الاول الہجری**۔مدینہ منورہ: مکتبہ الدار۔

50. خالد کبیر علال۔**مدرسۃ الکذابین فی روایۃ التاریخ الاسلامی و تدوینہ**۔الجزائر: دار البلاغ

51. خطیب بغدادی(392-463/1002-1071)۔**تاریخ مدینۃ السلام (بغداد)**۔بیروت: دار الغرب الاسلامی

52. خلیفہ بن خیاط(d. 240/855)۔**تاریخ**۔بیروت: دار الکتب العلمیہ۔

53. الذہبی، شمس الدین(673-748/1275-1347)۔ **سیر الاعلام النبلا**۔ عمان: بیت الافکار الدولیہ۔

54. الذہبی، شمس الدین۔ **میزان الاعتدال فی نقد الرجال**۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ ac. 11 Dec 2009 www.waqfeya.com

55. سامی عطا حسن۔ **عبد اللہ بن سبا الیہودی الیمانی بین الحقیقۃ والخیال**۔ اردن: جامعہ آل بیت۔ (ac. 13 Aug 2012) www.ssaid.net

56. السمعانی، عبد الکریم(d. 562/1167)۔ **الملل والنحل الواردۃ فی کتاب الانساب**۔ ریاض: دار الوطن۔

57. سید ابو الاعلیٰ مودودی(1903-1979)۔ **خلافت و ملوکیت**۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔(ac. 10 Aug 2012) www.quranurdu.com

58. سید ابو الحسن علی ندوی۔ **المرتضیٰ**۔ کراچی: مجلس نشریات اسلام۔(ac. 12 Apr 2012) www.ahlehaq.org

59. سید رضوان علی ندوی۔ **ناصبیت: تقدس کے بھیس میں**۔ (ac. 9 Aug 2012) www.library.alqlm.org

60. سید شریف رضی(359-406/970-1015)۔ نہج البلاغۃ (عربی)۔ منتدیات مقهى الأصدقاء۔ ac. 19 Apr 2007 www.PalsCoffee.com

61. شاہ عبد العزیز محدث دہلوی(1745-1823)۔ **تحفہ اثنا عشریہ**۔ کراچی: دار الاشاعت۔(ac. 12 Apr 2012) www.ahlehaq.org

62. شاہ عبد العزیز محدث دہلوی(1745-1823)۔ **فتاویٰ عزیزی**۔ کراچی: سعید اینڈ کمپنی۔(ac. 12 Apr 2012) www.ahlehaq.org

63. شاہ ولی اللہ دہلوی(1703-1762)۔ **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء**۔ www.aqeedeh.com/ebook/view_news_inner_popup.shtml?rowID=161 (ac. 13 Aug 2012)

64. شمس الدین ابن طولون(880-953/1475-1546)۔ **قید الشرید من اخبار الیزید**۔ (ac. 13 Aug 2012) www.archive.org/details/qsmay

65. شہرستانی، محمد بن عبد الکریم۔(d. 548/1153)۔ **الملل والنحل**۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ۔ (ac. 10 Aug 2012) www.waqfeya.com

66. صلاح الدین یوسف۔ **خلافت و ملوکیت کی شرعی حیثیت**۔ لاہور: مکتبہ سلفیہ۔(ac. 15 Jan 2012) www.kitabosunnat.com

67. صلاح الدین یوسف۔ **رسومات محرم اور سانحہ کربلا**۔ لاہور: دار السلام پبلی کیشنز۔(ac.18 Apr 2012) www.kitabosunnat.com

68. طبرانی(260-360/874-971)۔ **مقتل الحسین بن علی بن ابی طالب**۔ کویت: دار الاوراد۔

69. ظفر احمد عثمانی۔ **مقالات عثمانی**۔ لاہور: بیت العلوم۔ (ac. 10 May 2012) www.ahlehaq.org

70. عبد الجبار سلفی۔ **صحابہ اور اہل بیت میں یگانگت اور محبتیں**۔ لاہور: مجلس التحقیق الاسلامی۔ (ac.31 May 2012) www.kitabosunnat.com

71. عبد الرحمن عبد اللہ الزرعی۔ **رجال الشیعہ فی المیزان**۔ کویت: دار ارقم۔

72. عبد الرزاق(126-211/744-827)۔ **المصنف**۔ بیروت: مجلس منشورات اسلامی۔(ac. 18 Dec 2009) www.waqfeya.com

73. عبد العزیز پرہاڑوی۔ **مقام حضرت معاویہ**۔ (ترجمہ: محمد غزالی جالندھری۔) میر پور خاص: مکی دار الکتب۔ (ac. 10 May 2012) www.ahlehaq.org

74. عبد الواحد خیاری۔ **الامام الحسین**۔ شہداد پور: دار العلوم حسینیہ۔(ac. 12 Apr 2012) www.ahlehaq.org

75. علی آل محسن۔ **عبد اللہ بن سبا: دراسۃ و تحلیل**۔ (ac. 13 Aug 2012) almohsin.org/index.php?act=books&action=view&id=6

76. علی بن ابی بکر الہیثمی(d. 807/1405)۔ **مجمع الزوائد و منبع الفوائد**۔(accessed 27 Dec 2007) www.almeshkat.net/books/

77. علی بن حسین بن علی المسعودی(d. 346/958)۔ **مروج الذہب و معادن الجوہر**۔ بیروت: الشرکۃ العالمیہ للکتاب۔

78. علی محمد محمد الصلابی۔ **ابو بکر الصدیق: شخصیتہ و عصرہ**۔ قاہرہ: دار التوزیع۔(ac. 7 Jan 2012) www.waqfeya.com

79. علی محمد محمد الصلابی۔ **امیر المومنین الحسن بن علی بن ابی طالب: شخصیتہ وعصرہ**۔ قاہرہ: دار التوزیع۔ www.waqfeya.com (ac. 7 Jan 2012)

80. علی محمد محمد الصلابی۔ **خلافۃ امیر المومنین عبداللہ بن زبیر**۔ قاہرہ: موسسہ اقرا۔(ac. 7 Jan 2012) www.waqfeya.com

81. علی محمد محمد الصلابی۔ **عثمان بن عفان: شخصیتہ وعصرہ**۔ قاہرہ: دار التوزیع۔(ac. 7 Jan 2012) www.waqfeya.com

82. علی محمد محمد الصلابی۔ **علی بن ابی طالب: شخصیتہ وعصرہ**۔ شارجہ: مکتبہ الصحابہ۔(ac. 7 Jan 2012) www.waqfeya.com

83. علی محمد محمد الصلابی۔ **عمر بن خطاب: شخصیتہ وعصرہ**۔ قاہرہ: دار التوزیع۔(ac. 7 Jan 2012) www.waqfeya.com

84. قاضی مظہر حسین۔ **حضرت لاہوری، فتنوں کے تعاقب میں**۔ چکوال: تحریک خدام اہل سنت۔

85. قاضی مظہر حسین۔ **دفاع حضرت معاویہ**۔ لاہور: مکہ کتاب گھر۔(ac. 12 Apr 2012) www.ahlehaq.org

86. قمر بخاری۔ **مورخ ابی مخنف پر اک نظر**۔ www.alqlm.org/forum/showthread.php?4183-مورخ-ابی-مخنف-پر-ایک-نظر (ac. 19 April 2012)

87. محمد ادریس کاندھلوی(1899-1974)۔ **خلافت راشدہ**۔ کراچی: زمزم پبلشرز۔(ac. 12 Apr 2012) www.ahlehaq.org

88. محمد اسحاق ملتانی۔ **محرم الحرام اور شہادت حسین**۔ ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ۔(ac. 15 Jan 2012) www.e-iqra.info

89. محمد امحزون۔ **مواقف الصحابہ فی الفتنۃ من روایات الامام الطبری والمحدثین**۔ قاہرہ: دار السلام۔

90. محمد بن ادریس الشافعی۔ **کتاب الام**۔ المنصورۃ: دار الوفا۔(ac. 6 Jan 2010) www.waqfeya.com

91. محمد بن طاہر البرزنجی و محمد صبحی حسن حلاق۔ **صحیح التاریخ الطبری**۔ دمشق: دار ابن کثیر۔(ac. 22 Jan 2010) www.waqfeya.com

92. محمد بن عبد اللہ الغبان۔ **فتنہ مقتل عثمان بن عفان**۔ ریاض: مکتبہ العبیکان۔ (ac. 15 May 2012) www.waqfeya.com

93. محمد بن عمر بن عبد العزیز الکشی۔ **معرفۃ اخبار الرجال**۔ بمبئی: مطبع مصطفویہ 1899۔

94. www.4shared.com/office/35Byd8a-/____.html (ac. 10 May 2012)

95. محمد تقی عثمانی۔ **حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق**۔ کراچی: ادارۃ المعارف۔(ac. 12 Apr 2012) www.ahlehaq.org

96. محمد ثاقب رسالپوری۔ **حضرت معاویہ اور تاریخی روایات**۔ کراچی: مکتبہ معارف القرآن۔ islamicbookslibrary.wordpress.com (ac. 15 Jan 2012)

97. محمد جعفر الطبسی۔ **رجال الشیعہ فی اسانید السنۃ**۔ موسسہ معارف الاسلامیہ۔

98. محمد حمید اللہ۔ **رسول اللہ کی حکمرانی و جانشینی**۔ (ترجمہ: خالد پرویز)۔ لاہور: بیکن بکس۔(ac.18 Apr 2012) www.kitabosunnat.com

99. محمد شفیع، مفتی۔ **شہید کربلا**۔ ملتان: دار الکتب۔(ac. 15 Jan 2012) www.e-iqra.info

100. محمد شفیع، مفتی۔ **مقام صحابہ**۔ کراچی: ادارۃ المعارف۔(ac. 10 May 2012) www.ahlehaq.org

101. محمد ظفر اقبال۔ **سیدنا معاویہ کے بارے میں گمراہ کن غلط فہمیوں کا ازالہ**۔ کراچی: مکتبہ عمر فاروق۔ islamicbookslibrary.wordpress.com (ac. 15 Jan 2012)

102. محمد ظفر اقبال۔ **سیرت امیر معاویہ اور ان کے دلچسپ واقعات**۔ لاہور: بیت العلوم۔ islamicbookslibrary.wordpress.com (ac. 15 Jan 2012)

103. محمد عبد الرشید نعمانی۔ **اکابر صحابہ اور شہداء کربلا پر افترا**۔ کراچی: الرحیم اکیڈمی۔ urdulibrary.paigham.net (ac. 15 Jan 2012)

104. محمد عبد الرشید نعمانی۔ **حادثہ کربلا کا پس منظر**۔ دہلی: ادارہ اشاعت دینیات۔

105. محمد عبد الرشید نعمانی۔ **ناصبیت: تحقیق کے بھیس میں**۔ کراچی: الرحیم اکیڈمی۔

106. محمد عبدالرشید نعمانی۔ **یزید کی شخصیت: اہل سنت کی نظر میں**۔ کراچی: الرحیم اکیڈمی۔

107. محمد عبدالمعبود۔ **تذکرہ اہل بیت اطہار**۔ راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز۔ (ac. 15 Jan 2012) www.e-iqra.info

108. محمد عبداللہ۔ **صحابہ کرام اور ان پر تنقید**۔ ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ (ac. 15 Jan 2012) www.ahlehaq.org

109. محمد فرج مصری۔ **فاتح اعظم: حضرت عمرو بن عاص**۔ (ترجمہ: شیخ محمد احمد پانی پتی)۔ کراچی: نفیس اکیڈمی۔

110. محمد نافع۔ **حضرت ابوسفیان اور ان کی اہلیہ**۔ لاہور: دارالکتاب۔ (ac. 5 Aug 2012) www.ahlehaq.org

111. محمد نافع۔ **رحماء بینہم**۔ لاہور: مکہ بکس۔ (ac. 10 Aug 2012) www.ahlehaq.org

112. محمد نافع۔ **سیرت حضرت امیر معاویہ**۔ لاہور: دارالکتاب۔ (ac. 30 Apr 2012) www.ahlehaq.org

113. محمد نافع۔ **سیرت علی المرتضی**۔ لاہور: دارالکتاب۔ (ac. 5 Aug 2012) www.ahlehaq.org

114. محمود احمد عباسی۔ **تحقیق سید و سادات**۔ کراچی: مکتبہ محمود۔ (ac. 3 Dec 2009) www.aboutquran.com

115. محمود احمد عباسی۔ **تحقیق مزید بسلسلہ خلافت معاویہ و یزید**۔ کراچی: مکتبہ محمود۔ (ac. 3 Dec 2009) www.aboutquran.com

116. محمود احمد عباسی۔ **حقیقت خلافت و ملوکیت**۔ کراچی: مکتبہ محمود۔ (ac. 3 Dec 2009) www.aboutquran.com

117. محمود احمد عباسی۔ **خلافت معاویہ و یزید**۔ کراچی: مکتبہ محمود۔ (ac. 3 Dec 2009) www.aboutquran.com

118. مسعود احمد۔ **صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین**۔ کراچی: جماعت المسلمین۔

119. مسلم بن حجاج (204-261/819-875)۔ **الجامع الصحیح**۔ (accessed 3 Oct 2011) www.almeshkat.net/books/

120. مصعب الزبیری (156-236/773-851)۔ **نسب قریش**۔ (ac. 14 Aug 2012) www.waqfeya.com

121. ملک غلام علی۔ **خلافت و ملوکیت پر اعتراضات کا تجزیہ**۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔ (ac. 30 Sep 2007) www.quranurdu.com

122. منیر محمد الغضبان۔ **معاویہ بن ابی سفیان: صحابی کبیر و ملک مجاہد**۔ بیروت: دارالقلم۔ (ac. 15 May 2012) www.waqfeya.com

123. موسی الموسوی۔ **اصلاح شیعہ**۔ (ترجمہ: ابو مسعود آل امام)۔ (ac. 11 Aug 2012) www.kitabosunnat.com

124. نامعلوم مصنف (منسوب بہ ابو حنیفہ الدینوری)۔ **الاخبار الطوال**۔ لندن: مطبع بریل (1888)۔ (ac. 6 Apr 2012) www.al-mostafa.com

125. نسائی۔ **السنن الصغری**۔ مکتبہ مشکاۃ الاسلامیہ۔ (ac. 19 Feb 2008) www.almeshkat.net/

126. نصر بن مزاحم المنقری (d. 212/828)۔ **وقعۃ الصفین**۔ بیروت: دارالجیل۔

127. یاقوت حموی۔ **معجم البلدان**۔ بیروت: دارالصادر۔

128. یحیی بن ابراہیم بن علی یحیی۔ **مرویات ابی مخنف فی تاریخ الطبری**۔ ریاض: دارالعاصمہ۔ www.ahlalhdeeth.com/vb/showthread.php?t=93954 (ac. 13 Aug 2012)

129. Ameer Ali, Syed. ***Short History of the Saracens.*** London: Mcmillan & Co. (1916) www.aboutquran.com (ac. 6 May 2008)

130. Browne, Edward G. MB, FRCP. ***Arabian Medicine.*** London: Cambride University Press (1921) archive.org/details/arabianmedicineb00browiala (ac. 12 Aug 2012)

131. Fazal ur Rahman. ***Revival and Reform in Islam.*** London: One World Publications (2006)

132. Hart, Micheal H. ***The 100. A Ranking of the Most Influential Persons in History.*** New York: Carol Publishing Group Edition (1993).

133. The Circle of Ancient Iranian Studies (CAIS), www.cais-soas.com/News/2007/June2007/28-06.htm, (ac. 12 Sep 2011)